UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224162

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٨٩١٤٣٠٥ Accession No. ٣٦٢

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

نہیں پڑھتا۔ جس طرح ایک بیرسٹر اپنے مقدمے کی مختصر یادداشت کو پڑھتا ہے، اسی طرح میں بھی اس رپورٹ کو پڑھتا ہوں۔ تاکہ اس کے ذریعے سے بچا ہوا پیسے کما لوں۔ اگر آپ کسی کتاب کو محض تفریح کی غرض سے پڑھ رہے ہوں تو پھر آپ کے چاروں طرف کچھ بھی ہوتا رہے آپ کو پروا نہ ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ میں تو "ٹیرسٹرم لک سینڈی" اور "ٹریژر آئلینڈ" سے زلزلہ کے دوران میں بھی لطف لے سکتا ہوں۔

لیکن جب آپ کسی کتاب کو سنجیدہ مقصد کے ماتحت پڑھ رہے ہوں تو آپ کا معقول سکون کی ضرورت ہوگی اور یہی چیز مجھے میسر نہیں آسکی کیونکہ دوسرے ہی منٹ میں دو صاحب تشریف لے آئے جن میں ایک صاحب اپنے ساتھی کے ساتھ راستہ بھر بہت زور زور سے تاخرانہ لہجہ میں گفتگو فرماتے رہے انھیں دیکھ کر مجھے "ہارن ٹوک" کا وہ قصہ یاد آگیا کہ ایک صاحب سڑک پر بہت ہی اکڑ کر چل رہے تھے۔ ایک ظریف نے انھیں روک کر دریافت کیا کہ "معاف کیجئے گا جناب! کیا آپ خود کو ہم چو من دیگرے نیست سمجھتے ہیں؟" یہ حضرت بھی "ہم چو من دیگرے نیست" قسم کے انسان تھے۔ یہ رپورٹ کے نقروں اور جملوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھے اور ان حضرت کی آواز آندھی کی طرح برابر بڑھتی چلی جارہی تھی۔ ان کے خاندانی حالات تک بغیر عظیم میں ان کے لڑکوں کے کارنامے اور پرسالار اور سپاہی رہنماؤں کے افعال پر ان کی تنقید نے میری اپنے کام میں لگے رہنے کی جو کوشش اکارت رائگاں کر دیا۔ میں نے کتاب بند کر دی۔ اور کچھ دیر بیٹھا رہا اور نہایت بددلی کے ساتھ ان کی گفتگو بھی سنتا رہا۔ وہ اس قسم کے الفاظ کے ساتھ گرج رہے تھے "فرانس والوں کو اصل میں کرنا کیا چاہیے تھا؟ جرمنی والوں نے اصل میں غلطی کیا کی؟ اگر صرف اسکوتھ نے ..... کیا ہوتا وغیرہ وغیرہ" گفتگو کے رنگ کو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ میں اس قسم کی گفتگو پہلے بھی سن چکا تھا اور کئی بار سن چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک خود بخود بچے ڈالا جا رہا ہے جس میں سے اگلے زمانے کا کوئی راگ مسلسل نکل رہا ہے۔

اگر میں ان سے کہتا کہ "جناب عالی ذرا آہستہ بولئے" تو شاید وہ مجھے بہت ہی بدتہذیب انسان سمجھتے۔ ان کے ذہن میں یہ بات مطلق نہیں آئی کہ ان کی گفتگو سننے کے علاوہ دوسرے شخص کو بھی کوئی اور کام بھی ہو سکتا ہے اور مجھے تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر میں ان سے ضرور اس یقین کے ساتھ

گئے ہوں گے کہ ان کی بدولت تمام مسافروں کا سفر بہت ہی بصیرت افروز اور بامعنی رہا اور ہر شخص ان کی ہمہ گیر معلومات کا خوش گوار نقش اپنے ذہن میں لیکر جائیگا یہ واقعہ ہے کہ وہ ایک نیک نیت انسان تھے۔ اگر کسی بات کی ان میں کمی تھی تو صرف یہ کہ وہ آداب مجلس سے ناواقف تھے۔ وہ "شایان انجمن" انسان نہیں تھے۔

دوسروں کے حقوق یا جذبات کے مناسب لحاظ پر ہی حیات اجتماعی کا دارومدار ہے۔ عورتوں کی نسبت عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس معاملے میں وہ مردوں کے مقابلہ میں کم شائستہ ہوتی ہیں اور میں بھی اپنے تجربہ کی بنا پر اس اعتراف پر مجبور ہوں کہ وہ عورت اور خوش پوشاک عورت ہی ہوتی ہے جو ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے آپ کے آگے گھس جاتی ہے۔ مرد کبھی ایسا نہیں کرے گا کیونکہ اول تو وہ جانتا ہے کہ لوگ اس کے اس فعل کو جائز نہیں سمجھیں گے۔ دوسرے اس کے وسیع میل جول نے اس کو چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی عوض معاوضہ کے اصول کی پابندی سکھا دی ہے۔ وہ دنیا کی کھلی فضا میں زیادہ رہا ہے۔ جہاں ہر شخص کو اپنا طرز عمل عام معیار کے مطابق کھنا پڑتا ہے۔ اس کی اسکول کی زندگی اور انجمنوں اور کھیلوں میں شرکت اس خصوص میں اس کی ایسی تربیت کر دیتی ہے جس سے عورتوں نے صرف ابھی ابھی مستفید ہونا شروع کیا ہے۔

میرا اعتقاد ہے کہ غریب اور بے زبان لوگوں کے حقوق کا تحفظ بھی اسی قدر ضروری ہے جتنا کہ چھوٹی قوموں کے حقوق کا۔ جب میں کسی موٹر والے کو دیکھتا ہوں کہ وہ اپنا بے درد اور سفاک ہارن[1] بالکل بیکار بجا رہا ہے تو میں سچ کہتا ہوں میرے خون میں اسی قسم کا ایک ابال پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب جرمنی نے بلجیم کے کچل ڈالنے کے لئے جارحانہ اقدام کیا تھا۔

جناب محترم! آپ کس استحقاق سے ہر اس شخص کو یہ نفرت انگیز گالی سناتے جاتے ہیں جو شاہراہ عام پر آپ کے راستے میں حائل ہو؟ کیا آپ ایک مہذب انسان کی طرح اپنی آمد کا اعلان نہیں فرما سکتے؟ کیا آپ بھی "ہم چو من دیگرے نیست" قسم کے انسان ہیں؟ یا کیا آپ نیٹشے[2] (NIETZSCHE) کے کوئی پرجوش پیرو ہیں؟ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کا انسان ہے جو اپنی موٹر کار میں ایک خوفناک خبردار ہارن لگا کر بیٹھتا ہے اور ہمیں سمجھنا کہ وہ اس سپرٹ کا نمونہ ہے جس کا جرمنی

[1] ناولوں کے نام۔

[2] مشہور یورپین فلسفی "انسان افضل" کا بانی۔ HORN

نے مظاہرہ کیا تھا اور وہ مہذب دنیا کے صفحہ پر ایک بہت ہی بدنما نقش ہے۔

اب سنیما اس زیادہ بے ضرر انسان کو لیجئے جس نے ایک بڑے آواز کا گراموفون خرید لیا ہے اور ہر اتوار کی شام کو اسے بجاتا ہے۔ کھڑکی کھول دیتا ہے اور تمام محلہ میں "کیپ ٹی ہوم فائرس برننگ" یا اسی قسم کے کسی دوسرے گیت کی صدا گونجنے لگتی ہے۔ ان معاملات میں اجتماعی زندگی کے اصول و افعال کے جائز حدود کیا ہیں؟ یہ شمال کے طور پر پھیرا ڈھول والے سامد کو لینا چاہئے۔ ہیزلٹ لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس وحشت خیز باجے کو سننا چاہتا ہے تو وہ اپنے مکان کے اندر سنے کا مجاز ہے۔ چاہے اس سے اس کے ہمسایوں کو تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ اس کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس تکلیف کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرے اس کو چاہئے کہ اپنے مکان کے اندرونی حصہ میں مجھ کر مشق کرے اور کھڑکی بند کر دے۔ اس کو بالکل حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے مکان کے بیرونی حصہ میں بیٹھے کھڑکی کھول دے۔ اور پوری قوت کے ساتھ اپنے شور سے ہمسایوں کے کان پھوڑ دے "یہی صورت گراموفون کی بھی ہے اگر آپ کو گراموفون پسند ہے تو آپ اسے خرید سکتے ہیں لیکن اگر آپ اس کے شور کو اپنے ہی گھر تک محدود رکھنے کی امکانی کوشش نہ کریں تو آپ اپنے ہمسایوں کی آزادی میں مخل ہوں گے ممکن ہے آپ کے ہمسایوں کو "کیپ دی ہوم فائر برننگ" بھلا نہ معلوم ہوتا ہو اور وہ اپنی اتوار کی شام بے شور و شر گزارنا زیادہ پسند کرتے ہوں۔ آپ کا جان بوجھ کر ان کے سکون میں مخل ہونا ایسا ہی معیوب ہوگا جیسا کہ ان کی بات نہ سنیں بغیر اجازت گھس جانا اور ان کے پھولوں کی کیاریوں کو روندڈالنا"

اس میں کلام نہیں کہ بعض صورتیں ایسی بھی پیش آتی ہیں۔ جہاں ایک کی آزادی دوسرے کی آزادی سے ٹکراتی ہے اور کوئی درمیانی راستہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ زید و بکر ایک پرانے دوست ہیں عوام کے محلے میں رہتے ہیں۔ وہ ایک نہایت اور زور بخی کا ایک عجیب مرکب ہیں اگر وہ کبھی سڑک پر پیانو بجتا ہوا سنتے ہیں تو غصے میں بھر جاتے ہیں اور باہر نکل کر بجانے والے کو فوراً چلے جانے کا حکم دے دیتے ہیں۔ لیکن ان کے پڑوس میں ایک مستانہ خاتون بھی رہتی ہیں جو لطیف رومانی مذاق کی حامل ہیں اور بازاری پیانو بجانے والے بھی اُن کی

KEEP THE HOME FIRES BURNING کے

HAZLITT کے

طرف اسی طرح کھنچتے ہیں جس طرح شہد کی طرف مکھیاں۔ اب اس صورت میں کس کی آزادی دوسرے کی آزادی پر قربان کی جائے؟ مجھ سے میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے کیونکہ بازاری پیانو کو پسند کرنا بھی اتنی ہی معقول بات ہے جیسا کہ اسے ناپسند کرنا۔ ایسے پیچیدہ معمے کے متعلق تنخ چلی کا حل زیادہ قابل قدر ہوگا۔

میں سمجھتا ہوں بات دراصل یہ ہے کہ دنیا کے اس پیچیدہ نظام کے اندر نہ تو ہم مطلق اشتراکی بن سکتے ہیں اور نہ مطلق انراجی بلکہ ہم کو دونوں کا ایک موزوں مرکب ہونا چاہئے ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں آزادیوں کو برقرار رکھنا ہے۔ ایک طرف تو ہمیں ارکان حکومت کی اعمال کی نگرانی کرنا چاہئے اور دوسری طرف مخالفین حکومت کے انسداد کی تدابیر میں۔ نہ تو کاسل مارکس کا ہم خیال ہوں۔ نہ ٹالسٹائے کا بلکہ میرے خیالات دونوں کے خیالات کا مرکب ہیں۔ میں کسی اقتدار کے لئے جائز نہیں رکھتا کہ وہ مجھ پر یہ پابندی عائد کرے کہ میرا لڑکا اس اسکول میں جائے جہاں میں علم سیکھے یا ہنر۔ فٹ بال کھیلے یا نہ کھیلے۔ یہ سب انفرادی معاملات ہیں لیکن اگر میں کہنے لگوں کہ میرا لڑکا بالکل تعلیم نہیں پائے گا۔ یا اس کو بیسویں اگلے زمانے کے وحشیوں کی طرح کی جائے گی یا اسے سٹرننگ سیکی کی رسم پر جیب تراشی میں تعلیم دلائی جائے گی تو سماج نہایت اخلاق کے ساتھ لین ٹال لہجہ میں مجھے متنبہ کر دے گی کہ اس کو اگلے زمانے کے وحشیوں کی نقل ضرورت نہیں ہے اس کو جیب تراشوں پر سخت اعتراض ہے اور چاہے میں پسند کروں یا نہ کروں میرے لڑکے کے کم سے کم حد تک تعلیم ضرور حاصل کرنا ہوگی۔ مجھے آپ اپنے لئے باعث تکلیف ہونے کی یا اپنے لڑکے کو حکومت کے لئے ایک بار اور خطرہ بنانے کی آزادی نہیں دی جا سکتی۔

غرض یہ ہے کہ معمولی باتوں میں رہبری کے قاعدہ کی پابندی ہی ایک ایسا معیار ہے جس کے لحاظ سے ہم اپنے متعلق خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا ہم مہذب ہیں یا غیر مہذب بہت اور ابتدا کے بڑے بڑے واقع کتاب ہیں۔ روزمرہ کے کاروبار میں چھوٹی چھوٹی عادتیں ہی ہماری زندگی کا راستہ تیار کرتی اور ہمارے سر کو تاج یا طوق غلامی پہناتی ہیں

مجھے امید ہے کہ میرے پیارے والے دوست اس پر غور کریں گے اسکے باوجود اپنے ساتھی کو سمجھانا تو ترک نہیں کریں گے کہ فرانسیسیوں سے کہاں غلطی کی اور جرمنی والوں نے کہاں لیکن وہ سطریں سمجھائیں۔ مگر مجھے پاپولیٹ کی پوٹ سکون کے ساتھ پڑھنے کا موقع مل سکے۔

ظہور الحق بی اے

PAGIN کے TOLSTOY کے KARL MARX کے

تو غریب پر مصیبت آجائے گی۔ کم از کم ایک بار تو ضرور رکھا یا پیاسب نکل جائے گا۔ دایاں بالا خانہ خالی پڑا ہے۔ پچھلے بایاں بھی خالی تھا مگر اب تقریباً ایک مہینے سے آباد ہو گیا ہے خالی والے اور ہمارے بالا خانے کا زینہ ایک ہے اور بائیں بالا خانے کا زینہ دوسرا ہے اور ہمارے اُس کے صحن کو ایک چھوٹی سی دیوار دو حصوں میں منقسم کرتی ہے۔ اس چھوٹی سی دیوار ہی نے واقعات کو یہ رنگ دیا ہے۔ اگر یہ دیوار دو ایک فٹ اور اونچی بنا دی جاتی تو شاید آج صورتِ حالات یہ نہ ہوتی۔ لیکن مکان کے مالکوں کو تو کرایہ سے غرض ہے۔ اُن کی بلا سے اگر کرایہ داروں کو کچھ تکلیف ہو تو ہوا کرے۔ اس بالا خانے میں ایک مسلمان بزاز رہتا ہے۔ صبح کو آٹھ نو بجے دوکان پر جاتا ہے تو رات کو دس بجے سے پہلے لوٹنا نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی بیوی انتہا درجہ کی فیشن کی دلدادہ ہے۔ آٹھ پہر بناؤ سنگار کرتی رہتی ہے۔ گو دو ننھے ننھے بچے بھی ہیں پھر بھی اس کی زیبائش میں فرق نہیں آتا اس قسم کی عورت کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کی زیبائش پر جان دے اُس کی مدح خوانی کرے۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ شوہر دن بھر کا تھکا ماندہ آتا ہے اور کھانا کھا کر لیٹ جاتا ہے ——— خیر مجھے کسی کے ڈھکے چھپے ٹھاٹھ کھولنے کا کیا حق ہے۔

کئی روز تک یہ دیوار پر سے جھانکتی رہی جب میں نظر اوپر اٹھاتا تو فوراً سر نیچا کر لیتی۔ کئی مرتبہ میں نے دیکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ ایک بھلا مانس ——— اور اُس کے بعد معاملہ صاف۔ اتوار کا دن تھا مجھے مجامت بنانی تھی۔ صحن میں میز کرسی بچھائی اور اُس دیوار کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا۔ میز کرسی کے بچھنے کی آواز سے وہ دیوار کے سب آگئی اور میز کے آئینہ میں اُس کا عکس پڑنے لگا۔ میں نے پیچھے مڑ کر نظر نہ دیکھا۔ آہستہ آہستہ مجامت بناتا رہا۔ شیشے میں اُس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنی بچی کو آواز دی اور کچھ کام کرنے لئے کہا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں مڑ کر دیکھوں لیکن میں اُسی طرح بیٹھا رہا جب مجامت بنا چکا تو ایک دفعہ اور گالوں کو صابون لگایا اور دوسرے اُسترے سے جھاگ صاف کرنے لگا۔ اُس نے بھی نقل کی گالوں کے قریب ہاتھ لے جا کر ایسے ہلانے لگی جیسے صابون لگاتے ہیں اور اس کے بعد شہادت کی انگلی پھیرنے لگی۔ اُس کی اس شرارت پر مجھے ہنسی آگئی اور استرے نے فوراً اس ہنسی کی سزا دی۔ لیکن کچھ تکلیف محسوس نہ ہوئی کیونکہ اُسترا میرے لگا تھا اور آہ اُس نے کھینچی تھی۔ میں برابر ہنستا رہا۔

اس دن کے بعد اکثر دیوار کی دوسری طرف سے ٹھنڈے ٹھنڈے سانسوں کی آواز آیا کرتی اور کبھی کبھی عشقیہ اشعار سنائی دیتے۔ لیکن میں

کوئی توجہ نہ کی۔ ایک شام کو انگنائی میں بیٹھا وغیرہ رہا تھا کہ ایک پرچہ قریب آکے پڑا۔ اٹھا کے پڑھا تو حیران ہو گیا۔ رحم کرنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے کسی پر ظلم کیا تھا جو رحم کرتا۔ اس پرچے کا میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے دن پھر اُسی وقت دوسرا پرچہ آیا۔ پہلے کا جواب مانگا تھا اور کچھ کچھ عشق کا اظہار بھی کیا تھا۔ تیسرے دن پھر چھٹی تھی۔ دوپہر کو جیب سے "ہمایوں" کا پرانا فائل دیکھ رہا تھا کہ میری توجہ اُس کی نجی لڑکی نے اپنی طرف منعطف کر لی۔ اُس کی والدہ نے اٹھا کر اُسے دیوار پر بٹھا دیا تھا اور وہ اپنے ننھے ننھے اُودے اُودے لب ہلا رہی تھی۔

"بابو جی زور زور پڑھ ہم بھی سنیں گے"۔

میں نیچی نظریں کئے ورق گردانی کرتا رہا۔ لڑکی نے پھر یہی درخواست کی کیونکہ اُس نے ایسا کرنے کے لئے دوبارہ کہا گیا تھا میں نے ماہ مارچ کا "ہمایوں" فائل میں سے نکال لیا اور اپنا افسانہ "ثروت" اتنی بلند آواز سے پڑھنے لگا کہ وہ آسانی سے سن سکے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے مجھے شبہ ہوا کہ شاید چلی گئی ہے بچی کو تو اُس نے افسانہ شروع کرنے کے ساتھ ہی ہمسائی کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے بھیج دیا تھا اور دیوار کی دوسری طرف کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن میں اسی طرح پڑھتا رہا۔ افسانہ ختم ہونے پر بھی کسی قسم کی آواز سنائی نہ دی میں سمجھا کہ کوئی عورت آگئی ہو گی اور ملازم کو کھانے کے متعلق ضروری ہدایتیں دے کر چلا گیا۔ توقع کے خلاف بہت جلد واپس آگیا۔ ظہیر سے ملنے گیا تھا وہ گھر میں موجود نہ تھے۔ میری آواز سنتے ہی فوراً دیوار کے قریب آکر جھانکنے لگی۔ اتفاق سے ملازم خود بخود بازار چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی کہنے لگی۔

"وہ کتاب ذرا مجھے دے دیجئے"۔

"کونسی کتاب" میں نے پوچھا

"جس میں سے کہانی پڑھ کر سنائی تھی"۔

اس کے چہرے سے [illegible]

نمایاں تھے آنکھ [illegible]

یہ اُس وقت [illegible]

ہے اور مدہوش ——— جب میں اپنا قصیدہ ختم کر لیتا ہوں تو اکثر کہتی ہے "میں اس قابل کہاں ہوں کہ آپ میری تعریف کریں"۔

ایک دن اُس نے مجھ سے ایک عجیب درخواست کی۔ کہنے لگی "اپنے ملازم کو علیحدہ کر دیجئے"۔ میں نے کہا "کیوں؟ اور رکھانا کون پکائے گا"۔ "کھانا پکائے گا کون" اس نے میرے سوال کو دہرایا۔ پھر بولی "صبح تک میرے دم میں دم ہے۔ آپ کو کھانے کا کیا فکر"

میں نے کہا "نہیں یہ ٹھیک نہیں"۔

"کیوں" اُس نے سوال کیا

"اُس لئے کہ میں کہتا ہوں" مجھے کوئی اور جواب بن نہ پڑا۔

"اُس لئے کہ میں کہتا ہوں" اُس نے لبوں ہی لبوں میں یہ الفاظ کہے اور سر نیچا کر لیا۔

حیات کیا تمہارا کاہل دوست اس قابل ہے کہ اس سے عورت محبت کرے۔ اُس پر صنفِ نازک کی ایک دلفریب ہستی جان دے ——— نہیں ——— پھر اس بدنصیب کو کیا ہو گیا۔

شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اتنا طویل خط لکھا ہے۔ اچھا۔

رخصت ———

دوسرا خط

سات دن ہوئے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ ابھی تم اُس کا جواب دینے کے متعلق غور کر رہے ہو گے کہ میں دوسرا خط لکھنے بیٹھ گیا۔ تہیہ کر لو جب تک میرے اتنے خط تمہارے پاس نہ پہنچ جائیں جتنے تم نے مجھے اکر جواب نہ دیا۔ لیکن یہ ہو نہیں سکتا۔ تم محبت کی داستان سنو اور

دلچسپی ہے تو عورت کے پیار سے متعلق
حبیب میرے نزدیک
ر صدے
نظر آتی

ہے اور اب تو مجھے بھی بہت کھلاتی ہے جب دیکھو جیب میں کشش بھری ہے اور منہ چل رہا ہے۔

کل ہم سینما دیکھنے گئے تھے۔ کشش کا شوہر دس بجے گھر آتا ہے اور پہلا کھیل نو بجے سے پیشتر ختم ہو جاتا ہے۔ اُس نے شام سے ہی ترکاری پکالی اور آٹا گوندھ کر رکھ لیا۔ میں نے کہا "روٹیاں پکا لو"۔ کہنے لگی "ٹھنڈی ہو جائیں گی" وہ کہیں گے روٹیاں تو مغرب سے پہلے کی پکی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کیا کرتی رہیں"۔

میں اُس سے تقریباً دس منٹ پہلے چلا گیا اور سڑک پر جا کر کھڑا ہو گیا کہ وہ بھی آ گئی۔ ہم نے تانگہ کرائے کیا اور سینما پہنچ گئے۔ میں ٹکٹ خریدنے کے لئے جانے لگا تو اس نے روپے پیش کئے۔ میں نے کہا کہ میرے تمہارے روپے ایک ہی ہیں۔ وہ بولی پھر کیا حرج ہے یہی لے جاؤ۔ میری مرضی فرسٹ کلاس کے ٹکٹ خریدنے کی تھی لیکن اس کے کہنے سے بکس کے لئے۔ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا اور چار آنے والوں نے شور و غوغا سے سارے ہال کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ خدا خدا کر کے تماشہ شروع ہوا۔ خاصہ دلچسپ کھیل تھا اور سبق آموز۔ تمہارے لئے نہایت مختصر الفاظ میں اُس کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

"ایک شخص اکرام نامی اپنے دوست کی بیوی پر عاشق ہو جاتا ہے لیکن اُسے یہ معلوم نہیں کہ اُس کی محبوبہ اُس کے محبوب ترین دوست کی شریکِ زندگی ہے۔ وہ اپنے عشق کا حال اپنے دوست سے کہہ دیتا ہے اور جس جگہ اور جس حال میں اُسے دیکھا تھا وہ بھی بتا دیتا ہے۔ دوست بظاہر مطمئن نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے دل پر چھریاں چل رہی ہیں۔ آخر بڑی مشکل سے دلی جذبات پر غلبہ پا لیتا ہے اور اپنے دوست سے کہتا ہے فکر نہ کرو آج رات اس پری کو تمہارے کمرے میں حاضر کروں گا۔ وہاں سے جا کر وہ اپنی بیوی سے یہ انوکھی درخواست کرتا ہے۔ بیوی راضی نہیں ہوتی لیکن شوہر کی ضد پر خاموش ہو جاتی ہے۔ وہ خود جا کر اُسے اکرام کی خواب گاہ میں چھوڑ آتا ہے اور رنگی تلوار لے کر باہر پہرہ دیتا ہے۔ اکرام دوست کی بیوی کو نامہ لگاتا ہے وہ اُسے حقیقت سے آگاہ کر دیتی ہے۔ اکرام یہ راز سن کر اُسے بہن کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور پاؤں میں گر کر معافی مانگتا ہے۔ پھر سوچتا ہے جن ہاتھوں نے دوست کی زوجہ کو بری غرض سے مس کیا ہے انہیں کاٹنا چاہئے۔ یہ خیال کر کے وہ باہر آتا ہے اور وہ دوست سے کہتا ہے

کہ جب میں اُس حسینہ کے قریب جاتا ہوں تو دیدار میں سے دو ہاتھ نکلتے ہیں اور مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ دوست اُس کے ہمراہ کمرے میں جاتا ہے اور کہتا ہے "چراغ گل کر کے تم آرام کرو میں یہاں پہرہ دوں گا" اکرام موقع پا کر باہر چلا جاتا ہے اور دیوار کے روزن سے اپنے دونوں ہاتھ اندر کی جانب نکالتا ہے۔ دوست ہاتھ دیکھتے ہی تلوار چلاتا ہے۔ دونوں ہاتھ کٹ کر گر پڑتے ہیں۔ ایک چیخ کی آواز آتی ہے۔ باہر جا کر دیکھتا ہے کہ اکرام بے ہوش پڑا ہے۔ حیران ہے کہ کیا معاملہ ہے اتنے میں بیوی آجاتی ہے اور سارا واقعہ بیان کرتی ہے"۔

اس کے بعد خبر نہیں کیا ہوا ہم اٹھ کر چلے آئے تھے۔ بات یہ ہوئی کہ "قفہ" میں میں نے جو نیچے جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کشمش کے سرتاج تشریف رکھتے ہیں میں نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کشمش سے پوچھا "انہیں پہچانتی ہو یہ کون ہیں؟" اُس نے دیکھا اور سہم گئی۔ پھر بولی "یہ کہاں سے آگئے؟" اور گھر چلنے کی رٹ لگا دی۔ میں چاہتا تھا کہ کھیل ختم ہونے پر چلیں لیکن مصلحت فوراً روانہ ہونے ہی میں تھی۔ بچہ بھی رونے لگا تھا۔ لہٰذا کھیل ختم ہونے سے تقریباً بیس منٹ پہلے واپس چلے آئے۔ اُسے خوف تھا کہ کہیں اُس کے شوہر کو پتہ نہ چل گیا ہو کہ ہم یہاں آئے ہیں لیکن میں نے تسلی دی کہ نہیں یہ یوں ہی چلے آئے ہوں گے۔ بعد میں معلوم ہوا یہی بات تھی حضرت نے گھر آکر سینما جانے کا ذکر تک نہیں کیا کشمش کے دریافت کرنے پر کہ آج دیر کہاں لگی کہنے لگے "آخری وقت میں گاہک آگئے تھے"۔

حیات کتنی عجیب بات ہے میاں بیوی دونوں ایک تماشہ دیکھنے جاتے ہیں۔ ایک ہی سینما گھر میں اور ایک ہی وقت میں مگر ایک دوسرے کو نہیں بتاتے اور دونوں محبت کے دعوے دار ہیں۔ کیا یہ بزاز صاحب کی غفلت کا نتیجہ نہیں کہ اُن کی رفیق زندگی غیر مرد کے ساتھ تماشہ میں گئی اور کیا یہ اُن کی بے رُخی کا انجام نہیں کہ اُن کی شریک حیات نامحرم سے محبت کرتی ہے۔ جتنا اعتبار وہ کرتے ہیں کہاں تک درست ہے۔ کیا محبت میں کبھی شبہ کو دخل نہ دینا چاہیئے۔ اگر یہ کبھی کبھی دُکان کو چھوڑ کر وقت بے وقت گھر کی خبر لے لیا کرتے تو شاید واقعات اس سرعت کے ساتھ ظہور پذیر نہ ہوتے لیکن انہیں تو دُکان سے غرض ہے اور روپے سے۔ بیوی کی پروا نہیں ——— حیات تم کہو گے کہ دوسروں کو نصیحتیں کرنی آتی ہیں اپنی بُرائیوں پر نظر نہیں کرتے۔ دوست ٹھیک کہتے ہو یہ بھی گناہ ہے لیکن جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے بچتا ہوں اور جو کچھ تمہیں لکھ چکا ہوں اس حد سے زیادہ نہیں بڑھا۔ شاید تمہیں یہ پڑھ کر حیرت ہو گی کہ آج تک اُس کے بدن سے میں نے اپنی انگلی تک مس نہیں ہونے دی۔ خیر صفائی کی ضرورت نہیں۔ اگر تم کچھ برا خیال کرو گے تو تمہارے آگے آئے گا۔

تیسرا خط

ابھی ابھی تمہارا "حماقت نامہ" پڑھ کر بیٹھا ہوں۔ نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کبھی لاہور کے مشہور مقام کو تمہاری قدم بوسی کا شرف حاصل نہ کرنا پڑے۔

تم کہتے ہو کہ وہ "زریں زمانہ" ایک مرتبہ اور آئے گا اور ہمیشہ رہے گا تمہاری مراد بہشت سے ہے۔ وہاں بھی ہم معصوم ہوں گے اور بے فکر اور دل شاد لیکن کہتے تو وہ تمہارے لئے ہو گا میں اُس سے مستفید نہ ہو سکوں گا۔ خوب! حیات یاد رکھو کہ اگر ہم سب دوستوں میں سے کسی کو بہشت ملی تو انشاء اللہ خاکسار ہی کو ملے گی۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں میرا جی نہ لگے اور میں اللہ میاں کی منتیں کر کے تمہیں بھی اپنے پاس بلا لوں۔

تم میرا "فسانۂ محبت" سننے کے لئے بہت بے تاب ہو۔ کیوں؟ تم تو لکھتے ہو کہ آگ سے نہیں کھیلنا چاہیئے اور خاص طور پر جب کوئی مطلب نہ ہو تو جتنا دور رہا جائے بہتر ہے۔ حیات تمہارے خیال میں میں آگ سے کھیل رہا ہوں۔ عورت کو تم آگ کہتے ہو یہ صنفِ نازک کی سخت توہین ہے۔ عورت دنیا کی زیبائش ہے۔ عورت خداوند تعالیٰ کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔ عورت نے دنیا میں بڑے بڑے مصلح، قاید، ولی اور پیغمبروں کو جنم دیا۔ عورت نے دنیا کو معراج ترقی پر پہنچایا۔ عورت سے زندگی کی دلچسپیاں وابستہ ہیں اگر عورت نہ ہوتی تو دنیا کی ہر چیز نامکمل رہ جاتی اور کسی شے میں حُسن نظر نہ آتا۔ ظلمت کا، واہمہ، اور نور کا کہیں پتہ نہ چلتا پھر تم عورت کو آگ کیسے کہتے ہو اگر آگ ہی ہے تو ٹھنڈی آگ ہے۔ روشنی پہنچاتی ہے جلاتی نہیں۔

"اگر مطلب نہ ہو تو جتنا دور رہا جائے بہتر ہے" اس مطلب پرستی نے ہندوستان کو تباہ کر دیا۔ کاش یہ الفاظ لکھتے ہوئے تمہارا قلم ٹوٹ جاتا۔ مجھے اس ایک فقرے کو پڑھ کر اتنا رنج ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ ایک طرف تم محبت کی توہین کرتے ہو دوسری طرف عورت کی۔

جی تو یہ چاہتا ہے کہ آئندہ تمہیں کشمش کے متعلق کچھ نہ لکھوں۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ مفت میں ناراض ہو جاؤ گے۔ اچھا سنو فسانۂ اُلفت سنو اور اگر خدا توفیق دے تو نیک سبق حاصل کرو۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ملازم بیمار ہو گیا اور مجھے مجبوراً اُسے چھٹی دینی پڑی۔ وہ وقت تو بازار میں کھانا کھایا لیکن کشمش نے بہت بُرا مانا اور قسم کھا کر کہنے لگی کہ اب آپ جب تک بازار میں کھانا کھائیں گے مجھے بھی کھانا پینا حرام ہے۔ دو تین وقت میں نے اور ٹال دئے طشتت میں کھانا رکھ کر دیوار پر سے دینے لگی مگر میں نے نہیں لیا۔ اُس کے بعد کچھ نہ بولی اور بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ مجھے اس کی لڑکی کی زبانی اس بات کی خبر ہو گئی اور خود کہنا پڑا کہ شام کا کھانا میں آپ کے یہاں کھاؤں گا۔

حیات وہ نظارہ بھی خوب تھا۔ دیوار کو ہم نے میز بنا رکھا تھا ایک جانب کرسی پر وہ کھڑی تھی اور دوسری طرف میں اور ایک سانھ کھانا کھا رہے تھے۔ اندھیری رات تھی۔ گو سرد ہوا چل رہی تھی پھر بھی پسینہ سا آرہا تھا۔ یہ میری مختصر حیات میں پہلا واقعہ تھا کہ میں ایک نامحرم عورت کے ساتھ کھانا تناول کر رہا تھا۔ بدن میں ہر دو تین لمحوں کے بعد سنسناہٹ سی محسوس ہو رہی تھی اور دل کو ایک عجیب سرور حاصل تھا۔ وہ مارے خوشی کے پھولی جاتی تھی۔ بات بات میں ہنس رہی تھی۔ سو یاں سینکڑوں دفعہ کھائی ہوں گی مگر جو لطف اُس دن آیا کبھی نہ آیا تھا۔ اُس دن سے دونوں وقت کھانا طشتت میں لگا کر دیوار پر سے پکڑا دیتی ہے۔ ہر چند کہتا رہتا ہوں کہ تم مجھے شرمندہ کرتی ہو بس اب میرے لئے کھانا نہ پکانا مگر وہ ایک نہیں سنتی اور ہمیشہ اچھے سے اچھا پکاتی ہے۔ آج کل وہ وہ چیزیں کھا رہا ہوں کہ تم نے اُن کے نام بھی نہ سُنے ہوں گے۔

چوتھا خط

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کس طرح سمجھاؤں کشمش کی طرف سے تمہارے خیالات اتنے برے کیوں ہو گئے۔ وہ اتنی بری نہیں جتنا کہ تم خیال کرتے ہو۔ اُسے مجھ سے محبت ضرور ہے اس کا میں بھی اعتراف کرتا ہوں مگر بے لوث محبت ہے اس کی تہ میں کوئی غرض یا مطلب پنہاں نہیں اور مطلب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ مالی حالت اُن کی مجھ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ میں پھر ایک کلرک ہی ہوں اور وہ نا جر۔ دو تین دن ہوئے اُس نے مجھے نہایت قیمتی فیروزہ کی ایک سنہری انگشتری دی ہے۔ کیونکہ میرے پاس کوئی ایسا قیمتی تحفہ اُسے دینے کو نہ تھا اس لئے میں نے لینے سے انکار کیا مگر اس نے ہر دلیل کی تردید کی اور مجھے وہ انگوٹھی قبول کرنی پڑی۔ اس کے ساتھ اُس نے ایک درخواست بھی کی۔ "جب آپ کی شادی ہو جائے تو یہ انگوٹھی میری طرف سے اپنی بیوی کو دے دینا"

میں نے کہا "ہرگز نہیں اسے تو میں ہر وقت اپنی انگلی میں رکھوں گا اور آنکھوں کے سامنے"۔ کہنے لگی "آپ کو اختیار ہے میں تو اپنی درخواست عرض کر چکی"۔

میں خود اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر ابھی کامیاب نہیں ہوا۔ اس کی باتیں ـــــ محبت بھری اور پیاری باتیں اس کا حسن سلوک اور اس کی محبت میرے لئے ایک معمّا ہے کبھی کبھی میں بدگمان ہو جاتا ہوں مگر پھر یہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ میرا دل بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

گئی جمعرات کا ذکر ہے کہ اُس نے کہا "تم مضمون لکھتے ہو"

"نہیں تو۔ کون کہتا ہے؟" میں نے کہا

"مکرتے کیوں ہو؟ تم نے خود مجھے اپنا افسانہ پڑھ کر سنایا تھا اور اس کے بعد میں نے تم سے جتنے رسالے مانگے ان سب میں تمہارے مضمون تھے"۔

"پھر تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں کیا چاہتی ہوں" اس وقت بتاؤں گی اگر تم یہ وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہوں اُسے ضرور پورا کرو گے"۔

میں نے وعدہ کر لیا تو بولی "تم مردوں کا کام کرتے ہو جس میں یا تو تمہاری ہی جنس کو فایدہ پہنچے یا بالکل فضول ہو۔ عورتوں کے لئے تم کچھ نہیں کرتے اور تمہارے خیال میں اس کی ضرورت بھی نہیں"۔

"کیوں عورتوں کے لئے میں کیا نہیں کر تا ـــــ تمہاری رائے میں مجھے اور کیا کرنا چاہئے؟"

"تم نے ابھی کیا ہی کیا ہے تعلیم ہی کو لیجئے سو میں شکل سے دس پڑھی ہوئی ہیں گی۔ تم نے کبھی اس کے متعلق قلم اٹھایا۔ ہماری صحت کا تم نے کیا خیال کیا۔ کیا ہماری تقدیر میں صرف یہ چار دیواریں ہی رہ گئی ہیں۔ جسے دیکھو وہی بیمار ہے۔ جسے دیکھو اُسی کا رنگ زرد ہے۔ تمہیں تمہارے دلچسپ مشغلے اس طرف توجہ کرنے ہی نہیں دیتے۔ تم ساری قوم کو کمزور اور جاہل بنا رہے ہو۔ بیمار اور ضعیف ماؤں کے بچے کہیں تندرست اور طاقت ور ہو سکتے ہیں اور ان پڑھ ماؤں کی اولاد بھی مہذب ہو سکتی ہے؟"

کچھ دیر کی پُرلطف بحث کے بعد میں نے مکرر وعدہ کیا کہ آئندہ جو کچھ لکھوں گا جنس لطیف کے مفاد کے لئے لکھوں گا۔ کشمش نے شکریہ ادا کیا۔

حیات میں تمہیں اتنے بڑے بڑے خط لکھتا ہوں اور تم مجھے شاہ آباد کی خاص خاص ہستیوں کے حالات سے بھی مطلع نہیں کرتے۔ تمہیں تو افسانہ سننے کی پڑی ہے اور یہ چاہتے ہو کہ ایک ہی دن میں ختم کر دیا جائے خیال تو کرو کہ میرے پاس کیا لکھا رکھا ہے جو اٹھا کر ڈاک میں ڈال دوں۔ جب کوئی بات ہوتی ہے تو میں تمہیں ضرور لکھتا ہوں۔

پانچواں خط

نہ جانے تمہاری تحریر میں یہ اثر کہاں سے آگیا۔ تم روز بروز میرے دل میں کشمش کی طرف سے زیادہ ہی زیادہ شبہ پیدا کر رہے ہو۔ جب تمہارا خط آتا ہے اُس وقت تو خاص طور پر میں اُسے "سراپا معصیت" سمجھنے لگتا ہوں لیکن پھر کشمش اپنی دلفریب باتوں اور بے غرض محبت سے حور سے زیادہ معصوم معلوم ہونے لگتی ہے۔

آج میں نے دفتر آنے سے پہلے ایک حماقت کی۔ اس سے کہا ایک بات پوچھوں اگر تم برا نہ مانو"

"پوچھو" اُس نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے جواب دیا مشوق سے پوچھو"۔

اور خبر نہیں کیوں ـــــ میں نے اُس سے سوال کیا "تم نے اب تک کتنوں سے محبت کی ہے؟"

"میں نے ـــــ اب تک ـــــ کتنوں سے ـــــ محبت کی ہے؟" اُس نے رُک رُک کر اور اٹک اٹک کر کہا۔ ذرا دیر سوچتی رہی۔ شاید سوال کی اہمیت پر غور کر رہی تھی اور پھر فوراً اپنے بیٹھ گئی۔ میں نے کچھ خیال نہ کیا اور دفتر چلا آیا۔

حیات تمہاری تحریر نے یہ گل کھلایا ہے۔ خدا جانے اس کا انجام کیا ہو۔ دفتر میں بیٹھا ہوں اور دل کشمش میں پڑا ہے۔ مجھے اس بات کا رنج ہے کہ میں نے اس کے دل کو صدمہ کیوں پہنچایا جب کہ وہ میرا اس قدر خیال کرتی ہے اور نہ مجھے ہر طرح سے آرام پہنچانے کی تدبیریں سوچتی رہتی ہے۔

میری بھی یہی دلی خواہش ہے کہ خدا شوکت کو کسی بڑے عہدے پر مامور کر دے۔ ان حضرات نے ناڈونت میں آنکھیں کھولیں، چاچو پکلوں میں پلے اور عیش و عشرت میں جوان ہوئے۔ اب یہ کوئی سخت کام نہیں کر سکتے۔ انہیں اُداس اُداس دیکھ کر میرا بھی دل کڑھتا ہے اور قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ابھی یہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوئے تھے کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھا لیا اور پھر اُن کی مفارقت کے زخم بھرنے نہ پائے تھے کہ والدہ کے لطف و کرم سے محروم کر دیا۔ ان ناقابل برداشت صدموں کی تلافی اُس وقت ہی ممکن ہے کہ انہیں کوئی اعلیٰ عہدہ مل جائے اور یہ پہلی سی بے فکری اور "فضول خرچی" سے زندگی بسر کرنے لگیں۔

چھٹا خط

غضب ہو گیا حیات! غضب ہو گیا۔ اب تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گا۔ اب تم اطمینان کا سانس لو گے۔ اس مرتبہ اور "روداد غم" پڑھ کر اس کے بعد میں تمہیں کچھ نہ لکھوں گا۔ یہ سب کچھ کیا دھرا تمہارا ہی ہے۔ نہ تم مجھے اکساتے نہ میں اس سے ایسا سوال کرتا اور نہ یہ سانحہ ـــــ یہ جانگداز سانحہ وقوع میں آتا۔

اُس روز شام کو دفتر سے واپس آیا تو کسی کو اپنا منتظر نہ پایا اور نہ جب میں آتا تھا تو ہمیشہ کھڑی انتظار کرتی ہوتی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اور صحن میں لوٹوں سے آواز پیدا کر کے پھرنے لگا۔ پھر یوں ہی کھانسنے لگا لیکن بے سود۔ دروازے کو کھٹکے سے بند کرتا اور پھر اُس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ کھولتا۔ اپنی آمد کی مختلف طریقوں سے اطلاع کرنے پر بھی کسی کی آواز سنائی نہ دی اور نہ کوئی دیوار پر سے جھانکا تو میں دبے پاؤں دیوار کے قریب گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ اُس طرف موت کی خاموشی طاری تھی۔ میں سہم گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ دوسری جانب دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ صحن میں جتنی چیزیں تھی سب بے قرینہ پڑی تھیں اور ہر شے سے رنج و غم برستا معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت مجھے سوال کی نوعیت کا خیال آیا اور میں خود کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ کرسی انگنائی میں نکال کر بیٹھ گیا۔ بیٹھ گیا اور غور کرنے لگا۔ غور کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچا کہ یا تو وہ آج ہی آجائے گی اور یا پھر اس مکان میں کبھی نہ آئے گی ـــــ بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا تو سیر کرنے چلا گیا۔ سیر میں بھی کچھ لطف نہ آیا لیکن میں بڑھا چلا گیا اور بڑی دیر بعد واپس آیا۔ آکر دیکھا اُن کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے کو خوب زور سے بند کیا اور صحن میں ادھر اُدھر پھرنے لگا۔ کشمش دیوار کے

قریب آئی نہ اُدھر ہی سے کوئی بات کی ٹہلتے ہوئے چار پانچ منٹ نہ گزرے تھے کہ آہستہ آہستہ رونے کی آواز آئی۔ میں ساکت و صامت دیوار سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا اُس کا شوہر کہہ رہا تھا "تمہیں ہوا کیا خود بخود کیوں رونے لگیں" اس نے کچھ جواب نہ دیا اور زیادہ شدت کے ساتھ رونے لگی۔ روتی رہی حتیٰ کہ سسکیاں بھرنے لگی اور روتے روتے بے ہوش ہو گئی شوہر کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ کیا کرے آخر لڑکی سے پوچھا "بیٹا آج یہاں کوئی تمہاری ننھیال سے آیا تھا تمہاری اماں کو کیا ہو گیا"

"صبح باوجی نے کچھ کہا تھا اس وقت سے رو رہی ہیں پھر ڈوبی میں ہم نانی اماں کے گئے تھے وہاں بھی روتی رہیں"

غریب لڑکی بھی پریشان ہو گئی تھی۔ پریشانی ہی میں اُس نے اپنی ماں کے بہت اہم راز کو افشا کر دیا تھا اور اسے معلوم بھی کیا تھا کہ یہ بات کہنے سے کیا ہو گا۔

"کون باوجی" ابا نے پوچھا

"یہ جو اس طرف رہتے ہیں"

"تمہاری اماں اُن سے باتیں کرتی ہیں؟"

"ہاں ——— نہیں کرتی" لڑکی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے کشش کا خیال تھا کہ غریب پر کیسی مصیبت آئی۔ میرا کیا تھا مجھے رہ کیا سکتا تھا اور زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ یہ سب کچھ میری بے وقوفی سے ہوا تھا نہ میں اس سے وہ سوال کرتا نہ واقعات یہ صورت اختیار کرتے۔ آ کر کمرے میں لیٹ گیا۔ کچھ دیر میں دوبارہ سسکیوں کی آواز آئی۔ پھر باہر جا کر دیوار کے قریب بیٹھ گیا۔ جتنا زیادہ واقعات کی اہمیت پر غور کرتا تھا اتنا ہی دل کو رنج پہنچتا تھا۔ بارہ بجے تک یہی حالت رہی کبھی رونے کی آواز آتی اور کبھی سناٹا چھا جاتا۔ بارہ بجے کے بعد قطعی خاموشی ہو گئی۔ شاید وہ سو گئے تھے لیکن حیات اس رات میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا۔ ساری رات قرآن کی تلاوت کرتا رہا۔

خیال تھا کہ صبح کو ملاقات ہو گی تو معافی مانگ لوں گا لیکن اُس کا خاوند اُس روز دُکان پر نہ گیا میں بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ وہ جائے تو کشمش سے بات کروں۔ آخر بوتے دس بج گئے اور مجھے دفتر جانا پڑا۔ رات کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا گو سخت بھوک لگ رہی تھی لیکن میں نے اُس وقت بھی کچھ نہ کھایا۔

دفتر کے کام میں رنج میں اور شام کی ملاقات کی اُمید میں دن تمام ہو گیا۔ اس بات کا خاص طور پر صدمہ تھا کہ میری وجہ سے کسی کو کیوں رنج پہنچا۔ چار بجے سے پہلے ہی ہیڈ کلرک سے اجازت لے کر چل پڑا۔ گھر پہنچا تو پھر دیوار کو خالی پایا۔ انگنائی میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا آج اُس نے قطعی دُکان نہیں کھولی ورنہ کشمش رکنے والی نہ تھی۔ کئی دفعہ جی میں آیا کہ لڑکی کو آوازدوں پھر اُس کے والد کے خوف سے چپ ہو رہا کہ جو کچھ رات لڑکی نے کہا تھا اُس کا اُسے بالکل یقین آ جائے گا۔ انتظار کرتے کرتے خاصی دیر ہو گئی لیکن ادھر سے کوئی آواز نہ آئی نہ بات کرنے کی نہ بچوں کے بولنے کی اور نہ کسی کے چلنے پھرنے کی۔ مجھے بڑی فکر ہوئی۔ دبے پاؤں دیوار کے نیچے گیا اور آہستہ آہستہ سر اوپر اٹھانے لگا۔ دوسری طرف جھانکنے لگتا کہ پھر سر نیچا کر لیتا۔ آخر ایک مرتبہ دل کڑا کر کے دوسری جانب دیکھ ہی تو لیا ——— کیا دیکھا؟ الم میں اس کے بیان کرنے کی طاقت نہیں۔ پہلی بار مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ دوبارہ دیکھا ——— کمرے کے سارے دروازے چوپٹ کھلے تھے اور وہاں نہ کشمش تھی نہ کشش تھی کوئی کی کوئی چیز ———

حیات یقین مانو کہ مجھے اُس سے عشق نہ تھا لیکن اُن کے ایسی طرح چلے جانے پر میرے دل کو بے انتہا صدمہ پہنچا اور میں بغیر کسی خاص ارادے کے جنگل کی طرف چلا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ کب واپس ہوا۔ صبح کو جب آنکھ کھلی تو اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں کشمش کے لئے سوگوار ہوں اور یہ بھی یقین ہے کہ زندگی میں اُس سے زیادہ خوبصورت، اس سے زیادہ حسین، اس سے زیادہ دلکش عورتوں سے پالا پڑے گا لیکن اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی سینے میں بیٹھا کلیجہ مسل رہا ہے۔ گو مجھے اُس سے معافی مانگنی نصیب نہیں ہوئی لیکن میں اپنی خطا پر سخت پشیمان ہوں۔ آسمان چاند تارے، زمین پتھر، چٹانیں، گھاس اور درخت سب گواہ ہیں میں پشیمان ہوں اور ان سب نے مجھے اپنی غلطی پر آنسو بہاتے دیکھا ہے۔

ساتواں خط

تم اپنے آپ کو بے خطا ثابت کرنا چاہتے ہو لیکن نہیں کر سکتے تم ہزار ثبوت پیش کرو مگر میں ایک نہ مانوں گا۔ تم نے صرف مجھے ہی نہیں ہرکایا بلکہ کشمش کے دل پر بھی ایسا چرکا لگایا ہے کہ جیتے جی تمہیں دعائیں دے گی اب معافی مانگنے سے کیا ہوتا ہو جو ہو چکا، ہو چکا مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ تم نے اچھا نہیں کیا۔

تم مجھے میرے کرتے پر موکہ خط لکھتا رہوں اور یہ داستان جواب حد درجہ ناگوار ہو گئی ہے سناتا رہوں۔ حیات اگر داستان سننی تھی تو کشمش کو خط کیوں لکھا تھا۔ تم تو مجھے اس کے پنجے سے نکالنا چاہتے

تھے۔ لیکن میں تو اور گرفتار ہو گیا۔

دوسرے دن دفتر جانے سے پہلے میں نے اس طرف پھر دیکھا دیوار پر ایک نئی اینٹ رکھی تھی۔ میں نے اُسے اٹھا لیا۔ اُس کے نیچے سے ایک پرچہ ملا۔ یہ کشمش کا خط تھا اور اس کے ساتھ تمہارا خط تھا۔ اب میں اس کے رونے اور بے قرار ہونے کا سبب سمجھا۔ بھلا تم نے جھوٹ بول کر کیا لیا۔ خدا تمہیں اس "نیک کام" کا اجر دے۔

اب پھر وہ زمانہ آ گیا ہے کہ زندگی میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ دفتر جاتا ہوں تو وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے گھر آتا ہوں تو در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ اسی وحشت میں قدسیہ باغ یا کسی دوسری سیر گاہ میں چلا جاتا ہوں مگر وہاں وحشت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ نوجوان مرد خوبصورت اور حسین عورتوں کو بغل میں لئے سرگشت کرتے نظر آتے ہیں ایسی خوبصورت اور حسین عورتوں کو جن پر ایک دفعہ نظر پڑنے کے بعد انسان متاعِ زہد و اتقا کھو بیٹھتا ہے۔

جی چاہتا ہے کہ میں بھی کسی رشکِ حور کو ساتھ لے کر ان باغوں کی سیر کروں۔ ان خوشنما روشوں پر اکڑا اکڑا کر چلوں اور ہر بے عورت کے مرد کو حقارت کی نظر سے دیکھوں۔ علاوہ ازیں جب کسی حسین عورت کو بدصورت مرد کے پہلو میں دیکھتا ہوں تو دل کو ناقابلِ بیان تکلیف محسوس ہوتی ہے، جنون کا دورہ زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور میں واپس بھاگ آتا ہوں۔

حیات دما کرو کہ خدا اس زندگی کا جلد خاتمہ کر دے۔ پہلے اور اب کے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ گو پہلے بھی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اُس وقت میں یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں دلچسپی ہے ہی نہیں اور اب یہ یقین ہو گیا ہے کہ ہے تو سہی لیکن میری دسترس سے باہر ہے۔

آٹھواں خط

آج کل غم بہت ہلکا ہے کبھی کبھی کشمش کی میٹھی میٹھی باتیں یاد آ جاتی ہیں اور میں غمگین ہو جاتا ہوں مگر اختر اپنی مضحکہ خیز باتوں اور حرکتوں سے پھر ہنسا دیتا ہے۔ وہ میرے دل سے کشمش کو بالکل محو کر دینا چاہتا ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہو گیا ہے۔ شاید تم اختر کو بھول گئے ہو۔ یہ وہی اختر ہے جو دوسرے تیسرے ہمارے کمرے میں آ جاتا تھا اور گھنٹوں اپنی بکواس سے میرا اور تمہارا دماغ کھایا کرتا تھا تم اکثر اس کی گفتگو سے اکتا کر باہر چلے جاتے تھے لیکن میں اس کا جی میلا نہ کرتا تھا اور اُس کے پاس بیٹھا دلچسپی سے باتیں سنتا رہتا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد یہ ولایت چلا گیا تھا دو تین ہوئے انجنیئری کی سند لے کر آیا ہے۔ اب یہ پہلا سا اختر نہیں رہا۔ بڑی عقلمندی کی باتیں کرتا ہے۔ بڑے بڑے جالاکوں کے کان کترتا ہے ہفتہ سے میرے یہاں قیم ہے۔ اتفاقیہ سینما گھر میں مل گیا تھا میں نے تو پہچانا بھی نہ تھا کیونکہ اس کی اب کی اور پہلی شکل و صورت میں بہت فرق ہے اور لباس میں بھی۔ تماشہ ختم ہو جانے کے بعد میں اس کا سامان ہوٹل سے اپنے یہاں اٹھوا لایا تھا۔ ساری رات اُس نے ولایت کی باتیں کہیں۔ صبح کو میں کچھ رنجیدہ سا تھا۔ اُس نے وجہ پوچھی اور میں نے بے کم و کاست سارا "افسانہ" سنا دیا۔ دیوار کو دیکھ کر کہنے لگا اسی میں گہنی در دازہ لگا دوں میں نے کہا "نہیں اب کیا ضرورت ہے"؟ کہنے لگا "اب کیا یہ خالی ہی پڑا رہے گا"۔

"تو کیا جو بھی اس مکان میں آ کر آباد ہو گا وہ مجھ سے محبت ضرور کرے گا" میں نے پوچھا

"ہاں ضرور کرے گا۔ تم اسی قابل ہو کہ تم سے ہر ایک محبت کرے اگر تم ولایت جاتے تو دیکھ لیتے کہ تم پر کتنی پریاں عاشق ہوتیں اور تمہیں یہ ساری پارسائی اور زہد طاق میں رکھنا پڑتا" وہ بہکتا رہا۔

اسی دن شام کو اُس نے اپنے پاس سے ایک قسم کا تیزاب سا پانی میں ملا کر پچکاری کے ذریعہ دور کھڑے ہو کر ننھی سی دیوار پر چھڑک دیا۔ دس گیارہ بجے تک دیوار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ میں ہنسنے لگا۔ "اختر تم مجھے بناتے ہو بھلا دیوار پر اس پانی سے کیا اثر ہوتا۔

"صبح کو دیکھنا" اُس نے یقین اور اطمینان کے ساتھ کہا۔

دوسرے روز علی الصبح میں شوق میں اٹھ بیٹھا۔ اُٹھتے ہی باہر آیا تو دیوار غائب تھی۔ مجھے یقین نہ آیا۔ اسے میں نظر کا دھوکا سمجھا۔ آنکھیں ملیں پھر دیکھا دیوار ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔ قصہ مختصر اختر نے اُس میں کہ اینٹوں سے ایسا دروازہ لگایا ہے کہ بالکل پتہ نہیں چلتا۔ بیچ دار ایک کھونٹی ہے۔ اس میں بٹن لگا ہے۔ بٹن کو دبانے سے دروازہ کھل جاتا ہے اور کمال یہ ہے ذرا بھی آواز پیدا نہیں ہوتی۔ یہ کہانیاں وہ اپنے ساتھ ولایت سے لایا تھا۔ کہتا ہے کہ یہ ایجاد ابھی ہندوستان نہیں پہنچی۔ اس سے ترکیب پوچھ لوں گا تاکہ جب کبھی مکان چھوڑنا پڑے تو کہانیاں ساتھ لے جا سکوں

اختر آج کل میں جانے والا ہے گو نہ میرا جی چاہتا ہے اور نہ اس کا کہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے۔ لیکن مجبوری ہے۔ ملازمت کا تار آ گیا ہے۔ میں اُسے روک نہیں سکتا۔

نواں خط

تین چار ہفتوں سے پھر میں نے تمہیں خط نہیں لکھا۔ تمہارا خیال غلط ہے میں ناراض نہیں۔ معافی کس بات کی مانگتے ہو جو ہونا تھا ہو چکا۔ مجھے اس بات کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں۔ میں تو تقریباً بھول چکا ہوں تمہیں نے یاد دلایا ہی خط نہ لکھنے کی وجہ وہی پہلی سی مصروفیت ہے اور کچھ نہیں۔ پندرہ بیس دن ہوئے یہ مکان آباد ہو گیا ہے اور خدا نے کشش کا ایسا نعم البدل عطا فرمایا ہے کہ الفاظ میں تعریف کرنا ناممکن ہے۔

ایک سارٹر صاحب تشریف لائے ہیں۔ شاید سارٹر کا مطلب تم اچھی طرح نہ سمجھ سکو۔ ڈاک خانے کی ایک شاخ "ریوے میل سروس" ہے۔ سارٹر اُس کے کلرک ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ اسٹیشنوں کے دفتروں میں کام کرتے ہیں اور باقی باہر جاتے ہیں۔ مختلف ڈاک گاڑیوں میں اور مختلف اطراف میں۔ غریبوں کی کیا زندگی ہے آج یہاں کل وہاں۔ یہ سارٹر صاحب بھی لاہور جاتے ہیں۔ تین دن یہاں رہتے ہیں دو دن لاہور تیس راتوں میں بارہ سفر میں کٹتی ہیں بارہ دہلی میں اور چھ لاہور میں بے چارے کو پیٹ کی خاطر کیسی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ ساری عمر کی کمائی ایک لڑکی ہے جو دسویں جماعت میں تعلیم پاتی ہے اور بیوی دائم المرض ہے۔

جب یہ پہلے دن مکان میں آئے تو معمولی علیک سلیک ہو گئی تھی۔ کیا خبر تھی کہ یہ ذرا سی ملاقات بڑی کارآمد ثابت ہو گی۔ کئی روز تک یہ نظر نہ آئے۔ میں نے بھی کچھ پروا نہ کی۔ ایک دن تمہیں خط لکھنے بیٹھا تو حضرت آنازل ہوئے۔ دو تین سطریں ہی لکھنے پایا تھا کہ قلم اٹھا کر رکھ دیا اور باتوں میں مشغول ہو گیا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے اپنی مصیبتوں کا ذکر شروع کر دیا کہ باوجود ہزاروں دواؤں کے استعمال کے ہنوز اولاد نرینہ سے محروم ہیں۔ چار لڑکیاں ضائع ہو چکیں۔ پھر کہنے لگے بیوی ہے وہ ہمیشہ کی بیمار۔ لڑکی اسکول میں پڑھتی ہے ایک جان کیا کیا کام کرے۔ گھر کے کام کاج کے لئے کوئی خادمہ مل جاتی تو اچھا تھا۔

"لڑکی کونسی جماعت میں ہے؟" میں نے اور باتوں کو قطع نظر کرتے ہوئے پوچھا۔

"دسویں میں"

"اتنی زیادہ تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ پھر ایسے حالات میں اُسے اسکول سے اٹھا لینا مناسب ہوتا۔"

"میری تو یہی مرضی تھی مگر وہ کہنے لگی ابا ایک برس رہ گیا ہے کم از کم انٹرنس تو کر لوں۔"

مجھے وہ عہد یاد آ گیا جو میں نے دو تین مہینے پہلے کشش سے کیا تھا۔ اس لئے تعلیم دلانے کے خلاف اور کچھ نہ کہا۔

"خادمہ تو کوئی نظر میں ہے نہیں البتہ ایک لڑکا ہے جو بہت اچھا کھانا پکانا جانتا ہے اور ہے بھی ہوشیار سمجھ دار۔"

"کس عمر کا ہے؟"

"یہی کوئی بارہ تیرہ برس کا ہے۔"

"کہاں ہے پھر اُسی (اُسے ہی) بلا دو"

"بہت اچھا اس مرتبہ جب آپ لاہور سے تشریف لائیں گے تو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔"

وہ تو چلے گئے تو میں نے فوراً رشید کو خط لکھ دیا۔ اُس کے دو تین خط آ چکے تھے جن میں لکھا تھا کہ اب میں بالکل اچھا ہوں کسی جگہ کوئی نوکری ہو تو مہربانی کر کے بلا بھیجئے۔ اُس کا خیال تھا کہ میں نے اس کی جگہ دوسرا ملازم رکھ لیا ہے ورنہ خط لکھوانے کی بجائے وہ خود کبھی کا آ چکا ہوتا۔

رشید تو تیار ہی بیٹھا تھا۔ خط ملتے ہی فوراً آ گیا۔ پھر سارٹر صاحب نے ایک اور فرمائش کی کہ میں بازار میں کھانا نہ کھایا کروں بلکہ دونوں وقت اُن کے یہاں سے آ جایا کرے گا۔ بہت سے عذر پیش کئے مگر ان کے لئے ایک بھی قبول کئے جانے کے قابل نہ تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ اتنے مصر کیوں ہیں۔ خیال کیا کہ شاید ان کی لڑکی نے کہا ہو کیونکہ مجھے وہ تین چار دفعہ لگی میں مدرسے سے آتے جاتے مل چکی تھی اور شاید ایک دفعہ کھانا لاتے بھی دیکھ لیا تھا لیکن پھر سوچنے لگا کہ اُس نے تو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

مجھے اُن کی یہ فرمائش منظور کرتے ہی بن پڑی۔ رات بھر سوچتا رہا کہ ان کی لڑکی جوان ہے اور بیاہ دینے کے قابل۔ شاید ان حضرت کی نظرِ انتخاب مجھ غریب پر ہی پڑی ہے۔ انہیں مجھ میں کیا خوبی نظر آئی بظاہر

تو کوئی خوبی ہے نہیں اور برائی بھی کیا ہے خود بخود یہ خیال بھی عین اس وقت دماغ میں آ گیا جب کہ پہلی بات سوچ رہا تھا اور میں اپنے دل ہی دل میں شادی کے متعلق فیصلہ کرنے لگا کہ والدین کی رضامندی کے بغیر ہرگز سر شادی نہ کروں گا۔ دسویں جماعت تک پڑھی لکھی لڑکی کو تو کبھی دلھن نہ بناؤں گا۔ اس کے علاوہ بے پردہ بھی تو ہے۔ اسے تو والدہ محسن میں قدم بھی نہ رکھنے دیں گی۔ پھر مجھے اس کے خوبصورت خط و خال یاد آ گئے اور اس کی مستانہ چال ——— اور میں نے محسوس کیا کہ اوپر کے فیصلہ میں ضرور ترمیم ہونی چاہیئے۔

اس واقعہ کے چوتھے دن یہ عقدہ کھلا۔ سارٹر صاحب فرمانے لگے کہ لڑکی کو یونیورسٹی کا امتحان دینا ہے پچھلے دنوں وہ دو مہینے بیمار بھی رہ چکی ہے اور والدہ کی بیماری نے بھی اُسے اسکول کا کام نہیں کرنے دیا۔ کوئی بھلا مانس اور شریف استاد دل جانا تو کمی پوری کرا دیتا۔ جی میں آتا ہے اشتہار دے دوں پھر خیال آتا ہے کہ اس طرح بھلے بُرے میں تمیز نہ ہو سکے گی"۔

میں کہنے ہی لگا تھا کہ "میں حاضر ہوں" لیکن یکایک بجلی کی تیزی کے ساتھ یہ خیال آیا کہ میں بھلا مانس اور شریف بھی ہوں" اور لفظ زبان پر آتے آتے رہ گئے۔ آخر انہوں نے خود ہی کہا "اگر آپ یہ تکلیف کریں تو میں آپ کی ہر خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں اور یہ احسان آپ کا ہم تینوں پر ہوگا"

مجھے محسوس ہوا کہ کوئی خزانہ مل گیا ہے۔ میں نے کہا "نہیں صاحب احسان کس بات کا ہے۔ میں تو آپ کا خادم ہوں جو حکم دیں بسر و چشم حاضر ہوں"۔

کوئی چار دن سے میں نے اُسے پڑھانا شروع کیا ہے غضب کی ذہین لڑکی ہے جو بتاتا ہوں فوراً یاد کر لیتی ہے۔ اس کے باپ کو غلط فہمی ہوئی یہ تو بغیر پہیری مدد کے بھی بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتی۔

کل سے ہم کھانا بھی ایک ساتھ کھا رہے ہیں۔ اس کا علم عرف رشید کو ہے۔ سارٹر صاحب لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ماں غریب منہ سر لپیٹے پڑی رہتی ہے۔ وہ اسلیم اور بے پردگی کے بہت خلاف ہے مگر شوہر دم مارنے نہیں دیتا۔ ابھی میں نے چور دروازے کا راز اُسے نہیں بتایا۔ چار پانچ دن میں امتحان کی تیاری کی چھٹیاں ہونے والی ہیں میں بھی ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھیج کر چھٹی لے لوں گا۔

حیات اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ حسین بھی ہے تعلیم یافتہ بھی ہے۔ ہارمونیم اور پیانو پر اردو انگریزی کے گیت گا لیتی ہے۔ لیکن دل اس سے شادی کرنے کو نہیں مانتا۔ گو روز بروز مجھے اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ محبت ہوتی جاتی ہے لیکن پھر بھی یقین ہے کہ شادی کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوں گا خواہ اس کا انجام کیسا خوفناک کیوں نہ ہو۔

دسواں خط

دو دن سے چھٹی ہے رکھی ہے۔ بڑے لطف سے کٹ رہی ہے اس کی بھی چھٹیاں ہیں۔ ہم ایک ساتھ سیر کو جاتے ہیں۔ وہ بھی مردانہ لباس میں ملبوس ہوتی ہے۔ ان کے اسکول میں ایک تمثیل کی گئی تھی جس میں شہزادہ کا پارٹ اُس نے کیا تھا۔ اس کی دو پوشاکیں اس کے پاس موجود ہیں۔ مردانہ بھیس میں ایسی دلکش معلوم ہوتی ہے کہ کیا کہوں۔ میں بھی رجس پہن کر اور دوپٹہ باندھ کر سیر کو جاتا ہوں۔ لوگ اُسے دیکھ کر بے حجاب ہو جاتے ہیں بہت سے کمینے کبھی کبھی کچھ بک دیتے ہیں تو اُسے بہت ناگوار گزرتا ہے ایک اور مزے کی بات سنو جب یہ بات کرتی تھی تو اُسے یاد نہ رہتا تھا کہ میں مرد بنی ہوئی ہوں صیغہ مذکر استعمال کرنا چاہیئے۔ وہی مونث صیغہ "میں گئی" "میں بولی" زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ اسے دور کرنے کے لئے میں نے اس سے کہا کہ انگریزی میں بات چیت کیا کرو۔

پرسوں پہلی مرتبہ میں نے چور دروازے کو استعمال کیا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ اس کے خیال میں ایسے مکان میں بیسویں صدی کی یہ ایجاد ہونا حیرت انگیز ہے۔ کل وہ اپنی ایک سہیلی کو جو حسن و صورت کے اعتبار سے اس سے ذرا کم نہیں دروازہ دکھانے لائی تھی۔ میرا بھی استاد کی حیثیت سے تعارف کرایا تھا۔ سہیلی تعریف کرتے کرتے مذاق پر اتر آئی لیکن اس دروازے کی یہاں کیا ضرورت ہے"۔ شاگرد سوچنے لگی کہ کیا جواب دے۔ آخر استاد کو بولنا پڑا "یہ کہانیاں فالتو رکھی تھیں۔ اس دیوار میں لگا دیں گے چلو نمائش ہی رہے گی۔ یار دوستوں کو دکھا کر تعریف ہی سنا کریں گے"۔

حیات تم اس کا نام کیوں پوچھتے ہو؟ کیا اسے بھی خط لکھو گے؟ ارے ہے۔ دوست! اب ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ میں نے اس کا نام گلاب تجویز کیا ہے کیونکہ اس کے رخسار گلاب کی طرح کھلے رہتے ہیں اور نزاکت میں بھی کسی طرح گلاب سے کم نہیں۔ یہ تو جستجو سے کوشش سے بالآخر میں نے آخر تمہارے کامل دوست کو اس نے اپنا راز داں بنا لیا ہے اور طالب علمی کے دو وہ تجربے بیان کئے ہیں کہ اگر میں انہیں کسی اخبار یا رسالہ میں شائع کرا دوں تو نوے فی صدی آدمی تعلیم

نسواں کے خلاف ہو جائیں کم از کم موجودہ طرزِ تعلیم کو تو کوئی بھی پسند نہ کرے میرے دل میں اس کی قدر ہے بھی اور نہیں بھی۔ جب اس کی خوبیوں پر نظر جاتی ہے تو یہ حور سے بھی بہتر معلوم ہوتی ہے اور جب عیبوں کو دیکھتا ہوں تو ــــــ

آج کی بات ہے گلاب کہنے لگی

"ایک بات پوچھوں اگر آپ سچ سچ بتائیں"

"پوچھو" میں نے کہا لیکن وہ چپ رہی "پوچھو" میں نے پُر اشتیاق لہجے میں کہا "چپ کیوں ہو گئیں"۔

"آپ ایک ہیں یا دو ہو چکے؟" اس نے دریافت کیا

اب خاموش ہونے کا میرا نمبر تھا۔ وہ ایک منٹ جواب کا انتظار کر کے بولی

"میں کیا پوچھ رہی ہوں آپ ایک ہیں یا دو ہو چکے"

میں جھوٹ بولنا نہ چاہتا تھا اس لئے میں نے کہا

"اس کا جواب کل دوں گا"

"جو بات ہے آپ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے اس کا تو یہ مطلب ہے کہ آپ کو سچ بولنے میں تامل ہے"

ٹھیک اس وقت گلاب کے والد آ گئے اور میں اُسے سبق پڑھانے میں مصروف ہو گیا۔

حیات اگر تم تیار ہو تو میں اسے اور اس کے باپ کو تو راضی کر لوں گا۔ یہ یاد رہے کہ کسی سے پردہ نہیں کرتی اور دسویں جماعت میں پڑھتی ہے۔

گیارھواں خط

گلاب چھ روز سے بیمار ہے۔ سردی لگی تھی اس سے بخار ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ پروا نہ کی پھر نمونیہ ہو گیا۔ اس کے والد کی ڈیوٹی تبدیل ہو گئی ہے۔ پرسوں راولپنڈی گئے ہیں تین دن میں واپس آئیں گے۔ جب وہ جانے لگے تو گلاب کو معمولی سی حرارت تھی۔ یہ خبر نہ تھی کہ یہ معمولی سی حرارت خطرناک بخار اور نمونیہ کی صورت اختیار کرے گی جس رات کو وہ گئے اسی رات کو گلاب کو بہت زور کا بخار چڑھ آیا اور سینے میں درد ہونے لگا۔ میں اپنے کمرے میں بے خبر سو رہا تھا کہ اس کی والدہ نے دیوار میں اینٹیں مار مار کر جگا دیا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور اُن سے پوچھنے پر گلاب کی حالت معلوم ہوئی۔ گھبراہٹ ہی میں میں نے خفیہ دروازہ کھول لیا۔ مجھے اس بات کا قطعی خیال نہ آیا کہ گلاب کی والدہ کو ابھی تک اس دروازے کا حال معلوم نہیں اور جلدی میں اُسے کھلا ہی چھوڑ گیا۔ اس کی والدہ نے پوچھا "کہاں سے آ گئے۔ دیوار پر سے؟"

"ہاں"

"کودنے کی آواز تو آئی نہیں" وہ بولیں۔

اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں چپ رہ گیا۔ مگر انہوں نے زیادہ خیال نہ کیا کیونکہ لڑکی کی وجہ سے پریشان ہو رہی تھیں۔ میں نے نبض دیکھی۔ اُس پر نیم غشی طاری تھی سمجھ میں نہ آیا کیا کروں "بے وقت اور پھر کسی ڈاکٹر کا گھر معلوم نہیں۔ ہسپتال بہت دور ہے"۔ میں سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے دروازے کا بٹن دبا دیا۔ کپڑے پہنتے ہوئے یہی فکر رہا کہ کونسے ڈاکٹر کو بلا کر لاؤں۔ آخر زینہ میں ہو کر ان کے یہاں گیا اُس کی والدہ نے کنڈی کھولی اور میں انہیں تسلی دے کر چلا گیا۔ ڈاکٹروں کی دو تین دکانوں پر آوازیں دیں مگر بے سود میں نامراد واپس آنے ہی لگا تھا کہ ایک سپاہی نے ڈاکٹر کا گھر بتایا۔ اس کے یہاں گیا بڑی دیر میں تیار ہو کر آیا اور کہنے لگا "آٹھ روپے فیس ہو گی"۔

"آپ چلئے تو سہی فیس بھی لے لیجئے گا"

"میں اُسے لے کر گھر آیا"

گلاب کا بخار اب اور بھی زیادہ ترقی کر گیا تھا اور اُس پر مکمل بیہوشی طاری تھی۔ انہوں نے مقیاس الحرارت سے بخار کا درجہ معلوم کیا اور کہا "بہت خطرناک حالت ہے اگر آج رات آرام سے گزر گئی تو خیر ورنہ ــــــ"

"ورنہ کیا" میں نے جلدی سے دریافت کیا

"ورنہ زندگی کا خطرہ ہے"۔

"زندگی کا خطرہ ہے" میرے منہ سے بے اختیار یہ لفظ نکل گئے۔

میں اُس کے ساتھ ہی گیا اور دوا لے آیا۔ فیس میں نے اپنے پاس سے دے دی اور گلاب کی والدہ سے کہہ دیا یہ میرا دوست ہے فیس ویس کچھ نہ لے گا۔ دوا کی قیمت اس نے کچھ نہ لی تھی۔ ایک ایک

گھنٹے کے بعد دوا کیں دینی تھیں۔ میں اُس کے پلنگ کے نزدیک کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔ انگیٹھی میں کوئلے سلگا لئے اور اُس کی والدہ سے کہا "آپ اس کے سینے میں دوا کی مالش کر کے آرام کریں۔ میں جاگتا رہوں گا فکر کی بات نہیں"۔ وہ غریب چاہتی تو یہ تھی کہ بیٹی کے پاس بیٹھی رہے مگر کھانسی کا دورہ اُٹھنے لگا اور مجبور ہو کر لیٹ گئی۔ میں نے اُسے جب دوا کی دوسری خوراک دی تو اُس نے آنکھیں کھولیں ——— میں نے کہا "کیسی طبیعت ہے گلاب" وہ مجھے تکتی رہی مایوسی اور حسرت کے ساتھ اور پھر اُس نے کروٹ لے لی۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ حیات میں سمجھتا تھا کہ میں گلاب سے یوں ہی دل بہلا لیتا ہوں مجھے اس سے محبت نہیں ہے مگر کل رات پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل میں اُس کی محبت موجود ہے ——— بے انتہا محبت اس کی بیماری سے میرا دل بہت بے چین تھا۔ سارے کمرے میں سکوت نے تسلط کر رکھا تھا۔ ایک ٹائم پیس کے چلنے کی آواز متواتر آ رہی تھی یا کبھی کبھی مجھے اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا سنائی دے جاتی تھی میں نے دہکتے ہوئے کوئلوں سے بھری ہوئی انگیٹھی کو دیکھا اور سہم گیا کچھ دیر پہلے کوئلے سرد تھے پھر سلگنے لگے آخر سارے دہک گئے اب کچھ دیر میں خاک ہو جائیں گے۔ یہی حالت دنیا کی ہے۔ دنیا ایک انگیٹھی کے مانند ہے اور ہم سب انسان کوئلے ہیں جلتے ہیں اور جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ دنیا ویسی کی ویسی رہتی ہے۔ جب میرا دل زیادہ گھبرایا تو میں صحن میں نکل کر ٹہلنے لگا۔ چاند نکل چکا تھا۔ ہر چیز چاندنی کے سمندر میں نہائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بڑا دلفریب منظر تھا ہر طرف سکوت، ہر طرف چاندنی ——— مگر مجھے یہ سکوت اور یہ چاندنی ایک ڈائن معلوم ہوئی جو میری گلاب کو کھانے آئی تھی میں پھر کمرے میں آ کر گلاب کے سرہانے بیٹھ گیا اور اُس کے مرجھائے ہوئے زرد گالوں کو دیکھنے لگا۔ گیسو پریشان ہو کر رخساروں پر آ گئے تھے۔ تین منٹ مسلسل نہ دیکھ سکا۔ میرا جی بھر آیا۔ اُس نے پھر کروٹ بدلی۔ میں نے کہا "گلاب! گلاب!!"۔ وہ بے ہوش تھی اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی پیشانی پر اپنا رخسار رکھ دیا ——— میں بے بس تھا۔ ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں رو رہا تھا آہ ——— اس کی پیشانی دہکتے ہوئے کوئلوں سے زیادہ گرم تھی اور سرخ۔ شاید میرے آنسوؤں کی نمی کا احساس اُسے ہوش میں لے آیا۔ اُس نے بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں کھولیں اور نازک نازک لبوں کو حرکت دی

"لطف صاحب! ابا جی کو تار دے دیا؟" میں نے کہا نہیں۔ مگر اُس نے میرا جواب نہیں سنا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

عزمکہ میں ساری رات اُس کے قریب بیٹھا رہا۔ علی الصبح پھر ڈاکٹر کے پاس گیا اور حالت بیان کی۔ وہ کمبخت کہنے لگا "اگر اچھے معلوم نہیں ہوتے" کیا مطلب ——— "میں بمشکل یہ الفاظ ادا کر سکا۔

"مریضہ کی حالت خطرناک ہے اور زندگی کی کوئی امید نہیں" اس نے کہا

میں نے سوچا یہ ڈاکٹر کام کا نہیں۔ اسے تو تیمارداروں کی تسلی بھی کرنی نہیں آتی حالانکہ اُس نے صاف صاف بات کہہ دی تھی۔ دوسرے ڈاکٹر کو لا کر دکھایا۔ اُس کی دوا سے بھی کچھ فایدہ نہ ہوا۔

آج تمام دن انتہائی پریشانی میں بسر ہوا۔ یہ خط بھی اُس کے قریب بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ دوسرے ڈاکٹر نے بھی جواب دے دیا ہے۔ آنکھیں روتے روتے خشک ہو گئی ہیں اب ان میں آنسو نہیں رہے۔ جی گھبرا رہا تھا تمہیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ خبر نہیں جلدی اور رنج میں کیا کیا لکھا گیا۔ حیات دعا کرو کہ خدا گلاب کو صحت عطا کر دے لیکن وہ تو آپ کی دعا سے پہلے ہی اسی قسم کی دعاؤں سے بے نیاز ہو چکے گی۔ آہ۔ خدا نہ کرے اگر ایسا ہو گیا تو میں کیونکر زندہ رہوں گا ——— حیات! گلاب کے بغیر میں زندگی کا "بارِ گراں" نہ اٹھا سکوں گا۔

بارھواں خط

اس مرتبہ تم نے خط کا جواب خلافِ معمول بہت جلد دے دیا لیکن میں حسبِ معمول "تاخیر سے لکھ رہا ہوں۔ تمہاری دعاؤں کا شکریہ نہ زبان سے ادا ہو سکتا ہے نہ قلم سے۔ تمہاری دعاؤں ہی کی بدولت گلاب کی جان بچ گئی ورنہ بیماری کا حملہ بہت مایوس کُن تھا اور ہم سب اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔

کئی روز سے خط لکھنے کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن بے وجہ دیر ہوتی رہی اور اب تین چار دن سے ایک "الجھن" نے پریشان کر رکھا ہے ہزار سر پھاتا ہوں، دماغ پر لاکھ زور دیتا ہوں مگر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ بالکل مجبور ہوں اور بے بس۔ آپ سے "رازِ دل" بیان کرتا ہوں شاید آپ اس معاملے میں میری کچھ مدد کر سکیں۔

پرسوں جب میں دفتر سے آیا تو رشید نے مجھے ایک لفافہ دیا جس پر گلاب کے والد کا ہنستا ہوا تحریر تھا اور بولا "یہ بی بی جی دے گئی ہیں"۔

"وہ خود کہاں ہیں" میں نے لفافہ لیتے ہوئے کہا

"نہیں صاب" رشید کہہ کر چلا گیا۔

میں نے لفافے میں سے خط نکال کر پڑھا۔ یہ گلاب کے کسی رشتہ دار حضرت کا خط تھا۔ انہوں نے تحریر فرمایا تھا "دو خط لکھ چکے آپ نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ اگر آپ نے اس خط کا جواب بھی ایک ہفتے کے اندر اندر نہ لکھا تو ہم آئندہ رضوان کے رشتے کے لئے آپ کو کبھی نہ لکھیں گے۔ خدانخواستہ رضواں میں کوئی عیب نہیں ہے۔ پڑھا لکھا سنے نیک چلن ہے۔ آج ہم ذرا تحریک کریں تو نہیں رشتے موجود ہو جائیں گر اس کی اور اس کی والدہ کی یہی مرضی ہے کہ آپ ہی کے یہاں ہو۔ اس لئے بھائی کر عرض کرتا ہوں کہ رضواں کو اپنی غلامی میں قبول کر لیجئے اور اگر آپ کا ارادہ کچھ اور ہو تو جلد مطلع فرمائیے۔

میں نے لفافہ جیب میں ڈال لیا اور چارپائی پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کیا کروں کیا والد صاحب کو خط لکھ دوں کہ میرے رشتے کے لئے گلاب کے والد کو لکھیں پھر مجھے والدہ کا خیال آ گیا ——— میں ابھی اسی قسم کے خیالات میں محو تھا کہ گلاب اپنے مکان میں آئی اور رشید سے میرے متعلق دریافت کر کے فوراً میرے پاس آ گئی اور آتے ہی ریاضی کا ایک سوال سمجھانے کے لئے کہا۔ میں اس وقت اپنا ایک نہایت اہم سوال حل کر رہا تھا لیکن گلاب کی بات کو رد کرنا بھی آسان نہ تھا لہٰذا حساب کی کتاب لے کر سوال کی عبارت پڑھنے لگا۔ ابھی میں نے سوال کو دوسری دفعہ ہی پڑھا تھا کہ ایک نسائی آواز نے ہم دونوں کو حیران کر دیا۔

"کیا ظفر صاحب اسی مکان میں رہتے ہیں"

میں اور گلاب ایک ساتھ اٹھ کر زینے کے دروازے تک گئے ایک سرو قد عورت کشمشی رنگ کا برقعہ اوڑھے کھڑی تھی۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ کشمش ہے۔ آواز سن کر پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا اور برقعہ دیکھا تو بالکل یقین آ گیا۔ گلاب کو بڑی حیرت ہوئی۔ کہنے لگی "تم کون ہو ——— اوپر آ جاؤ"۔

"ایک بدنصیب بیوہ" اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا

"بیوہ! خدا نہ کرے" میں نے کہا "خدا تمہارے سہاگ کو قائم رکھے"۔

جب میں یہ بات کہہ رہا تھا تو گلاب تعجب سے میری طرف تک رہی تھی۔

کشمش اوپر آ گئی اور ہم تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس نے گلاب کے کہنے سے برقعہ اتار کر الگ رکھ دیا۔ کچھ دیر ہم تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں نے ان دونوں کا تعارف کرایا لیکن دونوں کو یہ خیال رہا کہ میں نے انہیں ایک دوسری کے متعلق صاف صاف بات نہیں بتائی۔ گلاب کو ہر روز کے معمولی لباس میں تھی مگر کشش بہت بن سنور کر آئی تھی۔ اس کا لباس اور چہرے کی خوشی کی علامتیں دیکھ کر اور اس کی گفتگو سن کر کوئی اسے بیوہ نہ کہہ سکتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس مکان سے جانے کے پندرہ دن بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے دکان کا حصہ دوسرے حصہ دار کے پاس فروخت کر دیا اور روپیہ بنک میں جمع کرا دیا اس نے باتوں ہی باتوں میں دوسرا نکاح کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے لئے شوہر میں تجویز کروں اور اگر میں نے ایک ہفتے میں کوئی امید افزا جواب نہ دیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دہلی سے چلی جائے گی اور یہ کہ اس وقت اس کے پاس جائیداد اور نقد تیس ہزار کے قریب ہے۔

کشش جب تک بیٹھی رہی مجھے حسرت اور امید سے تکتی رہی اور گلاب کشش کو۔ کچھ دیر کے بعد پھر خاموشی چھا گئی اور ہم مختلف قسم کے خیالات میں کھو گئے۔ آخر کشش اٹھی اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے جانے کی اجازت چاہی میں نے کہا "ذرا اور ٹھہریئے کھانا تیار ہے"۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا "کھانا تیار ہے؟ کہاں! ——— مجھے تو نظر آتا نہیں"۔

"ابھی نظر آنے لگے گا دو لمحے انتظار تو کیجئے" میں نے اس کی بات کا جواب دیا اور گلاب کی طرف دیکھا۔

گلاب چپ چاپ بیٹھی تھی۔ حیات! وہ گلاب جو انتہا سے زیادہ خلیق ہے اور رہ رہ کر اس وقت کسی خیال میں محو تھی۔ نہ اسے اخلاق کا دھیان تھا نہ خاطر تواضع کا میں اس سے کھانا لانے کے لئے لفظی درخواست کرنے ہی لگا تھا کہ کشمش یہ کہہ کر چلی گئی "آپ تکلیف نہ کیجئے میں اس وقت نہیں ٹھہر سکتی"۔

اس کے جاتے ہی گلاب بھی اٹھ کر چلی گئی اور میں بغیر کھانا کھائے روشن آرا باغ کی طرف چل دیا۔ رستے میں طبیعت کچھ اور زیادہ پریشان

ہوگئی اور میں نے جنگل کا رخ کیا آبادی سے بہت دور جا کر جمنا کے کنارے ہری ہری گھاس پر بیٹھ گیا۔ سینے میں خیالات کا ایک سمندر موجزن تھا اور دل سے ایک ابال سا اٹھ رہا تھا۔ سامنے دریا کا پانی خراماں خراماں بہہ رہا تھا۔ چاند نہ نکلا تھا میں سوچ رہا تھا کہ مجھے خود بخود کیا ہو گیا کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا کشمش کی ملاقات کا رنج تو ہوا نہیں۔ خوشی کی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پھر دل کو کیا ہو گیا۔ دماغ کیوں پریشان ہے۔ پھر چاند نکلنے لگا۔ اس کا عکس پانی میں ایسا دلفریب تھا کہ میرا دل ذرا دیر کے لئے اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور یکایک خیال آیا کہ مجھے گلاب اور کشمش میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایسی جگہ کھڑا ہوں جہاں سے "منزل" کو دو راستے جاتے ہیں اور ہر راستے میں الگ الگ "رفیقِ سفر" ملے گا۔ ایک راستہ اختیار کرنے سے اپنی حالت بدل جائے گی۔ عیش و عشرت اور امیرانہ ٹھاٹھ سے مسافت طے ہو گی۔ روپے پیسے کے تفکرات سے بے نیاز ہو جاؤں گا۔ گو رفیقِ سفر کچھ عمر رسیدہ سا ہے لیکن تجربہ کار اور ہوشیار ہے۔ دوسرا راستہ اختیار کرنے سے تمام سفر میں روپیہ حاصل کرنے کی فکر اور پیٹ بھرنے کے انکار چین نہ لینے دیں گے۔ لیکن ساتھی ایسا ہو گا جسے دیکھ کر ہی تمام رنج و غم کافور ہو جائیں۔ جو جوانی میں مست اور حسن میں مخمور ہے جس کے مقابلے میں انسان دنیا کی ہر نعمت کو بخوشی ٹھکرانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ میں سوچتا رہا۔ پانی کی سطح پر نظریں جمائے سوچتا رہا لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کونسا راستہ بہتر ہے۔

چاند کافی بلند ہو چکا تھا۔ ہر چیار سمت چاندنی نے اپنی دلفریب چادر بچھا کر ایسا دلکش اور سہانا منظر پیدا کر دیا تھا کہ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ کاش یہاں گلاب ہوتی" اور دوسرے لمحہ یہ الفاظ میری زبان سے نکل رہے تھے "کاش کشمش" میں چاہتا تھا کہ کوئی فیصلہ کر کے وہاں سے آؤں لیکن دماغ بالکل کام نہ کرتا تھا۔ چاند کو دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ کشمش اس چاند کے مانند ہے اور گلاب ہلال کے مانند۔ گلاب ایک کلی ہے خوشنما جو عنقریب کھلنے والی ہے اور کشمش ایک شگفتہ پھول ہے اسی طرح مقابلہ کرتے کرتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ گلاب کو حسن و صورت کے لحاظ سے کشمش پر فضیلت حاصل ہے اور کشمش دولت اور محبت کے لحاظ سے گلاب سے افضل ہے۔ جب میں قطعی نتیجہ پر ہو گیا اور ایک رائے قائم نہ کر سکا تو میں نے وہ کیا جو شاید ہر انسان ایسے موقع پر کرتا ہے یعنی تقدیر پر چھوڑ دیا ——— اور وہاں سے چلا آیا واپس آتے ہوئے میرے دل میں کشمش کی زیادہ عظمت تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کشمش مجھے گلاب سے زیادہ عزیز رکھتی ہے لیکن گھر پہنچنے پر اس بات کی بالکل تردید ہو گئی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی یہ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا اس لئے زینے میں نہایت آہستہ آہستہ قدم رکھ کر اوپر چڑھا۔ زینے کے دروازے میں پہنچ کر میں دو ایک لمحے ٹھہرا اور پھر تیزی سے یک لخت کمرے میں چلا گیا۔ میز پر میرا فوٹو رکھا تھا اور گلاب اس پر جھکی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی اور رحم طلب نگاہوں سے تکنے لگی۔ حیات! خبر نہیں ان نظروں میں کیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ آج تمام کائنات غمگین ہے اور میری بے وفائی کا ماتم کر رہی ہے۔ میں نے کپڑے بدلے اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ گلاب آ کر قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کھانا لاؤں؟" اس نے پوچھا

"نہیں ——— مجھے بھوک نہیں"

"کیوں کیا کہیں اور کھا آئے"

"نہیں"

گلاب نے رشید کو آواز دی اور کہہ دیا کہ برتنوں کو اٹھا کر رکھ دے۔ اس نے دریافت کیا کھانا نہیں کھائیں گے کہنے لگی "نہیں انہیں بھوک نہیں ہے"

"اور آپ" رشید نے دوبارہ پوچھا۔

"مجھے بھی بھوک نہیں" گلاب نے جواب دیا

"آپ جب تو کہہ رہی تھیں بھوک لگ رہی ہے خبر نہیں ظفر صاحب ———"

"تمہیں جو کہا ہے وہ کرو اپنی طرف سے کچھ اس کرنے کی ضرورت نہیں" گلاب نے ناراضی سے رشید کی بات کاٹ کر کہا

ہم دونوں خاموش تھے۔ نہ جانے گلاب کیا سوچ رہی تھی لیکن

ہیں۔ اُسی سوال میں الجھا ہوا تھا کہ کسے انتخاب کروں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گلاب کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اُس کا چہرہ کسی خاص غم سے پژمردہ ہو گیا تھا اور آنکھیں نم آلود تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے پھر چپ ہو جاتی ہے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا

"گلاب!"

اُس نے اپنی نظریں زمین پر سے اٹھائیں اور میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں جن کی سیاہی میں دو سفید سفید موتی چمک رہے تھے اُس کے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ میں نے پھر کہا

"گلاب"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور رونے لگی میرا بھی جی بھر آیا لیکن میں نے ضبط کیا اور اُسے سمجھانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں کسی کے اوپر چڑھنے کی آواز آئی۔ گلاب کے والد ڈیوٹی پر گئے ہوئے تھے اور کسی اور کے آنے کا وقت نہ تھا حیرت ہوئی کہ اس وقت کون آ گیا اور صحن میں نکل آیا۔ دیکھا کشمش ہے۔ مجھے اُس کی آمد سے اُس وقت رنج ہوا۔ گلاب کسی نامعلوم غم میں رو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اُس سے اُس کے رنج کی وجہ دریافت کروں اور یہ بات صرف تنہائی ہی میں پوچھی جا سکتی تھی۔ کشمش مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"خطرہ! پیارے خطرہ" اُس کا خیال تھا کہ میں کمرے میں اکیلا ہی ہوں۔ میری شہادت کی انگلی خود بخود دانتہ کمر میرے منہ کے قریب چلی گئی اور کشمش مجھ سے سی ہو گئی۔

گلاب کشمش کے آنے سے خاموش تو ہو گئی لیکن اس کے چہرے کے نقوش سے صاف ظاہر تھا کہ یہ پہلے سے دو چند غمگین ہے اور کشمش دوبارہ آنے پر پریشان تھی میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں تفصیل کے ساتھ سارے واقعات بتا دوں اور پھر دونوں سے رائے لوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے نہایت مشکل سے میں نے پہلے کشمش کے حالات بیان کئے پھر گلاب کے۔ دونوں نے غور و خوض سے میری باتیں سنیں۔ مگر دونوں غمگین تھیں اور اُداس۔

رات زیادہ جا چکی تھی اس لئے میں اور گلاب کشمش کو پہنچانے گئے وہاں سے آ کر گلاب بھی اپنے یہاں چلی گئی اور میں تمام رات بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ کبھی کشمش آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی کبھی گلاب اور کبھی دونوں۔

حیات تم میرے دوست ہو اور تمہیں ساری باتیں بھی معلوم ہیں۔ شاید تم مجھ سے بہتر رائے قایم کر سکو۔ بتاؤ ——— پہلے خوب سوچو اور غور کرو، پھر بتاؤ کہ کون بہتر ہے۔

تیرھواں خط

تم بھی ایک فیصلہ نہ کر سکے۔ مجھے یہی توقع تھی۔ میری رائے معلوم کرنے کا تمہیں بہت اشتیاق ہے۔ سنو پہلے میں نے بڑی کوشش کی کہ صرف ایک کو انتخاب کر لوں لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ دل قابو سے باہر تھا۔ اگر عقل کشمش کے حق میں رائے دیتی تھی تو یہ گلاب کے لئے تڑپتا تھا اور جب میں گلاب کو انتخاب کرنے لگتا تو کشمش کی خاطر مچلتا غرضکہ دل نے دو دن اور تین رات پریشان رکھا۔ آخر میں نے تیسرے دن کشمش سے پوچھا اُس نے کہا "گلاب سے شادی کر لیجئے۔ میرا کیا ہے میں تو آپ کی اور آپ کی وجہ سے گلاب کی خادمہ ہوں۔ عمر بھر دونوں کی خدمت کرتی رہوں گی" پھر میں نے گلاب سے دریافت کیا اس نے بھی یہی کہا کہ کشمش مجھ سے بہتر ہے اور میں تو آپ دونوں کی لونڈی بننا اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔ لیکن ان دونوں کے جواب میں ایک نمایاں فرق تھا۔ کشمش کے لب و لہجے میں صدق تھا اور اخلاص اور گلاب کے لب و لہجے میں شکایت تھی اور طنز۔ جب میں نے دیکھا کہ میں دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑ سکتا نہ مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ دونوں کو حبالۂ عقد میں لے لیا جائے لیکن اس کی دونوں نے تردید کی اور یہ رائے دی کہ قرعہ ڈالا جائے۔ لہٰذا میں نے شام کو انہیں اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا اور چائے پینے کے بعد میں نے کاغذ کے دو پرزوں پر کشمش اور گلاب لکھا پھر دونوں پرزوں کی گولیاں بنا کر رشید سے کہا کہ ان میں سے ایک اٹھا لو۔ اُس نے ایک گولی اُٹھا لی۔ ہم تینوں بے تاب ہو گئے کہ جلدی کھول کر پڑھیں۔ گلاب نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کھولا اور اپنا نام دیکھ کر شرما گئی لیکن اُس کی صورت پر خوشی کی ایک رو دوڑتی صاف نظر آ رہی تھی۔ کشمش نے کاغذ کی دوسری گولی اٹھا کر کھولی۔ پھر ہنستے ہوئے گلاب کو بہترین خاوند ملنے پر مبارک باد دی اور دو ہزار روپے نقد دینے کا وعدہ کیا۔ مجھے پہلے تو خوشی ہوئی پھر رنج اور کشمش بظاہر مسرور تھی اور بہ باطن رنجیدہ۔

گلاب کے والد سے یہ قرار پایا ہے کہ فی الحال صرف نکاح کر لیا جائے اور پھر دو ایک مہینے میں وہ اپنے وطن جا کر باقاعدہ وداع کر دیں گے

حیات یہ بات ہے بھی درست۔ نکاح ہونے کے بعد تو کوئی کچھ نہ کر سکے گا ورنہ والدہ اس شادی کی ہرگز اجازت نہ دیں گی۔

پرسوں بعد مغرب نکاح ہے۔ اگر تم شامل ہونا چاہو تو آجاؤ اور کسی شخص کو اس کی خبر نہ ہو۔

آخری خط

آپ کا پارسل ملا۔ "سنہری انگوٹھیوں" اور "نہرے" کا شکریہ قبول فرمائیے انگشتری پر میرا اور اپنا نام دیکھ کر گلاب کو بڑی خوشی ہوئی۔ گو آپ کے تحفے دیر سے پہنچے لیکن اس میں آپ کی غلطی نہیں۔ میں نے اطلاع ہی بہت دیر سے دی تھی اور اس سے زیادہ جلدی آپ کیا کرتے۔ گلاب اپنے شوہر کے عزیز مہمان دوست کو سلام کہتی ہے اور ملاقات کا شوق ظاہر کرتی ہے۔ حیات آپ نے دو انگوٹھیاں کیوں بھیجیں بس ایک ہی کافی تھی۔ فضول خرچی بہت بُری ہے۔ جس انگوٹھی پر ہمارے نام کندہ ہیں ہم وہ رکھ لیں گے اور دوسری واپس کر دیں گے مگر ایک شرط ہے ——

حیات اگر تم بُرا نہ مانو تو تمہیں ایک بہت اہم راز سے آگاہ کر دوں ایسے راز سے جس کے انکشاف کے بعد تم بہت جز بز ہو گے لیکن شکست ہو چکی ہے اب شرمندگی سے کچھ حاصل نہیں اور نہ کسی قسم کی تاویل سے تمہیں اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑے گا اور بغیر کسی دلیل کے تمہاری تحریر بس —— طویل خط میرے پاس محفوظ ہیں جو تمہارے انکار کرنے پر ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ممکن تھا کہ ابھی اور اس راز کو ظاہر نہ کرتا لیکن صبح جو میں نے پرانی ڈائری دیکھی تو معلوم ہوا کہ اس واقعہ کو پورا ایک برس ہو چکا ہے جس نے مجھے یہ افسانہ لکھنے پر مجبور کیا اس کے علاوہ آج ہی حامد کا خط بھی آیا ہے اور قیوم کا بھی۔ وہ بھی لکھتے ہیں کہ اب بغیر کسی توقف کے آپ کو یہ راز بتا دیا جائے۔

راز یہ ہے کہ میں نے تمہیں کامل چھ مہینے بے وقوف بنائے رکھا اور تم بھی تسلیم کرو گے کہ اس دراز عرصے میں ایک دن بھی تمہیں اپنی بے وقوفی کا احساس نہیں ہوا۔ وہ وقت یاد کرو جب تم نے یہ شیخی ماری تھی کہ تم میرے لکھے ہوئے فسانے پر کبھی یقین نہ کرو گے اور کبھی یہ نہ مانو گے کہ وہ فسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ یہ خط کیا ہیں —— میرا لکھا ہوا فسانہ۔ اب سیدھے ہاتھ سے بیس روپے عبداللہ کو دے دو۔ تم شرط ہار چکے ہو اور اگر ابھی تمہیں یقین ہو کہ جو کچھ میں لکھ چکا ہوں وہ درست ہے، حقیقت ہے تو پہلی گاڑی سے دہلی چلے آؤ اور یہاں آ کر مکان کا حدود اربعہ دیکھ لو اور چور دروازہ بھی۔ اختر تو ابھی ولایت ہی سے نہیں آیا اور محلہ میں جس شخص سے چاہو دریافت کر لو کہ میں چھ مہینے سے نیچے کے مکان میں رہتا ہوں جس کے برابر کا مکان بھی اتنے ہی عرصے سے خالی پڑا ہے اور اوپر کا بھی۔ دوسری طرف میدان ہے، سامنے سڑک ہے۔ حیات جب یہ شرط قرار پائی تھی میں نے اس دن تہیہ کر لیا تھا کہ ایسے وقت میں شکست دوں گا۔ جب تم قطعی بھول چکے ہو گے۔ اس لئے چھ ماہ بعد یہ ذکر چھیڑا اور نصف برس تک تمہیں اس کا احساس نہ ہونے دیا میں نے جتنے بھی خط تمہیں لکھے اُن کی نقلیں برادر عبداللہ، قیوم، شفقت اور حامد کے پاس بھیجتا رہا کیونکہ یہی اصحاب اربعہ شرط کے گواہ ہیں۔ اب تم سمجھے کہ میں پنسل سے کیوں خط لکھا کرتا تھا تم کہو گے کہ اس بات کو اتنا طول دینے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ایک خطوں کے بعد ہی یہ مقصد حاصل ہو گیا تھا۔ درست ہے لیکن اس طرح افسانہ مکمل نہ ہوتا۔ ہاں البتہ کشش کی جدائی کے ذکر کے بعد میرا ارادہ تھا کہ فلاکر دوں مگر حامد نہ مانا اُس نے لکھا کہ "ابھی دو ایک مہینے اور یہ دلچسپ کھیل کھیلتے رہئے۔ اُس کے بعد میں فلاں تاریخ کو شاہ آباد جاؤں گا تو ظاہر کرنا تاکہ میں اُن سے مٹھائی کے روپے وصول کر سکوں"۔ شاید وہ آج شاہ آباد پہنچ گیا ہو۔ تم اُسے یہ خط کیوں دکھانے لگے۔ لیکن واضح ہو کہ میں اس کی نقل بھی اُس کے پاس علٰحدہ ارسال کر رہا ہوں۔

تمہیں تعجب ہو گا کہ تمہارا وہ خط جو تم نے کشش کو لکھا تھا مجھے ہی ملا تھا ڈاکیہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپ کے اوپر والے کمرے میں کوئی نماز کی بیوی رہتی ہے میں نے کہا کیوں کیا بات ہے۔ اُس نے مجھے لفافہ دکھایا میں نے تمہارا خط پہچان لیا اور اس سے لے کر رکھ لیا اور کہہ دیا کہ اس وقت وہ کہیں گئے ہوئے ہیں جب آئیں گے میں پہنچا دوں گا۔ جن جذبات کا تم نے اُس خط میں اظہار کیا وہ واقعی قابل تعریف ہیں۔ اگر سچ مچ کوئی کشش ہوتی اور تمہارا خط اُسے مل جاتا تو تمہیں اور تمہارے دوست کو جی بھر کے کوستی اور گالیاں دیتی۔

حیات معاف کرنا لیکن اس میں میری کیا خطا ہیں روپے کی شرط اور تم اس کے ذمہ دار ہو۔ تمہاری ایک انگوٹھی اس شرط پر واپس کی جا سکتی ہے کہ تم "شرط" کے روپے خوشی سے دے دو اور اگر ذرا بھی حیل وحجت کی تو انگوٹھی سے روپے وصول کر لئے جائیں گے۔

ظفر واسطی

موت اور عشق

عشق نے موت کو، مگر کتنا حسیں بنا دیا
موت کی سرد رُوح میں سیلِ جنوں بہا دیا

ایک حیاتِ جاوداں موت میں ہے چھپی ہوئی
ایک بہارِ بے خزاں موت میں ہے چھپی ہوئی
روحِ نشاطِ قلب و جاں موت میں ہے چھپی ہوئی

عشق کا سحر دیکھ کر موت نے مُسکرا دیا

موت نے عشق کو مگر کتنا بلند کر دیا
دردِ پرست دل دیا، زخمِ طلب جگر دیا

روح و رواں ہے موت ہی عشق کے شاہکار کی
موت نے بزمِ گرم کی عشقِ جنوں شعار کی
رُوح کی طاقتِ نہاں موت نے آشکار کی

عشق کی داستان میں سوزِ دوام بھر دیا

عدمؔ

اعجازِ بیاں

غزل
کاش اِک روز تو یوں رونقِ محفل ہوتا — پاؤں رکھتا تو جہاں واں پہ مرا دل ہوتا
حُسن کامل تھا ترا، عشق بھی کامل ہوتا — یعنی ہاتھوں میں مرے پردۂ محمل ہوتا
دلِ ساحل کو ہے ارمان کہ ہو جائے وہ بحر — بحر کو ہے یہ تمنّا کہ وہ ساحل ہوتا
دل نہ زنہار نوا سنجِ شکایت ہوتا — لطف بھی کچھ جو ترے جور میں شامل ہوتا
خوگرِ جور ہیں ہم جاں سے گزر ہی جاتے — گر ستم چھوڑ کے تُو لطف پہ مائل ہوتا
کاش اس طرح سے یہ چاندنی راتیں کٹتیں — کہ ہم آغوش مرے تُو لبِ ساحل ہوتا
ترے پہلو میں گزرتی مری اک ساعتِ عیش — خوب ہوتا یہ مری عمر کا حاصل ہوتا

کس قدر یاس فزا شامِ اجل تھی اعجاز
کاش بالیں پہ مرے وہ مہِ کامل ہوتا

سعید احمد اعجاز

۳۶ ۲ ھ

قبر

۱۲ر جولائی ۱۸۹۳ء کو ڈھائی بجے رات کے قریب قبرستان کا محافظ، جو وہیں کونے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا، باورچی خانے میں بندھے ہوئے کتے کی آواز سے چونک پڑا۔ وہ جلدی سے نیچے اترا کتا کسی چیز کی بو پاکر زور زور سے بھونک رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لکڑا امکان میں دبے پاؤں گھس آیا ہے۔ محافظ نے بیحد احتیاط سے اپنی بندوق اٹھانے باہر نکلا۔ اس کا کتا باہر کو جانے والے ایک راستے کی طرف پل پڑا اور مادام ٹوماس کی قبر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

محافظ احتیاط سے ذرا آگے بڑھا۔ مدھم سی روشنی باہر کے دروازے پر نمودار ہو رہی تھی۔ وہ ایک قبر کے پتھر کے پیچھے جا چھپا۔ جہاں سے اس کی آنکھوں نے ایک نہایت ہی خوفناک فعل کا ارتکاب ہوتے دیکھا۔

ایک نوجوان، تازہ دفن کی ہوئی ایک عورت کی قبر کا پتھر اٹھا کر اس کی لاش کو اوپر کھینچ رہا تھا۔ یہ ہیبت ناک منظر مٹی کے ڈھیر پر پڑی ہوئی ایک چور لالٹین کی مدھم روشنی میں نظر آ رہا تھا۔

دن سینٹ ملزم پر جھپٹ پڑا اور جھٹ زمین پر گرا کر اس کے ہاتھ باندھ لئے اور پولیس سٹیشن میں لے گیا۔

ملزم کو رٹیلی، شہر ہی کا ایک دولتمند وکیل تھا۔ جو نیک نامی کے باعث بہت مشہور تھا

مقدمے کی سماعت شروع ہو گئی۔ سرکاری وکیل نے وہ دہشتناک واقعہ دوبارہ لوگوں کے سامنے بیان کیا جس کا ملزم ارتکاب کر چکا تھا۔ حاضرین کا اشتیاق اور بڑھ گیا، اور وہ ہمہ تن گوش کارروائی کو سننے لگے۔

سارا مجمع ملزم کے مذموم فعل پر نفرت کا اظہار کر رہا تھا اور جونہی مجسٹریٹ اندر داخل ہوا "اسے موت کے گھاٹ اتارو، اسے مار ڈالو" آوازیں بلند ہونے لگیں۔

مجسٹریٹ نے خفگی کے لہجے میں ملزم سے پوچھا "بتاؤ تمہارے پاس کیا جواب ہے؟"

کورنیلی، ایک خوبصورت، دراز قد، سیاہ فام اور خوش رُو نوجوان تھا، اس کی آنکھیں اس وقت بے خوف سی معلوم ہوتی تھیں۔ اس نے کسی وکیل کی امداد طلب نہ کی اور خود ہی اٹھا۔ اسے دیکھتے ہی ہجوم میں جنبش سی پیدا ہو گئی۔

اس نے نہایت دلیری اور جرات سے بھاری آواز میں، جو بتدریج تیز ہوتی چلی جاتی تھی، تقریر شروع کی:

"فاضل منصف، و دیگر حاضرین! مجھے بہت تھوڑا کہنا ہے۔ وہ عورت جس کی قبر میں نے کھود دی تھی، میری ہی محبوبہ ہے۔ مجھے اس سے بے حد محبت تھی اور میرا صاف اور بے لوث دل اس کی محبت میں ہمیشہ سرشار رہتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ مجھے گویا اس نے دیوانہ ہی بنا دیا تھا۔

اب سنئے:۔

جب پہلے پہل اس سے میری ملاقات ہوئی تو اسے دیکھتے ہی ایک عجیب سے جذبے نے مجھ پر قابو پا لیا۔ جو نہ تو کسی جرات کا نتیجہ تھا، اور نہ نگاہ اربیں سے پیدا شدہ کسی فوری الفت کا اثر تھا۔ وہ ایک مسرت انگیز رنگین جذبہ تھا جس کے اثر سے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی نرم گرم حمام میں ایک سرمدی کیف کے مزے لے رہا ہوں۔ اس کی حرکات نے فریفتہ اور اس کی آواز نے مجھے مسحور کر رکھا تھا۔ اس کے ہر انداز میں ایک کیف محسوس کرتا تھا۔ اور میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ کاش اس سے پیشتر میں اس سے آشنا ہو چکا ہوتا اور اس سے پہلے اسے دیکھ لیا ہوتا۔

مجھے یوں معلوم ہوتا تھا گویا میری روح کا کچھ حصہ اس کے جسم میں سرائت کر گیا ہے۔ فی الحقیقت وہ میری روح کی التجا کا جواب تھی۔ وہی روح جو ہمیں عمر بھر فطرت سے ہمکنار ہونے کی دعوت دیتی رہتی ہے!

جب میں اس سے کچھ آشنا ہو گیا تو محض اس کی ملاقات کے خیال ہی سے میرے جذبات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ کا خفیف سا لمس میرے لئے اتنی مسرت کا باعث ہوتا تھا جس سے قبل ازیں میں کبھی لطف اندوز نہ ہوا تھا۔ اس کا جسم میری آنکھوں کو منور کر دیتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں رقص کرتا کرتا زمین پر لوٹ رہا ہوں۔

کچھ عرصہ بعد وہ میری محبوبہ بن گئی۔

اس کے ہوتے ہوئے مجھے دنیا میں کسی چیز کی تمنا نہ تھی۔ ایک شام جب ہم ندی کے کنارے کنارے ٹہل رہے تھے، ہمیں بارش نے آلیا۔ اسے سردی لگ گئی۔ اگلے دن اس کے پھیپھڑے متورم ہو گئے۔ اور آٹھ روز کے بعد وہ چل بسی۔ مایوسی کے ان آٹھ دنوں میں عقل اور فہم مجھ سے رخصت ہو چکے تھے۔

جب وہ مر گئی تو میں اتنی گہری مایوسی میں ڈوبا ہوا تھا کہ مجھے معلوم نہ ہوتا تھا کہ میں کیا کروں۔ بالآخر میں رونے لگا۔

تجہیز و تکفین کے دردناک منظر کو دیکھ کر میں انتہائی غم میں گھر گیا جس سے میرے حواس بالکل ضائع ہو گئے۔

جب وہ مجھ سے رخصت ہو گئی اور زمین کے نیچے کہیں غائب ہو گئی تو یکایک میرے دل سے رنج و الم کے بادل چھٹ گئے۔ مگر میرا دماغ ذہنی تکالیف کی آماجگاہ بن گیا جو اس کی الفت کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ تھیں۔

پھر ایک اور خیال نے میرے دل پر قبضہ کر لیا: کہ اب میں اسے کبھی دیکھ نہیں سکوں گا!" اور اس خیال نے مجھے ایک عرصہ تک دیوانہ بنائے رکھا۔

ذرا غور کرو۔ ایک بے نظیر محبوب ہو۔ اس کی تم پرستش کرتے ہو۔ وہ اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دے اور تمہارے ساتھ وہ پُر اسرار تعلق پیدا کرے جسے الفت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی طلسم ریز نظر — تمہیں دنیا کی بہنائیوں سے زیادہ وسیع اور زیادہ دلکش دکھائی دے — جب وہ تم سے ہم کلام ہو تو اس کی آواز سے تمہارے دل میں مسرتوں کا ایک بے پایاں سمندر موجیں لینے لگے۔

اور یکایک وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ ذرا غور کرو۔ نہ صرف تمہاری نظروں سے بلکہ دنیا کی نظروں سے وہ غائب ہو جائے یعنی موت اسے اپنی آغوش میں لے لے . . . تمہیں معلوم ہے موت کیا ہے موت سے کیا مراد ہے . . . تو وہ یکایک مر جائے اور اس کی روشن آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں اور وہ آواز جس کے ساتھ دنیا کی کوئی آواز مشابہ نہیں، جو کبھی شیریں الفاظ ادا کیا کرتی تھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے اور وہ چہرہ جس کے مانند کبھی کوئی چہرہ روئے زمین پر نمودار نہ ہوا ہو اگر آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جائے تو کیا یہ انسان کو دیوانہ بنانے کے لئے کافی نہیں۔ ذرا سوچو تو!

وہ بیس سال زندہ رہی — زیادہ نہیں — اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کہیں غائب ہو گئی۔ آہ وہ کبھی مسکرا تی تھی کبھی محبت کیا کرتی تھی، کبھی اس کے دل میں خیالات کا ایک طوفان برپا تھا — مگر اب یہ داستان ایک حکایت پارینہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہماری اور ان کھیوں کی خلقت میں کوئی فرق نہیں جو خزاں نمودار ہوتے ہی مر جاتی ہیں۔

میں یہ خیال میں ہنک رہتا تھا کہ اس کا اتنا نوخیز، اتنا گرم، اتنا صاف، اتنا سپید اور اتنا خوب صورت جسم کس طرح مٹی میں مٹی ہو رہا ہو گا اور اس کی روح، اس کا دل، اس کا جسم اب کس عالم میں جا چھپے ہونگے۔ کیا اب وہ پھر نظر نہیں آئے گی؟ کیا کبھی نہیں! کیا اس کے جسم کے عناصر ہمیشہ کے لئے منتشر ہو چکے ہیں! — میرے دل پر ایسے خیالات مسلط رہتے تھے۔

مگ میں بیلیم، لالٹین اور ہتھوڑا لے کر چل پڑا۔ قبرستان کی راہ میں ایک جگہ پہنچا جہاں اس کی قبر تھی۔ میں نے صندوق سے چند بے ایک۔ ایک تیز بدبو میرے نتھنوں میں پہنچی۔ . . آہ کبھی کیا یہ وہ کہ تھا تیز پسینا کرتی تھی!!

موجود تھی۔ کر لالٹین ذرا آگے بڑھائی اس کا چہرہ پتلا پڑ اس کا اعتقا ہوش مجھ پر خوف طاری ہو گیا مگر میں نے جرأت کر کے ا . . پڑے تاکہ ذرا آگے ہو کر اسے اچھی طرح دیکھوں۔ تو یہ لمحہ تھا جب نظر نے مجھے آدبوچا۔

اب تمہیں اس سے جیسا چاہو کرو۔"

ہال میں سکوت طا تھا۔ لوگ اس سے آگے بھی کچھ سننے کے مشتاق نظر آتے تھے تو عدالت ملزم پر غور کرنے کے لئے اٹھ بیٹھی چند منٹوں کے بعد کارروائی پھر شروع ہو گئی۔ ملزم کے چہرے سے پریشانی کے آثار دور ہو چکے تھے۔ جج نے انصاف کے مطابق فیصلہ سنایا۔

عدالت نے بے گناہ قرار دے اُسے بری کر دیا۔ لوگ فیصلہ سنتے ہی تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرنے لگے۔

(رموچاسال)

طاہرہ بیگم ہاشمی بی اے

تجلّیات

صبا میں ہیں مستیاں اُسی کی، اُسی کا پھولوں میں رنگ و بُو ہے
کرن ہی تو ہے رُوبرو تمہارے، اثرؔ تمہیں کس کی جستجو ہے!
زمیں پہ ہے رنگِ لالہ و گل، فلک پہ ہے نورِ ماہ و انجم
ریاضِ ہستی میں جلوہ آرا جمالِ تیرا ہی ہو بہو ہے!
سرور سے گل مہک رہے ہیں، فلک پہ تارے بہک رہے ہیں
زمین سے لے کے آسماں تک عجیب غوغائے ہاؤ ہو ہے۔
سحر کا عارض ہے یا شرابِ طہور کا ایک مست دریا
ہے ایک طوفان مستیوں کا کہ شام کی زلفِ مشکبو ہے۔
ہوائیں مسرور ہو گئی ہیں، فضائیں پُر نور ہو گئی ہیں
نگاہیں مخمور ہو گئی ہیں، عجیب طوفانِ رنگ و بُو ہے
ہوئے ہیں گلپوش کوہ و صحرا، ہوئے ہیں مدہوش دشت و دریا
بہار ہے گلستاں بدامن، بہار کے دوش پر سبو ہے۔
بہار پیغام زندگی کا، بہار ہے جامِ زندگی کا
کہ ذرّے ذرّے میں پتّے پتّے میں موجِ صہبائے آرزو ہے
شفق ہے یا کے عہدِ الفت کا کوئی بھولا ہوا فسانہ
عجیب سا خوابناک منظر مری نگاہوں کے روبرو ہے
اثرؔ میں اک رندِ لم یزل ہوں، دوام ہے میری مستیوں کو
کہ حسن میں ہے شراب میری، ہر اک حسیں شے مرا سبو ہے

اثرؔ صہبائی

ناموں کی اہمیّت

علومِ عصریہ میں ناموں کے دو پہلو ہیں، لسانی اور نفسیاتی۔ مغربی زبان دانوں نے لسانی پہلو پر کافی بحث تمحیص کی ہے۔ لیکن اردو میں علوم کی یہ شاخ تا حال تربیتاً تشنۂ تعارف ہے اور نفسیاتی اہمیت پر اردو کا تو ذکر ہی کیا انگریزی اور مغربی زبانوں میں بھی بے حد کم توجہ دی گئی ہے۔ نفسیات کے ماہرین میں سے سٹیکل اور فلوگل نے ناموں کی نفسیاتی اہمیت کے متعلق چند نظریے قائم کئے ہیں۔ اور آج کی نشست میں راقم کا مقصد اردو دنیا کو اردو ادب کے لحاظ سے ان نظریوں سے روشناس کرانا ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ ناموں کا صرف ایک ہی کام ہے، نام ہونا یعنی مختلف اشیاء اور افراد کے لیبل لیکن عوام (اور خواص) کی اس کم علمی کے باوجود ناموں کی نفسیاتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حواسِ خمسہ میں سے سننے اور بولنے کی قوتوں کا ناموں کے ساتھ بہت سا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ اجتماعِ خیالی یا تصور کا تسلسل بھی ناموں کی اہمیت میں برسرِ کار ہوتا ہے۔ یہ سمجھئے کہ ہلکے پھلکے لفظ۔ لفظوں کے نرم یا مختصر اجزاء، آرام و آسائش، تن آسانی، نزاکت، نازکی، ضعف وغیرہ کا خیال لائیں گے۔ بوجھل۔ موٹے صحیح مخرج سے ادا کئے ہوئے شین قاف نما الفاظ، مثلہ قیدِ رسم کے مطابق الفریہ خواہ مخواہ اور وزنی اشیا یا افراد کا تصور پیش کریں گے۔ حروفِ ہجا پر غور کرنے سے ہی لسانی پہلو کی یہ دلچسپی ظاہر ہو سکتی ہے۔ کوئی حرف ہمیں کسی پتلی دبلی انسانی شخصیت کے متوازی محسوس ہوتا ہے اور کوئی اس کے خلاف۔

ان باتوں کے بعد ہی ہماری نظروں میں ناموں کی ایک خاص حیثیت ہو جانا چاہئے۔ غور کرنے سے ہمیں یہ بھی محسوس ہو سکتا ہے کہ ہماری حیاتِ ذہنی میں ناموں کا ایک خاص درجہ ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ ہمارے چال چلن اور زندگی کی روش پر بھی ناموں نے کچھ اس قسم کا اثر کیا ہو جسے ہم اب تک دقیانوسی سمجھ کے ناموں سے بے تعلق کوئی کبھی نہیں۔ کوئی نام آپ کو اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن مجھے پسند ہی نہیں آتا۔ کسی نام کو سن کر آپ توجہ بھی نہیں کرتے لیکن مجھے وہی نام اپنی خارج از فہم مقناطیسیت سے گویا کھینچ لیتا ہے۔ اگر کسی فرصت کے وقت ہم اچھائی برائی یا پسند ناپسند کے لحاظ سے ناموں کا انتخاب و شمار کرنے لگیں تو اپنی ترجیحات اور جذباتی ردِ عمل کے حیران کن انکشافات ہم پر ہوں گے۔ انھیں بے معنی ناموں سے تعلق ایسے لوازمات اور دلائل ہم پر ظاہر ہو جائیں گے جن سے پیشتر نا واقفیت تھی۔

مغرب کے مفکرین نے اس بات کو بہت عرصے سے مان لیا ہے کہ افسانوں میں مصنفین کرداروں کے جو نام پیش کرتے ہیں۔ وہ نام کردار کے چرچے سے انفرادی طور پر خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ اور نقدِ نظر سے دیکھا گیا ہے کہ کئی مصنفوں میں مناسب ناموں کے انتخاب کی قابلیت خصوصاً موجود تھی۔ ڈنسیسی ناول نگار ایسے زولا اس نظریے کا بڑا پرست حامی تھا اس کا اعتقاد تھا کہ نام اپنے موسوم سے ایک پُراسرار باہمی رشتہ اور مطابقت رکھتا ہے۔ ایک اور فرنسیسی محقق کے خیال میں ہر نام ایک خاص انداز کی انفرادی شخصیت کا تصور ذہن میں پیدا کرتا ہے اور جن کا بھی وہ نام ہو وہ سب کم و بیش اسی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں (واضح رہے کہ شخصیت سے محقق کا منشا "جسمانی شخصیت" ہے) مثلاً بوجھل۔ کڑے جثہ والے، زور دے کر بولے جانے والے تشدیدی الفاظ والے نام سی موٹے۔ بھاری بھرکم یا بھرے ہوئے یا گٹھے ہوئے یا مضبوط جسم کا اشارہ کرتے ہیں۔ اور چھوٹے سے نام دبلے۔ پتلے۔ پھرتیلے شخص کا تصور لاتے ہیں۔

ناموں کی عمومی متعلقہ اہمیت کے باوجود کسی شخص اور اس کے نام کی شرح اور وضاحت کے انفرادی اختلافات بین ممکن ہیں متعلقہ اہمیت کا دارومدار ان باتوں پر ہے۔ قومیت۔ اسی نام کے اور لوگ۔ لغوی اور سماعی متعلقات اور آواز کے لحاظ سے اثر اندازی۔ تجزیۂ نفسی کے ماہرین میں سٹیکل اوّلین شخص تھا جس نے اوروں کو اس طرف توجہ دلائی کہ ناموں کی غیر شعوری

اہمیت کا اثر ترکیبِ سیرت اور جذباتی اندازِ نظر پر ہوتا ہے۔ ناموں کا جو غیر شعوری اثر سیرت پر ہوتا ہے اس کی تین بڑی شاخیں ہو سکتی ہیں۔ (اور ممکن ہے کہ آئندہ تحقیقات اور شاخوں کو بھی دریافت کر سکے)۔

۱۔ سیرت اور چال چلن پر عام اثر۔

۲۔ پیشے اور کام کے انتخاب پر اثر۔

۳۔ محبوب کے انتخاب پر اثر۔

سیرت پر نام کا اثر عموماً کسی شخص کی عشقیہ یا جنسی زندگی میں ظاہر ہو سکتا ہے لیکن یہ بات پیشتر یاد رہنا چاہئے کہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ نام اپنے معانی اور متعلقات سے سراسر مختلف اثر بھی کرتے ہیں یعنی جس کا نام ہو اُسے اُس نام اور اس کے متعلقات سے ایک نفرت یا چڑ سی ہو جاتی ہے اور وہ غیر شعوری طور پر بغیر۔ بے حد مختلف خصوصیات اپنے میں پیدا کر لیتا ہے۔ خواہ وہ خصوصیات اس کی اپنی ذات کے لئے مضر ہی کیوں نہ دکھائی دے رہی ہوں۔

نام کا جو اثر پیشے کے انتخاب پر ہوتا ہے وہ سلّمہ ہے لیکن تحقیق و نتائج دور رس کارنامہ ہوں اور مکمل ہوں۔ اس لئے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ نام اور پیشے کا تعلق تقریباً بالکل نمایاں ہو، یا اتفاقیہ نہ ہو۔ یا آپ کو اس بات کا ذاتی علم ہو کہ نام نے یقیناً اثر اندازی کی ہے۔ یہ ممکن ہے۔ نام اکثر درجے اور مقدار دونوں کے لحاظ سے سیرت پر اثر انداز ہوں۔ یعنی وہ کسی فرد کی "خاص کشش" کو کم یا زیادہ کر دیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس "خاص کشش" کو ایک راہ مخصوص پر ڈال دیں۔ نام میں کسی قسم کے معنی ہوں وہ انفرادی رجحان کی نشوونما اور رہنمائی اُن خصوصیات کی طرف کرتے ہیں جو بالآخر امتیاز کے حصول میں معاون ہوں اور جن کے نام محض امتیازِ شخصیت کا مقصد حل کرتے ہیں اور کسی قسم کی اہمیت کے حامل نہیں انھیں یقیناً اس کارزارِ حیات کی مدافعت کے لئے ایک بہت بڑی خامی کا سامنا ہے۔

کئی بار ایسا ہوا ہے کہ نام کے لحاظ سے پیشے میں جو غیر شعوری دل کشی پیدا ہو جاتی ہے اس نے بہت سی دشواریوں پر قابو پا لیا۔ خواہ نام کے معنی کا تعلق پیشے سے نمایاں نہ ہو۔ پھر بھی اکثر دلچسپی کے قائم کرنے میں نام نے اثر کیا ہے۔

جب ہم محبوب کے انتخاب پر نام کے اثر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ نام کے معنی کی نسبت ماحول کے متعلقات اور تخصیص زیادہ اہم ہیں۔ عیسائیوں میں مریم کو تقدیس و تبرک کا جو رتبہ حاصل ہے۔ وہ قریب قریب ایک دیوی کے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مریم کی ہستی اتم خلائق بھی ہے۔

اس حقیقت سے جنسی ممانعت (TABOO) کی شدید دل کشی قائم ہو جاتی ہے اور تعلقِ خاطر اس نام کی ہستی سے ہو جاتا ہے جو اس نام سے ملتا جلتا ہو اس کی ایک نہایت عمدہ مثال انگریزی کے شاعر بائرن کی شخصیت ہے اس کی زندگی میں بے شمار عورتوں کا دخل تھا جن کے نام عموماً مریم یا مریانہ تھے۔ ابھی اس کی عمر آٹھ برس کی ہی تھی کہ اس کا سیلانِ طبعی بہری ڈف نام کی ایک عورت پر مرکوز ہوا۔ مریم نام سے بائرن کو جو والہانہ محبت تھی اس کا ذکر عام طور پر اس نے اپنی نظموں میں کیا ہے۔ چنانچہ اپنی مشہور نظم "فان وان" میں لکھتا ہے:۔

"مریم کے نام کے لئے میرے دل میں ایک شدید جذبہ ہے
گو کہ ایک زمانہ تھا جب یہ میرے لئے ایک جادو
کی آواز تھی۔
اور اب بھی یہ اس سرزمینِ پرستان کا تصور لے آتی ہے۔
جہاں میں نے وہ باتیں سنیں جو عالمِ سکان میں نہ تھیں،
تمام احساس بدل جاتے ہیں لیکن یہ تاثر۔
ہمیشہ مختلف صورتوں میں آتا رہا۔
اور یہ ایک ایسا جادو ہے جس کے اثر سے آج بھی میں آزاد
نہیں ہوں"۔

اسی طرح ایک ہی نام کے تواتر کی مثال شیلے اور شلّر کی زندگیاں بھی ہیں۔ شیلے کی زندگی میں ایک ہی نام تین بار آیا۔ ہیریٹ گروو، ہیریٹ ویسٹ بروک اور ہیریٹ بُرن وِل۔ یوں ہی شلّر کی حیاتِ جنسی میں بھی تین بار ایک ہی نام کی عورتوں نے اثر اندازی کی۔ شارلٹ فان لینگ فیلڈ۔ شارلٹ فان کالب اور شارلٹ فان وُل زوجن۔ ابھی تک ان وجوہات کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے جو ہم کو بچوں کے نام مقرر کرنے پر اُکساتی ہیں۔ اس سلسلے میں خاندانی رسم و رواج اہم ترین جزو ہیں۔ کئی بار یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی بڑے آدمی کے نام پر بچے کا نام بھی وہی رکھا جاتا ہے۔ اور وہ بڑے آدمی بچے کے والدین کے خیالات و اعتقادات کے لحاظ سے قابلِ تعظیم ہوتے ہیں۔ اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہی عادات و خصائل اور خصوصیات بچے میں بھی راسخ ہوں۔ اس سلسلے میں ایک بے حد دلچسپ مثال سوئٹزرلینڈ کی حکومت کی ہے جس نے ایک بچے کا نام ٹراٹسکی رکھا جانا ممنوع قرار دیا۔ مبادا بچہ بڑا ہو اور انقلابی خیالات و تحریکات کا حامل ہو۔

چونکہ ناحال ناموں کے نفسیاتی پہلو کا علم نامکمل ہے۔ اس لئے

اس مختصر مقالے میں اس موضوع کے ہر پہلو پر وضاحت کے ساتھ غور کرنا ناممکن ہے۔ ہر شخص کو ان نظریات کے مطابق غور و فکر سے مثالیں سوجھ سکتی ہیں۔

اور اب اردو ادب کے متعلق بھی لگے ہاتھ دو چار باتیں کر ہی لی جائیں۔

اردو ادب میں آغاز کے افسانوں میں مغل بیگمات کی بناوٹی زندگی کے اثر کے تحت نیز مصنفین کی شاعرانہ افتادِ طبع کی وجہ سے جو نام استعمال ہوئے وہ پُرتکلف اور نفسیاتی لحاظ سے کردار کی سیرت سے دور از کار ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب ناول نگاری مغربی اثرات کے ماتحت ترقی کرنے لگی تو ادائے موضوع و بیان میں انقلاب کے باوجود ناموں کے انتخاب میں ایک نئی قسم کا تکلف رہا یعنی ہیروئن کا نام حامدہ، ہیروئن کا حامدہ، ہیروئن کا نام راشدہ، ہیروئن کا راشدہ، سرشار کے نام ہیروؤں کی خصوصیات کے لحاظ سے بامعنی تھے مثلاً خوجی۔ کھوجی یعنی کھوج لگانے والا۔ تجسس اور اس کردار کی فطرت میں تھا کہ غیر معمولی تجسس کی وجہ سے عموماً داخل در معقولات کا موجب بن بیٹھتا۔ اس کے ساتھ ہی سرشار کی اپنی سیرت کا نمایندہ یعنی میاں آزاد۔ یہ صلح کُل۔ مرنجاں مرنج اور رقیانوسی خیالات اور بھی تصورات سے فارغ کردار ہے۔

شرر چونکہ زیادہ تر تاریخی ناول لکھتے تھے۔ اس لئے ان کے نام ہر ملک کے مطابق ہونا زیادہ ضروری تھے۔ سیرت کے مطابق ہوں یا نہ ہوں۔ البتہ ہندوستان کے معاشرتی ناولوں میں جو نام استعمال کئے گئے ہیں وہ نفسیات کے لحاظ سے قابلِ غور ہو سکتے ہیں۔ اور ان میں ناموں کے نفسیاتی پہلو پر غور کیا گیا ہو یا نہ، یہ ضرور ہے کہ ان کے اختلاف سے ایک قدرتی پن اور معاشرتی اثر یقیناً پیدا ہو گیا ہے۔ محمد علی خاں کے تاریخی اور معاشرتی ناولوں کا بھی یہی حال ہے۔ راشد الخیری کے نام بھی نفسیاتی پہلو سے عاری ہیں۔ چونکہ ان کے کردار گہرے اور زوردار نہیں ہوتے محض المیہ واقعات کا بہاؤ دکھانے اور قائم رکھنے کے لئے لائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے قریباً تمام ناول معاشرتی ناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ مرزا رسوا کے ناولوں میں بھی نام معاشرت کے بے حد آئینہ دار ہیں لیکن چونکہ ان کے کردار گہرے اور زوردار ہوتے ہیں اس لئے ان کے معاشرتی لیبل ان سے ایک خاص تعلق رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مرزا محمد سعید کی "یاسمین" میں غیر شعوری طور پر ایک دو نام نفسیاتی اہمیت رکھتے ہیں۔ یاسمین اور پھول چند سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ کردار غیر معمولی خصوصیات کے حامل ہوں گے۔ پریم چند نے ہمیشہ نفسیاتی پہلو کی بجائے معاشرتی پہلو کا زیادہ تر لحاظ رکھا ہے اور اختلافِ موضوع کے مطابق ان کے نام بھی کبھی اَن پڑھ دیہاتی اور کبھی پڑھے لکھے شہری کرداروں کا اظہار کرتے ہیں۔

حامد اور حامدہ قسم کے نام زیادہ تر بلکہ تمام تر عورت ناول نگاروں کی اختراعِ ذہنیت تھے اور اس سلسلے میں والدہ افضال علی کے "گورڈ کے لال" نے اپنے زمانے کے ناولوں پر بے حد اثر کیا۔ لیکن شکر ہے کہ اب وہ زمانہ گزر گیا۔ اردو افسانوں کی موجودہ روش یہ ہے کہ ناموں کو معاشرت کے لحاظ سے رکھا جاتا ہے اور یہ طریقہ کار دنیا کے تنوع کو افسانہ میں لے آنے کا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے نفسیاتی پہلو پر نا درسعدوم والی توجہ دی جاتی ہے۔ پھر بھی چونکہ انسانی افعال، انسانی نفسیات کے آئینہ دار ہیں۔ اس لئے ناموں کا معاشرت کے مطابق ہو جانا ہی اس بات کے لئے کافی ہے اور کرداروں کے نام خود بخود نفسیات کے مطابق ہو جاتے ہیں مثلاً شرر کے "آغا صادق کی شادی" میں آغا صادق۔ صاف گو۔ سچا۔ وعدے کا پکا اور اپنا کہا کر کے دکھانے والا ہے اور نجفی بیگم یعنی ہیروئن۔ شرمیلی مگر ظریفیت اور بڑی بوڑھیوں کے اثر میں آجانے والی ہے اور ہیرو ہیروئن کی ان خصوصیات کی بنا پر ہی پلاٹ کی باقاعدگی کا دارومدار ہے +

"میراجی"

شعر

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

یاس یگانہ لکھنوی

ذوقِ محبّت کی خامی
۱۹۳۷ء
بادۂ سہ آتشہ

(ذیل کا ترجمہ جو میں نے اپنے عزیز دوست اختر اسلام احسن بی۔ ایس سی، ایل ایل۔ بی کی فرمائش سے کیا ہے۔ انہیں کے نام سے معنون کرتا ہوں۔)
(ح۔ ۵)

(۱)
فارسی

"چو نبود عشق عاشق را کمالے — نہ بندد جز مرادِ خود خیالے
طفیلِ خویش خواہد یارِ خود را — بکامِ خویش سازد کارِ خود را
بجوئے یک گل از بستانِ معشوق — زند صد خارِ غم بر جانِ معشوق"

(ملا جامیؒ در "یوسف و زلیخا" ۱۴۸۴ء)

(۲)
انگریزی

When love is not perfect, with one sole thought —
Himself — is the heart of the lover fraught.
He looks on his love as a charming toy,
The spring and source of his selfish joy.
One rose he would pluck from his love, and leave
A hundred thorns her lorn heart to grieve.

R.T. H. Griffith. (1888).

(۳)
اُردو

خامیٔ ذوقِ محبّت نے جہاں میں اکثر — حُسن کو رنج و مصیبت میں گرفتار کیا
جذبۂ شوق کی تسکین کا ساماں چاہا — اُن سے جب پیار کیا اپنے لئے پیار کیا
"عشقِ خود کام" نے اک لمحۂ عشرت کے لئے — "حُسنِ معصوم" کو آزردہ و بیزار کیا
چشمِ ناز سے اک گل کی تمنا میں حفیظ — دلِ محبوب کو محنت کشِ صد خار کیا

حفیظ جالندھری
۱۹۳۷ء

زلزلہ

زلزلے کو گزرے صرف دو دن ہوئے تھے، مگر اس قلیل عرصے میں سالہا سال کی زندگی کے جانکاہ مناظر اور خراش اثرات کے ہجوم نے گزرِ وقت کے احساس کو معطل کر دیا تھا جس طرح چند لمحوں کی نیند میں انسان کئی سال کی زندگی کو طے کر جاتا ہے اسی طرح اس بیداری کے خواب میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس قیامت خیز حادثے کو کئی برس گزر چکے ہوں۔

میں اُن چند خوش قسمت یا بدقسمت اشخاص میں سے تھا جن کو ابھی کچھ اور دنوں کی مہلت دی گئی۔

جدھر نظر اٹھتی تھی صرف گرد و غبار دکھائی دیتا جو نہایت بے ترتیبی اور بے پروائی سے جھومتا ہوا اِدھر سے اُدھر نکل جاتا یا چند بگولے جو اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے اُس یاس کے سبزہ و رختوں میں چھپ جاتے۔ کونٹے کے شہتیر اور خوبصورت شہر کی کائنات چند بے بسی ہوئی، خاموش آہیں رہ گئیں . . . ایک پراسرار سکون تھا۔ گویا تقدیر سانس لے رہی تھی۔

رنج و غم کا اظہار؟ آہ و بکا؟ چیخ پکار حادثات کی نوعیت اور گرد و پیش کے حالات سے اضافیت رکھتا ہے اس لئے جب رنج و غم کی صدائے بازگشت کی امید نہ ہو تو سوائے خاموشی کے جو اپنی آپ آواز ہے ذریعہ اظہار نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ جو چلتے پھرتے نظر آتے تھے اُن کے چہرے اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ تقدیر ہنس رہی تھی۔ "رو تو، بھلا کس کس کو روتے ہو"

میرے جذبات اور احساسات پر جمود کا عالم طاری تھا . . . محبت، ہمدردی، غم ایک حرفِ غلط تھا جس کو مٹا دیا گیا تھا۔

مقامیال آباد اور انڈین ملٹری ہسپتال کی طرف چل دیا۔ یہ ہسپتال زلزلے کے زخمیوں کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی واقف یا دوست مل جائے گا۔ باتیں کریں گے اور ممکن ہے کہ ضائع شدہ احساسات عود کر آئیں۔ شہر سے ہسپتال کا فاصلہ دو میل سے زیادہ نہیں مگر اس کو طے کرنے میں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی دوسری دنیا میں انتقال کیا ہو۔ شہر کی گزشتہ عظمت، قابلِ رشک سوسائٹی، ایک پریشان خواب کی طرح دماغ میں گھوم رہے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان دہشتناک اشکال کو ایک لمحے کے لئے قلیم کر لوں مگر بے سود۔ اسی بے معنی کشمکش میں ہسپتال کے قریب پہنچ گیا۔

ہسپتال کیا تھا، ایک وسیع میدان میں خیمے نصب تھے۔ جہاں کرنہ والے بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ میرے لئے یہ نظارہ ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ خون سے لتھڑے ہوئے جسم۔ رحم کی متمنی آنکھیں، ناامیدی اور افسردگی کی زندہ تصویریں تھیں۔ عورتیں، بچے، لوڑھے جوان بغیر کسی جنسی یا سوشل امتیاز کے وقت کے طویل لمحوں کو گن گن کر گزار رہے تھے۔ شاید اب میں تیسرے خیمے میں سے ہو کر واپس لوٹنے کو تھا کہ ایک نحیف سی آواز آئی "پانی!"

میں نے پیچھے دیکھے ایک کٹورے میں پانی ڈالا اور زخمی کو پیش کیا۔ پانی مانگنے والا ایک نوجوان تھا جس کے سر اور رخساروں پر پٹی کچھ اس طرح سے بندھی ہوئی تھی کہ اس کے ہونٹ اور ایک آنکھ کے سوائے اس کے چہرے کا اور کوئی حصہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ گھونٹ پانی پینے کے بعد مریض نے اوپر نگاہ اٹھائی اور میری طرف ایک لمحے کے لئے دیکھا۔ کٹورا میں نے اس کے ہاتھ سے لے لیا اور چلنے کو تھا کہ اُس نے میری آستین کو پکڑ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بغیر کسی حیل و حجت کے میں اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر زخمی نے آہستہ سے اپنے زرد ہونٹوں کو جنبش دی "کیسے رہے آپ؟" اور ساتھ ہی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔

"اوہو! زینیدر! تم ہو" حیرانی کی کوئی بات نہ تھی مگر میرے دل کو ایک ٹھیس سی لگی۔

زینیدر دو سال پہلے کوئٹہ میں آیا تھا۔ سول دفتر میں کام کرتا تھا چوبیس پچیس برس کی عمر تھی۔ خوبصورت اور خلیق نوجوان تھا۔ شیریں گفتار اور حسنِ سلوک کے باعث ہماری کلب کا ہر دلعزیز ممبر تھا۔ مجھے کئی بار اس کی معیت میں سینما جانے کا اتفاق ہوا اور میں نے ہمیشہ اس کو ایک سنجیدہ اور بامذاق انسان پایا۔ ہاکی اور ٹینس سے اس کو خاص لگاؤ تھا۔

ہمارے تعلقات کچھ خاص طور پر گہرے نہ تھے مگر موجودہ حالات

میں تو کسی محض صورت آشنا کو دیکھ کر آنسو بھر آنا کچھ عجیب نہ تھا اور ایک اپنی کلب کے ممبر کو دیکھ کر اور اس حالت میں دیکھ کر میرے خوابیدہ جذبات بیدار ہونے شروع ہوئے مگر زیندر کی کمزور حالت کو مدنظر رکھ کر میں نے ضبط سے کام لیا وہ مجھ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

زیندر بابو محلے میں رہتا تھا، وہ تنہا تھا۔ ابھی اُس کی شادی نہ ہوئی تھی۔ اسی لئے بیوی بچوں کی خیریت کے متعلق روایتی گفتگو کی ضرورت ہی نہ تھی۔

"اور کیا حال ہے؟" پھر اس نے کہا۔ اُس کی آواز پہلے سے زیادہ صاف اور بلند تھی۔ میں خاموش تھا کہ اس کو کیا جواب دوں، حال! کس کا حال! کھنڈرات کا حال . . . یا اُن دوستوں کا جو لاکھوں من مٹی کے نیچے دبے پڑے تھے!

"اچھا ہے"۔ خیمے کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

"کہیں رام لعل کو دیکھا! مجھے اُس کا کئی بار خیال آیا ہے"

اب میں کیا کہتا، کہ رام لعل نے بہنوں کا ساتھ دیا ہے اور اُس کی نوجوان بیوہ جس کو صرف چند دن پہلے کوٹلہ لایا تھا۔ اُس کے پاس کے خیمے میں دست و پا شکستہ سسک رہی ہے۔ مجھے اتنا ضرور معلوم تھا۔ مگر کہتا کون۔

"دیکھا نہیں۔ ہوگا کہیں . . ." میرے دماغ میں ایک جلن سی پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے فطری طور پر بات ٹالنے کے لئے کہا . . . "تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ کیا میں تمہارے لئے کچھ کر سکتا ہوں؟"

"میرے لئے؟ میرے لئے اور کیا کرو گے۔ یہی بہت ہے کہ تم آگئے۔ مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ آہ۔ اگر تم چپکے سے چلے جاتے . . ."

"زیندر۔ اچھا ہوا تمہاری ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ ورنہ تمہیں کس قدر زیادہ تکلیف ہوتی . . . تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے . . ." تسلی دیتے ہوئے میں نے کہا۔ مگر مجھ کو اپنے الفاظ بے معنی معلوم ہو رہے تھے۔

"موہن!" اُس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ اگر زلزلہ نہ آتا تو آج کے دن میں اور . . . مائے میں اور میری بیوی شاید بمبئی کی سیر کر رہے ہوتے . . . اگر میں نے اب تک شادی نہیں کی تو اس میں میری دُور بینی کو کوئی دخل نہیں . . . یہ سب تقدیر کا کھیل ہے۔ اچھا یا بُرا، یہ الفاظ ہمارے محدود خیالات کا ترجمہ ہیں۔

"تم اور تمہاری بیوی!" تعجب سے میں نے استفسار کیا۔ لیکن گزشتہ دو دنوں میں اتنے اور ایسے ایسے واقعات نظر سے گزرے چکے تھے کہ کسی بات پر تعجب کرنا فضول تھا۔

بجائے میرے سوال کا جواب دینے کے اُس نے ذرا لمبی سانس لی اور خاموش ہو گیا۔ اُس کی آنکھ سے اس کی اندرونی کشمکش اور کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اُس نے اپنے سر کو ذرا سر ہانے پر بلند کیا اور نہایت سکون سے کہنا شروع کیا۔

"موہن! مجھے معلوم نہیں کہ کسی اور صورت آشنا کو دیکھنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں، اس لئے میں تم سے چند آخری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ممکن ہو سکے تو نرملا سے کہہ دینا۔ جو کچھ کہ تم دیکھ رہے ہو۔ خدا جانے وہ بے چاری ہے بھی کہ نہیں . . . بہر حال میری قسمت نہیں یہاں کھینچ کر لے آئی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اپنی داستانِ غم تم سے کہہ ڈالوں ایک منٹ کے لئے زیندر خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔

"رائے صاحب رامیش چندر کا مکان تو تم نے دیکھا ہوگا . . . وہی نا۔ جہاں اُس روز کھڑا تھا . . . جب تمہاری ہیٹ ہوا سے اُڑ کر دور جا گری تھی اور میرے قہقہہ لگانے پر تم کچھ کھسیانے اور کچھ ناراض ہو گئے تھے"

مجھ کو یہ واقعہ کیسے بھول سکتا ہے۔ ساری گلی کے نیچے مجھے اب بھی ہنستے ہوئے نظر آتے تھے اور اس پر زیندر کا بلند اور بے اختیار قہقہہ میں نے سر کے اشارے سے بتایا کہ مجھے سب کچھ یاد ہے اور اس دلچسپ واقعہ کو یاد کرتے ہوئے میں خفیف سی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔

"ہاں تو وہی مکان ہے . . . بہر حال تھا . . . وہی جگہ تھی اور دفتر جاتے وقت میں اسی راستے سے گزرا کرتا تھا اور اس میں کوئی خاص امر قابلِ ذکر نہیں۔ میں عموماً پیدل جاتا تھا اور یہ راستہ ذرا نزدیک پڑتا تھا" میں نے سر جھکا کر اُس کے قریب کر دیا۔

"اُس واقعے کو آج دس مہینے ہوتے ہیں . . . میرے دماغ میں وہ دن کتنا تازہ ہے . . . ہاں دس مہینے ہوتے ہیں کہ نرملا کا بڑا بھائی جو کالج میں میرا ہم جماعت رہ چکا تھا گرمیوں کے دن گزارنے کوئٹہ آیا اور ایک دن مجھے سرِ بیر کی چائے پر مدعو کیا۔ اس دن نرملا کو پہلی بار دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں اور ہماری اہمیت ایک بے حس کھلونے سے زیادہ نہیں . . . میری تقدیر میں یہی تھا۔

اور مجھے معلوم نہیں کہ نرملا کی محبت کا بیج میرے دل میں کس طرح بو دیا گیا۔ مجھے اپنی زندگی میں اپنی ہم عمر لڑکیوں سے زیادہ میل جول کا موقع

نہیں ملا اور کبھی یہ بات میرے دماغ میں نہ آئی تھی کہ میں بھی کسی سے محبت کروں گا۔ میں اپنے آپ کو ہمیشہ اس بے اختیار جذبے کے ناقابل خیال کرتا رہا۔ مگر یہی تو قدرت کی ستم ظریفی ہے۔ اسی گلی میں سے اب بھی گزرتا جہاں سے اس سے قبل سیکڑوں مرتبہ گزرا تھا مگر جب نرملا کا گھر قریب آتا تو اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز میرے کانوں کو سنائی دینے لگتی اور میرے قدموں میں بے قاعدگی پیدا ہو جاتی۔ دونوں وقت نرملا دروازے پر کھڑی ہوتی۔ میں بغیر ادھر اُدھر دیکھے سیدھا گلی کے آخر تک چلا جاتا اور یہ دوری مجھ میں کچھ جرأت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔ گلی سے مڑتے وقت میں بے اختیار پیچھے لوٹ کر دیکھتا۔ صرف ایک نہایت مختصر لمحہ کے لئے اور نرملا جھینپ کر اندر ہو جاتی۔ اور میں دفتر جا پہنچتا۔ وہ ہر روز صبح اور شام میری منتظر رہتی۔ رفتہ رفتہ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالنا شروع کی۔ اُس کا حسن روز بروز بڑھتا ہوا نظر آتا۔ اب میں نظر بھر کر اس کو دیکھتا اور وہ مسکرا کر نگاہ نیچی کر لیتی۔

"دن ایک خواب کی مانند گزر رہے تھے۔ ایک خواب تھا۔ مگر ہماری زندگی اپنی بے حجاب حقیقتوں کے باوجود آتشیں شیریں اور دیرپا نہیں۔ کاش کہ ہماری زندگی ایسے ہی ایک آدھ خواب پر مشتمل ہوتی۔ یہ نام نہاد حقیقی زندگی ہی ہماری دشمن ہے۔

"نرملا کو صبح و شام دیکھنا میری زندگی کا اہم ترین حصہ تھا۔ اگر کسی دن کسی وجہ سے وہ نظر نہ آتی تو میرے لئے اپنے مفوض منصبی کو انجام دینا دوبھر ہو جاتا۔ دن رات میری ذہنی فضا ایک خواب میں مستور رہتی اور یہ خواب نرملا کے معصوم حسن کی نیرنگیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اس ذہنی تگ و دو کا نتیجہ کچھ نہ ہوگا۔ میں نے کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے غور کیا۔ آخر یہی سمجھا کہ نرملا سے ملاقات اور بات جاتا تھا۔ بات کر وقت مجھے نرملا الفاظ میں ڈھالنے اور آخر کار میں ایک ان فقروں کو خوب یہ انتظار تھا۔

"نرملا کے بھائی کی رخصتیں ختم ہونے کو تھیں۔ ایک دن اتفاق سے بازار میں اُس سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے شام کے کھانے پر اس کو بلایا اور اُس نے نہایت بے تکلفی سے آنے کا وعدہ کیا۔ کھانے پر ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ جاتے وقت اُس نے مجھ کو دوسرے روز شام کی چائے پر بلایا۔ مجھے اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے تھا۔ مگر میں نے کچھ انکار کیا مگر اُس کے اصرار پر مان گیا اور اب دوسرے دن کے انتظار میں بے قرار تھا۔

"میں نے اپنی تیار کردہ تقریر کو ذہنی طور پر دہرانا شروع کیا۔ سوچا اور پھر سوچا۔ پہلے یہ کہوں گا۔ پھر اس طرح سے تمہید ۔ ۔ ۔ الغرض اپنی تصورات میں ڈوب کر رات کاٹ دی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ نرملا کو میری آمد کی خبر دی گئی ہوگی۔ مگر باوجود ہر طرح کے دلائل کے یہ یقین نہ تھا کہ وہ مجھے گفتگو کا موقع دے گی۔ میں اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے کس قدر بے قرار تھا۔ ۔ ۔ ساڑھے چار بجے جانے کا وقت مقرر تھا۔ مگر میں اضطرار کی حالت میں تین بجے ہی روانہ ہو گیا۔ پہلے آ جانے کا بہانہ ایک آدھ بن ہی سکتا تھا۔ گھڑیوں کے وقت کا اختلاف ۔ ۔ ۔ یا چابی دینا بھول جانا ۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ محض اپنے دل کو فریب دینا تھا اور یہ کچھ مشکل بات نہیں۔

"دروازے پر جا کر میں نے دستک دی ۔ ۔ ۔ میری مشکلیں کس قدر جلد آسان ہو رہی تھیں۔ میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں نہ تھا، گھبرا رہا تھا۔ دنیا کے ہنگاموں میں کتنی رونق نظر آ رہی تھی۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ کسی مہم میں ابتدائی کامیابی خواہ وہ کتنی ہی بے حقیقت کیوں نہ ہو ایک شگون (خدا کرے ایسا آتا ہے جس کے خوش کن تاثرات کی رو ہمارے

"گ س ؛ کے

قدرے جلد آجانے پر افسوس تھا۔ لوٹنا چاہتا تھا کہ بیٹھک کا دروازہ کھلا:۔

"آپ اندر آجایئے . . . بھائی صاحب نوکر کو ساتھ لے کر ذرا بازار گئے ہیں" شرماتے ہوئے زملا نے کہا۔ ان الفاظ کی شیرینی صرف محسوس ہوسکتی ہے، بیان نہیں ہوسکتی۔ ابھی تک اُس کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ ہماری محبت کی تہذیب کتنی سنجیدہ تھی۔ خاموشی سے اندر داخل ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا مگر مجھے اپنے ہوش وحواس پر قابو نہ تھا۔ بغیر کسی آئینے کی مدد کے میری پریشانی مجھے اپنے چہرے پر عیاں نظر آرہی تھی۔

"زملا میری طرف دیکھ رہی تھی اور میرا دل بیٹھا جارہا تھا۔ زملا سے گفتگو کرنا میں نے کس قدر آسان جانا تھا۔

"زملا نے میری پریشانی کو دیکھا اور مسکرا کر ساڑھی کے دامن کو مروڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"زملا آئی اور چلی گئی۔ میں بہوت بیٹھا۔ خواب دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد پھر میں نے اپنے آپ میں کچھ سکت محسوس کی۔ اپنی محبت کی پہلی تقریر، کو دہرانا شروع کیا مگر الفاظ بے ربط اور بے ترتیب معلوم ہونے لگے اور الفاظ کے مناسب معانی جن پر میں نے کئی دن صرف کئے تھے معنی سے سربرا معلوم ہورہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے سب کچھ بھول گیا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے حواس بجا ہونے لگے۔ میں نے جیب سے گھڑی نکالی۔ ابھی سوا تین بجے تھے گھڑی کو ایک گھنٹہ آگے کر دینے سے کچھ سکون ہوا۔ اب جلد آجانے کا بہانہ بالکل تیار تھا۔

زملا پھر اندر آئی۔ . . .

نہ تھی۔ یہ شاید ملاقات کا آخری موقعہ ہو۔ میں نے دل میں خیال کیا اور بغیر کسی تمہید کے میں اپنے جذبات کے اظہار کی کوشش کرنا چاہتا تھا مگر الفاظ نہ ملتے تھے۔ معلوم نہیں میری رٹی ہوئی تقریر کیا ہوئی۔ میرے دماغ پر کچھ اور ہی باتیں مسلط تھیں۔

"میں ماتاجی کو بتانے گئی تھی کہ آپ آگئے ہیں . . . ماتاجی کی طبیعت کل سے کچھ ناساز ہے۔"

"اور خیریت ہے" میں نے رکتے ہوئے پوچھا اور میرا بدن کانپنے لگا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے کسی عورت سے ان حالات میں بات کی ہو۔

"آپ اتنے گھبرا کیوں رہے ہیں . . . آرام سے بیٹھیں۔ . . . بھیّا بھی آجائیں گے۔ وہ آپ کی بہت تعریف کیا کرتے ہیں . . . آپ ذرا سکون سے بیٹھیں . . ."

"میں نے اب پہلی بار دیکھا کہ میں کرسی کی سیٹ کے ایک کنارے پر اٹکا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی بدحواسی پر بہت ندامت ہوئی۔ زملا کی آنکھوں میں شرارت آمیز تبسم تھا اور چہرے پر سرخی دوڑ رہی تھی بات کو ٹالنے کے لئے میں نے یوں ہی کچھ ریزرب کہنا شروع کیا۔ مجھے الفاظ ملنے مشکل ہوگئے . . . اگر میری جرأت اور میرے منصوبوں پر ہی ہماری بات کا انحصار ہوتا تو بات ختم تھی۔ مگر اُف۔ زملا کتنی حواس کی مالک تھی۔ مجھ کو اس کے یہ الفاظ کبھی نہ بھولیں گے۔ "کیا آپ نے مجھے پہلی بار دیکھا ہے کہ آپ ایک اجنبی کی طرح گھبرا رہے ہیں" کاش میں اجنبی ہوتا۔ اجنبی کو گھبرانے کی کیا ضرورت؟ میرا اجنبی نہ ہونا ہی تو میری مشکل تھی۔ البتہ زملا کی آزادانہ طرزِ گفتگو نے مجھے جرأت دلائی اور میں نے پُراسرار طریقے سے سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں"

س نے شرماتے
ں کچھ حواس میں
لیا۔ . . .
صاف طور پر پوچھ
ت ہے بے انتہا

قادر نہ تھی۔
میں نے اپنی جیب سے

"نرملا کا بھائی چند دنوں کے بعد رخصت ہو گیا اور میں
مقررہ ہوا۔ اس بات کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ
کس طرح طے کیا۔ مگر اس سراپا فریب دنیا میں اگر کوئی
ہو سکتی ہے تو یہ یقینی امر ہے کہ میں اتالیق مقرر ہو گیا
خواہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں . . . مجھے
پر شک گزرنے لگتا ہے۔

"یہ میری زندگی کی بہار تھی . . . اُف
چند سیکنڈ کے لئے زمیندر خاموش
کرتے ہوئے میں نے چند گھونٹ پانی پیا"
نے زیادہ صاف اور بلند آواز میں کہا:
"نرملا جوان تھی۔ خوبصورت
سینا پرونا حسبِ دستور جانتی تھی
کا کاروبار کرتا تھا اس لئے یہ کہ
بہادروں اور رائے صاحبوں
اُن حالات میں نرملا
لڑکے کے ماسٹر کی حقیر سی شکل
پسندی کی انتہا دیکھ کر میں
خیال کرتا تھا، اور کسی کو
اور اس کی محبت کا خیال

"رائے صاحب
ایک دن مجھ سے بیان
کیا گیا ہے، یہ میرے
"لیکن میں
جائیں گے۔ معلوم نہ
برا بھی خیال نہ کیا اور
"آخر کار نر
"صرف د
انتہائی عزم و فکر کے
کے ساتھ نرملا کا نام
رام لعل
بھائی نہیں دیتا تو

ں دیں . . . یہ ہماری بزدلی . . . ہے۔ اخلاقی
،" میں نے نرملا کو اپنے فوری خیالات سے مطلع کر دیا۔
اور اُس کی بیوی نے بھی ہم سے اتفاق کیا اور اگر
اور نرملا . . . !"

کچھ اس طرح سے رُک گئی جس طرح تھکا ماندہ
، بار گی بے حس و حرکت گر پڑتا ہے۔
شاید کمزوری کی وجہ سے وہ خاموش ہو گیا
کہا۔
ہو گئے . . . !"
یا۔ میں نے آگے سرک کر اُس کے
کے ساتھ معلوم نہیں کہاں پہنچ

نظر رکھ کر شہر کو پبلک کی آمد و
کے کھنڈروں کو دیکھتے جب
، پاس سے گزرا۔ رائے
ذرا نمایاں تھا۔ ایک لمحے
، والا مکان ہے اور کھڑکی
لے نوجوان کی طرف
اسے بے خبر ہیں۔
سامنے سڑک پر
آواز میرے کانوں
منڈروں کے غیر

رومال نکالتے ہوئے کہا

"ہاں، مگر یہ تو آپ کو پہلے سے معلوم ہے . . . آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں"۔

"یہی نا کہ پھر وہ چلے جائیں گے"۔

"مجھے جب کبھی یہ گفتگو یاد آتی ہے تو اپنے بے ربط الفاظ اور معانی پر کبھی شرم سی محسوس کرتا ہوں کبھی مسرت۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ جگفتگو دو محبت سے لبریز دلوں کے درمیان ہوتی ہے وہ اس قدر مضحکہ خیز طور پر بے ربط ہوتی ہے کہ تھیٹر وغیرہ کے مسخروں کے پارٹ اُس کے سامنے ہیچ دکھائی دیتے ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس ربطی کو محسوس نہیں کیا جا سکتا اور دونوں طرف نہایت سنجیدگی سے ہضم ہو جاتی ہے۔

"اب میں پھر خاموش تھا اور چاہتا تھا کہ ہمایر کا نعرہ لگا کر سب کچھ کہہ ڈالوں مگر سوائے اس کے کچھ نہ کر سکا کہ جیب سے گھڑی نکال کر بغیر کسی مطلب کے اُس کے مطالعے میں مصروف ہو جاؤں۔

"ساڑھے چار بج گئے ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا مگر میرے الفاظ ترملا نے سن لئے تھے۔ "ساڑھے چار! یہ کیسے! آپ کی گھڑی اور ہماری کلاک کا وقت تقریباً ایک برابر ہوتا ہے۔ کم از کم دس اور چار بجے کے قریب . . ."

اب میں نے اس موضوع پر گفتگو کرنا زیادہ آسان جانا۔ خیال آیا کہ پوچھوں کہ اُس کو گھڑیوں کے وقت کی مطابقت کا علم کیسے ہوا۔ مگر گزشتہ ایام کی صبح و شام کوئی بھولنے والی چیز نہ تھی، اور یہ سوال کرنا حماقت خیال کیا۔

"ابھی تو ساڑھے تین کا وقت ہے" اُس نے پھر کہا

"اوہو۔ پھر تو میں نے بہت تکلیف دی۔ میں کل رات گھڑی کو چابی دینا بھول گیا، اور یہ وقت اندازاً کر دیا تھا . . ."

"اچھا تو آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ مگر اُس کو میری زبان سے سننا منظور تھا۔ وہ میرے رُکتے ہوئے بے ربط الفاظ میں بہت کے والہانہ اظہار کی پیاسی تھی۔

یہ بات عورت کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ محض خاموش جذبات سے تسکین نہیں پاتی۔ یہ دیوی پرستش کے علاوہ مسترد کے الاپ کی بھی متمنی ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ بے قرار تھی۔

"ترملا" میں نے دبے ہوئے الفاظ میں کہا۔ "اگر یہ ہماری آخری ملاقات ہے . . . تو میں یہ راستہ کل سے چھوڑ دوں گا . . . مجھے اپنے آپ سے راہِ فرار نظر نہیں آتی"

"آپ تو بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گئے . . کیا آپ قسمت پر اعتبار نہیں کرتے . . . آج کل کے پڑھے لکھے لوگوں کا یہی حال ہے" ترملا نے دروازے کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ترملا میں بالکل بے بس ہوں . . . میں نہیں جانتا مجھے کیا ہو گیا۔ میں اپنی ایک کمزوری کیا ہزار کمزوریاں تسلیم کرنے کو تیار ہوں"۔ اپنے الفاظ میں اور گفتار میں بڑھتا ہوا جوش محسوس کر کے میں نے خاموش ہو جانا بہتر خیال کیا۔

"کچھ سیکنڈ تک خاموشی رہی میرے رگ و ریشہ میں ایک ہیجان تھا۔ مگر ترملا نہایت سکون سے کھڑی تھی۔ وہ سر جھکا کر کچھ سوچ رہی تھی۔ میرے جذبات کا دریا امنڈا ہوا چلا آرہا تھا اور دماغ تقریباً معطل ہو چکا تھا۔ اس چند لمحوں کی خاموشی میں امید و بیم کے مختلف مناظر میرے سامنے سے گزر رہے تھے . . . طوفانی گھٹائیں اُٹھیں ایک لمحے کے لئے چھا گئیں اور کھل گئیں۔

"آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے"۔

"ایف اے تک" چونک کر میں نے جواب دیا۔ جیسا کہ کسی آفیسر نے سوال کیا ہو۔ "آپ میرے چھوٹے بھائی کو . . . جو پانچویں میں پڑھتا ہے۔ پڑھایا کریں . . . وہ پڑھائی میں کمزور ہے اور ماتاجی نے کئی ماسٹر مقرر کرنے کا ارادہ کیا ہے مگر یونہی وقت گزرتا رہا ہے، اور ابھی پتا ہی کسی ماسٹر کی تلاش میں ہیں اچھا میں ذکر کروں گی . . ."

"بغیر کسی مزید گفتگو کے وہ کمرے سے نکل گئی۔ حالات کی رفتار اور مرا فقت مجھے ناقابلِ یقین اور ناقابلِ برداشت معلوم ہو رہی تھی۔ کیا یہ خواب تھا . . . خواب میں وقت کی رفتار ہمارے دماغی تاثرات کے ماتحت ہوتی ہے۔ مگر یہ خواب نہ تھا۔ آہ . . . کاش کہ یہ سب کچھ خواب ہوتا . . . مگر زمانے کی ہیبت ناک حقیقت سے نجات کہاں . . .

"ترملا سے ملاقات اُس کی گفتگو اور گزشتہ چند منٹوں کے نفسیاتی واقعات نہایت تیزی سے میرے دل و دماغ میں سے گزر رہے تھے۔ زندگی بعض اوقات منجمد اور سست ہوتی ہے اور ایک ذرا سی تبدیلی سے کس قدر تیز اور ہیجان آفریں معلوم ہونے لگتی ہے۔

تیاگ

لو آج تمہیں میں نے اپنے غمگیں دل سے رخصت دے دی!
اور خانۂ دل کے دروازے پر یہ لکھا "میں بھول گیا!"
گر آئے کوئی اور پوچھے کیا میرا رہتی ہے یاں پر؟"
میں کہہ دوں گا "کیا کہتا ہے؟ میں بات نہیں سمجھا تیری!"
لیکن یہ کیا ہوا جب کانوں میں کوئی میٹھی آواز آئے!
میں چونک پڑوں اور یہ سوچوں! یہ میرا کی آواز نہ ہو!!
لیکن یہ کیا؟ جب لوگوں سے میں ذکرِ محبت سُن پاؤں!
بے ساختہ یاد آجائیں مجھے جو باتیں تم نے کیں مجھ سے!
محسوس مجھے یوں ہوتا ہے اک ہاتھ ہے میرے ہاتھوں میں!
میں سرگوشی میں کہتا ہوں "ہاں مجھ کو تم سے محبت ہے!"
میں دیکھتا ہوں تم سڑکوں پر آہستہ آہستہ ہو رواں!!
اور پیچھے پیچھے بے بس اور مجبور چلا آتا ہوں میں!!

ہاں آج تمہیں میں نے اپنے غمگیں دل سے رخصت دے دی
اور خانۂ دل کے دروازے پر یہ لکھا "میں بھول گیا!"
گر آئے کوئی اور پوچھے "کیا میرا رہتی ہے یاں پر؟"
میں کہہ دوں گا "کیا کہتا ہے؟ میں بات نہیں سمجھا تیری؟"

میراجی

مریاں نے مرنے
کرایا اور سمجھا کہ اب وہ د
عاقبت کے لئے اس نے
"سات سال
ہیں دینا کی مصیبتو
کرتی رہیں۔ آج
گی اتنی بڑی
رکھے۔ چند
کا سہارا

ی کیوں۔ مگر می۔ ذرا سمجھنے کی کوشش
باغوں میں چھپ چھپ کے رہیں
کم از کم ہیں اب لاوارث تو نہ
چاہیئے تھا۔ زندگی کے دن
خیال رکھنا تھا۔ مہینے کے بعد

ارہا۔ اسے خیال تھا کہ میں
کو اپنے روزگار کی فکر تھی۔
ک اس سے اب بھی
مجھے اچھی نظروں سے
لگے۔ دو وقت
میلے کپڑے
ی اچھی طرح

ئی جس
ے اس
ایسے
یک
ہنے
!
!!
!!!

ایک مصیبت میں پھنس گئی۔ رات دن کا آرام جاتا رہا اور میں سوچنے لگی کہ کہیں اور نوکری کروں تو اچھا ہے کہ میرے نصیب جاگے۔ جمیلہ کا خاوند ایک دن بیرسٹر کی عیادت کو آیا۔ شاید وہ اس کا دوست تھا۔ گو بیرسٹر کے ہاں پہلے تو کبھی میں نے اسے نہ دیکھا تھا۔ مگر یہ معمولی بات ہے۔ خیر جمیلہ کے خاوند نے مجھے دیکھا اور وہ حیران رہ گیا۔ اس نے دیر تک میرے پاس بیٹھ کر میری باتیں سنیں اور کچھ تسلی بھی دی۔ دوسرے تیسرے دن وہ پھر آیا تو جمیلہ کا پیغام واپسی بھی لایا۔ شاید جمیلہ کو اپنے جھوٹے الزام کا احساس ہوا یا شاید اپنے ظلم کے بدلے اب مجھے وہ اس مصیبت سے چھڑانا چاہتی تھی۔ بہرحال میں تیسرے دن بیرسٹر کے لئے ایک دوسرے نوکر کا انتظام کر کے جمیلہ کے ہاں پھر واپس آ گئی۔

یہاں آ کے دیکھا تو گھر کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ وہ خلیج جو میاں بیوی کے درمیان حائل تھی دن بدن وسیع ہوتی چلی جاتی تھی۔ جمیلہ کا دل بھی اب پتھر ہو چکا تھا۔ اس نے اب نوکروں سے پردہ وغیرہ چھوڑ دیا تھا اور اسے اپنے خاوند کی طرف سے جیسے بالکل اطمینان تھا۔ اسے اب اس بات کی ذرا پروا نہ تھی کہ وہ رات کو کتنے بجے گھر آتا ہے۔ کون کون سی کلب میں جاتا ہے۔ کس کس کے ساتھ پھرتا ہے اور کیوں اتنی راتیں باہر کاٹ آتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکی کہ وہ کس طرح ان باتوں سے چشم پوشی کرتی تھی۔ ایک عورت اپنے خاوند کی اس بے پروائی کا خیال اسی وقت نہیں کرتی جب وہ خود بھی اتنی ہی بے پروا ہو جائے اور یہ ناممکن ہے۔ اس کی بیوی ہوتے اسے ضرور تصور راہبت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کم از کم میں تو یہی جانتی تھی۔ خیر یار! مجھے یہ بھی خیال آیا کہ شاید ظاہر داری کی خاطر یہ اس کی اس بے پروائی کو اس لاپروائی سے ٹال جاتی ہے یا شاید یہ بے پروائی بھی ایک ریاکاری اور ڈھونگ ہو۔

میرے ساتھ اب جمیلہ کا سلوک کچھ مختلف تھا۔ وہ مجھے ہر وقت کام میں مصروف دیکھنا چاہتی تھی۔ کام اچھا ہو بس۔ اسے اب اور کوئی وہم و گمان بھی نہ تھا۔ شاید وہ اپنی پہلی غلطی کی ضرورت سے زیادہ تلافی کرنا چاہتی تھی۔ جب کبھی موقعہ ملتا وہ مجھ سے کنارہ کرنے کی کوشش ہی کرتی۔ اسے اب بھول کر بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ ایک ناگن کو وہ پہلو میں پال رہی ہے۔ وہ جیسے میری طرف سے بالکل مطمئن تھی۔ پہلی سب باتیں بھول چکی تھی یا کیا پتہ ہے وہ میری طرف سے دیدہ دانستہ آنکھیں بند رکھنا چاہتی تھی۔ وہی کبوتر کا بلی کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا۔

مجھے جمیلہ کے ہاں واپس آنے کی بڑی خوشی ہوئی۔ یہ نہیں کہ یہ گھرانہ اچھا تھا۔ نہیں۔ یہ خوشی کچھ اور ہی تھی جس کو میں اب کچھ کچھ سمجھنے لگی ہوں۔ یہ خوشی وہ تھی جو ایک ناگن کو ہو سکتی ہے جب اس کا پھن ٹوٹے کے منہ سے نکل آئے اور اسے ڈسنے کا موقعہ مل جائے۔ یہ انتقام کی خوشی تھی جس کے لئے جمیلہ نے خود مجھے تیار کیا تھا اور جس کے لئے میں اب اپنی تمام طاقتوں کو پورے زوروں پر دیکھتی تھی۔ مجھے اب جمیلہ ایک بے بس کبوتری نظر آتی تھی جو میرے شکنجے میں پھڑک رہی ہو۔ میں جب کبھی رات کو سوتی اور سوچتی تو میرا سینہ زور زور سے ابھر اکرتا۔ میرا دم سیر ہو جاتا اور میرا خون کھولنے لگتا۔ میں نے جمیلہ کے ہاں آتے ہی اپنے انتقام کی تدبیریں سوچنی شروع کر دیں اور صورت حالات میرے بالکل موافق نظر آتی تھی۔ جمیلہ اور اس کا خاوند بالکل اس طرح رہتے تھے جیسے ایک مکان میں دو کرایہ دار جنہیں ایک دوسرے سے بولنے سے بھی نفرت ہو۔

تم پھر کہو گی میں کس طرح ایسی محسن کش بن گئی مگر ای اس میں میرا کیا تصور تھا میں اب دنیا کے مصائب جھیل جھیل کر سنگ دل ہو چکی تھی میری طبیعت کی وہ نرمی اور گداز جسے میں گھر سے لے کر نکلی تھی اب جاتے رہے تھے۔ میں اب سخت تھی پتھر کی طرح۔ میرا دل اب وہ دل ہی نہیں رہا تھا۔ میں اب اخلاق اور سماج کے قوانین پر ہنسا کرتی تھی۔ مجھے بارہا ان لوگوں کی سادہ لوحی پر ہنسی آتی تھی جو اپنی زندگی محض اس لئے ایک مصیبت بنا لیتے ہیں کہ سماج اور مذہب والے اُن سے کچھ توقعات لگائے رکھتے ہیں اور انہیں ان توقعات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ مگر آخر یہ ہے کیا؟ مذہب۔ سماج۔ اخلاق۔ کچھ بھی نہیں۔ چند اور پوچ۔ امیر طبقے کے خالی از جذبات مردہ اور سڑے ہوئے دماغوں کی اختراع۔ اصل میں زندگی ایک کشمکش کا نام ہے اور وہ کشمکش مذہب اور اخلاق سے کہیں بالا ہے۔ میں اس عرصے میں ان تمام حقیقتوں سے آگاہ ہو چکی تھی۔ آخر مجھ میں بھی کچھ سمجھ تھی۔ مجھے بھی خدا نے کچھ دماغ دیا تھا۔ لیکن امی تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ ایک گاؤں میں رہ کر ان باتوں کی کبھی سمجھ نہیں آ سکتی۔ یہ جان جوکھوں کا کام ہے اور میں اس راز کو فاش کرنے کے لئے جسے ہمارے سامنے بچپن سے ہی اس کد و کاوش سے سجایا جاتا ہے اپنی جان پر کھیل گئی۔

جمیلہ کا خاوند پہلے تو کچھ دنوں ڈرتا رہا۔ اُسے شاید جمیلہ کی اسی بناوٹی بے پروائی سے ڈر لگتا تھا۔ مگر کب تک وہ ناکردہ گناہ جو جمیلہ نے

میرے سر لگا یا تھا اس کے دل میں بھی کھٹکتا تھا اور وہ بھی اب انتقام لینے کے لئے بالکل تیار تھا۔ ادھر میری تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ میرا زاویہ نگاہ ہی کچھ اور بن چکا تھا اور نہیں جمیلہ سے اپنا انتقام لینے میں ذرا بھی دقت پیش نہ آئی۔ آخر ہونا تو وہی تھا جس کے لئے جمیلہ نے مجھے اور اپنے خاوند کو اپنے ہاتھوں تیار کیا تھا۔

تمہاری چھوکری اب امی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ مگر نہیں نہیں تباہ کیوں۔ کس کو اختیار ہے کہ میرے عمل کا جائزہ لے۔ مجھے یقین ہے کوئی کسی کے اعمال کا ذمہ دار نہیں اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجھے سزا کا مستحق سمجھے۔ آخر میں نے کیا کیا، وہی نہ جس کے لئے دنیا نے مجھے مجبور کیا۔ جس کے لئے دنیا بھر کی طاقتوں نے مجھے اکسایا اور ابھارا تو پھر اس میں میرا اپنا کیا قصور رہے۔ تمہاری غربت اور ناداری میرے بس کی بات نہ تھی۔ رشتہ داروں کا ہم سے اس قدر ظلم کرنا ہمارے اپنے بس میں نہ تھا اور جمیلہ کے ماں سے اس طرح بے بسی کی حالت میں نکال دیا جانا بھی تو میرے بس کی بات نہ تھی۔ آگے جو کچھ ہوا وہ تم سمجھ ہی سکتی ہے۔ اس میں میرا کیا قصور تھا بجز بوی ناداری۔ ناچاری۔ احتیاج۔ غربت۔ کیا دنیا ان حقائق سے آنکھیں بند کر سکتی ہے اور اگر کرتی ہے تو کیوں۔ کیا یہ بھی ایک گناہ نہیں! میں کہتی ہوں یہ میرے گناہوں سے کہیں زیادہ خطرناک اور مہلک ہے۔ کیونکہ میں مجبور تھی اور یہ سماج کے اجارہ دار مجبور نہیں ہوتے

آخر امی آج میں اپنے کئے کی سزا بھگت رہی ہوں۔ جمیلہ کے خاوند سے مدتوں کھلی ملی رہی اور جمیلہ کو ذرا پتہ نہ لگا۔ جمیلہ کے خاوند نے ظاہرداری کی خاطر میرا نکاح ایک مرہل سے نوکر سے کروا دیا اور میں رضامند ہو گئی۔ اس بات پر رضامند ہو گئی کہ جو کچھ بھی ہو میں اسے بدنام نہ ہونے دوں گی۔ کسی پر بھی اس راز کو فاش نہ کروں گی اور دنیا کو جو ہمارے مصائب سے دیدہ دانستہ آنکھیں بند کر لیتی ہے اس امر کی تہ تک بھی نہ پہنچنے دوں گی جس کا اسے کسی صورت بھی حق نہیں پہنچتا۔

اب میں خط کو امی ختم کرتی ہوں۔ معاف کرنا میں نے وہ باتیں کیں اور کہیں جن کی تمہیں مجھ سے امید نہ تھی مگر چونکہ مجھے اب یقین تھا کہ اب میں ایک لمبے سفر کے لئے تیار ہو رہی ہوں۔ میں نے بے خوف و خطر وہ سب کچھ کہہ دیا جو میری طرح ہزاروں کو پیش آتا ہے مگر کسی کو کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ دوپہر ڈھل رہی ہے اور باورچی بچارے نے جسے میں نے اب تک اپنے بستر کے پاس باندھ کے بٹھا رکھا ہے ابھی شام کے کھانے کے لئے چیزیں لینے بازار جانا ہے۔

میری حالت اب خطرناک ہوتی جاتی ہے۔ بخار بہت تیز ہے اور مجھے اپنا جسم جلتا معلوم ہوتا ہے۔ ادھر اس مریل خاوند کے نام پر جو کچھ میں نے کیا وہ میرا جان لیوا بن رہا ہے۔ مجھے اب درد شروع ہو گیا ہے جو مجھے یقین ہے میری موت اور ایک نئی جان کی تخلیق میں ہی ختم ہوگا جو دنیا کے سامنے اس کے ظلم و ستم کو آشکارا کرنے کے لئے میری اور جمیلہ کے خاوند کی باہمی کوششوں سے لائی گئی ہے۔ مگر لوگ اس کو بھی نہیں سمجھیں گے۔ وہ دیدہ دانستہ بلی کی طرف سے آنکھیں بند کرنے والے اب واقعی اندھے ہو چکے ہیں اور اس راز کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ نہ جمیلہ مجھے کوسے گی نہ لوگ مجھے کچھ کہیں گے۔ کیونکہ ایک سال سے میں اپنے مریل خاوند کی نام نہاد بیوی رہ چکی ہوں۔ کوٹھڑی کی دیواریں اب جل رہی ہیں۔ مجھے ہر کونے میں آگ کے شرارے نظر آرہے ہیں جو مجھے جلانے کی خاطر میری طرف ہر سمت سے بڑھے چلے آرہے ہیں۔ امی۔ ہاں وہ دیکھو آگ ہی آگ۔ چاروں طرف مجھے آگ نظر آرہی ہے۔ میں جل رہی ہوں۔ بچانا بچانا امی مجھے بچانا۔ میں جل گئی۔ میں جل گئی . . .

آگ اب ماہم ہو گئی ہے اور مجھے پھر کچھ کہنے کی فرصت ملی ہے۔ میرا مریل خاوند دایہ کو بلانے کے لئے باہر گیا ہے اور جمیلہ کا خاوند میرے سرہانے بیٹھا ہے۔ باورچی بے چارا اب خط لکھتے لکھتے تھک گیا ہے اور حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔

گھبراؤ مت امی میں تمہاری خاطر بہت کچھ چھوڑے جا رہی ہوں۔ جمیلہ کے خاوند نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ اس خط کے ساتھ وہ سب کچھ تمہیں پہنچا دے گا تم اس سے موٹی کی پرورش کرنا۔ اسے لکھنا پڑھانا اور جب وہ بڑا ہو جائے تو اسے یہ میرا خط دکھانا اور کہنا کہ اس بیرحم دنیا سے میرا انتقام لے اور جی بھر کر انتقام لے . . . وہ آگ آگ۔ امی اب پھر آگ مجھے نگلنے کو میری طرف دوڑی آرہی ہے۔ جمیلہ کے خاوند کا ٹھنڈا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے اور مجھے اب نیند آتی جا رہی ہے۔ اندھیرا ہو چلا ہے۔ درد۔ ہائے ٹیسیں۔ میں مر گئی۔ خدایا۔ امی مجھے بچا۔ میں چلی . . .

محمد حمید الدین ایم اے

غزل

نشانے پر جو میں نے اپنی جانِ ناتواں رکھدی
تو پھر کیوں مُسکرا کر ہاتھ سے تُو نے کماں رکھدی

ذرا اس بُلبلے کو دیکھ موجوں کے تھپیڑوں میں
خلاصہ کر کے گویا زندگی کی داستاں رکھدی

وہ تیرا حُسن ہو یا عشق میرا ایک آتش ہے
ترے رُخ پر عیاں کر دی مرے دل میں نہاں رکھدی

صبا دامن کشاں خاموش غنچے سبزہ بیگانہ
الٰہی کس چمن میں میں نے طرحِ آشیاں رکھدی

کہیں انسان کے جھگڑے کہیں شیطان کے جھگڑے
یہ تیرے دل میں کیا آئی کہ بنیادِ جہاں رکھدی

ملائک کو نہ کر دیں منحرف بے رحم نظارے
بنی آدم کی دُنیا تُو نے زیرِ آسماں رکھدی

اجل کے ہاتھ میں مجھ کو بنا کر اِک کھلونا سا
مرے دل میں تمنّائے حیاتِ جاوداں رکھدی

اُسی نے اشکِ غم کو خوئے آتشناک بخشی ہے
کہ جس نے ابر کے دل میں رگِ برقِ تپاں رکھدی

کوئی تو کاتبِ تقدیر سے یہ پوچھ دے مجھکو
کہ لکھی تھی مری تقدیر تو لکھ کر کہاں رکھدی

تری نیّت پہ ہے موقوف پھل تیری عبادت کا
وہ بُت خانہ حرم ہے یہ جبیں دل سے جہاں رکھدی

معمّا زندگی کا حل ابھی ہونے نہ پایا تھا
اجل نے سامنے میرے عدم کی چپتیاں رکھدی

میری قیمت نہیں لعل و گہر میں مفت ملتا ہوں
کوئی کیا لے مجھے قیمت بڑی میں نے گراں رکھدی

مسعود شاہد

نواب سعداللہ خاں لاہوری

وزیر شاہجہاں

نام اور وطن | سعداللہ خاں نام تھا، شیخ سعداللہ خاں لاہوری اور ملا سعداللہ خاں مشہور تھا، اکثر تاریخوں میں وطن لاہور لکھا ہے، لیکن مصنف سلیم التواریخ نے سعداللہ خاں کا وطن جنبوت بتایا ہے اور سکونت لاہور لکھی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

کہ موطن او جنبوت ومنشاش لاہور است[1]

علمی استعداد | سعداللہ خاں تمام علوم عقلی ونقلی میں نہایت کامل بسندگاہ اور فاضلانہ قابلیت رکھتا تھا۔ زبردست ادیب اور مقرر تھا، فارسی اور عربی میں نہایت اچھی تحریریں لکھتا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے دوسرے سلاطین کو جو فرمان جاتے تھے وہ سعداللہ خاں ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے اور اب بھی تاریخوں میں موجود ہیں۔ یہ فرمان بالعموم فارسی زبان میں لکھے جایا کرتے تھے۔ لیکن ۱۰۴۱ھ میں سید محی الدین قیصر روم کا ایلچی بہت سے تحائف اور خطے کر آیا تو سعداللہ خاں نے بادشاہ کے حکم سے اس کا جواب عربی میں لکھا۔

اس زمانے کا عام دستور تھا کہ خطوط اور فرامین بڑی قابلیت سے لکھے جاتے تھے، اور ان کی ترتیب وتسوید میں نہایت اہتمام کیا جاتا تھا۔ وہ بادشاہ اور اس کے درباری لوگوں کی علمی استعداد اور ادبیت کا آئینہ ہوا کرتے تھے اور یہی ایک ذریعہ تھا، تحریر وکتابت کی قابلیتوں کے اظہار کا۔ نفس مضمون کے علاوہ خطوط کی ظاہری شان وشوکت پر بھی کافی توجہ کی جاتی تھی، بہترین خوشنویس موجود رہا کرتے تھے وزیر کے لئے بھی ضروری تھا کہ املا اور انشا دونوں میں پوری مہارت رکھتا ہو۔ ان خطوط کے دیکھنے سے نواب سعداللہ خاں کی ادیبانہ اور منشیانہ نکتہ سنجیوں کا آج بھی اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے، ظاہری کمالات کے علاوہ مورخین نے اس کے رسوخ باطنی کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر ہماری رائے میں ان باتوں کو اس کی فضیلت علمی سے کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ اس کی خدا پرستی اور مذہبیت پر ضرور روشنی پڑتی ہے، سعداللہ خاں حافظ قرآن بھی تھا۔

دربار شاہی میں پہلی مرتبہ | سعداللہ خاں پہلی مرتبہ دربار میں آیا تو بادشاہ کو اس کے جوہر ذاتی کا علم نہ ہوا اور اس نے زیادہ التفات نہ کی، تنخواہ بھی بہت کم مقرر کی جسے سعداللہ خاں نے اپنی خودداری سے منظور نہیں کیا،

رمضان ۱۰۳۷ھ میں موسوی خاں صدر کو حکم ہوا کہ سعداللہ خاں کو ہمارے پاس بھیج دیا جائے چنانچہ سعداللہ خاں حاضر دربار ہوا۔ اب کی مرتبہ مناسب تنخواہ مقرر ہوئی، خلعت ملا، اور اصطبل خاص سے گھوڑا بھی عنایت کیا گیا۔ پھر دو تین روز کے اندر ہی یومیہ کی جگہ منصب پر سرفراز کیا گیا، اور ایک سال کے اندر ہی اندر منصب ہزاری ذات اور دوسو سوار خطاب، اور عرضداشت کرر کی خدمت عطا ہوئی۔ پھر غسل خانہ کی داروغگی پر تقرر ہوا،

ترقی مناصب اور عہدہ وزارت | سعداللہ خاں ایک جوہر قابل تھا اب تک اس کی قابلیتوں کا اظہار نہ ہوا تھا۔ دربار میں آتے ہی گویا اس کی اقبال مندی و خوش نصیبی کا آفتاب، بادلوں سے نکل آیا، اور اپنی تابانی سے ہندوستان بھر کو منور کر دیا، رفتہ رفتہ اس کی کارداني اور فہم وفراست ظاہر ہوتی گئی اور اس نے اس قدر جلد اور متواتر ترقیاں حاصل کیں کہ دوسرے درباری امرا کی زندگی میں یہ واقعات نظر نہیں آتے۔

شاہجہاں بہت ہی مردم شناس، اور قدردان بادشاہ تھا، سعداللہ خاں کا اس کے پاس پہنچ جانا ہی اس امر کی کافی ضمانت تھی کہ وہ اپنی

[1] سیر المتاخرین صفحہ ۲۷۰

ظاہری و باطنی استعداد کے شایانِ شان ترقی کرے گا۔ چنانچہ ملازمت کے دوسرے ہی سال میں سہ ہزاری منصب دو ہزار سوار اور خان سامانی کا عہدہ اُسے مل گیا، چوتھے سال ترقی کرتے کرتے ۲۰ رجب ۱۰۵۸ھ کو وزارت کا منصب جلیل اس نے حاصل کر لیا، اسلام خاں کو ہٹا کر قلمدانِ وزارت سعداللہ خاں کو دیا گیا، منصب میں ہزار و پانصد کی ترقی ہوئی اور پنج ہزاری پانصد ذات پنج ہزار و پانصد سوار کا منصب مرحمت ہوا۔

پھر ساتویں سال وہ ہفت ہزاری اور ہزار سوار دو اسپہ و اسپہ کی عزت ملی۔

دربار میں اس سے بڑا کوئی منصب نہ تھا، امرا اس منصب سے آگے ترقی نہیں پاتے تھے، البتہ شہزادوں کو اس سے بڑے مناصب بھی دیئے جاتے تھے۔

۱۰۵۹ھ میں اس کی تنخواہ دو کرور درم یعنی تیس لاکھ سالانہ مقرر ہوئی۔ اس کے آگے ترقی کا کوئی درجہ باقی نہ رہا تھا۔ سعداللہ خاں نے بہت تھوڑے عرصے میں تمام مدارجِ عزت کو طے کر لیا، صاحبِ سیر المتاخرین لکھتا ہے۔

سعداللہ خاں کہ جوانِ شہامتے متواتر مدارجِ منصب والا رابطی کرد، و بقیہ باقی ماندہ بود کہ بدان رتبہ ترقی کند[1]

سعداللہ خاں کی متواتر ترقیوں سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس زمانے میں منصب حاصل کر لینا کوئی معمولی بات تھی۔ ہمیں خاص طور پر شاہجہاں کے متعلق معلوم ہے کہ وہ منصب عطا کرنے میں نہایت سخت تھا۔ اس کے دربار میں چار آدمی سے زیادہ ہفت ہزاری نہ ہوتے تھے۔ جب ان میں سے کوئی مرجاتا تھا تو اس کی خالی جگہ پر کسی اور امیر کو ترقی دے دی جایا کرتی تھی، آج کل کے خطابات کا سا قصہ نہ تھا کہ افسران کی معمولی سی توجہ میں آدمی خاں صاحب اور خان بہادر ہو جاتا ہے۔ بادشاہ خود امراء کی کارگزاریوں کو دیکھتے اور پرکھتے تھے، پھر کہیں جا کر ترقی نصیب ہوتی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ سعداللہ خاں نے اپنی جاں نثاری، کاردانی اور معاملہ فہمی سے بادشاہ کے دل میں کافی گنجائش پیدا کر لی تھی، چنانچہ شاہ جہاں اس کو بہت عزیز رکھتا تھا اور اس کے اثر و نفوذ کا یہ حال تھا کہ شاہجہاں کوئی ملکی، مالی معاملہ بغیر اس کی صلاح و مشورہ کے طے نہ کرتا تھا علاوہ ان کاموں کے جو وزارت سے متعلق تھے۔ تمام کاروبارِ سلطنت جزوی و کلی طور پر سعداللہ خاں کے ہاتھ میں تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ دارا شکوہ بادشاہ کا چہیتا بیٹا تھا، سب بیٹوں سے زیادہ عزیز تھا۔ بادشاہ نے کبھی اسے جدا کرنا گوارا نہیں کیا، ولیعہد بھی تھا ہر وقت بادشاہ کے پاس رہتا تھا مگر سعداللہ خاں کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر اُسے بھی حسد ہونے لگا تھا چنانچہ اس نے اکثر بادشاہ سے جا و بے جا شکایتیں بھی کیں، مگر سعداللہ خاں کو ان سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔

عادات و خصائل | سعداللہ خاں نہایت ایماندار، خدا ترس و نیک نیت، بادشاہ کا خیر اندیش اور رعایا کا بہی خواہ تھا، مردم آزاری کو بہت برا خیال کرتا تھا، اور حتی الامکان کوئی ایسا نیا ضابطہ جس سے مخلوق کو تکلیف پہنچے نافذ نہ کرتا تھا، اپنے فرائض کو دیانت و امانت کے ساتھ ادا کرتا تھا، رعایا کی فلاح و بہبود اور غربا و مساکین کی تکالیف کا بہت لحاظ رکھتا تھا، شاہی خزانے کو معمور کرنے سے زیادہ رعایا کی دلداری اور اس کی مالی پریشانیاں کو ملحوظ رکھتا تھا، اس کا عقیدہ تھا کہ ایسی کفایت شعاری جو رعایا کے لئے موجبِ تکلیف و پریشانی ہو بادشاہ کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتی، سلطنت کا فائدہ اسی میں ہے کہ مخلوق آرام و اطمینان سے رہے اور رعایا کی اقتصادی حالت مضبوط ہو۔

مذہب | اکبر اور جہانگیر کے زمانۂ حکومت کو مورخین خصوصاً متعصب اور کوتاہ اندیش مورخین نے عام طور پر کفر و الحاد کا زمانہ کہا ہے، لیکن شاہجہاں کی حکومت پر تمام مورخین کو اتفاق ہے کہ وہ بالکل مذہبی رنگ کی حکومت تھی، اور الحاد کا اگر کوئی اثر تھا تو صرف اتنا ہی کہ بادشاہ اُدھر متوجہ نہ ہوا اور باپ دادا کا طریقہ سمجھ کر کسی بات میں فوری تغیر و اضافہ نہ کیا، شاہجہاں خود بھی مذہب کا پابند تھا، اسی طرح سعداللہ خاں نہایت سچا مسلمان تھا، مگر مذہبی تنگ نظری اور تعصب اس میں قطعاً نہ تھا۔

چنانچہ رگھناتھ کی جو سعداللہ خاں کا پیشکار رہا تھا (جو اس کی جیتی جاگتی تزک کی ہے) اس کے سپرد تھی، اتنی اچھی تربیت کی کہ وہ سعداللہ خاں کے بعد دیوان کل مقرر ہونے تک وزارت پر مامور رہا، اور شاہجہاں سے رائے رایان کا خطاب حاصل کیا۔

عام طور پر مسلمان بادشاہوں کو بدنام کیا جاتا ہے کہ وہ متعصب اور مسلم پرست ہوا کرتے تھے مگر یہ اور اسی قسم کے بے ثمار نازیبی واقعات ثابت کرتے ہیں کہ یہ الزام کوئی وقعت نہیں رکھتا، عہدے کی ترقی پر مذہب اور عقیدے کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس کے لئے صرف اہلیت درکار

تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ ہزاروں مسلمان امراء اور منصبداروں، نیز سرداران فوج پر حکومت کرنے کی غرض سے ایک ہندو کو متعین نہ کیا جاتا، بلکہ یہ کام کسی مسلمان ہی کے سپرد ہوتا، اسی عہدہ میں سعد اللہ خاں کے انتقال پر ایک اور ہندو شخص چندر بھان دارالانشاء کی خدمت پر مامور ہوا تھا، رائے چندر بھان" کا خطاب اُسے حاصل تھا اور بہت معزز تھا۔ اس کے اعزاز کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ دارالانشاء کی خدمت اس کے سپرد تھی جو کوئی معمولی خدمت نہ تھی، بہرحال سعد اللہ خاں اس قسم کی تنگ خیالیوں سے بالکل پاک تھا اور نہایت روادار انسان تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مذہبیت کو ننگ نظری سے کوئی تعلق نہیں۔ امورِ مملکت میں آدمی کو ہمیشہ وسیع النظر، عالی حوصلہ اور فراخ دل ہونا چاہئے، اور مذہب ہرگز اس چیز کو مانع نہیں ہے۔

اولاد تاریخوں میں سعد اللہ خاں کے دو بیٹوں کے نام ملتے ہیں، لطف اللہ اور عنائت اللہ گمراں کے علاوہ بھی اس کے اور اولاد تھی لیکن ان کے نام اور حالات ہمیں معلوم نہیں ہو سکے،

لطف اللہ اور عنائت اللہ ۱۰۵۷ھ میں پہلی مرتبہ بادشاہ کی ملازمت سے مشرف ہوئے اس سے پہلے کبھی وہ دربار میں نہ آتے تھے۔ لطف اللہ خاں کو موتیوں کی تسبیح، اور عنائت اللہ کو سرپیچ مرصع عنائت ہوا۔

سعد اللہ خاں کے انتقال کے وقت اس کے بڑے بیٹے لطف اللہ کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی بادشاہ نے اس کو ہفت صدی صد سوار کا منصب دیا دوسرے بیٹوں کا یومیہ مقرر ہو گیا۔

سعد اللہ خاں کا عہدہ وزارت سعد اللہ خاں کے عہدِ وزارت میں سلطنت کے کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوئے، ہندوستان میں عام مرفہ الحالی اور رونق پیدا ہو گئی، اکثر پرانے ضابطوں میں اس نے اصلاحیں کیں، لیکن اسی حد تک کہ رعایا پر کسی قسم کا بار نہ پڑے، اس سے پہلے یہ دستور تھا کہ عامل اور تحصیلدار کو مالگذاری وصول کرنے کا حق پانچ روپیہ سیکڑہ مقرر تھا یعنی سو روپے وصول کر کے عامل پچانوے روپے خزانہ سرکار میں داخل کر دیا کرتا تھا اور پانچ روپے اپنے حق کے رکھ لیتا تھا، سعد اللہ خاں نے کفایت اور فائدے کے خیال سے اس ضابطہ کو تبدیل کر کے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ایک سو پانچ روپے وصول کر کے سو روپے خزانے میں داخل کئے جائیں اور پانچ روپے حق تحصیل کے رکھ لئے جائیں۔ مگر عمر بھر وہ اپنے اس فعل پر نادم رہا کہ میں نے محض بادشاہ کے فائدے کو مخطار رکھا اور عمال کی منفعت و آسانی کو نظرانداز کر دیا، کاش اس دن میرے ہاتھ خشک ہو جاتے اور قلم چلانے پر قادر نہ ہوتے۔

وہ عمال کے حقوق کی بہت حفاظت کرتا تھا اور عہدیداروں کے مظالم سے ہمیشہ انہیں بچاتا تھا،

اکبر کے عہد حکومت میں راجہ ٹوڈرمل نے یہ قانون نافذ کیا تھا کہ عاملوں اور رکرویوں کا فاضل اگر سو سے کم ہو تو ان کو مجرا نہ دیا جائے البتہ سو سے زیادہ ہو جائے تو اس کو حساب میں شامل کیا جائے، شاہجہانی کے زمانے میں محاسبوں نے اس اصول سے ناجائز فایدہ اٹھایا، اور عاملوں کا فاضل مجرا دینے میں مشکلات پیدا کر دیں، سعد اللہ خاں کے سامنے اس قسم کے حسابات پیش ہوئے تو اس نے حکم لکھا کہ جب یہ ضابطہ مقرر ہے کہ سو سے اوپر فاضل مجرا دیا جائے تو پھر کیوں یہ دقتیں پیدا کر کے اپنی اور ہماری عاقبت خراب کرتے ہو،

محاصل خالصہ کی بدرنویسی اور فرد بازیافت اس کے سامنے رکھی گئی تو اس نے دستخط کر کے لکھ دیا کہ اس کنارہ فرد کو دھوپ میں رکھو دخشک ہونے پر جو باقی رہے وصول کر لو۔

سعد اللہ خاں ملک کی آبادی اور عمرانی ترقی پر بہت توجہ کرتا تھا۔ اس کی جاگیر کے مواضعات ہمیشہ سرسبز اور آباد رہتے تھے۔ ایک مرتبہ داراشکوہ نے بادشاہ سے شکایت کی کہ سعد اللہ خاں نے ویران اور برباد پرگنے ہماری جاگیروں میں دے دئے ہیں اور آباد و سیر حاصل پرگنے اپنی جاگیر میں رکھ لئے ہیں۔ سعد اللہ خاں کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے شاہزادے کے وکیل کو بلا کر اس کی جاگیر کے ویران و بیہات خود لے لئے اور وکیل نے جو مواضعات ان کے بدلے میں لینا پسند کئے وہ اس کو دے دیئے۔ دو تین سال میں شاہزادے کے ظالم عمال نے ان دیہات کو بھی برباد کر دیا اور سعد اللہ کی جاگیر اُسی طرح سرسبز و شاداب رہی،

عاملوں کے ظلم و ستم پر ہمیشہ اس کی نگاہ رہتی تھی جہاں وہ ان کے حقوق کی حفاظت کرتا تھا وہاں رعایا کو بھی ان کے استبداد سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عاملوں کی زیادتی اور ان کے جبر سے رعایا بددل اور پریشان ہو جاتی ہے،

نہایت ہی تجربہ کار اور بہادر تھا وہ ایسی قیامت خیز گولہ باری کر رہا تھا کہ ان لوگوں کو کسی کام کا موقعہ نہ ملتا تھا اور اکثر اوقات سنگینیں بھی بیکار رہ جاتی تھیں۔

اسی اثنا میں ایران کے ایک جدید امدادی لشکر نے وفعتہً ہندوستان کی اس فوج پر حملہ کر دیا جو لشکر شاہی کے لئے گھاس، لکڑی وغیرہ مہیا کرنے کے لئے ماورنہر اور اکثر اوقات دیہوں کو مار کر بہت سے مویشی گھیر کر لے گئے۔ یہ خبر سن کر رستم خاں نے اس لشکر کا تعاقب کیا، اور خونریز معرکہ ہوا۔

اس کے علاوہ بھی ایک لڑائی ہوئی جس میں بادشاہی فوج کو فتح ہوئی مگر قلعہ ہاتھ نہ آیا۔ گرانی بدستور زیادہ ہو رہی تھی اور فوج سخت تکالیف میں مبتلا تھی، مجبوراً شاہجہاں نے چار مہینے کے بعد فوج کو واپس بلا لیا۔ دو تین ہزار آدمی اور چار پانچ ہزار اونٹ اس محاصرے میں ہلاک ہوئے، ستروع ذی قعدہ میں سعد اللہ خاں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

قندھار کی دوسری مہم] ۱۷ ربیع الاول ۱۰۶۱ھ کو سعد اللہ خاں دوبارہ قندھار روانہ کیا گیا پچاس ہزار سوار، دس ہزار پیادے اور تین قلعہ شکن توپیں اس کے ساتھ تھیں۔ مست ہاتھی بھی تھے۔

دو کور روپیہ بے شمار سپلدار اور مزدور وغیرہ تھے۔ تیس ہزار اونٹ محض توپوں کے لئے گولہ بارود اور سیسہ وغیرہ کی باربرداری کے لئے تھے۔ غرض ہیئت ساز و سامان اور شان و شوکت سے یہ جنگی مہم روانہ ہوئی، امرا کی فوج ملا کر ستر ہزار سوار علاوہ توپ خانے کے تھے۔ محاصرہ کرنے کے لئے ۳ جمادی الاخریٰ بادشاہ نے مقرر کر دی تھی لہٰذا یہ ضروری تھا کہ اس تاریخ کو قلعہ گھیر لیا جائے۔

بادشاہ خود بھی ہندوستان سے کابل کو روانہ ہو گیا۔ سعد اللہ خاں کوچ پر کوچ کرتا ہوا یکم جمادی الاول کو قندھار کے قریب اورنگ زیب کے پاس پہنچ گیا جو ملتان کے راستے سے آیا تھا۔

دونوں نے مل کر قلعہ کا محاصرہ کیا اور مورچے تعمیر کئے سعد اللہ خاں نے بڑی بہادری اور عقلمندی سے کام کیا محاصرہ کے کچھ دنوں بعد قلعہ دار نے ایک دم خاموشی اختیار کر لی ادھر کے لوگ قلعہ کے نیچے پہنچ گئے مگر قلعہ سے کوئی مدافعت نہ کی جاتی تھی، آخر راجہ روپ نے اجازت مانگی کہ میں کمند کے ذریعہ سے برج پر چڑھ جاؤں گا لشکر مسلح رہے اور میرے اشارہ پر فوراً حملہ کر دے اورنگ زیب اور سعد اللہ خاں نے اجازت دے دی۔

راجہ رات کے وقت چند جانبازوں کے ساتھ قلعہ کی دیوار پر چڑھ گیا اور لشکر کو اشارہ کر دیا جو پہلے سے منتظر تھا فوراً حملہ ہوا، قرنا کی آواز فضا میں گونجی، اہل قلعہ اسی موقعہ کا انتظار کر رہے تھے سب طرف سے مشعلیں اور جنگی حربے لے کر ٹوٹ پڑے۔ نہایت سختی سے گولہ باری اور تیر باری ہوئی آگ اور پتھر برساتے گئے۔ کھولتا ہوا تیل پھینکا گیا۔ حملہ آوروں کے چھکے چھوٹ گئے بہت سے مسلمان اور راجپوت کام آئے جو شخص بھی برج یا دیوار کے پاس گیا زندہ نہ بچا بے شمار آدمی ہلاک اور مجروح ہوئے۔

اس کے بعد دو مہینے تک مورچوں کے اندر سے لڑائی ہوتی رہی۔ قزلباش رات کو ہندوستانیوں کے مورچوں پر حملے کر کے مویشی اور انسانوں کو نقصان پہنچاتے تھے، ایک رات رستم خاں اور سعد اللہ خاں کے مورچوں پر ایرانیوں کی فوج نے حملہ کر کے کئی توپوں کو خراب کر دیا اور کچھ لوگوں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ قلعہ میں لے گئے ادھر سے تعاقب کیا گیا مگر قلعہ کے اوپر سے گولہ باری شروع ہو گئی اور انہیں واپسی پر مجبور ہونا پڑا،

بادشاہی بہادر بڑی کوشش سے مورچوں کو آگے بڑھاتے مگر گولہ باری کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ جاتی۔ اسی دوران میں بادشاہ کی دو بڑی توپیں ترنج گئیں اس کے علاوہ پانچ اور توپیں یوں بیکار ہو گئیں کہ ان کے چلانے والے اناڑی تھے گولہ مارنے کہیں تھے اور پڑتا کہیں تھا برخلاف اس کے قلعہ سے رومی افزلباش ایسا بے خطا گولہ لگاتے تھے کہ ٹھیک نشانہ پر بیٹھتا تھا ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ سرداران فوج کے اختلاف رائے کی وجہ سے دوسرے حلقوں کی تسخیر بھی نہ ہو سکی،

محراب خاں قلعہ دار اتنا تجربہ کار تھا کہ اس نے اورنگ زیب اور سعد اللہ خاں کی عقل و دانائی کو بیکار کر دیا۔ ان دونوں نے بہت کوشش کی مگر کچھ بن نہ پڑا۔ بادشاہ نے ان حالات کی بنا پر لشکر کو واپسی کے احکام بھیج دیے۔

جنوری ۱۶۳۸ء] شاہجہاں سے قبل جہانگیر کے عہد میں چنوڑ کے رانا نے معاہدہ کیا تھا کہ وہ اور اس کی اولاد کبھی قلعہ کی مرمت نہ کرے گی۔ شاہجہاں کے

شاہجہاں کی حکومت کے مشہور کارناموں اور یادگاروں میں تاج محل کے ساتھ، دہلی اور تختِ طاؤس کے تذکرے کبھی صفحاتِ تاریخ سے محو نہ ہوں گے، دہلی ایک زندہ یادگار ہے جو اب تک باقی ہے۔ تختِ طاؤس اگرچہ اپنی ہستی قایم نہ رکھ سکا مگر تاریخ ہمیشہ اسے باقی رکھے گی۔

دہلی میں عہدِ شاہجہانی کی دو بڑی اور عظیم الشان یادگاریں ہیں۔ قلعہ اور جامع مسجد، اس میں سے جامع مسجد سعداللہ خاں کے اہتمام سے تیار ہوئی ہے ۱۰۵۸ھ میں سعداللہ خاں نے ایک پہاڑی پر اس کی بنیاد رکھی تھی۔

افسوس ہے کہ سعداللہ کی زندگی میں اس کی تکمیل نہ ہوئی اگرچہ سب کام پورے ہو چکے تھے اور جس سال سعداللہ خاں کا انتقال ہوا ہے اسی سال مسجد کی تکمیل بھی ہو گئی تھی مگر وہ اس تقریبِ مسرت میں شرکت کے لئے زندہ نہ رہا تھا۔ تختِ طاؤس پر جلوس فرمانے کی خوشی میں شاہجہاں نے علاوہ خاندانِ شاہی کے کل امیروں کو بھی انعامات دئے تھے اور ان کے اضافے بھی ہوئے تھے جن میں سعداللہ خاں بھی شامل تھا۔

بہرحال ان دو شاہجہانی یادگاروں کو سعداللہ خاں کے عہدِ وزارت سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اور اس کی وزارت کے کارناموں میں ان کا بھی شمار ہے،

فوجی خدمات موجودہ عہدِ تہذیب سے پہلے رحیں کو آلاتِ جنگ اور اسبابِ تباہی کے لحاظ سے دور وحشت و بربریت کہنا زیادہ موزوں ہے) جب لڑائی میں صرف ایسے آلات اور حربے استعمال ہوتے تھے جن کا تعلق براہِ راست انسان کی بہادری اور شجاعت سے تھا، وزیر کے لئے سب سے پہلی شرط یہ تھی کہ وہ قلم اور تلوار دونوں کا دھنی ہو اگر اس کا قلم صفحۂ قرطاس پر موتی بکھیر سکتا ہو تو تلوار میں بھی یہ طاقت ہو کہ میدانِ کارزار کو لالہ گوں کر سکے، چنانچہ سعداللہ خاں میں بھی یہ دونوں اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے اور واقعی طور پر وہ صاحب السیف والقلم تھا۔ چنانچہ اس کے نام کے ساتھ یہ لقب لکھا بھی جاتا تھا۔ وہ بڑی بڑی نازک مہموں پر بھیجا گیا اور ہمیشہ حزم و احتیاط سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا اگرچہ اس کی اکثر مہمیں ناکام رہیں اور اس کے جنگی کارناموں میں کوئی بڑا کارنامہ نہیں ملتا، قندھار کی مہم پر وہ دو مرتبہ نامزد ہوا لیکن دونوں مرتبہ ناکام واپس آیا مگر یہ ناکامی مخصوص حالات اور واقعات کی بنا پر تھی، اس کی بے تدبیری، ضعفِ عقل یا قوانینِ جنگ سے ناواقفیت کو قطعاً اس میں کوئی دخل نہ تھا۔

بلخ و بدخشاں کی مہم پر شاہ جہاں نے اپنے چھوٹے بیٹے مرادبخش کو بھیجا تھا اس نے وہاں پہنچ کر بڑے کارنمایاں کئے لیکن علی مردان خاں کے تسلط و اقتدار اور آپ و ہوا کی ناموافقت کے باعث شہزادہ مراد باپ کی مخالفت کے باوجود وہاں قیام نہ کر سکا، اور اپنی خدمات سے مستعفی ہو گیا۔

بادشاہ نے بڑے غور و خوض کے بعد سعداللہ خاں کو اس کام کے لئے منتخب کیا وہ چاہتا تھا کوئی ایسا آدمی بلخ بھیجا جائے جو میرا معتمد اور مزاج شناس بھی ہو اور اسی کے ساتھ تجربہ کار اور مقبولِ عوام بھی، تاکہ لوگ اس کا اعتبار کریں اور اس کی طرف سائل ہوں سعداللہ خاں میں یہ سب اوصاف موجود تھے۔ اس لئے اسی کو اس مہم کے لئے بہتر سمجھا گیا۔

بلخ و بدخشاں کی حالت بہت خراب اور نازک تھی، ازبکوں کا مقابلہ تھا، اور حالات یہ تھے کہ خود بادشاہ زادہ سرداران فوج کے طرزِ عمل سے بد دل ہو کر واپسی پر آمادہ ہوا تھا، لیکن سعداللہ خاں نے اسے سنبھال لیا۔

سعداللہ خاں کو جو احکام اور اختیارات دربارِ شاہی سے ملے تھے۔ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک طویل فہرست تیار ہو جائے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کو شہزادے کی جگہ بھیجا گیا تھا جو وہاں فرمانروا کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

سعداللہ خاں خنجان کے راستے سے ۸ رجب ۱۰۴۵ھ کو گیارہ روز میں بلخ پہنچ گیا، روانگی کابل سے ہوئی تھی، حکمِ شاہی کے بموجب اس نے شہزادہ مراد کو بہت سمجھایا مگر وہ کسی طرح وہاں رکنے پر آمادہ نہ ہوا، سعداللہ خاں نے تمام ملازموں کو حکم دے دیا کہ شہزادے سے ملاقات نہ کریں نہ اس کی قیام گاہ پر جائیں، اس کے بعد اس نے بہت ہی سرگرمی کے ساتھ احکامِ شاہی کی تعمیل کی، اور دن رات کی مصروفیت، شب و روز کے انہماک سے بائیس روز کے قلیل عرصے میں جملہ احکام کی تعمیل کر دی۔

قندھار کی مہم علی مردان خاں نے قندھار شاہجہاں کے حوالے کر دیا تھا ایرانیوں نے محض اس خیال سے کہ ان کی اندرونی حالت اچھی نہ تھی، اور سلطنت میں حد درجہ ضعف پیدا ہو گیا تھا، اس وقت کو برداشت

کر لیا تھا، شاہ صفوی کے بعد شاہ عباس ثانی تختِ ایران پر متمکن ہوا تو اس کی عمر بہت کم تھی۔ اس کم سنی میں کسی طرح وہ اس امرِ خطیر کا متحمل نہ ہو سکتا تھا کہ شاہجہاں کے مقابلے میں نبرد آزمائی کرے۔ اس لئے شروع شروع میں خاموش رہا۔ جب سن شعور کو پہنچا تو امرا نے اسے قندھار کی واپسی پر آمادہ کیا اور بتایا کہ قندھار آپ کا آبائی ملک ہے اس کی تسخیر سب کاموں پر مقدم ہے۔

چنانچہ وہ قندھار پر لشکر کشی کرنے کو تیار ہو گیا، یہاں خاموشی کے ساتھ یہ منصوبے باندھے جا رہے تھے اور ادھر شاہجہاں اپنے آباد کئے ہوئے شہر شاہجہاں آباد میں رنگ رلیاں منا رہا تھا، اسی دوران میں خواص خاں قلعدار کی عرضداشت پہنچی جس میں لکھا تھا کہ ۴ ربیع الاول ۱۰۴۸ھ کو شاہ عباس زبردست لشکر کے ساتھ قندھار پر حملہ کرنے کے لئے صفاہان سے نکلا ہے اس کا ارادہ ہے کہ جب کابل اور قندھار کے راستے شدت برف باری سے بند ہو جائیں تو خود آ کر قندھار پر چڑھائی کرے۔ شاہجہاں نے اورنگ زیب کو سعد اللہ خاں کی اتالیقی میں قندھار بھیجا، فوج میں سادات، افغان اور راجپوت بہادر شامل تھے، جس کی تعداد سوار اور پیادے ملا کر ستر ہزار تھی۔

لشکر بڑے اہتمام سے روانہ ہوا تنخواہ کے علاوہ سو روپیہ ہر شخص کو امداد کے طور پر دیا گیا جو لوگ نقد تنخواہ پاتے تھے ان کو تین مہینے کی تنخواہ پیشگی تقسیم ہوئی۔ شاہجہاں کو اس مہم میں اتنی عجلت تھی کہ اورنگ زیب کو باقاعدہ رخصت کرنے سے پہلے ہی حکم دیا گیا کہ ملتان کے راستے سے روانہ ہو جائے اور ملتان پہنچ کر لشکر جمع کرنا شروع کر دے۔ اس کے لئے خلعت اور گھوڑا بعد میں سعد اللہ خاں کے ساتھ بھیجا گیا۔ بادشاہ بھی کابل کے ارادے سے ۲۰ ربیع الاول میں روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ دریائے چناب کے پار نہ ہوا تھا کہ ایک گرز بردار نے قندھار سے آ کر بیان کیا کہ قندھار پر قزلباشوں کا قبضہ ہو گیا۔

اورنگ زیب اور سعد اللہ خاں کو جلد قندھار پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ تمہارے پہنچنے تک قلعہ پر ایرانی قابض ہو جائیں تو انہیں استقلال حاصل کرنے کا موقع نہ دینا اور فوراً پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لینا۔ مگر اورنگ زیب کو ملتان میں لشکر جمع کرنے میں دیر ہوئی اور سعد اللہ خاں کو بے وقت بارش کے باعث اور اورنگ زیب کے انتظار میں ٹھہرنا پڑا، صفر کے وسط میں جب دونوں لشکر قریب آئے تو خلیل بیگ کے خط سے معلوم ہوا کہ دروں میں ابھی برف جمی ہوئی ہے اگر بارش نہ ہوئی تو مشکل سے ایک مہینے میں یہ راستہ آمد و رفت کے قابل ہو سکے گا۔

اسی دوران میں متواتر یہ اطلاعات آئیں کہ قندھار کے قلعہ پر قزلباش قابض ہو گئے چنانچہ بادشاہ نے تاکیدی احکام جاری کئے۔ جلد قندھار پہنچو، جس راستے سے جانا ملے ہوا تھا مجبوراً اس کو چھوڑ کر پشاور کے پہاڑوں پر سے جانے کا ارادہ کیا گیا پہاڑ بہت اونچے تھے، فوج کو پیدل سفر کرنا پڑا بہت سا ضروری اور غیر ضروری سامان چھوڑ دیا گیا راستے میں زبردست مشکلات پیش آئیں۔ اکثر جانور بیکار ہو گئے، غلہ بہت گراں ہو گیا۔ بہ ہزار دقت و دشواری ۲۱ ربیع الاول کو فوج کابل میں داخل ہوئی۔

یہاں ضروریات کا انتظام کرنے کی غرض سے پندرہ روز قیام ہوا اور ۲ ربیع الثانی کے شروع میں کابل سے کوچ کر کے غزنی پہنچے۔ گرانی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں دستیاب نہ ہوتی تھیں خاص خاص لوگوں کو روپیہ کا ایک سیر غلہ اور ڈیڑھ سیر گھاس ملتی تھی۔ لشکر سخت پریشان تھا۔ پھر یہ اطلاع ملی کہ غزنی سے قندھار تک قزلباشوں کا تسلط ہے اور ضروریات بہم پہنچانا قطعاً ناممکن ہے۔ سعد اللہ خاں نے ان سب امور کی اطلاع بادشاہ کو دی وہاں سے حکم آیا کہ ایسے موقعوں پر آرام و آسائش کی تلاش فضول ہے جس طرح بھی ممکن ہو قندھار پہنچنے کی کوشش کرو۔

پندرہ دن قیام کرنے کے بعد پھر کوچ ہوا۔ ۱۴ جمادی الاول ۱۰۴۸ھ کو قندھار کے مقابل پہنچے اور مورچے وغیرہ بنانے میں مصروف ہو گئے۔

۱۵ جمادی الاول کی دوپہر کو راجہ مان سنگھ کو الیاری اور بخشی سعد اللہ خاں نے مل کر قلعہ کے برجوں پر حملہ کیا جس کا جواب اہل قلعہ نے بہت سخت دیا، اور حملہ آور قلعہ کے برج تک نہ پہنچ سکے لیکن شہزادے کے حکم سے جانوں کو خطرے میں ڈال کر جہاں پہنچ گئے تھے وہیں قائم رہے۔

دوسری طرف سے سعد اللہ خاں وزیر نے بڑی کوشش و جانفشانی سے سرنگیں کھود کر قلعہ کی خندق تک پہنچا دیں تیسری طرف سے رستم خاں اور قاسم خاں نے بھی خندق

حجاب رضیہ بیگم

محراب خاں جو حکومتِ ایران کی

زمانۂ حکومت میں اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی اور رانا جگت سنگھ نے قلعہ کو درست کر لیا۔ بادشاہ جہاں کو معلوم ہوا تو اس نے تحقیق کے لئے ابدال بیگ کو چتوڑ بھیجا کہ خود قلعہ کو دیکھ کر آئے۔ اس نے واپسی پر بیان کیا کہ واقعی قلعہ کی مرمت کی گئی ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے سعداللہ خاں کو حکم دیا کہ قلعہ منہدم کر دو اور رانا سرکشی کرے تو اس کی بھی گوشمالی کرو۔ تیس ہزار سپاہ لے کر گیا۔ مگر رانا نے دارا شکوہ کی معرفت بادشاہ سے اظہار اطاعت کیا اور شاہزادے نے سفارش کی۔ چنانچہ بادشاہ نے سعداللہ خاں کے نام فرمان بھیجا کہ مرفع قلعہ کو منہدم کر کے چلے آؤ۔ یہ واقعہ ۱۰۶۸ھ کا ہے۔

انتقال | سعداللہ خاں چار پانچ مہینے سے فالج (بعض نے قولنج لکھا ہے) میں مبتلا تھا۔ بادشاہ چند بار عیادت کو گیا۔ ایک مرتبہ دارا شکوہ بھی باپ کے ساتھ اُسے دیکھنے گیا۔ بادشاہ نے متعدد طبیبوں سے علاج کرایا۔ لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر میں تقرب خاں کے زیر علاج تھا کہ ۲۲ جمادی الآخر ۱۰۶۶ھ کو سینتالیس سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

بادشاہ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رتا تھا، اس کا بڑا بیٹا لطف اللہ خاں پندرہ برس کا تھا بادشاہ نے اس کو ہفت صدی صد سوار کا منصب دیا دوسرے بیٹوں اور اس کے وابستگان کا یومیہ مقرر ہو گیا، یار محمد سعداللہ خاں کا بھانجا تھا اس کو سی صدی شصت سوار کا منصب ملا، عبدالنبی کو جو سعداللہ خاں کی جاگیر کا مدار المہام اور اس کا معتمد تھا ہزاری بنایا، غرض سعداللہ خاں کے اکثر ملازموں کو بادشاہ نے ان کے شایانِ شان منصب اور وظائف عطا کئے۔

کوثر چاندپوری

حدیثِ ارتقا

قیدِ امکاں سے جدا کوئی نظر پیدا کر
تو نئی اپنے لئے شام و سحر پیدا کر

حُسنِ فطرت کے حجابوں کی شکایت کب تک
دیکھنے کی ہے تمنا تو نظر پیدا کر

ہے غمِ پیہم الفت ہی متاعِ ہستی
عیش و راحت سے گذر، دردِ جگر پیدا کر!

ہو چکے شیخ و برہمن کے طریقے پامال
تو کوئی چیز بہ اندازِ دگر پیدا کر

یہ فنا زار بھی تمہیدِ بقا ہے حاجی
شانِ ہستی کو تو پامال نہ کر، پیدا کر!

حاجی سرحدی

پریم کی شکتی

بس میں آوے جو دنیا کے پریم کے بس میں ہوئے ایسا نہ منتر اور ہے دوجا ایسا نہ جادو کوئے۔

پریم ہے سکھ کا ساگر، پریمی سکھ کی نند را سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

پتہ پتہ میں کن کن میں بندی پریم کی ڈور پریم کے کارن گھوم رہے ہیں تارا گن چہوں اور

پریم ہے سکھ کا ساگر، پریمی سکھ کی نند را سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

چاند اور سورج پریم کا دونوں برساتے ہیں نور جگ جیون کا پنتھ دکھاویں کریں اندھیرا دُور

پریم ہے سُکھ کا ساگر، پریمی سُکھ کی نند را سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

پی کر دودھ پریم کا پیارے منی اگل دے ناگ ہرن چوکڑی بھول کے بیٹھے پریم کا سن کر راگ

پریم ہے سُکھ کا ساگر، پریمی سُکھ کی نند را سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

پریم کی ساری پھلواری ہے جس کے ہیں یہ پھول پریم کی گنگا اس میں بہاوے پریت کی ریت نہ بھول

پریم ہے سُکھ کا ساگر، پریمی سُکھ کی نند را سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

پریم ہے سکھ کا ساگر، پریمی سکھ کی نند را سوئے پریم کی شکتی کھو کر بھارت بیٹھا بیٹھا روئے

پریم ہے سُکھ کا ساگر، پریمی سُکھ کی نند را سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

اندرجیت شرما

اوشا

مدت سے میرے گھر کا انتظام اوشا کے ہاتھ میں ہے گو ایک متوسط درجہ کے کنوارے مصور کے رہائشی کمروں کے لئے گھر ایسے وزنی لفظ کا استعمال نامناسب معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت ہے کہ اوشا کی زندہ دلی اور محسن انتظام نے میرے کمروں میں گھر کا سا ماحول پیدا کر دیا ہے اور اُن کے در و دیوار سے ویسی ہی اپنائیت اور اُنسیت کی بو آتی ہے جیسی کہ آپ اپنے پیارے گھر سے متوقع ہوتے ہیں۔ جب میں دن بھر کی مسلسل محنت کے بعد شام کو اپنے کمروں کا رُخ کرتا ہوں تو راحت و آرام کے خیال سے میرا دل مسرت اور محبت کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لئے میں دنیا بھر کے افکار سے آزاد ہو کر رہائشی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے تصور میں محو ہو جاتا ہوں۔ شہر کے پُرشور ہجوم اور گرد و باد بازاروں سے گزرنے کے بعد گھر اور گھر کی پُرامن زندگی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے جب میں گھر میں قدم رکھتا ہوں تو میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھتی ہیں ہر ایک چیز متبسم اور محبت سے لبریز نظر آتی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیواریں خوش آمدید کہنے کے لئے جھکی ہیں۔ سنیر ریر کے ہوئے شمع دان کی لرزتی ہوئی زرد روشنی سے ہمدردی سی ہے۔ شاید یہ انسانی زندگی کی پابندیوں اور مجبوریوں سے واقف ہے جبھی مجھے ہر شام ایسی حسرت بھری نظروں سے دیکھتی ہے!

مجھے یہ سب چیزیں جاندار نظر آتی ہیں، ان میں زندگی دوڑتی دکھائی دیتی ہے، میں نے بارہا چائے والی کو ہنستے دیکھا ہے، اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی سطح کو اپنی آنکھوں سے لگایا ہے، تنہائی میں جب اوشا گھر کے کام میں مصروف ہوتی ہے، میں نے گلدان کو گود میں اٹھایا ہے اور اس کے معصوم پھولوں کو سینے سے لگایا ہے، نازک پھولوں کی مخملیں پتیوں کی دھیمی دھیمی دستک کو بڑے غور سے سنی ہے اور انہوں نے میری محبت کا اعتراف ہزاروں مرتبہ اپنی پیار بھری نگاہوں سے کیا ہے، موٹے موٹے تر کی چوٹ اور ان کا خوشبودار گہرا نیلا دھواں کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے جب وہ نغمہ کی طرح لہراتا ہوا، سینکڑوں بل کھاتا ہوا اوپر کو اٹھتا ہے تنہائی کی بعض افسردہ راتیں میں نے اسی رنگین دھوئیں کی پیشی لہروں کے ساتھ شمار کرنے میں کاٹی ہیں۔ شفق کی روشنی میں گرم چائے کے خوشبودار گھونٹ کتنے جاں بخش ہوتے ہیں، اور بارہ گھنٹے کے بندھے ہوئے پاؤں کے لئے ٹھنڈے سلیپروں کا نرم مس کتنا پیارا ہوتا ہے، چائے کی نارنجی ڈورے دار پیالی کا خوب صورت چمکتا ہوا کنارہ یا کسی معصوم بچی کے سُرخ ہونٹ!

یہ سب کچھ اوشا کی بدولت ہے کہ میں تجرد کی زندگی اتنوں اطمینان اور سکون سے بسر کر رہا ہوں، اوشا کو تعیش کی زندگی اور امیرانہ ساز و سامان سے دلی نفرت ہے، اور جب کبھی میں نے آسائش کے متعلق کبھی کوئی تجویز پیش کی ہے اس نے یہ کہہ کر رد کر دی کہ گھر کو گھر ہی رہنے دو۔ تمہارے ایسے کنوارے گنوار کیا جانیں، خوبصورتی کس بلا کا نام ہے! اس کا یہ مقولہ ہے کہ بیش قیمت اور پُرتکلف چیزوں کے انتظام اور اہتمام سے گھر کی وہ پُرلطف اور آسان زندگی ختم ہو جاتی ہے جو گھر کو گھر بنانے کے لئے ازحد ضروری ہے۔ اس کو آرائش کا شوق ضرور ہے، اور اس کی سلیقہ شعار اور نفاست پسند طبیعت نے ہمارے کمروں کو خاصا خوبصورت بنا دیا ہے، مگر وہ ایسی خوبصورتی کی قائل نہیں جو بجائے مسرت و آرام کے وبال جان ہو جائے۔ اسی سادگی کے طفیل ہم آزادی اور خوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ملنے والے بھی ہمارے یہاں آکر خوشی اور اطمینان کا سانس لیتے ہیں، ہمارے ہاں کوئی بھاری قسم کا تاثر نہیں ہے اور نہ ہی دستور کے مطابق در و دیوار پردوں اور تصویروں سے لدے ہوئے ہیں۔ سفید سفید بلند دیواریں کھڑکی کے انگوری پردے کی ملائم روشنی میں کتنی پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ اگر کوئی چیز اسراف کی ہے تو وہ تازہ تراشے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے جو صبح و شام ہمارے بڑے کمرے کی زینت ہوتا ہے، اس کمزوری کا احساس ہم دونوں کو ہے مگر پھولوں کے بارے میں ہمیں مجبور سمجھنا چاہئے۔

آج نومبر کی پہلی شام ہے، خدا خدا کر کے گرمی کے خوفناک اور آتشیں مہینے تمام ہوئے اور دنیا کو اس عذاب سے نجات ملی، ۱۳ گھنٹے کا بہار ساون، کڑاکے کی دھوپ جھلستی ہوئی ہوائیں، تانبے کی طرح تپتے ہوئے زمین و آسمان، اللہ اللہ کیا کم عذاب ہے! ایک نحیف انسان کی روح ذ ہوتی ہے۔

ہم شہریوں کے لئے جنوں نے اینٹ اور پتھر کے تنور نما مکانوں میں تڑپ تڑپ کر یہ گرمی کے مہینے گذارے تھے، پیاری سردی کی آمد کتنی دلفریب اور جاں بخش ہے، اوشا آج صبح ہی سے سردی کی آمد کے انتظام میں مہمک تھی، ہلکا پرانے گرم کپڑوں کی مانوس خوشبو سے مہک رہا تھا۔ بھورے روئیں دار تولئے آج پھر کھونٹی پر دکھائی دے رہے تھے، گہرے سبز رنگ کی تمام چینی کی چائے کی پیالیاں چھ ماہ کے بعد آج پھر میز پر نظر آرہی تھیں، میں نے چائے کے چند سنسی گھونٹ پیئے اور باہر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا، جیب میں کچھ رنگین چاک تھے، شام کی دلفریبیوں کے نقش لینے کا ارادہ تھا، چلتے چلتے اوشا نے جلدی کی تاکید کردی، اوشا نہیں چاہتی تھی کہ آج میں کہیں جاؤں۔ مگر مجھے شام کی دوشیزہ سحر کاریاں کھینچ رہی تھیں۔ چلتے وقت اوشا نے کچھ ایسی معنی خیز نظروں سے دیکھا کہ میں گھبرا سا گیا، میرے قدم ٹھٹک گئے مگر ہمت کرکے چلا ہی آیا۔

اُف! کتنی سہانی شام تھی! کہیں کہیں ہلکے ہلکے رنگوں کے سوا چاروں طرف زردی چھائی ہوئی تھی، فضا ایک حسین مرثیہ کی طرح مضمحل نظر آرہی تھی، کتنا پیارا سماں تھا،

فطرت کی یہ سادگی کتنی جاذب نگاہ تھی! تالاب میں سنگھاڑے کی بیل پھیل رہی تھی، سبز پتے تیرتی ہوئی کشتیاں معلوم دیتے تھے، جیسے کسی نے چاندی بھرنے کے لئے قطار در قطار رکھ دی ہوں، میں چاہتا تھا کہ ان دلکش مناظر کو کاغذ پر لے لوں مگر طبیعت اچاٹ ہوگئی تھی، مجھے بار بار اوشا یاد آرہی تھی، چاروں طرف گہری خاموشی تھی، آج پرندے سویرے ہی واپس آگئے تھے، تھکی بڑھ رہی تھی، میں گھر کے خیال سے واپس چلا آیا، پانچ سال ہوئے ہم نے مشترک رہائش اس وعدے پر شروع کی تھی کہ شادی بیاہ کے معاملے میں ہم ایک دوسرے کے پابند نہ ہوں گے،

میں نے اوشا کو ہمیشہ صرف ایک ہنس مکھ، سلیقہ شعار اور عقل مند عورت سمجھا، اس کی شکل وصورت کا جائزہ لینے کی کبھی کوشش نہ کی، اور نہ مجھے قدرت کی نیرنگیوں نے اتنی فرصت دی تھی کہ میں کسی کے کاکل دراز یا لب ہائے لعلیں کی طرف متوجہ ہوں مگر اوشا کی محبت آمیز مہربانیاں بعض دفعہ حد سے بڑھ جاتی تھیں اور مجھے مجبوراً اس کو وہ عہد یاد دلانا پڑتا تھا۔ مگر آج مجھے اپنی شکست کے آثار نظر آرہے تھے!

میرا دل عجیب قسم کے خیالات اور کشمکش کا مسکن بنا ہوا تھا، مگر میں ہر حکم کو شش کر رہا تھا کہ ان خیالات کے سلسلہ کو توڑ دوں۔

گھر پہنچا تو اوشا کو مجسم انتظار پایا، میں بدستور ہنسی مکھ میں کمرے داخل ہوا، اچانک میری نگاہ اس کے ننھے ننھے پاؤں پر پڑی، آہ، کتنے خوبصورت تھے وہ! گول گول ایڑیاں اور پیاری ناخن، زندگی سے لبریز! مجھے کبھی اس کو غور سے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، آج جو نگاہ پڑی تو دیر تک دیکھتا رہا، انگور کی بیل کی طرح رس بھری سڈول باہیں، اور ان میں نیلی نیلی رگیں، میں محو حیرت ہو کر رہ گیا۔ باہیں! وہ اس قدر حسین تھی!!! پھر چونکا اور سیٹی بجاتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

چولہے میں آگ روشن تھی، کیتلی میں پانی زور سے کھول رہا تھا، کافی سردی ہوگئی تھی، میں نے اپنا پرانا سیاہ کوٹ پہن لیا، اس کی گرمی سے میری طبیعت بہت چمک گئی، فرط مسرت سے میں نے بوڑھے دفادار کوٹ کو چوم لیا، اس نے بھی گرم جوشی سے اپنے عمر رسیدہ ہونٹوں سے اپنی محبت کے اظہار میں کوتاہی نہ کی۔

اوشا خوشی سے اِدھر اُدھر پھر رہی تھی، اس کے ہونٹ مسکراہٹ اور مسرت سے تھرتھرا رہے تھے۔ میز پر کھانا آچکا تھا، میں اوشا کا منتظر تھا کہ حسب دستور وہ مجھے بلانے آئے گی مگر اس نے بجائے خود آنے کے مشارت سے کھانے کی گھنٹی بجادی، حیرت سے میں نے جو نظریں اٹھائیں اوشا میری نظر محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، شرم سے وہ دوہری ہوگئی! آج رات اس نے توس پر بڑا سا مکھن پھیلایا تھا۔ کھانا بھی آج بہت لذیذ معلوم ہو رہا تھا اور نہ معلوم کیوں بات بات پر ہنسی آرہی تھی، چاند بہت اونچا آچکا تھا، میری درخواست پر اوشا نے چند ویتاتی گیت سنائے خوشی سے میرے آنسو نکل آئے، میں چاہتا تھا کہ اُسے آغوش میں لے لوں، مگر اس نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے مجھے وہ وعدہ یاد دلایا۔

"بہت اچھا، اب دیر ہوگئی ہے، خدا حافظ" میں نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا، وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور زور سے چلائی "نہیں نہیں، آج کی رات دیر سا کوئی لفظ نہیں"۔ اور مجھے واپس کھینچ لیا،

شمع دان کی دھیمی روشنی میں، میں نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا اب شمع دان کی روشنی میں حسرت نہیں نظر آتی بلکہ محبت ٹپکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

خلیق احمد فاروقی

دنیائے ادب

اردو

نئے ادب کی ضرورت پر چند رائیں

ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ اُن کا محاکمہ کرتا ہے۔ وہ اب تحریک یا ابہام کے لئے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا۔ یا فانیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں۔ اُس کی فضیلت کا موجودہ معیار جذبات کی وہ شدت ہے جس سے وہ ہمارے جذبات اور خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اخلاقیات اور مذہبیات کی منزل مقصود ایک ہے۔ صرف اُن کے طرزِ خطاب میں فرق ہے۔ اخلاقیات دلیلوں اور نصیحتوں سے عقل اور ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب نے اپنے لئے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چُن لیا ہے۔ ہم زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں۔ یا ہم پر جو کچھ گزرتی ہے وہی تجربات اور وہی چوٹیں تخیل میں جا کر تخلیقی ادب کی تحریک کرتی ہیں۔ شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدتِ احساس ہوتی ہے۔ اتنا ہی اس کا کلام دلکش اور بلند ہوتا ہے۔ جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ پیدا ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے۔ ہم میں قوت اور حرکت نہ پیدا ہو۔ ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لئے بیکار ہے اُس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا زمانۂ قدیم میں مذہب کے ماتحت سوسائٹی کی لگام تھی۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی تہذیب مذہبی احکام پر مبنی تھی اور وہ تخویف یا تحریص سے کام لیتا تھا۔ عذاب و ثواب کے مسائل اس کے آلۂ کار تھے۔ اب ادب نے یہ خدمت اپنے ذمے لی ہے اور اس کا آلۂ کار ذوقِ حسن ہے۔ وہ انسان میں اس ذوقِ حسن کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حُسن کا احساس نہ ہو۔ ادیب میں یہ ذوق جتنا ہی بیدار اور پُرعمل ہوتا ہے اتنی ہی اس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔ فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوتِ احساس کے ذریعہ اس جذبۂ حُسن کی اتنی تیزی ہو جاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے غیر مستحسن ہے۔ انسانیت سے خالی ہے۔ وہ اس کے لئے ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے نیز وہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے وار کرتا ہے۔ یوں کہئے کہ وہ انسانیت کا، علویت کا، شرافت کا علمبردار ہے جو پامال ہیں، مظلوم ہیں، محروم ہیں چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت ان کی حمایت اور وکالت اُس کا فرض ہے۔

. . . . . .

ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ اُن کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے"۔

. . . . . .

ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو۔ آزادی کا جذبہ ہو۔ حُسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور بے چینی پیدا کرے۔ سُلانے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی"۔

پریم چند مرحوم

. . . . . .

ہمارے لئے بزرگانِ سلف نے ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے اس میں خوبیاں بھی ہیں خرابیاں بھی ہیں۔ ہمارا کام اپنی ضروریات کے مطابق ان کمیوں کو پورا کرنا اور نئی نئی چیزوں کا پیدا کرنا ہے۔ ہماری اکثر پرانی قسم کی غزلوں میں ایک خیالی صنم کے عشق میں بے قرار رہنا یہ موضوعی محبت کی نوک

جھنک، مبالغہ نہیں، آسمان کے تلے بے ملانا سر و آہیں بھرتے رہنا، ہر گھڑی مقدر کا رونا دھونا، کفن سر سے باندھے رہنا، یہ ایک الٹی قسم کی ذہنیت اور ایک غیر فطری اور بیکار اور لغو زندگی کی علامات ہیں جو غنچہ پھٹکا تو کہاں سریں دھمک ہوتی ہے۔ اب نہ ایسی خیال آرائی پر داشت کر سکتی ہو نہ ایسی نازبرداریاں ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم اپنے ملک الشعراء کے اس قول پر کان دھریں کہ ؎

تدبیر کہ فایدہ تدبیر میں کیا ہے ✦ کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے

بلکہ ہمیں اپنے ترجمان حقیقت کی اس ہدایت پر عمل کر دکھانا ہے کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

راقم نے سکول کے دنوں میں جب یہ شعر سنا ؎

چمن سے گزرے تو لے صبا تو یہ کہنا بلبل زار کو
کہ خزاں کے دن بھی قریب ہیں نہ لگا دل کو بہار کو

تو فوراً اپنی تک بندیوں کے لئے زار تخلص اختیار کر لیا۔ لیکن جب ذرا ہوش سنبھالا اور دنیا کا نیا انداز دیکھا تو معلوم ہوا کہ مشرق و مغرب میں "بلبل زار" اور "زار و زار دس" دونوں کا زمانہ ہو چکا ہے۔ ہمارا بھی یہی رونا دھونا رہے ہیں کہ "وہ کونسا غم ہے کہ جو دنیا میں نہیں ہے"! اور "آہ ہمیشہ حرام بلکہ حرام" اور وہاں بیل گاڑی کی بجائے موٹر کار اور ہوائی جہاز اور ریڈیو اور کیا کیا کچھ۔ رگ رگ میں زندگی کا خون دوڑ رہا ہے۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔!

جناب جوش ملیح آبادی خوب لکھتے ہیں۔ "شباب محبت کا واسطہ، اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑائیے اور وطن عزیز کے لئے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الہند تیار کیجئے جس کی سنہری اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نقرئی جلوس فوج در فوج اور قطار اندر قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔

یہ درست ہے کہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" ہمارے ادب کے چمن میں بجائے بلبل و قمری کے کوئل اور فاختہ کی ضرورت ہے۔ ہندوستانی فضا پیدا کرو، مقامی افسانہ لکھو، ہندوستان کے مذاہب کا تذکرہ کرو لیکن ساتھ ہی گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو۔" دیکھو کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مغرب کی نئی زندگی کو دیکھو وہاں کے تازہ ادب کو دیکھو۔ کیونکہ آزادی کی تنظیم کی، منصوبہ بندی کی، اشتراکیت کی، اور عدل و مساوات کی موجیں اس کے طوفانی سمندروں میں اچھل رہی ہیں، تم میں بھی نئی زندگی کا احساس پیدا ہوگا تو نئے سے نئے خیال پیدا ہوں گے اور وہ اپنے لئے خود بخود اظہار کے نئے طریقے ڈھونڈ لیں گے اس طرح ایک نئی طرز تحریر، نئے الفاظ اور ایک نیا ادب پیدا ہوگا اور جو خیال ایک صحیح قسم کی زندگی سے پیدا ہوگا جو اپنے لئے مشکل الفاظ تلاش کرے گا بلکہ وہ دل سے نکل کر دل میں آسانی سے جگہ پیدا کرے گا۔ ہمارا مقصد ہونا چاہئے عام لوگوں کی تعلیم و ترقی۔ اس کے لئے ضرورت ہے اصلاح شدہ مشاعروں کی آسان نظمی ڈراموں کی، اور رسالوں خصوصاً روزانہ اخباروں میں آسان عام فہم زبان میں نئے اصلاحی و انقلابی خیالات کی اشاعت، کیفیات، ان مجہولات کی جگہ دل سے دل کی باتیں ہوں، سیدھے سادے جذبات ہوں۔ دنیا کی تازہ تحریکوں کا نقشہ ہو سائنس کی روز افزوں ترقی کا بیان ہو تو ہماری جاہل ناواقف قوم ادبیات سے کتنا فایدہ اٹھائے پھر ادب اس کی بیداری کا ذریعہ بن جائے اور ایک نئی زندگی کی بنیاد پڑے۔ کہیں کہیں کوئی آواز بلند ہو رہی ہے۔ معنوی ادب کے مطالعہ اور اقبال کی حیرت انگیز شاعری نے ایک نئے دور کا آغاز ضرور کیا جس سے بعض نوجوان مصنف اور شعراء متاثر ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے نشاۃ ثانیہ اور ایک غلط قسم کی "ایگزوٹیزم" اور نام نہاد "روحانیت" نے پھر ہاتھ پاؤں نکال کر دئے۔ تو وہ پٹ چل رہی تھی اور میراں دھڑک رہا تھا" یا "اے شاہد حقیقی! میں تیرے نور جمال سے بے اجر ہو کر اقبال و خیریں آرہا تھا" وغیرہ وغیرہ۔ اس دل کی دھڑکن اور اس اندھا دھند نام نہاد حقیقت پرستی کی روک تھام کی اشد ضرورت ہے۔ فطری خیالات کی اور آسان زبان کی حاجت محض اس لئے نہیں کہ ہماری زبان دوسری زبانوں کا مقابلہ کامیاب طور پر کر سکے بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ وہ خود ہمارے لئے مفید ثابت ہو اور ہماری صحیح تعلیم و تربیت کی ضامن بنے۔ پھر کچھ شبہ نہیں کہ دوسرے لوگ اس سے ضرور متاثر ہوں اور دیکھیں کہ کیسے ہم نے اپنی زبان کو اور ہماری زبان نے ہمیں شاہراہ زندگی پر سیدھے رستے ڈال دیا ہے۔!

میاں بشیر احمد بی اے

ہمارا ملک ہر قسم کے مذہبی توہمات کا شکار رہے مذہبی تعصب یا

روحانیت نے جو گل ہندوستان میں کھلائے ہیں سب کو معلوم ہیں۔ روحانیت کے علاوہ ہمیں اپنے اخلاق پر بھی ناز ہے، مگر ہمیں کہنا یہ کہنا ہوگا کہ اس سے بحث نہیں۔ روحانیت اور اخلاق ادبی دنیا میں بھی گھس گئے ہیں اور اس بُری طرح کہ نکالے نہیں نکلتے۔ ادبی فن کو مذہب روحانیت اور اخلاق کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ جب میں اپنے تعلیم یافتہ دوستوں کی زبانی سنتا ہوں کہ فلاں کہانی، فلاں ڈراما یا فلم دھارمک ہے یا اخلاق اور روحانیت سے پُر ہے تو مجھے یہ خیال کر کے رنج ہوتا ہے کہ سیاسی سوراج کی طرح ہمارا ادبی سوراج بھی ابھی کوسوں دور ہے۔ ہر ایک ملک اور زمانہ کا اخلاقی مختلف ہے، بدلتا رہتا ہے اور بدلتا رہے گا مگر خوبصورتی ایک اٹل چیز ہے۔ خوبصورتی کے پروانے مذہب وملت رسم ورواج کی بندشوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ ایک غزل یا افسانہ کو اخلاقی یا روحانی یا مذہبی نظر سے دیکھنا ایسا ہی بے معنی ہے جیسا کہ ایک پھول سے ہم پوچھیں کہ تیرا مذہب کیا ہے اور تیرے پیدا ہونے کا راز کیا ہے اور تو اپنی خوشبو اور خوبصورتی کو بے پتری سے باغ میں کیوں بکھیر رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔!

پروفیسر بھوپال سنگھ ایم اے (ڈی رلٹ)

. . .

"۔ ۔ ۔ یہ نہ افسانہ ہے نہ شپ اور قصہ کہانیوں کا نہیں ہے۔ شاعری کرنا ہے تو افسانوں کو چھوڑئیے۔ نقاشی مت کیجئے بلکہ فوٹوگرافری کیجئے ورنہ آپ کی نقاشی کے ایک سے ایک بڑھ کر فوٹو کی ایک کھنڈر کی تصویر پر سے قربان کر دیئے جائیں گے ۔ ۔ ۔ یورپ کی افسانہ نگاری کا روح اس میں ملتا ہے اور اگر آج نئی یورپ دانی افسانہ نگاری میں سے گل وبلبل نکال پھینکے اور سیدھی سادی وقائع نگاری پر آجائے تو ممکن کہ ہم پورپین افسانہ نگاروں سے بڑھ نہ جائیں۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ دلچسپ واقعات روس میں تو ہوتے ہوں مگر ہندوستان میں نہ ہوتے ہوں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ چونکہ ہندوستان میں سیکڑوں مذاہب، رسمیں، قومیں، زبانیں اور روس اور فرانس سے کہیں زیادہ اقسام کی ذہنیتیں موجود ہیں قدم قدم پر طرح طرح کے قانون ہیں لہٰذا بہ نسبت روس اور فرانس کے ہندوستان کی معاشرت ایسے ایسے تماشہ کے واقعات پیش کرتی ہے جن کے عجیب وغریب پلاٹ دوسری جگہ مرتب ہونا ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ میرا قول ہے کہ "جو دیکھو وہ لکھو، اور جو دکھائی دے وہ لکھو۔"

مرزا عظیم بیگ چغتائی

". . . ایک طرف پولیس کا وہ منش خوار وزبوں ہے جو تمام عمر اپنی فرعونیت اور ہوس پرستی کا مظاہرہ کرنے کے بعد تسبیح کے دانوں پر اپنے گناہوں کا شمار کرتا ہے۔ اُسے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اُس کو رُلانے اور رسلانے میں مدد دے سکیں۔ پھر وہ مولوی ہے جو دین کے پردے میں دنیا دار ہے جس کی ہوس پرستی کو اشعار کے اس ناپاک دفتر سے ایک گونہ تسکین ہوتی ہے اور وہ تعلیم زدہ لڑکیاں ہیں جو زن مرید شاعروں کی ٹھنڈی سانسیں سُن کر کسی محبون کے انتظار میں ہیں۔ وہ ایسی کہانیاں پڑھنا چاہتی ہیں جن کی ہیروئن وہ خود ہوں اور جن کے ہیرو خود کشی کر کے بھیڑوں کی طرح تڑپ رہے ہوں۔ کیا آپ کی آیندہ کاوشیں اُن ہی کے لئے وقف ہوں گی۔

دوسری طرف وہ کسان ہے جو سماج کا سنگِ بنیاد ہے زمیندار اور سود خور جونک کی طرح اس کا خون پی رہے ہیں مولوی اس پر خود گزاری اور صبر وشکر کا جادو پھونکتے ہیں اُس کی بیوی روئیوں کے لئے عشوہ فروشی پر مجبور ہے۔ اُس کے بچے بھوک سے تنگ آکر آپ کی جیب پر گھات لگائے ہوئے ہیں۔ وہ مزدور ہے جو سماج کی عمارت کا ستون ہے وہ مال اس لئے پیدا کرتا ہے کہ مانع کے نام سے ایک دوسرا شخص اُسے ہتیالے جس کے لئے لغت میں مالک کا لفظ تراشا گیا ہے۔ قید خانہ کی کوٹھڑیوں سے بدتر جھونپڑیوں میں پلیگ اور ہیضہ میں تڑپ کر وہ بھوکا اور ننگا مزدور اس حسرت میں مرجاتا ہے کہ ہارواڑی کا سانڈ یا کسی امیر کا کتا کیوں نہ ہوا۔ کیا اس کے حال زار نے کبھی آپ کے دل میں ہلچل پیدا کی ہے۔ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کیا کبھی ان اسباب وعلل کو مٹانے کا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہے۔ اگر نہیں تو آپ ادب کے لئے باعثِ ننگ ہیں۔ ایسے ادیبوں کے لئے کرو یا تمن کہتا ہے:۔

کیا تم مصنف بننے کی آرزو رکھتے ہو؟ تو اپنے ملک کے مصائب کی داستان پر نظر ڈالو اور اگر اس کے بعد تمہارا دل خون نہیں ہو جاتا تو اپنے قلم کو پھینک دو۔ اس قلم کا مصرف صرف یہ ہے کہ تمہارے بے حس دل کی ناپاکی کا پردہ فاش کرتا رہے"

اختر حسین رائے پوری بی اے

"شاہجہاں"

کیفیات

اُف وہ روئے تابناک و چشمِ تر میرے لئے
ہائے وہ زلفِ پریشاں تا کمر میرے لئے

ہر نفس میں ایک دنیائے محبت نو بہ نو
ہر نظر میں اک پیام تازہ تر میرے لئے

کچھ تجاہل، کچھ تغافل، کچھ توجہ، کچھ غرور
روز و شب میرے لئے، شام و سحر میرے لئے

وہ رُخِ رنگیں پہ انوارِ محبت زرد، زرد
وہ لبِ نازک پہ طوفانِ شرر میرے لئے

صبح سے تا شام نظروں کو مری ہے جستجو
شام سے تا صبح آنکھیں سوئے در میرے لئے

سر سے پا تک آہ وہ اک پیکرِ حُسنِ حزیں
چار جانب دیدۂ حسرت نگر میرے لئے

سرد سرد آہوں میں تاثیرِ محبت گرم گرم
خشک خشک آنکھوں میں جوشِ اشکِ تر میرے لئے

جوشِ غم، جوشِ حیا، آغازِ عشق، احساسِ حُسن
اک قیامت سی قیامت سر بسر میرے لئے

یاس و حرماں، شوق و اُمید، آرزو و بے دلی
کشمکش سی کشمکش آٹھوں پہر میرے لئے

حیف وہ لغزیدہ لغزیدہ قدم میری طرف
ہائے وہ دزدیدہ، دزدیدہ نظر میرے لئے

سامنے آتے ہی آتے [illegible] تیز تیز
سینۂ شفاف وہ زیر و زبر میرے لئے

وہ سرک جانا یکا[illegible] ناباں سے نقاب
حیرت افزا رونقِ دیوار و در میرے لئے

عشوہ عشوہ منظرِ حسرت ٹوٹا ہوا بازو ہار
جلوہ جلوہ، دعوتِ ذوقِ نظر میرے لئے

اُف وہ آغوش تہی نتائجِ آغوشِ دگر
اُف وہ دردِ شوقِ محتاجِ اثر میرے لئے

ہائے وہ رنگیں رُخ و سیمیں تن و زرّیں کمر
ہائے وہ لعلیں لب و سلکِ گہر میرے لئے

اُس نگاہِ نازمیں وہ ہلکی ہلکی جُنبشیں
معنیِ بے لفظ و شرحِ مختصر میرے لئے

تھرتھراہٹ سی لب و چشم و جبیں پر بار بار
کپکپاہٹ سی وہ سارے جسم پر میرے لئے

شبنم آلودہ وہ آنکھیں وہ گلاب افشا جبیں
وہ دھڑکتا دل، وہ گھبرائی نظر میرے لئے

میں سراپا بے نیازِ ربط و ضبطِ حُسن و عشق
وہ مجسم حسن و عشقِ معتبر میرے لئے

وہ مری آزاد فطرت وہ مری تمکینِ ہوش
وہ شکستِ حُسن وہ نیچی نظر میرے لئے

اول اول آہ وہ دل میں مرے احساسِ عشق
آخر آخر اُف وہ نوکِ نیشتر میرے لئے

اس طرف جو تھیں وہی کیفیتیں سب اس طرف
جو اِدھر تھا سب وہی عالم اُدھر میرے لئے

لحظہ لحظہ وہ مرا پیہم سکوتِ مضطرب
لمحہ لمحہ عالمِ نوعِ دگر میرے لئے

ظاہری وہ احتیاطِ رسم و راہِ حُسن و عشق
باطنی وہ اختلاطِ بیش تر میرے لئے

یک بہ یک کہنا وہ پھر بانہوں میں باہیں ڈال کر
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

جگرِ مرادآبادی

"عالمگیر"

تعظیم نہ کر

آزاد منش رہ دنیا میں، پروائے امید و بیم نہ کر
جب تک نہ ملیں فطرت کے قدم، خم دیکھ سرِ تسلیم نہ کر
سینے میں ہے اُس کے سوز اگر، شیطاں کے قدم لے آنکھوں پر
بیگانۂ درد دل ہے اگر، جبریل کی بھی تعظیم نہ کر
کتنی ہی شعاعیں ابر میں ہوں، خورشید جنوں پر ایماں لا
کتنے ہی دلائل روشن ہوں، دانش کو کبھی تسلیم نہ کر
سانچوں میں برابر ڈھلتا جا، رفتارِ جہاں سے پھیر نہ مُنہ
تیغ تو کیا، اس دفتر میں، جینا ہے تو کچھ ترمیم نہ کر

اے جوشِ ہجومِ کلفت میں فریاد و فغاں سے کام نہ لے
گھٹ جائے گا اس سے دل کا اثر، اجزائے تپش تقسیم نہ کر

(جوش)

انگریزی

فاحشہ

میرا ایک مصیبت کا مارا دوست، گردشِ ایام سے نہایت ضعیف و ناتواں، اوائلِ عمر سے بدنصیبی کا شکار، اب حضرتِ عشق کا ساتھی بنا۔ خبط کی مجبوریوں سے تنگ آکر ایک حسین فاحشہ کو دل دے بیٹھا۔

وہ حسین فاحشہ جس کے طفیل بیسیوں بھرے ہوئے گھر اُجڑ گئے . . . وہ دلفریب طائفہ جس کی نظرِ عہد جوانی میں کئی نوجوان کھا گئی۔ وہ جادو نگاہ جس کے سمندر کی رو میں محبت میرے رعظم مست کو بہا کر لے گئی۔

میں نے کہا۔ ہڈیوں کا پنجر میرا دوست میرے دوستوں سے بدتر ہے میں نے سوچا دوست کو گرداب بلا سے بچانا صحابت کا فرض ہے لیکن بات یہ ہے کہ عشق کا مارا بھائے سے بھ تا ہے۔

اس حور کو اپنی طرف لانا آسان تھا او ح دوست کو بچانا بھی سہل تھا۔ کیونکہ میرا دوست ٹوٹا ہوا بازو، ہمت تھی۔ برخلاف

براؤننگ

اس کے میں صاحبِ دوست تھا ــــ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ میں طاقت کا مالک تھا

وہ میری طرف اس طرح آئی جس طرح بلبل میوے کو دیکھ کر آتی ہے۔ وہ مجھ سے ایسی مانوس ہوئی۔ جیسے بھونرا پھول سے پریم کرتا ہے، اُس نے سمجھا گویا اُسے میری ہی تلاش تھی۔

میرا دوست بے تاب ہوگیا۔ مضطر ہوگیا۔ اُس کے لبوں پر خاموشی چھا گئی۔ اُس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہہ رہا ہے "تو نے میری آرزوؤں کا خون کیا حسن کش!"

میں حیران تھا۔ میں نے تو اُسے آفت سے بچایا تھا۔

میں خوب پھنسا۔ دوست کو کھو دیا۔

میں نے کیا کیا۔ کیوں کر ایک چڑیل کو اپنے گلے مڑھ لیا۔

میرا دل صاف تھا لیکن پھر بھی میں لوگوں کی نظروں میں گر گیا۔

امرت لال عندلیب

نقد و نظر

سوز و نام

حضرت عاشق بٹالوی کے میں مختصر افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے عاشق صاحب ملک کے اُن چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے معاشرت اور اس کے مسائل کو غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور پھر اپنی مصورانہ قابلیت سے اُن کا ایسا موثر اور زندگی سے لبریز نقشہ پیش کیا ہے جو پڑھنے والے کو حقایق کی روح سے قریب تر لے جاتا ہے۔ عورت کی فطرت گناہ کی اصلیت اور انجام معاشرت کی خامیاں اور خرابیاں، زندگی اور زندہ دلی ان افسانوں کے مضامین ہیں، اور ان کو جس بے باکی اور قدرت کے ساتھ مصنف نے نباہا ہے اس کی نظیر ہمیں اپنے اہل قلم میں بہت کم ملتی ہے۔ آخری افسانہ ــــ تحریر کے لحاظ سے بھی ان افسانوں میں غالباً آخری افسانہ "حیاتِ تازہ" ہی ہے۔ اگرچہ اس کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسے افسانہ کہیں یا سوانح عمری یا مضمون، لیکن اس کے باوجود یہ مصنف کا شاہکار ہے جس میں وہ تمام خصوصیات و رجحانات ہمیں یکجا ملتے ہیں جن کی ملحدہ ملحدہ جھلک ہم نے مصنف کے مختلف افسانوں میں دیکھی ہے۔ گویا جس تصویر کا معمور کبھی کبھی کوئی رُخ دکھایا کرتا تھا آخر میں اس نے اسے ایک حقیقتِ عریاں کی طرح نظروں کے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔ حادثات کا زیر و بم، جذبات کی گوناگونی، رومان اور حقیقت، اُن کی شیریں بیانی اور تلخیاں ایک حقیقی انسانی کردار کی تخلیق کرتی ہوئی اس میں موجود ہیں۔ غرضکہ "زندگی" سے کے کر جو اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے اور اس موضوع پر ایک فرخ و دلنشیں تبصرہ ہے "حیاتِ تازہ" تک اس مرقع کا ہر نقش غائر نظر سے دیکھے جانے کا حق رکھتا ہے۔ عاشق صاحب کی زبان اور اسلوبِ تحریر بھی کچھ کم جاذب نہیں اگر انہیں صاحبِ طرز ادیب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ نہایت شستہ و رفتہ اردو لکھتے ہیں، الفاظ کی قدر و قیمت جانتے ہیں، اور ترشی ترشائی سبھی ہوئی تراکیبیں اور فقرات استعمال کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ کتاب ظاہری حیثیت سے بھی بہت اچھی چھپی ہے۔ حجم ۳۲۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ادبی دنیا۔ کرشن بلڈنگ لاہور۔

تمدنِ عتیق

مولفہ ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے و مُعد عطار الرحمٰن صاحب بی اے اسسٹنٹ سٹی کالج حیدر آباد دکن۔ یہ کتاب دنیا کے آغاز سے لے کر کلدانی سلطنت کے خاتمے اور آریاؤں کے آغاز تک کی تاریخ ہے انسان صفحہ ہستی پر کیسے نمودار ہوا؟ تہذیب و تمدن کا آغاز کب ہوا؟ تہذیبی اور معاشرتی حالات نے انسان کے ارتقا کے ساتھ ساتھ کس طرح ترقی کی؟ کہاں کہاں ترقی کے مدارج کی کیا کیفیت تھی؟ سائنس کی تحقیقات اور آثار کی شہادتوں کے ذریعے سے ان سوالات کے اس کتاب میں جواب ہیں۔ اردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ لیکن فاضل مولفین نے ایسی وضاحت اور سلاست کے ساتھ ارتقا کی اس گتھی کو سلجھایا ہے کہ جو شخص پہلی بار بھی اس مضمون کا مطالعہ کرے گا وہ اس میں دلچسپی اور معلومات کا کافی ذخیرہ پائے گا۔ حجم ۲۲۴ صفحات ہے اور کتاب مجلد ہے قیمت بے تصویر ایڈیشن دو روپے با تصویر ایڈیشن تین روپے۔ مولفین سے طلب فرمائیے۔

مثنویات

منشی محمد امیر احمد صاحب علوی بی اے کی ایک قابلِ قدر تالیف۔ دراصل یہ ایک مبسوط مضمون ہے جو سالنامہ نگار ۱۹۲۵ء کے لئے لکھا گیا تھا۔ بعد میں اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے مناسب حذف و اضافے کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس میں مثنوی کی حقیقت اور تاریخ لکھنے کے بعد قدیم طرز کی اردو مثنویات پر ایک محققانہ تنقید کی ہے جو بہت سی ادبی نکات سے بھی پُر ہے۔ حجم ۱۰۲ صفحات قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ امیر لائبریری، امیر محل لائبریری، تھمبیر باغ۔ کاکوری (لکھنؤ)

پیمانہ

اس ماہوار رسالے میں فلمی دنیا کی سرگرمیوں کے متعلق دلچسپ مقالات اور ادبی مضامین اور نظمیں ہوتی ہیں۔ اس کے ایڈیٹر جناب باصر ایک خوش مذاق ادیب ہیں جو رسالے کو مفید بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ سالانہ چندہ دو روپیہ دفتر رسالہ "پیمانہ"۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور سے طلب فرمائیے۔

منصور احمد

فہرستِ مضامینِ ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ فروری سنہ ۳۷ء ۱۹

جلد ۱۵ تصاویر:- ۱- سعدی فکرِ شعر ہیں ۲- جونو اور مور نمبر ۴

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	بزمِ ادب	منصور احمد	۲۹۴
۲	آئینۂ عالم	"	۲۹۶
	افسانے		
۳	دوسری بیوی	جناب مولانا سید حسن صاحب ایم اے	۳۰۱
۴	کیا تمہیں یاد نہیں	جناب اقبال	۳۲۳
۵	رشک	جناب عزیز مسعود صاحب	۳۲۷
۶	عجیب انتقام	جناب روشن لال صاحب روشن نجمی ایم اے	۳۳۴
۷	گل فروش	جناب کرشن چندر صاحب ایم اے	۳۴۲
	علمی مضامین		
۸	سیاسی انقلابات اور شاہی	جناب سید وقار عظیم صاحب ایم اے	۳۱۳
۹	فاروقِ اعظم کا ایک سفر	جناب سید یحییٰ حسن صاحب ندوی	۳۲۹
۱۰	دونا جلیانہ	جناب سر شنکر نائر صاحب نوبل ایڈووکیٹ لکھنو	۳۳۹
۱۱	کیمورہ	جناب محمد منظر الٰہی صاحب ایل ایل بی	۳۴۸
	ادبی مضامین		
۱۲	جونو اور مور	منصور احمد	۲۹۵
۱۳	تمہیں یاد ہے!	جناب پنڈت ایم نقایا صاحب	۳۳۷
	حصۂ نظم		
۱۴	عہدِ رفتہ	جناب حفیظ ہوشیار پوری ایم اے	۳۰۰
۱۵	جگر پارے	جناب جگر مرادآبادی	۳۱۱
۱۶	شاعر کی دعا	جناب سید عبدالحمید صاحب ایم اے	۳۱۲
۱۷	غزل	جناب سید طاہر حسین صاحب رضوی کیفی اعظمی	۳۲۲
۱۸	کومل	جناب مسعود شاہد صاحب بی اے	۳۲۶
۱۹	جامِ صہبائی	جناب خواجہ عبدالمسیح صاحب پال اثر صہبائی ایم اے وکیل سری نگر	۳۲۸
۲۰	پیاسے مہن کی یاد میں	جناب پنڈت رجموہن نتاتر یہ صاحب کیفی دہلوی	۳۳۳
۲۱	غزل	جناب حیراں خیرآبادی	۳۳۸
۲۲	غزل	جناب سید ابن حسن صاحب شارق دہلوی	۳۴۱
۲۳	آزاد ملاح	جناب نذیر میرزا صاحب پراس بی اے آنرز	۳۴۷
۲۴	نوائے فراق	جناب پروفیسر گورکھپوری ہما سما صاحب فراق گورکھپوری ایم اے	۳۵۲
۲۵	نقد و نظر		۳۵۳
۲۶	دنیائے ادب		۳۵۴

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے محصول وی پی نو آنے کل پانچ روپے ممالک غیر میں شلنگ

(ریلوے الیکٹرک پریس، پیپر مل روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر ادبی دنیا مرسل ہذا چھپ کر مالی روڈ لاہور سے شائع ہوا)

بزم ادب

ہمیں مسرت ہے کہ اس دفعہ بھی "ادبی دنیا" کا سالنامہ ہر پہلو سے کامیاب رہا اور ادباء اخبارات نے اپنی آرا میں اس کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کر کے ہماری محنت کی داد دی۔ اب تک جو آرا موصول ہو چکی ہیں اُن میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں تاکہ ناظرین "ادبی دنیا" کو معلوم ہو کہ اُن کے پرچے کے متعلق ملک کے اکابر ادباء کیا خیال کرتے ہیں۔

علامہ برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی نے محسوس کیا ہے کہ سالنامہ عام سالناموں کی طرح محض ظاہری لباس سے مزین نہیں ہے بلکہ اس میں ایسے ایسے پائیدار مضامین موجود ہیں جو ادب پر خاص اثر اور نشان پیدا کرتے ہیں:

"طلبیتوں کی طرح رائیں بھی مختلف ہوا کرتی ہیں۔ بہت لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ رسالوں کے خاص نمبر خود نمائی سے اور کچھ نہیں ہے اس بنا پر والوں نے اگر "ادبی دنیا" کا سنہ رواں کا سالنامہ دیکھا ہوتا تو انہیں اپنی رائے بدل دینی پڑتی۔ بات اصل یہ ہے کہ خاص نمبروں کے لئے جو خاص اور غیر معمولی اہتمام کیا جاتا ہے وہ صحافت سے گزر کر لٹریچر پر خاص اثر اور نشان پیدا کرتا ہے۔ وہ رسالہ کا ایک نمبر نہیں رہتا بلکہ ادب کا ایک شاہکار بن جاتا ہے۔ ادبی دنیا کا یہ سالنامہ اس وصف کا مالک ہے۔ لٹریچر کے اکثر اہم شعبوں پر اس میں دلچسپ مسالہ ملتا ہے۔ جو بعض مندرجات کی انفرادیت ہمگانی اہمیت سے بالاتر ہے۔ مولوی منصور احمد صاحب سرراہل ذوق اور ادب دوست کی تہنیت کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ قرینہ ڈھائی سو صفحہ کی ایسی کتاب تیار کر دی ہے جس کے حواس ضروری و غیر ضروری کی پوری توصیف امکان سے باہر ہے۔ کیا فسانے، اور کیا ادبی مقالے اور کیا نظمیں جو کچھ بھی اس میں ہیں محبوبیت اور افادت کا نذرانہ طلب کرتی ہیں۔" کیفی

پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری نے دو سطروں میں سالنامے کی اتنی تعریف کر دی ہے کہ "ادبی دنیا" کے لئے باعث صد فخر و ناز ہے اس کے بعد انہوں نے ایک تجویز لکھی ہے، جسے بجنسہٖ یہاں درج کیا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ ایسی تجویزیں ادب کی زندگی کا نشان ہوتی ہیں اور اُس زندگی کے مدنظر جو کچھ عرصے سے اردو ادب میں نظر آ رہی ہے ہمیں امید ہے کہ اہل قلم اس طرف توجہ فرمائیں گے، اور اس تجویز کی تکمیل کی نسبت اپنی آراسے ہمیں مطلع کرینگے۔

"کرمی تسلیم

سالنامے کی علیحدہ شان کا یہ پہلی پر بہار کی باد۔ ہر لحاظ سے یہ نمبر بڑا گا نمبر ہے صرف "ادبی دنیا" کی تاریخ میں نہیں بلکہ اردو ماہ ناموں کی تاریخ میں۔

یہ خط ایک تجویز پیش کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ آج کل اردو ادب اور اردو شاعری بلکہ ہندوستان بھر اور دنیا بھر کے ادب میں انقلاب اور زندہ دلی کے جذبات کا زور شور ہے۔ اردو میں آج لوگ ایسے ادب کے مشتاق ہیں جس میں زندگی ہو جو حیات بخش ہو جس میں امنگ ابھار اور گرمی ہو اور اسی نظر سے پہلے کے ادب کی بھی جانچ پڑتال ہو رہی ہے۔ چنانچہ میں آتش کے دیوان کی سیر اسی نظریے کی تحت میں کر رہا ہوں۔ اُن کے وہاں آٹھ ہزار اور نو ہزار کے بیچ میں اشعار ہیں۔ میں نشان لگاتا جا رہا ہوں آتش کے یہاں پچیس تیس فی صدی اشعار موجودہ فضا اور اسپرٹ کے لحاظ سے بہت کامیاب ہیں اور دنیا پیغام نئی معنویت اور ایک خاص تاثر کے ساتھ ذہن پر کام کرتے ہیں اور دل میں اترتے ہیں۔ میرا انتخاب ڈھائی ہزار اشعار تک پہنچے گا۔ چنانچہ میری آپ سے تجویز ہے کہ آپ جون ۱۹۳۷ء کا نمبر آتش نمبر کے نام سے نکالیں جس میں زیادہ سے زیادہ دس مضمون آتش پر ہوں بلکہ اپنج ہی چھ مضامین ہوں تو اچھا ہے یعنی ۶ صفحوں کے اندر مضامین ختم ہو جائیں یا زیادہ سے زیادہ ۸ صفحوں پر اور آتش کے پورے کلام کا مکمل انتخاب کر کے میں دے دوں گا۔ معہ ایک مضمون کے جو مختصر مگر جامع اور نکتہ نظر سے لکھا ہو اگر مناسب سمجھیں تو آتش نمبر کا سائز زمانہ کانپور کا سائز رکھیں یا "جادبی دنیا" کا سائز ہے وہی رکھیں۔

اگر آپ کو یہ تجویز پسند ہو تو فروری یا جنوری نمبر میں اس کا اعلان کر دیں کہ آپ کا جون نمبر آتش نمبر ہوگا اور اس کی یہ خصوصیتیں ہوں گی اور مضامین آخری اپریل تک منگالیں میں اپنا انتخاب تو فروری میں بھیج سکتا ہوں اور اور مضمون مارچ میں۔

کیا آپ اس تجویز پر غور کر کے اندر ایک ہفتہ کے یعنی جنوری کے اخیر تک مجھے اپنا فیصلہ لکھیں گے؟

نیاز کیش۔ رگھوپتی سہائے فراق"

جناب مرزا محمد سعید صاحب ایم اے نے ایک عام ریویو لکھا ہے اور "ادبی دنیا" کی ترقی پسند روش سے متاثر ہو کر اس کے لئے لکھنے کا خاص وعدہ فرمایا ہے۔ ہم ان کے فاضلانہ مقالات کے لئے چشم براہ ہیں اور اُن کی دعاؤں کے شکر گزار ہیں۔

"مخدومی و محترمی تسلیم۔ "ادبی دنیا" کا سالنامہ موصول ہوا اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کا رسالہ نہ صرف اپنی شاندار روایات پر قایم ہے بلکہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ مضامین سب مفید اور دلچسپ ہیں اور تصاویر کا انتخاب نہایت اچھا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔"

خاکسار محمد سعید

حضرت یاس یگانہ چنگیزی لکھنوی نے تصاویر اور نظموں میں سے اپنے انتخاب کے دو نمونوں کی نسبت چند پُرجوش الفاظ میں اظہارِ خیال فرمایا ہے۔

مائی ڈیئر منصور صاحب۔ السلام علیکم

سالنامہ پہنچا، اچھا نکلا۔ مبارک باد۔ کرشن لیلا کے عنوان سے جو تصویر نظر آ رہی ہے شاید جنت کی زندگی کا مرقع ہے۔ بانسری والے کا حُسن اور اُس کی بانسری قیامت ڈھا رہی ہے معلوم ہوتا ہے سامعین کی روحیں عرشِ اعظم کو پہنچ گئی ہیں شعر سننے کو تو میں ترس گیا ہوں۔ مگر یہ دفیضِ فراق کے ترانہ عشق میں حقیقی شاعری کے بعض نمونے دیکھ کر کچھ نہ کچھ ذوق ہو گئی۔ کیا خوب فرمایا ہے ؎

جلوۂ گل بلبل کو بہت ہے۔ شیخ کو گریۂ شام
یارِ بہاری گل کو بہت ہے۔ مجھ کو تیرا نام (جل جلالہ)

گل کو یارِ بہاری اور مجھ کو تیرا نام۔ ان دو اجدانی لطافتوں کا کیا کہنا!

شاخ پہ شعلۂ گل کی لپک ہو۔ چرخ پہ انجم و ماہ
دنیا پہ سورج کی چمک ہو۔ مجھ پہ تیری نگاہ

(اللہ بس باقی ہوس)

مجھ پہ تیری نگاہ انگیہ ہر کس بقدرِ ہمت اوست (جواک اللہ۔

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی"

جولو اور مور

مور نے آسمانوں کی ملکہ جونو سے کہا۔

"اے دیوی، میں حق بجانب ہوں گا
اگر میں اولمپین قوانین پر اعتراض کروں۔
جو آواز تم نے مجھے دی ہے، ساری فطرت کو بیزار کر دیتی ہے؛
حالانکہ بلبل، جو ایک چھوٹا سا پرندہ ہے
اور جس کی دُم بھی ناقابلِ ذکر سی ہے
اپنے گلے میں سے ایسے نور بھرے نغمے نکالتا ہے
کہ بہار جاگ اٹھتی ہے۔
بہار کی رنگینیوں میں اس کا نغمہ سب سے دلکش لگ ہے"

ملکہ خفا ہو گئی۔ اُس نے ملامت آمیز لہجے میں کہا

"حاسد پرندے، خاموش!
کیا تجھے ایک نغمے پر کڑھنا زیبا ہے ــــ
تجھے، جس کی معزور گردن میں
ریشمی توس قزح کے سیکڑوں رنگ موجود ہیں
جو میرے باغ کی روشوں پر محوِ خرام رہتا ہے
اور اپنے پُرشوکت پروں کی نمائش سے
جن میں گویا دنیا بھر کے ہیرے جواہرات جڑے ہیں
فضا میں ایک آگ سی لگائے رکھتا ہے؛
کیا آسمان کی چھت کے نیچے کوئی اور پرندہ بھی ہے
جسے تجھ سے زیادہ حسن عطا کیا گیا ہو؛
ہم نے مختلف چیزیں مختلف مخلوق کو دے رکھی ہیں
سب کو سبھی کیسے مل سکتی تھیں؛
بعض پرندے قوت کے لئے مشہور ہیں بعض قد کے لئے،
شاہیں کو تیزی دی، شترمرغ لمبائی،
باز بہادر ہے اور کوا سمجھ دار،
ہر ایک اپنے اپنے حال میں خوش ہے۔
خاموش اسے ناشکر گزار ورنہ دیوتاؤں کی قسم
میں تیری یہ دُم کاٹ لوں گی!

(لافانتین)

منصور احمد

آئینہ عالم

مصنفینِ روس اور مسائلِ ادب

سوویٹ مصنفین کی ایک کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے آے۔ این ٹالسٹائی نے کہا:-

ہماری زندگی اور ہمارا ملک تمام مظلوموں اور محروموں کا مرکزِ توجہ ہے۔ یہ طبقہ نوعِ انسان کا بہت بڑا طبقہ ہے اور یہ طبقہ اُن سنگریزوں کی طرح تعداد میں بڑھتا جاتا ہے جو ایک گرتی ہوئی عمارت میں سے ٹوٹ ٹوٹ کر پھیلتے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں جاننا چاہتے ہیں۔ ہم کون ہیں۔ ہماری اخلاقیات کیا ہیں۔ ہم کس طرح رہتے سہتے ہیں کس طرح کام کرتے ہیں اور ہماری تفریحات کیا ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو کیسی تعلیم دیتے ہیں اور عورتوں سے ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ ہم یعنی سوویٹ یونین کے باشندے اہلِ مغرب کے نزدیک ایک نیم حقیقی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ہم ایسے حالات اور ایسی زندگی کی تخلیق کر رہے ہیں جو ان کے لئے محض خواب ہے۔ اگرچہ وہ لوگ خواب میں بھی ایسے خیالات سے ڈرا کرتے ہیں۔

فیقو۔ لوگ ہمیں جاننا چاہتے ہیں۔ ہم خود بھی اپنے آپ کو جاننا چاہتے ہیں کیونکہ ہم جوان ہیں اور جوانی میں غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم اپنے آپ کو جاننا چاہتے ہیں اور ہم سے زیادہ ساری دنیا ہم کو جاننا چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ ہم میں جرأت، قوتِ ارادہ، عقل و دانش، قابلیت، جوش اور رجائیت کے مثالی ہیں۔ سیاحت کے دوران میں بیسیوں ہی مرتبہ میں نے رشک کی نگاہ سے اپنے اوپر تُھتے دیکھی ہیں۔ اور کتنی ہی مرتبہ میں نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: "آہ تم کتنے خوش قسمت ہو!"

کیا غیر ملکوں کے یہ لوگ ہمیں جانتے ہیں؟ نہیں! وہ ہمیں نہیں جانتے۔ جب وہ ہم سے ملتے ہیں تو اس قسم کے سوالات کرتے ہیں:-

"یہ تو بتائیے، کیا یہ سچ ہے کہ روس میں تمام عورتیں ایک ہی قسم کی پوشاک پہنتی ہیں؟ کیونکہ وہاں مساوات ہے۔" یا

"کیا روس میں بیئر بھی بنتی ہے؟"

ہم جواب دیتے ہیں "ہاں، روس میں بیئر بنتی ہے۔"

وہ کہتے ہیں۔ "لیکن بیئر وہاں کون پی سکتا ہوگا۔ صرف زارِ اے سکوت پیتے ہوں گے۔"

فیقو۔ وہ ہماری نسبت بہت کم جانتے ہیں۔ اس کم علمی میں اضافہ اُن فنسطائی اخبارات کی دروغ بافیوں سے ہوتا ہے جنھیں حکومت کی طرف سے رشوتیں ملتی ہیں۔ ہمارے متعلق اس لاعلمی سے فاسیت فائدہ اٹھاتی ہے۔ فاسیت چاہتی ہی یہ ہے۔ ہمارے متعلق لاعلمی کے عمیق سمندر میں سے اسے کافی شکار ہاتھ آجاتا ہے۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمیں ادب میں کیا کچھ کرنا ہے۔ جیسے کہ دستورِ آزادی کا مقدار انقلاب کا راستہ نکالتا اور بناتا ہے۔ بالکل اسی طرح سوویٹ ادب میں ایسے ناول، تمثیلیں اور نظمیں لکھی جانی چاہئیں جو ہمارے ملک کے چہرے سے نقاب اٹھادیں اور اس چہرے کی روشنی زندگی اور جوانی کی ایک ایسی پُرآب و رنگ تصویر پیش کریں کہ دنیا کی آنکھیں اس کو دیکھ کر ماند پڑ جائیں۔ جو جائیں اور فنسطائیوں کے جھوٹ اس کو دیکھ کر ماند پڑ جائیں۔

لیکن ابھی تک ہم اس منزلِ مقصود کی طرف کیوں نہیں بڑھے؟ اوّل سبب یہ کہ ہمارے ادبا اور شعرا کو اپنے آرٹ کی خصوصیات کو از سرِ نو تعمیر کرنا تھا۔ ہمارا انقلاب سے پہلے کا ادب۔ اہلِ مغرب کی طرح جماعتی امتیازات کی بنا پر تعمیر ہوا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک ایسا ادب تھا جو قدیم نظام کی مخالفت پر مشتمل تھا اس میں منفی سے دلالت کی گئی تھی؟ اس میں یا تو ہیرو کا فقدان تھا یا ایک ایسا

شخص پیش کیا گیا تھا جسے معاشرتی اور سیاسی نظام نے مصائب میں مبتلا کر رکھا ہو۔

ہم مستقبل قریب کی ایک ایسی سوسائٹی کا ادب تعمیر کر رہے ہیں جس میں ادنیٰ و اعلیٰ طبقے کا امتیاز مفقود ہوگا۔ ہم ایک شبہ ہیرو کے اقسام کی تشکیل کر رہے ہیں۔ ہم اس آرٹ کے سرچشموں کو کھود رہے ہیں جسے زمانے نے بھلا دیا ہے۔ اور جو ہزارہا سال کے کوڑے کرکٹ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ ایک قومی آرٹ، آفتاب اور زندگی کی نظم۔

ناول اور ڈراما کے فن پر قدرت حاصل کرنے کے لئے ایک طباع آدمی کو وقت درکار ہے۔ طباع آدمیوں کو وقت دو۔ اگر کوئی صاحب قلم کچھ عرصہ کے لئے خاموش ہو گیا ہے تو اس سے لکھوانے کے لئے جلدی نہ کرو۔ اسے اطمینان سے مطالعہ کرنے دو۔ اس دوران میں کوئی اور مصنف کچھ لکھ دے گا۔ ہمارا ادب نسبتہً بلند پایہ ہوگا بلکہ دنیا میں بہترین ہوگا۔ ہمارا دستور اس کی ضمانت ہے۔ صرف جلد بازی سے احتراز لازمی ہے۔ مصنفین کو موقع دو کہ وہ اپنی فن کارانہ ہستی کی تکمیل کر لیں۔ میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ ہمارے رسالے اس ذہنی اور فن کارانہ جہد و کوشش کا مرکز بن جائیں جو تخیل کے نئے محلات تعمیر کرنے والی ہے۔

یہ باتیں میں کسی قدر بعد از وقت کہہ رہا ہوں کیونکہ یہ کام پہلے ہی سے ہو رہا ہے۔ میں صرف اپنے لاکھوں قارئین کی بے تابی کو ایسی اعلیٰ پایہ کی انجمنوں تک پہنچانا چاہتا ہوں جیسی مثلاً "جمعیت مصنفین" ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اہل قلم کی روزمرہ زندگی کا خیال رکھا جائے اور یہ ہو رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے ادب کی خاطر اپنے تخلیقی حالات و رجحانات کو منظم کریں۔ رسالوں میں نئی روح پھونکیں۔ قارئین کی کانفرنسیں بلائیں۔ ان کی آراء کی طرف توجہ دیں۔ لائبریریاں کھولیں اور اسی قسم کے دوسرے کام کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اب ہمیں اس کو ایک بڑے پیمانے پر شروع کرنا چاہئے۔ ایک ایسے پیمانے پر جو ہماری زندگی کے معیار اور وسعت سے نیچے نہ رہ جائے۔

رفیقو۔ سوویت ادب بہت کام کر چکا ہے۔ مگر ہم اس سرعت سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ اس کے متعلق سوچنے کا ہمارے پاس وقت نہیں۔ سوویت ادب کو اب ایسے عظیم اور مشکل کام درپیش ہیں جن کا پہلے کاموں سے کچھ مقابلہ ہی نہیں۔ پڑھنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اور تمام دنیا میں اس ادب کو پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کیا ہم اہل قلم اس کام کو سرانجام کر سکیں گے۔ نہ صرف ہم سے سرانجام کریں گے بلکہ ہم اور آگے بڑھیں گے اس سے زیادہ سرعت کے ساتھ جتنا کوئی خیال کرے اور تخلیقی سرگرمیوں کے جدید ترین اور نامعلوم اطراف میں ہم اہل قلم اپنے عظیم الشان ملک کے روح رواں ہیں۔ ہم پر اعتراض و تنقید بری نہیں لیکن اس سے بہتر یہ ہے کہ ہم پر اعتماد کیا جائے۔

دُنیا کے سامانِ حرب میں اضافہ

جرمن محکمۂ تفتیش کی ایک رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ گزشتہ چند سال میں سامانِ حرب میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء کی بہ نسبت گزشتہ سال دنیا نے اپنی فوجی قوتوں کے استحکام کے لئے تخمیناً روپیہ خرچ کیا۔ شمار و اعداد یہ ہیں:-

۱۹۳۳ء	۸۳۳۰۰۰۰۰۰	پونڈ
۱۹۳۶ء	۱۲۵۰۰۰۰۰۰۰	پونڈ
۱۹۳۷ء	۲۵۰۰۰۰۰۰۰۰	پونڈ سے
	۲۹۰۰۰۰۰۰۰	پونڈ تک۔

سوویت روس اور جاپان دو ایسے ملک ہیں جن کے سامانِ حرب میں گزشتہ آٹھ سال کے اندر سب سے زیادہ اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان جاپان کے مصارف سو فیصدی بڑھ گئے اور روس کے سولہ گنا ہو گئے۔

برطانیہ کا اضافہ ۳۹ فی صدی۔ ریاست ہائے متحدہ کا ۳۸ فی صدی اور فرانس کا ۵۶ فی صدی دکھایا گیا ہے عجیب یہ ہے کہ جرمنی نے اپنے متعلق کوئی شمار و اعداد درج نہیں کئے اور کہا ہے کہ فرانس کو مقابلے کے طور پر لیتے ہوئے ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان جرمنی نے بھی اپنے مصارف حرب میں ۱۶۵۰۰۰۰۰۰ پونڈ کا اضافہ کیا ہوتا اگر اس پر معاہدۂ ورسیلز کی پابندیاں عائد نہ ہوتیں۔

قیامِ امن کے لئے زبانیں سیکھو

"محاسن و معائب کے لحاظ سے تمام دنیا کے لوگ ایک جیسے ہیں اور اس دنیا میں نفرت اور حسد کو الگ رکھتے ہوئے ہر ایک کے لئے جگہ موجود ہے"

مندرجہ بالا خیالات کا اظہار مادام کٹی وائیلوزیں نے ڈبلن ورکنگ کلب میں بین الاقوامی روداری پر تقریر کرتے ہوئے کیا۔ اس کے بعد انھوں نے قوموں میں ایک دوسری کے لئے خیر اندیشی کا جذبہ پیدا کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ مختلف زبانیں سیکھنے کی طرف توجہ کی جائے۔

انھوں نے کہا کہ یورپ اور امریکہ میں جنگ اور امن کے متعلق عذر بحث کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ امن پسند بننے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ غیر زبانیں

سیکھی جائیں کیونکہ اس سے قوموں اور ملتوں سے بچی پیدا ہوتی ہے اور بچی پیدا ہوگی تو یہ معلوم ہوگا کہ تمام دنیا کے لوگ محاسن اور معائب کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں اور نفرت اور حسد سے قطع نظر ہر ایک کے لئے یہاں جگہ موجود ہے۔

سیاسیات سے زیادہ تر مردوں کا تعلق ہے۔ اور وہی اس کے بنانے والے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عورتوں کو سیاسیات میں دخل نہ دینا چاہئے اور بچوں کو پالنے اور گھروں کی دیکھ بھال کی طرف توجہ کرنی چاہئے لیکن ایک عورت کی حیثیت سے میں کہتی ہوں کہ پھر دنیا کے امن کی ذمہ داری بھی مردوں کو لینی چاہئے کیونکہ صرف ایک محفوظ اور پُرامن ملک ہی میں عورتیں صحت مند اور سرور بچے پیدا کر سکتی ہیں۔

دنیا کتنی حسین ہے جتنی جلد گزر جاتی ہے اور اس میں جتنی کثرت سے مختلف چیزیں موجود ہیں کہ وہ نہ کچھ سیکھ سکتی ہیں۔ نہ جان سکتی ہیں۔ نہ دیکھ سکتی ہیں کیونکہ ان کی روزمرہ کی زندگی اور واقعاتِ عالم کی موجودہ کیفیت ان کی توجہ کو ان حسین چیزوں سے ہٹا کر اپنی طرف پھیرے رکھتی ہے۔

نہ ٹھوس نہ مائع نہ گیس

حال ہی کے ایک لیکچر میں مشہور حکیم سر جیمز جینز نے مادے کی ایک چوتھی حالت کا انکشاف کیا جو نہ ٹھوس ہے نہ مائع نہ گیس اور جو کائنات کے تمام مادے میں ننانوے فی صدی موجود ہے۔ یہ چوتھی حالت "کسی معمل میں تیار نہیں کی جا سکتی۔ اور اس کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس اس کی کچھ مقدار ہو اور آپ اس میں اور اضافہ کریں تو یہ بڑھنے کی بجائے کم ہو جائیگی ایک اور بات یہ ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار کا بھی کوئی معجم نہیں ہوتا۔

آرتھر برزبین

آرتھر برزبین امریکہ کا ایک مشہور اخبار نویس تھا۔ گزشتہ کرسمس کی صبح کو وہ اپنے بستر میں مردہ پایا گیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر بہتر برس کی تھی۔ دنیا کے اخبار نویسوں میں اس کے مضامین سب سے زیادہ پڑھے جاتے تھے اور سب سے زیادہ قیمت پاتے تھے۔

سالہا سال تک اسے ہرسٹ پریس سے پچاس ہزار پونڈ سالانہ تنخواہ ملتی رہی اور پچیس ہزار پونڈ دوسرے پرچوں اور رسالوں سے مضامین نویسی کا معاوضہ ملتا رہا۔

اس کا روزانہ کالم "آج" ریاست ہائے متحدہ کے درسو سے زیادہ پرچوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ہفتہ وار کالم تقریباً بارہ سو ہفتہ وار پرچوں میں چھپتا تھا۔

اس کے مضامین نہایت آسان انداز میں ناظرین کے ذہنی میلانات کو ملحوظ رکھ کر لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ سوئنطائی نقادوں کا تنخواہ سے بالکل متاثر نہ کرتا تھا۔ کیونکہ وہ جو کچھ لکھتا تھا۔ ان کے لئے نہ لکھتا تھا۔

اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اس کے دماغ نے خوب جلا پائی تھی۔ فرانسیسی اور جرمن زبان روانی کے ساتھ بول سکتا تھا۔ وہ اہم واقعات افراد اور تحریکات کو عوام تک پہنچانے کے لئے ایسی زبان لکھتا تھا جسے وہ آسانی سے سمجھتے تھے۔

جذبات پر قابو پیدا کرو

مشہور حکیم پروفیسر جولین ہکسلے کہتا ہے:۔ "دنیا مصیبت اور آفت کے اس گڑھے میں کیوں گری جس میں ہم اس وقت اپنے آپ کو پاتے ہیں۔ اس کی وجوہ خواہ کچھ ہی ہوں ان کا تعلق بہت کم یا بالکل اُس بے اختیاری سے نہیں جو انسان کو فطرت کے معاملے میں درپیش ہے بلکہ اس تمام مشکل کی وجہ خود ہمارا اپنی فطرت پر اور ہمارے اپنے معاشرتی اور اقتصادی نظاموں پر قابو نہ ہونا ہے ہمیں یہ بات قعرِ مذلت میں گرائے ہوئے نہیں ہے کہ ہم اپنے علم کیمیا اور علم برق سے طوفانوں اور جھکڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے جذبات پر قابو نہیں ہے۔ ہم اپنی حرص اور نفرت۔ امیری غریبی اور قومی دلی احساس، سیاسی و اقتصادی امور جن کا تعلق ہماری معاشرتی عصوبتوں سے ہوتا ہے اور اقتصادی ملیت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

گداگری کے دورخ

سمرنا کی پولیس نے گداگروں کی ایک کمپنی کا سراغ لگایا ہے جس کے سترہ ارکان تھے۔ جو لنگڑے لولے بن کر اور خود اپنے آپ کو زخموں میں مبتلا

کر کے خیرات حاصل کرتے تھے۔

ایک انگریز محاسب کی تحویل میں اس کمپنی کے حساب کتاب کی باضابطہ کتابیں تھیں جو کمپنی کے مالی معاملات سرانجام دیتا تھا۔ پولیس کہتی ہے کہ یہ گداگر اس کمپنی سے تقریباً ساڑھے تین ہزار پونڈ سالانہ منافع حاصل کرتے تھے۔

اس کے برعکس مسز گریس ہلیارڈ جو ایک امریکن ماہرِ تعلیم ہیں لکھتی ہیں "ہم نے روس میں ایک بھی سست آدمی نہیں دیکھا لیکن ہم نے پانچ چھ بڑھیا فقیرنیاں دیکھیں تو ان کے متعلق دریافت کرنے پر ہم سے درخواست کی گئی کہ "براہِ مہربانی ان کو کچھ نہ دیجئے گا۔ یہ بڑھیاں ننگِ قوم ہیں۔ انھوں نے تمام عمر گداگری کی ہے۔ اور اب تھوڑا سا کام کر کے اپنی روزی حاصل کرنا انھیں دردِ سر معلوم ہوتا ہے۔ ان کو ہر چیز مہیا کر دی جاتی ہے۔" القصہ یہ بات ہے جو میں نے روس میں محسوس کی جہاں ہم ایک نئی زندگی۔ ایک نئی امید سر دل میں موج زن پاتے ہیں۔ مشکلات جو ایک ایسے عظیم الشان تجربے میں پیش آنی لابدی ہیں ہم ہر ایک کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ معاشرتی آمیزش سے ایک نئی دنیا وہاں پیدا ہو رہی ہے جس کی بنیاد قوم کے ایک گروہِ عظیم کے مصائب اور قربانیوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ ایک دیکھنے کے لائق اور یاد رکھنے کے قابل منظر ہے۔

کیا ۲۰۳۹ء میں ہر شخص پاگل ہو جائیگا؟

ڈاکٹر فرانسس ہارڈنگ نے جو ایک مشہور رجاقون ڈاکٹر ہیں کوٹا کلب سڈنی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اگر موجودہ رفتار سے دیوانگی بڑھتی گئی تو ۲۰۳۹ء تک ہر مرد، عورت اور بچہ پاگل نظر آئے گا۔

گزشتہ دس سال کے دوران میں دیوانوں میں تیس فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ پریشانی اور جنگ اس کا باعث تھے۔ اگر شرحِ دیوانگی یہی ہے تو آخر کار ہم سب اپنے حواس کھو بیٹھیں گے۔ ہمیں پریشان تو نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی اس وقت موجود نہ ہوگا۔ لیکن یہ صورتِ حالات صحیح دماغی میلانات کا تقاضا ضرور کرتی ہے۔"

انھیں وجوہ کی بنا پر انھوں نے عورتوں کو اپنے سامانِ آرائش مثلاً غازوں وغیرہ کے معاملے میں نہایت محتاط ہونے کی تاکید کی۔ ان کو اپنے لباس کے متعلق عقل و ہوش سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اور اونچی ایڑی والے جوتے پہننے سے منع کیا جو صحت کے لئے مضر ہیں۔

ترکی لڑکیوں کی فوجی تربیت

اگر آئندہ جنگ میں ترکی کو بھی شامل ہونا پڑا تو اس ملک کی عورتیں اس جنگ میں ایک نمایاں حصہ لیں گی۔

ترکی کی وزارتِ تعلیم نے احکام جاری کئے ہیں کہ مدارس میں لڑکیوں کو لازمی طور پر فوجی تعلیم دی جائے۔ نصاب میں آتشیں اسلحہ کا استعمال اور فوجی ورزشیں شامل کر دی گئی ہیں۔ لڑکیوں کو گھوڑے کی سواری اور موٹر چلانی بھی سیکھنی پڑے گی۔ یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ اگر کوئی لڑکی ان مشاقی میں سے کسی ایک میں کچھ نہ کچھ قابلیت نہ دکھائے تو اسے پاس نہ کیا جائے۔ بعض مدارس میں ہوابازی کے لئے بھی طالبات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

سعدی فکرِ شعر میں

یہ دلکش تصویر پنجاب کے نوجوان اور ہونہار مصور جوگندر ناتھ سینی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ سینی ایک سرگرم صناع ہیں۔ انہوں نے تھوڑے سے عرصے میں بہت سا کام کیا ہے، اور خاصی ترقی کی ہے۔ گزشتہ ماہ انہوں نے ازراہِ نوازش اپنی چند تصویریں مرحمت فرمائی تھیں جن میں سے ایک اس ماہ شائع ہو رہی ہے۔ اس تصویر میں انہوں نے شیراز کے حکمت نواز شاعر کو ایک ایسی کیفیت میں پیش کیا ہے جب اس کا طائرِ تخیل ایک شعر کے لئے مضمون کی تلاش میں آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ آئندہ بھی "ادبی دنیا" کو اپنی تصویروں سے مزین فرماتے رہیں گے۔

منصور احمد

عہدِ رفتہ

مری غزل میں فسانہ ہے عہدِ رفتہ کا
نوائے شوق ترانہ ہے عہدِ رفتہ کا

مرے سخن کو دیا اس نے سوز و سازِ دوام!
عجیب چیز بہانہ ہے عہدِ رفتہ کا

دکھا رہا ہے تجھے جلوہ ہائے دور و دراز!
تصور آئینہ خانہ ہے عہدِ رفتہ کا

نہ ذکرِ حال کا سودا، نہ فکرِ مستقبل!
زباں پہ سب کی فسانہ ہے عہدِ رفتہ کا

حکایتیں ہیں دلآویز و دل نشیں اس کی!
فریب خوردہ زمانہ ہے عہدِ رفتہ کا

حدیثِ رنج و الم، داستانِ عیش و طرب!
ہر ایک نقش یگانہ ہے عہدِ رفتہ کا

حفیظ دل نہ نظر ڈال یادِ ماضی میں!
نہاں اسی میں خزانہ ہے عہدِ رفتہ کا

حفیظ ہوشیارپوری ایم اے

دوسری بیوی

جاڑوں کی ایک برفانی صبح تھی، رات سے سفید برف سڑکوں مکانوں اور درختوں پر روئی کی طرح ہلکے ہلکے گالوں کی تہ جما رہی تھی۔ سڑی کایہ عالم تھا کہ ساری فضا منجمد ہوئی جاتی تھی۔ آئرین اپنے کمرے میں کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھوں کے سہارے جھکی ہوئی سنسان گلی کی جانب نظر جمائے کھڑی تھی۔ باہر کی طرف شیشے پر برف کے گالے پھسل پھسل کر چوکھٹ پر جمتے جاتے تھے۔ آئرین نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں کے اندر آنسو کے قطرے بھی منجمد ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ اس وقت جذبات کے ایک بے پایاں سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس کی شادی کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھی۔ ہنری اس کا نوجوان شوہر اس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ ہنری کی پہلی بیوی روزا نے طلاق حاصل کر لی تھی کیونکہ دونوں کے درمیان تعلقات نہایت بے کیف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آئرین کے بہی خواہوں نے ہنری کی شریک زندگی بننے میں اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ لیکن اس کو ہنری کی محبت پر پورا اعتماد تھا اور دونوں کی ازدواجی زندگی کے ابتدائی ایام بھی نہایت خوش گوار ثابت ہوئے۔ لیکن بہت جلد آئرین نے محسوس کر لیا کہ روزا ایک ناسعلوم طریقے پر اس کے عیش کو منغص کر رہی ہے۔ اس احساس نے اسے نہایت فکر و تردد میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آج وہ بہت مضطرب تھی۔ اس کے دل میں بیسیوں قسم کے جذبات موج زن تھے۔ وہ سوچتے سوچتے یک لخت کھڑی ہو گئی۔ پھر کچھ سوچ کر لکھنے کی ایک میز کی طرف بڑھی جو دیوار کے سہارے لگی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس میز کی دراز سے اس نے ایک کتاب نکالی جس کی جلد طلائی تھی اور بند لیٹنی فیتہ کے تھے۔ یہ اس کا روزنامچہ تھا۔ اس کے اندر اس نے اپنی شادی کے روز سے لے کر آج تک کے تاثرات قلمبند کیے تھے۔ اس طلائی جلد کے اندر اس نے اپنی آتش حسد کے لئے بہت سا ہیزم مہیا کر رکھا تھا۔ پہلے تو وہ بند علیحدہ کر کے غیر ارادی طور پر ورق الٹ پلٹ کرتی رہی۔ آخر چند منٹوں کے بعد ایک یادداشت جو اس نے شادی کے بعد ہی قلم بند کی تھی اس کی تمام توجہ کو مرکوز کر لینے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے پڑھنا شروع کیا۔

"۱۶۔ اپریل ۱۹۳۰ء۔ میں بے حد خوش ہوں کہ میری سہیلیوں کی توقع کے خلاف میری زندگی کا آغاز مسرتوں کے ساتھ ہوا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ روزا ہنری کے مزاج کو پہچان نہ سکی۔ ورنہ علیحدگی غیر ممکن تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس معاملے میں غلطی نہیں کی۔ میں اس کے مزاج اور عادات سے بخوبی واقف ہو گئی ہوں اور کبھی اس کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دوں گی۔

"میں نہیں جانتی کہ ہنری کو روزا اور اس کی ننھی بچی کی یاد اب بھی آتی ہے یا نہیں، آج وہ ایک ننھی سی بچی کو گود میں لے کر پیار کر رہا تھا میں اپنے پیارے ہنری کے دل کو اپنی محبت سے اس قدر معمور کر دوں گی کہ اس میں کسی غیر کے لئے گنجائش ہی نہ رہے گی۔

"میں اس خیال سے بہت مسرور ہوں کہ آج سے قبل ہنری یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ پہلی شادی کے بعد اس نے "ماہِ عسل" کا روال میں گزارا تھا۔ دنیا کی کوئی چیز بھی مجھے وہاں جانے کی ترغیب نہیں دے سکتی اگر خدانخواستہ مجھے وہاں جانا پڑا تو پھر قدم قدم پر روزا سے مڈبھیڑ ہو جانے کا اندیشہ لگا رہے گا۔ دنیا ہم دونوں کے لئے بہت زیادہ وسیع ہے۔

"ہنری آج کی ڈاک لے کر آیا ہے۔ آج وہ کتنا حسین ہے میں نہیں سمجھ سکتی کہ کوئی عورت اس کی بیوی بن کر کیوں کر ناخوش رہ سکتی ہے ایسی عورت خود قابلِ الزام ہے۔

"ہنری کے یہاں آجانے سے قبل مجھے یہ یادداشت لکھنا ختم کر دینا چاہئے۔ وہ میرے روزنامچے کو "دفترِ خواب" کہہ کر ہنستا ہے۔ میرے پیارے رفیقِ زندگی تمھیں کیا معلوم کہ میرے کتنے سارے خواب سچ ثابت

ہوئے ہیں۔"

آئرین نے آہستہ آہستہ ورقوں کو اُلٹنا شروع کیا۔ ان کے اندر اس نے اپنی رنج و خوشی کی گھڑیوں کا رنج کھینچا تھا بعض یادداشتوں کو جو حال ہی میں قلمبند کی گئی تھیں اس نے بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔

"دوشنبہ ۱۹ر جولائی۔ آج کی رات ہنری لکھنے کی میز پر ایک گھنٹہ کام کرتا رہا۔ میرے اس سوال پر کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ چند ضروری خط لکھنے ہیں۔ کھانے کے وقت میں نے اندازہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے لیکن جب میں نے سبب دریافت کیا تو اس نے مسکرا کر گرمی کی شکایت کی۔ اس وقت وہ اپنا خط ڈاک میں چھوڑنے گیا ہے۔ ہاں خطوں کے ساتھ ایک پیکٹ بھی تھا۔ اُف۔ اب مجھے یاد آیا کل رَوزا کی بچی کی سال گرہ کا دن ہے۔ پانچ برس کی ننھی بچی ہے خوب ہوا کہ وہ پیکٹ نہیں بھولا۔ لیکن آخر یہ پیکٹ میری یاد سے محو کیوں نہیں ہوتا۔ ہنری نے اس بچی کو خط بھی لکھا ہوگا۔ اور یقین ہے کہ اس خط کا جواب اس کی ماں لکھے گی۔ پانچ برس کی بچی بھلا خود کیا لکھ سکتی ہے۔

"اب مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ اس عورت کو جس نے ہنری ایسے مرد سے شادی کی ہو۔ چند قربانیاں کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے میں خوب سمجھتی ہوں کہ اس میں نہ ہنری کا تصور ہے اور نہ اس کی پہلی بیوی کا۔ لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں کہ یہ حسد سے باز نہیں آتا۔ میں اُن گزشتہ ایام سے جن کی ساعتیں دونوں کی یک جائی میں گزری ہیں رشک کئے بغیر نہیں رہ سکتی جس وقت ہنری مجھے اپنی آغوش میں لے کر میرے لبوں پر مہرِ محبت ثبت کرتا ہے تو میں اس خیال سے کانپ اُٹھتی ہوں کہ وہ رَوزا سے بھی اسی طرح اظہارِ محبت کرتا ہوگا۔ ہاں اسی رَوزا سے جو میری مانند اس کی شریکِ زندگی رہ چکی ہے۔ یہ خیال نہایت ناگوار ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہوتی ہے۔ بلکہ خود اپنے آپ سے نفرت ہوتی ہے کہ میں نے ایسے لغو خیالات کو اپنے دل میں جگہ دی۔ لیکن میں معذور ہوں۔ آہ! بالکل معذور۔ ہنری۔ پیارے ہنری مجھے بتاؤ کہ میں تمہارے لئے کیا چیز بن جاؤں جو رَوزا نہ بن سکی۔ للہ میری اس جستجو میں مدد کرو۔ میں تم سے بے حد الفت رکھتی ہوں۔"

"پنجشنبہ ۲۲ر جولائی۔ آج کی ڈاک میں رَوزا کا خط بھی دکھائی دیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اسی کا خط ہوگا۔ اگرچہ میں نے اس کی طرزِ تحریر نہیں دیکھی ہے۔ بڑے بڑے اور صاف حروف لفافے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے۔ سوسن ڈاک لائی تھی۔ ہم دونوں اُس وقت ناشتے کی میز پر تھے۔ میں نے اپنے خطوط چھانٹ کر باقی ہنری کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے بے پروائی سے سبز رنگ کا لفافہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ میں نے کچھ نہ پوچھا۔ اس نے بھی ایک پیالی کافی مانگنے کے سوا اور کوئی بات نہ کی۔ مجھے تعجب ہے کہ اسے یہ کیوں معلوم نہ ہو سکا کہ میرا کلیجہ اس وقت کتنی شدت کیساتھ دھڑک رہا تھا، نہیں، شاید اسے اس کا علم نہ ہو سکا۔ مرد بیوقوف طرح طرح کی مانند ہیں جو اپنا سر ریت کے اندر ڈال کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو دُنیا کی نظروں سے بالکل چھپا لیا ہے۔ لیکن مجھ ایسی لغو باتوں کو سوچ کر فکرمند نہ ہونا چاہئے۔ . . . . . .

"رَوزا نے اپنی بچی کی طرف سے تحفے کے شکریہ کا خط لکھا ہوگا۔ پر یہ تحفے کے بھیجنے اور شکریے کے خط کے آنے کا سلسلہ تو ہر سالگرہ کے موقع پر جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ ایک لازمی چیز بن جائے گا میری زندگی کا ایک حصہ جس کا خود مجھے بھی خوگر ہونا پڑے گا . . . . . کیا میرے لئے ایسی باتیں سوچنا مناسب ہے یا نہیں؟ میں جاننا نہیں چاہتی۔"

"یکشنبہ ۱۵۔ اگست۔ میں یہاں ایک گھنٹے سے بیٹھی ہوئی یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہی ہوں کہ عورت کو یہ بات کیوں ناپسند ہے کہ اس کا شوہر کسی غیر عورت سے چاہے وہ اس کی زنِ مطلقہ ہی کیوں نہ ہو۔ رسم و راہ پیدا کرے۔ ہمارے دلوں میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوتی ہے کہ شوہر پر صرف ہمارا قبضہ ہو۔ ہماری زندگی صرف اس شبہ ہی سے کہ وہ فلاں غیر عورت سے محبت کرتا ہے کیوں تلخ ہو جاتی ہے۔ نہ معلوم یہ ہمارے کمینہ نفس کی شرارت ہے۔ یا ہماری فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے؟ ڈاکٹر ریزن جو فطرتِ نسوانی کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ "عورت تعددِ ازدواج کو اس لئے ناپسند کرتی ہے کہ اس کی شفقتِ مادری کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ شوہر صرف اسی کے بچوں سے محبت رکھے اور اس محبت میں اس کی سوکنوں کی اولاد حصہ نہ بٹائے" اگرچہ خود عورتوں کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے لیکن سوکنوں سے حسد کرنے کا مادہ اسی جذبے کے ماتحت پیدا ہوتا ہے

. . . . . مگر ان لغو باتوں کو سوچ سوچ کر میں کیوں فکرمند ہوئی جاتی ہوں۔ سبز رنگ کے لفافوں کو دیکھ کر اتنے دنوں تک مضطرب رہنا اور ایسے لغو خیالات کو دل میں جگہ دینا نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔ ڈاکٹر کا نظریہ ہی غلط ہے یا خود میں ہر سر غلط ہوں۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی"

"روز شنبہ۔ ۱۶۔ اگست۔ آج میں نے اپنے حسد کا کفارہ ادا کیا ہے۔ ہنری کے پاس ایلین (روزا کی بچی) کی تصویر ہے۔ جسے وہ ہمیشہ اپنی میز کی دراز میں بند رکھتا ہے۔ شاید وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس تصویر کو دیکھ کر مجھے روحانی اذیت ہوگی، آج صبح میں نے وہ تصویر نکال کر چاندی کے چوکھٹے میں لگا دی۔ بھولی بھالی بڑی پیاری بچی ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ پتلے نازک ہونٹ۔ لیکن ہنری کی صورت سے بالکل الگ۔ اس تصویر کو میں نے لباس بدلنے کی میز پر رکھ دیا تھا ہنری کی نظر فوراً اس پر پڑ گئی اور میرے پاس آکر وہ بڑی محبت کے ساتھ میرے بالوں سے کھیلنے لگا۔

"آئرین تم نے خوب کیا" اس کی آواز جذبات سے معمور تھی۔ لیکن نہ معلوم یہ جذبات میرے متعلق تھے یا ایلین کے۔ مگر میں اس کی حرکت کو بہم طور پر مطمئن تھی۔ بڑے افسوس کی بات ہے"

"شنبہ ۲ ستمبر۔ . . . . دوسری بیوی بننا آسان نہیں ہے مرد شادی کے بعد چند باتوں کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ بعض امور کو ایک خاص طریقے پر انجام پذیر ہوتے دیکھ دیکھ کر اسی طریقے کا خوگر ہو جاتا ہے لیکن یہ ایک ناممکن بات ہے کہ دو افراد میں ہر طرح سے یکسانیت پائی جائے۔ میں اکثر محسوس کرتی ہوں کہ ہنری اپنے ذہن میں مقابلہ کیا کرتا ہے۔ گو میرے کہنے پر وہ یہ بات ماننے کو تیار نہ ہوگا۔ لیکن مجھے اس کا اچھی طرح یقین ہے کہ وہ بارہا یہ سوچا کرتا ہے کہ فلاں کام کو روزا اس طرح کیا کرتی تھی۔ یا اس طرح نہیں کیا کرتی تھی۔ یا فلاں امر کے متعلق اس کا ایسا خیال تھا۔ یہ احساس مجھے خوفناک طریقے پر متوحش کئے دیتا ہے، جب وہ مجھ سے کہتا ہے کہ "اسکاٹ کے ناول پڑھا کرو" یا یہ کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان کو صبح سویرے اٹھ کر تفریح کا کیا سامان مل سکتا ہے" تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ کسی دوسرے کے خیالات کا عکس ہے جن کو اس نے غیر معلوم طریقے پر اپنا بنا لیا ہے۔ میں ہرگز اسے یہ جتانا نہیں چاہتی کہ میں ان ساری باتوں سے آگاہ ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ تھوڑے عرصے میں یا تو وہ میری عادتوں سے مطابقت پیدا کرے گا یا میں ہی اس کے خیالات سے ہم آہنگ ہو جاؤں گی۔ شادی کے بعد کچھ دنوں تک اختلافِ خیال کا ہونا لازمی ہے۔ میں نے گرجا جانا ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ اس کی کچھ زیادہ پروا نہیں کرتا ہے۔ میں نے سبز رنگ کا ایک گون خریدا ہے۔ گو مجھے اس کا رنگ پسند نہیں ہے۔ لیکن اس لئے پہنتی ہوں کہ اس کی نظروں میں یہ مجھے بہت زیب دیتا ہے، میں نے اس کو حلوہ کا مزا پسند کرنا سکھایا ہے۔ آج صبح اس نے تھوڑا کھایا بھی تھا۔ آیندہ کے متعلق تو بہت کچھ امیدیں نظر آتی ہیں"

"دوشنبہ۔ ۱۲ ستمبر۔ آج پھر ہنری کے نام سبز رنگ کا لفافہ آیا ہے اس رنگ کے تمام لفافوں سے مجھے نفرت ہو گئی ہے، . . . . . میں اس وقت سنیما جانا چاہتی ہوں"

"۲۸ ستمبر۔ آج شام کو سارا مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزا اشیح پر ایک رقاصہ کی حیثیت سے ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ کہتی تھی کہ روزا میں بہت سی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے وہ اس پیشے میں یقیناً کامیاب ثابت ہوگی۔ مگر کچھ دنوں قبل لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جیمس سے جو یہاں کا ایک بڑا تاجر ہے ضرور بیاہ کر لے گی کیونکہ دونوں کے تعلقات نہایت گہرے ہو رہے ہیں۔ خدا کرے کہ پچھلی بات سچ ہو، میں کبھی اس خیال کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتی کہ وہ پھر ہنری کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھائے گی۔ اگر وہ جیمس سے شادی کر لے تو خوب ہو۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بہت دولتمند ہے لیکن اگر روزا نے رقاصہ کا پیشہ اختیار کیا اور اس میں کامیابی حاصل کر لی تو ہنری کو اس سے ملنے کا موقع برابر ملتا رہے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اس بیوی سے تغافل برتنے لگے جو اپنے لمحاتِ فکر و تردد میں اپنے تبسم سے اس کو خوش کرنا چاہتی ہے۔ جو صبح سویرے اٹھ کر اس کی چائے تیار کرتی ہے اور اس کی پسند کے مطابق شوربا بناتی ہے۔ اور بارش کے دنوں میں یہ یاد دلاتی ہے کہ آفس جاتے وقت وہ اپنی برساتی ساتھ رکھ لے۔ اس نے کچھ دن پہلے یہ شکایت کی تھی کہ روزا فرائض خانہ داری سے بے پروائی کرتی تھی۔ ہاں اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں تم سے اس لئے محبت کرتا ہوں کہ تم صحیح معنوں میں ایک عورت کہی جا سکتی ہو۔ ایسی عورت جس پر ایک مرد بھروسہ کر سکے میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس قسم کی قابلِ اعتماد بیوی بننا دانائی ہے یا نہیں۔ مجھے تو یہ خوف ہے کہ کہیں وہ مجھے اپنے اس موٹر کی طرح قابلِ اعتماد

نہ سمجھنے لگے جو اس کی روزانہ تگ و دو میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن جس سے وہ اسی قدر اکتا گیا ہے جتنا گزشتہ سال کے کیلنڈر سے۔

"میں نے یہ کیا بیہودہ بکواس لگائی ہے۔ بے شک ہنری مجھ سے محبت کرتا ہے اور مجھے یہ کبھی یقین نہیں ہو سکتا کہ ہنری کے دل میں روزا کے متعلق اب بھی اگلے سے جذباتِ الفت پیدا ہوتے ہیں۔ دھوبی آیا ہے ایسا نہ ہو کہ میں یہ بھول جاؤں کہ گزشتہ ہفتہ وہ ہنری کی قمیص نہیں لایا تھا۔

"۲۔ نومبر۔ آج صبح میں نے خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا ہے یہ خوش ہونے کی بات ہے لیکن اس وقت میرا دل بہت رنجیدہ ہو رہا ہے اور شام بہت اُداس معلوم ہو رہی ہے۔ پر یہ میرا اپنا تصور ہے۔ میں نے کیوں آج سنما جانے پر اصرار کیا۔ ہم دونوں تماشہ دیکھنے گئے تھے۔ وہاں روزا اور ایلن بھی موجود تھیں۔ روزا الجس میں چند کارکنوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں چپ چاپ بیٹھی رہی لیکن یہ جانتی تھی کہ ہنری گھبرا سا گیا ہے اور اسے بھی معلوم تھا کہ میں نے اس کی حالت کا اندازہ کر لیا ہے۔ تماشے کا سارا مزا کرکرا ہو گیا۔ میں بہت شوق سے تماشہ دیکھنے گئی تھی لیکن وہاں عالم ہی کچھ اور نکلا۔ میری نگاہ بار بار اُس کی طرف اُٹھ جاتی تھی۔ اور میرا دماغ اس زندگی کی خیالی تصویر کھینچنے میں مشغول تھا جو اس نے ہنری کے ساتھ گزاری تھی۔ میں بے حد رنجیدہ تھی۔ ہنری نے مجھ سے صرف اتنا پوچھا۔ "دنیا کتنی تنگ ہے۔ ہے نا؟" میں چپ رہی اور کوئی جواب نہ دیسکی میں نے اس کو یہ دیکھنے کا موقع نہ دیا کہ اس وقت میری آنکھیں پُر آب ہو رہی تھیں حالانکہ رونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔"

"۹۔ دسمبر۔ ہنری منچسٹر گیا ہوا ہے۔ اس لئے میں آج دن بھر تنہا رہی۔ سارا چائے کے وقت مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس نے اخبار سے کٹا ہوا ایک ٹکڑا دکھا یا جس میں روزا کے متعلق تعریفیں چھپی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ ہفتہ اس نے اپنے فن میں بہت شہرت پیدا کی اور آج کل اس کی کمپنی منچسٹر میں ہے۔ میں خوب جانتی ہوں کہ ہنری کو ایک مقدمے کے سلسلے میں منچسٹر جانا پڑا ہے۔ اس سے قبل بھی وہ ایک دو مرتبہ جا چکا ہے۔ لہٰذا کسی قسم کے شبہے کو دل میں جگہ دینا بالکل نامناسب ہے لیکن میں معذور ہوں۔ سارا کے دریافت کرنے پر جب میں نے یہ بتایا کہ ہنری منچسٹر گیا ہوا ہے تو وہ معنی خیز طریقے پر مسکرائی اور بولی عجب اتفاق ہے، ہے نا؟" میں نے ہنری کی مجبوری کا حال بیان کیا۔ اس پر بھی وہ مسکراتی رہی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ اس کو رخصت ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ تب سے میں اب تک رو رہی ہوں میں بھی کس قدر بے وقوف ہوں۔"

"نصف شب۔ کاش ہنری یہاں موجود ہوتا۔ میں بالکل سو نہیں سکتی۔ کیونکہ ہنری کے ساتھ میری نیند بھی رخصت ہو چکی ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ آج کی رات ہنری مجھے چھوڑ دینے والا ہے تو میں نہیں کہہ سکتی کہ میں کیا کروں۔ شاید ہنری کے ساتھ روزا بھی آئے۔ لوگوں کی یہ سنتا ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی فضا میں جا بسیں جہاں انھیں دائمی خوشی میسر ہو سکے لیکن اس فضا میں پہنچنے کے بعد انھیں پتہ چلتا ہے کہ جس زندگی کو وہ چھوڑ آئے ہیں وہی زیادہ کامیاب تھی۔ اگر روزا پھر ہنری کی آغوشِ محبت میں آنا چاہے تو میری محبت ہرگز دونوں کی راہ میں حائل نہ ہوگی ..... مگر اس کا یقین کیسے آسکتا ہے؟"

"۱۰۔ دسمبر۔ میں اس وقت گزشتہ رات کی قلمبند کی ہوئی یادداشت پڑھ رہی ہوں اور پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں نہایت بیوقوف عورت ہوں۔ ہنری میرا دل و دادہ ہے اور مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ اس کے متعلق شکوک پیدا کر کے اپنی زندگی تلخ بنا لوں۔ یہ ہم دونوں ہی کے لئے مضرت رساں ہے۔ آئینہ دیکھنے سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں روزا سے کہیں زیادہ دلفریب ہوں اور پھر عمر میں بھی اس سے دس سال چھوٹی ہوں اور سن کا فرق بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آج میں بہت مسرور ہوں کیونکہ کھانے کے وقت ہنری یہاں پہنچ جائے گا۔"

"۱۱۔ دسمبر۔ گزشتہ رات جب ہنری منچسٹر سے واپس آیا تو وہ بُری طرح خستہ و پریشان ہو رہا تھا۔ سر میں شدید درد تھا اور بھوک تو مطلق نہ تھی میرا اہتمام سے پکایا ہوا کھانا برباد کیا۔ وہ بہت سویرے سو رہا اور میں دیر تک ایک معمولی سا رسالہ پڑھتی اور بہت سی باتیں سوچتی رہی۔"

"۱۵۔ دسمبر۔ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ ہنری نے تحفے میں مجھے ایک نہایت خوشنما بیش قیمت بروچ لا کر دیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ اتنے لغو خیالات اور شبہات کو دل میں جگہ دینے کے بعد بھی میں اس کے تحفوں کی مستحق ہوں یا نہیں۔"

"۳۔ مئی۔ موسمِ بہار کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہمسایہ کے مکانات صاف ہو رہے ہیں۔ میں بھی آج بہت خوش ہوں۔ کیونکہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ روزا کے متعلق لغو خیالات سے اپنے دل کو پاک و صاف کر لوں گی جس طرح

دنیا کی اور عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ مسرت کی زندگی گزارتی ہیں۔ میں بھی ویسی ہی مسرور زندگی بسر کروں گی۔ ہنری درحقیقت میرا شیدائی ہے ورنہ آج اس کی زبان سے ہرگز یہ بات نہ نکلتی کہ "کاش اللہ نے تمہیں بھی ایک بچہ عطا کیا ہوتا"۔ اگر عورت اپنے شوہر سے وفاشعاری کی امید رکھے تو وہ حق بجانب ہے لیکن اس کے عوض اسے بچوں کی نگہداشت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ سارا کہتی ہے کہ مجھے اولاد کی تمنا نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کا شوہر بھی اس کا ہم خیال ہو جائے تو پھر آسمان سر پر اٹھا لے گی مجھے بھی بچوں سے محبت کرنی چاہئے۔ روزا کی بھی ایک بچی ہے۔ میں جو اس سے حسد کرتی ہوں تو شاید اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ اب مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ گرم چائے، سامانِ آرائش اور ایک خوب صورت بلی گھر کی رونق کے لئے کافی نہیں ہے۔"

"۱۸۔ جون۔ آج شام کو ہنری بہت متفکر نظر آیا۔ مجھے اتنی جرأت نہ ہو سکی کہ وجہ دریافت کروں۔ فکرمند ہونے کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ شاید آئلین بیمار ہو۔ روپے پیسے کا کوئی معاملہ ہو۔ یا وہ کمپنی جس میں اس کی بیوی ملازم ہے تباہ ہو گئی ہو۔ کیونکہ چند مہینوں سے مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ہے لیکن میں نے اس کی بیوی کیوں لکھ دیا۔ ہنری کی بیوی تو میں ہوں۔ درحقیقت میں کبھی کبھی یہ سمجھنے لگتی ہوں کہ ہنری کی دو بیویاں ہیں۔ معلوم نہیں کہ ہم دونوں کب تلیں گی۔ قیامت سے قبل تو یہ خیال ناممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں میں گہری دوستی ہو سکتی ہے لیکن نہیں۔ میں اپنے آپ سے یہ امید نہیں کر سکتی۔ میں بہت تنگ دل واقع ہوئی ہوں اور میری تنگ دلی اُس وقت بڑھ جاتی ہے۔ جب ہنری معقول وجہ بتائے بغیر رات کو بہت دیر تک باہر رہتا ہے۔ کاش میں فلورنس کی طرح فراخ دل ہوتی۔ وہ کہتی ہے کہ میرا شوہر جہاں چاہے کتنی ہی بیویاں کیوں نہ کرے۔ مجھے اس وقت تک کوئی خوف پریشان نہ ہوگی جب تک وہ ان کی تعریف بھی میرے سامنے نہ کرنے لگے۔ فلورنس کے خیالات آزاد ہیں لیکن مجھے ایسی آزادی کی تمنا نہیں ہے ورنہ میں شادی ہی کیوں کرتی۔

"ابھی ایک نکتہ حل نہ ہوا ہے کہ ہنری نے میز کی داہنی جانب والے دراز میں کوئی چیز بند کی ہے۔ نہ معلوم اس میں کیا ایسی بیش قیمت شے ہے جس کے لئے وہ دراز کو ہمیشہ مقفل رکھتا ہے۔ یہ اس کا پوشیدہ باغ ہے جس میں سیر کرنے کی مجھے بالکل ممانعت ہے۔ اونہہ۔ مجھے اس کی پروانہ کرنی چاہئے سچ ہے کہ محبت کے معاملے میں عورت ناقص العقل ثابت ہوتی ہے۔

"۱۹۔ اکتوبر۔ آج صبح ہنری کے نام پھر ایک بیرنگ کا لفافہ آیا ہے جسے لے کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور جب وہ باہر آیا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ چلتے وقت وہ مجھ سے رخصت ہونا بھی بھول گیا۔ ضرور کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہے جس میں میری شکست اور ناکامی پنہاں ہے۔ اب میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ میں آج ہنری سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ وہ روزا کو خط لکھنا بند کر دے۔ ورنہ اس قسم کے توہمات مجھے دیوانہ بنا کر چھوڑیں گے۔

"لیکن میرے کہنے کا فائدہ کیا ہوگا؟ وہ دفتر کے پتے سے خط لکھا کرے گی۔ پھر مجھے کبھی ان کے تعلقات سے واقفیت نہ ہو گی۔"

"۲۰۔ نومبر۔ سہ پہر۔ ہنری نے ابھی ابھی ٹیلیفون سے اطلاع دی ہے کہ کھانے کے وقت وہ گھر نہیں آسکے گا۔ میں وجہ سننے کا انتظار کرتی رہی لیکن اس نے کوئی سبب نہیں بتایا۔ اور میرے نسوانی غرور نے مجھے دریافت کرنے سے باز رکھا۔ دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ آج صبح جو اسے خط ملا۔ اس پر ریجنٹ پارک کی مہر تھی۔ اے اللہ اب میں کیا کروں!"

آئرین نے روزنامچہ بند کر دیا۔ یہ یادداشت جسے اس نے آخر میں پڑھا تھا۔ اسی دن سہ پہر کو قلمبند کی گئی تھی۔ کاغذ پر جا بجا جو دھبے تھے اُن سے صاف ظاہر تھا کہ لکھتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک پڑے تھے۔ اس وقت سے اب تک رنج و غم کے آٹھ طویل گھنٹے گزر چکے تھے۔ باہر بارش کے قطرے ایسی سست رفتاری سے گر رہے تھے جیسے رکتے رکتے ٹھنڈی ہوئی آنکھوں سے آنسو۔ اس نے لپک کر اپنا قلم اٹھایا۔ اور آج کے روزنامچے کو مکمل کرنے میں مشغول ہو گئی۔

"نصف شب۔ آج ہنری گھر آئے گا کیونکہ کسی نہ کسی وقت تو اُس کا گھر آنا ضروری ہے۔ تو اس سے صاف صاف پوچھوں گی کہ آیا وہ روزا کے یہاں گیا تھا یا نہیں۔ اور اگر اس نے جواب اثبات میں دیا تو میں کہہ دوں گی کہ میں تم سے علیحدہ ہوئی جاتی ہوں۔ میں ایسا کر کے رہوں گی۔ اب سے قبل میں نے کبھی ایسا سوال نہیں کیا ہے۔ کیونکہ تمام واقفیت اور ثبوت کے باوجود میں نے اس پر ہمیشہ بھروسہ کیا ہے، لیکن اب وہ مزید اعتماد کے قابل نہیں رہا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ اس وقت روزا کے یہاں ہے۔ اگر اس نے انکار کیا تو میں کبھی یقین نہ کروں گی۔ . . ."

مہیب دہشتیں ازدواجی رشتے میں منسلک ہو جاتی ہیں تو ان کے درمیان کسی تیسری ہستی کا رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ ہنری نے غلطی کی۔ مجھ سے

شادی کی درخواست کرنے کے قبل اسے اپنی گزشتہ زندگی کو بھول جانا چاہئے تھا۔ اگرچہ ایسا کرنے میں اسے تکلیف ہی کیوں نہ ہوتی۔ اسے یہ حق حاصل نہیں تھا کہ اپنی گزشتہ ساعتوں کو میری زندگی سے وابستہ کرکے میری راحت میں خلل ڈالے۔ میں نے ہمیشہ چشم پوشی کی ہے۔ اس کے پوشیدہ باغ سے الگ رہنا چاہا ہے۔ اس کے رازِ سربستہ کی عزت کی ہے حالانکہ اس کی وجہ سے مجھے روحی اذیت ہوئی ہے لیکن اب میں حقیقت کے انکشاف پر مجبور ہوں۔ زندگی کا وہ دروازہ جس کو مقفل رہنا چاہئے تھا اب کھلنے کو ہے۔ بہزی کی زندگی میں ہم دونوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ اسے انتخاب کرنا چاہئے۔ دل کو مضبوط کرکے اسے ہم دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لینا چاہئے۔

"میں نہیں جانتی کہ وہ گھر آنے پر اپنی غیر حاضری کا کیا سبب بتائیگا مجھے توقع ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ اپنے کسی دوست کی بیماری یا کسی کاروباری جلسہ کا بہانہ نہیں کرے گا۔ بہزی ایسی باتوں سے بالاتر ہے تو کیا وہ یہ کہے گا کہ میرے ساتھ شادی کرنے میں اس سے غلطی کی؟ اور اب اس نے زروا کی طرف مراجعت کرنے کا قصد کر لیا ہے؟ میں ڈرتی ہوں کہ شاید وہ ایسا ہی کہے گا۔ اچھا تو میں بھی تیار ہوں۔ میں اس کی مرضی کے خلاف اسے قید میں رکھنا پسند نہیں کرتی۔ یہ اصول ہمیشہ غیر مفید ثابت ہوتا ہے۔ میں رونے سے بھی اپنی آنکھوں کو روکوں گی۔ کیونکہ رونے کے لئے پھر بہت سا وقت ملتا رہے گا۔

"لیکن آہ بہزی! ایسا کیوں ہوگا! کیا میری محبت کے تحیں تشفی نہیں ہوتی؟ کیا اس لئے کہ زروا مجھ سے زیادہ حسین اور ہوشیار ہے؟ یا بچی کی خاطر؟ خدا جانتا ہے کہ میرا دل خود ننھی ننھی آواز سننے کے لئے بے قرار رہتا ہے۔ خاموشی کے عالم میں ننھے ننھے قدموں کی چاپ میرے کانوں میں آتی ہے۔ شاید یہ آواز تمھارے کانوں میں بھی پہنچتی ہوگی جس وقت تم گھر آکر اپنے پرتکلف بستر، اپنی تصویروں اور لذیذ کھانوں کو دیکھتے ہوگے تو شاید تمھیں ایک چیز کی کمی محسوس ہوتی ہوگی، اور میں سمجھتی ہوں کہ صرف میری محبت ہی تمھاری زندگی کو کافی سے زیادہ دلچسپ بنا سکتی ہے۔ آہ! میں بھی کس قدر بیوقوف ہوں۔

"جو جذبات میرے دل میں اس وقت پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آج کی رات تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ ان تمام واقعات سے جنھیں میں نے اپنے روزنامچے میں قلمبند کیا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ میرا نظم و انضباط بتدریج ترقی کرتا رہا ہے۔ اور اس کی ابتدا شادی کے دو دن ہوگی تھی اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی میرا طرزِ عمل چاہے غلط ہو یا صحیح میں اب اس طرح نہیں رہ سکتی۔ میں خوش ہوں کہ فیصلہ کرنے کی ساعت آپہنچی چاہے یہ فیصلہ میرے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ تیقن۔ اس روح فرسا شبہہ سے خوش تر ہے۔ کیا اس کا دل مجھ سے پھر گیا ہے؟ کیا وہ زروا سے پھر محبت کرنے لگا ہے؟ کاش مجھے کسی طرح یہ معلوم ہو جائے۔

آئرین کی کانپتی ہوئی انگلیوں سے قلم گر پڑا۔ وہ اپنی تحریر کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کا عزم صمیم اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ "کیوں نہیں" اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی "مجھے اس کے جاننے کا حق حاصل ہے" اس نے تیزی کے ساتھ میز کا ایک دراز کھولا۔ اور اس میں سے ایک بکس نکال کر اسے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ گویا یہ سوچ رہی کہ نہ معلوم اس کے اندر کیا چیز بند ہے وہ ڈر رہی تھی۔

اُس نے اپنی خریں انگلیوں سے بکس کو کھولنا چاہا لیکن قفل نے اسے باز رکھا۔ حالانکہ وہ بہت کمزور تھا۔ آئرین نے کسی آلے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک درزی کٹار جو قدیم جنگلوں میں استعمال ہوتی تھی دیوار سے لٹک رہی تھی۔ آئرین اسے اتار لائی اور اس کے دستے کا سرا ڈھکنے کے اندر ڈال کر ایک ہلکا سا جھٹکا دیا جس سے قفل کھل کر الگ جا گرا۔ اور بکس کے اندر کی کل چیزیں سامنے میز پر ڈھیر ہوگئیں۔

ایک لمحے کے لئے آئرین ہچکچائی۔ اس کی خوف آلودہ نگاہیں بکس کے گوشے گوشے کا جائزہ لے رہی تھیں لیکن بکس کا سرمایہ مختصر تھا۔ خط کے پتلے پتلے کاغذ قابل نفرت سبز لفافوں میں۔ دو تین تصویریں۔ ننھے جوتوں کا ایک جوڑا جس کے چمڑے کا رنگ ماند ہو گیا تھا۔ چند بالتصویر کرسمس کارڈ۔ ہیپر کسی بچی کے ہاتھ کا پتہ لکھا ہوا تھا اور سب کے نیچے چند قافی مسودات جن کو آئرین نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ طلاق کے مقدمے کے متعلق ہیں۔ بکس کے اندر سے ایک پژمردہ گلاب کی پنکھڑیوں کی ہلکی باس نکل کر ان واقعات کی طرف اشارہ کر رہی تھی جو اب یاد سے محو ہو گئے تھے۔ سبز لفافے جن پر پتہ بہت نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا حال کے واقعات کی یاد دلا رہے تھے۔ اس نے خط کے پلندے کو اٹھا لیا۔ اور اس کے فیتے کو کھول کر الگ کیا۔ "ان خطوں سے وہ بات معلوم ہو جائے گی۔ جو میں جاننا چاہتی ہوں" اس نے اپنے دل میں کہا۔

پلندے میں صرف چار خط تھے اور تاریخ وصول کے لحاظ سے

ترتیب وار ایک پر ایک رکھے ہوئے تھے۔ پہلا خط بہت مختصر تھا اور اس میں الگ ایک گلابی پرزی بھی لگی ہوئی تھی۔

"پیارے ہنری" (خط کا مضمون تھا) "ایلن تمھاری بھیجی ہوئی گھڑی کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ میں نے یہ گھڑی اس کے لئے اٹھا رکھی ہے کیونکہ ابھی وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی حفاظت کر سکے۔ اس کی سال گرہ کی تقریب ہنسی خوشی کے ساتھ گزر گئی۔ اس نے شکریے میں تمھیں یہ پرزی لکھی ہے۔"

"روزا"

جس وقت آرین نے ایلن کی پرزی کو اٹھا کر پڑھنا شروع کیا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ بڑے بڑے اور کچے حروف میں لکھا تھا "پیارے ابا" آرین ان آنسوؤں کو نہ روک سکی لیکن ان آنسوؤں میں وہ عنصر نہ تھا جس سے حسد کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس وقت اس کے دل پر ایک پریشان کن احساس طاری تھا۔ وہ پشیمان ہو رہی تھی کہ اس نے کیوں ایسے معاملات میں دخل اندازی کی جو اس کی زندگی سے علیحدہ تھے لیکن پھر دونوں میں اس ناقابل برداشت ارتباط کا کیا مطلب تھا؟ جس طرح اس خط میں روزا نے "پیارے ہنری" لکھ کر مخاطب کیا تھا۔ اسی طرح وہ پہلے بھی لکھا کرتی ہوگی۔ آرین تعجب کر رہی تھی کہ اگر آج رات کے واقعات کی بنا پر اسے ہنری سے علیحدہ ہو جانا پڑے تو وہ کیا لکھ کر مخاطب کرے گی۔ اسے یاد آیا کہ یہ طلاق محض ایک رسمی علیحدگی تھی۔ لہٰذا روزا کا ہنری کو ان الفاظ میں مخاطب کرنا چنداں نامناسب نہ تھا۔ تاہم آرین کو ناگوار معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے پھر دوسرا خط کھولا۔ یہ بھی مختصر تھا اور اس کا مضمون یہ تھا۔

"شکریہ۔ ہنری تمھاری دعاؤں کا شکریہ! میں اپنی کامیابی سے اس لئے خوش ہوں کہ ایلن کا مستقبل بن جائے گا۔ اب وہ اچھی ہے۔ اسکو الفلدانزا ہو گیا تھا۔ وہ تمھیں پیار کرتی ہے۔"

آرین غور سے یہ خط پڑھ رہی تھی اور خط کے ختم ہو جانے پر بھی چند منٹ تک وہ خاموشی کے ساتھ کچھ سوچتی رہی۔ ہنری نے روزا کو فن رقص میں کامیابی حاصل کرنے کی دعائیں دی تھیں۔ وہ ضرور روزا کی آئندہ زندگی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ورنہ ان دعاؤں کا کیا مطلب تھا۔ لیکن کیا یہ ایک مرد کی فطرت سے بعید ہے کہ وہ ایک بچی کی خاطر اس کی کامیاب زندگی کے متعلق دعا کرے۔ آرین نے خط الگ رکھ دیا۔ وہ بالکل کھوئی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اب تک اسے وہ چیز نہیں ملی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔

تیسرا خط اور بھی مایوس کن تھا۔ اس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"پیارے ہنری۔ ایلن کی آئندہ زندگی کے متعلق چند ایسے اہم امور ہیں جن میں تمھارے مشورے کی ضرورت ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنے وکیل کو تمھارے پاس بھیجوں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اگر ہم دونوں مل کر مشورہ کریں تو جلد کسی مناسب فیصلے پر پہنچیں گے۔ ممکن ہے کہ اس میں ہم دونوں کو تھوڑی تکلیف ہو لیکن اس بچی کی خاطر ہمیں یہ تکلیف برداشت کرنی ہی پڑیگی

"آئندہ ہفتے میں برائٹین جاؤں گی اور اس کے ایک ہفتہ بعد مینچسٹر جانا ہوگا جہاں ہمارا قیام ایک ماہ تک رہے گا۔ اگر ان دنوں تم مینچسٹر جاؤ (کیونکہ مجھے یاد آتا ہے کہ تمھیں اکثر کاروبار کے سلسلے میں مینچسٹر جانا ہوتا ہے) تو مجھے اطلاع دو۔ تاکہ میں ملاقات کا انتظام کر سکوں۔ مینچسٹر میں ایلن میرے ساتھ ہوگی لیکن اس کے بعد وہ کہاں جائے گی بس اسی کے متعلق تم سے کچھ ضروری صلاح لینی ہے۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ وہ میرے ساتھ رہے کیونکہ اس زندگی میں بڑی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ راتوں کو دیر تک جاگنا ہوتا ہے۔ وقت کا زیادہ حصہ تھیٹروں میں صرف ہوتا ہے۔ کھانا ہوٹلوں میں کھانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے کوئی اسکول زیادہ مناسب ہوگا۔ اگر میرا کوئی ایسا رشتہ دار موجود ہوتا جس کے سپرد میں ایلن کو کر سکتی تو تمھیں تکلیف نہ دیتی۔ لیکن بدقسمتی سے خالہ برتھا کے سوا اس دنیا میں میرا اور کوئی رشتہ دار نہیں۔ تم سے جو اس کو عداوت تھی وہ تمھاری بچی کے ساتھ بھی جاری ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم مینچسٹر میں مجھ سے ضرور ملو گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہمارا قیام کہاں رہے گا لیکن تم ہمارے تھیٹر کے ذریعے مجھ تک پہنچ سکتے ہو۔

"اچھا تمھارے دن کیسے گزرتے ہیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ تمھیں وہ مسرت مل گئی ہوگی جس کو پہم پہنچانے میں میں ناکامیاب رہی۔ . . . . .

ہمیشہ کی چاہنے والی تمھاری روزا"

جس وقت آرین نے یہ خط ختم کیا۔ اس کی آنکھوں سے آتش غضب کی تیز شعاعیں نکل رہی تھیں۔ کیا یہ سکار عورت ایلن کے ذریعے ہنری پر ہمیشہ اپنا قبضہ رکھنا چاہتی ہے۔ وہ ہنری سے ملاقات کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہے اور بڑھ آج یک بیک مصلاح و مشورہ کی کیا ضرورت پیش آئی۔ وہ طلاق کی قیمت میں بچی کی پرورش چاہتی تھی۔ ایلن روزا کی بیٹی تھی۔ لیکن اب وہ ہنری کو اپنے یہاں بلاتے وقت لکھتی ہے کہ "تمھاری بچی" افوہ! یہ چال بازی! اچھا تو ہنری اس سے مینچسٹر میں ملا ہوگا۔ اب آرین نے سمجھا کہ جس رات ہنری مینچسٹر سے واپس آیا تھا۔ اس نے بھوک کی کمی کی شکایت کیوں کی تھی اور دوسرے کے بہانے کا مطلب کیا تھا۔ اور آج اس رات کی بے تابی اور گریہ وزاری کا ذمہ دار کا

کون تھا۔ ان باتوں کو یاد کر کے آئرین کے دل کو سخت چوٹ لگی۔ اسے دھوکا دیا گیا تھا۔ دونوں نے مل کر اسے دھوکا دیا تھا۔ آہ کس قدر صدمے کی بات ہے۔ اگر ہنری پھر روزا کی طرف جانا چاہتا ہے تو چلا جائے ان فریب بازیوں کی کیا ضرورت ہے۔ روزا نے ہنری کی خفا و خرم زندگی کے متعلق جو سوال کیا تھا۔ اس سے ایک استہزا آمیز رشک ظاہر ہو رہا تھا۔ آئرین نے غصہ سے اس خط کو الگ پٹک دیا۔ اور آخری لفافہ کھولا۔ اس پر بکنٹ پارک کی مہر تھی۔ آئرین کو یاد آیا کہ یہ وہی خط ہے جو آج صبح ہنری کو ملا تھا۔ وہ پڑھنے لگی۔

"پیارے ہنری۔ میں آج کل لندن میں ہوں اور بہت دنوں سے بیمار ہوں۔ میرے دل کا یہ ناقابل فہم جس کا تمھیں بھی علم ہے کمپنی کے ٹوٹ جانے اور فکر و تردد کے باعث پھر اُبھر آیا اور روز بروز تکلیف میں زیادتی ہے۔ میں تم سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ ایلین کے مستقبل کا خیال مجھے بے حد پریشان کر رہا ہے۔ ڈاکٹر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میں مہینوں تک کسی کام کے قابل نہ ہو سکوں گی۔ اور مجھے اس ناموافق آب و ہوا سے جلد چلا جانا چاہئے۔ میں نہیں جانتی کہ اس نازک موقع پر تمھارے سوا اور کس سے مدد لوں۔ شاید تمھیں تکلیف پہونچے لیکن ہنری میں تم سے صاف صاف کہنے پر مجبور ہوں کہ میں تم سے زیادہ کسی کا خیال نہیں کرتی میں جانتی ہوں کہ یہ اعتراف نہایت خوفناک ہے لیکن کیا کروں۔ میں بالکل معذور ہوں کیونکہ حقیقت یہی ہے۔ پیارے ہنری۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تمھاری خوبیوں کو سمجھ نہ سکی۔ امید کرتی ہوں کہ تمھاری موجودہ بیوی مجھ سے زیادہ عقلمند ہوگی۔ میں نے چاہا تھا کہ زندگی کو کامیاب بناؤں لیکن جو لوگ کامیابی کے خواہشمند ہیں انھیں بسا اوقات ناکامی کے تلخ گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ کامیابی کے لمحے مختصر ہوتے ہیں۔ بہت مختصر۔

"ہاں، میں نے بڑی بے وقوفی کی۔ مجھے خود اس کا اعتراف ہے۔ اگرچہ اب وقت نکل چکا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم ایک ایسی ہستی کے ساتھ جو تمھاری خوبیوں کو سمجھتی ہے مصروفِ عیش ہو۔ ہم دونوں نے بھی چند دن عیش کے گزارے ہیں۔ یہ میں اس لئے نہیں لکھ رہی ہوں کہ گزشتہ زندگی کے یہی چند لمحات ہیں جن کی یاد مجھے ایک گونہ مسرور رکھتی ہے براہِ خدا ایسا نہ خیال کرنا کہ میں تمھیں الزام دے رہی ہوں۔ میں خود قصوروار ہوں حالانکہ اس سے پہلے میں تمھیں یہ الزام دیتی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ باتیں بالکل لغو ہیں اور میرے قلم سے بے ارادہ نکل گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم معاف کر دو گے۔

"میں اس وقت تنہا ہوں۔ بے کس ہوں۔ بیمار ہوں اور ایلین کا خیال مجھے رہ رہ کر ستا رہا ہے۔ کاش کسی طرح ایلین کے مستقبل کا فیصلہ ہو گیا ہوتا۔ یہاں ایک نرس ہے جو میری اور ایلین دونوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ اگر میں تبدیل آب و ہوا کے لئے یہاں سے باہر چلی جاؤں تو موسم بہار تک تندرست ہو سکتی ہوں'

"ہنری میرے دل پر سوز و غم کا بادل چھا رہا ہے۔ یہ اس لئے کہ میری زندگی ناکامیاب ثابت ہوئی تھیں میں اپنے اندوہ و غم میں شریک بنانا چاہتی ہوں جیسا کہ پہلے میرا معتمد تھا اس وقت میں تم سے ایک ضروری کام میں مدد لینا چاہتی ہوں۔ ایلین کے متعلق تمھارا مشورہ درکار ہے میں اس کو ساتھ لے کر ڈیون کو چلا جانا چاہتی تھی، لیکن میرے پاس اتنا کافی روپیہ نہیں ہے کسی اسکول کے بورڈنگ ہوس میں وہ زیادہ اچھی طرح رہ سکتی ہے، تمھارا کیا خیال ہے؟ مجھے تمھارے مشورے کی ضرورت ہے اگر تم آسکتے ہو تو جلد آؤ۔ کیونکہ جس وقت مجھے ذرا بھی صحت ہو جائے گی میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گی، میرا کمرہ تیسری منزل پر ہے۔ یہاں برقی زینہ نہیں ہے۔ تاہم مجھے امید ہے کہ تم میری خاطر سیڑھیوں پر چڑھنے کی تکلیف گوارا کرو گے۔ آنے سے قبل تو ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع کر دینا۔ تاکہ میں تمھارے خیر مقدم کو تیار رہوں۔ میں زیادہ تر بستر پر پڑی رہتی ہوں کیونکہ ڈاکٹر کا حکم ہے کہ مجھے آرام کرنا چاہئے۔

"تم ضرور آؤ۔ شاید تمھاری بیوی ہماری اس ایک دو کی ملاقات کا کچھ خیال نہ کرے گی۔ ایلین تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔

روزا"

آئرین نے ایک اضطراری حرکت کے ساتھ خط کو موڑ کر لفافہ کے اندر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نصف بند تھیں۔ اس نے اپنے دماغ میں ایک تصویر کھینچنی چاہی کہ اس کا شوہر روزا کے بستر پر پہلو میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کی ناکامیابی پر اظہارِ ہمدردی کر رہا ہے۔ بلکہ کبھی اس کو اپنے آغوش میں لے کر تسلی دینے لگتا ہے۔ اس آخری خطا نے مخالطہ بالکل صاف کر دیا تھا۔ وہ ہنوز اس ذہنی تصویر کے کھینچنے میں مشغول تھی کہ دور سے گرجا کی گھڑی کے بجنے کی صدا اس کے کانوں میں پہنچی یکبارگی وہ لرز گئی خطوں کو جلد جلد لفافوں میں رکھ کر کل چیزوں کو اس نے بکس میں بند کر دیا اور پھر بکس کو دراز میں اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ شدتِ غضب سے وہ بالکل مغلوب

ہو رہی تھی۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ اور اس کا شوہر ابھی تک اپنی آشنا کے پہلو میں بیٹھا ہوا۔ اس کی بیٹی کے مستقبل کے متعلق مشورہ کر رہا تھا۔ آئرین نے زور سے ایک قہقہہ لگایا جس میں رنج والم، حسد و عداوت اور غیظ و غضب کی تلخی ملی ہوئی تھی۔ آہ! وہ کتنی بے وقوف تھی کہ اس نے مرد پر اعتماد کیا تھا اب اسے احساس ہوا کہ ہنری اپنی برات میں چاہے کیسا ہی معقول عذر کیوں نہ پیش کرے اس کے دل پر سے رنج والم کا بار ہٹ نہیں سکتا۔ اگر ایک یا دو گھنٹے کی بات ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ نصف شب تک بغیر کسی معقول سبب کے غائب رہنا یقیناً ناقابل معافی ہے۔ آئرین کی دلی خواہش تھی کہ اب وہ صبح سے قبل واپس ہی نہ آئے۔

باہر دروازے کا نفل کھلنے کی ایک ہلکی سی صدا بڑے ہال سے گزرتی ہوئی اس کے کانوں تک پہنچی۔ آئرین اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو زور سے بھینچ لیا۔ یہاں تک کہ اسے تکلیف معلوم ہونے لگی قدموں کی چاپ سے اس نے پہچانا کہ ہنری آرہا ہے۔ کچھ سوچ کر وہ فوراً سایہ میں چھپ گئی۔ تاکہ ہنری اس کے اندوہناک چہرے کو نہ دیکھ سکے پر وہ ہٹا۔ اور اس کا شوہر اندر داخل ہوا۔ اس کا سفید چہرہ صاف نظر آرہا تھا غم و غصے کی حالت میں بھی آئرین کو اس کے چہرے پر زردی اور ماتھے پر تردد و فکر کے آثار نمایاں معلوم ہوئے تھے۔ آئرین نے سمجھ لیا کہ اب وہ نازک موقع جس کا اسے انتظار تھا آپہنچا ہے۔

ہنری کے چہرے سے کسی طرح یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ دل میں پشیمان ہو رہا ہے اور معافی کا خواستگار ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ مقابلے کے لئے تیار نظر آتا تھا۔ آئرین کے دماغ میں یہ خیال نہایت سرعت کے ساتھ پیدا ہوا کہ وہ اس وقت اس سے یہ کہنے آیا تھا کہ "مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ میں روزا کی طرف واپس جا رہا ہوں"۔ آئرین نے اس کی نگاہوں کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا لیکن اس کے دل پر بڑی ہیبت طاری تھی،

"آئرین" اس نے کہنا شروع کیا۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے"۔

"اگر تمہیں یہ کہنا ہے کہ تم اس وقت اپنی آشنا کے پاس سے چلے آرہے ہو تو فضول ہے کیونکہ مجھے پہلے ہی اس کا علم ہو چکا ہے"

"ہنری کو آئرین کی بات سن کر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ ظاہر ہوا اسے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ شام کے واقعات سے آئرین کو واقفیت ہے یا نہیں اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آئرین کو اس کا علم کیسے ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اس سے زیادہ اہم معاملے کے متعلق سوچ رہا ہے۔

"نہیں، یہ نہیں" اس نے ایک ایسی متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا جو ہر لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ "وہ بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے"

"اس سے زیادہ اہم؟" آئرین کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک پیدا ہونے لگی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آپے سے باہر ہوئی جا رہی ہے۔ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی اہم بات ہو سکتی ہے کہ وہ اسے تنہا چھوڑ کر رات کسی دوسری جگہ بسر کرے۔ "اس وقت تک اس سے زیادہ کوئی دوسری چیز اہم نہیں ہو سکتی جب تک کہ تم مجھ سے قطع تعلق کر کے اپنی آشنا کے جا نہ ملو"

"آئرین، ایسا نہ کہو" اس نے نہایت نرمی سے کہا۔ "اگر میں ایسا کرنا بھی چاہوں تو اب ممکن نہیں۔ ایک گھنٹہ ہوا کہ وہ چل بسی"

کمرے میں ایک یاس آمیز خاموشی چھا گئی۔ آئرین کے سر میں چکر سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے سہارا لینے کے لئے میز کا کنارہ پکڑ لیا۔ اس اضوسناک واقعہ کے سامنے اسے اپنا معاملہ بالکل ہیچ اور بے بنیاد معلوم ہو رہا تھا۔

"وہ صدموں کو برداشت نہ کر سکی"۔ اس نے ہنری کو کہتے ہوئے سنا۔ "لوگوں نے اس کو مرض کے متعلق رھوکے میں رکھا لیکن مجھے معلوم تھا میں نے اس کے ڈاکٹر سے گفتگو کی تھی۔ پیاری آئرین!"

اس نے ازرہ محبت میں آئرین کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم جانتی ہو کہ میں نے تمہارے مقابلے میں اس سے زیادہ محبت نہیں کی۔ تم میرے دل اور جان کی مالک ہو۔ اگر میں وقتاً فوقتاً اس سے ملنے چلا گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میرے دل میں اس کی محبت از سر نو پیدا ہو رہی ہے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ مجھے اس کی صحت کے متعلق شبہ ہو رہا تھا۔ اگر میری جگہ تم بھی ہوتیں تو شاید اس سے کم نہ کرتیں کیوں؟ میری پیاری آئرین؟!——"

آئرین نے اپنا سر ایک سنی خیز انداز میں ہلایا اور بیچارگی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"آج رات جس وقت میں نے اسے دیکھا" ہنری نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تو میں نے یقین کر لیا کہ عنقریب اس کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ دس بجے اس کی حالت ایسی بگڑی کہ پھر سنبھل نہ سکی یہاں تک کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ نرس۔ ڈاکٹر۔ امین اور میرے سوا وہاں کوئی موجود

نہ تھا۔ لہٰذا میرا وہاں ٹھیر جانا ضرور تھا۔ میں نے چاہا کہ تھیلی فیون سے اطلاع کر دوں۔ مگر وہ اس کے بستر مرگ کے قریب رکھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے میں مجبور رہ گیا۔"

آئرین کے دماغ میں دو باتیں تیزی کے ساتھ ٹکر لگا رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ عورت جس سے وہ حسد کرتی تھی اب دنیا میں موجود نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ اب وہ اپنے شوہر کی تنہا مالک تھی لیکن ان دونوں باتوں میں وہ کسی سے بھی خوش نہ تھی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس مردہ عورت میں ایک بار پھر جان ڈال دیتی۔ اگرچہ اس کی خاطر اس کو اپنی محبوب ترین چیز قربان کیوں نہ کرنی پڑتی لیکن اب یہ ناممکن تھا جس محبت بھرے انداز سے ہنری اس کے ہاتھوں کو بار بار تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمیشہ سے آئرین کا تھا۔ اور اس کے تمام شکوک و شبہات اور حاسدانہ خیالات بالکل مہمل و بے بنیاد۔

"ہنری ہنری" اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ اس سے زیادہ بولنے کی اس وقت اس میں سکت نہ تھی۔ ہنری نے اس کی طرف دیکھا۔ ابھی تک اس کی نگاہوں سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

"ابھی ایک بات اور ہے آئرین" اس نے کہا۔ "بچی ابھی تک موجود ہے۔ میں نے اس کے متعلق بہت کچھ غور و فکر کیا ہے۔ اس معاملے میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایلین ہمارے ساتھ رہے۔"

معاً آئرین کے ہاتھ چھوٹ کر لٹک گئے۔ روزا کے متعلق سوچنے میں وہ اس قدر غوطہ زن ہو رہی تھی کہ اسے ایلین کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ اس سے کیا امید کی جا رہی ہے۔ اس سے یہ کہا جا رہا تھا کہ اکی بچی کو اپنے ساتھ رکھ لے۔ وہ اپنی ماں کی یاد کا بن کر برابر ان کے ساتھ رہے گی۔ اور ہر وقت ہنری کو روزا کی یاد دلایا کرے گی آئرین ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال دل میں نہ لا سکتی تھی ہنری کو یہ حق نہ تھا کہ وہ اس سے اس قسم کی درخواست کرے۔ اگرچہ آئرین اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی لیکن واقعہ یہ تھا کہ اس کی عداوت ماں سے ہٹ کر بچی کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ اب وہ ہنری کے خیالات اور روزا کی یاد کا بھی حسد کرنے لگی تھی۔

آئرین کے دماغ میں خیالات کا جو طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس کا ہنری نے اندازہ کر لیا۔ اس نے مڑ کر دروازے کا رخ کیا۔ جب وہ چوکھٹ پر پہنچا تو ایک ہاتھ سے پردہ تھام کر کہا۔ "پیاری اس پر غور کرو میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پردہ چھوڑ دیا۔ اور باہر نکل گیا۔

آئرین میز کے کناروں کا سہارا لئے ہوئے بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اب اسے کیا کرنا چاہئے؟ اس کی جگہ پر اگر کوئی دوسری عورت ہوتی تو اس کا ردعمل کیا ہو سکتا تھا؟ خط سے اسے معلوم ہو ہی چکا تھا کہ اس بچی کا دنیا میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے جو اس کی پرورش کا ذمہ دار ہو۔ اگر ہوتا بھی تو یہ بات بالکل فطرت کے مطابق تھی کہ ہنری ایلین کو اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش کرے۔ کیا اس یادگار کی موجودگی میں دونوں کو کبھی خوشی میسر آ سکتی تھی۔ ایک مرتبہ ہنری نے کہا تھا کہ ایلین ہو بہو اپنی ماں کی تصویر ہے۔ کیا وہ اسے ہر روز دیکھ کر روزا کو یاد کئے بغیر رہ سکے گا!

آئرین ہنوز ان ہی خیالات میں منہمک تھی اور کسی فیصلے پر نہیں پہنچی تھی کہ ہنری پردہ ہٹاتا ہوا اندر داخل ہوا۔

آئرین نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ جھک گئی کیونکہ اس کا شوہر اس دفعہ اکیلا نہیں تھا ایک ہاتھ سے وہ ایک بچی کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ بچی کے جسم سے پھول کی سی نزاکت چہرے سے حور کی سی معصومیت ٹپک رہی تھی۔ اس کی بھٹی بھٹی نگاہوں میں جن میں سرتاسر خوف کی جھلک تھی آنسوؤں کے قطرے تیر رہے تھے۔ اس نے آئرین کی طرف نگاہ کی اور پھر جیسے کوئی بچہ خوفناک چیز دیکھ کر ماں کی آغوش سے چمٹ جاتا ہے۔ وہ ہنری کے ہاتھوں سے چمٹ گئی۔ ہنری نے بہر سکوت کو توڑتے ہوئے کہا:۔

"پیاری آئرین۔ دیکھو یہ ایلین ہے اس کا لہجہ بہت نرم و خوفناک تھا۔ "ماں کی آغوش چھوٹنے کے بعد اب اس کے لئے کہیں ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس لئے میں اسے ساتھ لے آیا ہوں۔ وہ بہت خستہ ہو رہی ہے۔"

بات ختم کر کے اس نے اپنی نگاہیں آئرین پر جما دیں شفقت اور رحم کی ایک لہر آئرین کی روح میں دوڑ گئی یکبارگی وہ آگے کو بڑھی اس کی آغوش اس یتیم ماں کی بچی کے لئے کھلی ہوئی تھی۔

"پیاری بچی۔ پیاری بچی" کہہ کر وہ گھٹنوں کے بل جھک گئی اور اس نے ایلین کو سینے سے چمٹا لیا۔ ہنری نے کہا۔ "اسے کچھ تھوڑا سا گرم دودھ دینا چاہئے۔ ایلن۔ یہاں اپنے ابا اور میرے ساتھ رہو گی؟"

بچی نے نہایت سنجیدگی اور خاموشی سے سر ہلا دیا اور پھر رونے لگی۔ آئرین نے اسے سینے سے لگا کر خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا اس کی آنکھوں میں اس وقت مسرت کی ایک چمک پیدا ہو رہی تھی۔

ہنری۔ جلدی سے دودھ لاؤ۔ شفقت اور الفت سے بھری ہوئی آواز میں اس نے کہا "میرے پیارے میں ہمیشہ اسے خوش رکھنے کی حتی الامکان کوشش کروں گی!"

ہنری جھک کر آئرین کی زلفوں کا بوسہ لینے لگا۔

"میں جانتا تھا کہ تم ایسا کرو گی!" اس نے مسکرا کر کہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اس وقت کس قدر مسرور ہوں۔" (ترجمہ)

سید حسن، ام۔ اے

جگر پارے

اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب اُن کا
فصلِ حسن ہے اُن کی موسمِ شباب اُن کا

ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی اُن کی
ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالمِ پُرآب اُن کا

کیا اسی کو کہتے ہیں ربط و ضبطِ حسن و عشق
شوقِ نارسا اپنا نازِ کامیاب اُن کا

یوں ہی کھلتے جاتے ہیں حسن و عشق کے اسرار
اک نفس سوال اپنا اک نفس جواب اُن کا

اور کس کی یہ طاقت اور کس کی یہ جرأت
عشق آپ آڑا اپنی حسن خود حجاب اُن کا

عرضِ غم نہ کر اے دل دیکھ ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ "اُنھ" کہہ کر سُن لیا جواب اُن کا

تُو جگر جو رسوا ہے تو ہی آہ رسوا رہ
نام تو نہ کر رسوا خانماں خراب اُن کا

جگر مرادآبادی

مرسلہ شہزادہ ایاز الہ بیگ

شاعر کی دعا

مرے غمزدہ دل کی جانِ نشاط — رہے عشرتوں سے ترا ارتباط
تری روح ناواقفِ غم رہے — لہو میں تپشِ شوق میں دم رہے
تری زلف کا عشق انگیز رنگ — حسیں انکھڑیوں کا جنوں خیز رنگ
ترے روح پرور لبوں کا گداز — ہے تخلیق کو جن کی صنعت پہ ناز
کشادہ جبیں کی صباحت کا سحر — حسیں انگلیوں کی نزاکت کا سحر
وہ باتیں تری جن کو میں کیا کہوں — لطیف اور جذبات آرا کہوں
وہ باتیں جو انساں کی باتیں نہیں — جو اس بزمِ ویراں کی باتیں نہیں
وہ باتیں، وہ گفتار کی ساحری — وہ باتیں مجل جن سے نظمیں مری
تکلم میں مے، گفتگو میں شراب — سلامت رہے آہ! تیرا شباب
ترے حُسن کی، دلربائی کی خیر — تُو فطرت کا شہ کار ہے، تیری خیر
بڑی تلخ ہے گو مری یہ دعا — مگر میں ہوں انجام سے آشنا!
پہنچ کر جوانی کے معراج پر — نہ ہو تیری شب آشنائے سحر
تُو رخصت ہو پہلے ہی تخریب سے — فنا کی غم انگیز ترکیب سے
اور اک غیر فانی کہانی بنے
جوانی تری جاودانی بنے

عدم

سیاسی انقلابات اور شاعری

سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ گرد و پیش کی ساری چیزیں بدل جاتی ہیں۔ حکومت علم و فن اور فضل و کمال کی ترقیوں کا مرکز ہے جس حکومت میں علم و فن کو ترقی دینے کی کوشش کی جائے گی۔ جہاں کے حکمرانوں کو علم و فن سے دلچسپی ہوگی۔ وہاں کے عوام میں بھی یہ مذاق دن بدن ترقی کرتا رہے گا۔ اور عوام میں دلچسپی پیدا ہو جانے کے بعد علم و فن سب سے زیادہ ترقی کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر حکومت علم و فن کی طرف سے بے نیاز ہے۔ حکمرانوں کو فنون سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ وہ اہل کمال اور علم و فن کے دل دادگان کی قدر نہیں کرتے تو ایسی سلطنتوں میں علوم و فنون کا جنازہ نکل کر آن میں ایک طرح کا جمود پیدا ہو جائے گا۔

یہ بیان کسی ثبوت کا محتاج نہیں۔ ہر ملک اور ہر قوم کی حکومت پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اس بات کا اندازہ آسانی سے کر سکتے ہیں کہ جب حکومت نے علم و فن میں دلچسپی لی تو انھوں نے ہر جگہ بے حد ترقی کی ہے۔ یہ بات مان لینے کے بعد کہ حکومت کی توجہ اور بے توجہی علوم و فنون کی ترقی اور تنزل کی ضامن ہے، دوسری چیز جو ہمارے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ جب حکومت فنون کی ترقی میں کوئی نمایاں حصہ لینا شروع کرتی ہے تو صاحب فن اس کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ فن کی موجودہ شکل حکومت کے مذاق کے ہم آہنگ ہو بخصوص شخصی حکومتوں میں یہ اثر زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں جب سے اردو شاعری شروع ہوئی شخصی حکومت کا دور دورہ رہا۔ اور گولکنڈہ۔ بیجاپور۔ دہلی لکھنؤ۔ مرشد آباد۔ رام پور اور حیدر آباد کی چھوٹی اور بڑی سب ریاستوں میں علم کی ترقی کسی نہ کسی شخصی حکمران کی توجہ کی محتاج رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں جہاں مختلف سیاسی تبدیلیوں سے ایسے اثرات رونما ہوئے جو ظاہری طور پر ہونے لازمی تھے وہاں دوسری طرف مختلف دوروں کی شاعری کے مذاق میں بھی تبدیلی ہوتی گئی اور بعض اوقات ایک ہی زمانے میں دو مختلف مقامات پر ایسی شاعری کا دور دورہ رہا کہ دونوں اپنے اپنے مذاق میں ایک دوسرے سے جداگانہ تھیں۔ دونوں کے مذاق میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ دو مختلف مقامات کا سیاسی مذاق جداگانہ تھا۔ شاعر آخر فطرتیں اس کی پیروی کرتی رہیں اور ایک ہی زمانے میں دو مختلف مذاق کی شاعریاں پیدا ہو گئیں۔

لکھنؤ اور دہلی پر نظر ڈالنے کے بعد اس بات کا اندازہ اچھی طرح ہو سکتا ہے کہ سیاسی انقلابات اور حکمراں کا مذاق اور ذہنیت شاعری کے مذاق میں کس طرح تبدیلی کر سکتے ہیں۔

یہ تو ایک عام اصول ہے۔ اب دیکھنا یہ چاہئے کہ ملک کے سیاسی حالات شاعری پر کس کس طرح اثر ڈال سکتے ہیں اور ان مختلف سیاسی تبدیلیوں کے نقوش کس طرح مختلف دوروں میں شاعری پر باقی رہ جاتے ہیں اور کس طرح کوئی ناواقف شخص ان سیاسی تبدیلیوں کو شاعری کے ذریعے سے محسوس کر سکتا ہے؟

شاعر پر کسی سیاسی انقلاب کا پہلا اثر تو یہ پڑتا ہے کہ یکایک وہ اس انقلاب کی وجہ سے اپنے گرد و پیش میں جو تبدیلی محسوس کرنے لگتا ہے اسے شعر کا لباس پہنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور یہ سیاسی انقلاب کی پہلی تصویر ہوتی ہے۔ اردو شاعری میں ان انقلابات کی مصوری یا تو مثنویوں اور قصیدوں میں ہوئی ہے اور یا اُن نظموں میں جو مختلف دور کے شاعروں نے شہر آشوب کے نام سے لکھیں۔ ایسی نظموں کے پڑھنے کے بعد ہمیں حکومت کے انقلاب کے حالات تو معلوم ہوتے ہی ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ مفصل طریقہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سیاسی تبدیلی سے ملک کے رہنے والوں کی زندگیوں میں کیا انقلاب ہو گیا۔ امیر غریب ہو گئے۔ اور غریب اتنے غریب ہوئے کہ فاقہ مست بن گئے

شرافت لوگوں سے دور بھاگ گئی۔ رہنے سہنے کے طریقوں میں عظیم انقلابات رونما ہو گئے اور ان سب سے زیادہ شدید بات یہ ہے کہ ملک کے لوگوں کے اخلاق میں خاص قسم کی تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ یہ تبدیلیاں ہوتا مائل پستی ہوتی ہیں اور اس لئے آنے والے دور کے شاعر ان تبدیلیوں کو خوش آیند نہ سمجھ کر وعظ و پند کے دفتر کھولتے ہیں اور اس سلسلے میں جو شاعری جلوہ گر ہوتی ہے اس کا انداز اس طرح کا ہوتا ہے کہ اس سے لوگوں کی اس اخلاقی پستی کا اندازہ بالکل اچھی طرح ہو جاتا ہے جو اس سیاسی تبدیلی کی وجہ سے ان میں پیدا ہو گئی ہے؛

اس مضمون میں سیاسی انقلابات کے سلسلے میں مختلف قسم کی شاعریوں کے جو نمونے پیش کئے جائیں گے انھیں مختصر طور پر اتنے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) مختلف زمانوں میں جو سیاسی انقلابات ہوئے ان کی مصوری شاعروں نے کس کس طرح کی؟

(۲) ان سیاسی تبدیلیوں نے لوگوں کی معاشرت۔ ان کے تمدن یا رہنے کے طریقوں میں کیا اور کیسی تبدیلیاں کیں؟

(۳) ان سیاسی انقلابات سے لوگوں کے اخلاق اور اخلاقی زندگی میں کیا کیا فرق پیدا ہو گئے؟

(۴) اردو شاعری کے مختلف دوروں میں عام مذاق شاعری میں کس کس طرح تبدیلیاں ہوئیں اور ان سے اردو شاعری پر کیا اثر پڑا؟

ان چار عنوانوں کے تحت میں اردو شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ سیاسی انقلابات کی وجہ سے کس طرح شاعری میں مقامی رنگ کی جھلک اور اس کا گہرا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

دکن کے ابتدائی دورِ شاعری کو چھوڑ کر اگر ہم ہر ملی کی شاعری پر نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہو گا کہ اس شاعری کے جتنے اہم دور ہوئے انھیں مختلف سیاسی تبدیلیوں سے دوچار رہنا پڑا۔ ولی، سراج۔ داؤد۔ اور ان کے ہم عصروں کو دہلی سے بہت قریبی تعلق نہیں رہا۔ اس لئے ان کی شاعری اس رنگ سے متاثر نہیں ہوئی۔ اس لئے سیاسی حالات کا گہرا اثر ہمیں سب سے پہلے میر اور سودا کی شاعری پر نظر آتا ہے ان دونوں شاعروں کے کلام میں ہمیں جا بجا ایسے اشارات اور تفصیلات ملتی ہیں جن میں اس زمانہ کی سیاسی حالت کی مصوری کی گئی ہے۔ سودا اور میر کا زمانہ وہ تھا جب تیموری شان و شوکت ختم ہو جانے کے بعد شاہ عالم برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے۔ تخت و تاج صرف نام کے لئے باقی تھا مرہٹوں کا اتنا زور تھا کہ بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹ پتلی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ امراء کی حالت ان سے بھی زیادہ خراب تھی۔ شان و شوکت جشم و خدم سب روپے کی بدولت ہے۔ روپیہ ان سے دور بھاگتا تھا۔ اس لئے یہ سب چیزیں بھی معدوم تھیں۔ زمانہ کی اس حالت کی منظم تصویریں ہمیں سودا اور میر کی نظموں میں ملتی ہیں۔ اور انھیں پڑھ کر ہم اُس زمانے کی سیاسی حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میر اپنی ایک مثنوی میں ایک امیر کی حالت بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک سرائے میں جا کر اترے اور جھٹیاری سے کھانا طلب کیا تو اس نے یہ جواب دیا ؎

سُن کے اک دل سے کھینچی آن نے آہ — اور بولی کہ واہ صاحب واہ
ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے — چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے
کچھ یہ کھا دیں گے کچھ کھلا دیں گے — ہم کچھ ان کے سبب سے پا دیں گے
سو تو بنگلے ہو کو رہے با لم تم — ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

ان چار شعروں سے امراء کی حالت کا جو اندازہ ہوتا ہے۔ وہ تو ہے ہی لیکن آخری مصرعے سے شاہ عالم کی حالت کی سچی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

میر نے ایک شہر آشوب میں امیروں کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال — ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال

بادشاہ و وزیر سب قلاش

جتنے ہیں یاں امیر بے دستور — بہر بخشش و سلوک سب مشہور
پہنچا ان تلک بہت ہے دُور — بات کہنے کا واں کسے مقدور

حاصل ان سے نہ دل کو غیر خراش

چار بچے ہیں مستعد کار — دس تنگے جو ہوں تو ہو دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار — ٹوٹ سے کچھ ہے گرمیٔ بازار

سو بھی قند سیاہ ہے یا ماش

امیروں کی حالت کا نقشہ سودا نے مخمس شہر آشوب اور قصیدہ شہر آشوب میں کھینچا ہے مخمس میں کہتے ہیں ؎

سپاہی رکھتے تھے لوگر امیر دولتمند — سو آمدن کی تو جاگیر سے ہوئی بند

کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند جو ایک شخص ہو بامیش صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں خوجداری کول

سیاسی حالات کی یہ مختصر مصوری مقامی اثر کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہے۔ درحقیقت میں یہ کچھ زیادہ اہم بھی نہیں۔ اصل چیز عام لوگوں کی زندگی ہے۔ اسے دیکھ کر ان تبدیلیوں کے انقلاب اثر پہلوؤں کا اندازہ ہوتا ہے اور لوگوں کی حالت دیکھے بغیر پڑھنے والے سیاسی انقلاب کا نقشہ اپنی نظروں میں بٹھا سکتے ہیں۔ یہ سماجی تبدیلیاں سنوداؔ اور میرؔ کے زمانے سے لے کر برابر ہمارے موجودہ دورِ شاعری تک جلوہ نما ہوتی رہیں اور ہمارے شاعروں نے قریب قریب ہر زمانے کی حالت کا نقشہ کسی نہ کسی شہر آشوب میں کھینچا ہے۔ میرؔ اور سوداؔ کے شہر آشوب مخمسوں اور قصیدوں کے کچھ شعروں سے جن میں عام زندگی کے عبرت انگیز پہلوؤں کا ذکر ہے اس انقلاب کو نمایاں کیا جا سکتا ہے ؎

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کوئی تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف دانہ کی خاطر شمشیر جو گھر میں تو سپر بنئے کے یاں ہے
سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت دکھن میں ہکو دہ جو خریدِ صفہاں ہے
شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال دیکھے جو کوئی فکرہ و تردد کو تو یاں ہے
گر عید کا سجدہ میں پڑھے جا کے دوگانہ نیت قطعہ تہنیتِ خانِ زماں ہے
تاریخ تو لد کی رہے آٹھ پہر فکر گر رحم میں سیکم کے سنے نطفہ خاں ہے
ملّا نی اگر کھیچے ملّا کی ہے یہ قدر ہوں دور و پیہ اس کے جو کوئی مژدہ خواں ہے

(سودا)

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال کنجڑے جھینکے ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال ایک تلوار نیچے ہے یک ڈھال

(میر)

نظیر اکبرآبادی نے اپنے ایک مخمس شہر آشوب میں اپنے زمانے کی سوسائٹی کی حالت دکھائی ہے اور لوگوں کی زندگی کی زیادہ چھوٹی جزئیات کا ذکر کر کے ان کی حالت کی مصوری زیادہ نوشطر یقے سے کی ہے ؎

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی کو ٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

اب آگرہ میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیز وایسے بُرے وقت سے پناہ وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ

کسبے ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند
ماریں ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کہ دستکار اور جتنے پیشہ وار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹھے ہے تن لوہار تو پیٹے ہے سر سنار کچھ ایک ورد کے کام کا رد نہیں ہے بار بار
چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار بند

نظیر نے اس کے بعد تفصیل سے بساطی۔ نائی۔ نان بائی۔ مالی اور بہت سے پیشہ والوں کی حالت بیان کی ہے ؎

آمد ہی خادموں کی نہیں بیقروں کے بیچ باسن بھی سر پٹکتے ہیں سب مندروں کے بیچ
عاجز ہیں علم والے بھی سب سُبّ سی کے بیچ حیراں ہیں پیرزادی بھی پڑ نگروں کے بیچ
نذر و نیاز ہو گئی سب ایک بار بند

کیا چھوٹے کام والے و کیا پیشہ ور نجیب روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں غریب
ہوتی ہی بیٹھے بیٹھے ہی جب شام عنقریب اُٹھتے ہیں سب دکاں سے یہ کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند

یہ حالت تو غدر سے کچھ سال پہلے کی ہے۔ غدر کے زمانے میں جو حالت ہو گی اس کا اندازہ کرنا تو اور بھی دشوار ہے۔ البتہ غدر کے بعض حالات اور اس کے اثرات کا اندازہ اسی قسم کی چند نظموں سے کیا جا سکتا ہے۔ راسخ عظیم آبادی داغ۔ حالی اور بعض دوسرے شاعروں نے دہلی کی اس حالت پر جو نوحہ کیا ہے وہ دیکھنے میں ان شاعروں کے آنسو ہیں لیکن ان آنسوؤں کی پردے میں سیاسی انقلابات کے تباہ کن نتائج کی تصویریں ہیں جنھیں پڑھ کر ہم ان حالات کا اندازہ کرتے ہیں۔ حالی نے دہلی کے ان انقلابات پر قوم کے آنسو بہائے ہیں۔ اس طویل مسدس کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

لیکن آخر طبعِ دوراں کا ہے جیسا اقتضا ہر ترقی کی ہے حد پر ابتدا کی انتہا
جب کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا وقت لے جانِ جہاں تیرہ شبی آخر کی آئیگا

تجھ پہ اے وارالخلافۂ انقلاب آنے لگے غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے
طالع مشقت کے پیغام عتاب آنے لگے تیرہ بختی کے نظر بازوں کو خواب آنے لگے
دولت و اقبال کا بند ھنے لگا رختِ سفر

تجھ سے لے دارالعلوم اُٹھنے لگا علم و ہنر
جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی پر نہ کی عرضِ ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی
اس بزرگی سے گزاری تیرہ سو برس تو نے صدی پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دورِ اکبری
علم دین و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر اپنی تو نے چار سو عالم میں دھوم

اس کے بعد حالی نے مختلف پیشوں کے ماہرین اور علوم وفنون کے فاضلوں کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اس کا نوحہ اس طرح کرتے ہیں ؎

یا یہ آج پہنچی ہے ہم میں نوبت انحطاط الرجال ایک اُٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال
دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اسکی مثال ذاتِ باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بے ہمال

ظاہر اب قحطِ آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

حالی کے علاوہ بعض دوسرے شاعروں نے دہلی کی تباہی کے جو مرثیے لکھے ہیں۔ ان میں سے بھی چند شعر نقل کر دینے بے محل نہ ہوں گے ؎

معطل ہے ہر کوئی بے کار ہے فقط مفلسی برسرِ کار ہے
گدائی کا کاسہ لئے دربدر ہیں آوارہ ارباب فضل و ہنر
مشائخ جو ذی عز و تعظیم ہیں دل ان کے بھی صدمہ کش سیم ہیں
غم قوت ہے یاں تلک ہر زباں کہ ہیں رشتہ سبحہ ساں ناتواں
گئے سارے ورد و وظائف کو بھول کیا ایسا فکر شکم نے ملول

وظیفہ ہے ان کا بس اب حرفِ قوت
کئے دانے تسبیح کے صرفِ قوت

بعض شاعروں نے ان سیاسی انقلابات کو غزل کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ انداز وہی غزل کا ہے لیکن حقیقت میں دل کے غم نے مرثیہ کہلوایا ہے۔ اکبر نے اپنی بعض غزلوں میں اس انداز کے شعر کہے ہیں ؎

وہ طرب وہ ساز وہ گانا بدل گیا نیندیں بدل گئیں وہ زمانہ بدل گیا

اکبر ہمارے عہد کا التدرے انقلاب گویا وہ آسمان نہیں وہ زمیں نہیں
وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا۔ وہ مکاں نہ رہے وہ مکیں نہ رہے
نظروں میں لبا ہے رنگِ چمن آنکھیں وہی گلشن ڈھونڈھتی ہیں
موسم وہ نہیں ہے اے اکبر جو بات تھی کل وہ آج کہاں

فلک نے دور بدلا۔ دور نے انسان کو بدلا
گئے ہم تم بدل، قانون بدلا، سلطنت بدلی

اس انقلاب کی تصویریں موجودہ دور کے شاعروں میں سو اکثر کے یہاں ملتی ہیں جنھوں نے سیاسی انقلابات اور ان کی مختلف روشوں کو غزلوں میں نظم کیا ہے۔ مولانا محمد علی اور حسرت موہانی کی بہت سی غزلیں اس انداز کی ہیں بعض غیر معروف شاعروں کی غزلوں میں بھی سیاسی رنگ موجود ہے۔ لیکن ان چیزوں کا ذکر اس سلسلہ میں آئے گا جب ہم مختلف دور کی شاعری پر سیاسی انقلابات کا اثر دکھائیں گے۔ اس ذکر کو سلطنتِ تیموریہ کے آخری تاج دار بہادر شاہ کی غزل کے چند شعروں پر ختم کیا جاتا ہے ان شعروں میں بادشاہ نے سیاسی انقلابات کا شکار ہو کر اپنے دلی جذبات کو لفظی جامہ پہنایا ہے ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا کوئی سُن کے مجھ کو کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں
مرا بخت مجھ سے بچھڑ گیا مرا رنگ روپ بگڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں
کوئی کہہ دو فاتحہ آئے کیوں، کوئی شمع لا کے جلائے کیوں
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں کہ میں بے کسی کا مزار ہوں

سیاسی انقلابات جہاں لوگوں کے طرزِ زندگی میں نمایاں تبدیلیاں کر دیتے ہیں مختلف پیشوں، علوم وفنون۔ تجارت۔ ملازمت۔ شاعری، ہر چیز پر ان کا اثر پڑتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ مہلک نتیجہ ان انقلابات کا وہ ہے جو اخلاقی پستی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ لوگ زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اخلاق کی اُن پست گہرائیوں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں اخلاق کا نام اخلاق باقی نہیں رہتا جس کے بجائے عیب اس کی زینت بن جاتے ہیں۔ بد اخلاقی حکمران ہو جاتی ہے۔ آنکھیں بدیوں کو نیکیاں سمجھنے لگتی ہیں۔ اور لوگ ان پر عامل ہو جاتے ہیں۔

جس دلی کے متعلق حالی نے اپنے مسدس میں یہ لکھا ہے ؎

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام
تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جس پر جا بجا
آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام
شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام
رسم میں آئین میں اوضاع میں اطوار میں
طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں

وہ رہ گیا باہر سے آکر جو تجھ میں چند سال
ڈھل گئے سانچے میں گویا اس کے عادات و خصال

آ کے بن جاتا تھا یاں نقصان انساں کا کمال
تیرے پرچھاویں سے موتی بن کے جاتی تھی سفال
آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یاں
چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یاں

یا یہی وہ سیاسی انقلابات کے پر زور تھپیڑوں سے ایسی پستی کی حالت میں نظر آنے لگتی ہے ؎

کر گئے آداب اور اخلاق سب تجھ سے سفر
گر گیا نظروں سے تیرا سب جلال و جاہ و فر
جھڑ گئے تاج شرف سے تیرے سب لعل و گہر
تجھ کو اے دار الخلافت کھا گئی کس کی نظر

سوداؔ نے بھی اسی کا رونا رویا ہے ؎

گر خان و خواتین کی لے کوئی وکالت
اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ سے کہ عیاں ہے
ہر عمدہ کے دروازے پہ نیوں پوش پہ بیٹھا
پوچھے ہے اجی مرد ہے نواب کہاں ہے

دیوان کے بخشی کے بیوتات کے حاضر
مانند کنھیا کے جہاں دیکھو نہاں ہے
ہر بات پلٹتا ہی رہے صبح سے تا شام
پیپل کے پتے کی طرح منہ میں زباں ہے

میرؔ بھی اس پستی کی مصوری یوں کرتے ہیں ؎

در پہ شہدوں کے ہر دو صعب شر و شور
حرف یکسر فریب و رشوت و غور
بے لئے دیکھیں نے کسو کی اور
مردہ شو پردہ سب کفن کے چور

ہے جنھیں کچھ بھی رویت دربار — سو فریبندہ مکری و غدار
کاذب و مفت پرہے دلآزار — ڈول ان کا ہے یہ کہ کرے خوار
کام اُن کا ہے یہ خراش و تراش

ان انقلابات کا جتنا گہرا اثر غدر کے بعد ظاہر ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اس لئے اس دور کے شاعروں میں سے قریب قریب ہر ایک نے قوم کی اس حالت پر آنسو بہائے ہیں لیکن اس جگہ ہم صرف دو شاعروں کے کلام سے مثالیں لے کر اس اخلاقی پستی کے چند پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے۔ حالیؔ اور اکبرؔ دونوں کے کلام کا انداز جداگانہ ہے لیکن دونوں نے سیاسی پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر برابر اپنی قومی پستی کا اظہار کیا ہے۔ ایک نے آنسو بہائے ہیں۔ دوسرا ان پر ہنسا ہے۔ مقصد اس کا بھی یہ ہے کہ قوم کو اپنی پستی کا احساس ہو۔ اور دوسرے نے بھی جو کچھ کہا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے۔ ان شعروں کو پڑھ کر ہمیں مقامی اڑکا ایک گہرا رنگ شاعری پر نظر آنے لگتا ہے۔ حالیؔ کی مختلف نظموں کے مختصر اقتباسات اس مقامی رنگ کے اندازے کے لئے درج کئے جاتے ہیں۔ پہلے تمہید کے طور پر ان کے چند شعر ان کے بلند مقصد کی ترجمانی کے لئے پیش کرنے مناسب ہوں گے ؎

ختم جب اقبال کا ہوتا ہے دور — سارے بگڑ جاتے ہیں قوموں کے طور
خصلتیں ان کی نہیں رہتیں درست — فرض ادا کرنے میں رہتے ہیں سست

ایسی قوم اپنے ادبار کی حالت میں کیا کیا کرتی ہے ؎

اُسے جانتے ہیں بڑا اپنا دشمن — ہمارے کرے عیب جو ہم پہ روشن
نصیحت سے نفرت ہے ناصح سے اَن بن — سمجھتے ہیں ہم رہنماؤں کو رہزن

یہی عیب ہے سب کو کھویا ہے جس نے
ہمیں ناؤ بھر کر ڈبویا ہے جس نے

نفاق اس پستی کی ایک پہچان ہے ؎

قوم میں جو دیکھئے چھوٹا بڑا — چُھتا ہے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا
سوجھتی ملت کی نہیں کوئی بات — یہ جو کہے دن تو وہ کہتا ہے رات
زید کا ہے عمرو سے ظاہر ملاپ — دل میں بھرا دونوں کے لیکن ہے پاپ

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ — نکی غیروں کی تم چھپڑنے نگاہ
پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے — ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی چڑھ کر کسی نے گھر لوٹا — کبھی آ کر کسی نے زر لوٹا
کبھی اس نے ہے قتل عام کیا — کہیں اس نے ہے آغلام کیا

ملک روندے گئے ہیں پیروں سے
چین کس کو ملا ہے غیروں سے

اس قسم کی بعض اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے قوم اپنے ملک۔ دولت اور اقبال سب سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ نفع کی زیادتی۔ خلوص کی کمی ؎

دوست اس کے ہیں نہ اس کی آشنا گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر
گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم کرتے ہیں رُسوا اسے دل کھول کر

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تا کہ ہو عیب ان کا ظاہر اور اپنا ہنر
دوست اک عالم کے پر مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے خدا یا رو حذر

معاش کی حالت ؎

نوکری ٹھیری ہے لے دے کے اب اوقات اپنی
پلیٹھ سمجھے تھے جسے ہو گئی وہ ذات اپنی
اب نہ دن اپنا رہا اور نہ رہی رات اپنی
جا پڑی غیر کے ہاتھوں میں ہر اک بات اپنی

تنگ ہوتے ہیں تو تقدیر کا کرتے ہیں گلا کبھی ٹھیراتے ہیں گردش کو زمانے کی بُرا
کبھی سرکار کو کہتے ہیں کہ ہے بے پروا کبھی فرماتے ہیں یہ ہو کے شیخ خفا
وعدۂ رزق میں سنتے تھے کہ ہوتی نہیں دیر
پھر جو ذکر نہیں ہوتے تو یہ ہے کیا اندھیر

قومی ہمدردی کی کمی ؎

نہ رنج ان کے افلاس کا ان کو اصلا نہ فکر ان کی تعلیم اور تربیت کا
نہ کوشش کی ہمت نہ دینے کو پیسا اڑانا مگر مفت ایک اک کا خاکا
کہیں ان کی پوشاک پر طعن کرنا
کہیں اُن کی خوراک کو نام دھرنا

حالی نے مختصر طور پر قوم کی جن پستیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان سے جو ذہنی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ بظاہر سیاسی انقلابات کا اثر نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن اکبر کے کلام میں قدم قدم پر ایسے شعر ہیں جہاں ہم ہندوستان والوں کی ذہنی پستیوں کے عبرت آموز مرقعے دیکھتے ہیں۔ ہم میں زمانہ نے اتنی تبدیلی پیدا کر دی کہ قومی اخوت و ملت کی محبت تک دلوں میں باقی نہیں رہی ؎

ملت کا ابر اُٹھ گیا جس قوم کے دل سے اقبال کی سمت اس نے کبھی راہ نہ پائی

جنھیں ہے شرک سے نفرت خدا کو ایک کہتے ہیں
یہ ان میں کیوں ابھی تک جنگ اور تکرار باقی ہے

لوگوں کی سیاسی ذہنیت میں بلندی و ایمان داری کا نام نہیں۔ اس سے بڑی پستی اخلاق اور کیا ہو سکتی ہے۔ لوگوں میں قومی محبت نہیں۔ سیاسی زندگی صرف اس لئے بسر کرتے ہیں کہ یہ شہرت کا زینہ ہے۔ بڑے بننے کا ایک ذریعہ ہے ؎

قومی ترقی کی راہ ہموار کی بیٹھی ہے پہنے جوڑا بھاری
لائی ہیں سکھیاں بھر کر جھولی خوب کھلی ہے برج میں ہولی
جمع ہیں سب بھولے بھالے جاڑوں کا موسم پھولے پھالے
آنکھیں پھاڑے دانت نکالے چندہ دے کر پھنسنے والے
دیکھ کے ایک باضابطہ پبلسٹی دنیا آپ کی جانب لپکی
آپ نے سب کی دولت ہپ کی بزم جمالی خالی گپ کی
دیکھتا ہے اک عمر سے بندا بس یہی باتیں اور یہی پھندا
ہوتا ہے کچھ کام نہ دھندا لاؤ چندا لاؤ چندا

رزولیوشن کی بارش ہے مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

زور بازو نہیں تو کیا اپیچ ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

غدر کے سیاسی انقلاب نے ہم میں جو چیز سب سے زیادہ مہلک پیدا کر دی تھی وہ ذہنی غلامی تھی۔ اس کے بعد موجودہ سیاسی انقلابات نے پھر بیداری پیدا کر دی ہے سا اور اقبال۔ جوشؔ اور بعض دوسرے شاعر آزادی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اکبر کی ذہنی غلامی کی زنجیروں کی جکڑبند کا اندازہ کیجئے ؎

اب اور چاہئے نیشو کے واسطے کیا بات یہی بہت ہے مشرف ہوئے سلام کیا ہم

پاؤں کا ناپا کی کو خوشی اُن کے در پر چست پتلون پہننے سے بھی پنڈلی نہ تنی

وہ کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے۔ ہم کہتے ہیں ہاں ٹھیک
بالفعل تو ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہتے

حکم خاموشی ہے اور میری زباں آپ کی باتیں ہیں میرا امتحان ہے

موجیں ہیں طبیعت میں مگر اٹھ نہیں سکتیں — دریا ہے مرے دل میں مگر بہ نہیں سکتا

ہے جب انقلاب دنیا میں — کیا کہوں بات بھائی صاحب کی
اب وہ تسبیح پر بجائے درود — پڑھ رہے ہیں دہائی صاحب کی

نہ کچھ انتظارِ گزٹ کیجئے — جو افسر کہیں بس وہ جھٹ کیجئے
کہاں کا حلال اور کیسا حرام — جو صاحب کھلائیں وہ چٹ کیجئے
بہت شوق انگریز بننے کا ہے — تو چہرے پر اپنے گلٹ کیجئے

میری نصیحتوں کو وہ شیخ سُن کے بولا — نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں

ہوا آج خارج جو میرا سوال — کہا میں نے صاحب سے باصد ملال
کہاں جاؤں اب میں زرا یہ بتاؤ — وہ جھنجھلا کے بولے جہنم میں جاؤ
یہ سن کر بہت طبع مشکل ہوئی — مگر اس تصور سے تسکیں ہوئی
کہ جب اہلِ یورپ میں بھی ذکر ہے — تو بے شک جہنم بھی ہے کوئی شے

یہی ذہنی غلامی ہے جس کا اثر جب انسان کی زندگی پر پڑتا ہے تو وہ اپنے پرانے طریقوں کو چھوڑ کر نئی باتیں اختیار کر لیتا ہے۔ بلندی سے پستی کی طرف آجاتا ہے اور اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز جسے وہ اختیار کرتا ہے۔ وہ فیشن ہے ؎

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں اکبرؔ — پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

خواہ صاحب کو تم سلام کرو — خواہ مندر میں رام رام کرو
بھائی جی کا نقطہ یہ مطلب ہے — جس میں روپا ملے وہ کام کرو

مرعوب ہو گئے ہیں لایت سے شیخ جی — اب صرف منع کرتے ہیں ویسی شراب کو

شیخ کے دامن کو اکبر نے دیا بوسہ جو کل — ہم نے برکت کیلئے اک سکہ دامن چھو لیا

شکل کوتے کی ہیٹ سولے کی — واہ کیا موج ہے میرے بھولے کی

میرے لئے شراب یہاں بھی ہے کیا حرام — اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

نہ کوئی تحریم باقی ہے نہ پیسا رہا باقی ہے اب دلوں میں
یہ صرف تحریر میں ڈر سر ہے یا جنابِ مکرمی ہے
پا کر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا — سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا
تہمد میں ٹین جب لگنے لگے جب دھوتی سے پتلون اُگا
ہر پیڑ پر اک پہرا بیٹھا ہر کھیت میں اک قانون اُگا
مغربی ذوق ہو اور وضع کی پابندی بھی — اونٹ پر چڑھ کے چلے ہیں حضرت

قاصد ملا جو ان سے وہ کھیلتے تھے پولو — خط رکھ لیا یہ کہہ کر اچھا سلام بولو

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں — بات وہ ہے جو پائی یورپ میں چھپے

ان باتوں کا اثر تو سست اور مذہب پر پڑتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان قوم اور مذہب کی قدیم روایات سے دست بردار ہو کر ایک ایسی زندگی بسر کرنے لگتا ہے جو اپنے ملک کی نہیں بلکہ دوسرے ملک اور قوم کی معلوم ہوتی ہے۔ ملکی خصوصیات کا نام بھی باقی نہیں رہتا ؎

خدا سے منکر نہیں سے غافل کہاں کے پیرو اور امام صاحب
انھیں کے در پہ جھکی ہے خلقت سلام صاحب سلام صاحب

حریفوں سے لگاوٹ کرتے ہیں آپس میں لڑتے ہیں
یوں ہی بربادیاں آتی ہیں یوں ہی گھر بگڑتے ہیں
ٹٹو پہ جس طرح سے ہو بازی کا سا زور جھ — یوں بابوانِ ہند پہ اب ہے نماز و جھ

شاید کہ کبھی ترقی قومی ہے — ہر شخص بجائے خود بنا ہے اک قوم

نہ نماز ہے نہ روزہ۔ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس میں کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے
اپنے بھائی کے مقابل کہہ سے تن جایئے — غیر کا جب سامنا ہو بس قلی بن جایئے

لے شیخ جب نکیل نہیں دست قوم میں — پھر کیا خوشی جو اونٹ مرے ریل ہو گئے

گنگا جی کا بہاؤ تو یکساں ہے — آفت ہے مگر پرا گ والوں جنگ
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ
کہتے ہیں سچ کیا ہے جو باریک ہے وہ پل — بائیسکل پر گزریں گے ہم پل صراط سے

ہے نورِ خدا بھی طالب رزق کا دست — ڈاڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

یہ چیزیں ایسی ہیں جو قوم کے بعض سماجی طریقوں پر بھی اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ہندوستان والوں نے اس سیاسی انقلاب کے دور میں مغرب والوں سے جو کچھ اثر لیا اس کا اثر سیاست۔ مذہب۔ طرزِ معاشرت۔ تمدن۔ اخلاق اور عمل ہر چیز پر پڑا۔ لیکن ہندوستان میں خصوصاً دو چیزیں ایسی ہیں جن کا اثر عام زندگی پر زیادہ نمایاں ہے۔ پردہ اور تعلیم کے قدیم اور جدید مفہوم میں بیحد فرق ہو گیا ہے اور اس فرق نے زندگی کے طریقوں میں بھی کافی فرق پیدا کر دیئے ہیں۔ اکبر کی شاعری ان دونوں تبدیلیوں کے بہت کامیاب اور مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے نمونے ہمارے سامنے پیش کرتی ہے ؎

مردِ جنتلمین ہو کر پاس ہے ہیں جب عروج — بیبیاں پھر گھر میں رنج کس برس کی ہیں میر

پردہ کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم — اللہ کی مار اس پہ علی گڈھ کے حوالے

نہ یہ تبدیلِ شریعت ہے نہ غفلت کا پردہ ہے — رواجِ دولت کی بات ہے حکمت کا پردہ ہے

حسرت بہت ترقیِ دشمن کی تھی انھیں — پردہ جو اٹھ گیا تو وہ باہر نکل گئی

اٹھا یا پردہ تو اکبر کا بڑھا کو نسا حق — بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی مری بہبود کی خاطر سے نہیں — صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید — بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے
نورِ اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ — شمعِ خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم — رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

انجن آیا نکل گیا زن سے — سن لیا نام آگ پانی کا

سیاسی انقلابات اور شاعری

اپنے ہیں سکھا لیں اگر — تب کریں شکر مہربانی کا

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے — جنابِ ڈارون کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب

نظر اُن کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر — گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں ذہنی عقائد پر

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے — مگر یونہی کہ گویا آبِ زمزم موریہ داخل ہے

نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زباں — مطلب یہ ہے کہ سمجھے ان کا فرماں

ہم اردو شاعری کو ادب اور زبان کے ارتقا کے لحاظ سے مختلف دوروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ زبان کا ارتقا تو خیر ایسی چیز ہے کہ وہ سیاسی انقلابات کے بغیر بھی ہوتا رہتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی ایسے انقلابات آتے ہیں کہ وہ زبان کے اندر میں بھی یکبارگی ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے لئے موجودہ دور کو لیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی مثال میں ہم خاص طور پر اکبر کے کلام کو پیش کر سکتے ہیں لیکن جہاں تک خیالات اور شاعری کے مختلف دوروں کا تعلق ہے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہر زمانہ کی تبدیلیاں شاعری پر بھی برابر اپنا اثر کرتی رہتی ہیں اور ان چیزوں کو چھوڑ کر جو شاعری میں محض مادی شکل میں داخل ہو جاتی ہیں۔ شاعروں کے طرزِ نظر اور اندازِ تخیل میں بھی نمایاں فرق نظر آنے لگتا ہے۔ ہم اردو شاعری کے سب دوروں کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد مختلف شاعروں کے ذہنی رجحانات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ بعد کا یہ ذہنی رجحانات سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ میر کی شاعری کے انداز میں سیاسی انقلابات کا اثر ہے۔ اس کے بعد کے دور کی شاعری جس میں انشا۔ مصحفی اور جرأت کی شاعری خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ اسی سیاسی انقلاب کا اثر ہے کہ شاعر لکھنؤ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور اس دربار کے شاعروں کے رجحانات اور ان کے میلانِ طبع سے متاثر ہو کر ایسی شاعری کی جس کا انداز دہلی کی شاعری سے الگ ہے۔ یگانہ کو بھی اسی خاص سیاسی تبدیلی کا مرہونِ منت سمجھنا چاہئے۔ غدر کے بعد کی شاعری پرانے شاعرانہ رنگ سے بالکل الگ ہے۔ غزلوں تک نے اس سیاسی تبدیلی کا اثر محسوس کیا اور شاعروں نے غزلوں کے علاوہ مستقل نظموں میں اپنے ان خیالات کا اظہار نئے طریقوں سے کیا۔ حالی، اکبر، چکبست اور اقبال کی شاعرانہ کوششیں ایسی ہیں جن میں قدم قدم پر ان

تبدیلیوں کا اثر نمایاں ہے۔

شاعروں نے قوم کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر اسے ابھارنے کی کوشش کی۔ وطن کی محبت کا جوش ان کے دلوں میں طرح طرح سے پیدا ہوا۔ شعروں میں انھوں نے اس محبت کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا۔ کہیں قدیم سورماؤں کے جذبۂ وطن پرستی کا بیان کیا۔ کہیں قوم کی قدیم عظمتوں کا ذکر کیا۔ کہیں ایثار و قربانی کا سبق دیا اور کہیں وطن پر فدا ہونے کی تعلیم۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے اس دور میں وطنی شاعری کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں اور اردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس کے کلام میں اس جذبہ کا نمایاں اثر نہ ہو۔ اکبر کی وطن پرستی کے جذبے کا اظہار تو ان تمام مثالوں سے ہو سکتا ہے جو مختلف موقعوں پر اس مضمون میں پیش کی گئی ہیں لیکن دوسرے شاعروں کے یہاں سے مختصر مثالیں لے کر اس کا اندازہ اور بھی بہتر طریقے سے ہو سکتا ہے چکبست کا نام ایسے شاعروں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے ان کی نظمیں تو سرتاپا اس جذبے میں ڈوبی ہوئی ہیں لیکن اس موقع پر غزلوں کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ اس سے اور زیادہ اندازہ ہوگا کہ غزل جیسی صنف بھی اس اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتی ؎

جنون جب وطن کا سر شباب میں ہے — لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
جو مانگنا ہے ابھی مانگ لو وطن کیلئے — یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے — بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — میرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے
چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے — اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

غرور جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا — بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں
زباں سے جوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا — ابلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا
ہم پوجتے ہیں باغِ وطن کی بہار کو — آنکھوں میں اپنی پھول سمجھتے ہیں خار کو

لایا ہے کیا پیامِ وطن پوچھتا ہوں میں — غربت میں دیکھتا ہوں جو ابر بہار کو

دل کے تسخیر بخشا فیضِ روحانی مجھے — حبِ قومی ہو گیا نقشِ سلیمانی مجھے

قوم کا غم مول لے کے دل کا یہ عالم ہوا — یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

اس جذبہ کی مثالیں سرور، محزوں، مہر، نظر، حفیظ، جوشؔ اختر اور اس کے علاوہ اکثر شاعروں کے یہاں ملتی ہیں۔ اقبال کا کلام اس رنگِ تخیل سے بھرا ہوا ہے مان کی شاعری کا ایک دور ایسا ہے جس میں ہندوستان کی حب وطن کا جذبہ موجود ہے۔ ایسی نظموں میں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ان کی شاعری کے متوسط اور آخری دور کا انداز بالکل ہی جداگانہ ہے۔ متوسط دور میں ان کی سیاسیات پر پیغام عمل کا غلبہ ہے۔ اور اسے بھی کسی حد تک ہندوستان کی سیاسی فضا کا اثر سمجھنا چاہئے۔

موجودہ دور شاعری پر اس حیثیت سے سیاسیات نے جو گہرا اثر کیا ہے اس کی اگر صرف مثالیں ہی جمع کی جائیں تو دفتر کے دفتر جمع ہو جائیں اس لئے اس دور کی شاعری کے ان اثرات کو نمایاں کرنے کے لئے اور مثالوں کا لکھنا فضول سا ہے۔

اب تک ہم نے سیاسی انقلابات کے تحت میں شاعری کے جن جن پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے انھیں دیکھ کر اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیاسی تبدیلیاں کن کن مختلف طریقوں سے شاعری پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

سیّد وقار عظیم

رباعی

تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے
خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے
اب آخرِ عمر میرؔ جی کی خاطر
سجادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے

میرؔ

غزل

تقدیر بگڑتی جاتی ہے گو بات بنائے جاتے ہیں
وہ اُتنے ہی رُوٹھے جاتے ہیں ہم جتنا منائے جاتے ہیں

وہ جا کے نہیں اب آنے والے طوریہ پائے جاتے ہیں
ہنستے ہیں تسلی دینے کو پر اشک بھی آئے جاتے ہیں

صد شکر کہ فرقِ حُسن و عشق اعجازِ وفا نے میٹ دیا
میں جلووں میں کھویا جاتا ہوں وہ مجھ میں سمائے جاتے ہیں

محفل بھی وہی ساقی بھی وہی قسمت ہے مگر اپنی اپنی
کچھ ہیں جو بلائے جاتے ہیں ہم ہیں کہ اٹھائے جاتے ہیں

ہے باغ سے ہم کو کیا مطلب اب پھول کھلیں یا آگ لگے
جن تنکوں نے رشتہ جوڑا تھا چُن چُن کے جلائے جاتے ہیں

بیتاب نگاہیں لوٹ رہی ہیں پردہ در پر حسرت سے
اور آنے والے آنکھ بچا کر دل میں سمائے جاتے ہیں

ہے پیرہنِ صد پارہ میں خوشبو یہ کسی کے گیسو کی
بیگانہ ہوا جاتا ہوں جہاں سے غش پہ غش آئے جاتے ہیں

باتوں سے مروت کے رشتے وہ توڑ رہے ہیں ہنس ہنس کر
آنکھوں سے محبت کے ساغر بھر بھر کے پلائے جاتے ہیں

رہ رہ کے دھڑک اُٹھتا ہے کلیجہ سانس الجھتی جاتی ہے
اے موت ٹھہر تعجیل نہ کر دم بھر میں وہ آئے جاتے ہیں

کیفی کوئی اس کو جی سے مرے پوچھے کہ شبِ وعدہ میں چراغ
کس طرح جلائے جاتے ہیں کس طرح بجھائے جاتے ہیں

سید اظہر حسین رضوی کیفی اعظمی

کیا تمہیں یاد نہیں۔؟

شدت کی گرمی تھی۔ بوڑھا سکھو دُکان سے ایک پیسے کا تمباکو لینے گیا تھا۔ اب گھر کو واپس جانا اسے بہت دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ آخر ایک ہاتھ میں چلم اور دوسرے میں سونٹا لئے وہ چل پڑا۔

"مجھے افسوس ہے" وہ بڑبڑایا۔ "کہ میں نے لڑکوں میں سے کسی ایک کو کیوں نہ تمباکو لینے بھیجا۔"

چلتے چلتے وہ یک دم ٹھہر گیا۔ جمائی لی اور پھر کہنے لگا۔ "لیکن انہوں نے پیسہ خود رکھ کر تمباکو کی بجائے مجھے مکا سا جواب دینا تھا۔ ہائے میرے اپنے گھر میں ہی میری کوئی قدر نہیں۔ اُف گرمی سے تن بدن پھنکا جاتا ہے ذرا دم لے لوں پھر چلوں گا۔"

اس کی عمر ستر برس سے زائد تھی۔ کبھی وہ قوی ہٹے اور گٹھیلے بدن کا جوان تھا لیکن اب تو سکڑا ہوا اور اس کا جسم کمزور و ناتواں ہڈیوں کا ایک مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس کی ناک بیٹھ گئی تھی اس کا نچلا لب ایک طرف لٹک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے تقریباً ہر وقت پانی ٹپکتا رہتا تھا۔ اس کے کپڑے لیڑ تھے اور جا بجا مختلف رنگوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کے نوجوان بیٹوں کی کریپ اور بوسکی کی قمیصیں گاؤں بھر میں مشہور تھیں۔

تھوڑی دور چل کر ایک بڑ کے درخت کے سائے میں سستانے بیٹھ گیا۔ اس نے پاؤں پھیلا کر ایک ٹانگ دوسری کے اوپر رکھی۔ دھوپ اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن اس کے جسم کا باقی حصہ محفوظ تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ہائے" اس نے کہا۔ "جسمانی طاقت کھو کر انسان کتنی بے بسی کے عالم میں ہوتا ہے۔"

ایک سوکھی ٹہنی لے کر وہ چلم صاف کرنے لگا۔ اچھی طرح کھرچ کر اس نے چلم کے پچھلے حصے پر منہ رکھ کر پھونک ماری۔ ساری میل نکل کر سامنے جا گری۔ چلم کو زمین پر رکھ کر وہ کرتی کی جیبیں تمباکو نکالنے کے لئے ٹٹولنے لگا۔ لیکن پڑیا میں بندھے ہوئے آدھی چھٹانک تمباکو کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ کھڑے ہو کر اس نے پگڑی اتار کر جھاڑی۔ کرتی اتار کر دیکھی۔ پرنے کو کاندھے سے اتارا۔ دھوتی میں تلاش کیا لیکن تمباکو نہ ملا۔

"چور کے بچے رام نے پیسہ بھی رکھ لیا اور تمباکو بھی۔ بنئے کی ذات ہی ایسی ہے۔ اپنی گرہ کے پکے اور دوں کا دیوالہ نکال دیں۔"

زمین پر گرے ہوئے پرنے کو پھر ٹٹولا۔ نیچے پڑیا محسوس کی اور چلا اٹھا۔ "یہ رہا میرا تمباکو۔ کون جان سکتا تھا یہ یہاں ہوگا۔" پرنے کو اٹھاتے ہوئے پڑیا نیچے لیتا ہوا وہ بیٹھ گیا۔ پرنے کو دیکھا تو پڑیا ندارد۔

"رام۔ رام یہ پھر کون تمباکو اٹھا لے گیا۔؟"

سوٹے سے زمین کوٹتے ہوئے اس نے تلاش از سرِ نو جاری کی۔ ایک بوڑھی عورت سامنے سے گزر رہی تھی ٹھٹھک کر بوڑھے کی حرکات کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن خدوخال اور چہرے کا شگفتہ پن اب بھی ببانگِ دہل اعلان کر رہے تھے کہ وہ جوانی میں کتنی کافر جمال ہوگی۔ اس کے تناسبِ اعضا سے پتہ چلتا تھا کہ ان کی مالکہ بھی بے حد حسین تھی۔ کالا دوپٹہ اوڑھے تھی۔ گھونگٹ نکال رکھا تھا۔ اگرچہ جیٹھ کا مہینہ تھا لیکن اس کے پیروں میں کوئی جوتی نظر نہیں آتی تھی۔

وہ بوڑھے کے عین مقابل آکر کھڑی ہو گئی اور دفعتہً اسے پہچان کر گھونگٹ اٹھاتے ہوئے اس نے ہاتھوں کو ڈرامائی انداز میں آگے لے جا کر پھر پیچھے کیا۔

"الٰہی شور نہ کرے" وہ بولی۔ "تم سکھ لال تو نہیں ہو۔ رام رام سکھ بھائی"

"رام۔ رام کون سے گاؤں سے آرہی ہو؟"

"ارے تم نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"ہوں"۔ بوڑھا بولا۔ "میں کسی کو بھی آج کل نہیں پہچانتا۔ ہر کوئی میرا مذاق اڑانے پر تلا ہوا ہے۔ کونسے گاؤں کا تم نے نام لیا؟"

"کیا تمہارا مطلب ہے۔ تم نے مجھ کو ــــــ سکھ دئی کو نہیں پہچانا؟"

"اوہو۔ اچھا یہ تم ہو۔ گھر سب راضی خوشی ہیں نہ؟"

"واہ رے۔ کیا تمہیں اچھی طرح معلوم نہیں کہ میں اکیلی رہتی ہوں اور میرا کوئی عزیز رشتے دار دنیا میں نہیں؟"

"سوگند لے لو اگر میں نے تمہیں پہچانا ہو تو۔"

"تم جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہو" بوڑھی اپنے ہاتھوں کو جھٹکا دیتے ہوئے بولی "اور یہاں کیا ڈھونڈ رہے تھے؟"

"ہوں میں کیا ڈھونڈ رہا تھا؟"

"میں نے تمہیں زمین پر ادھر اُدھر کچھ ڈھونڈتے دیکھا ہے۔"

"اجنبیوں کی تفتیس المزاجی مشہور ہے اور تم مجھے کھیلتے دیکھ رہی تھیں؟"

"بڑے نادان معلوم ہوتے ہو۔"

"اور کیا تمہا کو کھو کر شادیانے بجاؤں؟"

"ٹھیک" بوڑھی نے باہیں اپنی کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم کچھ کھو بیٹھے ہو۔ تبھی تو سوٹے کو زور زور سے زمین پر پٹک رہے تھے۔ اہا تمہارا سارا رنگ روپ کدھر گیا؟"

"ابھی پڑیا میرے ہاتھ میں تھی اور اب بجانے اسے کون اٹھا لے گیا؟"

"ذرا ٹھہرو۔ مجھے تلاش کرنے دو۔"

بوڑھی نے اِدھر اُدھر آنکھیں گھمائیں اور ایک ٹہن اٹھاتے ہوئے بولی "یہ کیا ہے؟"

"یہ ٹہن ہے۔ لاؤ مجھے دے دو۔ منوکو دوں گا۔ بڑا خوش ہوگا۔"

"پڑیا تو کہیں نظر نہیں آتی تم ذرا ادھر ہٹو نا۔"

اس نے بوڑھے کو کندھے سے پکڑ کر پرے ہٹایا۔ پڑیا نیچے پڑی تھی۔ وہ اُسے اٹھا کر فاتحانہ نگاہوں سے بوڑھے کی طرف دیکھنے لگی لیکن بوڑھے نے سکریے کا ایک لفظ کہے بغیر پڑیا لے لی۔ وہ اس کی بائیں طرف ایڑیوں کے بل بیٹھ گئی۔ بوڑھا تھوڑا سا تنکا کو لے کر تیلیوں سے ملنے لگا اور پھر اس کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے چلم میں تمباکو ڈالنے لگا۔ وہ اُسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ اُس کے دانتوں سے بھنچے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں آدھی کھلی اور آدھی بند تھیں۔ پھر دوپٹے کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولی۔

"سکھو۔ سچ سچ بتانا کیا تم مجھے جانتے نہیں؟"

بوڑھے نے لاپروائی سے اس پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

باتیں بنانا کوئی تم ہی سے سیکھے۔"

"تو کیا تم مجھے سچ مچ بھول چکے ہو؟" بوڑھی نے ذرا پریشان سا ہو کر کہا۔ "ہے پرماتما! سکھو پچیس برس ہوئے جب میں نے تمہیں آخری بار دیکھا۔ اور تم تب مجھے خوب جانتے تھے۔ اگرچہ تم تیوری چڑھائے میرے پاس سے گزر گئے۔ وہی تیوری جو میری شادی کے بعد تمہارے ماتھے پر اکثر نظر آتی تھی۔ مجھ پر جو جو تکالیف گزریں وہ تمہارے دل سے کدورت دور نہ کر سکیں اور اب آج شاید تمہارا حافظہ کمزور ہو چکا ہو کہ مجھے پہچانتے تک نہیں رہا۔ مے تم تھے کیا اور ہو کیا گئے۔ تمہارا جسم روندے ہوئے پودے کی طرح ہے۔ اگرچہ وہ دن بھول نہیں گئے جب تمہارے سنہری گھنگریالے بال تمہارے ماتھے پر لہرایا کرتے تھے۔ تمہاری آنکھیں ایک بے پایاں سمندر کی مانند تھیں جس پر سورج کی کرنیں متبسم ہوں۔ کہتے ہیں ماضی کی خوشگواری اور حال کی تلخی کا ذکر کرنا بے سود ہوتا ہے۔ لیکن سکھو تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میرے دل پر جو گزر رہی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔"

کوئی دلچسپی نہ لیتے ہوئے بوڑھے نے ایک دیا سلائی جلائی اور چلم پر رکھ کر کش لگانے لگا۔ کش لگاتے ہوئے اس کے کھوکھلے رخسار ابھر آتے۔ تمباکو نے جب اچھی طرح آگ پکڑ لی تو دیا سلائی ایک طرف پھینک کر اس نے چلم کا لمبا منہ کو اپنی بائیں سے پکڑ لیا۔

"کیسی لایعنی گفتگو!" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "تم ہو کون؟"

بوڑھی نے ایک طرف گرے ہوئے دوپٹے کو احتیاط سے سر کے گرد لپیٹا اور آہستہ سے چھینک ماری۔ آنچل سے ناک صاف کی۔ بوڑھا اس اثنا میں چلم منہ سے ہٹا کر اس کی طرف بے نگاہ غائر دیکھ رہا تھا۔ پھر حقہ کا کچھ پڑبڑایا اور پگڑی کو آنکھوں پر ادر جھکا لیا۔

"کیا تمہیں یاد نہیں۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ کبھی تم مجھ پر جان دیتے تھے۔" بوڑھی نے قدرے مشتعل ہو کر کہا۔ "میں تمہاری طرح نہیں۔ مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ گزشتہ واقعات آن کی آن میں میری آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ سچ مچ تمہیں یاد نہیں؟ واقعی تم فراموش کر چکے ہو۔ اُف وہ دن ——— اس دن میں گائے کا دودھ دوہ رہی تھی جبکہ تم گھوڑے پر سوار پاس سے گزرے۔ تم پیاسے تھے۔ میں نے تازہ دودھ کا ایک پیالہ بھر کر دیا۔ تم مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ وہاں اور تب سے میں تمہاری داسی بنی۔ کیا تمہیں وہ شام یاد نہیں؟"

"ہوں۔ ہوں۔" بوڑھے نے ہاتھ سے پیشانی کا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ "کونسی شام کا تم ذکر کر رہی ہو؟"

"سکھو۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ ہم جوہڑ کے پاس، میرے باپ کے کوئیں سے بائیں جانب، کیکر اور بھلاوے کے درختوں کے نیچے ملا کرتے تھے۔ میں ہر رات وہاں آتی۔ تم میرا انتظار کیا کرتے تھے یا نہیں؟"

میں کب گھر سے باہر نکلتا ہوں؟ میں تمہارا انتظار کیا کرتا تھا؟ وہ کس شے؟

نہیں آج یا کل کی باتیں نہیں کر رہی۔ یہ تو چوالیس سال پیشتر کا واقعہ ہے مجھے خوب یاد ہے میں سولہ اور تم پچیس برس کے تھے۔ سکھو یہ صرف شراب پینے اور ہر وقت لڑتے رہنے کا نتیجہ ہے کہ تم اس کمزور حالت میں ہو۔"

"آر۔ رر۔ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ دو چار قطرے چکھ لینے سے آدمی شرابی نہیں بن جاتا۔"

"اور تم چار دفعہ جیل بھی ہو آئے ہو نہ؟ یاد نہیں جب تم اپنے ساتھیوں سمیت آئے اور مجھے میرے گھر سے نکال لے گئے اور تم نے ہنسو کو لاٹھی سے اس بری طرح پیٹا کہ اس نے تین مہینے ہسپتال میں گزارے اور تمہیں چھ ماہ کے لئے قید کر دیا گیا؟"

"کون؟۔ میں!" بوڑھے نے چلم پیتے پیتے رک کر کہا۔ "میں قید ہوا؟ کب؟ کیسے؟"

"ارادۂ قتل اور اغوا کرنے کے جرم میں۔"

بوڑھے کے چہرے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔ اس نے دایاں ہاتھ زور سے ران پر مارا۔

"ہاں۔ ہاں۔" اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد ہے ہنسو واقعی بے حیا ہے میں نے اسے پیٹا۔ وہ اس کا مستحق تھا۔ سرسے پاؤں تک ریاکاری کا مجسمہ! میں نے اسے پیٹا۔ اور خوب پیٹا۔ مجھے اپنی قسم۔ مجھے پروا نہیں خواہ کوئی بھی سُن لے۔ ایک دن تھا جب میں نہتا گاؤں کے مسلح مسٹنڈوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔"

"لیکن کیا تمہیں وہ رات یاد نہیں جب تم ہمارے گھر آئے؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا اور تھوڑی دیر ٹھہر کر بولا۔

"گرمی کسی قدر زیادہ ہے۔ تن بدن میں آگ سی لگ رہی ہے۔"

کتنے انجان بن رہے ہو تم اپنے بچاؤ اور گاؤں کے دو آدمیوں کے ساتھ آئے۔ میرا رشتہ مانگا لیکن میرے باپ نے انکار کر دیا۔ ایک شرابی کو جس کے پاس اپنا بدن ڈھانکنے کے لئے کپڑا میسر نہیں میں اپنی بیٹی دے دوں؟ اس نے کہا تھا۔ ہمارے پاس تب چار بھینسیں اور دو گائیں تھیں۔ ہم امیروں کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے۔ یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ میرے باپ کی ساری جائیداد کا وارث میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ وہ مجھے نمبردار کے لڑکے ہنسو سے بیاہنا چاہتا تھا اور آخر ہنسو ہی سے میری شادی ہوئی۔"

"ارے یہ کیا؟ تمباکو اتنی جلدی جل گیا؟ میری چلم بجھ چکی ہے۔" بوڑھے نے ذرا متحیر ہو کر کہا۔

"بجھنے دو۔" بوڑھی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "خواہ تمہیں یاد نہیں لیکن یہ حقیقت ہے جو میں بیان کر رہی ہوں۔ اتنی مدت بعد تم سے باتیں کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ جب انہوں نے میری شادی ہنسو سے کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تو میں نے تمہیں آگر بتایا۔ تم نے کہا خواہ کچھ بھی ہو تمہارے ہاتھوں سے مجھے کوئی چھین کر نہیں لے جا سکتا۔ برات آئی ڈھول بجے۔ دیگیں چڑھیں لیکن دفعتہً گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں تم نے مجھے زور سے پکارا۔ اب تک رات ہو چکی تھی۔ تمہارا چچا اور بیس تیس آدمی تمہارے ساتھ تھے۔ تم نے کواڑ لاٹھیاں مار مار کر توڑ ڈالے۔ ایسا واقعہ نہ ہوا اور نہ اب کبھی سننے میں آیا ہے۔ تم اس کمرے میں لاٹھی گھماتے آن گھسے جہاں میں اپنی ماں اور دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کوئی بھی تمہیں روک نہ سکا اور میں بھی تمہارے ساتھ جانے میں خوش تھی۔ تم مجھ کو گھوڑے پر بٹھا کر لے بھاگے اور اپنے گاؤں لے آئے۔ دوسرے دن پولیس آئی۔ ہم تمہارے چچا کے گھر چھپے ہوئے تھے۔ ہر ایک کو گرفتار کیا گیا۔ مجھے واپس میرے گھر پہنچایا گیا۔ آہ۔ وہ رات کتنی خوفناک تھی سکھو اور تم کہتے ہو مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔"

بوڑھے نے چلم از سرِ نو صاف کی۔ بنیا تمباکو ڈالا۔ بوڑھی کی طرف دیکھا اور پھر کچھ جواب دئے بغیر اسے سلگانے میں مشغول ہو گیا۔

"تم پھر چھ ماہ کے لئے قید کئے گئے۔" بوڑھی حلق صاف کرتے ہوئے بولی۔ "ہنسو کے صحت یاب ہوتے ہی ہماری شادی ہو گئی۔ میں اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ ایسا کرنے پر میں مجبور کی گئی۔ میں دن رات روتی رہتی تھی۔ سارے فساد کی جڑ میں تھی لیکن تقدیر کے اٹل فیصلے کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ سب کچھ اتنی جلد ظہور پذیر ہوا کہ کچھ سوچنے یا کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ ہنسو کے ساتھ میری ازدواجی زندگی کتنی تلخ اور نا خوشگوار تھی اور میری اور تمہاری

محبت کا انجام اس افسوسناک طریق پر ہوا۔ داستانِ الفت کی یاد فرسودہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے رس ہوتی چلی گئی۔ ہنسو بدقماش تھا۔ جلد ہی اندرونی بیماریوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔"

یہ کہتے کہتے بوڑھی کے آنسو نکل پڑے جنہیں وہ دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔ بوڑھا بے چینی سے اِدھر اُدھر ہل رہا تھا اور لگاہے گا ہے اس کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ اس کو روتے دیکھ کر وہ ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"بیچاری۔ دیکھا۔ بڑی مصیبت زدہ دکھائی دیتی ہو۔"

"آہ" بوڑھی نے اور بھی زیادہ رو کر کہا "آج تمہیں دیکھ کر بھی ہوئی آگ ایک ہی دفعہ بھبک کر جل اٹھی ہے۔ دل پر اک بوجھ سا پڑ گیا ہے۔ باتیں کرنے سے یہ اور بھی گراں بار ہو گیا ہے۔ کاش میں تمہیں دیکھے بغیر تمہارے پاس سے گزر جاتی۔"

وہ اُٹھ بیٹھی۔ بوڑھے کی طرف ایک دفعہ اور اس نے مشتاق نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور اس کے لب بے رنگ تھے۔

"میں اب جاتی ہوں۔ سکھو کیا مجھ سے ایک لفظ محبت بھی نہ کہو گے جس سے میں سمجھ سکوں کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔"

بوڑھے نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"رام تمہارا بھلا کرے۔"

"پریشر تمہیں سکھی رکھے۔" اس نے جواب دیا اور چل پڑی۔ جب تک وہ نظر آتی رہی وہ اُسے دیکھتا رہا۔ اس کے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہی تھی!"

اس کے چہرے پر چند لمحوں کے لئے ذہنی کشمکش کے آثار نمودار ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بہت غور و خوض کرنے کے بعد بھی اسے چنداں کامیابی نہ ہوئی۔

وہ لڑکھڑا کر اٹھا اور سوٹا سنبھالتے ہوئے گھر کی طرف چلنے لگا۔

اقبال

کوئل

اے مُرغِ چمن، مُرغِ حزیں، مُرغِ الم ریز
شوریدہ و آشفتہ و بیزار و سحر خیز
غمناک گلستاں میں فقط تو ہی نہیں ہے
کیا تجھ کو خبر ہے کہ مرا دل بھی حزیں ہے
پُر دردیوں ہی نغمہ کا انداز ہے میرا
خمخانۂ عالم میں تو ہم ساز ہے میرا
تعمیر ہے اس بستیٔ کہنہ کی الم سے
اس ساز کا ہر تار ہے پُر نوحۂ غم سے
لبریزِ مئے درد سے ہر گُل کا سبُو ہے
رگ ہائے گُل تر میں مرے دل کا لہو ہے
اندوہ کا بے تھاہ سمندر ہے زمانہ
رسوائی فطرت ہے مسرت کا ترانہ

مسعود شاہد

رشک

"میرے کپڑے جلدی نکالو"

"رات کے نو تو بج چکے ہیں۔ اب کہاں جاؤ گے"

"سنیما اور کہاں"

"میں اس وقت کپڑے نہیں نکال سکتی"

"کیوں"

"مجھے نیند آ رہی ہے"

"اگر سنیما نہ جاؤں تو تمھاری نیند کھل جائے گی"

"زیادہ باتیں مت کرو۔ مجھے سونے دو"

"تمھیں شرم نہیں آتی۔ گستاخ کہیں کی"

"سنیما تمہیں جانا ہے اور کپڑے میں نکالوں"

"کپڑے نکالو"

"خود نکالو۔ مجھے نیند آ رہی ہے"

"اچھا لاؤ۔ دو چابی میرے بیگ کی"

"میرے پاس نہیں ہے"

"اور کس کے پاس ہے۔ شام کو تمھیں نے میرے بیگ میں ٹافیاں رکھی تھیں"

"مجھے یاد نہیں کہاں رکھ بیٹھی ہوں"

"ڈھونڈو پھر اٹھ کر"

"مجھے مت ستاؤ۔ مجھے سونے دو"

"دیکھو پیاری سوا نو کا وقت ہے جلدی کرو۔ ورنہ مجھے دیر ہو جائے گی۔ اٹھو اچھی زرینہ"

"میں بری زرینہ ہی اچھی ہوں۔ روز رات کے بارہ بارہ بجے آتے ہو اور پھر طرزِ کلام تو دیکھیے"

"پیاری زرینہ آج جب میں سنیما سے واپس آؤں گا تو تم بڑی خوش ہو گی"

"ہاں مجھے کانوں کے کانٹے جو مل جائیں گے"

"تم اٹھو تو سہی"

"پھر وہی بات"

"اچھا سو رہو آرام سے میں بھائی سلیم کے ہاں جاتا ہوں۔ وہ لوگ تاش کھیل رہے ہوں گے بس رات کٹ جائے گی زرینہ تم فکر نہ کرو میں سنیما نہیں جاؤں گا"

"نہیں نہیں۔ پیارے رشید میں کپڑے نکالتی ہوں تم سنیما چلے جاؤ"

"اب میں وہیں جاؤں گا اور صبح آؤں گا۔ تاکہ تمھاری نیند میں خلل انداز نہ ہوں"

"خدا کے لئے وہاں مت جاؤ"

"کیوں نہ جاؤں"

"اس لئے کہ میں تمھیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ اس کی بیوی جادوگرنی ہے کہیں تمھیں کوئی تعویذ نہ کھلا دے۔ ریحانہ کہتی تھی کہ اس نے بلقیس کے خاوند کو کچھ کھلا دیا تھا اب وہ بیمار پڑا ہے"

"میں ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا میں ضرور جاؤں گا"

"تمھارے قدموں پر گر کر کہتی ہوں کہ خدا کے لئے وہاں نہ جاؤ۔ مجھے میری گستاخی کی معافی دے دو اور سنیما چلے جاؤ آخر میرا مطلب تو یہی تھا کہ تم سنیما نہ جاؤ گے تو میرے پاس رہو گے"

"اچھا لاؤ۔ دو چابی"

"تمہیں رشید۔ میں خود کپڑے نکال کر دیتی ہوں"

"اب اپنے بھی نکالو"

"کیوں"

"آج سلیم نے BOX کا پاس بھیجا ہے تم بھی میرے ساتھ چلو مگر تمھیں تو نیند آ رہی ہے"

"نہیں پیارے کہیں تمھیں تو نہیں آ رہی۔ اب؟"

عزیز مسعود

جامِ صہبائی

(۱)

ہر نقش میں حسن کی درخشانی ہے
ہر نغمہ سرور و سازِ ربانی ہے
ہر گوشۂ چشم گوشۂ مستی ہے
ہر مستی میں سرورِ دل کی فراوانی ہے
کیا نغمہ و نوری کیا فراوانی ہے

(۲)

ہر جلوے میں ہیں ہزار سامانِ جنوں
ہر نگاہ فضل سے طوفانِ جنوں
کیا دامنِ عقل سے الجھے ہیں پیر
جاری ہے دلوں سے آج فرمانِ جنوں

(۳)

باغوں میں ہیں جمع گلعذارانِ بہار
جلوے ہیں کہ رنگ و بو کے میخانے ہیں
فردوس میں جلوہ گر ہیں حورانِ بہشت
نظروں میں ہیں سرمہ سیاہ مستانِ بہار

(۴)

اخلاص و وفا کو عام کرنے یارب
تاریک دلوں میں نور بھرنے یارب
ہر چیز میں دیکھے جو تیرا جلوہ
وہ دیدۂ دل کو وہ نظر دے یارب

اثر صہبائی

فاروقِ اعظم رضؓ کا ایک سفر

[حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے واقعاتِ سفر کی طرف آپ کے اردو سوانح نگاروں نے بہت کم اعتنا کی ہے۔ تاآنکہ آپ کی جامع اور مکمل سوانح حیات الفاروق میں بھی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے حالاتِ سفر قلم انداز فرما دیئے ہیں۔

حضرت فاروق اعظم اپنے زمانہ جاہلیت کے واقعاتِ سفر اکثر قصے کے طور پر بیان فرمایا کرتے تھے۔ ہم عہدِ جاہلیت میں آپ کے سفرِ شام کا ایک دلچسپ واقعہ جو آپ نے اپنی زبانِ مبارک سے بیان فرمایا تھا دمشق کے مشہور اور بلند پایہ عربی مجلہ "المجمع العلمی" ۱۹۲۹ء سے اردو میں منتقل کرتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے اسناد و رواۃ قلم انداز کئے جاتے ہیں۔ "یحییٰ"]

حضرتِ فاروقِ اعظم فرماتے ہیں :-

ایک مرتبہ میں نے تجارت کی غرض سے ملکِ شام کے لئے رختِ سفر باندھا اور قبیلۂ قریش کے ایک قافلے کے ساتھ جس میں ابوسفیان بن حرب بھی تھے ہم عازمِ شام ہوئے جس وقت ہمارا قافلہ شام میں داخل ہوا تمام بازار اٹھ چکے تھے۔ اب صرف ہمارے سامان تجارت باقی رہ گئے تھے۔ لوگوں نے ہمیں صلاح دی کہ اگر تم دمشق چلے جاؤ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہو۔ ہم نے دمشق کا رخ کیا۔ وہاں پہنچے۔ بازار لگایا۔ سامانِ تجارت فروخت کیا اپنے شہر کی ضروریات کے مطابق چیزیں خریدیں اور واپسی کیلئے روانہ ہو پڑے۔ ہمارے قافلے نے ابھی تھوڑی ہی مسافت طے کی ہوگی کہ مجھے اپنی کمر سے بندھی ہوئی سونے کی تھیلی کا خیال آیا۔ یہ سونا ہماری ایک تراب اغریب خاتون نے دیا تھا۔ اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ اسے فروخت کر کے اس کے لئے کپڑے وغیرہ لیتا آؤں۔ میں نے اپنے رفقائے سفر سے کہا کہ آپ لوگ میری واپسی تک اس جگہ انتظار کریں اور اپنی وہ ضرورت بیان کی جس کی خاطر میرا پھر دمشق جانا ضروری تھا۔ ہمارے رفقائے سفر نے کہا :" اچھا جاؤ! ہم تمہارا یہاں انتظار کریں گے۔ مگر بھائی ہمیں یہاں مقید ہی نہ کر دینا!"

میں وہاں سے روانہ ہوا۔ اور جس وقت دمشق پہنچا شام ہو چکی تھی وہاں ایک سرائے میں اقامت اختیار کی کہ رات بسر کر لینے کے بعد صبح کو جس مقصد سے آیا ہوں اسے پورا کروں گا۔

اس اثنا میں کہ میں وہاں سویا ہوا تھا ایک شخص آیا اور اپنے پاؤں سے مجھے ہلایا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے پوچھا تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟" میں نے کہا" ایک مسافر ہوں ایک ضرورت سے یہاں آیا ہوں"

اس نے کہا" میرے ساتھ میرے گھر چلو!"

میں اس کے ساتھ اس کے مکان پر گیا۔ اس نے میری نہایت پر تکلف ضیافت کی۔ میں نہایت عافیت سے اس کے ہاں شب باشی ہوا میں تو اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور وہ تمام رات نمازیں پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح کر دی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا :-

"تم بازار اس وقت تک ہرگز نہ جانا جب تک میں تمہارے ہمراہ نہ چلوں۔ دیکھو! میری حیثیت میں اپنی ضرورت پوری کرنا! (اس نے یہ اس لئے کہا تھا کہ وہ مہمانوں کے مال و اسباب کی حفاظت بھی لٹ جانے کے خوف سے کیا کرتا تھا حضرت فاروقِ اعظم فرماتے ہیں کہ پھر وہ سو گیا کیونکہ اس نے ساری رات شب بیداری میں گزاری تھی میں اس کا جگانا نامناسب سمجھ کر اور یہ خیال کر کے کہ اگر اس کے جاگنے کا انتظار کرتا ہوں تو اپنے رفقائے سفر سے چھوٹ جاؤں گا عجلت سے کام لے کر بازار چلا آیا۔ یہاں پہنچ کر دیکھتا ہوں کہ اہل بازار ابھی نہیں آئے ہیں میں ان کا انتظار کرنے لگا،

ناگاہ ایک رومی بطریق سامنے نظر آیا۔ اس کے ساتھ اس کے ملازموں کی ایک جماعت تھی وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر سمجھ گیا کہ میں مسافر ہوں اور اپنے ملازموں کو حکم دیا: "اس کو پکڑ لو!" یہ گرجے کا کام بہت اچھی طرح کر سکتا ہے۔ وہ مجھے پکڑ کر گرجے تک لائے۔ اس کی عمارت کچھ گر گئی تھی۔ مجھے تھوڑا دے کر کہنے لگے اس کو توڑ دو! میں تمام دن کام کرتا رہا جب شام ہوئی تو مجھے چھوڑ دیا۔ میں پھر اپنی اسی سرائے میں آیا اور نہایت شکستہ حالی میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہی شخص جس نے اپنے گھر مجھے مہمان رکھا تھا پہنچا اور کہنے لگا۔ "تم کہاں تھے۔ کیا تھا، اکام ہو گیا؟" میں نے اپنی داستان مصیبت سنائی تو بولا "میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔ تم مجھے ہمراہ لے کر بازار جانا۔ میری عدم معیت میں ہرگز نہ جانا" میں نے کہا: "تم ساری رات عبادت میں مصروف رہے اور شب بیداری کے باعث صبح کے وقت نہایت متضمحل تھے اور مجھے عجلت تھی۔ کیونکہ میرے ہم سفر میرے منتظر تھے۔ میں نے یہ پسند نہ کیا کہ تمھیں جگاؤں"

اس نے کہا "اچھا اب میرے ساتھ چلو۔ وہ اپنے گھر لایا۔ نہایت پُرتکلف ضیافت کی اور نصیحت کی کہ اب میں ایسا نہ کروں اور جب بازار جاؤں اس کے ہمراہ جاؤں"

وہ پھر گزشتہ شب کی طرح عبادت میں مشغول ہو گیا جب روز کا تڑکا ہوا جب معمول پھر سوار ہا۔ میری شامت جو آئی تو پھر بازار کی طرف نکل گیا۔ سوء اتفاق دیکھئے کہ آج بھی ناگاہ میری نگاہ اس بطریق پر پڑ گئی۔ میں اسے دیکھتے ہی بدحواس ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "ہاں دیکھنا یہ کل والا آدمی پھر مل گیا ہے اس کو جلد پکڑ لو۔ وہ لوگ مجھے پکڑ کر پھر اسی گرجے تک لائے اور مجھے کام کرنے پر مجبور کیا میں برابر دیوار توڑنے کے کام میں مشغول رہا۔ جب دوپہر ہوئی اور سخت گرمی پڑنے لگی تو سب لوگ چلے گئے اور اس جگہ کوئی نہ رہا۔ میں انہی دیواروں کی چھاؤں میں ذرا آرام لینے کے خیال سے بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چپکے سے اس بطریق نے میرے سر پر پہنچ کر ایک کوڑا تڑاق سے جما دیا۔ نہایت سخت چوٹ آئی۔ اس نے نہایت غصے میں کہا تو کام چھوڑ کر بیٹھ رہا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی جب دیکھا اور کوئی نہیں ہے۔ اس کو اس زور سے کھینچا کہ وہ اپنے گھوڑے سے نیچے گر گیا پھر اس کے سر پر ہتھوڑے کی بارش شروع کر دی وہ چیختا اور واویلا مچاتا رہا۔ مگر سننے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے دیوار کا ایک بھاری ٹکڑا اس پر گرا کر اس کا کام تمام کر دیا اور وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر نکل بھاگا۔ میں ہر طرف خوف سے پیچھے مڑ کر دیکھتا بھی نہ تھا کہ مبادا کوئی میرے تعاقب میں آ رہا ہو اور مجھے پکڑ لے۔

میں نے مصلحتاً اس راستے کو جس میں میرے رفقائے سفر تھے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ جب شہر سے دور نکل گیا۔ مجھے ایک رومی شخص ملا اس نے اپنی زبان میں مجھ سے گفتگو شروع کی جسے میں مطلق نہ سمجھ سکا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور سلسلۂ گفتگو طویل کر تا گیا لیکن میں اس کی ایک بات بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ بھی میری زبان سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ اثنائے گفتگو میں جب اس نے اپنی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں سمجھ گیا کہ یہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ فوراً میں نے اس پر غالب آنے کی کوشش کی۔ اس کو اس کے خچر سے زمین پر گرا کر ایک تلا ہوا ہاتھ مارا اور کام تمام کر دیا۔ اور خود اس کے خچر پر سوار ہو کر اور مالِ غنیمت سمجھ کر لے چلا۔

اس جگہ سے روانہ ہو کر میں ایک دیر کے قریب پہنچا۔ یہاں نصاریٰ کی ایک جماعت مقیم تھی۔ میں دیر کے اندر داخل ہوا تو مجھے دیکھتے ہی اہلِ دیر میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ اور مجھ سے میرے حالات کے متعلق استفسار شروع کر دیا۔ میں نے ٹالنے کے طور پر گفتگو کا رُخ بدل دیا اور دیر کے متعلق سوال کیا کہ کس نام سے مشہور ہے؟ ایک نے جواب دیا اسے دیر العبس کہتے ہیں۔

پھر وہ اسقف کے پاس گئے اور میرے وارد ہونے کی خبر سنائی۔ وہ میرے پاس آیا اور مجھے نہایت غور سے دیکھ کر کہنے لگا:۔

"تمھارے چہرے سے خوف کے آثار ظاہر ہوتے ہیں؟"

میں نے کہا: "تم نے مجھ میں خوف زدہ ہونے کی کونسی علامت دیکھی؟" اس نے کلام کا پہلو بدل کر کہا:۔

"آپ یہاں جس طرح چاہیں قیام کریں۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو تمام خوف و ہراس سے پناہ دے دی۔ آپ ہر طرح کے خدشے سے مامون ہو گئے۔ کیونکہ اب آپ ہماری حمایت اور حفاظت میں آ گئے ہیں۔ اسقف نے مجھے اپنے گھر میں بحیثیت مہمان رکھا اور میری نہایت خاطر مدارات کی۔ پھر میرے حالات دریافت کئے کہ آپ کون ہیں؟ کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں نے مختصر طور سے بتایا۔ وہ مجھے نہایت غور سے دیکھتا تھا۔ اور بار بار میرے متعلق مزید استفسارات کرتا تھا میں نے

اس کے ہاں رات نہایت آرام سے بسر کی۔ صبح ہوئی تو مجھ سے سوال کیا: "آپ کا ارادہ قیام پذیر ہونے کا ہے یا رختِ سفر باندھے لگا؟" میں نے کہا "میں عازمِ وطن ہوں گا" وہ اپنا نہایت شاندار گدھا جو بہت ہی خوش رنگ اور نہایت تیز رفتار تھا لے آیا۔ اس پر پالان کسا۔ خرجیں لادیں جو لذیذ ترین کھانے کی چیزوں اور قیمتی تحائف سے بھری ہوئی تھی۔ پھر میری طرف مخاطب ہوا۔ اور بولا۔ آپ اس پر سوار ہو جائیں اور روانہ ہوں۔ جب آپ راستے میں کسی عیسائی کے مکان سے گزریں گے۔ اور وہ آپ کو اس گدھے پر سوار دیکھے گا تو آپ کی تعظیم و تکریم اور خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھے گا۔ پھر اسقف نے میرا ہاتھ پکڑا اور مخلیہ میں لے جا کر کہنے لگا:۔

"اے عمر! تم پر میرا حق واجب ہو گیا" میں نے کہا "بے شک!" اس نے کہا: "تم ایک معزز قوم کے فرد ہو۔ میری ایک غرض تم سے وابستہ ہے۔ کیا تم پوری کرو گے؟" میں نے کہا "بیان کرو لیکن تعجب ہے کہ تمھارے جیسی صاحب اثر اور ذی احتشام شخصیت مجھ جیسے ایک پریشاں حال مسافر سے کوئی غرض اور ضرورت رکھتا ہو!"——

سردار نے نہایت متانت و وقار سے کہا سنو! میں ایک آدمی ہوں جسے خدا نے آسمانی کتابوں کے علم سے سرفراز فرمایا ہے۔ میں نے تمھاری ذات میں بہت سی ایسی علامتیں پائی ہیں جن سے میں تمھارے متعلق یہ پیش گوئی کرنے پر مجبور ہوں کہ جب زمانہ اپنی ایک معین مدت پوری کر چکے گا تو حالات میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہو گا۔ دنیا ایک نئی کروٹ لے گی اور حالات و واقعات ایک نئے قالب میں جلوہ گر ہوں گے! عمر! یقین مانو کہ تم اس وقت ان تمام شہروں کے امیر و والی ہو جاؤ گے اور صرف تمھارے ادامر و احکام یہاں نافذ ہوں گے ——— سردار نے اپنی آستین سے دوات قلم اور کاغذ نکالا اور کہا کہ "میری غرض یہ ہے کہ آپ مجھے ایک نوشتہ تحریر فرما دیں جس کا مضمون اس وبر کے جزیہ کی معافی ہو"

میں نے کہا: "کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟" اس نے کہا "کیا تم میرے متعلق سوءِ ظن سے کام نہیں لے رہے ہو؟ قسم ہے اُس ذات کی جس نے عیسےٰ ابنِ مریمؑ پر انجیل مقدس نازل فرمائی کہ میں آپ سے جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ حرف بحرف حق ہے۔ امید ہے کہ ازراہ کرم آپ میری درخواست قبول فرمائیں گے اور نوشتہ تحریر فرما دیں گے!"

مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ میں نے بلا تامل جو کچھ اس نے فرمائش کی لکھ دیا اور وہاں سے کوچ کر کے نصاریٰ کی ایک جماعت کے پاس پہنچا۔ انھوں نے جب مجھے اسقف کے گدھے پر سوار دیکھا تو میری خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ پھر اس جماعت کے بعض افراد نے نصارے کی دوسری جماعت تک میری رفاقت کی۔ غرضیکہ جہاں بھی میں پہنچتا یہ قوم مجھے اس گدھے پر سوار دیکھ کر سراپا نیاز و عقیدت بن جاتی اور میری تعظیم و تکریم اور مہمان داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی میں اسی طرح مہمان بنتا ہوا۔ اور نصارے کی مختلف جماعتوں میں منزلیں طے کرتا ہوا تبوک[1] تک پہنچ گیا۔ خدا کی شان میرے رفقائے سفر (ابوسفیان وغیرہ) رکّی[2] کے قریب منزل کئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی میری جانب دوڑ پڑے اور میرے پہنچ جانے سے بے حد مسرور ہوئے اور کہنے لگے۔ اے ابن خطاب! تم نے تو ہم لوگوں کو اُس مقام پر جہاں چھوڑ کر گئے واقعی مقیدِ کرد الاتھا۔ جب ہم لوگ تمھارا انتظار کرتے کرتے بالکل مایوس ہو گئے تو اس مقام سے کوچ کیا۔ مگر تمھاری جانب سے ہمیں سخت اضطراب اور قلق تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کس حالت میں رہے؟ میں نے انھیں اپنے تمام واقعات سے آگاہ کیا لیکن اسقف سے اور مجھ سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ بالکل ظاہر نہ کی اور میرے نہ بیان کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں اسے کم زوری اور ضعیف الاعتقادی پر محمول کرتا تھا۔

ابوسفیان نے مجھے اس گدھے پر سوار دیکھ کر کہا: "ارے تم لوگ اس نوجوان کے اقبال کو نہیں دیکھتے! اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بے آب و گیاہ بیابان میں بھی چھوڑ دیا جائے تو پتھر شق ہو کر اس کے لئے خود بخود رزق مہیا کر دیں" ——— چونکہ اسقف نے کہا تھا کہ جب میں اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ جاؤں اور گدھے کی ضرورت سے بے نیاز ہو جاؤں تو اس کی رسّی خرجین میں رکھ کر اور خرجین کو گدھے پر مضبوط باندھ کر گدھے کو جہاں پر ہو اسی جگہ چھوڑ دوں میں نے ایسا ہی کیا۔ یہ دیکھ کر ابوسفیان نے مجھ سے کہا: "ارے یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے پوچھا کیا دیکھا؟" ابوسفیان نے کہا "تم نے گدھے کو ایسی جگہ چھوڑ دیا جو چوروں اور درندوں کی گذرگاہ ہے"

میں نے کہا "اس کے مالک نے مجھے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہی اس کے عادات و اطوار سے زیادہ واقف ہے"

اب وہ جگہ اور اس جگہ کا کنواں "رکی الاثمان" کے نام سے

---

[1] تبوک۔ مکہ معظمہ اور شام کے درمیان ایک مقام ہے۔
[2] رکی۔ تبوک کے قریب ایک مقام اور کنوئیں کا نام ہے۔

مشہور ہے یعنی گدھے والا کنواں۔

وہاں سے روانہ ہو کر ہمارا قافلہ مکہ معظمہ پہنچا۔ میرے اور اسقف کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی وہ میرے دل میں طغیان پیدا کرنے لگی مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے اپنا یہ راز اپنی ایک مربیہ سے بیان کیا۔ وہ بڑی عقلمند سمجھ دار اور عالمہ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا:۔

"اے ابن خطاب! میں تمھارے بچپن ہی کے زمانے سے تم میں نیک آثار دیکھتی ہوں ——— تم جب بہت کم سن تھے میں نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ تم لانبے ہوتے چلے جا رہے ہو۔ اور تمھارا قد اتنا لانبا اور طویل ہو گیا ہے کہ اس نے آسمان کو چھو لیا۔ یہ دیکھ کر میں نے نیند ہی میں کہا۔ ارے میرے بچے کی یہ کیا حالت ہے؟ تو مجھے کسی نے جواب دیا۔ یہ لڑکا عنقریب دنیا اور آخرت کی بھلائی پائے گا۔

عہد جاہلیت میں اس قسم کی باتوں کا کوئی مطلب میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مکہ میں ایک شخص اہل کتاب میں سے تھا جو بہت گم نام تھا اسکی حالت کسی پر آشکارا نہ تھی۔ ہاں اکابرین قریش اسے پہچانتے تھے اور اس کی دل سے عظمت کرتے تھے۔ وہ جب کسی اہم معاملہ میں اس سے مشورہ کرتے تو وہ ان سے نہایت خلوص سے باتیں کیا کرتا تھا۔ میں دوپہر کے وقت اس کے یہاں گیا۔ اور اس کے مکان پر پہنچ کر آواز دی "ذرا دروازہ کھولئے مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے اور ایک خاص اور اہم بات عرض کرنی ہے" اس نے دروازہ کھول دیا۔

میں نے کہا "میں آپ سے دو باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں اور ان کو آپ کے دل میں راز بنا کر رکھتا ہوں۔ آپ کسی کو شنشہ بھی اس سے مطلع نہ کریں گے" اس نے وعدہ کیا تو میں نے اپنی ساری سرگزشت اور وہ تمام باتیں جو اسقف یعنی سردار دیر عدس سے ہوئی تھیں من وعن بیان کر دیں اور اپنی مربیہ کے خواب کا بھی تذکرہ کیا جب میں اپنی ساری گفتگو ختم کر چکا تو وہ میری جانب متوجہ ہوا اور کہنے لگا:۔

"اے ابن خطاب! وہ اسقف جس نے تم سے یہ قول و قرار کیا۔ عہد حاضر کے تمام علمائے نصارے میں سب سے زیادہ عالم اور صاحب بصیرت ہے۔ جو کچھ اس نے کہا وہ حرف بحرف حق ہے اور عنقریب تم اس کو حقائق کی صورت میں جلوہ گر دیکھو گے اور خواب کی تعبیر تو کھلی ہوئی ہے کہ مکہ میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوگا اور زمانہ ایک نیا روپ اختیار کرے گا۔ آنے والے دور کے آسمان و زمین بدل جائیں گے اور دنیا ایک نئے طریقے سے سجائی جائے گی۔

اے ابن خطاب! تم اس آنے والے عہد کے اوائل ہی میں میرے پاس آنا۔ کیونکہ وہی ان تمام پیش گوئیوں کے پورے ہونے کا زمانہ ہوگا جو اسقف نے تم سے بیان کی ہیں۔

میں نے اس کی ذرا تفصیل پوچھی تو اس نے کہا "تم تو خود ہی مشاہدہ کر لو گے"

میں اس کے یہاں سے اپنے گھر چلا آیا۔ اور اس کی ساری باتیں برابر اپنے دل میں لئے رہا۔ وہ تھوڑی مدت کے بعد دار البقا کو سدھارا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ادھر اُدھر کچھ چہ میگوئیاں اور چرچے سنے جانے لگے۔ اہل قریش آپ کے بارے میں اکثر گفتگو کیا کرتے اور مضحکہ اور استہزار کے طور پر آپ کا آپس میں تذکرہ کرتے میرے دل میں خود بخود یہ بات بعض وقت گھٹتی کہ حالات و واقعات کچھ مختلف اور عجیب نظر آ رہے ہیں اور میں جو کچھ سن رہا ہوں اسکو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ وہی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور اسی پیش گوئی کا پیش خیمہ کہی جا سکتی ہیں جس کی طرف آسمانی کتاب کے اس عالم نے اشارہ کیا تھا۔

ابھی زیادہ مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام ظاہر فرمایا

اسلم سے روایت ہے کہ جب حضرت فاروق اعظم نے اپنے عہد خلافت میں عنان توجہ شام کی جانب موڑ دی فرمائی اور آپ نے اپنے قدوم سے ارض شام کو شرف بخشا تو ایک بہت بوڑھا آدمی جس کے بال برف کی مانند سفید ہو چکے تھے نصارے کی ایک جماعت کے ساتھ آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی "یا امیر المومنین! کیا آپ مجھ کو نہیں پہچانتے؟" آپ نے فرمایا "اگر تم دیر العدس والے میرے دوست اسقف ہو تو میں تمھیں پہچانتا ہوں" اس نے عرض کی "جی ہاں میں وہی اسقف ہوں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میں نے تم سے اس وقت جو عہد کیا تھا۔ وہ علی حالہ قائم اور مستحکم ہے۔ تم بہت بوڑھے ہو گئے۔

ہاں اللہ تعالیٰ نے ہم میں اسلام مبعوث فرما کر اس پچھے دین سے ہمیں سرفراز کیا۔ تم تو اہل کتاب ہو اور تم ہی نے مجھے ان باتوں کی بشارت دی تھی بھلا اسلام میں داخل ہونے سے کون سا امر مانع ہو سکتا ہے!

حضرت عمر نے اپنے "نوشتہ" کے مطابق دیر العدس کا جزیہ معاف کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔ اور اب وہ ساعت سعید آ گئی تھی کہ دیر العدس کا اسقف اپنی پوری جماعت کے ساتھ اسلام کی لازوال دولت سے سرفراز ہو!

سید یحییٰ حسن ندوی

پیارے موہن کی یاد میں

علامہ کیفی کے صاحبزادے پنڈت پیارے موہن کی جواں موت کا غم نہ صرف مرحوم کے دوستوں کا غم ہے بلکہ ساری قوم کا غم ہے لیکن جو شخص ساری قوم کا غم کھانے والا ہو اس کا غم اپنے پیارے بیٹے کے لئے کیسا ہوتا ہوگا اس کا اندازہ آپ کو ان اشعار سے ہوگا۔ حضرت علامہ نے یہ شعر لکھے نہیں بلکہ جذبۂ بے اختیار نے ان سے لکھوائے ہیں۔ ان میں وہی خیالات ہیں جن کا اظہار وہ اپنے دوستوں سے کرتے رہتے ہیں۔

منصود احمد

ہے رسمِ خط جو غلط ہوں بنائے جاتے ہیں
درست نقش جو ہیں کیوں مٹائے جاتے ہیں

جو نو فروغ تھے ہونے کو شمعِ بزمِ عمل
وہ شام ہی سے دیے کیوں بجھائے جاتے ہیں

جوان کو ہونا ہے کھلنے کے ساتھ پژمُردہ
تو غنچے باغ میں پھر کیوں کھلائے جاتے ہیں

جو فرطِ ضعف سے اٹھ سکتے تھے نہ بستر سے
وہ سوئے خلد قدم اب بڑھائے جاتے ہیں

ستم ظریفیاں غیب و حضور کی دیکھو
وہ چھپ کے آنکھ سے دل میں سمائے جاتے ہیں

یہ کون کس سے کہے اُن کو کس پہ چھوڑا ہے
غمِ جدائی میں جو بلبلائے جاتے ہیں

وہ امرِ ربی ہے، لافانی ہے یہ مان لیا
یہ داغ مسلوں سے کب مٹائے جاتے ہیں

حیات و موت کا ہے فلسفہ ہمیں معلوم
خواص قلب کے کس سے گنوائے جاتے ہیں

دل و جگر نہیں بالا عمل سے فطرت کے
جبھی تو لختِ دل آنسوؤں میں پائے جاتے ہیں

ہو جن دلوں میں محبت تمام خلقت کی
وہ ایسے حال میں پتھر بنائے جاتے ہیں

عمل سے کیفِ کردار کے ہیں ناواقف
جو آسمان کسی کو بنائے جاتے ہیں

جگر کے دل کے لئے راہِ چشم کیا تھی تنگ
یہ قتلے حلق تلک کیسے آئے جاتے ہیں

کسے ہے حشر سے انکار، کیا قیامت ہے
سمجھے جور و زجزا کے دکھائے جاتے ہیں

غمِ وطن تھا مگر کم شرر فشانی کو
پھپھولے ہوئے ہیں جو دل کیوں جلائے جاتے ہیں

جو آپ ہی غمِ اہلِ جہاں سے ہے صد چاک
اُسی جگر پہ یہ آرے چلائے جاتے ہیں

ربوبیت کی ہے اک شان یہ بھی، کیا کہنے
کسی کو دکھ نہیں جن سے ستائے جاتے ہیں

بنایا تھا سو بگاڑا، یہ حکم اب ہے سنبھال
یہ چوٹ دے کے تہوکے لگائے جاتے ہیں

یہ سچ ہے جلوہ بھی تیرا حجاب بھی تیرا
یہی کرشمے تو جی کو جلائے جاتے ہیں

یہ کس کو شان ہے پوچھے اجاڑنا ہے اگر
تو پھر یہ کس لئے ساماں سجائے جاتے ہیں

یہ رحم خاص ہے کھا کر اُسے تمام کریں
یہ غم وہ ہیں کہیں انساں سے کھائے جاتے ہیں

جسے مٹایا ہے یاد اُس کی بھی مٹا دل سے
الٰہی توبہ یہ کیسے لب تک آئے جاتے ہیں

یہ غم دیا، تو اٹھانے کی اس کے طاقت دے
یہ بوجھ بے مدد غیب اٹھائے جلتے ہیں

نہ سہل دوست نہ کم دل ہیں آپ اگر کیفی
تو روکے یاروں کو پھر کیوں رلائے جاتے ہیں

برجموہن دتاتریہ کیفی

عجیب انتقام

۱۴ ستمبر

ایک دکان دار نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کی چوری پکڑی گئی بھی ہوئی رنگے ہاتھ پکڑا گیا۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ملزم گرفتار کر لیا گیا۔ دکان دار نے عدالت میں ملزم کی شناخت کی۔ گناہ ثابت ہو چکا تھا۔ صرف صفائی کے گواہوں کا بیان باقی تھا۔

ایک نوجوان لڑکی شہادت دینے کے لئے پیش ہوئی۔ یہ لڑکی رنگل تھیٹر میں روزانہ پروگرام تقسیم کرنے پر ملازم تھی۔ وہ خوب صورت تھی۔ اور صاف ستھرا لباس زیب تن کئے تھی۔ وہ ہمیشہ خوش و خرم نظر آیا کرتی تھی۔ لیکن جب وہ بیان کے لئے عدالت میں حاضر ہوئی تو اس کے چہرے سے حسرت و غم کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی ٹانگوں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور نگاہوں میں خوف و ہراس کے جذبات!

"میں استغاثہ کے متعلق چند سوالات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں" جج نے ایک تجسسانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے جواب دیا "بہت اچھا"

"میرا خیال ہے کہ آپ کی نسبت ملزم سے ہو چکی ہے"

"جی ہاں"

"میرا خیال ہے۔ آپ کو ملزم سے محبت ہے" ——

"بے شک" لڑکی کے چہرے پر نسوانی حیا کا گلابی رنگ دوڑ گیا۔

کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ ۱۲۔ جولائی جمعہ کے دن تین بجے بعد دوپہر کو کہاں تھیں۔

"میں سٹرچلا۔ لی کے ہمراہ وکٹری کچر ہاؤس میں تھی"

"ملزم کے ساتھ"

"جی ہاں"

"کیا یہ بالکل درست ہے۔ یاد رکھئے آپ نے حلف اٹھایا ہے"

"ایک بات درست کہنی ہو گی۔ بالکل درست!"

"اس بات کو عرصہ ہو گیا ہے۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتی لیکن میرا خیال ہے۔ میں صحیح کہہ رہی ہوں"

"آپ جواب دینے سے پہلے خوب سوچ لیں۔ کیا آپ یقینی طور پر کہہ سکتی ہیں کہ آپ ۱۲۔ جولائی کے دن تین بجے ملزم کے ساتھ تھیں"

"ہاں ——— میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں"

اس دن آپ سینما کو تو نہیں گئی تھیں۔ کیا آپ کے دماغ میں کسی اور دن کے واقعات تو نہیں"

"اس دن کو گزرے بہت مدت ہو گئی ہے ——— تمام دن ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں" ——— میں اچھی طرح یاد نہیں کر سکتی ——— میں یقینی طور پر کچھ بھی نہیں کہہ سکتی ——— صرف میرا خیال ہے"

جج نے جیوری کی طرف معنی انداز سے دیکھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہے کہ کیا وہ ایسے بیان کو تسلیم کریں گے جو صرف وہم اور شک پر مبنی ہو۔ کیا یہ بیان اپنے ہونے والے شوہر کو رہا کرانے کے لئے تو نہیں دیا جا رہا؟

تھوڑی دیر بعد جیوری کے ممبران کی رائے لینے کے بعد جج نے ملزم کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمام لوگوں کو یہ مقدمہ فراموش ہو گیا۔ سوائے ملزم اور رنگل تھیٹر کی پروگرام تقسیم کرنے والی لڑکی کے جن کے لئے واقعہ واقعہ نہ تھا ایک المناک حادثہ تھا

۱۵۔ مارچ

مسز شائرے ملازمہ نے کہا "آپ کو کوئی فون پر بلا رہا ہے"

"کون صاحب ہیں؟"

"وہ اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے صرف اتنا کہا ہے کہ

ایک ضروری کام ہے۔"

مسز شائر ایک خوش قسمت عورت تھی۔ اس کا خاوند سائمن شائر ایک خوش خلق اور محنتی جج تھا۔ جو اپنی قابلیت کی وجہ سے روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔

"فرمائیے" مسز شائر نے ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ مسز شائر ہیں"

"جی ہاں مسز شائر ہی بول رہی ہے۔ فرمائیے کیا کام ہے"

"جب آپ کا شوہر آج گھر آئے تو اس سے دریافت کیجئے کہ ۹ و ۹۔ نومبر جمعرات کے دن شام کے وقت کہاں تھا"

"کیا؟" مسز شائر نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ اپنے شوہر سے پوچھیں کہ ۹۔ نومبر کو شام کے وقت وہ کہاں تھے۔ اور ان کے ہمراہ کون تھا۔ مجھے امید ہے کہ وہ کبھی آپ کو تمام حالات سے مطلع نہیں کریں گے اور کہیں گے اس بات کو اتنا عرصہ ہو گیا ہے کہ میں یاد نہیں رکھتا۔ مگر آپ ایک بھی نہ سنیں اور ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ آپ اس کا جواب چاہتی ہیں بکل جواب اور شرعت"

مسز شائر نے ٹیلیفون کا ریسیور رکھ دیا۔ اس کی شادی کو آج پانچ برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس نے کبھی اپنے خاوند کو کوئی بات پوشیدہ رکھتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ وہ ۹ و نومبر کے واقعات اس سے پوشیدہ رکھے۔

جسٹس کاک خاوند کی طرف سے اس کے دل میں بیٹھ چکے تھے۔ اس نے ان کو دل سے محو کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ وہ رہ رہ کر سوچ رہی تھی کہ اس لڑکی کا یہ سوال پوچھنے سے کیا مطلب ہے؟ معلوم ہوتا ہے یہ لڑکی خود سب کچھ جانتی ہے۔ ورنہ وہ مجھے اس سے پوچھنے کا مشورہ کیوں دیتی؟

اس نے خود بھی اس دن کی شام کے متعلق سوچنے کی کوشش کی لیکن اس کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ نومبر کے تمام دن ایک جیسے معلوم ہوتے تھے وہ نو۔ آٹھ۔ دس نومبر میں تمیز نہ کر سکتی تھی۔ وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔

اس کے دل سے پھر آواز آئی "تم ان دنوں میں تمیز نہیں کر سکتیں کیونکہ تمہارا دل آئینہ کی طرح صاف ہے۔ تمہارے دل میں کسی قسم کی کدورت نہیں اس لئے تم ان دنوں میں تمیز نہیں کر سکتی ہو"

سائمن جب عدالت سے واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی میں خاص تغیر دیکھا۔ پہلے وہ ہمیشہ چہکتی رہتی تھی۔ آج خاموش تھی اور اس کی طرف ترچھی نگاہوں اور پُرمعنی انداز سے دیکھ رہی تھی۔

سائمن کو حیرت ہوئی۔ اس نے پوچھا کیا بات ہے؟ مغموم کیوں نظر آتی ہو؟ کیا کوئی تکلیف ہے؟"

وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اسے اپنے شوہر پر کسی قسم کا شک ہے۔

"کچھ نہیں" اس کی بیوی نے جواب دیا اور رو سرکا بہانہ کر کے پلنگ پر لیٹ گئی۔

سائمن کو اور بھی تعجب ہوا۔

۱۶ مارچ

ناشتے کے وقت مسز شائر کے چہرے سے گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے تمام رات کروٹیں بدل بدل کر کاٹی ہے۔

سائمن نے ہمدردی سے کہا: "دیکھو تمہیں کمزور نظر آتی ہو۔ تمہارے لئے تبدیلی آب و ہوا اشد ضروری ہے۔ اب کہو جنوبی فرانس کی طرف جانے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔"

"کیا آپ بھی ساتھ چلیں گے؟"

"میں نہیں جا سکتا۔ اس سال مجھے کام زیادہ ہے۔"

اس کی بیوی کے دل میں خیال آیا کہ میرا شوہر کسی خاص وجہ سے یہاں رہنا چاہتا ہے۔ ممکن ہے اس میں وہی راز منہم ہو جس کے متعلق مجھ سے کسی لڑکی نے فون پر کہا تھا۔ وہ اور بھی پریشان ہو گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

اسی اثنا میں کسی نے اس کو ٹیلیفون پر بلایا۔ ایک لڑکی کی آواز آئی "آپ کی بات سن کر وہ آپے سے باہر تو نہیں ہو گئے تھے۔ آپ بھڑکیں بھی ایسی باتوں میں نہ آئیں۔ اور اس سوال کا صحیح۔ درست۔ صاف جواب حاصل کرنے کی کوشش کریں"

مسز شائر کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس نے ریسیور کو میز پر دے مارا اور کرسی پر لیٹ گئی۔

اس کا خاوند دوڑتا ہوا آیا "کیا بات ہے۔ کچھ تو ——"

وہ اس کے قریب آ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے رخسار زرد پڑ گئے تھے

اور وہ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لے رہی تھی۔

"سائمن" اس نے مسرت آمیز لہجہ میں پوچھا "تم ۹۔ نومبر کو شام کے وقت کہاں تھے اور اُس وقت تمھارے ہمراہ کون تھا؟"

"تم اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو" اس کے خاوند نے متعجبانہ نگاہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی بیوی نے سنی اَن سُنی کر دی اور پھر وہی سوال دریافت کیا "بتاؤ نا! تم ۹۔ نومبر کو کہاں تھے؟"

"میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ اس بات کو اتنا عرصہ گزر گیا ہے کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ یہ فضول سوال کس نے تمھارے دماغ میں بھر دیا ہے" مانا کہ یہ فضول سوال ہے۔ مگر تم اس کا جواب کیوں نہیں دے دیتے معمولی بات ہے"

"لیکن ۹۔ نومبر کیوں؟ یکم اپریل کیوں نہیں"

"کل ایک لڑکی نے مجھے ٹیلیفون پر بلا کر تم سے یہ سوال پوچھنے کو کہا تھا۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تمھارا شوہر اس کا جواب نہ دے سکا تمھیں مال دے گا کہ تجھے بالکل یاد نہیں"

"لیکن ——— سائمن نے غصہ میں آتے ہوئے کہا۔

"یہی تو میں محسوس کرتی ہوں" اس کی بیوی نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ سوال فضول معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اسے اپنے دل سے محو کرنے کی کوشش کی مگر نا کامیاب رہی۔ میرے دل میں اس لڑکی کے طنز آمیز الفاظ رہ رہ کر چبھ رہے ہیں۔ میں خود نادم ہو رہی ہوں ——— مگر اپنے دماغ سے وہ شک رفع نہیں کر سکتی۔ اب بھی اسی لڑکی نے مجھے ٹیلیفون پر بلا کر کہا ہے کہ تمھارا شوہر طرح طرح کے بہانے بنائے گا اور کہے گا اس بات کو عرصہ گزر چکا ہے۔ اب مجھے کیا معلوم میں اس دن کہاں تھا اور میرے ساتھ کون تھا؟"

"ارے تم ایک اجنبی اجنبی لڑکی کا اعتبار کر سکتی ہو کیا ———"

"اس لڑکی کے اس سوال میں کوئی راز ہے اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسے معلوم ہے کہ تم ۹۔ نومبر کو کہاں تھے۔ تم بجائے غصہ ہونے کے میرے سوال کا جواب دو اور معاملہ کو ختم کر دو"

"تم کس طرح امید کر سکتی ہو کہ میں اتنا پرانا واقعہ یاد رکھ سکتا ہوں ———"

"اس لڑکی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم بہانے بناؤ گے"

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم ۹۔ نومبر کو کہاں تھیں"

"میں نے لاکھ کوشش کی کہ کچھ سوچ سکوں مگر میری قوتِ حافظہ کام نہیں کرتی"

"اگر تمھیں مجھ پر اتنا ہی شک ہے تو اس لڑکی سے خود ہی پوچھ لو اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جو کچھ کہے گی وہ غلط اور افترا ہو گا۔ یقیناً اسے مجھ سے کوئی دشمنی ہے" یہ کہہ کر سائمن باہر چلا گیا۔

۱۹۔ مارچ

اس کے بعد کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ سائمن اور اس کی بیوی میں نفرت بڑھنے لگی۔ پہلے کی محبت خدا جانے کہاں چلی گئی۔

کبھی کبھی سائمن کی بیوی اپنے شکوک پر نادم بھی ہو جاتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے شوہر سے معافی مانگ لے۔ مگر ایک آواز تھی جو اس کے دل کی گہرائیوں سے اُٹھتی تھی اور اس کا ارادہ بدل دیتی تھی۔ سائمن خود بھی حیران تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کس طرح اپنی بیوی کے دل سے یہ شکوک نکال دے اس پر یہ اچھی طرح واضح تھا کہ انھیں جادو دانی خوشی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ۹۔ نومبر کو کون سے واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے لیکن یہ ایسا راز تھا کہ کسی طرح کھلتا نہ تھا۔

وہ لڑکی ہر روز مسز شائر کو ٹیلیفون پر بلاتی اور اسے مجبور کرتی کہ وہ صداقت معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اسے یہ بات فراموش نہیں ہونے دیتی تھی۔

ایک دن ٹیلیفون پر اس لڑکی کا پیغام آیا جو پہلے تمام پیغامات سے مختلف تھا۔ پیغام یہ تھا:۔

"اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کا شوہر ۹۔ نومبر کو کہاں تھا۔ تو کل بوقت گیارہ بجے سٹون بلڈنگ لنکن ہوٹل میں تشریف لائیں"

مسز شائر نے وہاں جانے کا تہیہ کر لیا۔ کیونکہ وہ ہر ایسا کام کرنے کے لئے تیار تھی جو اس معاملے کو اختتام تک پہنچا دے۔ جس سے اس کی روح مسرت حاصل کر سکے۔

جب وہ دوسرے دن سٹون بلڈنگ میں پہنچی تو اس کا شوہر بھی وہیں موجود تھا۔ مسز شائر سمجھ گئی کہ جس نے مجھے یہاں بلایا ہے۔ اس نے اس کو بھی بلایا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"لارڈ" ریگل تھیٹر کی پروگرام تقسیم کرنے والی لڑکی نے جو دیوار کے

پیچھے سنرشائر کا انتظار کر رہی تھی اور اس کے آنے پر سائمن کے بالمقابل آکر کھڑی ہو گئی تھی کہا۔ "آپ کا فیصلہ غلط تھا"

خاوند۔ بیوی۔ دونوں اس لڑکی کا منہ تکنے لگے۔

"مجھے آپ بھول گئے ہیں" لڑکی نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "کیا آپ کو یاد نہیں۔ گزشتہ سال ستمبر میں بطور ایک صفائی کے گواہ کے آپ کے سامنے پیش ہوئی تھی۔ اور آپ نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ تم ۱۲ر جولائی بروز جمعہ دوپہر کے وقت کہاں تھیں اور جب میں نے جواب دیا کہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ کیونکہ اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا تھا تو آپ نے جیوری کو ایک خاص اشارہ کیا تھا جس کی وجہ سے مجھ سے منسوب شدہ شخص کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا ہو گئی لیکن اس وقت آپ کی باری تھی اب میری باری ہے۔ جب چارلی اپنی سزا کے چھ ماہ گزارنے کے بعد جیل سے رہا ہو گیا۔ تو اس نے میری ذرا پردہ دری کی۔ اس نے کہا "بس اب ہماری تمہاری نبھ چکی۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ آپ نے ایک فضول سوال پوچھ کر میری زندگی تباہ کر دی۔ تب جوشِ غضب میں میں نے عہد کر لیا کہ آپ کی زندگی بھی تباہ کر کے چھوڑوں گی۔ میں آپ سے ایسا انتقام لوں گی جو آپ کو ساری عمر نہ بھولے۔ میں دیکھوں گی آپ کس طرح اُن سوالات کا جواب دے سکیں گے۔ جن کے جوابات کی توقع کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ میں نے آپ کی بیوی کے دل میں زہر کے بیج بو دیئے اور نتیجہ وہی نکلا جو میں چاہتی تھی لیکن اب میری اور چارلی کی پھر صلح ہو گئی ہے۔ اب ہم پھر شادی کرنے والے ہیں ——— دیکھئے آپ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ آپ ۹۔ نومبر کو کہاں تھے؟"

اب بھی وہاں اسی طرح ویسی ہی خاموشی طاری تھی۔ پُر سحر ہیبت ناک مسلسل۔

لڑکی نے ایک ہینڈ بیگ نکالا اور ایک ہینڈ بیگ کھولا۔ "یہ دیکھئے" اس نے کہا "شاید اس سے آپ کو کچھ واقفیت مل سکے"

اس نے فائل سے بنگل تھیٹر کے دو ٹکٹ نکالے جن پر C11 اور C12 نمبر درج تھے اور ۹۔ نومبر کی مہر لگی ہوئی تھی اور کہا "جو سوال آپ نے اُس دن مجھ سے عدالت میں پوچھا تھا۔ آج میں نے اس کا جواب دے دیا"

میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے +

روشن لال روشن نکودری

تمہیں یاد ہے؟

اے میری جائے پیدائش!
تیری شبیں یاد کے نقوش میرے دل پر کتنے گہرے ثبت ہیں!
میری بہن!
کتنے اچھے وہ دن تھے۔
جو ہمارے پیارے ملک فرانس میں گزرے؟
تمہیں یاد ہے نا
کہ اُس چھوٹے سے کچے مکان میں
ہماری ماں ہم دونوں کو سینہ سے چمٹا لیتی تھی
اور ہمارے بالوں کو۔
لمبے اور سنہری بالوں کو ——
چوما کرتے تھے!
بہن! تمہیں یاد ہے وہ قلعہ
دریائے ڈوردو کے کنارے پر
اور وہ پرانا بینارجس پر گھنٹے بجا کرتے تھے۔ مسیح کی واپسی کے اعلان کے لئے!
اور تمہیں یاد ہے وہ خاموش جھیل
جس کی ساکت سطحِ آب کو
پرندے چوستے ہوئے گزر جاتے تھے!
اور تمہیں یاد ہے وہ ہوا
جو مغرور درختوں کے سر جھکا دیتی تھی
اور غروبِ آفتاب کا وہ دلکش نظارہ جھیل کی ساکت سطحِ آب پر!
آہ! مجھے اب کون واپس دے گا میری بہن!
وہ پہاڑ، اور سربلند درخت!
جن کے خیال سے میرے دل میں ایک درد ہوتا ہے۔
ایک ٹیس اٹھتی ہے
اے میرے ملک فرانس!
تیری شبیں یاد کے گہرے نقوش
میرے دل پر ہمیشہ ثبت رہیں گے!

(ترجمہ) ایم بقایا

غزل

پھر مجھے عیش کا پیغام سنا دے ساقی
پھر کوئی ساغرِ اندوہ رُبا دے ساقی

بھول جاؤں غم و آلام ہمیشہ کے لئے
آ، مجھے ہوش سے بیگانہ بنا دے ساقی

مجھ کو انجام کی مطلق کوئی پروا نہ رہے
غمِ فردا کو مرے دل سے بھلا دے ساقی

تجھ کو تسخیرِ دو عالم کوئی دشوار نہیں
اک ادائے نگہِ مست دکھا دے ساقی

دیکھنا ہے تری اعجاز نگاہی کا اثر،
آج کونین کو نظروں سے گرا دے ساقی

مجھ کو آزادیٔ فطرت کا یقیں ہو جائے
پردۂ وہم نگاہوں سے ہٹا دے ساقی

نگہِ لطف کو اک جنبشِ ادنیٰ دے کر
کلفتِ گردشِ ایام بھلا دے ساقی

اپنی ہستی کی حقیقت کی قسم دیتا ہوں
آج ہر خوف مرے دل سے مٹا دے ساقی

تیرے مستوں کا کہیں وقت نہ رسوا ہو جائے
اور کچھ قیدِ تعیّن کو بڑھا دے ساقی

رندی و زہد کی تفریق مٹا دے یکسر
دین و دنیا کی کشاکش سے چھڑا دے ساقی

تشنگی دل کی بجھائے نہ بجھے گی تجھ سے
ہاں، جو ممکن ہو تو اک آگ لگا دے ساقی

ذرّے ذرّے کی زباں پر ہو گواہی تیری
چپّے چپّے پہ مئے فیض بہا دے ساقی

خس و خاشاک بھی نغمہ سرا ہو جائیں
جوشِ مستی سے جہاں بھر کو جگا دے ساقی

مجھ کو اس کشمکشِ زیست سے چین آ جائے
کوئی گزرا ہوا افسانہ سنا دے ساقی

تجھ سے نسبت ترے حرماں کے لئے کافی ہے؛
یہ ترا فیض، پلاتا ہے، پلا دے ساقی

حرماں خیرآبادی

ڈونا جُلیانہ

تعارف | ڈونا[1] جلیانہ کا نام تاریخ میں غیر معروف ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ڈونا اٹھارہویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی ایک ممتاز عورت ہے جس زمانہ میں ڈچ سپاہ نے کوچن کے بندرگاہ پر قبضہ کیا ہے۔ ڈونا کا باپ جس کا نام اگاسٹنو ڈیاس[2] پکاشاتھا، کوچن میں تجارت کرتا تھا اور طبقۂ تجار میں نیک حیثیت خیال کیا جاتا تھا۔ وہ پرتگالی تھا۔ سقوطِ کوچن نے اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ سامانِ تجارت گھر بار سب لوٹ لیا گیا۔ اور وہ دنیا میں خانِ شبینہ کو محتاج زندہ چھوڑ دیا گیا۔ آخر کار عسرت سے تنگ آکر وہ گوا آیا۔ مگر جب یہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی تو بنگال کا رُخ کیا۔ بنگال۔ سے آگرہ پہنچ گیا۔ اور نہ معلوم کس طرح سے دربارِ شاہی میں رسوخ پاکر منصب داری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو گیا مشہور ہے کہ ڈی کاسٹا کو کچھ فنِ طب میں بھی دخل تھا اور ولایتی جڑی بوٹی سے علاج کرنا جانتا تھا۔ یہ زمانہ اورنگ زیب کا تھا جو کمال کی قدر جانتا تھا۔ شہنشاہ نے شہزادہ[3] اعظم کے دربارِ طبیب کی خدمت اس کو سپرد کر دی جلیانہ جو غالباً ان ماں کی لڑکی نئی باپ کے ساتھ کئی اور جہاں تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے جوان تھی۔ اس کے بعد بہت انقلابات ہوئے۔ شہزادہ معتوب ہوا اور نظر بند کر دیا گیا، اور ڈیکاسٹا شاہی عساکر کے ساتھ مہم دکن پر بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ محاصرۂ گولکنڈہ میں ہمتوں جوہر کام آگیا۔ شہنشاہ نے باپ کی وفاداری کا صلہ دختر کو یہ دیا کہ اس کو شاہی محلات کی طبیبہ مقرر کر دیا۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جلیانہ نے باپ سے طبابت کو حاصل کیا تھا۔ اور وہ خود بھی مریضوں کا علاج کر سکتی تھی۔ مرتے دم تک جلیانہ اس عہدے پر عزت کے ساتھ مقرر رہی اور اس نے اپنے کسی نعل سے اُس وقار کو جو اس کو دربارِ شاہی میں حاصل ہو گیا تھا کم نہ ہونے دیا۔

DONA JULIANA[4]

AGOSTINO DIASDACASTA[5]

[1] بہادر شاہ ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء تک۔

تذکرہ نگاروں کی متضاد روایات | جو یورپین مؤرخین اکبر اعظم کی ایک پرتگالی مسیحی بیگم کے وجود کے قائل ہیں ان کی رائے میں ڈونا جلیانہ اکبر کی سالی تھی۔ یہ سراسر لغو و بے بنیاد ہے۔ کیونکہ نہ اکبر کی کوئی مسیحی بیوی تھی اور نہ سالی۔

ایک شخص سمیئل گریسس نے جو گوا کا رہنے والا تھا۔ انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ ڈونا جلیانہ کو ان دو لڑکیوں میں سے ایک بتلاتا ہے جو لسبن دارالسلطنت پرتگال کے یتیم خانہ سے وسط سولھویں صدی عیسوی میں ہندوستان بھیجی گئی تھیں لیکن ڈاکٹر ووگل[6] جس نے ڈچ سفیر متعینہ لاہور ۱۶۱۱ء کے تذکرہ کا ترجمہ کیا ہے۔ اور تذکرہ مذکور تاریخی نقطۂ نظر سے بہت مستند و معتبر ہے ڈونا کے صحیح واقعات کو ہمارے پیش نظر کر دیتا ہے۔ اس موقع پر تذکرہ کا حسبِ ذیل اقتباس بہت مفید ہو گا۔ اور اس سے نہ صرف ڈونا بلکہ کثیر التعداد مسیحیوں کا وجود دربارِ شاہی میں ثابت ہو سکے گا۔ بادشاہ اس وقت شاہ الامارا باغ میں فروکش تھے۔ وہ لکھتا ہے:۔

> "شاہ الامارا میں سفارت کا خیر مقدم ایک منصب دار نے کیا جو چند نفیس تحائف اور گھوڑے اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ تحائف لیڈی ڈونا جلیانہ نے بھیجے تھے جو شاہی علات کی طبیبہ اور دربارِ خلیفہ کی ایک ممتاز خاتون تھی۔ دوسرے دن سٹر مارٹن شاہی طبیب مع تین مسیحیوں کے آکر ملے۔ ان کے ساتھ چھ سو سوار اور چھ سو پیادے تھے۔"

اب جلوس روانہ ہوتا ہے:۔

---

[1] میں نے اپنے مضمون اکبر کی مسیحی بیگم میں یہ ثابت کیا ہے کہ اکبر کے کوئی مسیحی بیوی نہ تھی۔

[2] ISMAIL GRACIAS

[3] (A PORTUGESE LADY AT THE COURT OF THE GREAT MOGOL

[4] DR. VOGEL

آگے آگے سات ہاتھی تھے جن پر طلائی ہودج اور زنگار جھولیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہر ہاتھی پر ایک پروہن سپہ سالار اور ایک رومیلا بندوقچی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد نقارچی تھے اور ان کے ساتھ سات عربی گھوڑے جو شہنشاہ کے لئے تحفہ تھے۔ بعد ہُ دو چالگھوڑا اس کی نعلیں چاندی کی گاڈیاں تھیں جو شاہی خلعت کی سواری کے لئے بنی گئی تھیں۔ ان گاڑیوں میں بیش قیمت تحائف کے صندوق لدے ہوئے تھے۔ یہ سب سامان براہِ راست یورپ سے بادشاہ کے لئے آیا تھا۔ چالگھوڑوں کی گاڑی میں ارمنی بشپ اور پادری سوار تھے جن کے جلو میں تیس سیحی مسلح سوار زرین برق وردیاں پہنے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے اونٹوں کی ایک لانبی قطار تھی جن میں کچھ پر طبل و نقارے تھے اور کچھ پر تحائف کے صندوق۔ اونٹوں کی حفاظت کا گارد ۲۴ رسالہ تھا جو برداروں اور ۳۰ رنج شہسواروں پر مشتمل تھا۔ اور ان کے قائد گولفریڈ بائھرڈ۔ سرجنٹ[1] آٹو وان بلو اور کارپورل آرنلڈ وان سوئلنز تھے۔ شاہی کیمپ سفارت کی قیام گاہ سے ایک میل کے فاصلہ پر تھا۔ شہنشاہی خیام میلوں تک دریائے راوی کے کنارے کنارے نصب تھے اور ایک عجیب و غریب شان و ساماں پیش کر رہے تھے۔"

سفارت کا جو نتیجہ ہوا۔ اس سے بحث نہیں۔ اس اقتباس میں مفید مطلب صرف ڈونا جلیانہ کا ذکر ہے۔ اب اگر تذکرہ کو مستند تسلیم کیا جاوے تو اسمیل کر سیس کا افسانہ ایک صدی پرانا ہوا جاتا ہے اور تاریخ کی نظروں سے بے حیا و رجو کر بالکل گر جاتا ہے۔ نتیجہ اس بحث کا یہ نکلا کہ ڈونا کا وجود اٹھارہویں صدی عیسوی میں تھا۔ نہ کہ سترھویں یا سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں۔

ڈونا جلیانہ دربارِ شاہی میں | شہزادہ کی نظر بندی کے زمانہ میں ڈونا جلیانہ نے جو خدمات انجام دی تھیں۔ ان کو شہزادہ نے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد فراموش نہیں کیا اور جلیانہ کا وہ اعزاز کیا جو کسی یورپین عورت یا مرد کو کبھی دربارِ مغلیہ میں نصیب نہیں ہوا۔ وہ خلعت میں خانم صاحبہ کہلاتی تھی۔ اور اس کی تنخواہ دھائی ہزار سکہ وقت[2] تھی لیکن شہزادہ نے مسندِ حکومت پر تمکن ہونے کے بعد اس کی تنخواہ چھ ہزار پانسو سکہ رائج الوقت کر دی تھی۔ تذکرہ میں یہ بھی تحریر ہے کہ اس کا رتبہ محلات[3] کے برابر تھا اور جب اس کی سواری کہیں جاتی تھی تو دو ہاتھی جن پر سرخ نشان اور ان کے شکم میں سفید صلیب بنی ہوئی تھیں جلو میں رہتے تھے۔ اس کو مخصوص اختیارات بھی حاصل تھے۔ نجلدان کے ایک اختیار یہ بھی تھا کہ تخمیناً دو سو یورپین و ہندوستانی مسیحیوں میں سے جو گولہ اندازوں۔ توپچیوں اور انجنیروں پر مشتمل تھے جس کو جی چاہے رکھے اور جس کو جی چاہے برطرف کر دے۔ جہان و ہنوز[4] اس کا ھتیجا انجنیر تھا اور تین ہزار پانسو روپیہ سکہ رائج الوقت تنخواہ پاتا تھا۔ وہ محلات میں بہت سربرآوردہ تھا اور امرا و اعیانِ سلطنت سب اس کا احترام کرتے تھے۔ بادشاہ پر وہ جان و روح سے فدا تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ شہنشاہ اس کو جلیانہ نہ کہہ کر "دعاگو" کہا کرتا تھا۔ اس کی مُہر میں بھی جلیانہ نہ سہی پہلے "فدویہ بہادر شاہ" کے الفاظ تھے۔ اس کی بہادری کی ایک تمثیل تذکرہ میں درج ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جنگ برادران میں ایک معرکہ کے موقع پر وہ شہزادہ معظم کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھی ہوئی تھی اور شہزادے کی نہایت دلیری کے ساتھ حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

بہادر شاہ کی وفات (۱۷۱۲ء) کے بعد اس نے ملازمت ترک کرنا چاہی لیکن درباری مسیحیوں کے اصرار سے ارادہ کو فسخ کر دیا۔ نئے شہنشاہ نے اس کی کوئی بے حرمتی نہیں کی۔ بلکہ صاحب تذکرہ تو یہاں تک مبالغہ کرتا ہے کہ بادشاہ نے اس کو تاج پوشی کا مورد ٹی حق عطا فرما دیا تھا۔

اخلاق و عادات | وہ بڑی ہی ہمہ جہت عورت تھی اور مسیحیت پر مرتے دم تک قائم رہی وہ بہت خوش اخلاق تھی اور ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتی تھی۔ وہ بہت سخی تھی چنانچہ اس کی سخاوت کے چرچے اس کی موت کے برسوں بعد تک دہلی اور آگرہ میں رہے۔ کسی تذکرہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی شادی کسی کے ساتھ ہوئی تھی۔ البتہ اس کی بھتیجی کی شادی فرانسیسی تاجر ژن جنٹل[5] کے ساتھ ہوئی تھی جو ۱۷۱۲ء میں صوبہ دار اودھ کی سپاہ میں ایک مشہور کمان دار تھا۔ جلیانہ کی کثیر جائداد دہلی و آگرہ میں رہ گئی تھی۔ اس کا ایک باغ دہلی کے قریب تھا جو لیڈی جلیانہ باغ کے نام سے موسوم تھا۔

وفات | ڈونا جلیانہ نے ستر[6] سال کی عمر میں ۱۷۳۵ء میں انتقال کیا۔ دارالسلطنت

---

[1] ENSIGN GOLFRIED BYTHARD, SURGENT OTTO VAN BULOW, AND THE CORPORAL ARNOLD VAN SWILLENZ.

[2] اس واقعہ کی صداقت ہو بکلام ہے ممکن ہے کہ تنخواہ کے بجائے جلیانہ کو جاگیر عطا کر دی گئی ہو جس کی سالانہ آمدنی چھ ہزار سکہ رائج الوقت ہو۔

[3] یہ بھی درست نہیں محلات کی طبیعہ کا اعزاز بیگمات کے برابر نہیں ہو سکتا۔ صاحب تذکرہ کو صحیح مطالعہ کا موقع نہیں ملا۔ اس وقت اس کی عمر پچپن سال کی تھی۔ لہٰذا اس کی پیدائش تقریباً ۱۶۷۵ء میں ہوئی ہوگی۔

[4] JOHN WILHOE

[5] GENTIL

میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کو اس کی موت پر افسوس نہ ہوا ہو۔ تاریخ محمد یعنی تذکرۂ عہد محمد شاہ" میں اس کا ذکر موجود ہے۔ خود اس کا خویش جنٹیل اس کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ پرتگالی نسل سے تھی اور اس کا خاندان ہندوستانیوں سے اختلاط سے محفوظ رہا تھا۔ اس نے مرتے دم تک شادی نہیں کی اور ساری عمر عفت و عصمت سے گزار دی۔ دربار میں اس کا وہ وقار تھا کہ بعض نکتہ چیں نگاروں کو مغالطہ ہو گیا۔ اور انھوں نے اس کو شاہ عالم کی حرم خیال کیا۔ یہ خیال بالکل غلط و بے بنیاد تھا۔ اور بہادر شاہ کی وفات کے بعد ہی شاید حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھ گئی اور اس کی پاک دامنی سامنے آگئی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بہادر شاہ سے اس کو ایک روحانی محبت تھی اور عقیدہ اس کا دم بھر اکرتی تھی۔ مرتے دم تک یہ حالت تھی کہ جب اپنے ولی نعمت کا نام آجاتا تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ اور آہ وزاری کا اثر اس قدر ہوتا کہ وہ پہروں کوئی کام کاج نہ کر سکتی۔

مغلوں کی تاریخ بھی گوناگوں واقعات کی بنا پر ایک عجیب و غریب تاریخ ہے۔ اور ڈونا جلیانہ کا دربار شاہی میں وجود بھی تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ عہد بہادر شاہ اور محمد شاہ کی کوئی عورت خواہ وہ ہندوستانی ہو یا ولایتی ڈونا جلیانہ سے شہرت۔ ناموری۔ عزت و وقار میں گوئے سبقت لے جا سکی ہے۔ وہ دربار میں رہ کر اس پاک دامنی سے اپنی ستتر سالہ زندگی گزار گئی کہ برسوں تک دہلی کے بچہ بچہ کی زبان پر اس کی عصمت و عفت کی داستان رہی +

شہنشاہ حسین رضوی

غزل

نہاں کسی سے وہ مستِ شباب ہو نہ سکا
حجاب لاکھ کیا پر حجاب ہو نہ سکا

تمہاری آنکھ سے ہر چند بجلیاں برسیں
ہمارے داغ دروں کا جواب ہو نہ سکا

مرا دماغ جو ہے مثلِ بوئے مے آزاد
رہینِ فکرِ عذاب و ثواب ہو نہ سکا

ہمارا شوقِ معاصی ارے معاذ اللہ
تمہارے عفو کا لیکن جواب ہو نہ سکا

ملی نہ داورِ محشر سے تا ابد شارق
عذاب میرے گنہ کا جواب ہو نہ سکا

سید ابن حسن شارق دہلوی

گل فروش

جب گل فروش کا بیٹا میٹرک پاس کر چکا تو بوڑھے باپ نے بیٹے کے ہاتھ میں ایک سائیکل دے کر یوں کہا "جا بیٹا، نوکری تلاش کر!" بالکل اسی طرح جیسے قرونِ وسطیٰ کا ناول نویس اپنے قصے کے ہیرو کو اپنی محبوبہ کی تلاش میں کسی بے آب و گیاہ خطۂ صحرائی میں چھوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی، بے چارے لڑکے کے سائیکل چلاتے چلاتے پنجے زخمی ہو گئے، ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں، وہ معصوم پھول سا چہرہ کملا گیا، مگر نوکری کہیں نہ ملی، گوہرِ مقصود نہ ہاتھ آیا پر نہ آیا۔

آخر ہار مان کر اور سائیکل کا ہینڈل توڑ کر گلفروش کے بیٹے نے اپنے بوڑھے باپ سے کہا، "ابا تو نوکری کہیں نہیں ملتی، یہاں تو اس کے لئے بڑے بڑے مارے مارے پھرتے ہیں، میں غریب کیا کروں؟"

بوڑھے باپ نے چلم پر سے راکھ جھاڑی اور رک رک کر بولا "کرنا . . . کیا . . . ہے؟ دوکان پر بیٹھ جا . . . گلفروش کا بیٹا بھی گلفروش ہے . . . پھول بیچ اور گذارہ کر . . . مولوی فہیم کہتا تھا، اس لونڈے کو انٹرنس کیوں پڑھاتے ہو۔ لمبے بال رکھے گا اور عورتوں کی طرح ناچ گانے گا، کل سے یہ زلفیں کٹا دے اور ہار بنا! . . . سنا تو نے؟"

اتنا کہنے کے پانچ سال بعد بوڑھا گلفروش راہیِ عدم ہوا۔

بوڑھے باپ کے مرنے پر گلفروش نے اپنی دکان انارکلی کی نکڑ پر کر لی۔ انگریزی تعلیم نے اسے جدت پسند بنا دیا تھا۔ اُس نے ہار اور گجروں کے نئے نئے نمونے ایجاد کئے، اور مشہور و معروف فلم ایکٹرسوں پر ان کے نام رکھے، گوہرِ آبدار، کجن ادا، گل گلاب سوچنا ہار وغیرہ اور بھی کتنے ہی دلربا اور دل کش نمونے تھے جو تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول ہوئے۔ اس کی دکان بہت چمک اٹھی، اب اس نے ہاتھ بٹانے کے لئے دو تین ملازم بھی رکھ لئے، ریڈیو بھی لگا دیا، اخباروں میں اشتہار بھی دینے لگا، چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

نرگس کا سیزن آگیا ہے۔

ہماری دُکان پر تشریف لا کر نرگسی ہاروں کے "آپ ٹو ڈیٹ" ڈیزائن ملاحظہ فرمائیے۔

گریٹا گاربو کی نئی پکچر کی تقریب پر گل گاربو کے گجرے پہنئے!

پھولوں کے خوشنما آویزے آپ کے حسن کے بہترین محافظ ہیں!

پردے کا خاص انتظام ہے!

گلفروش کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ نہایت خوشگوار نکلا، ہار، گجرے، وغیرہ پہننے کا پرانا دستور ہندوستانی سوسائٹی میں از سرِ نو زندہ ہو گیا پہلے تو تہواروں پر بھی لوگ ہار کم پہنتے تھے، مگر اب کلرک، بابو، منشی لوگ دفتر بھی پھول لے لے کر جانے لگے۔ چنانچہ سیاہی سے گندی میزیں اور فلدان پھولوں سے سج گئے، دفتر گلستان بن گئے، ہر طرف اک مہک سی اُڑی پھرتی تھی، کالج کے طلبہ تو ہاروں کے اس قدر شیدائی ہوئے کہ پھولوں کے ہار بھی اپنی ٹائی یا سوٹ کے رنگ کی مناسبت سے پہننے لگے، عورتوں اور پھولوں کا میل تو یوں بھی آنکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے مگر اب تو حد ہی ہو گئی، اگر ایک خاتون سراپا "نرگس" بنی ہوئی جا رہی ہے، تو دوسری "موتیا کی ڈالی" ایک زعفران زار تھی، تو دوسری دھان کا کھیت، جس کی بھینی بھینی خوشبو اور خوشنما ہریالی آنکھوں کو طراوت بخشتی تھی۔ ہونے کو تو یہ سب کچھ ہوا، لیکن ہندوستان کی ان قدیم روایات کو تازہ کرنے والے کا دل ہمیشہ غمگین و محزوں ہی رہا، نوجوان گلفروش ہمیشہ

یہی سوچا کرتا، کہ اگر وہ پھول نہ بیچتا، تو اس وقت تک کم از کم بی اے پاس کر لیتا، اور پھر اُس کو نوکری کہیں مل ہی جاتی، ــــ اور پھر اُس کی شادی بھی کسی تعلیم یافتہ حسین لڑکی سے ہو جاتی اور یہ بالکل اغلب تھا لیکن . . . اب . . . اب، وہ لمبے سانس بھرتے ہوئے سوچتا اب اُس کی زندگی اس پھولوں کی دُکان پر ریڈیو سُن کر اور گجرے بیچ کر برباد ہو گئی تھی، اب وہ محض ایک ویران، شکستہ، کھنڈر ماتی زندگی کا مالک رہ گیا تھا، آثارِ قدیمہ کے محکمہ کی طرح تعلیم یافتہ لڑکی تو اُس کے طبقے میں دو ہزار میں والا بجلی کا قمقمہ لے کر ڈھونڈنے پر بھی دستیاب نہ ہو سکتی تھی اور جو لوگ اپنی لڑکیاں سکولوں اور کالجوں میں پڑھانے تھے غالباً اُن کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ ان کی لڑکی کسی پھول بیچنے والے کے پلّے باندھ دی جائے، وہ سماج کا اچھوت تھا، ہری جن . . . ہری جن . . . اب ان اونچے طبقے والے لوگوں نے ایک نیا لفظ اسی پرانے خیال کو ادا کرنے کے لئے اختراع کیا ہے، کچھ بھی ہو، وہ اپنی زندگی ایک اجڈ اور بھوہڑ بیوی کے ساتھ نہیں بسر کر سکتا تھا۔ جسے نہ تو باڈیس پہننے کا سلیقہ ہے نہ ساڑھی لگانے کا قرینہ اور نہ ہی اخبار پڑھنے کی عادت جو تمام دن اپنا سر چولھے میں دئے رکھتی ہے۔ اوہ . . . وہ تو کسی "عورت" سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا، ایک باورچن سے نہیں! لیکن اس کے باوجود وہ دیگر امور میں ایک سادہ مزاج جوان سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً وہ اپنی بوڑھی ماں کی عزت کیا کرتا تھا اور گو یہ بہت حیرت کی بات ہے۔ پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اُسے اپنے ننھے بھائی سے بہت محبت تھی اور گو وہ ریشم کی خوب صورت قمیصیں پہنتا تھا جن پر لمبی لمبی خوشرنگ دھاریاں ہوتی تھیں اور عطر پھلیل لگاتا تھا، پھر بھی اُسے شراب، بیگٹ اور رنڈیوں سے بہت نفرت تھی، سینما، تھیٹر دیکھنے پر بھی اُس کے چال چلن میں کچھ فرق نہ آیا تھا، اُس کے دوست اکثر اس پر تعجب کا اظہار کیا کرتے، آخر ایک پھول بیچنے والا کیونکر شریف رہ سکتا ہے؟

اس کی بوڑھی ماں کو بھی یہی شک تھا، یوں تو وہ اس پر جان چھڑکتی تھی، مگر ڈرتی تھی کہ کہیں اس کا "نرس پاس بیٹا" آوارہ نہ ہو جائے، جو نوجوان پھول بیچتا ہو اور سینما دیکھتا ہو اس کے لئے شریف رہنا بہت مشکل ہے، آخر کب تک؟ اسی لئے بوڑھی ماں اس کی شادی پر مصر تھی، مگر نوجوان گل فروش نہیں مانتا تھا، اُس کے ناتجربہ کار شاعرانہ دل نے پڑھی لکھی لڑکی کی ایک خیالی حسین مورت بنا رکھی تھی وہ اُسی کو پوجتا تھا اور اسی سے شادی کا خواہاں تھا۔

بس یہی جھگڑا تھا، ماں ایک میٹھی، نرم مزاج، دیہاتی بہو کے حق میں تھیں اور ان کی نگاہ اپنے ہی قبیلے میں ایک قبول صورت، غریب طبیعت لڑکی پر تھی، گلفروش اس کے برعکس ایک ساڑھی نواز، سینما پسند، تھیٹری کی تلاش میں تھا . . . مگر آہ، یہ وہ تھیٹریاں تھیں جو اُس کے گلوں پر کبھی بیٹھنا پسند نہ کرتیں، کیا وہ سوسائٹی کا اچھوت نہ تھا . . . محض ایک گلفروش!

ایک سنیچر وار کی دل کش شام کا ذکر ہے، اُس دن نشاط تھیٹر میں وکٹر ہیوگو کا لافانی شاہ کار "مسز ایلمز" دکھایا جانا تھا اور گلفروش دُکان کو جلد بند کرنے اور وہاں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک چھوٹی سی "مارس" گلفروش کی دکان کے سامنے آ کھڑی ہوئی اس میں ایک جوان لڑکی اور ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھیں، گلفروش دکان کی سیڑھیاں اتر کر موٹر کے قریب گیا اور بوڑھی عورت کو مخاطب کر کے کہنے لگا: "یم صاحبہ، کیا حکم ہے"؟ اس پر جوان لڑکی نے موٹر کا پٹ کھولتے ہوئے کہا "ہمیں کچھ ہار اور گجرے چاہئیں"۔

آیئے، دُکان کے اندر تشریف لایئے۔

لڑکی نے بہت سے ہار خریدے، بہت سے گجرے، چند ایک گلدستے، چلتے وقت کہنے لگی "کل ہمارے ہاں ایک ڈانس ہے ہال روم کو سجانا ہوگا، کل اپنے آدمیوں کو ساتھ لے آؤ، کوئی چار بجے شام کو اور دو گھنٹوں میں کام ختم کر دو، ٹھیک ہے"؟

گلفروش نے جواب میں سر جھکا دیا۔

جب وہ موٹر میں بیٹھ چکی تو نوجوان گلفروش نے پھر جھک کر سلام کیا اور انگریزی میں نوجوان لڑکی سے پوچھا "سرکار آپ کا پتہ"؟

لڑکی کی آنکھوں میں حیرت کی ایک خفیف سی جھلک، اُس کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اُس نے گردن کو ایک طرف جھٹکا کر کہا "ایلیسن روڈ پلیز"۔

نوجوان گلفروش نے چلتی ہوئی موٹر کو جھک کر ایک فرشی سلام کیا، اور آہستہ سے کہا "ایلیسن روڈ پلیز"!

اس واقعے کے تین چار روز بعد گل فروش کی بوڑھی ماں کو محسوس ہوا کہ اس کا بیٹا غیر معمولی طور پر اُداس ہے۔ نہ وہ صرف کھانا کم کھانے لگ پڑا تھا بلکہ اب وہ اکثر کھانا کھاتے ہوئے نتھنوں کی ایک طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگ جاتا تھا، ایک نوالہ منہ میں، ایک نوالہ ہاتھ میں لئے وہ کچھ سوچنے لگ جاتا پھر کچھ یاد آ جانے پر ایک آہ سرد بھر کر جلدی جلدی نوالے اٹھانے شروع کر دیتا، کبھی وہ چمپا کی چاندنی جیسی سپید اور نازک کلیوں کو زرّیں تاروں میں پروتے ہوئے یکایک رک جاتا، مسکراتا، پھر یکایک غمگین ہو جاتا، اُس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے اور جب اُس کی ماں اُس سے دریافت کرتی، کیا بات ہے بیٹا؟ تو وہ اس درد بھرے سوال کے جواب میں ایک کھسیانی ہنسی ہنس دیتا اور کہتا کچھ بھی تو نہیں، اماں!

اور اماں دل میں سوچتیں، ضرور کسی لڑکی نے اس کے دل کو موہ لیا ہے، یا اللہ وہ کون ہو گی؟ — میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟

خود بے چارے گلفروش کو بھی ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، وہ ہر روز حسین عورتیں دیکھتا تھا، اُس نے تو سینکڑوں کے ہاتھوں میں گجرے پہنائے تھے، نازک اندام کلائیوں میں گجرے پہننے کے نئے نئے انداز سیکھا کئے تھے، کتنی شوخ نگاہوں کے وار سہے تھے! ہزاروں متبسم لبوں سے شہد کی طرح میٹھی بولیاں سُنی تھیں، کسی کے گداز بازوؤں کے سنڈول پن نے اُسے اتنا متاثر نہ کیا تھا، اور قوس قزحی ساڑھیوں کے خوشنما رنگ اُس کے معصوم دل پر ہمیشہ سائے کی طرح گزر جاتے تھے! لیکن اب یکایک یہ کیا ہو گیا تھا . . . جب بال روم کو سجاتے وقت وہ بھی اس کے پاس آ کر ایک دم کے لئے کھڑی ہو گئی تھی تو اس کی آنکھیں کیوں جھپک گئی تھیں، سانس کیوں ایک لمحے کے لئے رک گئی تھی اور جب وسطی فانوس کو لمبے لمبے ہاروں سے مزین کرتے وقت اُس کی انگلیاں اُس کے ہاتھوں سے چھو گئی تھیں، تو اُس کی رگوں کا خون کیوں ایک آتشیں سیال بن گیا تھا، اور پھر . . . جب . . . اُسے بال روم سجاتے دیکھ کر وہ ایک دم پیانو کی طرف چلی گئی تھی تو وہ کیوں یکایک بے تاب ہو گیا تھا اور یہ کس قدر عجیب احساس تھا کہ اُسے پیانو بجاتے دیکھ کر اُسے معلوم ہوا کہ کسی نے گویا اس کے دل کی تاروں پر اپنی انگلیاں رکھ دی ہیں اور اُن میں سے ایک رنگین و حزیں نغمہ پیدا ہو گیا ہے۔

شاید یہی احساس محبت تھا، وہ احساس جو عمر میں صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے، شاید اسی لئے گلفروش کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، اور اس نے جلدی سے ایک کونے میں جا کر اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے،

اس امر کا صحیح اندازہ لگانا گو مشکل ہے کہ لڑکی کے دل پر گلفروش کے جذبات نے غیر شعوری طور پر کیا تاثرات پیدا کئے، مگر یہ کہنے میں تو ذرا تامل نہیں، کہ اب وہ اکثر اُس کی دُکان پر آیا کرتی تھی یہی، پھولوں کے آویزے خریدنے کے لئے، کلمدستے، گجرے پسند کرنے کے لئے لیکن یہ تو ایک اتنی معمولی سی بات تھی جسے کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی تھی، کالجوں کی کتنی ہی لڑکیاں روزانہ گلفروش کی دُکان پر آیا کرتی تھیں، لیکن اس کا مطلب یہ کیسے لیا جا سکتا ہے کہ وہ سب گلفروش سے محبت کرتی تھیں، پھولوں سے محبت کرنے کا نتیجہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ باغ کے اجڑ جانے سے محبت کی تتلیاں بڑھالی جائیں، ایسی حماقت کون کرے گا؟ اور صنف نازک تو ایسے معاملوں میں ہمیشہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ دانشمندی کا ثبوت دیتی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ گلفروش کبھی غفلت میں تھا، لیکن اب تو نہ جانے اُس کی عقل پر کیا پردہ پڑ گیا تھا، جب وہ سفید ساڑھی باندھے ہوئے دُکان میں داخل ہوتی تو اس کا دل خوشی سے زور زور سے دھڑکنے لگتا، وہ سمجھتا کہ وہ خفیف سی مسکراہٹ جو اس کے رنگیں لبوں پر کبھی کبھی آ جاتی تھی صرف اُسی کے لئے تھی، اُس کی صندلی کلائیوں میں پڑی ہوئی نقرئی چوڑیوں کی میٹھی جھنجھناہٹ اُسی کے کانوں کے لئے پیدا ہوتی تھی، اور سفید ساڑی میں چھپے ہوئے کانوں میں گلاب کے پھولوں کے جھلملاتے ہوئے سرخ سرخ آویزے شاید اسی کی حریص نگاہوں کے لئے پہنے جاتے تھے۔ شاید و . . . وہ کبھی بھی خیال کر لیتا کہ وہ یقیناً اس سے محبت کرتی ہے، کبھی کسی اندھیری رات میں جب کوئی اُسے دیکھ نہ سکے، اُس کی کوٹھی کے گرد چکر لگاتا اور مغربی سمت کے ایک کمرے میں روشنی دیکھ کر خوش ہوتا اور پھر جب کبھی ایک چھریرا سا سایہ اُس روشنی میں ایک طرف سے ہو کر دوسری طرف گزر جاتا تو اُس کے دل کی حرکت یک بارگی تیز ہو جاتی اور وہ یکایک بجلی کے کھمبے کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس کرتا، پھر وہ دیر تک کھڑکی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا، حتیٰ کہ روشنی بجھ جاتی اور اس کے دل میں ایک

اندھیرا سا چھا جاتا اور وہ گھبرائے ہوئے مسافر کی طرح جو اپنا راستہ بھول گیا ہو گھر کی راہ لیتا۔

اور اماں بے چاری دل میں روز کڑھتیں، ہائے اللہ میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟ رات دن کس فکر میں غلطاں رہتا ہے، کہیں کسی کی نظر تو نہیں لگ گئی، کوئی آسیب؟ . . . پھر یکایک اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتی اور سر جھکا کر چارپائی کے پائے گننے لگ جاتی۔

اسی طرح چھ مہینے گزر گئے۔

ایک ابر آلود شام کو وہی موٹر جو آئی تو گلفروش نے دیکھا، کہ بوڑھی عورت اکیلی بیٹھی تھی، گل فروش کے جھک کر سلام کرنے پر بوڑھی عورت نے مسکراتے ہوئے کہا "کل دن کو بہت سے پھول اور ہار وغیرہ درکار ہوں گے اور رات کو کوٹھی بھی سج جائے . . ."

بہت اچھا سرکار، گلفروش نے یہ کہہ کر ایک تیز نگاہ موٹر کی خالی سیٹ پر ڈالی،

بوڑھی عورت نے پھر مسکرا کر کہا "کل مس ہرمز جی کی شادی ہے نا، بہت سے پھول چاہئیں"۔

موٹر چل دی، غریب گلفروش سر جھکائے رہ گیا۔

دوسرے دن گلفروش کو ایسا معلوم ہوا کہ اُسے ہلکا سا بخار ہے۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ مگر اُسے آج تو بہت کام کرنا تھا، وہ بہت سویرے اٹھا اور دُکان پر چلا گیا، آج وہ نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا، اس کی محبوبہ کی شادی تھی! آج اُس نے وہ وہ خوب صورت ہار اور گجرے تیار کئے جو اس سے پہلے کبھی نہ کئے تھے آج اس کی محبوبہ کی شادی تھی!!! اُس نے پھولوں کو زریں تاروں میں اٹھا کر نازک چادریں بنائیں، حسین گلدستے، کلیوں کے چند ہار تیار کئے اور موتیا کے نیم وا پھولوں سے ایک خوب صورت ٹکٹ تیار کیا۔ آج اُس کی محبوبہ کی شادی تھی!!!

گلفروش نے کوٹھی کا کونہ کونہ پھولوں سے سجا دیا، وہ آج نہایت انہماک سے کام کر رہا تھا۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر، بھاگا پھر رہا تھا، اپنے ملازموں کو ہدایات دیتا جاتا تھا، کتنی گہما گہمی تھی، کتنی رونق تھی!

بوڑھی عورت مسکراتی ہوئی اِدھر سے اُدھر نکل جاتی اور ایک سفید ماڑھی والا گوری رنگت کا آدمی بہیوں والی آرام کرسی میں بیٹھا ہوا کرسی کو ہینڈل گھما کر اِدھر اُدھر دھکیلتا ہوا لے جا رہا تھا، ایک کمرے میں اُس نے اپنی محبوبہ کو بھی دیکھا تھا، وہ اپنے قبول صورت بھائی کے پاس بیٹھی ہوئی جھکی ہوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی اور پھر وہ دونوں آہستہ سے ہنس پڑے تھے، بھلا اُسے دیکھ کر وہ گھبرا کر کیوں کھڑی ہو گئی تھی! ایک لمحہ ——— صرف ایک لمحہ کے لئے گلفروش نے اُسے ملامت بار نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا، کیا لڑکی کے نازک رنگیں لب نرگس کی طرح زرد نہ ہو گئے تھے اور کیسے گلفروش نے واقعی اُس کی نگاہ کی خطاداریاں دیکھ لی تھیں؟ شاید یہ اُس کا وہم ہی تھا، کیونکہ دوسرے لمحہ ہی میں وہ اپنے بھائی سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئی تھی۔

کام کرتے کرتے شام ہو گئی، آسمان پر تارے نکل آئے، کوٹھی میں برقی قمقمے روشن ہو گئے، آج دن بھر سے گلفروش بھوکا تھا، بھوکا! نہیں۔ اُسے بھوک لگی ہی نہ تھی، اب اُس کا کام ختم ہو گیا تھا، کوٹھی سج چکی تھی، ہینڈ بج رہا تھا، گلفروش باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ وہ کدھر جائے! اُسے چاروں طرف اندھیرا نظر آ رہا تھا، اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا، . . . وہ جانے سے پہلے اپنی محبوبہ کو ایک لمحہ کے لئے دیکھ لینا چاہتا تھا، اُس نے ایک نیلے سے رومال میں موتیا کے پھولوں کا بنا ہوا مکٹ لپیٹ رکھا تھا، کاش وہ اپنے ہاتھوں سے یہ مکٹ اُسے پہنا سکتا اور پھر اُس کے قدموں میں گر جاتا ———

بے وقوف گل فروش!

رات کے نو بجے فلیش روڈ سے موٹریں چلنا شروع ہوئیں آگے آگے نوشہ کی کار رنگی پھولوں سے سجی ہوئی اس میں دولھا اور دُلہن بیٹھے تھے، اس کے پیچھے پیچھے بیس موٹریں مشورہ مچاتی ہوئی آ رہی تھیں، فلیش روڈ سے ٹرنکن روڈ تک لوگوں کا بہت ہجوم تھا بلند قہقہے، اور ہارنوں کے دل خراش نغمے، موٹروں کے انجنوں کی دھیمی آواز اور کسی آوارہ کتے کا بھونکنا . . . خدا خدا کر کے جب ٹرنکن روڈ گزر گئی تو موٹروں نے تیز ہونا شروع کیا اور جب فاپ ڈو آ گئی تو نوشاہ کی کار خوشی سے اُڑی جا رہی تھی، یہاں ایک خوشگوار سا اندھیرا تھا، بجلی کے کھمبے بھی دُور دُور تھے اور دور وہ گھنا درخت

کھڑے تھے۔

یکایک نوشاہ کو سامنے سے ایک شخص بھاگتا ہوا نظر آیا، اُس کے بازو کھلے تھے اور وہ عین موٹر کی سمت دوڑتا ہوا آرہا تھا، نوشاہ نے زور سے ہارن بجائے، نوشاہ نے موٹر کو ایک طرف کرنا چاہا، نوشاہ نے بریک دبائی، مگر آہ یہ سب کچھ بہت دیر سے ہوا، وہ پاگل شخص موٹر کے نیچے آچکا تھا، اُس کی چھاتی اور بائیں بازو سے خون بہ رہا تھا۔

دلہن ایک دلخراش چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

نوشاہ اور موٹروں میں بیٹھے ہوئے اور لوگ کر بھی کیا سکتے تھے، اُسے اٹھا کر اُسی دم ہسپتال لے گئے، زخمی کو فی الفور آپریشن روم میں لے جایا گیا، باہر کمرے میں سب لوگ بیٹھے ہوئے سوچنے لگے، آہ بے چارے کو بہت چوٹ آئی ہے، وہ کیوں موٹر کے نیچے آگیا؟ وہ کون ہے؟ کیا وہ بچ جائے گا؟ آخر ایک صدیوں کے لمبے عرصے کے بعد ڈاکٹر باہر آیا، اور نوشاہ کو کہنے لگا "آخری لمحوں پر ہے، تمہاری مسز کو بلاؤ"

گلفروش میز پر لیٹا ہوا تھا، چھاتی پر پٹی بندھی تھی جو خون سے سُرخ ہو چکی تھی، لڑکی کو دیکھ کر اُس کے زرد چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے لڑکی کی جانب اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا آہ اس ہاتھ کی لرزتی ہوئی انگلیوں نے اُسی موتیا کے مکٹ کو تھام رکھا تھا، مکٹ خون آلود تھا، پھول والے نے اپنے پھولوں کے ساتھ خون کی ہوئی کھیلی تھی، کس لئے؟ کیا اس ملاقات کے لئے؟ ——— بے وقوف گل فروش!

لڑکی نے ایک قابل وقعت کے لئے گل فروش کی طرف دیکھا، پھر اس کا سر اُس کی چھاتی پر جھک گیا اور لڑکی نے دونوں ہاتھ بڑھا کر مکٹ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا، جیسے کوئی کسی معصوم یتیم بچے کو اپنی گود میں لے لے گلفروش کا بازو آہستہ سے میز پر گر گیا، اُس نے اپنی روح کی پوری قوت سے لڑکی کی طرف دیکھا، پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں، شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا، اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم نمودار ہوا، یہ چراغ سحری کی جھلملاتی ہوئی لو تھی۔

گلفروش کا اکھڑا ہوا سانس مدھم ہو گیا، ڈاکٹر نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا، گلفروش کے لب کانپے، ہلکی ہلکی ایک دو ہچکیاں آئیں۔

چراغ بجھ گیا!

لڑکی رونے لگی

"یہ کون تھا؟" ڈاکٹر نے آہستہ سے پوچھا

کوئی اس کے نام سے واقف نہ تھا . . . نوشاہ روتی ہوئی دلہن کو بازوؤں میں تھام کر باہر لے گیا۔

ڈاکٹر نے اپنے شانوں کو ایک خفیف سی حرکت دی اور نرس سے بولا "دوسرا مریض لاؤ!"

دنیا کے اس بھرے ہسپتال میں یہی ہوتا ہے جب ایک مریض مرجاتا ہے تو دوسرا اُس کی جگہ فوراً آجاتا ہے۔

اس حادثے کے چند دنوں بعد گل فروش کا ننھا بھائی اپنی دکان پر انارکلی کے نکڑ کے قریب، تو تلی زبان میں گجرے اور پھول بیچ رہا تھا، اور ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے باپ کی انگلی پکڑے ہوئے اُسے نہایت دلآویز لہجے میں مجبور کر رہی تھی کہ وہ اُسے ننھے گلفروش کی دکان سے چنبیلی کے پھولوں کے دو ننھے آویزے خرید دے۔

(طبع زاد)

کرشن چندر ایم اے

آزاد ملاح

مشرق کے دریچہ سے جب سورج صبح سویرے جھانکتا ہے
دریا سے اٹھتی موجوں پر اک رنگیں سایہ کانپتا ہے

سورج کی روپہلی کرنیں میری پیشانی کو چومتی ہیں
آزاد ہوا کے جھونکوں میں نورانی پریاں جھومتی ہیں

جس کشتی میں شب گزری ہے موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہے
لہروں کی زد سے بچتی ہے ساحل سے جا ٹکراتی ہے

دریا کی لہروں کے نغمے ایسے سننے میں آتے ہیں
جیسے میری بے فکری کی نیندوں سے وہ شرماتے ہیں

کیا وقت سہانا ہوتا ہے یہ فطرت کے نظاروں کا
ہر موج لئے ہوتی ہے پر تو رخصت ہوتے تاروں کا

میں ایسے میں جاگ اٹھتا ہوں اٹھ کر انگڑائی لیتا ہوں
منظر نیگاہیں ہوتی ہیں ہنستے ہوئے کشتی کھیتا ہوں

لہروں کے نغمے سنتا ہوں دریا کو گیت سناتا ہوں
فطرت کی پرستش کرتا ہوں آزاد ترانے گاتا ہوں

میں خود فطرت کا حصہ ہوں آزاد ہوا میں پلتا ہوں
میں طغیانی پر ہنستا ہوں میں طوفانوں سے لڑتا ہوں

منجدھار میں جب لہروں کے طوفاں کشتی سے ٹکراتے ہیں
یہ اونچے اونچے پربت میری ہمت سے شرماتے ہیں

بادل برسے بجلی چمکے طغیانی یا طوفان آئے
ناممکن ہے ماتھے پر بل ہمت میں فرق اک آن آئے

جب بادل گھر کر آتے ہیں میں خوابوں میں کھو جاتا ہوں
کشتی کو بہاؤ پر چھوڑے سستاتا ہوں سو جاتا ہوں

یہ کشتی میری دنیا ہے میں دنیا کا پابند نہیں
ہر چیز میسر ہے مجھ کو سو شکر کہ حاجت مند نہیں

جب تک ہیں توانا یہ بازو میں کشتی کھیتے جاؤں گا
ہر روز نئے منظر ہوں گے آزادی کے گن گاؤں گا

دن رات اسی میں بیتے ہیں دن رات اسی میں بیتیں گے
سب کھیل ہیں یہ آزادی کے کیا ہاریں گے کیا جیتیں گے

بچپن میں فسانے سنتا تھا کس شوق سے ایک جزیرے کے
(پریوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ سیلاب زدہ کشتی گھیرے)

اک روز مری کشتی بھی یونہی سیلاب زدہ کہلائے گی
دنیا کے لئے میری ہستی اک افسانہ بن جائے گی

نذیر میرزا برلاس

کیمورہ

ہندوستان میں بہت کم آدمی کیمورہ کے نام سے آشنا ہوں گے یہ دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک خفیہ سوسائٹی ہے۔ گو پچھلے دنوں میں اس کی سرگرمیاں ایسی زیادہ سننے میں نہیں آئیں۔ لیکن اس کے ممبر بدستور سٹرول اطالویوں کو جو اٹلی اور ریاستہائے متحدہ یا دوسری جمہوریتوں میں آباد ہیں اپنا شکار بنا کر لوٹ رہے ہیں۔

یہ قدرت کی ایک عجیب ستم ظریفی ہے کہ اس سوسائٹی کی بنا اُن چند خیر اور متقدر ہستیوں نے ڈالی جن کا عندیہ دراصل رہا شدہ قیدیوں کی امداد کرنا تھا۔ ابتدا میں یہ سوسائٹی موسوم بھی دا شدہ قیدیوں کی امدادی سوسائٹی کے نام سے تھی لیکن اس وقت اُن ہمدردانِ بنی نوع انسان کو کیا علم تھا کہ یہی سوسائٹی کچھ دنوں میں اٹلی کے نامی مجرموں کا اکھاڑہ بن جائے گی۔

قیدی جیل سے رہا ہو کر آتے اور دوبارہ قید ہونے تک اس سوسائٹی کے بانیوں کی سخاوت سے فایدہ اٹھاتے۔ رفتہ رفتہ اس سوسائٹی کے مخلص کارکنوں نے نہایت خلوص نیت سے اپنے ایک جلسے میں منظور شدہ قرارداد کے مطابق ان رہا شدہ قیدیوں میں سے چند ایک کو اپنی مجلسوں میں شریک ہونے کی اجازت دے دی اور چونکہ وہ چند مجرم اور سزا یافتہ ہونے کے ساتھ ہی ایک اعلیٰ دماغ کے مالک بھی تھے اس لئے انہوں نے ایک قلیل عرصے میں اپنے محسنوں کو نکال باہر کیا اور خود ان کی جگہ پر مسلط ہو گئے۔ جب ایسا کر چکے تو سوسائٹی کے کاغذات سے حاصل کردہ اطلاعات کو استعمال بالجبر کا ذریعہ بنا لیا اور اپنے ایجنٹوں کی وساطت سے جو ہر قصبہ ہر موضع اور ہر شہر میں موجود تھے۔ اٹلی کی تمام تر جرائم پیشہ آبادی کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا۔

یہ مختصر طور پر اس سوسائٹی کی تاریخ ہے۔ اس سوسائٹی میں داخلہ کے وقت امیدوار کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں اور اس کا خون نکالا جاتا ہے۔ یہ تمام رسوم ایک حجرے میں ادا ہوتی ہیں اور ان کا مقصد امیدوار کی قوتِ برداشت کا امتحان لینا ہوتا ہے۔ اگر اس امتحان میں امیدوار پورا اترے تو سوسائٹی کی طرف سے گویا اُسے اس بات کا لائسنس مل جاتا ہے کہ وہ مجرمانہ زندگی کو اپنا ذریعۂ معاش بنا سکتا ہے، اور سوسائٹی اس کی نگراں ہے۔ پابندی جو عاید کی جاتی ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ اپنی آمدنی کا فی صدی کچھ حصہ سوسائٹی کو باقاعدگی سے ادا کرتا رہے

کیمورہ کی طاقت۔ اقتدار اور رسوخ کا اندازہ ہمیں ڈکٹر وبوریلی (Vincenzo Borelli) کی زندگی کے نشیب و فراز سے ہو سکتا ہے اس شخص کو قدرت نے ایک غیر معمولی دماغ و ولیت کیا تھا۔ اس کی علمی استعداد اس بات سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ ابھی اس کی عمر پچیس سال سے کم ہی تھی کہ وہ یونیورسٹی کا پروفیسر انتخاب کیا جا چکا تھا۔ لیکن جہاں اس کا دماغ اس پایہ کا تھا۔ اس کی فطرت ابتدا ہی سے چوری کی طرف مائل تھی۔ جب اس کے طالب علموں کی ہیت حضیری مالیت کی متعدد چوریوں کا سراغ اس تک پہنچا تو اسے بہت بے آبروئی سے یونیورسٹی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ وہ اس وقت سے پانچ سال قبل کیمورہ کا ممبر بن چکا تھا۔ اب چونکہ اس کا یہ ذریعۂ معاش منقطع ہو چکا تھا اس نے چوری کو جو اس سے پہلے اس کے لئے محض ایک شغل تھا بطور پیشے کے اختیار کرنے کا تہیہ کر لیا۔

بوریلی کے اس اقدام نے اطالوی پولیس میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ روم، نیپلز اور دیگر شہروں کی پولیس کو بہت جلد آگاہی ہو گئی کہ دنیائے جرائم میں ایک نہایت خطرناک شخصیت کا اضافہ ہو گیا ہے لیکن اس مجرم کی شناخت جسے ہر دستخط کی نقل اتارنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے لئے ناممکن تھا اور وہ مجرم بوریلی کے اور کوئی دوسرا نہ تھا۔ بوریلی کی راہ میں جتنی مشکلیں پیش آئیں ان کا دور کرنا کیمورہ کے ذمے تھا۔ اس کے کارکن اسے تمام ان آدمیوں کے نام اور پتے بہم پہنچاتے جن کا کاروبار روپے کا لین دین تھا یا جن کا بنکوں میں کثیر تعداد میں روپیہ جمع تھا۔ اس کے

ساتھ ہی مختلف کاروباری فرموں اور بنکوں کے نام سے بھی مطلع کرتے۔ ایسا کرنے والے ان متمول آدمیوں کے یا تو نجی ملازم ہوتے یا بنکوں کے کلرک اور مینیجر۔ کیونکہ اس وقت تک اس سوسائٹی میں حکومت کے وزراء، کروڑپتی سوداگر بنکوں کے مینیجر، پولیس کے افسران۔ غرضکہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے آدمی شامل ہو چکے تھے اور کرنی الواقع ایسا ہی تھا۔ اس کے ثبوت کا خود بوریلی کی زندگی کا ایک واقعہ شاہد ہے۔

بوریلی نے رات کی تاریکی میں ایک امیر کروڑپتی رجنیلڈ کے قرب میں رہتا تھا) کے گھر میں داخل ہو کر اس کی نجی دراز کھولی اور اپنی پتلون۔ کوٹ۔ واسکٹ قمیص کی جیبیں نوٹوں سے بھر لیں جتنے وقت جتنے زیورات اس کے ہاتھ سنبھال سکتے تھے وہ بھی لے لئے اور نہایت اطمینان سے ٹہلتا ہوا مکان سے نکل کر باہر سڑک پر آ گیا۔ ابھی وہ کچھ دور نہ گیا تھا کہ دو پولیس مینوں نے اُسے پیچھے سے آن دبوچا۔ بوریلی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پولیس حالت میں یقیناً بدحواس ہو جاتا۔ لیکن وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ انہیں کیس کھول کر سگریٹ پیش کئے اور ان کے انکار پر خود سگریٹ جلا کر کہنے لگا "میں کمپورسٹ (یعنی کمپورہ کا ممبر ہوں، تمہیں بھی لازم ہے کہ ہماری جماعت میں داخل ہو جاؤ۔ ان دنوں پولیس والوں کے لئے بوریلی ایسے مجرم کو گرفتار کرنا باہم ترقی و شہرت پر پہنچنے کے مترادف تھا۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا "ایسی صورت میں تو ہمارا محکمہ سے نکال دیا جانا یقینی ہے، بوریلی نے اس پر ایک بہت زور سے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا "مجھے تمہاری اس سادگی پر حیرانی ہے۔ واللہ رستم تو بالکل احمق معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا افسر اعلیٰ تو ہماری سوسائٹی کا ایک سرگرم کارکن ہے اور علیٰ ہذا القیاس اس کے چیدہ چیدہ ماتحت بھی۔ کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں۔ بہت اچھا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو اور خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر لو۔"

بوریلی پولیس چوکی پہنچا۔ وہاں اس نے دو تین گھنٹے اپنے تین ممبر ساتھ خوش گپیوں میں گذارے اور چونکہ وہی تین ممبر اس چوکی کے افسر اعلیٰ تھے اس لئے یہ بات کچھ ایسی تعجب انگیز نہیں کہ وہ صبح سے پیشتر اپنے بستر استراحت پر نہایت سکون سے خراٹے لے رہا تھا۔

چند سال میں وہ بکمز بوریلی باستثنائے سردار علی اٹلی کا سب سے زیادہ مالدار مجرم بن گیا تھا۔ یہ سابقہ پروفیسر اس وقت بارہ مرکزوں سے ایک کا سردار تھا اور اس کی آمدنی کا ذریعہ نہ صرف اس کے اپنے جرائم تھے بلکہ وہ نذرانہ بھی تھا جو کم درجہ کے مجرم اسے ادا کیا کرتے تھے دولت کی اس فراوانی سے اس کے دل میں وہ امنگیں پھر عود کر آئیں جو کبھی اس کی شریفانہ زندگی میں اس کے دل میں جاگزیں تھیں۔ اسے وہ وقت یاد آیا۔ جب وہ نوی عزت لوگوں کا ہم جلیس تھا۔ اس کے ضمیر کا تقاضا اب یہ تھا کہ وہ مجرمانہ زندگی ترک کر کے اعلیٰ طبقہ کی سوسائٹی میں رسوخ پیدا کرے اور چونکہ اس کے پاس دولت موجود تھی۔ اس لئے اس کے لئے یہ بات کوئی مشکل نہ تھی۔ اس نے اب مصمم ارادہ کر لیا کہ اس وقت سے بعد اسے جرائم پیشہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس ارادے کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس نے نیپلز سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر ایک مکان کرایہ کیا اور وہاں بڑے تزک و احتشام سے رہنے لگا۔ اس کی ظاہری شان اور سخاوت نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا لیا۔

اس کے دو سال بعد پارلیمنٹ کے الیکشن کا وقت آیا۔ بوریلی اپنے حلقہ سے بطور امیدوار کھڑا ہوا۔ اس کا مقابلہ ایک سابقہ وزیر کے ساتھ تھا۔ لیکن اس کی ذات اس وقت تک کچھ ایسی اہمیت پکڑ گئی تھی کہ اس نے کثیر التعداد ووٹوں سے اپنے مقابل پر فتح پائی۔

پارلیمنٹ میں آ کر سابقہ پروفیسر نے اپنی علمی قابلیت کے ایسے جوہر دکھلائے کہ وزیر اعظم کی نظر انتخاب اس پر پڑی اور اس نے بوریلی کو ایک ڈنر کے دوران میں اشارۃً جتا دیا کہ وہ مستقبل قریب میں کسی وزارت کے لئے امیدوار رکھے۔

وزیر اعظم کے اس امید دلانے پر بوریلی کا حوصلہ بڑھا اور وہ اپنی منزل مقصود کے قریب تر پہنچتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ اس سابقہ پروفیسر نقب زن اور جیل ساز نے اپنے ماضی اور مستقبل کا جائزہ لیا۔ وہ ابھی تک کمپورہ کا ممبر تھا اور اس کے احکام کا پابند۔ وہ بظاہر ایک سیاست دان تھا۔ لیکن کمپورہ کا سالانہ چندہ باقاعدہ ادا کر رہا تھا۔ چندہ کی ادائیگی اسے کسی طور گراں نہ گزرتی تھی۔ اگر اس ادائیگی پر ہی بس ہوتی تو بوریلی کبھی کوئی خطرناک قدم نہ اٹھاتا۔ لیکن جبابت اسے پریشان کر رہی تھی وہ یہ حقیقت تھی کہ جوں جوں وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا اس کے خفیہ دوستوں کی فرمائشیں بڑھتی چلی جائیں گی اور ہر جرم میں خواہ وہ کیسا ہی تباہ کن کیوں نہ ہو ان کی امداد کرنا اس کا فرض اولیں ہوگا۔ اس کے ہم راز اس سے یہ امید رکھیں گے کہ وہ اپنا اثر ان کی بہبود کے لئے بروئے کار لائے۔ ان تمام باتوں کے معنی یہ ہوں گے کہ اسے اپنی یہ ترقی کچھ دیر

کے لئے زور شور کرے گی لیکن آخر حیت جلد وہ وقت آجائے گا جب وہ اپنے دوستوں کے تقاضے پورے نہ کرسکے گا اور اس کلازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے رفقاء اسے معطون کرنے کے بعد اسے قعر مذلت میں ڈال دیں گے۔ وہ یہ خوب جانتا تھا کہ جس ممبر کے خلاف ایک مرتبہ کیمورہ کے کارکن ہو جائیں۔ اس کا ٹھکانہ اس دنیا میں قبر ہی ہو سکتا ہے۔

ان خطرناک نتائج سے گریز کی راہ بھی ویسی ہی پُرخطر تھی بہت تفکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر اسے اپنے ساتھیوں کے غیظ سے رہا ہونا ہے تو اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ کیمورہ کے ممبروں سے غداری کرے اور حکومت کے سامنے اپنے تمام پرانے رفیقوں کے نام پیش کر دے اور بیک وقت ان سب کو گرفتار کرا کر ان سے گلوخلاصی کرالے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اگر وہ سب ایک مرتبہ بھی جیل کی کوٹھڑی میں مقید ہو گئے تو حکومت کبھی بھی انہیں آزاد نہ کرے گی اور اگر وہ خود قدرے ہوشیاری اور چالاکی سے کام لے گا تو اطلاع دہندہ کا نام بجز اس کی اپنی ذات کے اور وزیر اعظم کے کسی دوسرے کو معلوم نہ ہو سکے گا۔

چنانچہ ایک شب جب وہ وزیر اعظم کے ساتھ تخلیہ میں کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے قہوہ پینے کے دوران میں اپنے افسر کے سامنے کیمورہ کے لیڈروں کی فہرست پیش کر کے اسے حیران کر دیا۔ اس فہرست کے ساتھ ہی اس نے ان لیڈروں کی جائے رہائش کا پتہ بھی دے دیا۔

بوریلی اب خوش تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ اب اس کی ترقی کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی اور اب اس کی سیاسیات میں کامیابی یقینی ہے۔ انہیں خوش خیالیوں میں اپنے ہوٹل پہنچا۔ وزیر اعظم کی ملاقات کو ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ جونہی اس نے اپنے کمرے میں قدم رکھا ہوٹل کے خادم نے رجوخود بھی کیمورسٹ تھا) اسے اطلاع دی کہ کیمورہ کے سردار اعلیٰ نے وکٹر بوریلی کو غداری کے جرم میں قتل کر دینے کا حکم جاری کر دیا ہے۔

یہ سنتے ہی بوریلی کے اوسان خطا ہو گئے۔ اب اس کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ اسی دم بغیر ایک لمحہ بھی ضائع کئے گراس کے لئے ممکن ہو تو انگلستان سے نکل جائے۔ چنانچہ وہ الٹے قدموں ہوٹل سے باہر نکلا اور سیدھا سوہو (انگلستان) میں جا کر دم لیا جہاں وہ ایک گمنام سے ہوٹل میں اپنا نام تبدیل کر کے قیام پذیر ہوا۔ اس نے اس خاص مقام کو کئی وجوہات کی بنا پر انتخاب کیا تھا سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ سزائے موت کی تعزیرات سے لڑائی جا چکی تھی۔ لیکن انگلستان کی تعزیرات میں قتل عمد کی سزا موت ہی تھی اور بوریلی جانتا تھا کہ اس کے ہم وطن رفیقوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو سردار اعلیٰ کے احکام کی تعمیل میں تختۂ دار پر لٹکنے کے لئے تیار ہو۔ پس جب تک وہ انگلستان کی سرزمین میں موجود ہے کوئی کیمورسٹ اس کے قتل کا مرتکب ہونے کی جرأت نہ کر سکے گا اس لئے گولندن میں جتنے بھی کیمورسٹ تھے ان سب کو یہ علم تھا کہ وہ دراصل کون ہے اور اس کے خلاف سردار اعلیٰ نے کیا حکم صادر کر رکھا ہے۔ لیکن بوریلی محفوظ رہا اور کسی نے اسے کوئی گزند نہ پہنچایا۔ اس کی نگرانی چوبیس گھنٹے کی جاتی تھی اور فی الحال اسی پر اکتفا کیا گیا تھا۔

یہ تمام باتیں بوریلی کے حق میں تھیں۔ لیکن اس سے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی موت کا حکم دینے والے انجان تھے اور حکم دینے سے پیشتر بوریلی کے فرار ہونے کا امکان ان کے تصور میں نہ تھا۔ وہ خود اطالوی تھے اور اطالوی نفرت سے کما حقہٗ واقف تھے۔ انہیں علم تھا کہ ایک اطالوی جس کی جیب میں پیسہ ہو۔ وطن سے زیادہ عرصہ تک دور نہیں رہ سکتا اور پھر بالخصوص لندن میں۔ جہاں کی گہر آلود فضا اور مرطوب ہوا ایک اطالوی کو ہر وقت اپنے وطن کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ جس کے پُرفضا پہاڑوں اور میدانوں پر سورج چمکتا رہتا ہے۔

بوریلی پارلیمنٹ سے غیر حاضر رہنے کی وجہ سے اخبارات کی نکتہ چینیوں کا آماجگاہ بن چکا تھا اور کچھ اس وجہ سے اور بہت حد تک اپنی فطرتی کمزوری کے باعث جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) آخر کیمورہ کی توقعات کے عین مطابق انگلستان میں صرف چند ماہ گزرنے کے بعد اٹلی واپس آیا۔ اسے خیال تھا کہ شاید اس کے پرانے رفیقوں کی دھمکیاں بے اثر ہو گئی ہیں اور وہ اس کے درپے آزار نہیں لیکن یہ خیال اس کا محض غلط تھا کیونکہ اس کی آمد کے دوسرے ہی دن جب وہ نیپلز میں سڑک پر سے گزر رہا تھا ایک شخص بنام اپاسٹنوئے نے بہت اطمینان قلبی سے پستول کی گولی کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بوریلی کے زمین پر گرتے ہی قاتل کو چاروں طرف سے اس کے مداحوں نے جکڑ لیا۔ عورتوں نے وفور جوش کے زیر اثر اس کا منہ بنے نابنے طور پر کئی کئی مرتبہ چوما۔ اس کے پاؤں کے تلے پھول بچھائے گئے اور پولیس اور قاتل کے درمیان اس قدر ہجوم تھا کہ پولیس والوں کو ہجوم کے پیچھے ہٹانے کے لئے ایک خاصی لڑائی لڑنی پڑی۔ وہ اپاسٹنوئے زندہ باد کے نعرے لگاتے گئے۔ وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا کہ وہ اسے زیادہ دیر جیل میں نہ رہنے دیں گے۔ عورتیں اسے اس شب میں اسے تمام قوم پرستوں کے ساتھ مشابہت دے رہی تھیں حکومت نے اس لئے ۱۷ کیمورسٹوں کو گرفتار

تھوڑے وقت کے لئے سزا قید دی۔ ان میں سے ایپاسٹو کو ۸ سال قید ہوئی لیکن وہ چار سال قید بھگت کر باہر آ گیا۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جس دن ایپاسٹو نے مرکہ ماتا تھا اس دن اس کے نام مختلف بنکوں میں بے شمار روپیہ جمع کیا گیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے کیمورہ کے سردار اعلیٰ کے حکم کی تعمیل کی ہے اور یہی روپیہ تھا جس سے اس نے اپنی رہائی کے بعد بے طرح عیش اڑانی شروع کر دی تھی۔

کیمورہ کے نام کے ساتھ جزف پریسٹینو کا نام بھی وابستہ ہے یہ ایک اٹلی نژاد تھا جس نے امریکہ میں جا کر خفیہ پولیس میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ امریکا جانے سے پہلے اسے کیمورہ کے متعلق ہر قسم کی واقفیت ہو چکی تھی۔ اس کی بنا پر اس نے وہاں جا کر وہاں کے کیمورسٹوں کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا اور ایک حد تک کامیاب بھی رہا۔ اس کی کامیابی کا سن کر اطالوی حکومت نے بھی اس کی خدمات حاصل کرنے کی استدعا کی۔

پریسٹینو پہلی مرتبہ جب اٹلی آیا تو اس جگہ کیمورسٹوں کو اس کی آمد نے بہت متوحش کیا۔ اس نے اپنا لائحہ عمل حکومت کے سامنے پیش کیا اور اس پر کاربند ہونے کے لئے زور دیا۔ وہ اٹلی میں بھی کامیاب رہتا۔ لیکن یہاں اس کے لئے دشواری یہ تھی کہ پولیس میں ایسے آدمی کم تھے۔ جو دل سے تو کیمورسٹ نہ ہوں یا جو کیمورہ سے مخوف نہ ہوں یا جو کم از کم کیمورہ والوں کی دولت کے فریب میں نہ آئیں تاہم اس نے اطالوی پولیس میں سے اکثر کیمورسٹوں کو نکال دیا اور کسی حد تک پولیس کا معیار بھی بلند کر دیا لیکن کامل کامیابی ناممکن تھی۔

اس کی پہلی آمد کے دوران میں کیمورہ والوں کا داؤ نہ چل سکا۔ اور وہ بخیر و خوبی امریکا جا پہنچا۔

جب دوبارہ پریسٹینو کو اطالوی حکومت نے بلایا تو اس کی موت سر پر منڈلا رہی تھی۔ کیمورہ والے اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ اس دفعہ وہ اسے کسی صورت میں بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اٹلی کے بندر پر قدم رکھنے کے چند گھنٹے بعد ہی کیمورہ والوں نے اُسے موت سے ہمکنار کر دیا۔

اس کا قتل دن دہاڑے شارع عام میں اس کے ہوٹل کے سامنے ہوا۔ بوریلی کے قاتل کی طرح پریسٹینو کا قاتل مداحوں سے گھیرے جانے سے پہلے ایک پولیس مین کی جو وہاں ڈیوٹی پر موجود تھا گولی کا نشانہ ہو گیا۔ کچھ دیر کے لئے پریسٹینو کے قتل نے اطالوی سیاست میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ کیمورہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور اس سوسائٹی کو دنیا کے تختے سے نابود کر دینے کا حکومت سے مطالبہ ہوا۔ لیکن یہ جوش محض ہنگامی تھا اور گو اطالوی حکومت نے کیمورہ کو نیست کر دینے کے لئے بہت جد و جہد کی۔ لیکن نتیجہ آخر میں سوائے چند ایک گرفتاریوں کے اور کچھ نہ ہوا۔

زمانۂ حال میں بھی تقریباً ہر بیس سال کے بعد کیمورہ کے ممبروں کی گرفتاری کے لئے عام اعلان صادر ہوتا ہے اور بہ حرف زیر کشیران کے کئی ایک گروہ گرفتار کئے جا کر معمولی سے وقت کے لئے قید بھی کئے جاتے ہیں لیکن یہ سزا بذات خود غیر مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ ایسے مقدمات میں سے حال ہی میں ایک مقدمے کی سماعت اٹھارہ ماہ ہوتی رہی اور جیسا کیمورہ والے امید کرتے تھے۔ اتنے دراز عرصے میں پبلک کی ہمدردی بجائے حکومت کے ساتھ ہونے کے ملزموں کی طرف تھی۔ کیونکہ پبلک کو ملزموں کا اتنے عرصے تک مقدمے کی سماعت کی مصیبت جھیلتے رہنے میں سراسر گورنمنٹ کا قصور نظر آتا تھا۔ درپردہ یہ کیمورہ کے سردار اعلیٰ کی ایک چال تھی جس کی کوشش سے مقدمہ کو اس قدر طول دیا گیا تھا۔ کیمورہ والے اپنے ہم قوموں کے جذبات سے واقف تھے اور وہ اطالوی پبلک کی ہمدردی اپنی طرف حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اس مقدمے میں بے دریغ روپیہ ملزموں کی طرف سے خرچ کیا گیا تھا اور اس روپے کا ذریعہ وہ فنڈ تھا جس میں ہر کیمورسٹ کا نذرانہ جمع ہوتا ہے۔ ان ملزموں میں اٹلی کے فاضل ادیب۔ بڑے بڑے عالم، ذی عزت اور با اقتدار اشخاص بھی شامل تھے۔

باوجود حکومت کی کوشش کے کیمورہ کی سرگرمیاں اسی طرح جاری ہیں۔ آج کل بھی یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ایک قاتل جو کیمورہ کا ممبر ہو۔ وہ ایک کیمورسٹ جج کے سامنے پیش ہو اس کے مقدمے میں رائے دینے والی جیوری کے تمام کے تمام ممبر کیمورسٹ ہوں اور وہ ایسے جیل خانے میں سزا بھگتے جس کا سٹاف دارو نہ جیل سے لے کر معمولی سے معمولی چپڑاسی تک کیمورسٹوں پر مشتمل ہو۔

(ترجمہ)

محمد منظور الٰہی بی اے۔ ایل ایل بی

نوائے فراق

ایک آنکھوں کا اثر، تاثیر اک رفتار کی
موجِ مے کا لڑکھڑانا۔ بے خودی میخوار کی

پارسا کی پارسائی، مستیاں مے خوار کی
وہ فقط حسرت، یہ شان و کیفیت دیدار کی

کنجِ زنداں میں تو مجھ کو وسعتِ صحرا کی یاد
حسرتیں صحرا میں زنداں کے در و دیوار کی

بن چکے ہیں وصل و فرقت اک پیامِ بیخودی
مل چکی ہیں سرحدیں اقرار سے انکار کی

کیا کہیں، کیونکر کہیں، کیا ہے وہ چشمِ نیم باز
مست کی مستی بھی ہشیاری بھی ہے ہشیار کی

حسنِ رسوا۔ اور رسوائے جہاں ہوتا رہے
تھی یہی ساری حقیقت نکہتِ گلزار کی

دکھتے دل سے نغمۂ سازِ محبت چھیڑ دے
آپ رک جائیں گی بجتی کا فرو دیں دار کی

جن کی تاثیروں سے اہلِ دہر کی آنکھیں کھلیں
غفلتیں تھیں کچھ وہ تیرے محرمِ اسرار کی

آشتی جس پر تصدق۔ دوستی جس پر نثار
وہ چڑھی تیوری تھی اک آمادۂ پیکار کی

آہ، اے دردِ فراقِ یار اے جانِ فراق
کیفیت تجھ میں ہے اک بھولے ہوئے اقرار کی

فراق گورکھپوری

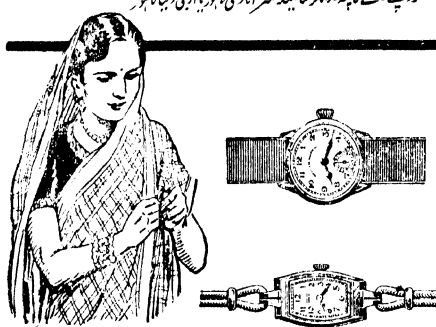
نقد و نظر

ہندوستان اور ملیت

"مصنفہ ایک پنجابی" ہر سیاسی یا سماجی تحریک کی تہ میں کچھ معاشی حالات ہوتے ہیں مختلف خیالات کی تحریک بھی کسی نہ کسی معاشی ضرورت یا سیاسی حالت کی بنا پر ہوتی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ فرقہ وارانہ ذہنیت یعنی مذہبی، نسلی، لسانی اور تمدنی اختلاف کا نتیجہ اکثر و بیشتر ہندو مسلم فسادات ہوتا ہے ملت ہندیہ کے قیام کے نصب العین سے قوم کے خیالات کا یکسر خود دار اور حساس افراد کے لئے ایک ذہنی کشمکش کا باعث ہے۔ کتاب ہندوستان اور ملیت اس ذہنی کشمکش کا ایک خوشگوار نتیجہ ہے۔ کتاب ہذا میں جن موضوعات پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے ان میں سے بعض تو اس قسم کے ہیں کہ ان کا ذکر بھی ہمارے ملک میں جاری ہوئیں اور اب تک جاری ہیں نسل۔ زبان۔ مذہب ذات پات کی تمیز اور ایسے ہی جاپان کے حالات پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان سے متعلقہ مسائل کو بیان کر کے ان کی اصلیت اور حل دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جماعتوں کے آئندہ رجحانات کا بھی اشارۃً ذکر کیا گیا ہے۔ مشترکہ ملکی خصوصیات اور عامۃ الناس کو ان کی طرف پیش آمدہ توجہ دلانے کی ضرورت نقصان دہ ابہال کو رد کرنے اور ان کی بجائے سود مند تحریکات کو شروع کرنے کے متعلق چند مفید مشورے بھی کتاب میں درج ہیں۔

ان موضوعات کے علاوہ فیشنزم کے نظریے پر ایک علیحدہ باب میں تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ ملیت کے ضروری عناصر پر روشنی ڈال کر ان کا موجودگی یا عدم موجودگی کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کا ملیت سے کیا تعلق ہے مثلاً نسل مذہب زبان اور تہذیب و تمدن کی یکسانیت یا غیر یکسانیت سے ملیت کیونکر اور کہاں تک اثر پذیر ہوتی ہے۔ اس لئے درسیہ نکات کو قوموں اور ملتوں کے ارتقا و فنا پر جہات کی شاہد میں پیش کر کے واضح کیا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں مغربی تہذیب اور جمہوریت پر عین نکتہ نظر سے بحث کی گئی ہے، مغربیت کی تہ میں جو اصول کارفرما ہیں مثلاً مساوات شہامت نفس۔ فرد کی اہمیت، احترام قانون وغیرہ ان کی حقیقت تربیت اور رفتار کو مختصراً لیکن مرصع طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جمہوریت پر چند ملحوظات جو اقسام کئے گئے ہیں اور چند صفحوں میں اصول جمہوریت، جمہوریت کے نقصان دہ رجحانات۔ فائدے اور مقاصد کو بیان کیا گیا ہے۔ کتابت طباعت کاغذ وغیرہ آپ اپنی مثال ہے صفحات پونے تین سو قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے غیر مجلد ۱ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مالک کرشنا اینڈ سنز انارکلی لاہور یا ادبی دنیا لاہور



نہایت اطمینان بخش خوبصورت گھڑیاں

مینچسٹر "A-2" (اوپر والی) ۱۸ کیرٹ رولڈ گولڈ ۷۰ روپیہ

مینچسٹر "U-3" (نیچے والی) ۱۸ کیرٹ رولڈ گولڈ ۸۵ روپیہ

ہمارا بڑا باتصویر کیٹلاگ مفت منگائیے

ویسٹ اینڈ واچ کمپنی کے گھڑیال سٹیڈیم خوبصورت نمونوں کی موجود ہیں اور سب سے سب ملی وقت دینے والی ہیں بہترین مصالحوں سے تیار کی گئی ہیں تا کہ بہت تک ملی سروس دیتی ہیں اگر آپ اپنے روپے کی قدر و قیمت کا خیال ہے تو آپ کو ویسٹ اینڈ کی گھڑیوں سے اچھی گھڑی نہیں مل سکتی یاد رکھئے۔ گھڑی ایک سا انسٹیٹیوشنل انویسٹمنٹ ہے۔ اس لئے آپ ایسی گھڑی خریدئے۔ جو ظاہری شکل صورت کے لحاظ سے ہی خوبصورت نہ ہو۔ بلکہ حقیقت میں خوبصورت ہو اور یہ آپ کو ایسی فرم سے خریدنی چاہئے جس کی شہرت مسلمہ ہے۔

ویسٹ اینڈ واچ کمپنی بمبئی کلکتہ

WEST END WATCH Co

BOMBAY CALCUTTA

دنیائے ادب

ہماری قومی زبان

بابل کے بنا کا قصہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ ہمارے ملک کا بھی کچھ ویسا ہی حال ہے۔ ہندوستان کی زبانوں کی پڑتال جو گریرسن نے کی ہے اُس کی رُو سے اس ملک میں ۱۷۹ زبانیں اور ۵۴۴ بولیاں بولی جاتی ہیں[1]۔ یہ زبانیں اور بولیاں سب ایک گھرانے کی نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق چھ گھرانوں سے ہے جن کے نام یہ ہیں:۔ آسٹری، مان، کارین، تبتی چینی، دراوڑی، اور انڈو یورپین۔ دو زبانیں ایسی بھی ہیں جن کے گھرانے کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ان میں سب سے بڑا گھرانا انڈو یورپین زبانوں کا ہے۔ ان زبانوں کے بولنے والے اس ملک میں ۲۶ کروڑ کے قریب ہیں[2]، دوسرا گھرانا دراوڑی زبانوں کا ہے جس کے بولنے والے کوئی ۷ کروڑ ہوں گے، باقی سب زبانوں کے بولنے والے مل کر دو ڈھائی کروڑ سے زیادہ نہیں ہیں[3]۔ زبانوں اور بولیوں کی اتنی بڑی گنتی سن کر آپ کو جھنجھلا ضرور ہوا ہوگا لیکن ان میں سے صرف گیارہ زبانیں ایسی ہیں جو لکھنے پڑھنے کے کام آتی ہیں اور ان میں سے بھی تین ایسی ہیں جن کا ادب ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ جن کا ادب کافی ترقی کر چکا ہے اُن کے نام یہ ہیں۔ بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلگو، ملیالم، کنڑی اور ہندوستانی جس کی دو شاخیں ہندی اور اردو کے نام سے مشہور ہیں۔

ہندوستان میں جب سے قومی تحریک شروع ہوئی ہے اُسی وقت سے یہ خیال بھی پیدا ہوا ہے کہ ہمیں ایک قومی زبان کی بھی ضرورت ہے۔ شروع میں تو اس تحریک میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ حصہ لیتے تھے جو انگریزی جانتے تھے اس لئے تمام سیاسی کاروبار انگریزی میں ہوتا تھا لیکن جب سے جنتا نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا ہے اس وقت سے قومی زبان کے سوال پر زیادہ زور دیا جانے لگا ہے۔ بڑی لڑائی کے بعد جب کانگرس کی کایا پلٹ ہوئی تو اسی کے ساتھ ساتھ یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہے اور تمام کاروبار اسی میں ہونا چاہئے مگر ابھی تک اس پر پورا عمل نہیں ہوتا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ وکن کے سیاسی کام کرنے والوں میں سے بہت سے آدمی ہندوستانی کو اچھی طرح نہیں جانتے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ بہت سے لوگ ابھی تک اس بات کو دل سے مانتے ہی نہیں کہ ہندوستانی کو قومی زبان ہونا چاہئے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کے دماغ میں رہ رہ کر یہ بات آتی ہے کہ انگریزی سے ہمارا کام نکل سکتا ہے۔ لیکن وہ ایسے لوگ ہیں جو بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ڈیڑھ سو برس کی انگریزی حکومت کے بعد بھی اس وقت ہندوستان بھر میں صرف تین لاکھ سے کچھ ادھر آدمی انگریزی بول سکتے ہیں[4]۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانی بولنے والوں کی تعداد ۱۲ کروڑ سے زیادہ ہے اور اگر ان لوگوں کو بھی ملا لیا جائے جو تھوڑی بہت ہندوستانی سمجھ لیتے ہیں تو یہ تعداد ۲۰ کروڑ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ بحث تو فضول ہے کہ ہندوستانی کے علاوہ کوئی دوسری زبان بھی ہماری قومی زبان بن سکتی ہے لیکن مشکل ایک دوسری آن پڑی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ہندوستانی کوئی زبان نہیں ہے۔ یہ ایک فرضی نام ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے بلکہ سیاسی کارکنوں نے ایک ڈھونگ کھڑا کر رکھا ہے۔ اس لئے اس سوال سے بحث کرنے کی سخت ضرورت ہے ——!

ہندوستانی اصل میں اُس علاقے کی زبان ہے جس کو پرانے زمانے میں ہندوستان کہتے تھے۔ اس علاقے کی چوحدّی یہ ہے:۔ اتر میں ہمالیہ، دکھن میں وندھیا، پچھم میں پنجاب اور پورب میں بنگال۔ یہ نام سب سے پہلے گلکرسٹ نے ۱۷۹۸ء کے قریب استعمال کیا تھا اور اسی وقت سے برابر استعمال ہوتا ہے۔ گریرسن کی تقسیم کے مطابق اس علاقے میں چار زبانیں بولی جاتی ہیں یعنی بہاری، پوربی ہندی، پچھمی ہندی، اور راجستھانی۔

ہندوستانی زبان کی ابتدا کب ہوئی اور کیسے ہوئی؟ یہ سوال بہت کٹھن[5] ہے۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں جو پراکرتیں مدھ دیس میں رائج

1. Linguistic Survey of India, Vol. I, Part I, p. 27.
2. Census of India, 1931, Vol. I, Part I, p. 351.
3. Census p 322, Pt. I, p. 43
4. Linguistic Survey Vol.
5. Encyc. Britt. 14th. Ed. Hindustani Literature, by Sir J. C. Lyall

تھیں انہی کے میل جول سے یہ زبان بنی ہوگی۔ اس زبان کو وشنو دھرم کے بھگتوں سے بہت مدد ملی بھگتی کی تحریک اصل میں برہمنوں کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا۔ یہ عوام کی تحریک تھی اس لئے اُس نے عوام کی زبان کو استعمال کیا اور سنسکرت کو چھوڑ دیا۔ راجپوتانے کے درباری بھاٹ اور کوی بھی یہی زبان استعمال کرتے تھے۔ پرتھوی راج کے زمانے میں اس زبان نے کافی ترقی کر لی تھی۔ آلھا کھنڈ اور پرتھوی راج راسو اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ آگے چل کر کبیر کے دوہے، تلسی داس کی رامائن اور ملک محمد جائسی کی پدماوت اسی زبان میں لکھی گئیں اور اب تک اسی ذوق اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ میرا بائی نے بھی اسی زبان میں اپنی کتابیں لکھیں سکھوں کے آدی گرنتھ کا ایک بڑا حصہ بھی اسی زبان میں ہے جس میں کبیر کی چوپائیاں، گرونانک کے بول اور بابا فرید کے اشعار شامل ہیں۔ اس میں کچھ ایسے بھگتوں کا کلام بھی ہے جن کا کسی دوسری جگہ ذکر نہیں ملتا۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں جہاں ہندوستان کی اور بہت سی چیزوں نے ترقی کی وہاں ہندوستانی زبان بھی بہت پھلی پھولی۔ اکبر کے درباریوں میں راجہ بیربل جو کبی رائے کہلاتے تھے، عبدالرحیم خانخاناں جن کے دوہے اور کتابیں اب تک زبانوں پر ہیں اور فیضی ہندوستانی کے مشاعر تھے۔ اس زمانے میں گوکل یعنی متھرا کے آس پاس کرشن کے پجاریوں کا بہت زور اور دبدبہ چار ہا اور وٹھل ناتھ کے آٹھ شاگردوں نے جو اشٹ چھاپ کہلاتے ہیں، اپنے بھجنوں سے بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں سورداس سب سے زیادہ مشہور ہے۔

ادبی ہندوستانی کی بنیاد برج بھاشا پر رکھی گئی جو آگرہ اور دہلی کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ یہ علاقہ مغل بادشاہوں کا مرکز تھا اور جوں جوں اُن کی حکومت بڑھتی گئی ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی کا رواج بھی بڑھتا گیا۔ اسی زبان کا ایک نام اردو زبان بھی پڑ گیا اس لئے کہ یہ مغلوں کی فوجی بازاروں کی زبان تھی جس کو اردو یا اردوئے معلیٰ کہتے تھے۔ لیکن اس زبان کا عام نام اس زمانے میں ہندی تھا یعنی ہند کی زبان۔ یہ نام ان لوگوں کا رکھا ہوا ہے جو ابھی تک فارسی میں تمام کاروبار کرتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں جب سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی میں ہونے لگے تو دونوں ادبوں کا میل ہوا اور ملکی زبان پر فارسی کا اثر بڑھنے لگا۔ اس زبان کی ترقی میں اس وقت زیادہ ہاتھ مسلمانوں کا نہیں تھا کیونکہ وہ تو فارسی سے اپنا کام نکالتے تھے بلکہ ہندوؤں کا تھا جن میں کائستھ اور کھتری آگے آگے تھے جو درباری ضرورتوں کے لئے فارسی سیکھتے تھے اور اپنی بول چال میں فارسی عربی کے الفاظ بے طرح استعمال کرتے تھے۔ یہ زبان شمالی ہند کی فوجوں کے ساتھ دکن بھی پہنچی۔ اور گولکنڈا اور بیجاپور کے دربار وں کی زبان بنی اور وہیں پروان چڑھی۔ شمالی ہند و ستان کے مسلمان شاعر جب ہندوستانی زبان استعمال کرتے تھے، وہ پرانی پراکرتی بحریں بھی استعمال کرتے تھے لیکن جب یہ زبان دکن میں پہنچی تو وہاں آس پاس دراوڑی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ شمالی ہند والوں نے جو وہاں بالکل اجنبی تھے۔ فارسی بحروں کا استعمال شروع کیا اور فارسی شاعروں کی طرح قصیدے، غزلیں، مرثیے، مثنویاں اور رباعیاں لکھنے لگے۔ ہندی اور اردو کا فرق اس میں یہیں سے شروع ہوا۔ لیکن یہ فرق صرف نظم میں تھا۔ نثر میں وہی برج بھاشا کی گرامر قایم رہی اور فارسی ترکیب کے بھی کبھی استعمال نہیں کئے گئے۔ غالباً دکن میں ہی شاعروں کی اس نئی زبان کا نام ریختہ پڑا اور ولی نے جو بابائے ریختہ کہلاتا ہے اس کا معیار قایم کیا۔ ۱۷۱۹ء میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا اور حاتم و یکوی نے دہلی کی زبان میں اس کی نقل شروع کی۔ اس طرح دہلی اسکول کی بنیاد پڑی۔ جب دہلی اجڑ گئی اور وہاں کے شاعر لکھنؤ پہنچے تو لکھنؤ اردو کا مرکز ہو گیا۔

ہندوستانی نثر کی بنیاد، اصل میں انگریزی حکومت شروع ہونے کے بعد پڑی۔ انیسویں صدی کے شروع میں جب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا انتظام ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے ہاتھوں میں آیا تو انہوں نے ہندوستانی زبان کے ادیبوں کی ایک جماعت کو اس کام پر لگایا کہ وہ نثر میں کالج کے لئے درسی کتابیں لکھے۔ اس میں شک نہیں کہ گلکرائسٹ نے ہندوستانی زبان کی بڑی خدمت کی لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک بہت بڑی غلطی کی جس کا خمیازہ ہم کو نہ جانے کب تک بھگتنا پڑے گا۔ جو چیز اب تک صرف نظم میں تھی اس کو انہوں نے نثر میں بھی شروع کرا دیا بجائے اس کے کہ وہ سادہ ہندوستانی زبان کو رواج دینے کی کوشش کرتے انہوں نے ایک طرف تو میر امن اور افسوس وغیرہ کو ایسی زبان لکھنے پر لگایا جس میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور دوسری طرف سری للولال سے اُن کے مقابلے میں ایسی زبان لکھوائی جس میں سنسکرت کے شبدوں کی بھرمار ہے۔ یہ تو کیسے کہا جائے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا لیکن ہندی اردو کے جھگڑوں میں ہماری حکومت کی جو پالیسی رہی ہے اور اب تک ہے اور سیاست میں جس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کی کوشش ایک زمانے سے کی جا رہی ہے اس کو دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ پہلی کوشش بھی اسی خیال سے تھی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو لیکن اُسی وقت سے

ہندی اور اردو جو ہندوستانی کی دو شاخیں ہیں اپنی اپنی راہ لگ گئیں اور آہستہ آہستہ ان میں دُوری بڑھتی گئی و نتیجہ یہ ہوا کہ آج کل کی اردو کو سمجھنے کے لئے فارسی اور عربی میں کافی مہارت کی ضرورت ہے اور اسی طرح ہندی کو سمجھنے کے لئے سنسکرت کا عالم ہونا ضروری ہے۔ فورٹ ولیم کالج تو ختم ہو گیا لیکن اس کی روح ابھی تک زندہ ہے اور آج کل بھی سرکار دولت مدار کی طرف سے ہم پر جو احسان ہمارے ادب کو ترقی پہنچانے کا کیا جا رہا ہے اور جس کا مرکز اب الہ آباد ہے اس میں بھی وہی خرابی موجود ہے۔ نام تو شاید عام ہوا کے اثر سے "ہندوستانی اکیڈیمی" رکھا گیا ہے لیکن ایک ایسی زبان کو بڑھانے کی کوشش کہیں نظر نہیں آتی جو واقعی ہندوستانی کہلا سکے بلکہ دو الگ الگ تہ خانے بنائے گئے ہیں جن کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں اور ایک میں سنسکرت آلودہ ہندی کو بڑھایا جا رہا ہے اور دوسرے میں مقرس اور معرب اردو کی ترقی کی کوشش کی جا رہی ہے۔

کانگرس نے ہندوستانی کا نام تو لے لیا لیکن اس کے لئے کام کچھ نہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام سیاسی جماعتوں کا نہیں ہے لیکن کانگرس صرف ایک سیاسی جماعت نہیں ہے۔ اس نے سماج سدھار کے بہت سے کاموں کا بیڑا اٹھا رکھا ہے تعلیم کے معاملے میں بھی اس نے دخل دیا ہے، اس لئے زبان کے معاملے میں بھی اُس کو کچھ کرنا چاہئے تھا۔ کانگرس کے بہت سے کارکن ہندی ساہتیہ سمیلن کے بھی کارکن ہیں لیکن اس کام میں انہوں نے تعصب کو چھوڑا نہیں ہے اور چاہتے ہیں کہ وہی ہندی رائج ہو جائے جو سنسکرت کی غلام ہے۔ اس طرح ہندوستان کی ایک بڑی جماعت کو ان لوگوں سے شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شکایت کرنے والوں میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو خود متعصب ہیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی بنانا چاہتے ہیں لیکن جو لوگ قوم پرستی کا دعوے کرتے ہیں ان کا تو یہ فرض ہے کہ ایسی چیز کو اٹھائیں جو ٹھیک ہو۔ بھارت ساہتیہ پریشد کے قائم ہونے کی خبر سے یہ امید بندھی تھی کہ شاید وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور جب اس میں اردو کے ادیب بھی بلائے گئے تو یہ امید اور بڑھی لیکن اس کے پہلے ہی جلسے میں "ہندی اتھوا ہندوستانی" کی ایک عجیب و غریب اصطلاح ایسی تراشی گئی کہ جھگڑا کم ہونے کی جگہ اور بڑھ گیا اور جو لوگ قریب آ رہے تھے وہ بھی بدک گئے۔

یہ مانا کہ ہندی اور اردو کی اصطلاحیں ہندوستانی سے پہلے کی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی مشترک زبان کے لئے نہیں استعمال کی جا سکتی۔ اسی مشکل کو دور کرنے کے لئے گلگرسٹ نے ہندوستانی کی اصطلاح بنائی اور وہ چل نکلی اور ہندی اور اردو اس کی دو شاخیں مانی گئیں۔ ہندی کی تعریف یہ ٹھہری کہ وہ ہندوستانی کی دو قسم ہے جو ناگری لپی میں لکھی جاتی ہے اور جس میں سنسکرت کے شدید بہت ہوتے ہیں اور اردو ہندوستانی کی دو قسم ہے جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور جس میں عربی فارسی کے الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ اصل زبان ہندوستانی ہے جو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو دونوں رسم خطوں میں آسانی سے لکھی جا سکتی ہے[1]۔ یہ زبان بولی زیادہ جاتی ہے اور لکھی بہت کم جاتی ہے، پھر بھی اس میں ادب موجود ہے جس کا ایک نمونہ انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" ہے۔ یہ ابھی تک ادبی زبان نہیں ہے لیکن جو لوگ ایک قومی زبان کے خواب دیکھتے ہیں اُن کو چاہئے کہ بیٹھ بیٹھ ہندوستانی کو ادبی زبان کے درجے تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ سنسکرت عربی، فارسی یا یورپ کی زبانوں کے جو لفظ ہماری زبان پر چڑھ گئے ہیں ان کو اپنی زبان سے نکالنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری لیکن باہر کی زبان کے لفظوں کی بھرمار نہ صرف کانوں کو بری معلوم ہوتی ہے بلکہ ہمارے ادب کی ترقی کو بھی روکتی ہے۔ ایسی بولی سے فایدہ ہی کیا جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔

"شاہجہاں"

ڈاکٹر محمد عبدالعلیم ایم اے پی ایچ ڈی

---

1. Linguistic Survey, Vol. IX, Part, I. p. 46.

فہرستِ مضامینِ ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ مارچ سنہ ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ — تصویر معصومیت — نمبر ۵

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	بزمِ ادب	منصور احمد	۳۵۸
۲	آئینۂ عالم	〃	۳۵۹
	افسانے		
۳	گڈیا	محمد مرسل مفتنہ الرحمٰن صاحبہ	۳۸۲
۴	خندۂ تقدیر	جناب نسیم رضوانی	۳۸۹
۵	انتقام	جناب عبدالغفور صاحب بہالوی	۴۰۲
۶	مصور	جناب دینا ناتھ صاحب واریکو شاہد کاشمیری	۴۱۱
	ڈراما		
۷	الوداع	جناب صادق ایوبی	۳۹۳
	علمی مضامین		
۸	مہاتما گاندھی سے بات چیت ٹیٹ اردو میں	جناب سید ابوالقاسم صاحب	۳۶۳
۹	ٹالسٹائے کا مذہب	جناب محمد یعقوب صاحب بی اے	۳۹۶

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
	حصۂ نظم		
۱۰	غزل	حضرت چیئرمین موشیار پوری ایم اے	۳۷۹
۱۱	دُعا	جناب شاد عارفی	۳۸۰
۱۲	ایک فراموش شدہ بیاض کو دیکھ کر	جناب تابش صدیقی	۳۸۱
۱۳	غزل	جناب سیفی نوگانوی	۳۸۷
۱۴	میں اور تم	جناب حمید عرفانی ایم اے	۳۸۸
۱۵	غزل	منصور احمد	۳۹۲
۱۶	فردوسِ خیال	جناب سکندر علی صاحب وجد	۳۹۵
۱۷	غزل	حضرت حکیم آزاد انصاری	۴۰۰
۱۸	رہزنی	جناب عبدالحمید صاحب عدم	۴۰۱
۱۹	رباعیات	مرزا عباس بیگ محشر	۴۰۹
۲۰	سہ آتشہ	جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری	۴۱۰
۲۱	جرمِ سنگین	جناب خادر	۴۱۵
	دنیائے ادب		۴۱۶
	نقد و نظر	منصور احمد	۴۲۰

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے محصول اور وی پی نو آنے کل پانچ روپے ۔ ممالک غیر سے دس شلنگ

ٹریجڈی الیکٹرک پریس انارکلی روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر صاحب کے دفتر ادبی دنیا کرشن بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

بزم ادب

مہاتما گاندھی سے بات چیت ٹھیٹ اردو میں

مندرجہ بالا عنوان سے مولانا سید ابوالقاسم صاحب کا ایک بے مثل مضمون اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے یہ مضمون سیاست حاضرہ اور اردو زبان کے پیش نظر مسائل پر ایک گراں بہا تحقیقی تبصرہ ہے۔ ان موضوعات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ خاص توجہ کا محل ہے۔ مولانا موصوف نے اس میں فارسی، سنسکرت، عربی، اردو، اور ہندی کے ماخذوں کی تحقیق کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت کا ماخذ ایک ہی ہے اور ان دونوں میں تفریق کرنا لاعلمی پر مبنی ہے۔ عربی زبان کے الفاظ جہاں اردو میں رائج ہو گئے ہیں وہاں دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اردو ان سب زبانوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی ہے اور ہندوستان کے اتحاد کے قیام کے لئے اس سے بہتر زبان ممکن نہیں ہے۔ اس امر کو تو ہندو بھی سمجھتے ہیں کہ زبان قوموں کے اتحاد میں بڑا حصہ لیتی ہے لیکن ان کی کوششیں اس وقت تخریبی ہیں تعمیری نہیں۔ مولانا نے ایک نیا تعمیری پروگرام پیش کیا ہے جو بلاشبہ قابل عمل اور ممکن العمل ہے اردو زبان کی وسعت اور قوت بیان کا ثبوت انہوں نے خود اپنی تحریر سے دے دیا ہے۔ یہ تحریر صرف عربی اور فارسی الفاظ سے قطعاً پاک ہے بلکہ اس میں غیر مانوس سنسکرت الفاظ سے بھی مدد نہیں لی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان الفاظ کی دولت سے کتنی مالا مال ہے۔ اس میں اپنے اس قدر الفاظ ہیں کہ دوسری زبانوں سے کچھ مستعار لئے بغیر مفہوم ادا ہو سکتا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ نہ صرف مہاتما گاندھی اسے غور سے پڑھیں گے اور اس کے نکات پر تدبر فرمائیں گی بلکہ اردو اور ہندی کے مسائل پر فکر کرنے والے اس سے بصیرت حاصل کریں گے۔

آتش نمبر

آتش نمبر کی تجویز طے ہو گئی ہے اور ماہ جون کا پرچہ آتش نمبر ہو گا۔ جون کے مہینے کی مناسبت سے نکلتا بھی اسی آتشیں مہینے میں موزوں تھا۔ ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار اور نقاد حضرت مجنوں گورکھپوری، حضرت یاس، یگانہ چنگیزی لکھنوی، حضرت فراق گورکھپوری، اور جناب شہنشاہ حسین صاحب رضوی اس پرچے کے لئے خاص محنت اور کاوش سے مضامین لکھ رہے ہیں۔

مندرجہ ذیل موضوعات اس نمبر کے لئے تجویز ہوئے ہیں۔

(۱) آتش اور اردو شاعری
(۲) آتش اور ایشیائی تہذیب اور کلچر
(۳) آتش اور لکھنؤ سکول
(۴) آتش کا اثر اردو شاعری پر
(۵) آتش اور خودی۔
(۶) آتش اور مجازیت اور عجمیت
(۷) آتش کا سلسلہ شاگردان اور متبعین

آٹھوں موضوع آتش اور غالب تجویز کیا گیا تھا جس پر خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

جو اصحاب ان موضوعات میں سے کسی ایک موضوع پر قلم اٹھانا چاہیں وہ براہ مہربانی ہمیں اپنے ارادہ سے مطلع فرمائیں۔ تمام مضامین اپریل کے وسط تک دفتر میں پہنچ جانے چاہئیں۔

ساقی اور شاہجہاں

دہلی کے یہ دونوں رسالے جناب مولانا شاہد احمد صاحب بی اے آنریری کی ادارت میں اردو ادب اور زبان کی بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ساقی میں مختلف اور متنوع مضامین شائع ہوتے ہیں اور شاہجہاں زیادہ تر ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی کی سرگرمیوں اور خیالات کو ملک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ساقی نے جہاں ضخامت طباعت وغیرہ میں ترقی کی ہے وہاں ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ دنیا کے بلند پایہ اور منتخب ادب کو بہایت سرعت اور زر افشانی کے ساتھ اردو میں منتقل کر رہا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کے سالنامے میں بھی دو مبسوط اور بہترین کتابیں ترجمہ کی گئی ہیں۔ اول فاؤسٹ جو خود حضرت مدیر کے گلگار قلم کا ایک دلکش نقش ہے اور دوسرے ٹیلیٹ جسے مولانا عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن نے اردو کا جامہ پہنایا ہے یہی دو کتابیں کسی ایک رسالے کی تکمیل کے لئے کم نہ تھیں لیکن انہوں نے ۳۲ کے قریب دوسرے مضامین بھی بہترین اہل قلم سے حاصل کر کے اس پرچے کی زینت بنائے ہیں۔ حجم ۳۰۰ صفحات کے قریب ہے اور قیمت ایک روپیہ چار آنے **منصور احمد**

آئینۂ عالم

تصویری زبان

قریباً پانچ سال کا عرصہ ہوا کہ دائنا میں حقایق کو بیان کرنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا ——— یہ طریقہ اس وقت اس قدر وسیع پیمانے پر رائج ہو رہا ہے کہ اب اس کے موجد کا نام تک یاد نہیں رہا۔ سرخ اور نیلی فوجوں کی طاقت کا اندازہ اگر دو سپاہیوں سے کیا جائے جن میں سے ایک سرخ اور طویل قد بنایا جائے اور دوسرا نیلا اور پستہ قد، تو کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اس کے بجائے اگر بارہ سرخ سپاہی بنائے جائیں اور پانچ نیلے اور ایک سپاہی ۲۰۰۰ کے برابر ہو تو ایک ہی نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ سرخ فوج کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار ہے اور نیلی فوج کی ایک لاکھ۔

حقایق کو جلدی، آسانی اور صحت کے ساتھ صرف تصاویر کے ذریعے سے پیش کرنے کا یہ ایک بالکل نیا طریقہ ہے ——— اور یہ عام طور پر یہ لوگوں کو معلوم نہیں ——— کہ یہ اُس "بین الاقوامی زبان" کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے جو الفاظ کے بجائے تصاویر کے ذریعہ لکھی جاتی ہے

اس کے موجد ڈاکٹر اوٹو نیورتھ معاشرتی سائنسدان اور فلسفی ہیں جنھوں نے اسے دائنا کے معاشرتی اور اقتصادی عجائب خانے میں ترقی دی ڈاکٹر موصوف نے دس سال ہوئے اس عجائب خانے کی بنیاد رکھی تھی اور اس عرصہ میں خود ہی اس کے نگرانِ کار رہے ہیں۔

تصاویر پر ان کا یقین اتنا پختہ ہے کہ وہ اپنے دستخط کے بجائے "ناقی" کی تصویر بناتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ آپ بہت بھاری بھرکم آدمی ہیں۔ (آپ کا وزن پونے ۲ من ہے) اور محکمن ہے ——— اس لئے کہ آپ بہت متکلم الانسان ہیں۔

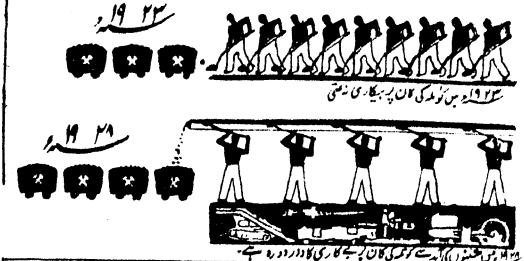
ابھی سے ان بڑھتے ہوئے تصویری نشانات کی لغات بن رہی ہے۔ انہیں کے ذریعے سے مشینیں، شہروں کے نقشے، اعداد و شمار، آبادی کی ترقیاں، تاریخی واقعات، گندم، الو ہے اور سیمنٹ وغیرہ کی پیدائش اور لاگت کے تفاوت بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک کتاب کا مضمون ایک پھیلے سے تصویری قرطاس پر سما جاتا ہے۔

جن لوگوں کو یہ الفاظ اور ان کی قواعد ازبر ہے ان کے لئے فقرے بنائے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نیورتھ کے تصویری نشانات الفاظ کے ہم معنی ہیں۔ اُن کھیل کی اینٹوں کی طرح جنہیں جوڑ جوڑ کر بچے عمارتوں کے نمونے کھڑے کر لیتے ہیں، ان نشانات کو جوڑ کر حقائق اور خیالات بیان کئے جا سکتے ہیں۔ ان نشانات کی بنی ہوئی ایک ہی تصویر دیکھنے والے کے دل سے ایک کہانی بیان کر دیتی ہے۔

تصویری زبان کا ہر نشان نہایت سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔ غیر ضروری تفصیلات نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ ہر چیز کا انتہائی درجہ تک اختصار کیا جاتا ہے۔ انسانی تصاویر کے چہرے نہیں بنائے جاتے ——— صرف سر کافی سمجھا جاتا ہے، ہاتھ غیر ضروری سمجھے جاتے ہیں ——— صرف بازو بنائے جاتے ہیں۔ ٹوپی کی موجودگی یا غیر موجودگی کسی کو سفید فام، لاطینی، امریکی انڈین، ہندوستانی حبشی یا منگولی ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ جوتی کی شکل پوری سیاہی میں۔ کارخانے کی ایک مستطیل خاکہ اور اس پر چمنی کا نشان۔ جوتی کو مستطیل میں رکھ دیجئے تو اس کا مطلب ہوا "جوتی کا کارخانہ" اور چمنی سے دھواں نکلتا ہوا دکھائی دے اور دروازے کھلے ہوں تو کارخانہ مصروف کار ہے۔ اگر دھواں نہ نکل رہا ہو اور دروازے بند ہوں تو کارخانہ بیکار پڑا ہوا ہے۔ ٹیلیفون کے آلے کی تصویر اور ایک تیر کا نشان دنیا کے کسی حصے میں یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ اس جگہ سے ٹیلیفون کیا جا سکتا ہے۔ سکوں کر اوپر تلے جوڑ کر رکھنے کے معنی ہیں "روپیہ"۔ ہوائی جہاز پر ایک چٹھی کی ٹکٹ کا مطلب ہے "ہوائی ڈاک"۔

بیرون ملک میں تصویری نشانات کی تعلیم رفتہ رفتہ ابھی سے

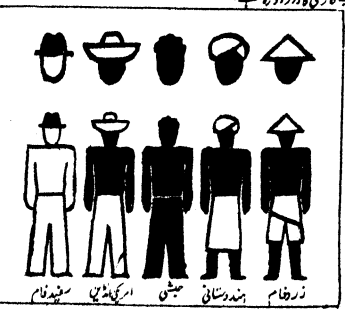
معلوم ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر نیورتھ کہتے ہیں کہ "اچھی تصاویر کی موجودگی میں اچھے معلموں کی ضرورت نہیں رہتی۔ نیز اس کے ذریعے سے بُرے معلم کے نقصانات کا اندیشہ نہیں رہتا۔" دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے اعلیٰ درجے کی تصاویر کی مدد سے ادنیٰ درجہ کے مدرّسوں سے بھی صحیح تعلیم حاصل کرسکتے ہیں



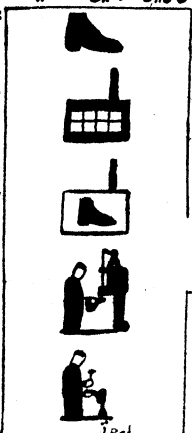
۱۹۲۳ء میں کوئلہ کی کان پر بیلچہ کی ضرورت تھی
۱۹۲۸ء میں مشینوں کی مدد سے کوئلہ کی کان پر بجلی کا دور دورہ ہے۔

یہ اس لئے کہ تصویری نشانات اپنی تشریح خود اکے مدرس کا بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں اور تعلیم کے فوائد صحیح معنوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

تصویری نشانات کو پہچاننا اور ان کی تشریح کرنا انہیں ایک عبارت میں منسلک کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ عبارت لکھنے کے لئے کچھ عرصہ باقاعدہ تعلیم لینی پڑتی ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں ایک ایسی تصویری زبان پر مہارت حاصل ہو جاتی ہے جو دنیا کی تمام زبانوں کے مقابلے میں زیادہ عالمگیر، آسان اور جلد تر سمجھ میں آنے والی ہوتی ہے۔ اس کی تشریح کے لئے صرف چند الفاظ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے ــــ مثلاً ــــ "ایک تصویر ۲۰۰۰ آدمیوں کو ظاہر کرتی ہے" اور یہ الفاظ لکھی زبان ہی میں لکھے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے نیورتھ کی تصاویر جغرافیائی نقشوں کی طرح ہیں جنہیں بہت کم تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے۔



عام طور پر کسی عبارت کو بیان کرنے کے لئے تصاویر سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات تصاویر کو واضح کرنے کے لئے عبارت کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور سیلیس اور سادہ عبارت اپنی تصویر کے ساتھ ضروری تعلقات ظاہر کرنے کے لئے نہایت اختصار کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر نیورتھ نے یورپ میں آلۂ نشر الصوت پر کئی فی البدیہہ تقریریں کی ہیں جن کا تمام مواد صرف تصویری زبان میں اس کے پاس ہتا تھا اور اس کی یہی تقریریں سادہ ترین اور مشہور ترین ثابت ہوئیں


۱۔ جوتی
۲۔ جوتی کا کارخانہ
۳۔ مشین سے بنی ہوئی جوتی
۴۔ " " "
۵۔ " " "

جس طرح کوئی عمارت بناتے وقت ایک ایک اینٹ نیلے رنگ کے نقشے کی ہدایات کے مطابق رکھتا ہے اسی طرح تصویری زبان کو لکھنے والا کوئی حق نہیں رکھتا کہ اپنے تخیل یا مرضی سے اس کی ترتیب میں دخل دے۔ وہ صرف ایک اوزار ہے اس ماہر فن کے ہاتھ میں جس نے اس بات کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا ہے کہ ہر سامعین، مورخ یا ماہر تعلیمات کو اپنے بیانات کس طرح لکھنے ہیں اور اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہر ضرورت کے لئے کون سے اشارات استعمال کئے جائیں گے اور مطلوبہ مطلب واضح کرنے کے لئے کم از کم دماغی کاوش کے ساتھ انہیں کس طرح ترتیب دیا جائے گا۔

اس عمل کا نام "تبدیل ہیئت" ہے۔ ماری ریڈ میسٹر اس عمل میں سب سے زیادہ ماہر ہے۔ تصویری اشارات کے بنانے میں جرٹ آٹمز اور ارون نیتھ کامل ترین ہیں۔

اس تحریر کی تصاویر ہمیشہ جذبات سے معرا، ٹھوس، حقیقی اور ہمیشہ ایسی عملی ہوتی ہیں جیسے ہتھوڑا یا دانتوں کا برش۔ جذبات کو بالکل خارج کر دیا جاتا ہے۔ اگر عام کتابیں ایسی ہی حقایق پر منطبق ہوں

تو انسان اکتا جاتا ہے، اور تصاویر سے انسان اتنی جلدی تنگ نہیں آتا۔ لیکن ان کی ترتیب اور استعمال میں بدرجہ غایت احتیاط کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ مطالب ذرا سی بے احتیاطی سے بدل جاتے ہیں" ڈاکٹر نیورتھ کہتے ہیں۔ اسی لئے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نشانات نہایت سادہ اور کم از کم خطوط پر مشتمل ہونے چاہئیں۔ غیر ضروری اور تزئینی تفصیلات سے کلیتہً احتراز کرنا چاہیے۔ اُن کے قواعد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی چیز صرف اس لئے شامل نہ کرو کہ وہ تمہیں دلچسپ یا خوب صورت معلوم ہوتی ہے اور اپنی مصورانہ قابلیت کا اظہار نہ کرو"

تصویری تحریر بڑے بڑے مصوروں کے شاہکاروں سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ ان شاہکاروں کو تم جتنے غور کے ساتھ دیکھو گے ان میں نئی نئی خوبیاں یا برائیاں ظاہر ہوں گی۔ لیکن تصویری تحریر میں ایسے عمق فوراً ختم ہو جاتے ہیں۔ پہلی ہی نظر میں تمام روئیداد آپ پر منکشف ہو جائے گی، دوسری نظر میں کچھ معمولی سے نکات، تیسری میں کچھ اور زوائد جو لکھنے والے نے ڈال دئے ہوں گے اور اگر چوتھی نظر کی بھی ضرورت ہے . . . تو ڈاکٹر نیورتھ کہتے ہیں "اسے اٹھا لو۔ اس میں بے ہودہ تفصیلات ہیں"

یہ نشانات تعلیمی ضرورت کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ سائنس کی ترویج کے لئے، جنگ کے اثرات اور سرداری کو دور کرنے کے لئے دواؤں کے استعمال کے بہترین طریقے بتانے کے لئے اور غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کے لئے۔ بچے بھی بجائے کھلونوں سے کھیلنے کے ان سے تعلیمی کھیلیں کھیل کر مستفید ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نیورتھ نے پیچ اور جوڈی کی کھیلیں انہیں تصاویر سے تیار کی ہیں۔ ان کا طریقہ نہ صرف آسان فہم اور جامع ہے بلکہ زمانے اور عام تعلیمی طریقوں سے بالکل جداگانہ اور آزاد ہے۔

اس زبان کی تحریر اور تقریر استعمال کرنے والے طبقے کی استعداد کے مطابق مختلف ہے۔ طبع شدہ پیغامات، بچے کے قاعدہ میں، اخبار کے صفحات میں، کیمیا کے کورس میں، سادہ ترین صورت سے مشکل ترین فنی اصطلاحات تک بدلتے چلے جاتے ہیں۔ اقتضایات کے کسی نظریے پر لکھی ہوئی کتاب مزدور کی فہم سے یقیناً بالا ہو گی۔

تصویری تحریر کا اولین مقصد اُس عقلی خلیج کو قابل عبور بنانا ہے جو کالج کے پروفیسر اور عام طبقے میں حائل ہے تاکہ وہ اپنا مدعا اُن پر واضح کر سکے اور یقیناً پروفیسر مدرسہ کی معمولی تعلیم کے مقابلے میں تصویری تحریر سے بہت کچھ زیادہ اخذ کر سکے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ذہین اور حساس ناول نویس کسی غیر شہر میں گھومتے ہوئے اس شہر کی عبادت گاہوں، دکانوں اور راہ گیروں میں وہ کچھ دیکھتا ہے جو ایک وہیں رہنے والے مزدور کو کبھی نظر نہیں آتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ممکن ہے کہ تصاویر میں سے شہر اور اس کے نظاروں کی طرح مزدور کو وہ کچھ حاصل ہو جائے جو ناول نویس کو نظر نہیں آیا۔

تصویری تحریر کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ اسے لکھنے کے عام رائج طریقوں کے بجائے استعمال کیا جائے۔ اس کا استعمال محدود ہے ——— الفاظ اور فقرات سے بھی زیادہ محدود۔ وہ اپنے مطالب و معانی کے بیان اور زود فہمی میں یکتا ہیں۔

نیورتھ کا باصری تعلیم کا یہ طریقہ ابھی سے وسیع پیمانے پر استعمال ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں ریاست ہائے متحدہ سب سے پیش پیش ہیں۔ لیکن اس کی تعلیم اور استعمال میں یکسانیت ملحوظ نہیں رکھی جاتی۔ ہر مدرس، مشتہر، مصور، سرکاری محکمہ یا کاروباری دفتر اپنے اپنے طریقے پر بلا لحاظ قواعد اور بیجا کے اس میں ترمیم و توسیع کر لیتا ہے۔ اگر تصویری تحریر کو فراخیسی اور صحت کے لئے ایک ہی سے معانی کا حامل بننا ہے تو اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ قواعد کی قطعی طور پر پابندی کی جائے ——— ایک حکم مقرر کیا جائے جو اس بات کا فیصلہ کیا کرے کہ کون سے نشانات استعمال کئے جائیں اور انہیں کس طرح جوڑا جائے۔

اس نئی بین الاقوامی تصویری زبان کی ترویج اور اس کے نشانات کی لغات بنانے کے لئے ہالینڈ کے شہر ہیگ میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی گئی ہے جس کے صدر ایم فیلڈرس ہیں۔ اسی ملک میں ایک ایسے مرکزی مدرسہ کی بنیاد بھی رکھی جانے والی ہے جہاں تصویری نشانات تیار ہوں گے اور اس طریقے کے عملوں کو تیار کیا جائے گا۔

ایک جامع اللغات بھی بنے گی ——— جو عجیب ترین اور مفید ترین جامع ہو گی۔ یہ لغات تمام تر ڈاکٹر نیورتھ کے تصویری اشارات پر مشتمل ہو گی اور عام الفاظ صرف اتنے ہوں گے جن سے اشارات کی توضیح کرنا مقصود ہو گا۔ یہ جامع کسی زید بکر کو دیجئے یا آئن شائن کو۔ دونوں پانچ منٹ میں اس سے اتنا استفادہ حاصل کر لیں گے جتنا معمولی لغاتوں میں سے کروڑوں الفاظ پڑھ کر حاصل کیا جاتا ہے

"نیویارک ٹائمز"

حیات بعد الموت ؟

ادارہ حیات ثانیہ میں محیر العقول تجربات عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ جہاں مرے ہوئے پھر جی اٹھتے ہوئے اور اپنی بقایا زندگی حسب معمول گزارتے ہیں۔

لیکن ابھی تک ـــــ جیسا کہ اس قسم کے تجربات کا فاعدہ ہے ـــــ ان تجربات کے معمول بے زبان جانور ہیں جنہیں پہلے تو اپریشن کے میز پر ڈال کر مار دیا جاتا ہے اور پھر انہیں دوبارہ زندہ کیا جاتا ہے۔

لیکن کیا ـــــ ان بے زبانوں پر ظلم کیا جاتا ہے یا یہ سب کچھ رحم اور نرمی سے عمل میں آتا ہے؟ اس کے متعلق جو حقائق حکومت روسیہ کے ایک افسر نے لندن میں ایک نمائندہ اخبار سے بیان کئے حسب ذیل ہیں۔ اب قارئین اسے پڑھ کر اس عمل کے موقوف پر رحم یا عقلمندی کے متعلق خود فیصلہ کر لیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ عمل موجودہ زمانے میں سائنس کی تحقیقات کے سلسلے میں سب سے زیادہ محیر العقول ہے۔

یہ تجربات ماسکو کے "ادارہ حیات ثانیہ" میں ڈاکٹر سرمی برو خانکو کے زیر عمل ہیں۔

اس قابل ڈاکٹر نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جو مردے کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ یہ آلہ اصل میں ایک مصنوعی دل ہے۔

کچھ عرصہ ہوا رائل انسٹی ٹیوٹ لندن میں ایک ڈاکٹر نے ایک مرے ہوئے کتے کے دل کو دوبارہ متحرک کر کے دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر برو خانکو اس سے کچھ اور آگے بڑھ گئے ہیں۔

آپ نے ایک کتے کا سر جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا اور پھر اسے اپنی مشین کے ساتھ جوڑ کر چھ مہینے تک زندہ رکھا۔ دوران خون مصنوعی طور پر اس میں جاری رکھا گیا۔

اس کے بعد دوسرا قدم پورے جسم کو زندہ کرنا تھا۔ کتے کو مارنے کے کافی دیر بعد دوران خون پیدا کیا گیا اور کتا دوبارہ زندہ ہو گیا۔

ڈاکٹر کے تحقیقاتی کام میں مدد دینے کے لئے حکام نے ایک خاص معمل تیار کر دیا ہے جس کا سرکاری نام انسٹی ٹیوٹ آف ایکسپریمنٹل فزیالوجی اینڈ تھیریپی ہے۔

اس معمل میں اس وقت پانچ کتے اپنی دوسری زندگیاں گزار رہے ہیں۔ گزشتہ اگست میں بعض کو زہر دے کر اور بعض کو خون نکال کر ہلاک کیا گیا تھا۔

ایک کتیا آج کل ہی میں بچے دینے والی ہے یہ اور اس کا جوڑا دونوں دوبارہ زندہ کئے ہوئے جانوروں میں سے ہیں۔

ان تجربات نے ڈاکٹر برو خانکو کو یقین دلا دیا ہے کہ انسانی اجسام پر بھی پوری کامیابی کے ساتھ یہی عمل کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا قول ہے کہ "موت عجیب و غریب طبیعی عمل ہے جو متعدد درجات پر منقسم ہے۔ ہم اس بات کے معلوم کرنے کی کوشش میں ہیں کہ کس درجہ پر ہم زندگی لوٹا لانے پر قادر ہیں اور کہاں ہم بے بس ہو جاتے ہیں۔

ہم ان مدارج میں سے ہر ایک کی مدت عمل معلوم کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اس سے قبل یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگر موت اور عمل حیات ثانیہ کے درمیان پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ گزر جائے تو عمل حیات بیکار ہے لیکن اس وقت جانور کو مارنے کے بعد معینہ مدت سے بہت زیادہ وقفہ گذار دیا جاتا ہے۔"

انسانی اجسام پر ان تجربات کے ہونے پر جب کبھی بھی وہ عمل میں آئیں بہت سے اختلافات کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔

"لندن گزٹ"

"لندن گزٹ" جس کا ایک خاص نمبر ہز میجسٹی کی تاجپوشی کی تاریخ مشتہر کرنے کے لئے شائع ہوا۔ انگلستان کا سب سے پرانا اخبار ہے۔

یہ اخبار سب سے پہلے، نومبر ۱۶۶۵ء کو آکسفورڈ سے شائع ہوا تھا کیونکہ اس وقت لندن میں پلیگ کی وبا پھیل رہی تھی اور دربار آکسفورڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت سے ہفتہ میں دو مرتبہ منگل اور جمعہ کے روز شائع ہوتا رہا ہے یا جب کبھی خاص ضمیمہ کی ضرورت محسوس ہوئی ۱۹۳۳ء میں مزدور طبقہ کے کسی جھگڑے کی وجہ سے ۲۵۸ سال میں پہلی مرتبہ اس کی اشاعت رک گئی۔

حکومت کے عام اعلانات "گزٹ" کے ذریعے سے شائع ہوتے ہیں اور قانون کا مدعا پورا کرنے کے لئے چند اشتہارات بھی شائع کرنے پڑتے ہیں ۱۹۱۴ء میں جب انگلستان میں ریلوے کا جنون ہو رہا تھا اور ریلوے کمپنیوں کے اعلان کی بھرمار تھی گزٹ کی ہفتہ وار اشاعت کا حجم ۳۰۰۰ صفحات تک بڑھ گیا تھا

گذشتہ بدھ ۳۱ فروری ۱۹۳۶ء کے روز اس کی اشاعت کا نمبر ۳۴۳۶۷ تھا۔

منصور احمد

مہاتما گاندھی سے بات چیت ٹھیٹ اردو میں

مہاتما جی۔ پرنام۔ ڈاکٹر تارا چند جی سے میں نے جو باتیں کیں وہ آپ نے سنی تو ہوں گی۔ انہیں باتوں میں بُھجارتیہ سا ہتیہ پریشد پر چار کی بات چیت بھی چھڑ گئی تھی جس پر میں نے اُن سے یہ بھی کہا تھا۔ میں کبھی کھل کر اس پر گاندھی جی سے الگ باتیں کروں گا۔ اسے کئی مہینے ہو چکے۔ جب سے اب تک آپ سے باتیں کرنے کا رہ رہ کر دھیان تو آتا رہا پر اِدھر اُدھر کے بکھیڑوں میں ایسا پھنسا جو اِدھر آنا چاہتے یہ بھی اب تک نہ آسکا۔ کچھ دنوں سے ان جھمیلوں سے چھٹکارا ملا ہے۔ آج چاہتا ہوں جو کچھ جی میں ہے اور جو اب تک نہ کہہ سکا وہ سب ایک سانس میں آپ سے کہہ دوں۔ پرماتما کرے آپ ٹھنڈے جی سے اسے دیکھ سکیں۔ کس نے کہا اسے دیکھنے والے نو ہیں اور کیا کہا اس کے پرکھنے والے بہت تھوڑے ہوئے اور ہیں اور ہوں گے۔ کون کہہ رہا ہے اسے چھوڑ کر کیا کہا جا رہا ہے اسی کو جانچئے اور پرتالئے۔

پہلے یہ بتا دینا چاہتا ہوں:۔ دیس کے پیچھے آپ نے اپنا سکھ چین سب کچھ کھو دیا۔ اسی کے لئے آپ نے جوگ سادھا۔ نئے نئے ڈھب سے اس سنسار نے آپ کو جھنجھوڑا اور دُکھ پہ دُکھ دیئے۔ دوسرا ہوتا تو ٹوٹ پھٹ جاتا اور ہمیشہ کے نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔ پر آپ ٹس سے مس بھی نہ ہوئے اور آپ نے یہ دکھا دیا:۔ نہیں لگتی ہے چوٹ پتھر کو۔ دیس کے سدھرنے کے لئے جو آپ نے اپنے جی میں ٹھان لی، اٹھتے بیٹھتے وہی دھیان ابھی تک ہے اور اپنا سب کچھ تج کے اُسی کے پیچھے آپ دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ ایسا بات کا دھنی اور دُھن کا پکا ہونا مٹی کھیل نہیں۔ ہند ماتا کی دکھ بھری کہانی میں سے یہ آپ کی باتیں کسی کے بُھلائے سے بھلائی نہیں جا سکتیں۔ یہ میں نے اس لئے لکھا کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں لکھنے والا مجھے اور آج تک جو میں نے کیا اُسے جانتا ہی نہیں جو کچھ کہنا ہے وہ تو پھر کہہ لیں گا پہلے یہ اک کہانی سُن لیجئے:۔

اک برہمن، اک چھتری، اک ویش، اک شودر یہ چاروں الگ الگ گھرانوں کے نہ جانے کیسے ایک جگہ اکٹھے ہو کے جی بہلانے جنگل چلے۔ چلتے چلتے پیاس لگی۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈنے پہ بھی کہیں پانی کی اک بوند تک نہ ملی، اور آگے بڑھے تو سامنے اک آبپھ دکھائی دی۔ لمبے لمبے اور موٹے موٹے پونڈے کھڑے جھومتے دیکھ کر سبھوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ پک کے ایک نے چٹاخ سے ایک گنا توڑ لیا۔ دوسرے نے پٹاخ سے دوسرا۔ جو دو رہ گئے تھے۔ انہوں نے بھی ساتھیوں کی دیکھا دیکھی بڑھ بڑھ کے اپنے اپنے لئے اک اک توڑ لیا۔ گنے توڑتے ہی ایک دوسرے کو سراہنے لگا بھئی کیا کہنا اتنا مزا اور ایسا لمبا گنا ایک ہی جھٹکے میں یوں جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔ کیئے نہ مہر ہونا، برہمن۔ برہمن نے کہا اور تم اپنے چھتری پن کو تو کہتے ہی نہیں۔ کٹار ایسا بانس کا بانس گنا کس پھرتی سے اکھیڑ لیا۔ ویش اور شودر میں بھی ایسی ہی باتیں ہوئیں۔

اکھ والا دیوتا کہیں آڑ میں کھڑا یہ سب سُن رہا تھا۔ سنتے ہی جی ہی جی میں کہنے لگا۔ ارے یہ تو سب کے سب الگ الگ گھرانوں کے ہیں۔ ان سے گنے چھین لینا کوئی بڑی بات نہیں یہ کہہ کے چلا اور بھٹکا پھر کچھ سوچ سانچ کے اک لمبا سا چکر کاٹ کے ان چاروں کے سامنے آتے ہی ڈنڈوت کی اور ڈنڈوت کر کے ایک سے یہ کہنے لگا:۔ آپ تو ہمارے مائی باپ برہمن ہیں۔ دھرم اور اس کی پوجا پاٹ آپ ہی سے ہے۔ آپ نہ ہوں تو جگ میں دھرم پر چار کا اجالا ہی نہ رہے اور پورے سنسار میں ایسا اندھیرا گھپ ہو جائے جو ہاتھ سے ہاتھ نہ سجھائی دے پھر چھتری سے بولا آپ ہی کے بھروسے پر راج جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے آپ ہی کی تلوار کی چھاؤں میں راج پاٹ پھولتا پھلتا ہے۔ یہ چھاؤں نہ ہو تو وہ جھلس جائے۔ آپ لوگوں سے بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویش سے کہا تمہاری کھیتی باڑی کا ٹھاٹھ دھندا بھی ایسا نہیں جو کوئی اس کا گُن نہ مانے اسی سے سارا جگ بھلا چنگا دکھائی دے رہا ہے۔ نہیں تو گھڑی بھر میں اودھم مچ جائے۔ میں تم سے بھی کچھ نہیں کہتا۔ تم نے وہ کہا اچھا کیا۔

اب ایک شور سا مچ گیا تھا۔ اسے گھور کے کہنے لگا۔ کیوں بے بھنگی بھری یہ ڈھٹائی۔ مجھے تو کچا ہی چبا جاؤں گا۔ ارے بتا۔ تو نے کیا سمجھ کے گنا تو؟۔ یہ کہتے ہی اُسے کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا اپنی جھونپڑی میں لے جا ہاتھ پاؤں باندھ کے ڈال آیا۔

چاروں سے ایک کی تو یوں چھٹی ہوئی جو تین بچے وہ اپنے اپنے گنے لئے لمبے لمبے ڈگ رکھتے آگے بڑھ ہی رہے تھے جو وہ ایکھ والا جھپٹ کے ویش سے آکے بھڑ گیا اور ڈانٹ کے کہنے لگا۔ او بل چلانے والے تجھے بھی یہ دن لگے جو دن ہمارے بیل ڈاکا ڈالنے لگا۔ یہ گنے کیا تیرے ماتا پتا کے لگائے ہوئے ہیں۔ برہمن، چھتری یہ تو ہمارے مائی باپ ہیں۔ ہم ان کے منگتا اور انہیں کا دیا کھاتے ہیں۔ لو، تو نے بھی پیٹ سے پاؤں نکالے، اور ان کی ریس کرنے لگا۔ یہ کہہ کے اُسے بھی پکڑ دھکڑ کے لے گیا۔

جب وہاں سے وہ چھٹ ہوا تو برہمن، چھتری دونوں کے دونوں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ چلو ہماری تو کرکری نہیں ہوئی یہ کہہ ہی رہے تھے جو وہ پھر دولتا ہوا آگے بڑھ کے چھتری سے جا بھڑا اور اُسے روک کر کہنے لگا۔ کیوں جی کیا تم چھتری ہو۔ چھتری کیا ایسے ہی لٹیرے ہوا کرتے ہیں۔ بڑے آئے وہاں سے چھتری بن کے۔ ایسے چھتری دنیا میں بہت سے دیکھے ہیں۔ یہ کہتے کہتے اس کی بھی کوئی بھری چھتری نے بہت بچھر پھر کی اور پنڈت جی نے بھی بہت چھڑانا چاہا پر اس نے کسی کی بھی نہ مانی اور اسے بھی جھونپڑی میں لے جا باندھ باندھ کے ڈال آیا۔

برہمن کہنے لگے۔ ساتھی گنے تو گئے ہم تو بچ گئے۔ وہ کانٹیاں ہتھ کھُٹ اور منہ پھٹ ایکھ والا بھلا ایک کو کیسے چھوڑ دیتا۔ پنڈت جی ہانپتے، کانپتے بھاگوں بھاگ بڑھے چلے جا رہے تھے جو وہ پھر جھونپڑی سے نکلا اور نکلتے ہی وہیں سے للکارتا ہوا جھپٹا اور جھپٹ کے پنڈت جی کو بھی جا دبوچا۔

کہنے کو تو یہ ایک کہانی ہے۔ پر سمجھداروں کے لئے اسی میں بہت سی سیکھنے کی باتیں بھری ہوئی ہیں۔ اپنی اپنی پڑی ہونے سے اک دُھن کے پکے نے اپنے سے چوگنوں کو کیسے باندھ کے ڈال دیا۔ ان میں اتنا ہی ایکا ہوتا جیسے یہ سب مل کے ساتھ آئے تھے تو بھلا ایک تو ایک دُگنے تگنے بھی ایسے جھٹ پٹ ان کا بال بیکا نہیں کر سکتے تھے۔

آج کل دیس میں بھی ایسی ہی آپا دھاپی کی ہوائی کھیلی جا رہی ہے راج نے کسی کو ڈھیل دی اور کسی کو جکڑ دیا۔ جدھر ڈھیل آئی اُدھر ٹلے اپنے آپے میں نہیں، ——— مونچھوں کو تاؤ دے کے لگے بنکا رنے اور ٹوپیاں اُچھالنے۔ یہ دھیان ہی نہیں آتا۔ ڈھیل دی تو کیا ہوا میں تو سب کے سب بندھے ہوئے۔ اس کا بھروسہ ہی کیا آج کی ڈھیل کل کھینچ بھی تو سکتی ہے۔ ایک جگہ کا اٹھانا پٹھنا، رہنا سہنا۔ اس پر آپس میں آئے دن کی دانتا کلکل۔ "ساہتیہ پریشد" میں جو آپ نے کہا کوئی اور اس سے بڑھ کر بھی کہتا تو اُسے کوئی دیکھتا بھی نہیں۔ اچھا تو اسی کا ہے۔ آپ کے منہ سے ایسی ایسی باتیں نکلیں جو کوئی دوسرا کہے تو سب انہیں اُگل پچر سمجھیں۔

پہلے تو یہی دیکھ لیجے۔ دیس کے لئے ابھی کیا کچھ کرنا نہیں۔ آپ برسوں سے بلند کے ماتوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے جگانا چاہتے ہیں۔ پھر کیا سب کے سب جاگ اٹھے؟ بہت سے بہت ہوا تو یہی گھوڑے بیچ کے سونے والوں نے آپ کے جھنجھوڑنے سے ہوں ہوں کر کے کروٹوں پہ کروٹیں لیں۔ ہاتھ ادھر جھٹکے، پاؤں اُدھر پٹکے، جمائیوں پہ جمائیاں اور انگڑائیوں پہ انگڑائیاں لیتے لیتے پھر آنکھیں میچیں اور پھر خراٹے لینے لگے اور آپ کا جھنجھوڑنا ان کے لئے لوری بن گیا۔

"ساہتیہ پریشد" کی دھوم دھام بتا رہی ہے۔ دیس کے لئے جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ سب ہو چکنے سے سب کے سب اندر اور نچنت ہو کر نئی بھاشا کے پرچار میں لگے ہوئے ہیں۔ بھاشا واشا کی دیکھ بھال! جاپ پڑتال، ناپ تول کا کھڑاگ اُس گھڑی کے لئے ہے۔ جب کٹن باتوں میں سے ایک ایک کر کے سب کی سب پوری ہو چکی ہوں۔

دیس کس جنجال میں پھنسا ہوا ہے۔ کنگلا پن کتنا بڑھتا چلا جاتا ہے اور پورا دیس کیسا اپاہج ہو کے رہ گیا ہے۔ اپنے بل بوتے پر آج تک نہ یہ کچھ کر سکا اور آپس میں بھی تنا تنی رہی تو آگے بھی یہ کچھ کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ جب ابھی تک دیس کی کسی بات کا بھی ٹھیک ٹھاک نہیں تو سب چھوڑ چھاڑ کے پہلے دیس ہی کو سدھارئیے پھر جو جی چاہے وہ کیجئے!

گھر میں تو پھوٹ پڑی ہے۔ کہرام مچا ہوا ہے۔ بھیانک چیخوں سے کان پھٹے جا رہے ہیں جیسے بھیڑیوں کا ریوڑ تتر بتر ہو کے اِدھر اُدھر مارا مارا پڑا پھرتا ہو۔ ایسے ہی دیس والے بھی ہیں۔ آپس میں جوتی پیزار، گالم گلوچ اور بھڑ سنائے جا رہے ہیں۔

ایسے دنوں میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی نیو رکھنا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کے پرچار پراڑنا ایسا ہی ہے جیسے کسی گھر میں آگ لگی ہوئی ہو، دھڑ دھڑ گھر جل رہا ہو اور اُس کے رہنے والے آگ بجھانے کی جگہ نئے گھر کا ڈیزائن، چھت کی اونچائی پچھیت کی بناوٹ آنگنائی کی چوڑائی، کھڑکیوں کی لمبائی اور پورے گھر میں کہاں کہاں پھول پتیاں بنائی جائیں گی، گھر سجنے کے لئے اور کیا کیا ہونا چاہئے۔ ایسی ایسی باتیں کھڑے سوچتے رہیں۔ گھر بنے پیچھے اس کے سجنے کے لئے آپ جو چاہیں کریں۔ کوئی ٹوک نہیں سکتا۔ گھر بننا کیسا ابھی تو بھرا گھر اجڑ رہا ہے اور اس کے بننے کی گھڑی آنے تک نہ جانے ابھی کیا کیا ہونا ہے تو ایسی کھچڑی پکانا آپ کے لئے تو ٹھیک نہیں۔

یہ تو سوچئے۔ آپ کدھر جا رہے تھے اور لوگوں کے بہکانے سے بھٹک کے کدھر چلے آئے۔ چلے آنے میں تو کچھ نہ تھا۔ پراڑنا اور یہیں جم کے بیٹھ جانا تو اچھا نہیں۔

کوئی بڑا بکیت، جیالا پھکیت، منچلا سورما اپنا سب کچھ لٹا کے دُہری، تہری بیڑیوں، ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دیس والوں کے چھڑانے کی دُھن میں ہیٹ پیٹ اٹھ کھڑا ہو اور لڑائی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں کُود کے ——— سوجھ بوجھ اور نت نئی گھاتوں سے جم کے ایسا لڑے جو دوسروں کے دانت کھٹے کر دے اور چھکے چھڑا دے۔ پھر وہی اکیلا کی لڑائی بڑھائی چھوڑ پھاڑ گھمتا گھاتا بھاشا کے پرچار کرنے والوں میں آبیٹھے اور ان کے سکھانے پڑھانے سے انہیں کا ساتھ دینے پر اڑ جائے تو اسے یہاں بیٹھا دیکھ کے دیکھنے والے اپنی اپنی سی کہنے لگیں گے۔ کوئی کہے گا لڑائی بھڑائی کے جوکھوں میں پڑنا منہ کا نوالا نہیں جو چپ چاپ نگل لیا جائے۔ دیکھا نا، جو کہتے تھے وہی ہوا۔ پہلے کیسی اکڑ مکڑ دکھائی اور پھر پائیں ٹائیں فش جب وہاں نہ ٹھہرا گیا تو لڑائی سے جی چرا کے یہاں بیٹھنا ہی پڑا۔

دوسرا کہے گا۔ نہیں بھئی یہ بات نہیں۔ لڑائی کو بھی تو دیکھو۔ گھنٹے دو گھنٹے، ایک دن دو دن۔ مہینے دو مہینے کی نہیں برسوں ہو چکے۔ ہاتھ پاؤں کب تک چل سکتے ہیں۔ گھڑی بھر آگ کی بلا کے تو دیکھو کتنی سوجھتی ہے۔ لڑتے لڑتے ہاتھ پاؤں تھک کے چور ہو گئے ہوں گے سستانے کے لئے کہیں بیٹھنا بھی کیا بوا پن ہے۔ تیسرا کہے گا بیٹھنا تو بوا پن نہیں پر جم کے بیٹھنا وہ نہیں تو پھر کیا ہے۔

جتنے منہ اتنی باتیں ہوں گی۔ ساتھ ہی سوجھ بوجھ والے بھی یہی کہیں گے۔ ایسے مہنگے کے لئے سب سے پہلے دیس ہی کی سیوا چاہئے۔ دیس کے پورے بندھن جب کھل چکیں تو بھاشا واشا کا پرچار سب کچھ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہو سکتا ہے اور جب تک دیس نہ سنبھلے تب تک ایسے اُلجھاوے میں اُلجھنا نہ چاہئے۔

بکسر کی لڑائی سے ایک بانکے منہ موڑ کے چلے۔ دیکھنے والوں نے ٹوکا۔ ہائیں یہ کیا۔ آپ کی کیہنی بھچکیتی کی تو دھوم تھی۔ بڑے بڑے جیالے لوہا مانتے تھے۔ جب آپ ہی جم سکے تو پھر کون جمے گا۔ اور اس گڑھی کو پھر کون جیتے گا۔ اس ٹوکنے پہ بانکے بیٹے اور جھنجھلا کے کہنے لگے۔ کیا کہتے ہو۔ تم کیا جانو نہیں تو یہی آتا ہے جو منہ میں آیا بک دیا کیا کہیں ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھ لیا۔ ایسے ایسے جتھے ہونک سک سے ٹھیک، ڈیل ڈول کے اچھے پورے اور ایسے ہیلے حدھر سے نکل جائیں دیکھنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں اور چھوٹے بڑے سب کی ٹکٹکی بندھ جائے۔ ان میں کا ایک ایک سیکڑوں پہ بھاری۔ نہتا بھی ہو تو لاکھوں کے ٹانڈی دل میں گھس کے دانتوں سے بوٹیاں کاٹ کاٹ کے تھوک دے اور پنجلوں کا پتا پانی کر دے۔

ایسے ایسے جیالوں کے دھڑ گولیوں سے چھلنی چھلنی ہوتے ہوئے دیکھے۔ اس سب کچھ ہونے پر بھی دیکھنے کی بات یہ ہے۔ جس جگہ ان کے پاؤں جم کے پھر وہاں سے نہ ہٹے اور وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے ٹھنڈے ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی لڑائی ہے۔ اس سے تو ہیجڑوں کی لڑائی اچھی کوئی کوس بھر سے دن دن ہونے لگی اور یہاں جی کی جی ہی میں رہی بات۔ ہونے پائی تلوار کے دھنی تھے تو منہ کیوں چھپایا۔ آمنے سامنے ہو کے دو دو ہاتھ ہمارے بھی دیکھ لینے ہوتے۔ بھیرے گلگریاں جیسے کٹنی ہیں، ایسے ہی گھڑی بھر میں پرے کے پرے کاٹ کے نہ رکھ دیتے تو یہ اپنی مونچھیں منڈا ڈالتے۔ اب یہ جگہ منچلوں کے ٹھہرنے کی نہیں اور وسیع تو یہ ہے اب جینا دوبھر ہو گیا۔

پہلے کبھی بانکوں کی بڑی دھاک تھی اور ہوتے بھی تھے بڑے تلوریے۔ پھر بھی ان میں اول جلول ہی بہت ہوا کرتا تھا پر آپ تو ایسے نہیں۔ آپ میں جو کچھ، سوجھ بوجھ اور اچھی اچھی باتیں پریمشر نے اکٹھی کر دی ہیں۔ وہ پہلے کے بانکوں میں کہاں۔ آج آپ ہی ہندماتا کے اکلوتے

بانکے ہیں۔ دیس کا اکھاڑا کھدا ہوا ہے اور اس میں برسوں سے راج کے ساتھ آپ کی گتھم گتھا ہو رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو گید گید کے جیت کرنے کی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھنے والوں کے جتھے کے جتھے اور ٹولیوں کی ٹولیاں پرا جمائے آپ کے اس بھڑنے کو بڑے چسکے سے دیکھ رہی ہیں۔ یہ کچھ دنوں سے جو آپ اس اکھاڑے سے نکل کر دوسرے دھندے میں لگ گئے۔ اس پر اپنے پرائے سب میں کانا پھوسی ہو رہی ہے اور کہا جا رہا ہے۔ مہاتما جی سیدھے جاتے جاتے یہ کدھر مڑ گئے۔

آپ کے ادھر آنے سے دیس کی بات کیسی ادھر کی ہو گئی رہ گئی تو پھر ادھر ہی جائے نا اور دیس ہی کے لئے جو بن برسے وہ کیجئے۔ رہا بھاشا کی گتھیاں سلجھانا اسے پھر کبھی کے لئے اٹھا رکھئے۔ بھاشا کیا کہیں بھاگی جا رہی ہے جو اس کی روک تھام ابھی ہو سکتی ہے پھر نہ ہو سکے گی۔ جدھر آپ جا رہے تھے اس کے سامنے بھاشا وشا ہے کیا۔ اچھا ہو کے ایسے سیکڑوں کھیل کھیلے جا سکتے ہیں۔

گاؤوں میں دیکھا ہو گا جوٹ آج بھرا، پھر سات دن تک یونہی سنسان پڑا رہتا ہے۔ اس سنسار میں جو جو دھندے لوگ کر رہے ہیں کچھ ہی دنوں کے لئے ان دھندوں سے انہیں الگ رکھا جائے تو وہ جیسے سے نہیں رہتے۔ سینے پرونے والوں سے سنار تک، بڑھیوں سے لکڑی کی چیر چار، لوہاروں سے لوہے کی پیٹ پاٹ، کمہاروں سے مٹی کی تھوپ تھاپ، لکھنے پڑھنے والوں سے لکھت پڑھت، سوچ بچار یہ بہت نہیں تھوڑے ہی دنوں کے لئے یہ ان سے چھڑا کے دیکھ لیجئے۔ ان میں سے کسی میں بھی پہلے کی سی بات نہیں رہے گی۔

آج جو کرنا ہے اُسے کل کے لئے اٹھا رکھنے پر بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ آج کا دھندا آج ہی کے ساتھ ہے اسے آج ہی پورا ہو جانا چاہئے کل کا دھندا آج سے الگ ہو گا۔ آج کی بات کل پر چھوڑ دی تو کل کی پرسوں اور پرسوں کی اترسوں پر چھٹتی رہے گی اور یونہی چھوٹتے چھوٹتے پھر وہ بات ہی چھوٹ جائے گی۔ بات ادھر ٹھنڈی پڑی تو پھر دھیان بھی ٹھنڈا کر کے رہ جاتا ہے تو ابھی دیس کی بات ٹھنڈی نہیں پڑی ہے۔ یہ سماں ابھی ایسا ہے جس میں بھاشا وشا کو چھوٹ چھاڑ کے پھر آپ دیس کو پکڑ سکتے ہیں اور اس کے لئے جن نمک دوڑ دھوپ کر سکتے ہیں۔ آپ کی دوڑ دھوپ باہر کی رہی اس سے جو کچھ نہ ہو سکے۔ آج کچھ نہیں ہے تو کل کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا اور آگے بڑھ کر آنکھیں یہ سہانا سماں دیکھیں گی۔

دیس میں میل ملاپ کے جُھنڈ کے جُھنڈ ایسے چھائے ہوئے ہیں جن کی گھنی چھاؤں میں پریم جل اگلڑائیاں لیتا بہہ رہا ہے۔ ایک کے من کی لہنیاں دوسرے کے من میں چڑھی ہو رہی ہیں۔ پیار کی بیل جوں کے پھیلتے ہوئے پودوں پر چڑھی جا رہی ہے۔ پریم کے پھولوں کے گچھے کے گچھے لٹک رہے ہیں۔ سکھ، چین کے پھولوں کی بھینی بھینی باس سے دیس کا دیس بسا ہوا ہے۔ مُن برسانے والی گھنگھور گھٹائیں سنسار کی آنکھوں میں کاجل نگار ہی ہیں۔ کالے کالے بادلوں کے بھاٹ رہ رہ کے دیس کے گیت گا رہے ہیں۔ کوئل کی کوک، مور دل کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، ہلکی ہلکی پھوار، سلونی، سانولی گھٹاؤں کے اندھیرے گھُپ میں رہ رہ کے بجلی کی چمک جیسے کسی جوبن کی متوالی کے بھیگے موٹے بال سکھانے کے لئے جھٹکنے میں گھڑی گھڑی منہ پہ آ جاتے ہیں۔ ایسے دھندلکے میں دیس کے پربھو آپ کے چرنوں میں جھکے ہوئے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور آپ دیس کی ہری بھری پھلواری کے منڈوے میں ایسی سہنی گھڑی کو دیکھ دیکھ کے سکرا رہے ہیں۔

اپنا لکھے ہاتھوں اپنی اُس نئی بھاشا کو بھی دیکھتے چلئے جس کے پرچار کی دھن میں آپ اپنا اب تک کا کیا کرایا سب کا بھرت کر دینا چاہتے ہیں۔ اردو میں عربی، فارسی بولوں کی بہتات سے ایسا دھوکا کھا جانا کچھ اچنبھا آپ یہ کہہ اُٹھے:۔

"اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا ہندو چاہیں تو اسے دیکھیں اور پھیلائیں۔"

یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ اں مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا اور کہاں ہندوؤں میں کوئی ٹک بھی ہے۔ ایسی بات منہ سے نکالنے سے پہلے آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو ہی سے پوچھ لیا ہوتا۔

ہندی اور اردو کے جھگڑے پر پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈاکٹر سید محمود کو جو ایک چٹھی لکھی تھی۔ اسی میں ایک جگہ پنڈت جی یہ لکھتے ہیں:۔

"یہ بات تو یہ ہے کہ نہ جانے ہمارے ملک میں کتنی زبانیں ہیں جو فرقہ وار نہ رنگ اختیار کر گئی ہیں۔ زبان کا مسئلہ بھی ہندی بن

گیا اور بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر تسلیم کر لیا گیا ہو اور مسلمانوں کی زبان ہے۔ میں یہ صدا ب عرض کروں گا کہ میں اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں اور اردو کو اپنی زبان سمجھتا ہوں جسے میں بچپن سے بولتا چلا آیا ہوں۔"

لیجئے پنڈت جی تو اردو کو اپنی ایسی بھاشا سمجھ رہے ہیں جسے وہ بچپن سے بولتے چلے آئے ہیں اور آپ اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا کہنے پر اڑے ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے۔ سننے والا کس کا کہا مانے، کسے جھٹلائے اور کسے سچ جانے۔ اسی کے ساتھ ساتھ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے مسلم یونیورسٹی یونین میں اردو کانفرنس کے اسٹیج پر "اردو ہماری زبان" کہہ کر جو لمبی چوڑی اسپیچ پڑھی اُسے بھی کہیں کہیں سے سُن لیجئے۔ پنڈت جی اسی میں ایک جگہ یہ کہتے ہیں:۔

"اب یہ سوال اُٹھتا ہے کہ اردو قوموں کے میل جول اور دیسی بدیسی زبانوں کے اختلاط سے پیدا تو ہو گئی لیکن کیا عہد میں بھی ہندو اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے۔ حضرات میں اس تنقیح کو گمنام میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔ سننے ہندوؤں میں تبلیغ مذہب تو عرصے سے بند ہو چکی تھی۔ تقریباً دو ہزار برس کے بعد اب پھر آزاد ہوئی ہے۔ اس واقعہ کو نظر میں رکھ کر دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں میں دھرم پرچار کے سلسلے میں اردو اختیار کی گئی یا نہیں اگر تحقیق سے اس کا جواب اثبات میں ملے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کو ہندوؤں نے اپنے ہندو بھائیوں کی دینی ہدایت کے لئے استعمال کیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اول برسوں میں آنجہانی وھا، اور پنجابیوں کی تبلیغ یا شدھی کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا۔ مگر ۱۸۱۵ء میں سمرسو بھاگوت کا دسواں اسکند یعنی باب، اردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمی آئینہ مستقر کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے یہ کئی سو صفحے کا قلمی کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب ایک ہندو نے اپنے ہندو بھائیوں کے لئے اچھی اردو نظم میں تصنیف کرتا ہے۔"

پھر پنڈت جی نے ہندو دھرم کی لائبریری میں سے ایسی بہت سی چھوٹی بڑی اردو لکھتوں کا اتا پتا دیا ہے جو پوری کی پوری ہندو دھرم کی باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ گھر کے بھیدی کی یہ باتیں بھی سنئے کی ہیں:۔

"سنسکرت اور ہندی بھاشاؤں کے جیتے جاگتے ہندو دیا

نے اردو کو اور اردو وظائف سے زیادہ احتیاط سے یہ کہئے کہ مذہبی اور قومی تعلیموں سے خارج نہیں کیا شکست چالیسی ایک اردو کی کتاب اسٹوتر یعنی وظیفہ کی ہے۔ یہ اردو کے محض ترجمہ بند کی صنف سے ہے۔ ہر بند کے چار مصرعے ضخیم اردو میں ہیں اور ترجیع کا مصرع "تس نمو" چار بار آتا ہے اس کو میں نے یوجن کے سلسلے میں وظیفہ یا مناجات کی طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ تلسی داس رامائن لکھ چکے تھے اس کی کھٹارا برابر ہو رہی تھی۔ مہابھارت اور بہت سے پُران اور دوسری مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی تھیں لیکن اپنے اہالی ملک میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی جب تک کہ اردو سے کام نہیں لیا گیا۔ اس ضمن میں وہ تمام اردو دنیا کے سنسکرت کے سنتی ہیں جنہوں نے مہابھارت، رامائن، گیتا، مہاتم شو پران گنیش پران اور رہائی بچے وغیرہ دھرم پستکیں اردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ یہ کتابیں منشی نول کشور کے مطبع سے چھپ کر آج تک شائع ہو رہی ہیں اور ہندوؤں میں ان کے مذہب کی تلقین اور روایات قدیم کے زندہ رکھنے کا زبردست آلہ ہیں۔ ان نظم کی کتابوں کے علاوہ بہت سے اپنشد اور رچھیوں شاستر اور سمرتیاں اردو نثر میں منتقل ہو کے شائع ہوئیں اور آج تک ان کی مانگ برابر جاری ہے۔ یہی حال آریہ سماج کے لٹریچر کا ہے۔"

یہ کہانی کہتے کہتے پنڈت جی نے کہی ہوئی باتوں کو پھر ایک جگہ اکٹھا کر کے اک چیلنج بھی دیا ہے جس کا نچوڑ یہ ہے:۔

"آپ نے دیکھا کہ اردو کی تعمیر و قدوین اور ترویج میں ہندوؤں کا کتنا مقتدر حصہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ہندوؤں کی مذہبی اور قومی کتابیں کس کثرت سے اردو میں لکھی گئیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ بھگوت گیتا کے ایک سے زیادہ نئے ترجمے اور تفسیریں اردو نظم اور نثر میں ہر سال بلا ناغہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ہندی دوالا (صحیح مطلب ہے اردو ہندی کے جھگڑے کا طلبگار) اس وقت یہاں موجود ہے تو سامنے آکر بتائے کہ جو واقعات ابھی پیش کئے گئے ان میں سے کوئی واقعیت سے محروم ہے۔"

پنڈت کیفی کی باتیں سنتے سنتے آپ اکتا گئے ہوں گے۔ یہاں تک تو آپ سن ہی چکے۔ گنتی کی دو ڈھائی باتیں اور سن لیجئے۔ یہ لکھت کسی

مسلمان کی ہوتی تو یہ مانے اس میں سے دو بول بھی کبھی وہاں نکلتا۔ پر اُس کا لکھنے والا ہندو اور ہندو بھی ایسا ویسا نہیں بڑی سوجھ بوجھ کا پنڈت ہے جس کی آنکھیں سچائی پر بھی ہوئی ہیں۔ اپنے ساتھ کے بیٹھے ہوؤں کو پکار پکار کے ادھر ہی بلا رہا تھا سے جو جھ سچائی کا اجالا ہے۔ اس کی لکھت کے ایک ایک بول سے یہی دکھائی دیتا ہے جن باتوں سے دیس بدحال ہوتا جا رہا ہے۔ ان پر وہ بھی جی میں کڑھ رہا ہے، کوفت رہا ہے اور بھاڑ جیسا ہے اس لکھت میں جی کی بھڑاس نکالی ہے اور پتے پتے کی باتیں ایسی ایک جگہ اکٹھی کر دی ہیں جنہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اسی میں ایک جگہ پنڈت جی نے یہ بھی لکھا ہے۔

"جب مہاتما گاندھی نے اپنے سابرمتی کے آشرم کی بھجنا ولی مرتب کرنے کا حکم دیا، اس وقت بھارتیہ ساہتیہ کا یہ نظریہ جواب مانگ پوہیں ہنگامہ آرا ہوا کہاں چلا گیا تھا۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ مہاتما جی کے مرعوم سابرمتی آشرم کے بھجنوں کے اس ہندی کے مجموعے میں کل ۱۲۱ بھجن ہیں جن میں ۱۰۲ بھجنوں کو ہندوستانی نام دیا گیا ہے۔ باقی ۱۹ بھجن گجراتی، مرہٹی وغیرہ دوسری زبانوں کے ہیں اور یہ واضح رہے کہ ان ۱۰۲ ہندوستانی بھجنوں میں کئی غزلیں بھی ہیں جیسے:۔

ہے بہار باغ دنیا چند روز ● دیکھ لو اس کا تماشا چند روز

یہ بھجنا ولی ہندی میں چھپی ہے۔ اب اگر اردو کے لفظ سے کسی وجہ سے بے اعتنائی ہو گئی تھی تو بھارتیہ ساہتیہ میں ہندوستانی ہی سے کام رکھتے۔"

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی کیا یہ سب باتیں ٹھیک ہیں۔ اچھا انہیں چھوڑیئے۔ بیچ میں بات میں سے بات نکل آئی اور جو کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا میں یہ کہہ رہا تھا اردو میں آپ نے عربی، فارسی بولوں کی ریل پیل دیکھ کے اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا سمجھ لیا۔ دیکھئے بات یہ ہوئی۔ اردو کی جب نیو ڈالی جا رہی تھی تو یہاں کے چھوٹے بڑے متھے سب ہی اس میں لگے ہوئے تھے اور مسلمانوں کا راج تھا اس لئے عربی، فارسی کے بول اردو میں آئے اور بہت آئے اور جو مسلمان راج کی جگہ کوئی اور راج ہوتا تو اُسی راج کی بھاشا کے بولوں کی بھیڑ اردو میں لگ جاتی۔ کسی بھاشا میں اور دوسری بھاشا کے بولوں کی بھرمار دیکھ کے بے سوچے سمجھے کہہ دینا یہ بھاشا اس متھے کے دھرم کی بھاشا ہے سوچنے تو یہ کتنی بڑی بھول ہے آج کل اردو میں انگریزی۔ بول بڑھتے جا رہے ہیں۔ کوئی نہ جاننے والا انگریزی بولوں کی بہتات دیکھ کر اردو کو انگریزوں کے دھرم کی بھاشا کہنے لگے تو تم کہئے اس کے اس کہنے پر کیا آپ اپنی ہنسی روک سکیں گے

دھرم اور بھاشا ان دونوں کے ڈانڈے الگ الگ ہیں

ان دونوں کے گھال میل کو جس سے پوچھئے یہی کہے گا یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ جب دھرم اور بھاشا کا آپس میں گڈمڈ کرنا ٹھیک نہیں کہا جاتا تو منہ سے جو کہا جا رہا ہے وہ کیا کہوں نہیں جاتا۔ چاچا جی کے باتیں کرنا کس لئے۔ دونوں کا نیل جول اچھا لگتا ہے تو کھل کر کہہ دیجئے۔ دھرم اور بھاشا کو ہم الگ الگ نہیں دیکھ سکتے اور دونوں کو ملا دینا چاہتے ہیں۔ اس کہنے پر بھی کوئی آپ کو ٹوکے تو اُسے جو جی چاہے کہئے۔ پر جب تک آپ منہ سے یہ نہ کہیں گے تب تک پوچھا گچھی کی گئے بڑھتی ہی رہے گی۔

پہلے پہل جو بھاشا کے جھگڑے کی بھنک کانوں میں پڑی تو میں نے جی میں کہا کہیں ایسا تو نہیں نئے نئے مولوی، ملّا اپنی بڑائی جتانے کے لئے چھانٹ چھانٹ کے ایسے موٹے موٹے اور بھاری بھاری فارسی بول کے بول بات چیت میں ٹھونستے ہیں جو بہت سے ہندو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بات ہندوؤں کو بُری لگی ہو اور جھلا کر انہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ پُچنے کی ٹھان لی ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی دھیان آیا ایسا تھا بھی تو اس کا یہ توڑ تو نہ تھا جو کیا جا رہا ہے۔ وہ بات ہی کیا تھی۔ دونوں جگہ کے لکھے پڑھے سمجھ داروں کو بلا لیا ہوتا یہ سب ایک جگہ بیٹھ بٹھا کے گھڑی دو گھڑی میں جھگڑا چکا دیتے۔

یہ بھی آج کل کا اک نیا ڈھکوسلا ہے۔ جسے دیکھئے اردو اور ہندی کا سنتر پڑھ رہا ہے اور اسی کی مالا جپ رہا ہے۔ بہت سے پڑھے لکھوں سے یہ پہیلی بوجھی جا چکی بہرا پوچھنا یہی تھا اور ہے۔ جب اردو کا دیول ہندی ہی کی مٹی سے بنا ہے تو پھر اردو کے ساتھ اور ہندی لکھنا کس لئے۔ اردو میں ہندی ایسی پیری ہوئی ہے جو کبھی اس سے الگ ہی نہیں ہو سکتی اور کیسے الگ ہو سکتی ہے۔ جب اردو کی کھال، چمڑا، ہڈیاں، ڈھانچہ جو کچھ ہے وہ ہندی ہی ہے۔ اپنی اپنی سب کہہ رہے ہیں اور اسے کوئی دیکھتا ہی نہیں یہ ہے کیا۔ جانچنے تو کھڑی پھریں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ دکھائی دینے لگے گا۔ اس کے پرکھنے اور جانچنے کا ڈھب یہ ہے:۔

دو اچھے پڑھے لکھے سامنے بٹھا کے ایک سے کہئے تم ایسی اردو لکھو جس میں عربی، فارسی بولوں ہی کی ریل پیل ہو اور بھولے سے بھی کہیں ہندی کا ایک آدھ بول تک نہ آئے۔ ہندی کے کسی بول کے نہ آنے پر بھی پوری لکھت اردو ہی رہے۔ دوسرے سے کہا جائے تم عربی، فارسی کو ہاتھ نہ لگاؤ اور ایسی اردو لکھو جس میں عربی، فارسی بولوں کی کہیں چھاں نہ آئے اور پوری کی پوری لکھت ٹھیٹ اردو رہے تو پہلا ایسے ڈھائی بول بھی نہیں لکھ سکتا جس میں اردو پن رہ سکے۔ پہلے لکھنے والے کی لکھت عربی، فارسی بولوں کی ایسی کھچڑی ہو کے رہ جائے گی جسے اردو سے نہ کوئی لگاؤ ہوگا اور نہ کوئی اسے اردو کہہ سکے گا۔

دوسرا لکھنے والا عربی، فارسی بولوں کی بھیڑ چیرتا، ہٹاتا آگے بڑھ کے ٹھیٹ اردو لکھ سکتا ہے تو اردو لکھنے اور بولنے میں ہندی سے کترا کے کوئی کتنا ہی نکلنا چاہے کبھی نہیں نکل سکتا اور کیسے نکل سکتا ہے جب اردو کے پتلے میں پوری مٹی ہندی ہی کی لگی ہوئی ہو۔ باہر والی بولیوں میں سے عربی، فارسی بول اس میں بہت سہی پر ہندی کے آگے وہ ایسے ہی ہیں جیسے موسلا دھار مینہ کے سامنے پانی کی کچھ بوندیں

یہ کبھی نہیں ہو سکتا جو ہندی کو نہ چھوا جائے اور عربی، فارسی بولوں ہی کی الٹ پلٹ سے اردو لکھت اور بات چیت ہو سکے۔ ہندی کو ہاتھ نہ لگانے اور عربی فارسی بولوں کے اکٹھا کر دینے سے اردو نہیں رہ سکتی۔ اردو میں سے عربی، فارسی بول نکال کے یوں لکھا جا سکتا ہے جیسے لکھنے کا یہی ڈھنگ جس میں آپ سے باتیں کی جا رہی ہیں۔ جب کسی جتن سے بھی ہندی کو اردو سے الگ نہیں کیا جا سکتا تو پھر اردو کے ساتھ ساتھ اور ہندی ٹکا ٹکڑا کس لئے بڑھایا جا رہا ہے۔ کیا آپ یہ بتا سکیں گے۔

اور سنئے پھل گیندا نہ مارو لگت کلیجا میں چوٹ، سائیں سے سچا رہو اور بندہ سے ست بھاؤ، موہ پہ ڈارو یہ سارے رنگ کی گگری یہ سب اور لکھنے کا یہ ڈھب جس میں بات چیت ہو رہی ہے۔ ان میں سے آپ کے ہندی کہیں گے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا جو ایک لاٹھی سے سب کو ہانک دیں اور کسی کو بھی آپ ہندی نہ کہیں۔

اچھا ان میں سے آپ جسے بھی ہندی کہیں اپنے بنارس کے بُنس کو اس سے ملا کے تو دیکھئے۔ بنس کی لکھت کیا اس کی سی ہے۔ آپ اس کی لکھت کے ڈھب کو کٹھن نہیں سمجھتے نہ سمجھئے اوروں سے پڑھوا کے تو دیکھئے۔ اسے سب پڑھ بھی تو نہیں سکتے اور کیسے پڑھ سکیں گے۔ اس کی ایسی نرالی لکھت ہے جو پہلے اور آج کل کے ہندوؤں کی لکھت سے میل ہی نہیں کھاتی۔

بُنس اور کچھ بنس والوں کو چھوڑ کے ہندو دں ہی میں سے کیا دو ایک کی بھی ایسی لکھت آپ دکھا سکیں گے۔ بنس میں ادھار کے ایسے ایسے من مانے کڈھب سے کڈھب بول ٹھونسے جا رہے ہیں اور ایسے بھولے بسرے بولوں کی بھرمار کی جا رہی ہے جن کے سمجھنے کے لئے مسلمان تو مسلمان ہندوؤں کو بھی سنسکرت کی ڈکشنری اٹھانا پڑتی ہے۔ آج کل کے نئے ہندی لکھنے والوں کی نہ کہئے یہ سب ادوان کے ٹوتے ہیں۔ کچھ لکھنا لکھانا ہوا، چھٹ سے سنسکرت کی ڈکشنری گھسیٹ لی۔ اسے سامنے رکھ کر آئیں بائیں شائیں جو جی میں آیا بھولے بسرے بول کے بول دیکھ دیکھ کے لکھتے چلے گئے۔ میں نہیں کہتا ان کے لکھنے کا ڈھب آپ پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

سنسکرت کا ہندو دھرم کی بھاشا ہونا اور اس بھاشا کا کبھی نہ ترنا ہوا پھیلاؤ کون ایسا پڑھا لکھا ہے جو نہیں جانتا۔ میں دیکھنے کی جو بات ہے وہ یہی ہے سنسکرت جب سہاگن تھی اور راج کی چہیتی بھاشا بھی جاتی تھی تب بھی چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب اسے نہیں بول سکے۔ کچھ ہی لوگ تھے جو اس میں بات چیت کر سکتے تھے تو راج کی بھاشا ہونے پر بھی جب یہ سب کی بھاشا نہ بن سکی تو اب کیا بن سکتی ہے۔ راج کے پانی ہی سے جو پودا نہ پھیک سکا۔ وہ بھوبل میں کیا پھل پھول سکتا ہے۔ پھلواری کی دیکھ بھال اور اس کے ٹھیک ٹھاک ہونے پر بھی جو پھول نہ کھل سکے تو اب پت جھڑ میں کیا کھلیں گے جس مچھی بھون کو راج بھی نہ بنا سکا تو راج کی دھوپ ڈھل چکنے پر وہ کیا بنتا۔ جب دانت تھے تبھی جو چنے نہ چبے سکے تو دانت ٹوٹنے پر وہ کیسے چبائے جا سکتے ہیں۔ وہ پرانے ڈھنگ کے سڈول موتی جو راج کا سنگھار ہونے پر بھی مٹی میں اٹے رہے اب ٹوٹ پھوٹ پر ان کی جھاڑ پونچھ ہوئی بھی تو کیا۔

پھر یہ بھی دیکھئے۔ آج جس نئے گھر کی نیو رکھی جا رہی ہے اگر اس کی یہ بنتا بھی رہا تو کب تک پورا بن سکے گا۔ بھاشا کا گھر اور گھروں کی طرح ایسا نہیں کہ جو کچھ دنوں میں بن بنا کے پورا ہو گیا اور اس میں گھر والے کا سیانا لگنے بسنے لگے۔ بھاشا کا گھر بنانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور بڑھ

جتھے کے ہوتے کا۔ وگ نہیں۔ اس کے بنانے کے لئے سب کا ایکا اور بڑی سوجھ بوجھ چاہئے۔ یوں ہی سی آنکھ بچی اور کچھ ہو کچھ ہو گیا یونہی سی چوک ہوئی اور کی کرائی باتوں پر پانی پھر گیا۔

نہ مانئے اور اپنی بات کی ہتک کرنے کی تو اور بات ہے پر ٹھنڈے جی سے دیکھئے تو آپ کی اردو میں وہ سب باتیں پائی جا رہی ہیں جو بڑھنے والی بڑی سی بڑی بھاشاؤں میں ہونی چاہئیں اور جو سچ کہنا کوئی پاپ نہ ہو تو مجھے یہ کہنے دیجئے۔ اردو میں کچھ پھیلاؤ کی ایسی ایسی باتیں بھی چھپی ہوئی ہیں جو اور دل میں نہیں۔ ابھی اس کا پھیلنا ہے۔ اس چھٹ پن ہی میں بھولی بھولی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ وہ پختگی گہری گہری باتیں بھی اس میں ہیں جنہیں دیکھ کر اچنبا ہوتا ہے۔ بڑے بوڑھوں نے سچ کہا ہے۔ بہو کے بول گھونگٹ میں اور پوت کے پاؤں پالنے میں۔ اس پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھئے تو، جب ابھی سے اس کی ادھ کٹی باتیں جی موہ لیتی ہیں تو آگے کیا ہوگا۔ کسی بھاشا کے پھیلاؤ کے جانچنے کے اور رہت سے ڈھبوں میں سے ایک ڈھب یہ بھی ہے:۔

جگ میں لوگوں کی چھٹائی بڑائی ایک سی نہیں ہوتی۔ سنسار میں یہی ہوتا آیا ہے۔ کوئی چھوٹا ہے تو کوئی بڑا۔ کوئی بہت چھوٹا ہے تو کوئی بہت بڑا۔ کوئی راجہ ہے تو کوئی بھکاری۔ کوئی اس کی چوکھٹ کا منگتا ہے اور کوئی اس منگتا کے گھر کا بھکاری۔ ایسے ہی ایسی بہت اونچ نیچ اور سیکڑوں اتار چڑھاؤ لوگوں میں پائے جاتے ہیں تو جس بھاشا میں ایسے اتار چڑھاؤ کے لئے الگ الگ بات کرنے کے ڈھب جتنے بہت ہوں اس بھاشا کا پھیلاؤ مانا پڑے گا۔

عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی ان سب میں سے کسی میں بھی یہ بات کرنے کے ڈھب بہت سے بہت نکلیں گے تو تین چار انہیں کے سامنے اب اپنی اردو کا پھیلاؤ دیکھئے۔ گنے گا تو ان کی گنتی اردو میں پندرہ سولہ تک پہنچے گی اور پورا پورا سوچ بچار کیا جائے تو ایسے اور اور بول بھی نکل سکیں گے۔ انہیں دیکھ کے کہیں یہ نہ کہہ اُٹھئے گا یہ بول ہیں کہاں کہاں کے۔ جہاں کے بھی ہوں اب یہ سب کے سب اردو ہی کے ہیں۔ اردو کوئی ایک بھاشا تو نہیں بیچ میں مٹھائی ہے۔

آئے، تو، تم، آپ، جناب، جناب من، جناب مکرم، جناب محترم، جناب راج کی بھاب، عالی جناب، سرکار، حضور، پیر و مرشد، جلالت مآب اور دوسری جمع عظم، شہنشاہ جہاں پناہ، یہ مرتی جن جن سیپیوں کے ہیں کیا یہ بھاشا اس جتھ Form of Addr

وہاں بھی انہیں ایک جگہہ ایسا ہی اکٹھا کر لیا گیا ہے جیسے ان بکھرے ہوئے موتیوں کی اردو نے تکتی ہوئی لڑیاں بنا دیں۔ یہ آپ جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔

تو جس ندی کا پاٹ اتنا چوڑا ہو چکا ہو۔ جس کا اتھلا پن گہرے پن میں چھپتا جا رہا ہو اسے پاٹنے کی دھن میں دن رات نئے نئے جتن کرنا اور رائگ سے اک نئی ندی نکالنے کے سوچ بچار میں آئے دن کھکیڑیں اٹھانا کیا کوئی سمجھ والا اسے اچھا سمجھ سکتا ہے۔

عربی کو آپ ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے اچھا نہ سہی۔ پر فارسی سے آپ کی یہ چڑ کیسی۔ فارسی اور سنسکرت یہ دونوں تو ایک ہی قبیلی کے چچیرے بہنے ہیں۔ ان دونوں کے کچھ بول لکھتا ہوں ان کا ملا جلا ہونا دیکھئے۔

فارسی اور سنسکرت کے ملتے جلتے بول

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
مہ	مہا	شاخ	شاکھا	ترس	تراس
کافور	کرپور	آستاں	ستھاں	بیوہ	ودھوا
بیم	بھیم	بار	بھار	بردت	بھوت
تباس (عبادت)	تپسیا	کرباس	کپاس	جندال	چندال
مگرمچھ	مگرمچھ	انگارہ	انگار	موش	مؤشک
باش	باس	فرمان	پرمان	ریشم	رشمی
است	استی	داغ	داگھ	کف	کپھ
خفتخاشش	کھکھس	بند	بندھ	ابرو	ابھرو
زانو	جانو	انگشت	انگشٹ	اورک	آدرک
آتش	آتشن	اشتر	اشٹر	سخرت	سرشٹی
خسر	سوسر	خہ	کھر	سخت	شکت
بادام	باتام	دیر	دھیر	سریر	شریر
میغ (ابر)	میکھ	نیلوفر	نیلوتپل	کان	کھان
کنج	کنج	گرم	گھرم	کام	کامنا
در	دوار	گرہ	گرہ	تن	تنو
ماست (دہی)	مستو	یک	ایک	شام	شائم
برنگال	برشاگال	بارش	برشا	جنگل	جنگل
بیش	ہنش	انرح	انرح	بوم	بھوم
شغل	سرگال	گاؤ	گئو	ماہ	ماس

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
روز	روج	گندم	گودھم	شیر (دودھ)	کشیر
جو	یو	پارینہ	پورانا	چم	چرم
خون	شون	پدر	پتر	مادر	ماتر
برادر	بھراتر	پور	پتر	دختر	دھتر
سرین	شرونی	بخش (حصہ)	بھاگ	ہشتاد (گٹھلی)	اسٹھی
پُر	پورن	ششم	ششٹم	پنجم	پنچم

آپ نے ان بولوں کا ملا جلا ہونا تو دیکھ لیا اب فارسی اور سنسکرت کے پرانے میل ملاپ کی کچھ اور کڑیاں بھی ساتھ ہی ساتھ دیکھ لیجیے۔ یوں تو انگریزی اور جرمن بھاشا کے بھی کہیں کہیں سے اگاؤ کا کچھ بول سنسکرت سے ملتے جلتے ہیں پر جو بات پرانی فارسی اور سنسکرت کے بولوں کو آمنے سامنے رکھنے پر دکھائی دیتی ہے وہ اور کسی بھاشا میں نہیں۔ اسی سے تاڑنے والے نے کہہ اٹھے اور یہ کہہ اٹھے:۔

ایران کے کیانی، زردشتی اور ہند ماتا کے سپوت برہمن، چھتری ان سب کے پُرکھا، بڑے بوڑھے ایک ہی ٹھہرانے کے تھے جن میں کبھی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک ہی جگہ سب کا رہنا سہنا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ پرانی فارسی اور سنسکرت ایک ہی بھاشا تھی جب آپس میں پھوٹ پڑنے سے یہ الگ ہوئے تو الگ الگ رہنے سہنے سے اس ایک بھاشا میں پہلے پہل تھوڑا پھر بہت ال بل ہونا گیا۔ ژند اوستا اور سنسکرت کے بول ایک سے ہیں جنہیں نہ جاننے والا سُنے تو ایک ہی سمجھے اور دونوں کو ایک ہی بتلائے۔

پرانی فارسی کو الگ الگ تین نمبروں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک ژند اوستا کی بھاشا۔ دوسرے پہلوی بھاشا جو ژند کے پیچھے پڑھی اور پہلی تیسرے دری بھاشا جو ساسانیوں کے راج میں چلی پھلی۔ یہ دری بھاشا ژند اوستا سے بہت الگ اور فردوسی کے راج کی بھاشا سے میل کھاتی ہے۔ ساسانی راج کی بھاشا اور فردوسی راج کی بھاشا جیسے یہ دونوں ملتی جلتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے ہی ژند اوستا اور سنسکرت ہیں۔ یہی دیکھ کے یورپ کے کھوج لگانے والے یہ کہنے لگے۔ یونہی سی گھٹ بڑھ سے ویدگ گیت اوستا میں اور اوستا کے بول ویدک کے سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔

اوستا کا منتر اور ہوما اور ویدکا منتر اور سوما دونوں کے دونوں ایک ہیں۔ ایسے ہی ژند اوستا کا ستر او ہی ہے جو رگوید کا منتر منتھرا ہے۔ رگوید کا ایرمن دیوتا اور ژند اوستا کا ایرمن یہ دونوں بھی ایک ہی ہیں۔ ایران کی راج دھانی میں پہلے پہلے جن جن کا راج رہا وہ رگوید اور ژند اوستا میں ایک ہی سے ہیں۔ ژند اوستا کا یما خشائتا (جمشید) رگوید میں یما راجہ ہے خشائتا ہمارا جہ (بادشاہ) کو کہتے ہیں۔ اس لئے یما خشائتا اور یما راجہ یہ دونوں ایک ہی ہوئے۔ ژند اور رگوید میں کیکاؤس اور کاویہ اشناس دونوں کی باتیں ایسی ایک سی ہیں جن میں رتی بھر بل نہیں۔

بھیٹ دینے والے اور چڑھاوے چڑھانے والے کو ژند اوستا میں اثرو کہتے ہیں۔ وید میں بھی اتروا کو اتھروون کہا گیا ہے۔ کوی یہ بول ویدوں میں آنے والی باتوں کے جاننے والوں اور بڑے بھاری پرکھ والوں کے لئے بولا گیا ہے۔ ایران میں بھی بڑے بڑے راج پاٹ والوں کے لئے یہی بول بولا جاتا تھا۔ جیسے کوی ہسرو (کیخسرو) کوی گوات (گشتاسپ) ٹوہ لگانے والوں نے تو یہاں تک کھوج لگا لیا۔ پوجا پاٹ میں جو بول منہ سے نکلتے تھے وہ ژند اور ویدوں میں کہیں کہیں یونہی سا ال بل ہو تو ہو، نہیں تو دونوں کے بول ایک ہی سے ہیں۔

وید میں سورج کو گھوڑے والا اور دوڑنے والا بتایا گیا ہے۔ اوستا میں بھی یہی ہے۔ سورج دیوتا کو وید میں ارامتی اور اوستا میں ایرامتی کہا گیا ہے۔ یہاں دونوں جگہ اس دیوتا کے منہ سیاہ کی سمجھ گھڑی میں پڑے جاتے تھے۔ انگیرا رشی کی پودے سے آگ کی پوجا کا پرچار ہند و مانتے ہیں۔ اوستا میں اسی آگ کی پوجا کا پرچار اتخرو اور اس کے گھر والوں سے مانا گیا ہے۔ تریتا کو اوستا میں پہلا بید بتایا ہے۔ رگ بید اور اتھروید میں یہی تریتا تھریتا، تریتا ہے جو دکھوں سے اچھا کرنے والا دیوتا مانا گیا ہے۔ اگنی ماتا کو جیسے ہندو گھروں میں رکھتے تھے۔ ایسے ہی ایرانی بھی۔ ایرانی آگ پوجنے والوں کے رات دن گانے کے منتر کو گاتا کہتے تھے۔ ہندوؤں میں بھی گاتا کا تری منتر کہلاتا ہے۔ جنیو برہمنوں اسے لڑکوں کو جنیو پہناتے۔ ایرانی بھی اسی برس پہناتے تھے۔

یہاں ناریوں پر جیسے اشنان کے میلے لگتے ہیں۔ ایسے ہی ایران میں آب رانی کے تہوار ہوا کرتے تھے۔ جاڑے آتے جیسے یہاں دوالی کا تہوار ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایرانیوں میں چراغاں کی دھوم دھام ہوا کرتی تھی۔ ہولی رہے اگلے دن یہاں ہندو جو کیا کرتے ہیں یہی سب ایران میں کوسہ برشتیس کے تہوار میں کیا جاتا تھا جس جگہ میں یہاں بسنت کا میلا لگتا ہے

ایران میں بھی اُسی مہینے جشن گل کوبی منایا جاتا تھا۔ ان باتوں سے یہی پتا چلتا ہے پہلے پہل یہاں کے آریہ جب ایرانیوں سے الگ ہوئے تو یہ اور ایرانی ایک ہی دھرم رکھتے تھے۔ پرانے لکھنے والوں میں سے کچھ نے ایران سے آریوں کے نکلنے کی باتیں یوں لکھی ہیں۔

ان میں کا ایک جتھا دھرم کی باتوں میں کچھ کتر بیونت کر کے دھرم کو بگاڑنا چاہتا تھا۔ اس سے اک آگ بھڑک اٹھی اور دھرم کے بچاؤ کے لئے تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے بڑا رن پڑا۔ لڑائی بھڑائی ہو چکنے پر آپس میں ایسی چھپا چھپتا ہوئی جو کبھی ایک جگہ مل جُل کے نہ بیٹھ سکو ہارا ہوا جتھا نکو کریں کہلاتا اُدھر آنکلا، اور یہیں رہ پڑا۔

۱۷۵۰ ابیں پُرانی دُھانی لکھت کے کچھ ٹکڑے کسی پارسی کے ہاتھ سے نکل کے یورپ پہنچے۔ پھر پُرانی لکھت کے کھُدے ہوئے کئی ٹکڑے ڈھونڈنے والوں کو ایران سے ملے۔ ان سب کو دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کے بال کی کھال نکالنے والوں نے سوچ بچار سے ان بکھری ہوئی کڑیوں کی لڑیاں بنا دیں۔

ان باتوں کا پھیلاؤ یہاں نہیں سما سکتا اسی لئے انہیں چھوڑتا ہوں۔ فارسی اور سنسکرت کے کبھی کے میل جول پر جو لکھا گیا وہ اتنا بھی نہیں جتنا کہ بہتی ہوئی ندی سے چلو بھر پانی۔ پھر بھی آپ نے یہ تو کچھ ہی لیا ہوگا۔ فارسی اور سنسکرت ایک ہی پیڑ کی ڈالیاں، ایک ہی پھلواری کے پھول، ایک ہی سیپی کے موتی اور ایک ہی منہ کی دو آنکھیں ہیں۔ جب ان دونوں کا میل ملاپ آپ دیکھ چکے تو اب فارسی بدیسی بھاشا کہاں رہی یہیں کی ہوئی اور جب یہیں کی ہوئی تو پھر اس کے بولوں کو ٹھکرانا کس لئے

فارسی اور سنسکرت کے بٹے ہوئے پریم کی کہانی میں آریوں کے باہر سے یہاں آنے کی بات چھڑ گئی ہے تو یہیں وہ جھگڑا بھی چکا دینا چاہئے جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں چلا آرہا ہے۔ ان دونوں جتھوں میں جلی کٹی اور جو نوک جھونک چلی آتی ہے اس میں سب سے بڑھ کر ہندوؤں کی یہ بنگار ہے:۔ ہندوستان ہمارا دیس اور ہمارا ہی جنم بھوم ہے۔ دیس کا بھولا ہمارے ہی لئے ہے اور ہمیں اس میں بھٹکتے رہیں گے۔ پہلے سے ہمیں یہاں کے رہنے والے ہیں۔ باہر سے آنے والے جو ساتھ رہ پڑے یہ کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے۔ دیس کے اکھڑتے سپوت ہمیں ہیں اور رہیں گے۔ یہ دیس کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔

گونڈ، بھیل، لمباڑے یہ بات کہیں تو سچ یہ ہے انہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا اور ہے بھی یہی۔ انہیں گونڈ، بھیل، لمباڑوں کی یہ جگہ جنم بھوم ہے اور انہیں کے جتھے دیس والے ہیں جو ننگے دھڑنگے پہاڑوں بنوں، جنگلوں میں مارے مارے پڑے پھر رہے ہیں۔ انہیں چھوڑ کے دیکھئے تو پھر کوئی دیس والا ہی نہیں رہتا۔ آگے پیچھے سب باہر ہی سے آئے ہوئے ہیں۔

کیسی ہی پرانی لکھت اٹھا کے کیوں نہ دیکھئے یہی پتا ملے گا آریہ پہلے سے یہاں کے رہنے والے نہیں یہ باہر ہی سے آئے اور یہاں رہ پڑے جیسے آریہ باہر سے یہاں آئے ایسے ہی مسلمان بھی آ دھمکے۔ دونوں کے یہاں آنے میں بھی بڑا بل تھا۔ آریہ جو آئے تو آتے ہی اپنی دھاک بٹھانے کے لئے انہوں نے یہاں کے بسنے والوں کا مار مار کے ایسا کچومر نکالا جو گیگلے دیس والے یہاں کا رہنا سہنا چھوڑ چھاڑ بھاگ بھوگ کر اندھیری گھاٹیوں میں منہ چھپا کے بیٹھ رہے اور جو نہ بھاگ سکے شودر کہلائے یہ اور ان کی پود، داس بن کے باہر والوں کی سیوا کرتی رہی۔ گھر بنانا، چھپر چھانا، گھر کی جھاڑ پونچھ، کوڑا کرکٹ اٹھا اٹھا کے پھینکنا، چکیاں پیسنا، برتن باسن مانجھنا، لکڑیاں چیرنا، گائے بھینسوں کو چرانا، گوبر اٹھانا، اُپلے تھاپنا انہیں دھندوں میں ان دیس والوں کے دن رات کٹتے تھے۔ یونہی سی بھول چوک پہ ان کی وہ درگت بنتی جس کے دھیان سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر یہ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ منتروں میں آنا جانا کیسا۔ ان کی پرچھائیں سے پوجا پاٹ کی ستھری جگہ پاپ کی کیچڑ میں لتھڑ جاتی تو ایسے بچھ وہاں کیسے پھٹک سکتے تھے۔

یہ ادھم دیکھ کے سنسار نے کروٹ لی اور وہ ڈری ہوئی بھیڑیں جو آئے دن کی مار دھاڑ سے چپ چاپ رہتی تھیں۔ اب سب کی سب مل کے چیخ اٹھیں ایسے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اب آنکھیں کھُلیں اور انہیں چمکا چمکا کر کے روکا تھاما جا رہا ہے اور ان کے اپنے سے الگ نہ ہونے کے لئے سیکڑوں جتن کئے جا رہے ہیں اور یہ جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے ان کے لئے نہیں یہ بھی سب اپنے ہی لئے ہے۔ ڈر یہ لگا ہوا ہے کہیں یہ پورا ریوڑ کا ریوڑ کسی اور گلے میں جا کے نہ مل جائے اور اس کے ملنے سے دوسرے اپنی بہتات کے گھمنڈ پر آگے بڑھ جائیں اور ہمیں چپ چاپ بیٹھنا پڑے۔

رہے مسلمان تو وہ یہاں ایسے آئے جیسے کوئی اپنے گھر میں آتا ہے۔ کسی نے انہیں دیکھ کے ٹیڑھی ٹوپی کی تو راج نے ڈانٹ ڈپٹ دیا۔

نہیں تو یہاں والوں کو مسلمان اپنے راج کی جگمگاتی سبھا میں ساتھ بٹھاتے رہے۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں ان میں سے اکبر کا تو پوچھنا ہی کیا یہ تو اوتار ہی مان لیا گیا اوروں کو بھی ہندو اچھا ہی جانتے ہیں۔ برا نہیں کہتے۔ اس لئے ان کی باتیں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ ان سب میں سے اک اورنگ زیب ہی ایسا ہے جسے دھرم کا کٹر، بس کی گانٹھ، ہندوؤں کو دُکھ دینے والا، ستانے والا اور نہ جانے کیا کیا اسے ہندو کہا کرتے ہیں۔

یہی اورنگ زیب جو ہندوؤں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا تھا جب دکھن کا گورنر تھا تو ہندوؤں کو آگے بڑھانے، انہیں جنجال سے چھڑانے کے لئے اس نے کیا کیا کیا۔ یہ کہانی سرجدوناتھ سرکار کے منہ سے سننے کی ہے۔ دھرم کا کٹر اورنگ زیب شاہجہاں کو ہندوؤں کے لئے ایسے ایسے فرمان لکھتا تھا جو کبھی کبھی شاہجہاں کی تیوری پر بل پڑ جاتے تھے۔ اس پر بھی اس نے ہندوؤں کا ساتھ دینا نہ چھوڑا اور ان کی جو باتیں اسے سچی دکھائی دیں شاہجہاں کے سامنے ان کے کہنے سے کبھی نہ چوکا۔

دیوگڈھ کا راجہ کیسری سنگھ، راؤ کرن راجپوت، جیتی داس راٹھور، نرسنگھ داس، جیات سنگھ، سارنگدھر، اندرمن یہ اور ایسے اور اور ہندو ؤں کو مسلم چین سے بٹھانے کے لئے اورنگ زیب اپنے سے جتن کرتا رہا۔

یہ باتیں تو جب کی ہیں جب یہ پرنس تھا اور اس نے اپنے راج میں ہندوؤں کے ساتھ کیا کیا، انہیں کیسی کیسی لگھیں دیں، ان کی بڑی سی بڑی بھول اور بھاری سی بھاری چوک کو بھی کیسا ٹالا۔ اس کے لئے پیچھے ہٹ کے یہ دیکھنا چاہئے۔ کھجوا کی لڑائی میں مہاراجہ جسونت سنگھ نے داراشکوہ سے مل کے اورنگ زیب کو جو نیچا دکھانا چاہا، ایسے ہی اجمیر کی لڑائی میں کنور رام سنگھ سے جو بڑی بھاری چوک ہوئی۔ کوئی اور راج ہوتا تو انہیں پانی پھیر کے ان کے ایسے کرتوت سے نجانے ان کی کیا درگت بنا دیتا۔ پر اورنگزیب نے نہ جب اور نہ لڑائیاں جیتنے پر کسی سے بھی کچھ پوچھ گچھ کی اور جو کچھ ہو چکا تھا اسے ایسا کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

دھیراج۔ راجہ جے سنگھ، بجے سنگھ، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راؤ دلیپ سنگھ بندیلہ، رائے سنگھ راٹھور، راجہ راج روپ، رائے رایاں، راجہ رگھناتھ داس، رام سنگھ ناگاڑ، جرام سنگھ کچھواہا، رگھناتھ سنگھ سیسودیہ، یہ اور ایسے اور بہت سے ہندو نکلیں گے جو اورنگ زیب ہی کی دیا سے پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ ان باتوں کے پھیلاؤ کے لئے نہ یہاں جگہ ہے اور نہ یہ ڈھائی بولوں میں سما سکتی ہیں۔

تو آپ نے دیکھا باہر سے آنے میں مسلمان اور ہندو دونوں کے دونوں ایک سے ہیں۔ بل اتنا ہی ہے آریوں نے پہلے آ کے ہندیں چھادنی چھائی اور مسلمان آریوں کے پیچھے یہاں آئے۔ آگے پیچھے آنے کا ال بل ایسا نہیں ہوا کرتا جو پہلے آنے والے جس جگہ آ کے ٹھہریں اُسے اپنا تو جنم بھوم سمجھیں اور اپنے پیچھے آنے والوں کو باہر والا ہی سمجھتے رہیں۔

یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ کسی جگہ آگے پیچھے دو جتھے باہر سے آ آ کے ٹھہریں اور پھر وہیں رد پڑیں۔ ان دونوں میں سے پہلے آنے والا جتھا اپنے پیچھے آنے والوں سے یہی کہتا رہے۔ یہ جگہ ہماری ہی ہے۔ تم ساتھ رہنے سہنے پہ بھی کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے اور نہ یہ جگہ کبھی تمہاری ہو سکتی ہے تو اس اڑنے اور ہٹ کرنے کو سمجھ والے بالک ہٹ کہیں گے۔ بات کا بتنگڑ بنانا کوئی اچھی بات نہیں۔ مسلمان، ہندو جو بھی یہاں آ آ کے رد پڑے، ہندو اب ان سب کا جنم بھوم ہے اور رہے گا۔ منہ سے کہہ دینے سے یہ کسی ایک جتھے کا دیس کبھی نہیں بن سکتا۔

دیس کے باہر اب بھی اک چھوڑ کئی کئی راجہ دھانیاں مسلمانوں کی ہیں، پر ان میں سے کسی میں بھی یہاں کے مسلمانوں کے لئے چونگی ٹیکنے کی بھی جگہ نہیں۔ جیسے ہندوؤں کا باہر کوئی ٹھکانا نہیں ہے ایسے ہی یہاں کے مسلمان بھی ہیں جن کا بہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا، مرنا جینا جو ہے وہ سب یہیں تو پھر اب یہ باہر والے کیسے ہو سکتے ہیں۔

یہ سچ ہے مسلمان ہندوؤں سے تھوڑے اور بہت تھوڑے پر جب ان کے دُکھ، سُکھ، مرنے جینے کی بات بیچ میں آ پڑے تو پھر تھوڑے سے تھوڑے بھی تھوڑے نہیں رہتے۔ آنکھ کروڑ کا لنڈی دل کبھی ایسا نہ بن سکے گا جس کا ہونا نہ ہونا ایک ساہو کے رہ جائے، سانس لینے والا اتنا بڑا جتھا مٹی کا تھا تو بنے سے رہا۔ اس میں کھلونوں کی سی من مانی توڑ پھوڑ کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہاں رہنا سہنا کیچڑ کا سا وصف نہیں ہے۔

جیسے جب چاہا روڑ دھوپ کے پانی سے دھو دھلا کے چھڑا ڈالا۔

مہاتما جی۔ پرماتما کے لئے دیس والوں سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اڑنا، ہٹ کرنا چھڑانے، تیری چھوٹی میری موٹی ایسی بے سری الجھی ہوئی تمہیں کب تک۔

دیکھئے اسی آپس کی جھنک پٹک، تن بھن سے دیس اب تک کتنے ٹوٹے میں رہا۔ آپ میں بھلائی، اچھائی کی چوچو باتیں ہیں انہیں بھگوان کی دیا سمجھ کے آگے بڑھئے اور رجگت گرو بنئے۔ یہ ایک جتھے کا لیڈر بننا کیسا آپ کو تو پورے دیس کا گرو بننا چاہئے۔ سچ ہے یہ بات ایسی نہیں جس میں نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جائے پر آپ تو پاؤں توڑ کے بیٹھنا نہیں چاہتے۔ آپ تو تپتا، رچے ہیں کٹھن سے کٹھن باتیں ہم جیسوں کے سٹ پٹا جانے کے لئے بہت سہی پر آپ کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں۔ آپ تو دیس ہی کے سدھارنے کی ادھیڑ بن میں رہے اور ہیں تو دیس والوں کو بھی ایسا بنا دیجئے جو آپ کی دیکھا دیکھی یہ سب بھی دیس کے بر وگی بن جائیں اور یہ جواب تک آگ لگا کے پانی کو دوڑتے رہے ہیں ایسی اندھا دھند روڑ دھوپ سے اکتا کر آپ کے ساتھ ساتھ اس چوڑی سڑک پہ چلنے لگیں جو پریم بھگتی پہنچا دیتی ہے۔ ان کے من کی گنجلکیں ہیں پریم کی دبی ہوئی چنگاریوں کو کریدکرید کر منتروں کے پنکھے سے دھونک دھونک کے ایسی بھڑکتی ہوئی آگ بنا دیجئے جو بھول چوک کے پانی کے چھینٹوں سے بھی نہ کبھی بجھے اور نہ کبھی کجلائے۔

ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی پرماتما نے ان سبھوں کو ایک سا دیل ڈول، ہاتھ پاؤں، آنکھیں، ناک کان دئے ہیں۔ جیسے اس دین میں سب کو ایک سا رکھا وہ چاہتا تو کیا بڑی بات تھی جو سارے جگ میں ایک ہی دھرم ـــــ پرچار کا ڈنکا بجتا۔ ایک ہی دھرم کے مندر ہیں سب مل جل کے ایک ہی ڈھب پر اس کی پوجا کرتے۔ پر بھگوان نے ایسا نہیں کیا کسی نے اُسے ایک ڈھب پر پوجا۔ دوسرے نے اس کے پوجنے کا اور ڈھنگ نکالا تیسرے نے کسی اور ڈھب سے اُس سے لو لگائی۔ سب دھرموں کو دیکھئے تو یہ سب کے سب چھوٹی بڑی الگ الگ سڑکیں ہیں جو اسی ایک کے پاس پہنچانے کے لئے کھلی ہوئی ہیں جس کے راج کا پھیلاؤ چھوٹے بڑے لاکھوں کروڑوں ان گنت سنساروں سے بھی آگے نجانے کہاں تک یوں ہی گھیرے ہوئے ہے۔ ایسے سنسار اُسے نہ مانیں اور اس کے پوجنے کا ڈھنگ سب مل کے توڑ تاڑ کے رکھ دیں جب بھی اُس کے امٹ راج میں سے ایک رتی بھی کبھی گھٹ نہیں سکتی۔ ایسے ہی انہیں جگمگاتے سنساروں کے رہنے والے کیسی ہی بڑھ چڑھ کے اُس کی پوجا پاٹ کیوں نہ کریں پر اس سے اُس کا راج رتی بھر بڑھ نہیں سکتا۔

دھرموں کے ماننے نہ ماننے کی بھلائی برائی جو بھی ہے وہ دھرم والوں ہی کے لئے ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کے پیار کرنے والا پرماتما ان باتوں سے ایسا الگ تھلگ ہے جو یہاں کے دُکھ سُکھ کی دھوپ چھاؤں اس پر پڑ نہیں سکتی۔ اس کے نہ ٹلنے والے راج کی چوکھٹ اتنی اونچی ہے جو یہ سنسار اپنے بہادروں کے ہاتھوں سے بھی اُسے چھو نہیں سکتے۔ ہمارے دھیان کا پھیلاؤ اور پھرتی جس کے سامنے بجلی کا چھلاوہ پن بھی پانی بھرتا ہے اور جو گھڑی بھر میں اونچی سی اونچی جگہ کو روند کر اس کی اونچائی ناپ نرپ کے رکھ دیتا ہے۔ وہاں تک پہنچنے میں یہ بیچ اپاہج ہے۔ رات دن سے گھرے ہوئے سنسار اُس کے راج کے پھیلاؤ کو کبھی نہیں پا سکتے

جب سب کے سب اُسی ایک کو اپنے اپنے من کی مٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ اپنے اپنے ڈھنگ پر اُسی کے آگے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور اُسی کے دھیان میں دھونی رمائے بیٹھے ہیں تو الگ الگ دھرم ہونے پر دھرم کے لئے آپس میں یہ ارے ترے کرنا کیسا۔ دھرم الگ الگ ہیں ہوا کریں۔ اس سے کیا ہوتا ہے جو دھرم ہے وہ اپنی جگہ اچھا کسی کو بھول کے بھی یہ نہ چاہئے جو دوسرے کے دھرم کو برا کہے۔ بُرا کہنا کس لئے۔ ایک کے دھرم کی پوچھ گچھ دوسرے سے تو ہونے سے رہی جو جس کا دھرم ہے اس کا بوجھ اُسی کے کاندھوں پر ہے۔ اس کے پیچھے آئے دن آپس میں لڑنا جھگڑنا بڑی بُری بات ہے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک دن دو دن کا تو ساتھ نہیں۔ پہلے بھی یہی مسلمان تھے اور یہی ہندو، یہی مسجدیں تھیں اور یہی مندر، یہی دُکھ کا اندھیرا تھا اور یہی سُکھ کا اجالا، یہی سنہری دن تھے اور یہی رنگیلی راتیں، باجا گاجا مسجدوں کے سامنے بھی بجتا تھا اور مندروں کے بھی۔ اس پر نہ کبھی مسجد والے بھڑکے اور نہ کبھی مندر کے پجاری بڑبڑائے۔ آپس میں مل جل کے رہتے اور جس سے جتنی جان پہچان ہو جاتی۔ مرتے مرتے اسے نباہتے اور اس میں کچھ بل نہ آنے دیتے تھے۔ بڑے بوڑھوں سے ہندو، مسلمانوں کے میل ملاپ کی جو کہانیاں کان سُن چکے ہیں وہ اب ساری کی

ساری من گھڑت اور زٹل دکھائی دینے لگیں۔

آج کل کے مسلمان اور ہندو تو ایسے ہو گئے جیسے توے سے روٹی الٹ جاتی ہے۔ بات بات میں آپے سے باہر۔ یونہی سی کچھ بات ہوئی اور بھڑک اٹھے۔ پھر کیا تھا جھیم چار خ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی جو یہ آپس میں گتھ گئے۔ سمجھ والے اجڈوں کی گتھم گتھا الگ تھلگ ہو کے دیکھنے لگے آپس کی لاگ ڈانٹ کی آگ بجھانے کا دھیان کسی کو بھی نہیں۔

یہ سُننے سُنتے کان جھنّانے لگے۔ آج یہاں جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا، کل وہاں لاٹھی چلی، پرسوں اُس جگہ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سیکڑوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے، لہو لہان ہوئے، بیسیوں مارے گئے۔ جب لڑتے لڑتے دونوں تھک کے ہانپنے لگے تو راج نے پکڑ دھکڑ کے جیل میں ڈال کے بیچ بچاؤ کر دیا۔ بیٹے نیارے الگ، چھوٹنے کی دوڑ دھوپ میں جو کچھ انٹی بھی تھا وہ ہاتھ سے الگ نکل گیا۔ جن دھندوں سے چار پیسے ہاتھ میں آ رہے تھے وہ دھندے الگ چھٹے اور گانٹھ میں ایک چھنگی کوڑی بھی نہ رہی۔ بیٹھے ٹھالے جو اکڑ تکڑ کا دھیان آگیا تھا اس کا یہ پھل مل گیا۔ چلتے چھٹی ہوئی۔

یہ آئے دن کی جھڑپ، بات بات میں لڑائی بھڑس، گھڑی گھڑی کا تڑاپن۔ دیس والوں کی ایسی کچھ پریتل ماش اتارے اور جیسے بنے انہیں اس نچے پن سے روکے۔ یہ سمجھ کے ہیٹے، کاؤں کے کچے آپس میں گتھے چلے جاتے ہیں اور ان کی جھیپٹ میں دیس کا ستیاناس ہوتا جا رہا ہے آپس کی نوچ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے دیس کے لٹکو ٹی بندھوا دی۔ مہاتما جی۔ آپ کے سامنے ایسی باتیں کرنا سورج کو دیا دکھانا ہے پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کبھی کبھی بڑے بڑے سمجھ والوں سے بھی سامنے کی باتیں دیکھنے سے رہ جاتی ہیں۔

اب پھر اسی بھاشا کو لیجئے۔ کٹھن باتیں چھوڑ چھاڑ کے نئی بھاشا بنانے کے جنجال میں پھنسنا اور مرنجھی سنجھائی بھاشا کو ٹھکرا کے منہ پھیر لینا یہ بھی نئی بات ہے۔ میں جانتا ہوں دیس کے کچھ لکڑوں کی بولیاں ایسی الگ الگ ہیں جو ایک دوسری سے نہیں ملتیں اور ایک ٹکڑے کی بولی بولنے والا دوسرے کی بولی نہیں سمجھتا۔ پر یہ سب کی سب بولیاں ایسی چھوٹی چھوٹی سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے لکڑوں ہی میں بولی جاتی ہیں باہر انہیں کوئی جانتا بھی نہیں ان سب میں اکیلی اردو ہی ایسی ہے جو سارے دیس میں بولی اور سمجھی جاتی ہے دیس کی پوری بولیوں میں سے اک اردو ہی کا ایسا پھیلاؤ ہے جو ٹھیک ٹھیک پورے دیس کی بھاشا بننے کا بل بوتہ رکھتا ہے۔

کسی بھاشا میں باہر والی بولیوں کی بہتات جتنی بھی ہو۔ پرکھنے والے اسے تو بھاشا کی بڑھوتری سمجھتے ہیں اور آپ نہ جانے کیا چاہتے ہیں جو عربی، فارسی بول اردو میں دیکھ نہیں سکتے اور یہ بھی نہیں بتاتے یہ کیوں آپ کو بُرے لگتے ہیں کیا آپ کوئی بھی ایسی آگے بڑھنے والی بھاشا بنا سکیں گے جو باہر کی بولیوں کو ٹھکرا کے اپنے ہی گنے چُنے دُھائی بول لے بیٹھی۔ ہی ہوا اور انہیں کے سہارے آگے بڑھ کے یہ مٹ پونجیا بھاشا ایسی پھولی پھلی ہو جو دوسری بڑھنے اور پھیلنے والی بولیوں کے لگ بھگ کہی جا سکے۔ عربی، فارسی بولوں کے نکال ڈالنے سے اردو کی بڑی لمبی چوڑی انگنائی گھٹ گھٹا کے بالشت بھر رہ جائے گی۔ یہ سچ ہے۔ ہندو دل کو چوڑی چکلی انگنا یہاں اچھی نہیں لگتیں اور اسی لئے وہ اپنے گھروں کی انگنائی چھوٹی چھوٹی سی رکھا کرتے ہیں۔ پر یہ گھر اور بھاشا کا گھر دونوں کے دونوں ایک سے تو نہیں ہو سکتے۔ جس بھاشا کی بڑھوتری دن دونی رات چوگنی ہو اور جس کی دوڑ پھیلاؤ سے پھیلاؤ کو بھی روندتی چلی جا رہی ہو۔ اُسے آپ ٹھکرانا چاہتے ہیں۔ اسے تو کلیجے سے لگا کے رکھئے۔

آپ سے یہ تو کوئی نہیں کہتا۔ عربی، فارسی کے نئے نئے من من بھر کے بھاری سے بھاری بول اردو میں آپ ٹھونستے چلے جائیں جو یہ کچھ اسے سڑی سمجھئے۔ پران دونوں بولیوں کے وہ بول جنہیں پڑھے لکھے تو پڑھے لکھے، ان پڑھ گاؤں والے اور گنوار تک دن رات بولتے چالتے ہیں انہیں اردو میں سے نکالنے کے جتن کرنا تو ٹھیک نہیں۔

دیکھئے وہ ہل جوتنے والے جو پو پھٹتے ہی تاروں کی چھاؤں میں اپنے اپنے دھندوں میں لگے تو سورج ڈوبنے پر سستانے کے لئے ٹھہرتے ہیں۔ وہ بھاشا واشا کے کھڑاک کو کیا جانیں۔ پر یہ اردو کا پھیلاؤ دیکھنے کا ہے جو وہ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے عربی، فارسی کے سیکڑوں بگڑے ہوئے بول کے بول بے جھجک بولتے چالتے ہیں۔ اچھوتوں کے لئے جب آپ گاؤں گاؤں پھر رہے تھے تو یہ سب کچھ آپ سن چکے ہوں گے جو اب آپ کو سنایا جا رہا ہے:۔

عربی، فارسی کے وہ بگڑے ہوئے بول جو گاؤں والے اور گنوار رات دن بولتے ہیں۔

مرجی (مرضی)، ناراج (ناراض)، کپیار (غضب) مجبور (منظور)، تکمہ (زلفیں)، جمین (زمین)، پچھت (مفت)، منائی (منع)، کبالہ (قبالہ)، کھزانہ (خزانہ)، تکھا

تنخواہ، مجوری (مزدوری) کھون (خون)، بیدکھلی (بے دخلی)، دستناویج (دستاویز)، کاگج (کاغذ)، کلم (قلم)، کاجی (قاضی)، راجی (راضی)، کھتا (خطا)، جلم (ظلم)، کابل (قابل)، کبول (قبول)، جکام (زکام)، نجلہ (نزلہ)، بکھار (بخار)، رجا (رضا)، بیتیج (قعد (قبض)، محن (محبت)، کیمت (خیرات)، کیامت (قیامت)، اجاب (عذاب)، ناجک (نازک)، کھجکت (کجخت)، ہاجر (حاضر)، کھالی (خالی)، کسور (قصور)، جھیجا (رمضا)، سورت (شہرت)، زلدی (جلدی)، نراترا (طرح طرح)، موجود (موجود)، مالوم (معلوم)، نقد (نقد)، املا (معاملہ)، گلت (غلط)، مندر (سادر)، نالت (لعنت)، رونک (رونق)، مولی (جناب مولوی صاحب)، ہمیسہ (ہمیشہ)، کم جور (کمزور)، کھساد (خوشامد)، ریسم (ریشم)، جمانت (ضمانت)، جامن (ضامن)، اگد (مقدمہ)، کھارج (خارج)، سکھت (دستخط)، کواب (کباب)، ساری (شادی)۔

یہ کچھ بول تو یونہی لکھ دئے ہیں۔ سوچ سوچ کر کیا جائے تو اور ایسے سیکڑوں بول کے بول نکل آئیں گے۔ عربی، فارسی کے بگڑے ہوئے کچھ بول ابھی آپ نے سنے اب انہیں بولیوں کے وہ بول بھی دیکھ لیجئے جنہیں ان پڑھ سے ان پڑھ گاؤں والے اور گنوار جوں کا توں بولتے ہیں۔

جیسے مکان، دکان، میدان، جان، ران، تکیہ، لتہ، صورت، بدن، گردن، سینہ، پلک، مکر، آدمی، عورت، بچہ، اگر، مگر، کتاب، سردی، گرمی، بادام، اورک، کام، نام، کمان، تیر، لگام، مال، عینک، گلاب، بہار۔

میرا کہنا یہی ہے یہ اور ایسے اور اور عربی، فارسی کے وہ بول جو اردو میں پورے سما چکے ہیں انہیں چھوٹے بڑے سب بولتے ہیں انہیں ہاتھ نہ لگائیے۔ ایسے ہی ہندی کے وہ گھلے ملے بول جو سب کی بات چیت میں چلے آرہے ہیں۔ ان سب کو ملا جلا کے اردو کو اور آگے بڑھانے کے نئے نئے ڈھب نکالئے۔ ہندو جیسے، ہندو مسلمان سب کا جنم بھوم ہے ایسے ہی اردو بھی ان میں سے کسی ایک کی بھاشا نہیں یہ ان سب کی بھاشا ہے۔ سب کی بھاشا اس لئے کہہ رہا ہوں۔ اردو کے آگے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے مسلمان اور ہندو دونوں ساتھ ساتھ اب تک اپنے اپنے سے جتن کرتے رہے۔

یہ کہہ چکا ہوں ہند کے چپے چپے کی چھوٹی چھوٹی بولیاں ایسی بہت سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں الگ الگ بولی اور سمجھی جاتی ہیں ان میں دیکھئے اور ڈھونڈئے تو عربی فارسی بول جیسے چھپائے ملیں گے بل اتنا ہی ہوگا کسی میں بدیسی بولیوں کے بول بہت ہوں گے کسی میں تھوڑے، اور کسی میں بہت تھوڑے۔ دیس کی سب بولیوں کے گنتی ہی کے کچھ کچھ بول یہاں لکھے جائیں تو یہ لکھت بڑھ کے نہ جانے کہاں تک پہنچے۔ اس لئے وہ سب تو نہیں اک مرہٹی بھاشا ہی کے کچھ بول لکھتا ہوں:۔

عربی، فارسی بولوں کی ریل پیل مرہٹی میں

ایمن (آمین)، اکل (عقل)، اکھتیار (اختیار)، اکھر (آخر)، اکھیر (اخیر)، بھائی (صفائی)، عجب، اجمت (عظمت)، اجماس (آزمائش)، اجار (آزار)، اجاری (آزاری)، اتر (عطر)، عدالت، عداوت، امانت (امانت)، اپھکرا (اخبرہ)، اپھوا (افواہ)، اباد (آباد)، ابھاری (رعماری)، ابھرا (ابر)، عیب مارکھ (عرق)، ارج (عرعل)، الاہیدا (علحدہ)، اول (اوّل)، آتس باجی (آتش بازی)، آپ گرجی (خود غرضی)، آپیج (آمیز)، آواج (آواز)، اشک (عشق)، آشک (عاشق)، اشک باج (عشقبازی)، اکرار (اقرار)، اکھلاس (اخلاص)، اجّت (عزّت)، اجار (ایذا)، اتبار (اعتبار)، اتلار (اطلاع)، انساپھ (انصاف)، انام (انعام)، ارادہ، عنایت، امان (ایمان)، عادت، انگشتان (انگشتانہ)، عالم، آلی سان (عالی شان)، عبرت، الاکھا (علاقہ)، علاج، علت، عمدہ، عمدا، ادا، ادب، امین، امرا، امہدوار، اولاد۔

مرہٹی کی بات چیت پر اک بھولی ہوئی بات دھیان میں آئی بہت دن ہوئے جو مرہٹی کے اک اناڑی کھلاڑی سے مڈبھیر ہوئی۔ اس کا اوڑھنا بچھونا جو تھا وہ مرہٹی اور انگریزی، اور کوئی بھاشا واشا جانتا نہ تھا۔ کچھ لوگ آپس میں کسی بھاشا کے پھیلاؤ پر کچھ کہہ سن رہے تھے۔ مرہٹی کا یہ اناڑی جو سب سے الگ بیٹھا تھا۔ یہ بات چیت سن کے نہ رہ سکا اور وہیں سے لڑنے بولا ہماری بھاشا کا سا پھیلاؤ دیس کی کسی بھاشا میں نہیں۔ چار دن سے اردو جو بڑھ چل ہے یہ بھی ہماری بھاشا کے بل پر۔ بنجانے مرہٹی نے اردو کی کیسی سیدھی جو اس کے سیکڑوں بول اردو میں آگئے جنہیں اردو والے اپنے یہاں کا سمجھ رہے ہیں۔ وہ بول کون کون سے ہیں اس پوچھے پر وہ سکا کے کہنے لگا۔ ایک دو؟ سیکڑوں ——— یہ کہہ کے اوپر لکھے ہوئے بولوں میں سے کئی بول اُس نے سنائے جس پر جاننے والے ہنس پڑے اور وہ بھکا بکا ہو کے ایک ایک کا منہ دیکھنے لگا۔ اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے اسی پر اُسے اچنبھا ہوا۔

مظفر پور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے اک بڑے بھاری بھرکم منچ نے جو وہاں ——— پڑھ کے سنایا۔ اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا یہاں لکھتا ہوں

"ہماری ہندی کے کویوں کی متی گتی بالکل نرالی ہے۔
وہ کبتا کی گمبھیرتا کے 'دھرے اور ریتے بھی بدل رہے ہیں۔
اپنے 'اوبھوت چھکڑے میں نیچے کی اور ریل 'نوجوت' کو گھنٹہ چھ
پر پہنچایا چاہتے ہیں۔ یہ اتنی نہیں منوکتا کا کلشن ہے۔ اس سے کبتا
کا سدھار نہیں سنگھار ہو رہا ہے"۔

کیا ایسی ہی ان گھڑ بھاشا سارے دیس کی بھاشا بن سکتی ہے کیا ایسی ہی انوکھی بولی پورے دیس میں پھیل سکتی ہے۔ کیا ایسی ہی لکھت کے پر چار پر آپ اڑے ہوئے ہیں۔ کیا یہی سب جنم بھوم والوں کی اکیلی بھاشا بن سکے گی اور کیا اسے ہی سب چھوٹے بڑے بول سکیں گے۔ دیکھئے تو یہ کیسا اودھم مچا ہوا ہے۔ عربی، فارسی کے گھلے ملے بول جو سب بولتے چالتے ہیں جان جان کے انہیں چھوڑ چھاڑ اور چھانٹ چھانٹ کر کویوں، متی گتی، کبتا، 'اوبھوت'، گھنٹہ چھ، منوکتا، کلشن۔ ان بھدے بسرے بولوں کو ٹھونسا گیا ہے۔ باہر والی بولیوں سے کترا کے اور بچ بچا کے نکلنے پہ بھی بدیسی بولوں سے یہ لکھت نہ بچ سکی اور گنتی ہی کے سہی پر کئی بول اس میں آ ہی گئے۔ کچھ فلم بنانے والی کمپنیاں بھی اپنے یہاں کے ڈراموں میں ایسی ہی ٹھونس ٹھانس کر رہی ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ دیس کے ماتھے کے لئے کلنک کا ٹیکا ہے۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اس نئی اپج کو دیکھ کے نہ رہ سکے اور انہیں یہ کہنا ہی پڑا:۔

"یہ زبان کیوں کر کل ملک کی زبان ہونے کا دعوےٰ کر سکتی ہے
اور کوئی مذاق سلیم اور اردو میں شعور رکھنے والا اردو کو چھوڑ کر
اسے کس طرح اختیار کر سکتا ہے"۔

فارسی کے رسیا بھیم سین کائستھ، پٹن کے ایسری داس، پنیالے کے سجان رائے، جگ جیون داس، کیول رام اگروال، منشی بھوپت رائے، منشی چندر بھان، اودے رائے، منشی نیک چند بہار یہ اور ایسے اور اور ہندوؤں کی فارسی لکھتیں۔ دیکھنے کو آپ سے نہیں کہا جاتا۔ پر وہ نئے پرانے اردو لکھنے والے ہندو جنھوں نے اردو کی ایسی سیوا کی جس پر اتنا لکھا جا سکتا ہے جو لکھتے لکھتے بڑا ڈھیر لگ جائے۔ ان کی لکھتوں کو تو رکھ لیجے۔

پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت بینڈو لال زار، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت نوبت رائے نظر، پنڈت برشن نرائن در آبہ، پنڈت برج نرائن چکبست، منشی درگا سہائے سرور، منشی پریم چند، سر بیج بہادر سپرو، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت امرناتھ جھا، پنڈت گرنگا ناتھ جھا، پنڈت آنند نرائن ملا، پنڈت کشن پرشاد کول، پنڈت منوہر لال الفی مسٹر گھنشیام سہائے فراق، مسٹر اقبال در ماسحر، مسٹر رام پرشاد دکھن سلانشاد مسٹر کرشن سہائے، مسٹر ملوک چند محروم، مسٹر جگدیش ہادر برق، چودھری جگت موہن لال رواں، پروفیسر سری رام شرما، مسٹر رام دیال سکسینہ، ٹھاکر جے آر رائے۔ لالہ روشن لال، مسٹر رام سرن نگم، مسٹر سری نرائن نگم، مسٹر دیا نرائن نگم، مسٹر سورج نرائن مہر، مسٹر سدرشن، مسٹر شیام موہن لال جگر، یہ سب کے سب ہندو اور پکے ہندو۔ اس پر بھی ان کی لکھتوں کا ڈھچر ایسا ہے جس میں تو یں، متی گتی، کبتا، اوبھت، گھنٹو چھ، منوکمتا، لکشن، سمپتی، شکتی، رکچھا، نوین، آشا، دشا، سہندو، کلاہل، دیا کرن، ہتوں ایسے ایسے بولوں کا پتا بھی نہیں اور ڈھونڈے سے بھی ایسے کڈھب بول ان میں کہیں نہ مل سکیں گے۔

ان ہندوؤں کی لکھت کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کا۔ دونوں میں بال بھرال بل نہیں اور ال بل ہو کیسے جب ہندو مسلمانوں نے مل جُل کے اب تک اردو کو یہاں تک سدھارا جو اج کے بل پر بڑھنے والی بولیوں کے لگ بھگ دکھائی دینے لگی۔ اب تک پہلا سا نہ سہی اسی اردو کے بولنے چالنے ہی میں تھوڑا بہت جو بھی ہیر پھیر ہو تو ایکا یہی ایکا آگے بڑھ کے جب مت سیدھی ہو گی تو پورا بھی ہو سکتا ہے اور جو یہ تھوڑا بھی نہ رہا تو پھر رہا کیا۔ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔

ہندماتا کا گہنا پاتا جو بھی تھا ایک ایک کر کے سب کا سب کب کا لٹ لٹا چکا اور آئے دن کی فوج کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے ایک چھلا بھی نہ چھوڑا۔ لے دے کے یہی اردو ہندو مسلمانوں کے ملاپ کی اک پرانی انگوٹھی دیس کے ہاتھ میں پڑی رہ گئی تھی۔ آج کل اس کی بھی چھیلا چھٹی ہو رہی ہے اور دیس کی انگلی سے اسے بھی اتارنے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔ یہ پرانی انگوٹھی بھی چھن گئی تو پھر کیا ہو گا یہ آپ سوچئے۔

اردو کو مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا آپ کہہ چکے ہیں اس لئے یہ ڈر لگتا ہے کہیں اس بات چیت سے آپ یہ نہ سمجھ لیں۔ اپنی بھاشا کی پڑچاک لی جا رہی ہے اور اس کے بچاؤ کے لئے یہ باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ کسی کے دھیان پر روک ٹوک کیسے ہو سکتی ہے جس کا جو جی چاہے سمجھ لے۔ پر سچی بات تو یہ ہے دیس کے لئے یہ باتیں چھیڑ لائی ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ دیس کے منہ پہ کیسی جھڑیاں پڑتی چلی جا رہی ہیں کیسا

مذمحال ہوتا جا رہا ہے۔ آپا دھاپی کے کیسے جھکڑ چل رہے ہیں۔ ایسا اندھیارا ہے جو آنکھیں کھولنا دوبھر ہو گیا ہے۔ دیس کے اندھیرے گھُپ میں بگلا کا لمبا تڑنگا بھوت، ہاتھ پھیلائے، دانت نکالے کھڑا ہنس رہا ہے۔

اس کے پرچھاویں سے یہاں والے سڑی بن کے آپس میں لڑے مرتے ہیں۔ کوئی بڑا منتر پڑھنے والا ایسا منتر پڑھے اور لٹو کا کرے جس سے دیس پر سے یہ بھوت اتر جائے اور بھوت اتر جانے سے یہاں کے ساتھ رہنے سہنے والوں کی ایسی آنکھیں کھلیں جو سب مل ملا کے سانس لینے کے یہ دُھائی دن آپس میں ہنس بول کے کاٹ دیں۔ بھوت اتارنا ہنسی کھیل نہیں اس کے لئے بڑی پرُمعنت پھونک چاہئے جسے آپ ہی کر سکتے ہیں۔

ہی ا۔ دو تو اب یہ مٹنے مٹانے کے جوکھوں سے نکل چکی اس کا پودا اب پودا نہیں۔ ہاجولوکے تھپیڑوں اور ٹھنڈ کے تھپلیس اور ٹھٹھر کے رہ جائے۔ یہ پودا پیڑ بنا اور بن رہا ہے۔ اس کی جڑیں آگے تک پھیلیں اور پھل رہی ہیں۔ اس کی بڑی بڑی ڈالیاں، موٹے موٹے تنے اور ہری بھری ٹہنیوں سے موٹی پتی اور اور ـــــ ٹہنیاں نکل نکل کے ان میں نئی نئی کونپلیں پھوٹتی چلی جا رہی ہیں۔ اس کا تو اب کچھ ڈر ہی نہیں۔ اس میں اک یہی بات دیکھنے کی ہے جس دھندے کو سب اب تک مل جل کے کر رہے تھے۔ اب ان میں پھوٹ پڑنے اور الگ الگ ٹھاگ ہو جانے سے ایک ہی دھندے کو وہ پورا پورا مجھ اٹھانا پڑے گا۔ جسے پہلے سب مل ملا کے اٹھا رہے تھے۔ اس سے بڑھتی ہوئی چال دھیمی پڑ جائے گی اور پہلی سی پھرتی نہیں رہے گی۔ پہلے جو بات دنوں میں پوری ہوتی تھی وہ اب مہینوں پہ جا پڑے گی پر نتیجے تو یہ دکھائی دیتا ہے۔ پورے ہند و بھی کبھی اپنی اردو کو چھوڑ نہیں سکتے اور اپنے بڑے بوڑھوں کے گاڑھے پسینے سے سینچی ہوئی اس ہری بھری کھیتی سے کبھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔

مہاتما جی۔ دیکھئے تو آپ کی اردو کسی بھاشا سے بھی ہیٹی اور دبتی ہوئی نہیں۔ وہی باتیں وہی گھاتیں ایک ایک کر کے اس میں دیکھ لیجئے تو نئی بھاشا کی جگہ اپنی اسی اردو کو ایسے ہی آگے بڑھاتے نا جیسے آج تک ہندو مسلمان سب مل جل کے اسے بڑھاتے اور سدھارتے چلے آئے۔

اس کے پرچار کے لئے پہلے ایسی ریڈریں لکھوائی جائیں جن میں عربی، فارسی، ہندی ان سب کے وہی گھلے ملے بول ہوں جنھیں سب بولتے ہیں۔ جیسے عربی، فارسی کے کڈھب بول ان میں جگہ نہ پا سکیں ایسے ہی ہندی کے بھوے بسرے بول بھی ان میں کہیں نہ آنے پائیں اسی بات میں آگے بڑھ کے یہ دیکھ بھال بھی کرنا پڑے گی۔ اردو کے پھیلاؤ اور بڑھانے کے لئے کہاں کہاں سے، اور کون کون سے بول چننے جائیں یہ گنتی ایسے لوگوں کے اکٹھا کرنے سے سلجھ سکتی ہے جو بھاشا کی بناوٹ اس کا اتار چڑھاؤ، لوچ، گھلاوٹ اور بولوں کی ناپ تول، ان کا بھدا پن، ہلکا پن یہ اور ایسی اور باتوں کو پرکھ سکتے ہوں۔

جیسی جگہ ہو ویسے ہی چُن چنا کے وہاں بولوں کا جڑنا اور بٹھانا جانتے ہوں۔ سب لوگ بھاشا کا ست لڑا انہیں بنا سکتے۔ بڑی سی بڑی سبھا میں سے بھی چھانٹے گا تو ایسے لوگ کچھ ہی نکلیں گے عربی، فارسی، ہندی ان میں سے نئے بول جس کے بھی ہوں پورے سوچ بچار سے جانچ جانچ کے اُن کا چُننا اور انہیں اپنی اپنی جگہ۔ ایسا جمانا جو وہ پھر نہ اکھڑ سکیں۔ ایسے ڈھب انہیں لوگوں کو آتے ہیں جو بھاشا کے پورے ٹھکاؤ جانتے ہوں۔ ایسے لوگوں کی دیکھ بھال سے یہ ریڈریں ایسی لکھی جائیں گی جن میں نہ بھاری بھاری عربی، فارسی کے بول ہوں گے اور نہ ہندی کے بھوے بسرے بھدے بول۔ ان میں نہ مولویوں، ملاؤں کے ان گھڑ بول دکھائی دیں گے اور نہ پنڈتوں کے کٹھن اور کڈھب بول۔ ان میں نہ ٹھیٹ ملا پن ہوگا اور نہ ٹھیٹ پنڈت پن۔ یہ ریڈریں ٹھیٹ مولویوں اور ٹھیٹ پنڈتوں کی لکھتوں سے الگ ہوں گی۔

ان کے لکھنے کا ڈھب ایسا سمویا ہوا، موتی سا چمکتا، میٹھا پانی ہو گا جس میں بھوے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کا کوڑا کرکٹ اور گدلا پن کچھ بھی نہ رہ سکے گا اور یہ سوجھ بوجھ بڑھانے والا امرت جل آنکھوں سے پیا جائے گا۔ جس سے من ڈھلتے دُھلتے چمک اٹھیں گے اور آنے والی پود پہلے ہی سے یہ پریم جل پی کے کچھ کی پوری آنکھ کھلنے تک ایسے ستھرے من کی ہو جائے گی جسے پھر اسی سے آگے بڑھنے اور دیس کے سنبھالنے میں کوئی رکاوٹ ہی نہ رہے گی۔

پہلے ہی سے عربی، فارسی، ہندی ان سب کے ملواں بول ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے سے پھوٹ ڈالنے والا یہ دھیان کبھی بھولے سے بھی پھر کسی کو نہ آئے گا۔ اس لکھت میں بدیسی بولیوں کے اتنے بول ہیں اور ہندی کے اتنے۔ ان میں سے انہیں چھوڑ کر انہیں چُن لینا چاہئے سب بولوں کو ساتھ ساتھ دیکھتے دیکھتے اور پڑھتے پڑھتے ان سب کا پیار، پریم جی میں جڑ پکڑتا چلا جائے گا اور سب اسی اردو کو اپنی بھاشا سمجھیں گے اور اس کے اور اور

بناؤ سنگھار کے لئے سوچ سوچ کے نئے ڈھب نکالتے رہیں گے تو اس چتن سے بھاشا الگ بھلے پھولے گی اور آج کل کی سی چھیر چھاڑ جس سے دیس کو گھن لگتا جارہا ہے یہ بات بھی پھپھوندہ رہے گی سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے اس کہاوت کو سچا کر کے دکھا دیجئے اور جو اوپر لکھا جا چکا اس کا پرچار ایسا کیجئے جس سے گھڑی گھڑی کے جھگڑے نمٹنے کا سانپ بھی مرے رہ جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے۔

بھاشا کے لکھنے کا ڈھنگ کون سا رکھنا چاہئے۔ یہ بھی اک بڑی اُلجھی ہوئی گتھی ہے۔ اس پر بھی یہیں لکھنا چاہتا تھا۔ پر اس لئے چھوڑتا ہوں ایک تو یہ بات کٹھن ہے اور اس کے کٹھن ہونے سے بہت پھیلنا پڑے گا۔ دوسرے یہاں تک جو کچھ لکھا جا چکا ابھی یہ بھی دیکھنا ہے اسے دیکھ کے آپ کہتے کیا ہیں۔ یہ باتیں آپ نے کان دھر کے سن لیں تو پھر کبھی اس پر بھی جو جو باتیں دھیان میں ہیں ایک ایک کر کے سب لکھوں گا اور بتاؤں گا اس کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

یہاں تک ادھ کچے بولوں میں جو بھی کہا جا چکا ٹھنڈے جی سے اسے آپ نے سُنا اور سوچ بچار کی آنکھوں سے دیکھا تو سمجھوں گا یہ لکھت ٹھکانے لگی اور جیوں ہی دیکھ دکھا کے ڈال دیا تو بات آئی گئی ہوئی۔ اچھا چلتے چلتے یہ ایک بات اور سُن لیجئے:۔

اب تک میں نے جو بھی کہا اُسے آپ نہیں سنتے اور نہیں مانتے۔ نہ سنئے اور نہ مانئے۔ عربی، فارسی بولوں کو آپ اُلٹھ گانا نہیں چاہتے۔ نہ لگائیے۔ ان پیسی بولیوں کے بول آپ نہیں دیکھ سکتے نہ سہی۔ اچھا یہ ٹیٹ اردو لکھنے کا یہی ڈھب جو آپ کے سامنے ہے اسی کو بیتئے اور اس کا پرچار کیجئے۔ عربی فارسی بول جن سے آپ کو چڑ ہے دیکھ لیجئے اس میں ان کا پتا بھی نہیں تو پھر کویوں، متی گتی، کتنا، اُدیمٹ، گمنتو، تچھ، منوکھنا، لکشن، کرتویہ، ساستیہ، سوبھاؤ، سمے، جیون آشا، بوشاسکتی، شکشا، سمبندھ، اینکتا، ہتول، ابھیاس، دشے، شبد ارتھا، نشچے، نکاہل، ویاکرن، اودیے، راج نیتی۔ ایسے ایسے بھولے بسرے بولوں کی ٹٹولس ٹھاش سے نئی بولی بنانے کی ٹکٹکیریں اٹھانے سے کیا یہ اچھا نہیں جو آپ اسی ٹیٹ اردو لکھت کے پرچار کی حامی بھریں اور اسی کو پھیلائیں اور اسی کو آگے بڑھائیں۔

آپ سے باتیں کرنا تھیں اور آپ کو بدیسی بولیوں سے چڑ۔ تو پھر لکھنے کا یہ ڈھب نہ رکھتا تو کیا کرتا عربی، فارسی، ہندی بولوں کو سموکے لکھتا جیسے لکھتا کرتا ہوں تو اس کے دو بول بھی آپ نہ دیکھتے۔

اسے دیکھ چکنے پہ جو بھی بات آپ کو دکھائی دے۔ وہ آپ لکھ بھیجیں، پڑھا کرے آپ پسند ہوں۔

سید ابوالقاسم سرشتہ دار الترجمہ
حیدرآباد دکن

غزل

تو وہ عہدِ رفتہ کی یاد ہے کہ نہ جس کو دل سے بھلا سکوں
میں وہ بھولا بسرا سا خواب ہوں کہ کسی کو یاد نہ آسکوں

کوئی پوچھتا ہے جو حال دل تو میں سوچتا ہوں کہ کیا کہوں
ترا احترام ہے اس قدر کہ زبان تک نہ ہلا سکوں

یہ تری جفا کی ہے انتہا کہ تو مجھ کو یاد نہ کر سکے
یہ مری وفا کا کمال ہے کہ نہ تجھ کو دل سے بھلا سکوں

مرے جذبِ عشق کو کیا ہوا، وہ کہاں گئی کششِ وفا
مجھے کوئی یاد کرے گا کیا جو تمہیں کو یاد نہ آسکوں

حفیظ ہوشیارپوری
ایم اے

دخت کُش

دخترِ مادرِ ہندی ہے زبانِ اُردو
"دخت کُش" اس کی تباہی کے اٹھاتے ہیں سوال

یہ دکن میں ہوئی پیدا تو پلی دِلّی میں
لکھنؤ میں ہوئی دوشیزۂ سلمائے جمال

کچھ دنوں خطۂ دلچسپ اودھ میں ٹھہری
اور پنجاب میں پہنچی بہ سرِ اوجِ کمال

اعنی پنجاب میں اک بحرِ یم کا ساگر بن کر
گوشۂ گوشہ کو دیا مژدۂ احساسِ وصال

سنسکرت اس کی ہے دادی تو ہے پوتی اردو
باعثِ حسن ہیں ایران و عرب کے خد و خال (راتحاد)

لوچ الفاظ میں۔ لہجے میں نزاکت آئی
کھو دیا فیضِ فصاحت نے ثقالت کا وبال

سعیٔ مشاطۂ معنی نے سنوارا ہے مگر
وہی عفت وہی عصمت وہی قد ہے وہی چال

نہیں پہچان کچھ اپنوں کی بھی ہٹ دھرموں کو
وائے بر ضعفِ بصر ہائے تعقّل کا زوال

سچ ہے یہ قول کہ اردو کی فنا "ممکن" ہے
مگر ایسے بھی ہیں "ممکن" کہ جو ہوتے ہیں محال

ہے یہ جانداد اردو کی زباں پر جاری
"دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا"

شادؔ عارفی



معشوقة

ایک فراموش شدہ باغ کو دیکھ کر

(سانیٹ)

یہیں پر اُس کو میں نے کھیلتے دیکھا تھا پھولوں میں
فرشتے جس طرح فردوس کی رنگیں بہاروں میں
ادائے بے خودی سے کھیلتے ہیں مرغزاروں میں

وہ جھولے جھولتی تھی چاند کی کرنوں کے جھولوں میں
فضائے قدس اب تک اس کے نورانی تبسم سے
محبت سے بھرے دل کی طرح معمور رہتی ہے
سرود و کیف کی اک نہر سی دنیا میں بہتی ہے

متاعِ دلبری سے سرمدی کیف ترنم سے
فضا میں اب بھی اُس کے آسمانی گیت رقصاں ہیں
جو اُس نے کہکشاں کے نغمہ زاروں میں بکھیرے تھے
جو غلمانوں کے قدسی لالہ زاروں میں بکھیرے تھے

ہواؤں میں ابھی تک ایک شعلہ بن کے پرّاں ہیں
مرے دل کو ابھی تک اُس کی بو آتی ہے پھولوں سے
جواں ہو کر مری ہر آرزو آتی ہے پھولوں سے

تابش صدیقی

گڑیا

"مجھے ایک گڑیا چاہیئے"۔ عورت نے کہا اور دکاندار نے اس کی ظاہری حالت سے اندازہ لگا کر کہ کتنی قیمت ادا کر سکتی ہے اسے دو شلنگ کی ایک گڑیا دکھائی۔

یقیناً مس مورڈنٹ امیر نہ تھی اور اس کے لباس سے بھی اسے کوئی امیر نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے کپڑے بہت معمولی تھے۔ صرف اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں اور بال کالے اور لمبے تھے جن کی وجہ سے اس کے بہت سے عیب ڈھک جاتے تھے۔ بجائے بالوں کو کاٹنے کے وہ جوڑا باندھا کرتی تھی۔ اس کی عمر تینتیس سال کی تھی اور وہ ایک ہفتے میں تیس شلنگ کماتی تھی۔

مگر دو شلنگ کی گڑیا اس کو پسند نہیں آئی۔ "یہ گڑیا تو کچھ اچھی نہیں ہے" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"اگر آپ کو یہ پسند نہیں تو میں دوسری دکھلائے دیتا ہوں"۔ دکاندار نے کہا۔ مس مورڈنٹ نے گڑیا کو ہاتھ میں لے کر اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ مگر وہ اُسے پسند نہیں آئی۔

"یہ تو" . . . اس نے کہا۔ "یہ تو لڑکی کو پسند نہیں آئے گی۔ اسے اس سے بڑی گڑیا چاہیئے"۔ وہ یہاں بات کرتے کرتے اس لئے رکی کہ اسے دھوکا دینا نہیں آتا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ گڑیا کی ضرورت کسی چھوٹی سی لڑکی کو نہ تھی اور اسی لئے وہ جھوٹ بولتے ہوئے گھبرا سی گئی۔

آخر میں مس مورڈنٹ نے (جو ہفتے میں تیس شلنگ کماتی تھی) آٹھ شلنگ کی گڑیا خریدی۔

"بڑی خوب صورت گڑیا ہے" دکاندار نے اسے کاغذ میں لپیٹتے ہوئے کہا اور اس کو ڈبے میں بند کر دیا۔ "اس سے کھیلنے میں یقیناً بچی کو بہت لطف آئے گا"۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے دینا نہیں چاہتا۔ بعد میں دکاندار نے بہت سے دوسرے قسم کے کھلونے دکھائے۔ مگر مس مورڈنٹ نے کہا کہ اسے اور کچھ نہیں چاہیئے۔

وہ گڑیا کے ڈبے کو لے کر دکان سے نکلی۔ ڈبے میں اٹھانے کے لئے ڈوری کا پھندا لگا ہوا تھا۔ مگر مس مورڈنٹ نے بجائے اس پھندے کو پکڑنے کے ڈبے کو احتیاط سے بغل میں دبا لیا۔

سڑک پر آج غیر معمولی طور پر بہت شور تھا۔ موٹر کے ہارن سائیکلوں کے گھنٹے سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی کوچوان نے ایک کتے کو چابک مارا۔ اُس نے چیخ چیخ کر سارے بازار کو سر پر اٹھا لیا۔ اخبار بیچنے والوں نے الگ شور مچا رکھا تھا۔ اس شور میں جو کچھ مس مورڈنٹ نے گڑیا سے کہا کوئی نہ سن سکا۔ "تمہارا گھر اب بہت دور نہیں ہے"۔ اس نے کہا۔

مگر وہ پاگل نہ تھی۔ اگر وہ پاگل ہوتی تو اتنے بڑے دفتر میں تیس شلنگ فی ہفتہ کس طرح کما سکتی تھی۔ جب وہ پہلے نوکر ہوئی ہے تو اسے صرف اٹھارہ شلنگ ملتے تھے۔ صرف چار سال میں اس نے اتنی ترقی کر لی تھی۔ وہاں کے مینیجر کا خیال تھا کہ وہ اپنے فرائض سے زیادہ کام کرتی ہے۔ مسٹر فوربز جو دفتر کا حساب کتاب رکھتا تھا اس کا خیال تھا کہ مس مورڈنٹ ذرا ہنس مکھ مزاج ہے۔ بوڑھی عورت جو دفتر صاف کرنے پر مقرر تھی سمجھتی تھی کہ وہ بہت با اخلاق عورت ہے اور چپراسی کا خیال تھا کہ ضرورت سے زیادہ پھرتیلی ہے اور ایسے ہی آدمی کو پسند کرتی ہے۔ اس طرح ایک ہی شخصیت کے متعلق لوگوں کے مختلف خیالات تھے۔ مگر یہ تو سب جانتے تھے کہ مس مورڈنٹ پاگل نہیں ہے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ جب وہ پاگل نہ تھی تو اس نے اپنے لئے آٹھ شلنگ کی گڑیا کیوں خریدی؟

وہ عورت تھی۔ صرف قسمت کے پھیر نے اسے کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بالکل ایسی تھی اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ اس کے عورت ہونے ہی نے اسے گڑیا خریدنے پر مجبور کیا۔ ایسی عورتیں انہیں کاموں کو قربانی اور بہادری کے کام سمجھتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ایک

کم معاش عورت کا آہ و شیون کی گڑیا خریدنا واقعی بہت بڑی قربانی کہلانے کا مستحق تھا۔ ایک چھوٹی سی گلی میں اس نے دو کمرے کرائے پر لے رکھے تھے۔ ان کمروں سے ملا ہوا بالکل چھوٹا سا ایک باورچی خانہ تھا۔ اس کا کمرہ بہت معمولی تھا۔ مگر صاف ستھرا۔ اسے ان دو کمروں میں بہت آرام ملتا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے گڑیا کو ڈبے میں سے نکالا اسے پیار کیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی "تھوڑی دیر یہیں ٹھیرو میری، دیکھو شرارتیں مت کرنا۔"

اس نے ڈبے کو الماری پر رکھ دیا جہاں اور دفتی کے ڈبے رکھے تھے کہ شاید کبھی کام آجائیں۔ پھر وہ باورچی خانے میں جا کر کھانا پکانے لگی۔ میری اس کے کہنے کے مطابق چپ چاپ بیٹھی سب دیکھتی رہی۔ مس مورڈنٹ کھانا پکاتے ہوئے اس سے باتیں کرتی رہی۔

"ان ڈبوں کی قید سے تو یہ گھر اچھا ہے نا؟ تمہیں معلوم بھی ہے میں کھانا کھانے کے بعد کیا کرنے والی ہوں؟ میں تمہارے لئے سفید ریشم کا فراک سیوں گی۔ پھر تم شہزادیوں کی طرح خوبصورت معلوم ہوگی۔ تم اپنی اماں کے پلنگ کے پاس چھوٹے سے پلنگ پر سونا۔"

مس مورڈنٹ خاموش طبیعت کی عورت تھی۔ اتنے لمبے اور اتنے خوبصورت فقرے تو اس نے عمر بھر نہیں بولے ہوں گے۔ اگر کبھی ٹائپ کرتے کرتے مشین میں خرابی پڑ جاتی تھی تو وہ بالکل مختصر طور پر اس کی خرابی بیان کر دیا کرتی تھی۔ مس مورڈنٹ کے اس مختصر سے فقرے پر مسز فورٹ کو اکثر ہنسی آجایا کرتی تھی اور اسے مسٹر فورٹ کی بے جا ہنسی پر غصہ آجایا کرتا تھا۔ مگر کمرہ صاف کرنے والی عورت سے اس کا ذکر کرنے کے سوا اس نے مسٹر فورٹ سے کبھی خفگی کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

فراک سیتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ میری سے باتیں کر رہی تھی۔ "اب تک میں بالکل اکیلی تھی گو میری بہت سی سہیلیاں ہیں مگر مجھے ایک چھوٹی سی لڑکی کی ضرورت تھی جو میرے ساتھ ہمیشہ رہے۔ میں کتا خریدلیتی مگر مشکل یہ ہے کہ میرے دفتر جانے کے بعد کتے کی حفاظت کون کرتا۔ میری چھوٹی سی بچی کتوں سے بہتر ہے۔"

خوش قسمتی سے میری کی آنکھوں سے یہ ظاہر ہوتا رہتا تھا کہ وہ ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔ مگر لڑنے سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور یہ خوشی غائب ہو جاتی تھی۔ مس مورڈنٹ اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ گھر میں دکان کے مقابلے میں زیادہ خوش رہے گی۔ وہ کچھ اور کہنے والی ہی تھی کہ اس کے پڑوس سے پیانو کی ہلکی سی آواز آئی جس نے ان کی گفتگو کو تھوڑی دیر کے لئے روک دیا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ہاں دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ والے کمرے بھی کسی نے کرائے پر لئے ہیں اور وہ عورت آج اس میں آگئی ہے۔ اس پیانو کے متعلق اس سے بات چیت کرنی پڑے گی۔ وہ بجاتی تو اچھا ہے مگر اس کے لئے مقررہ اوقات ہونے چاہئیں۔ یہ سر وقت کی بیریں بیریں تو ذرا تکلیف دہ ہے اگر یہ اس طرح شور مچاتی رہی تو میں عورتوں کی ادبی مجلس کا جلسہ کس طرح کر سکوں گی۔ سارا دن کام کرنے کے بعد میں آدھی رات تک اس پیانو کے شور کی وجہ سے جاگنا نہیں چاہتی کل دفتر جانے سے پہلے ان بیگم صاحبہ سے ضرور ملوں گی۔ اچھا اب تم یہ فراک پہن کر دیکھو اس میں کیسی لگتی ہو۔"

لیکن وہ فراک پہنانے ہی والی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اس نے جلدی سے گڑیا کو اور ان کپڑوں کو سونے کے کمرے میں ڈالا اور مس سٹیفرڈ کے لئے دروازہ کھول دیا۔

مس سٹیفرڈ دبلی پتلی سیدھی سادھی عورت تھی اور حفظان صحت کے قاعدوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔ سوائے سگرٹ پینے کے وہ کوئی کام صحت کے اصولوں کے خلاف نہیں کرتی تھی۔

"تم ابھی تو ہو گی کل شام عورتوں کی ادبی مجلس کے جلسے میں کیوں نہیں آئیں؟ میں کبھی شاید طبیعت اچھی نہ ہوگی!"

"میں بہت تھک گئی تھی اس لئے آنے کو جی نہیں چاہا۔" مس مورڈنٹ نے کہا۔

"فضول کہو اس سٹیفرڈ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ جب تک تم یہ نہ سوچو کہ تم تھکی ہوئی ہو تم تھکان محسوس کر ہی نہیں سکتیں۔ اسی طرح بعض آدمی اپنے آپ کو کامل بنا لیتے ہیں۔ خیر اب کے اس میں کچھ خاص بات نہیں تھی مارگرٹ جیک سن کو اپنی عادت کے مطابق غصہ آگیا اور اس نے تمہارے متعلق بھی کچھ کہا۔"

"سچ مچ! اس نے کیا کہا؟" مس مورڈنٹ نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا تم مسٹر فورٹ سے شادی کرنے والی ہو؟" مس سٹیفرڈ نے سوال کیا۔

"نہیں ہرگز نہیں! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

مارگرٹ جیک سن نے سنا ہے کہ آج کل مسٹر فورٹم سے بہت خوش ہیں۔"

"تو کل تک وہ اپنا خیال بدل لیں گے۔"

"بہت خوب" مس سٹیفرڈ نے سگرٹ کی راکھ گراتے ہوئے کہا۔ "یہ عمر شادی کرنے کی نہیں ہے۔ اگر ساری دنیا کی لڑکیاں میرے کہنے پر چلیں تو ہم بہت جلدی مردوں کے پھندے سے آزاد ہو سکتے ہیں۔"

مس مورڈنٹ خاموش ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ مسٹر فورٹ بے وقوف آدمی ہے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ وہ آج کل بہت اکیلی اکیلی ہے۔ ایک دم سے پیانو کی آواز نے اسے گھبرا دیا۔

"کتنا شور ہے" مس سٹیفرڈ نے کہا۔

"ہاں اس عورت کے پیانو نے میرا بھی ناک میں دم کر دیا ہے۔ میں کل اس سے اس کے متعلق بات چیت کروں گی۔ اس کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنا مشکل ہو گیا ہے۔"

مس سٹیفرڈ نے یاد دلایا کہ اس ہفتے عورتوں کی ادبی مجلس کا جلسہ اس کے ہاں ہو گا اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد مس مورڈنٹ نے نیا فراک گویا کو پہنایا اور گریان میں ذرا خرابی تھی اسے ٹھیک کیا اور گویا کو اپنے ساتھ پلنگ پر سلا لیا۔

دوسرے دن صبح کو چائے پینے کے بعد مس مورڈنٹ اپنی ہمسائی کے پاس گئی تاکہ اسے آہستہ سے سمجھا دے کہ ہر ایک کام کا ایک وقت ہونا چاہئے یہ ہر وقت کا باجا ذرا تکلیف دہ ہے۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جب دروازہ کھلا تو اسے بڑا اچنبھا ہوا۔ کیونکہ کمرے میں عورت نہیں تھی بلکہ ایک مرد تھا۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ یہ شخص گویا کے عقیلا اور حقیر عمر کا آدمی تھا۔ اس کے بات کرنے کا ڈھنگ بہت دل چسپ تھا۔ مگر اس کی عادتیں ضدی بچوں کی سی تھیں۔ اس کا نام مسٹر سمتھ تھا۔

ابھی مس مورڈنٹ نے دو فقرے ہی کہے ہوں گے کہ اس نے اس کا مطلب بھانپ لیا۔

اس نے مس مورڈنٹ کو گھور کر دیکھا اور سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہنے لگا۔ "میں کیا کروں؟ آپ ہی بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں جتنے گھروں سے نکالا گیا ہوں شاید ہی کوئی اور نکالا گیا ہو گا۔ میرے ہمسایوں نے ہمیشہ مجھ سے یہی شکایت کی۔ اب میں نے سوچا تھا کہ اس مصیبت سے نجات مل گئی۔ پیانو بجانے میں کوئی وقت کی پابندی نہیں کرتا۔ آج تک کسی نے نہیں کی۔ ابھی میں نے ناشتا بھی ختم نہیں کیا کہ آپ نے آ کر کہنا شروع کر دیا پیانو جلاؤ، جہنم میں جاؤ۔"

مس مورڈنٹ نے بہ مشکل تمام اپنی ہنسی روکی اور کہا۔ "میرا مطلب یہ نہیں ہے بلکہ میں نے یہ کہا تھا کہ آپ صبح چھ بجے سے لے کر شام کے دس بجے تک بجا سکتے ہیں۔ ہاں بعض دنوں میں آپ کو شام کے چھ بجے باجا بند کر دینے کو کہہ دوں گی۔"

مسٹر سمتھ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کہا۔ "ذرا ٹھیرو۔" پھر کہنے لگا۔ "جائے جناب۔ میں آتی باتیں کیسے یاد رکھ سکتا ہوں! میں صبح چھ بجے نہیں اٹھتا اور رات کو چھ بجے تک بہت کم جاگتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر آسمان نزدیک مکان ہوں تو بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" مس مورڈنٹ ذرا گھبرا گئی کیونکہ وہ خود یہی کہنے والی تھی۔ پھر مسٹر سمتھ نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے آج تک کسی کی شکایت نہیں کی۔ اوپر کی منزل میں ایک عورت ہے وہ سارا دن مشین چلا چلا کر اتنا شور مچاتی ہے کہ ایک منٹ آرام نہیں ملتا۔ مگر میں آج تک آپ کی طرح چیخا چلایا نہیں گیا کہ مہربانی کر کے مشین چلانی بند کر دو۔"

مس مورڈنٹ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ نہ تو وہ چیخی نہ چلائی، نہ اس نے پیانو جلانے کو کہا۔ مگر اسے صبح جلدی اٹھنا پڑتا ہے کہ دفتر جانے سے پہلے گھر کا کام کرے۔ اس لئے . . . .

"آپ نے خوب یاد دلایا" مسٹر سمتھ نے چلا کر کہا۔ اس طرح بات کاٹنا بہت بدتمیزی کی بات تھی مگر بیچاری مس مورڈنٹ کیا کر سکتی تھی۔

"کیا آپ مجھے کسی ایسی بڑھیا کا پتہ بتا سکتی ہیں جو روز صبح شام آ کر میرے گھر کا کام کاج کر جایا کرے؟"

"ہاں ممکن تو ہے" مس مورڈنٹ نے کہا۔ "مگر میں آپ سے یہ کہنے نہیں آئی تھی۔"

پھر اس نے سمجھایا کہ وہ کیا چاہتی ہے اور مسٹر سمتھ نے کہا کہ وہ وقت کی پابندی کرنے کی کوشش کرے گا مگر وعدہ نہیں کرتا اور ساتھ ہی اس نے مس مورڈنٹ سے کہہ دیا کہ ماما بھیجنا نہیں بھولنا۔ اس نے جلدی سے مسٹر سمتھ کو خدا حافظ کہا کیونکہ اسے فکر تھا کہ کہیں دفتر سے دیر نہ ہو جائے۔ وہاں جا

اس نے تھوڑی دیر مسز فاگ سے باتیں کیں جو فرنیچر جھاڑ دیا کرتی تھی۔
مسز فاگ نے کہا "ہاں اگر ان کو میرا کام پسند آجائے گا تو میں بھی کرنے کو تیار ہوں۔ اچھا تو یہ بتائیں وہ کیسے آدمی ہیں؟"
"خاصے اچھے آدمی ہیں۔"
"اچھا کل صبح میں خود جا کر دیکھ لوں گی کہ وہ کیسے آدمی ہیں۔ میں کہہ دوں گی کہ آپ نے بھیجا ہے۔"

مس مورڈنٹ آج ضرورت سے زیادہ خوش تھی اور اُس نے اس دن مسٹر فورٹ سے بھی بہت مِنس مِنس کر باتیں کیں۔ مسٹر فورٹ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کا خیال تھا کہ وہ اچھی عورت ہے۔ صورت شکل کی بھی اچھی ہے عقل بھی ہے مگر مزاج کی ذرا تیز ہے۔ مگر یہ کوئی خرابی نہ تھی وہ اس کو نظر انداز کر سکتا تھا اور کچھ روز سے مس مورڈنٹ کو غصہ بھی نہیں آرہا تھا۔

آج مسٹر فورٹ نے جو یہ رنگ دیکھا تو اپنا خیال ذرا بدل دیا اور ذرا تکلفی سے منس منس کر باتیں کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر پھر مس مورڈنٹ نے اپنا پرانا رویہ اختیار کر لیا۔ اس نے مسٹر فورٹ کی ہر ایک بات کا بہت مختصر سا جواب دیا۔ مگر وہ اسی سے خوش ہو گیا۔ اس نے شام کو اپنے ایک دوست سے کہا کہ عورتیں بھی عجب قسم کی جانور ہیں کبھی میں خوش کبھی میں ناخوش۔

گھر واپس آکر جیسے ہی مس مورڈنٹ نے سٹیر ھیوں پر قدم رکھا بانجے کی سریلی آواز نے اس کا استقبال کیا۔ مسز سمتھ کی آواز بہت اچھی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اسے گانے کی کافی مشق ہے۔ مس مورڈنٹ کو اس وقت گانا سننے کا شوق ہو رہا تھا مگر جیسے ہی اس نے دروازہ بند کیا گانا ایک دم رک گیا۔ وہ میری سے باتیں کرنے لگی جس طرح مس مورڈنٹ اسے صبح کو جھاڑ کر گئی تھی وہ اب بھی اسی طرح گدیلوں میں دبکی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے آنے سے خوش ہو کر مسکرا رہی ہے۔

مس مورڈنٹ نے کہا "میری بہت اچھی لڑکی ہے بالکل شرارتیں نہیں کرتی اور مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہے۔" پھر اس نے باجے کے متعلق باتیں شروع کیں۔ "معلوم نہیں میری انہوں نے باجا کیوں بند کر دیا۔ اگر پورا گیت ختم کر کے بند کرتے تو اچھا تھا۔ بعض لوگ عجب کم عقل ہوتے ہیں۔ بس انہیں بیٹھے بیٹھے غصہ آگیا ہوگا۔ تم یہ تو نہیں بتا سکتیں کہ وہ سارا دن بجاتے رہے تھے یا نہیں؟"

ہاں یہ ٹھیک تھا بیچاری میری کس طرح بتا سکتی تھی۔ اپنے معمول کے مطابق مس مورڈنٹ کھانا تیار کر رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا جب اس نے دروازہ کھولا تو ایک آدمی نے پوچھا کیا آپ کا نام مس مورڈنٹ ہے۔ اس کے ہاں کہنے پر اس آدمی نے ایک کارڈ اور پھولوں کا گلدستہ اس کو دیا کارڈ پر لکھا تھا۔ "اُس کا آمد تحفے کے شکریے میں جو آپ نے صبح کو بھیجا تھا یعنی مسز فاگ" اس نے پہلے سوچا کہ قبول نہ کرے مگر مسٹر سمتھ نے کچھ اس طرح لکھا تھا کہ اسے لینے پڑے اور اس کو پھول پسند بھی بہت تھے۔ مگر وہ خریدتی بہت کم تھی۔ اس نے سفید گلاب کے پھول کھانے کی میز پر رکھے اور خواہش ظاہر کی کہ میری ان کی تعریف کرے پھر وہ کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔ وہ بھوکی تھی اور خوش بھی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد مس مورڈنٹ نے مسٹر سمتھ کو شکریے کا خط لکھا اور میری کے لئے ایک اور فراق تیار کیا۔

اس طرح دن گزرتے گئے اور جیسے ہی مس مورڈنٹ گھر میں قدم رکھتی تھی مسٹر سمتھ پیانو بند کر دیتے تھے۔ یہ بہت بُری بات تھی کہ وہ پیانو اس پھرتی سے بند کر دیتا تھا۔ مس مورڈنٹ نے ارادہ کیا کہ وہ اس کے متعلق اس سے پھر بات چیت کرے گی۔ خاص خاص موقعوں پر شام کو وہ چھ سے دس تک خاموشی چاہتی تھی معمولی وقتوں میں اگر پیانو رات کے دس بجے تک بجتا رہے تو کچھ مضائقے کی بات نہ تھی۔ عورتوں کی ادبی مجلس کے دن اسے گفتگو کا موقع مل گیا۔

مس مورڈنٹ کے پاس صرف چائے کی چھ پیالیاں تھیں اور اس انجمن کے سات ممبر تھے۔ وہ اپنے کمرے کو سجا رہی تھی کہ اسے خیال آیا کہ ایک پیالی کم ہے۔ اس نے سوچا کہ مسٹر سمتھ سے مانگ لے اور اُسے یہ بھی سمجھا دے کہ اسے موسیقی سے نفرت نہیں ہے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مسٹر سمتھ نے غصے کے آثار نہیں ظاہر کئے۔ بلکہ اس کو کمرے میں بٹھا کر اس موقعے کے لئے موزوں پیالی تلاش کرنے اندر چلا گیا۔ اس کمرے میں ایک پیانو اور بہت سی کتابیں رکھی تھیں۔ روسی چمڑے اور تمباکو کی سگرٹ کی بو آرہی تھی۔

مسٹر سمتھ پیالی لے کر آیا اور پوچھا کہ اب وہ کب سے پیانو رات کے دس بجے تک بجا سکے گا۔

"اُن دنوں میں بھی آپ بجا سکتے تھے۔ جب کبھی مجھے ضرورت ہوگی میں خود ہی کہہ دیا کروں گی کہ باجا بند کر دیں۔"

وہ ایک دم گھبرا کر اٹھ گیا اور چپالی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے گرپڑا

"ہاں یہ میری ہی غلطی ہے۔ میں ہر واقعہ بات کا الٹا مطلب لیتا ہوں۔ میں سمجھا تھا کہ صرف بعض دن شام کو آپ مجھے ریزیک بجانے کی اجازت دیں گی اور آپ تو مجھ پر بہت مہربان ہیں آپ نے نوکرانی کو بھیجا اور سر طرح میرے آرام کا خیال رکھا۔ مگر یہاں تو دس بج کر پانچ منٹ والا قصہ ہو گیا۔"

"وہ کیا؟" مس مورڈنٹ نے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھے ایک ڈرامے میں دس بج کر پانچ منٹ پر جانا تھا۔ مگر مجھے یہ خیال رہا تھا کہ پانچ بج کر دس منٹ پر جانا ہے میں صبح کو جلدی اٹھا اور بغیر ناشتا کئے ٹاپتا کانپتا وہاں پہنچا تو سب میرا مذاق اڑانے لگے کہ ابی جناب ڈرامے کی مشق تو دس بج کر پانچ منٹ سے ہوگی اور میں شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔"

مس مورڈنٹ نے معافی مانگی۔ مگر اسے مسٹر سمتھ کی باتوں میں بہت مزا آرہا تھا۔

"میں نہیں سمجھ سکتی کہ اتنا بڑا گویا اتنی معمولی باتیں کس طرح بھول سکتا ہے۔"

"مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ گانا بہت بڑا عیب ہے اس نے تو میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اب تو مجھے ایک سکرٹری رکھنا پڑے گا جو میری ہر ایک بات کا خیال رکھے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے صرف میری خاطر اتنی تکلیف اٹھائی۔ آج تو آپ نہیں بجا سکیں گے کیونکہ آج خواتین کی انجمن کا جلسہ ہے۔ مگر کل سے آپ بجا سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہمدرد وارہ کنکشا رہا ہے۔ اچھا خدا حافظ بہت بہت شکریہ۔"

مس سٹیفرڈ کچھ کاغذ ہاتھ میں لئے دروازے پر کھڑی تھی "میں ذرا جلدی آگئی ہوں کہ شاید تمہیں کام میں کچھ مدد کی ضرورت ہو۔"

"تمہارا شکریہ میں سب کچھ کر چکی ہوں صرف ایک پیالی مانگنے ساتھ کے گھر میں گئی تھی۔"

"ہاں مجھے یاد آیا کہ تم نے کہا تھا کہ ساتھ کے گھر میں ایک عورت آئی ہے۔ کیا تم نے اس سے کہہ دیا کہ آج باجا نہ بجائے؟"

"ہاں کہہ دیا وہ آج نہیں بجائے گی" مس مورڈنٹ نے شرماتے ہوئے کہا۔ "یہ تو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے مس مورڈنٹ کو دھوکا دینا نہیں آتا تھا۔

جلسہ اچھا کامیاب رہا۔ سب نے عورتوں کی تعلیم و تمدن پر چھوٹے چھوٹے تبصرے کئے۔ چائے پیتے وقت سب نے تو ایک رنگ کی پیالیوں میں چائے پی مگر مس مورڈنٹ نے بالکل مختلف رنگ کی پیالی میں پی۔ رات کو سوتے وقت مس مورڈنٹ نے میری سے کہا۔ "آج کی شام بہت اچھی طرح گزری اور مسٹر سمتھ خوب آدمی ہے۔ اس کو خصہ بہت جلد آتا ہے اور اچھا امیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔" میری خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی مگر ایک دم سے اس کا سر تکیے پر سے پھسل گیا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

دوسرے دن صبح وہ ناشتا کر کے بیٹھی ہی تھی اور میری سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ مسٹر سمتھ کے پیانو نے اسے ایک دم روک دیا۔ وہ بہت شوق سے سن رہی تھی اور جب اس نے بجانا بند کر دیا تو مس مورڈنٹ نے تعریف کے طور پر آہستہ سے تالی بجائی۔

پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی اس نے کنڈی کھولی تو مسٹر سمتھ کھڑے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ مجبور تھی۔ کیا کرتی ان کو اندر بلا لیا۔ مگر وہ میری کو اٹھانا بھول گئی۔ مسٹر سمتھ نے کہا۔ "میں نے آپ کی تالیوں کی آواز سنی تھی۔ آپ کی تعریف کا بہت بہت شکریہ۔ اگر آپ میرے کمرے میں تشریف لے چلیں تو اس سے اچھی طرح سن سکیں گی۔"

مس مورڈنٹ راضی ہو گئی اور بعد میں اسے خود تعجب ہوا کہ اس نے کیوں رضامندی ظاہر کر دی۔ وہاں جا کر وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور مسٹر سمتھ نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا بجائے۔ مس مورڈنٹ نے کچھ بتایا اور وہ بجانے لگا۔

"یہ کتنی اچھی سُر ہے" مس مورڈنٹ نے کہا۔ "مگر اب یہ بہت پرانی ہو گئی ہے۔"

"ہاں واقعی بہت اچھی ہے۔ مس مورڈنٹ میں نے آج صبح کافی نہیں پی۔ کیا آپ کافی بنانے میں مجھے مدد دیں گی؟"

"مگر کافی تو بہت بری چیز ہے۔ اگر آپ اس وقت پی لیں گے تو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔"

"نہیں مس مورڈنٹ میرا حال عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے اگر کافی نہ پیوں تو مجھے نیند نہیں آتی۔"

دونوں نے مل کر کافی تیار کی اور بعد میں مل کر پی۔ مس مورڈنٹ نے کہا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ تالیوں کی آواز اس تک پہنچے۔

مسٹر سمتھ نے کہا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ دیواریں بہت پتلی ہیں آپ اپنی سہیلی سے جو باتیں کرتی ہیں میں سن تو نہیں سکتا مگر دھیمی دھیمی آواز ضرور آتی ہے۔

"کون سی سہیلی؟" مس مورڈنٹ نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ کی گڑیا! اور کون؟" مسٹر سمتھ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اصل بات یہ ہے . . . ."

مسٹر سمتھ نے کہا "میں سب کچھ جانتا ہوں اگر کوئی اتنا بھی نہ سمجھ سکے تو وہ موسیقی بھی نہیں سمجھ سکتا۔"

اس طرح وہ ایک دوسرے سے ملتے رہے آخر کار اُن کی شادی ہو گئی۔

چند برس کے بعد مسز سمتھ نے اپنی بیٹی کو جس کا نام اس نے میری ہی رکھا تھا۔ ایک گڑیا دینے کا وعدہ کیا اور کہا کہ وہ بہت پرانی گڑیا ہے اور وہ خود اس سے کھیل چکی ہے۔ میری جس نے ابھی حساب سیکھنا شروع ہی کیا تھا سمجھی کہ یہ گڑیا کم از کم سو سال پرانی ہو گی۔

اُس کو میں نے بہت اچھے کپڑے پہنا رکھے ہیں اور اس کا اور رتھ نام بھی ایک ہی ہے، اور اس کی آنکھیں بند ہوتی اور کھلتی بھی ہیں۔

"اچھا! ذرا مجھے دکھائیے تو سہی"۔ میری نے کہا۔ مسز سمتھ نے گڑیا نکال کر دی۔ میری تھوڑی دیر تک تو غور سے دیکھتی رہی۔ پھر حیرت سے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔ "اماں جان۔ آپ چھپن میں بہت عقلمند تھیں جو آپ نے گڑیا کے لئے اتنے اچھے کپڑے سی لئے"

"مگر میں اُس زمانے میں تم سے بہت بڑی تھی میری"

"آپ کتنی بڑی تھیں اماں جان؟"

"اتنی ہی بڑی جتنی اب ہوں"۔ مسز سمتھ نے مسکرا کر جواب دیا ابھی وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ مسٹر سمتھ نے پکارا۔

"ادھر سنو گریس مجھے کچھ روپیہ منی آرڈر کرانا ہے بتاؤ کس طرح کرتے ہیں"

اب تک تمہاری یہ عادت نہیں گئی" مسز سمتھ نے ہنس کر کہا۔ مجھے دے دو میں منی آرڈر کر دوں گی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے وہ گڑیا میری کو دے دی ہے اور وہ اسے پسند بھی آ گئی ہے"

(ترجمہ) مس معتصمۃ الرحمن

غزل

خاک ڈالو مرے سکوے پہ نہ جاؤ پیارے
نیچی نظریں نہ کرو آنکھ اُٹھاؤ پیارے

بعد مرنے کے مرے سوگ سے حاصل کیا ہے
چپ نہ ہو غم نہ کرو جی نہ کڑھاؤ پیارے

پھر کبھی آن ملو گے، یہ بجا ہے لیکن
کوئی صورت بھی تو جینے کی بتاؤ پیارے

تم جو آ جاؤ تو تقدیر کا شکوہ نہ رہے
میری سوئی ہوئی قسمت کو جگاؤ پیارے

ضبط سے رازِ محبت نہ چھپے گا سیفی
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کو چھپاؤ پیارے

سیفی لوگانوی

میں اور تم

مرے جہانِ محبت کو خواب کہتے ہو، مگر بتاؤ تو پھر اصلِ زندگی کیا ہے
مرے سرورِ نظر کو حجاب کہتے ہو مگر کھلا نہ یہ تم پر کہ روشنی کیا ہے

تمہاری زیست ہے کیا انتظار مرنے کا؟ ترس رہے ہو تم اک خوابِ جاوداں کے لئے
مرا جہاں مری رنگینیوں سے ہے پیدا تمہاری بود ہے اوہامِ ناگہاں کے لئے

مرا مقام ثواب و گناہ سے ہے بلند تم اور تمہاری نشیب و فراز کی دنیا
ہے میری دید کو اصلِ نگاہ سے پیوند ہے مجھ کو وجہِ حقیقت مجاز کی دنیا

مجھے یقیں ہے بہر حال زندگانی میں مگر تمہیں تو کسی بات پر یقیں ہی نہیں
مرے لئے تو مزا ہے اسی کہانی میں مرے جنوں کو تمیزِ جنوں ہی نہیں

مری حیات میں رنگِ شباب رہنے دو
فریبِ حُسن سے کچھ بار یاب رہنے دو

حمید عرفانی ایم اے

خندۂ تقدیر

گاڑی ایک منٹ کے لئے راہ والی کے اسٹیشن پر رکی۔ صرف وہی ایک مسافر تھا جو گاڑی سے اترا۔ بابو نے جو تنہا اس اسٹیشن پر ٹکٹ دینے لینے کے علاوہ دوسرے فرائض بھی انجام دیتا تھا بیرت کی نگاہوں سے اسے دیکھا لیکن وہ خاموشی سے ٹکٹ دے کر تنہائی کا ڈیرہ جنبل میں دبائے۔ اسٹیشن سے باہر نکل گیا اور ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اس چھوٹے سے اسٹیشن سے چند فرلانگ کے فاصلے پر اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ دن ڈھل رہا تھا جبکہ شاہنواز نے گاؤں کا رُخ کیا۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔

پگڈنڈی پر مرگ آسا سکوت طاری تھا۔ کھیتوں کے درخت چھوٹے بڑے پودے سب حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ نو وارد اور اجنبی نہ تھا لیکن اس میں جنبیت پیدا ہو چکی تھی یہ پگڈنڈی، یہ درخت اور یہ خاشاہ نواز سے ناآشنا تھی۔ آج سے آٹھ سال قبل یہی چیزیں اُسے شاہو کے نام سے جانتی تھیں۔

راستے پر چلتے ہوئے شاہنواز کو آٹھ سال قبل کی زندگی کی تصویریں نظر آرہی تھیں۔ یہ تو اسے معلوم ہی نہ تھا کہ اس کے والدین کون تھے اور انہوں نے اس کا کیا نام رکھا تھا لیکن اُس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا وہ گاؤں کے ایک زمیندار کی گائیں بھینسیں چرانے پر مامور تھا۔ زمیندار اور گاؤں کی مختصر دنیا اُسے شاہو کے نام سے پکارتی تھی۔

گاؤں کے جس ملاقے میں وہ چوپائے چرانے جاتا تھا وہیں ناجو گاؤں کے چودھری کا ریوڑ لے کر آتی تھی۔ ایک دوسرے کے قریب رہنے سے دونوں میں اُنس پیدا ہو گیا۔ سردی کے دنوں میں شاہو خشک اُپلے جمع کرتا اور انہیں آگ لگا کر سورج نکلنے تک شاہو اور ناجو دونوں آگ تاپتے رہتے۔ گرما میں شاہو درختوں کی بڑی بڑی ٹہنیاں کاٹ کر زمین میں گاڑ دیتا اور ناجو اپنی اوڑھنی اُن پر پھیلا دیتی اور دونوں اس کے سائے میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔ موسم جو شگوفا رہوتے پر دونوں کھیتے بھی رہتے۔

بچپن کے معصوم ایام آنکھ جھپکنے میں گذر گئے۔ آنا زشباب نے جہاں ان معصوم بچوں کو جسمانی بلوغت عطا کی وہاں اُن کے جذبات میں بھی روانی عنصر داخل کر دیا۔ کسی ناقابلِ فہم جذبے کے زیر اثر وہ اکثر ایک دوسرے کے پاس رہنے کی خواہش کرنے لگے۔ اُنس نے رفاقت اور رفاقت نے الفت کی شکل اختیار کر لی۔ صبح سویرے آنا اور شام کو دیر سے لوٹنا ان کا معمول ہو گیا۔ زندگی کے یہ لمحات بھی نشاط آوری میں کسی طرح بچپن سے کم نہ تھے۔

پھر رفتہ رفتہ صاف ستھرے پر غم کی گھٹائیں چھانے لگیں۔ شاہو بدستور مسرور تھا لیکن ناجو کے بے اختیار قہقہے رفتہ رفتہ تبسم میں تبدیل ہو گئے۔ شاہو نفسیات کا ماہر تھا لیکن حساس دل کا مالک ضرور تھا۔ ناجو کی اندرونی کشمکش اس کے لئے ایک عرصے تک راز نہ بنی رہی۔ وہ خود کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کسی بہانے سے اپنے مستقبل کے متعلق ناجو سے کہہ دے اور اس کا عندیہ معلوم کرے کہ وہ کہاں تک اس کی رفیق حیات بننے کی آرزومند تھی۔ لیکن اس مسئلے کا آغاز کرنا اُس کے لئے کارِ دشوار رہا ہوا تھا۔ شاہو شاید ابھی کچھ دن اور متذبذب رہتا لیکن ناجو کے رویّے میں ناگہانی تبدیلی دیکھ کر وہ عرضِ مدعا کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اُس روز صبح سے کئی بار شاہو ناجو سے آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے کہہ چکا تھا لیکن وہ کسی نہ کسی عذر پر انکار کر دیتی۔ سہ پہر ہو چکی تھی جب کہ شاہو نے جھلا کر ناجو کے ہاتھ سے وہ ادھوری ٹوکری چھین کر پرے پھینک دی جسے وہ صبح سے بنا رہی تھی اور طیش میں آکر اس سے کہا:۔

"تو تم میرے ساتھ آج کھیلو گی یا نہیں؟"

"نہیں، آج نہیں بلکہ کبھی بھی نہیں!" ناجو نے زمین کریدتے ہوئے دھیمی آواز سے جواب دیا۔

شاہو بھونچکا سا رہ گیا۔ اُس کی تیوری کے بل ایک ایک کر کے اترتے گئے اور اس کا دل کسی نامعلوم وجہ سے مچلنے لگا۔ ناجو کو بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی بجائے وہ خود اس کے پاس بیٹھ گیا اور آہستہ سے بولا:۔

"کہیں ناجو کیا بات ہے؟"

ناجو نا موشی سے زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ ایک دو آنسو آنکھوں سے نکل کر پلکوں تک آئے اور وہاں سے سارے دن کی تپی ہوئی زمین پر

گرکر جذب ہو گئے۔ شاہو نے ایک بار پھر کہا:۔

"ناجو کچھ کہو تو سہی"

ناجو نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ دو آنسوؤں اس سے ہی عمر میں پہلی دفعہ دُکھے ہوئے دل سے غم کا بار ہلکا ہو گیا۔ وہ بمشکل آواز سے بولی۔

"شاہو آج سے میرا تمہارا رشتہ الگ ہے۔ میری کل منگنی ہونے والی ہے۔ چودھری میری شادی اپنے ملازم بخشو سے کرنا چاہتا ہے۔"

شاہو کافی دیر تک بیٹھا ہوا ناجو کے چہرے کی طرف تکتا رہا۔ ناجو نے اٹھ کر اپنی نوکری اٹھائی اور ریوڑ کی طرف بڑھنے لگی۔ افق پر سورج آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا اور شیشم کے بلند درختوں کے اوپر آسمان پر سُرخی پھیل رہی تھی جیسے روشنی کا خون ہو رہا ہو۔ شاہو نے افق پر دیکھا۔ وہ شاعر نہ تھا لیکن افق کی سرخی اور اپنی امیدوں کے خون میں اسے کچھ مطابقت نظر آئی۔ اُس نے مایوس ہو کر افق سے نظریں ہٹالیں۔ ناجو ریوڑ لے کر دور نکل گئی تھی۔ شاہو بھی اپنے چوپائے جمع کر کے گاؤں کی طرف ہنکانے لگا۔

نصف رات گزر گئی لیکن شاہو کی آنکھیں ابھی تک واہنھیں۔ اُس کی زندگی میں کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا تھا جس پر اُسے غور کرنے کا موقع ملا ہو۔ اُس کے لئے زندگی کی یہ پہلی الجھن تھی۔ وہ خیالات میں ربط اور ترتیب پیدا کرنے کا عادی نہ تھا لیکن آج اُسے ان چیزوں کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ناجو سے محبت اور عشق پیدا ہوتے ایک عمر کا عرصہ صرف ہو گیا تھا اور آج ایک ہی دن میں اُسے ناجو سے مایوس ہونا پڑا تھا۔ گاؤں میں حکومتِ انگریزی کا تسلط برائے نام تھا۔ کم از کم سماجی قوانین ابھی تک گاؤں کے اپنے تھے۔ گاؤں کے چودھری کے فیصلے کے خلاف آواز بلند کرنا زک دلن کے مترادف تھا لیکن شاہو چودھری کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ آخر کار اُس نے اپنی الجھن کا حل سوچ لیا۔

وہ چپکے سے اٹھا اور اپنی بانسری بغل میں دبا کر گاؤں سے نکل گیا۔ بنسری اور بدن کے کپڑے ہی اُس کی کل کائنات تھی۔ کچھ دیر تک وہ غیر ارادی طور پر حرکت کرتا رہا۔ پھر اُس نے شہر کا رُخ کیا جو وہاں سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔

شہر میں دیہات کے آزمائے ہوئے دست و بازو کی بڑی قدر تھی۔ اُسے شکم پُری کے لئے کافی مزدوری مل جاتی۔ شام کو وہ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر کسی کونے میں بیٹھ کر بنسری بجانے لگتا۔ نہ جانے کیوں اُسے اس سے کچھ تسکین ہوتی۔ قریب کے محلے کے لڑکے اُس کے گرد جمع ہو جاتے۔ اُن کا خیال تھا کہ شاہو کی بنسری نہایت سریلی ہے، بچوں سے یہ بات بڑھ کر بڑوں تک پہنچی۔ کبھی کبھار کوئی بڑا آدمی بھی اس کی بنسری سننے کے لئے رُک جاتا۔ رفتہ رفتہ موسیقی کے شائق اسے بنسری سننے کے لئے گھر پر بلانے لگے۔ بچے کھچے کھانے یا ایک دو آنے سے اُس کی تواضع کر دی جاتی اور گھنٹہ دو گھنٹے اس کی بنسری سنی جاتی۔

حسنِ اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد اُسی شہر میں تماشا کرنے والوں کا ایک گروہ آیا۔ اس جماعت میں مختلف طرح کے فن کار شامل تھے۔ شاہو کی بنسری کی دھوم اس گروہ کے مالک تک بھی پہنچی۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ ان کی جماعت میں شاہو کا اضافہ مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ شاہو کو ایک معقول مشاہرے پر ملازم رکھ لیا گیا۔ اُس کے پھٹے پرانے چیتھڑے اتروا کر اُسے انگریزی لباس پہنا دیا گیا۔ لمبے لمبے گھنگھریالے بالوں کی جگہ اب شاہو کے سر پر صرف چھوٹے چھوٹے انگریزی وضع کے بال رہ گئے البتہ اُن شاہو اس نئی فضا سے کچھ خائف خائف سا رہتا لیکن رفتہ رفتہ وہ سب سے گھل مل گیا اور جاہل آدمیوں کی طرح اُسے انگریزی بولنے کا ڈھب بھی آ گیا۔ کمپنی کے مینیجر نے ضرورت کے مطابق اس کا نام شاہو سے شاہنواز کر دیا۔ جس بڑے شہر میں کمپنی جاتی شاہو نہیں بلکہ شاہنواز کی بنسری کی دھوم پہلے پہنچ جاتی۔ وہ اب دیہاتی بنسری کو ترک کر چکا تھا وہ اُس کے نئے راگوں کو بجانے کے لئے ناکافی تھی اور اُس نے اب ایک شہنائی خرید لی تھی۔ کمپنی کے کام کے علاوہ اُسے کئی بار دیگر مجلسوں میں بھی شہنائی بجانے کے لئے بلایا جاتا۔ اُس کی شہنائی میں ایک مخصوص سوز روز افزوں تھا۔ جو آدمی ایک دفعہ اُس سے شہنائی سنتا وہ دوسری دفعہ سننے کا تمنائی رہتا اور دوسری دفعہ سنتا تو پہلے سے زیادہ متاثر ہوتا۔

مغربی وضع کے سماجی اجتماعات میں شاہ نواز کی بڑی قدر رہتی۔ مردوں کے علاوہ جدید خیالات کی تعلیم یافتہ لڑکیاں اُس سے ملاقات کرنا فخر سمجھتیں۔ کئی شاموں کو سرخ و سفید ساری پوشوں نے شاہو کا پُرتپاک استقبال کیا۔ برقی روشنی میں غازے اور گلونے کی آرائش سے چمکتے ہوئے چہرے اُس کا دل لبھانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن صنفِ نازک میں شاہو نے صرف اس قدر دلچسپی لی کہ جب کبھی اسے کوئی چہرہ حسین نظر آیا تو وہ چند لمحوں کے لئے اس کی طرف صرف اس لئے دیکھتا

رہا کہ اس کے چند نقوش ناجو سے مشابہ تھے لیکن اس تماشے کا ردِّ عمل نہایت خوفناک ہوتا۔ شاہو کی وہ شام اور بعد میں آنے والی کئی راتیں ایک خلشِ مستقل کی نذر ہو جاتیں۔ وہ اُس دنیائے رنگ و بو کو تیاگ کر کہیں دور چلے جانے کے لئے آمادہ ہو جاتا۔ پھر زندگی کی مصروفیتیں اس کے عزائم کو تہ و بالا کر دیتیں۔

آٹھ سال اسی کشمکش میں گزر گئے۔ ایک دن وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گیا۔ راہ والی کا شاہو شاہنواز کی شکل میں پھر کسی جذبے کے زیرِ اثر گاؤں آنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔

چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب شاہو گاؤں کے نزدیک پہنچا اس وقت شام ہو چکی تھی۔ گاؤں کے ایک دو کتوں نے اس اجنبی شاہنواز کا خیر مقدم بھونک کر کیا۔ لیکن وہ ان کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک گلی میں داخل ہو گیا اور ایک جھونپڑے کے قریب جا کر رک گیا۔ ایک نوجوان زمیندار جھونپڑے سے باہر نکل رہا تھا۔ شاہو نے دفعتہً اس سے استفسار کیا۔

"ناجو کس گھر میں رہتی ہے؟"

زمیندار ٹھٹکا۔ گاؤں میں پیدا ہو کر تمام عمر گاؤں میں گزار دینے والی ناجو کو پوچھنے والا یہ شہری کون تھا۔ فرطِ حیرت سے اُس کے مُنہ سے نکلا۔

"ناجو!"

"ہاں" شاہو نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان زمیندار اُس وقت تک اپنی حیرت پر غلبہ پا چکا تھا۔ اُس نے نہایت افسوسناک لہجے میں کہا۔

"ناجو تو دو دن ہوئے مر چکی ہے۔"

"اچھا" شاہو کے منہ سے دھیمی سی آواز نکلی۔ اُس نے مٹی سے لپی ہوئی دیوار کا سہارا لیا۔ شہنائی کا ڈبہ ایک سرے سے کھسک کر اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگا کہ اُس نے ٹیک دے کر اسے سنبھال لیا۔ اور پیشتر اس کے کہ نوجوان زمیندار اس پر کوئی سوال کرے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گاؤں سے باہر نکل آیا۔ گاؤں کے مغرب میں کھیتوں کے درمیان گاؤں کا قبرستان تھا۔ شاہو قبرستان میں پہنچ گیا۔ چند ٹوٹی پھوٹی قبروں میں ایک ہی قبر نظر آ رہی تھی۔ کسی محبت بھرے دل نے سرسوں کے چند پھول قبر پر چڑھا رکھے تھے۔ قبر کے ایک سرے پر نیم کا درخت تھا۔ شاہو اُس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر تک بیکار بیٹھنے کے بعد شاہو نے ڈبے سے شہنائی نکالی اور اُسے بجانے لگا۔ شہنائی کے مدھم اور باریک سُر رفتہ رفتہ بلند ہوتے گئے۔ دردناک چیخوں نے ہنگامہ خیز گریے کی شکل اختیار کر لی۔ اُس روز جتنے پرسوز نغمے شہنائی سے بلند ہوئے اس سے پہلے کبھی نہیں سے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شاہو اپنا دل شہنائی میں پھونک رہا ہے۔ نصف شب سے کچھ قریب شاہو شہنائی بجاتا رہا اور پھر شہنائی کی آواز کم ہوتی ہوئی رات کی بھیانک تاریکی میں گم ہو گئی۔

اُس رات باد و باراں کا نہایت خوفناک طوفان آیا۔ ایک دفعہ بجلی اس زور سے کڑکی کہ گاؤں والوں کے دل دہل گئے۔ ساری رات گاؤں والوں نے اللہ اللہ کر کے کاٹی۔

صبح ہونے پر مطلع صاف ہو چکا تھا۔ دوپہر کے قریب ایک چرواہے نے گاؤں میں آ کر اطلاع دی کہ قبرستان میں بجلی گرنے سے ایک درخت جل گیا تھا اور ایک آدمی بھی مر گیا تھا۔ گاؤں کے چودھری نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ گاؤں کا کوئی آدمی کم نہیں ہوا تھا۔ مرنے والے کی شخصیت کے متعلق مختلف چہ مے گوئیاں ہوتی رہیں۔

شام کے قریب ایک نوجوان نے گاؤں والوں سے بیان کیا۔

"لاش کے قریب جو ڈبہ پڑا ہوا ملا ہے، ایسا ڈبہ کل شام ایک آدمی نے اٹھا رکھا تھا، جو ناجو کا پتہ پوچھتا تھا۔"

نسیم رضوانی

غزل

اب سرِ بالیں وہ شوخِ فتنہ گر آیا تو کیا
ہو چکا جب حشر حشر منتظر آیا تو کیا

کب ہمیں آبادیِ ہستی سے عدم کی وسعتیں
بلبلہ اک سطحِ دریا پر اُبھر آیا تو کیا

روشنیِ امید کی صحرائے ہستی کا سراب
دُور سے بہتا ہوا دریا نظر آیا تو کیا

صبحدم روشن نگاہیں اُس کے جلوے سے ہوئیں
رات بھر آنکھوں میں کٹ کٹ کر جگر آیا تو کیا

جس کی ہیبت سے لرز اٹھی تھی ساری کائنات
میرے سینے میں وہی طوفاں اتر آیا تو کیا

نالہ تو اک پل میں ہفت افلاک کو طے کر گیا
بارگہ سے اُس کی محتاجِ اثر آیا تو کیا

گھر کی ویرانی ہے کچھ صحرا کی ویرانی سے کم
چھوڑ کر دیوانہ صحرا کو اگر آیا تو کیا

اک نگہ حسرت کی جاتے جاتے اُس نے بھی تو کی
عمر بھر بھولا تو کیا، وقتِ سفر آیا تو کیا

منصور احمد

الوداع

[منظر:- پارک کے ایک گوشۂ تنہائی میں ایک مرد اور ایک عورت مصروفِ خرام ہیں۔]

عورت۔ لو اب تو بس ——— ہمیں جدا ہونا چاہئے۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔

مرد۔ جو حکم دو۔

عورت۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ میل جول اور کثرتِ بوس و کنار سے طبیعت بھر جائے اور ہم ایک دوسرے کے نام سے نفرت کرنے لگیں

مرد۔ بجا کہتی ہو (دوسرا ہاتھ چھوڑتا ہے)

عورت۔ میں دائیں ہاتھ کا راستہ لے کر جاتی ہوں۔ تم ایک منٹ کے بعد بائیں ہاتھ کا راستہ لے کر چلے جانا۔ میرا شوہر ہمارا تمہارا کچھ نہیں لگتا کیونکہ اب ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔

مرد۔ الوداع! (دونوں سر کرنے کا نام نہیں لیتے)

عورت۔ تم کیوں نہیں جاتے؟

مرد۔ ابھی مجھے کچھ کہنا سُننا ہے۔

عورت۔ کہو ——— ؟

مرد۔ غالباً تم کو یاد ہوگا کہ ہمارا پہلا آمنا سامنا کرنے میں ہوا تھا۔ اس روز تمہارا شوہر تمہارے ہمراہ نہ تھا۔ البتہ چند سہیلیاں تمہارے ہمراہ تھیں۔

عورت۔ ہاں خوب یاد ہے۔

مرد۔ ہمیں الفت کا دم بھرتے ایک مدت ہو گئی ہے مگر آج تک تمہارے شوہر کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔

عورت۔ پھر کیا چتون کروں؟

مرد۔ پچھلے دنوں تم نے ایک کرسچن جوان کی تصویر دے کر کہا تھا کہ یہ تصویر میرے شوہر کی ہے۔ میں نے اُس تصویر کی تعریف ان لفظوں میں کی تھی:-

بال دھواں دھار ہیں۔ بروئے شمشیر بر ہنہ ہیں۔ کٹورا سی آنکھیں ہیں۔ واسا منہ ہے۔ چاند سا ماتھا ہے۔ گردن کا ڈورا دام محبت ہے۔ کرچھتے کی ہے۔ غرض بدن سانچے میں ڈھلا اور کلک صانع سے بنا ہوا ہے

عورت۔ مجھے یاد پڑتا ہے۔

مرد۔ قسم ہے کہ اُس رات میری آنکھ لگی تو کیا کہ میں اُن دونوں تم پر ہزار جان سے فدا ہوا۔ بار بار اُٹھ اُٹھ کر آئینہ میں اپنی شکل و صورت کا مقابلہ اس تصویر سے کرتا تھا مگر کچھ قبول صورت انسان اور کچھ حسن کی ایک منہ بولتی تصویر۔ اس احساس نے مجھے تڑپا دیا اور میں نے تین بجے کا ارادہ کر لیا۔

عورت۔ میں اس تغیر کو دیکھ رہی ہوں۔

مرد۔ پھر مجھے اس خیال نے ڈھارس بندھائی کہ شاید تمہارا شوہر کوئی گاؤدی اور گنگلا ہے جو تم نے اُس سے مُنہ موڑ کر مجھے محبت کے لئے تاکا ہے۔ جب تصویر پر پھر نظر ڈالی تو یہ سمان و گمان بھی جاتا رہا۔ اس حقیقت و آگاہی نے میرا طوطا بولنا بند کر دیا۔

عورت۔ میں بھانپ گئی تھی۔

مرد۔ تمہارا دل موہ لینے کے لئے میں قیمتی لباس میں ملبوس ہو کر بہترین وضع میں تم سے ملنے لگا۔

عورت۔ میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں۔

مرد۔ میں اُن دنوں تمہاری ات گت محبت میں اندھا ہو رہا تھا۔ جب تمہارا شوہر ہفتہ بھر کے لئے دہلی گیا تھا تو میں پل بھر تم سے جدا نہ ہوا تھا۔

عورت۔ ہاں وہ دہلی گیا تھا۔

مرد۔ میں نے اُس کی واپسی پر اُسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر تم نے مجھے روک دیا تھا۔ غالباً دوسری بار پھر میں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی مگر تم نے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا۔ پھر یہ واقعہ پیش آیا . . .

عورت۔ کون؟

مرد۔ لو سنو! ——— ایک روز دوپہر کو میرے ہاں تم نے اپنی ماں کو

ایک خط لکھا تھا۔ جس میں مذکور تھا کہ رات کو میں اپنے شوہر کے ہمراہ تماشہ دیکھنے جاؤں گی۔ راستہ میں تمہیں بھی اپنے ہمراہ لے جاؤں گی۔ یہ خط تم بٹوے میں رکھنا بھول گئی تھیں۔ اتفاق سے میں نے خط کو پڑھ لیا تھا۔

عورت۔ واقعی خط میں بھول گئی تھی۔

مرد۔ موقع کو غنیمت جان کر میں تماشہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ وہاں تمہارے شوہر کو دیکھ لیا تھا۔

عورت۔ اچھا۔

مرد۔ کیا اسی بدصورت شوہر پر ناز تھا؟

عورت۔ اجی تمہیں اس سے کیا ——— چپ رہو!

مرد۔ خدا کے واسطے جھوٹ نہ بولو۔ تمہارا مبتذل شوہر تو کوئی مسخرہ پن کا ہے۔

عورت۔ بھلا تمہیں بات میں فی نکالنے سے کیا حاصل ہو رہا ہے؟ کیوں دل دکھاتے ہو؟

مرد۔ پھر مجھے باتوں میں اڑانے لگی ہو! بوڑھا گھاگ یقیناً تمہارا شوہر تھا۔

عورت۔ وہ میرا شوہر نہ تھا۔

مرد۔ اب تو بات کھل گئی ہے۔ میں تمہارے شوہر کا گھر گھاٹ، ٹھور ٹھکانا اور آگا تاگا لے چکا ہوں۔

عورت۔ اچھا وہ میرا شوہر تھا۔

مرد۔ پھر مجھ سے یہ فریب کیوں کھیلا تھا ——— تصویر کس کی تھی؟

عورت۔ میں نے دل میں کہتی ہوئی ضد کی تھی۔

مرد۔ (غصہ کو ہوکر) کس لئے؟

عورت۔ تمہاری آتش شوق کو ٹھنڈا کرنے کے لئے، تاکہ تم موقع پاکر میرے شوہر کو دیکھ لو۔ تمہاری لگی کو بجھانے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا ——— وہ آندھی جو مجھے چڑھی ہوئی تھی اُتر چکی تھی اور میں تعلقات کا رشتہ توڑنا چاہتی تھی کیونکہ میں ہر جائی ہوں۔

مرد۔ توبہ! ——— اب کیا ارادہ ہے؟

عورت۔ میں کسی اور مرد کے ساتھ فریب کھیلنا چاہتی ہوں۔ خفا نہ ہونا، مرد اسی سلوک کے مستحق ہیں۔ خدا حافظ!

——— الوداع!!

[مرد حیرت و استعجاب کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے اور عورت دائیں ہاتھ کا راستہ لے کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے]

(رومانیہ)

صادق ایوبی

فردوسِ خیال

مرحبا اے دل! کہ وہ جانِ بہار آ ہی گیا
جس حیات افروز کا تھا انتظار آ ہی گیا

اک جہانِ رنگ و بُو بر دوش ہے مستِ شباب
ہے جلو میں زندگی، رعنائیاں ہیں ہمرکاب

نوجوانی، جوش اور مستی شرابِ حسن کی
حل ہوئے سیماب میں تو یہ قیامت ڈھل گئی

حشر برپا کر رہا ہے آج یہ مستِ خرام
ہو نہ جائے منتشر ربطِ عناصر کا نظام

موجزن ہے ہر طرف عالم میں طوفانِ حیات
نشۂ عیش و طرب میں جھومتی ہے کائنات

فیضِ موسم ہے کہ داغِ دل فروزاں ہو گئے
تارِ دامن روکشِ تارِ رگِ جاں ہو گئے

دل کی یہ حالت کہ سازِ نغمۂ بے تاب ہے
جنبشِ موجِ نفس بھی جنبشِ مضراب ہے

اس نگاہِ فتنہ زا کی برق پاشی الاماں!
خون کے بدلے رگوں میں کوندتی ہیں بجلیاں

چہرۂ گلگوں پہ ہے چینِ جبیں کا پیچ و تاب
یا شفق کے جال میں الجھی شعاعِ آفتاب

مدبھری آنکھوں میں یوں کیفِ شرابِ لالہ فام
شوخیِ رفتارِ ساقی جیسے چھلکاتی ہے جام

مسکرانے میں لبوں پر عکسِ دنداں ضوفگن
چومتی ہے منہ کلی کا چاند کی خنچل کرن

اک نظر دیکھے تو دم لعلِ بدخشاں چھوڑ دے
ہونٹ، جیسے بارِ شبنم، گل کی پتی توڑ دے

خوش خرامی پر ہوئی موجِ صبا دل سے نثار
پانی پانی ہو رہا ہے شرم سے ابرِ بہار

ہے تری رفتار موجِ قلزمِ طوفانِ حُسن
ہاں! ڈبو دے مجھ کو بھی اے بحرِ بے پایانِ حُسن

دور آنکھوں سے رہا گر آئینہ تو کیا ہوا!
تجھ میں اپنا عکس دیکھوں اس قدر نزدیک آ!

وہ ہمنا تقدیر پر چکی، کارگر آہیں ہوئیں
عشق کے شانوں کی زینت حسن کی باہیں ہوئیں

کر چکا آرائشِ منزل فریبِ جستجو
اک طلسمِ خواب تھی یہ کائناتِ رنگ و بو

ظلمتِ شب میں سرابِ آرزو روپوش ہے
میں نے پا کر کھو دیا کچھ، صرف اتنا ہوش ہے

سکندر علی وجد

ٹالسٹائے کا مذہب

ٹالسٹائے عمر کے آخری سالوں میں فلسفیانہ، معاشرتی اور مذہبی مسائل کی طرف زیادہ راغب ہو گیا تھا۔ ۱۸۷۹ء کے بعد اس کی تمام تصانیف میں ان مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس نے اپنی کتاب (My Confession) میں اپنے مذہبی تجربات کے مختلف مدارج کو بیان کیا ہے جن میں سے گزر کر وہ بالآخر یہ کتاب ۱۸۷۹ء میں جینوا میں شائع ہوئی تھی۔ ٹالسٹائے اپنے Confession میں اپنی گزشتہ تصنیفات کی حقیقت کچھ طور پر بیان کرتا ہے۔ یہ اس سوال کا ایجاب ہے کہ مذہب کی مقدس فطرت کو جب دوسرے بیرونی لوازم سے علیحدہ کیا جاتا ہے تو یہ زندگی کا ایک قیمتی جزو بن جاتا ہے۔ ذیل میں ہم اس کتاب کا لب لباب قارئینِ ادبی دنیا کے پیش کرتے ہیں۔ ر۔ م۔ ن۔

اگرچہ میری تعلیم و تربیت ایک نہایت ہی راسخ الاعتقاد عیسائی گھرانے میں ہوئی تھی۔ لیکن جب میں اٹھارہ برس کی عمر میں یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوا تو مذہب کے متعلق جو کچھ بھی مجھے بتایا گیا تھا میں نے اس پر اعتقاد رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مذہبی تعلیم سے مجھے شروع ہی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے نہ صرف دعا کرنا ہی ترک کیا بلکہ گرجا میں جانا اور روزے رکھنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب باوجود خدا کی ہستی کا قائل ہونے کے میرے دل میں خدا کی حقیقت اور یسوع مسیح کی تعلیم کے متعلق کوئی خیال پیدا نہ ہوتا تھا۔

جب میرے دل میں نیک اور پاک طینت بننے کے لئے کوئی خیال پیدا ہوا اور اس کا اظہار کیا گیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگ مجھے مذہبی اور متکبر کا ہدف بنا رہے ہیں۔ لیکن برعکس اس کے میرے برے کاموں کا نتیجہ میری شہرت کی صورت میں نمودار ہوا۔

اب بیک میں اپنی گزشتہ زندگی پر ایک عمیق نظر ڈالتا ہوں تو ایک نامعلوم خوف سے تھرا اٹھتا ہوں۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب میں میدانِ جنگ میں بے گناہ لوگوں کے قتل، قمار بازی، کمر و فریب اور عورتوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی کے لٹانے کا سبب بنا ہوا تھا۔ یہ سلسلہ دس سال تک جاری رہا اس کے بعد میں تالیف و تصنیف کی طرف رجوع ہوا لیکن اس پیشے کا مقصد میرے سامنے کمینگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کیونکہ میرا مدعا دولت اکٹھی کرنا اور خوشامد پسندی تھا۔

میری آرزوؤں کا قابلِ قدر صلہ مجھے اُس وقت ملا جب میں چھبیس سال کی عمر میں سینٹ پیٹرزبرگ گیا اور وہاں کے شہرۂ آفاق مصنفین نے میرے ادبی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے میرا پُرمسرت استقبال کیا۔ وہ خزاں جنگ جس کے متعلق رزم گاہ سے واپس آکر میں نے بہت کچھ لکھا تھا ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ خواص (Intellegentia) میں یہ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ مصنفوں، فلسفیوں اور شاعروں کا فرض صرف پیغام دینا ہے۔ ان کا یہ فرض اُن پر اس لئے عاید نہیں ہوتا کہ وہ جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ اُن میں یہ صلاحیت فطرتی ہے۔ میں نے اس فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے ایک شاعر اور فنانی کی حیثیت سے بہت کچھ لکھا اور اُس کا پرچار کیا لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ کیا تھا۔ میری قلمی کاوشوں کا مجھے شاندار معاوضہ ملا اور تین سال تک میں دل کھول کر عیش و عشرت میں مشغول رہا۔

اس طرح میں علم و ادب کے درخشندہ ستاروں میں شمار ہونے لگا اور ایک طویل مدت تک میں ادبی عقیدہ کی صحت میں مجھے کوئی شک نہ ہوا لیکن جب اس تگ و دو میں تین سال گذر گئے تو میرے دل و دماغ پر مہیب شک کی طاری ہونے لگے۔ مجھے اس نظریے کی بنیادیں متزلزل معلوم ہونے لگیں۔ اس اصول کے پیروؤں میں اختلاف تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دھوکا دینے، اگاتی گلوچ اور لڑائی جھگڑنے میں مصروف رہتے تھے۔ اُن میں سے بہت سے ایسے تھے جو پرلے درجے کے لالچی اور بداخلاق تھے۔ مجھے اپنی ذات اور دوسرے انسانوں سے نفرت ہونے لگی۔ اب

میری غلطی یہ تھی کہ اگرچہ میری آنکھیں میرے اپنے رہنے کی خامیوں کو دیکھ رہی تھیں لیکن پھر بھی میں اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ میں اپنے خیال میں ایک شاعر، فلسفی اور معلم کی حیثیت سے دوسروں کو پیغام دے رہا تھا خواہ اس پیغام کی حقیقت کو میں خود بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس طرح علم و ادب کے ساتھ میرے تعلقات نے میرے گناہوں میں ایک اور قصور کا اضافہ کیا میں جب زندگی کے اس دور پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ میری ایک طرح کی دیوانگی کا زمانہ تھا۔ ہم میں سے سینکڑوں لوگوں کو پیغام مل رہے تھے جب کہ ہماری اپنی قلمیں کھس میں ایک دوسرے کے خلاف زہر اگل رہی تھیں۔ چونکہ ہم بے عمل تھے اس لئے ہمارا پیغام لوگوں پر کوئی اثر نہ کر سکا۔ تاہم تمام دوس میں ہماری تصنیفات کا ایک سیلاب امنڈ آیا لیکن ہمیں اس بات سے بہت اذیت ہوئی کہ ہماری چیخ پکار صدا بصحرا ہو کر رہ گئی ہے۔

(۲)

میں شادی کرنے سے قبل تمام یورپ کی سیاحت کے لئے نکلا۔ میرے دل میں تمام فنون کی تکمیل کا از حد شوق تھا۔ کیونکہ اُس زمانے میں خواص کے نزدیک یہ مسئلہ بہت اہمیت رکھتا تھا۔ متمدن طبقات "ترقی" (Progress) کے نظریے کے بہت حامی تھے اگرچہ یہ اصطلاح مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف معنی کی حامل تھی۔ دورانِ سفر میں جب میں نے پیرس میں ایک شخص کو پھانسی کے تختے پر لٹکتے دیکھا تو میں بہت خوف زدہ ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ غلطی اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئی جو "انسانی خرد" کے اساس میں مستور تھی۔ اُس وقت میں نے محسوس کیا کہ نظریۂ تمدن "کی حقیقت ایک دھوکے سے بڑھ کر نہیں ہے۔ میرے اس خیال کو میرے بھائی کی موت کے المناک حادثے سے اور بھی تقویت پہنچی جو ایک سال تک بیمار رہنے کے بعد اس دنیائے فانی سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گیا۔

میرا بھائی ایک نہایت ہی پاک طینت، صاحبِ خرد اور سنجیدہ نوجوان تھا۔ لیکن وہ اس دنیا سے اس بات کے جاننے کے فقیر ہی چل بسا کہ اُس کا دنیا میں آنے کا مقصد کیا تھا اور اس کی موت میں کیا راز پوشیدہ ہے۔ مجھے اس ٹریجیڈی کے پیشِ نظر تمام نظریے بے وقعت اور بے فایدہ معلوم ہونے لگے تھے۔ روس میں واپس آکر میں نے اپنے دیہاتی مکان میں رہائش اختیار کی اور کسانوں کے لئے درسگاہیں منظم کرنے کا کام شروع کیا۔ میں اپنی اس نئی سعی میں حقیقی جوش و خروش محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ میں ابھی تک بڑی حد تک تمدن کے عروج کے لئے ترقی کو ضروری سمجھتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اگرچہ بڑے متمدن اشخاص کی تعلیم اور خیالات مختلف ہیں اور وہ کسی ایک نقطہ پر بھی متفق نہیں تاہم کسانوں کے بچوں کی تعلیم کی صورت میں اس مشکل کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ ان کی پسند کے مطابق ان کو تعلیم دی جائے۔

میں نے اپنے اختیار کے ذریعے عوام کو ان لوگوں کے مضر نظریوں سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے پھر بھی کامیاب قلب حاصل نہ ہوئی میرے دل کو زیادہ ہی زیادہ اذیت پہنچتی گئی۔ یہاں تک کہ پریشان کن خیالات نے میری دماغی طاقتوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ میں زیادہ تر گھوڑی کے دودھ اور سادہ زندگی کی تلاش میں سٹیپ (Steppe) کے میدانوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ جاگیر میں تھوڑا عرصہ قیام کے بعد میں نے شادی کر لی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میں اپنے بال بچوں اور بیوی کے آرام و آسائش کے لئے خوشی سے کوشاں رہا۔ پندرہ سال تک "انفرادی تکمیل" کے پرانے خیال کو بھول کر فارغ البال خانگی زندگی بسر کی۔ کیونکہ بال بچوں کی فلاح و بہبود کے خیال نے اس خواہش کی جگہ لے لی تھی۔

لیکن اس دوران میں بھی میں نے تالیف و تصنیف کا کام جاری رکھا جس سے مجھے کافی دولت اور شہرت حاصل ہوئی۔ اس دور میں جو کچھ میں نے لکھا اُس میں اُس خیال کا پرچار کیا جو میرے نزدیک "واحد صداقت" تھا۔ کہ ہماری حیات کا مقصد اپنی خوشی اور اپنے خاندان کی راحت حاصل کرنا ہے۔

لیکن یہ خوشی بھی میرے لئے کوئی ابدی خوشی ثابت نہ ہوئی۔ بلکہ آج سے پانچ سال پہلے مجھے پھر وہی غمی پریشانی کا شکار ہونا پڑا۔ میں نا امید ہو گیا۔ میری پریشانی بڑھتی گئی "کیوں" اور اس کے بعد "کیا" کے پریشان کن سوالات نے میری دماغی طاقتوں کو بہت اذیت پہنچائی۔ ان سوالات نے بتدریج ایک خاص شکل اختیار کر لی۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا "میرے پاس حکومت سمارا میں چھ ہزار ایکڑ زمین ہے، وزلین سو گھوڑے ہیں۔ لیکن پھر کیا؟" باوجود سخت کوشش کے اس سوال کا جواب مجھے نہ مل سکا میرے نزدیک اب زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ یہ ایک بے حقیقت چیز تھی۔ میں ایک تندرست اور فارغ البال آدمی تھا لیکن پھر بھی زندگی مجھے ایک بے مقصد چیز نظر آتی تھی۔ مجھے اکثر خودکشی کا خیال پریشان رکھتا تھا اگرچہ میرا اس جرم کے مرتکب ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

(۳)

جب میں نے عمر کے پچاسویں سال میں قدم رکھا تو "زندگی کیا ہے؟" کے سوال نے مجھے بہت مایوس کر دیا تھا۔ اس مرکزی سوال کے گرد اور بہت سے خلک و شبہات جمع ہو گئے۔ "میرے زندہ رہنے کا کیا مقصد ہے؟" "مجھے کوئی کام کیوں کرنا چاہئے؟" "کیا زندگی میں کوئی ایسی خصوصیت ہے جو موت پر قابو پا سکے؟" یہ تھے سوالات جن کا باوجود سخت تحقیق و تدقیق کے مجھ پر کوئی راز نہ کھل سکا۔ اگر مجھے کچھ معلوم ہوا تو صرف یہ کہ انسانی دماغ ان مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ نہ صرف حضرت سلیمان ہی نے زندگی سے نفرت کا اعلان کیا اور کہا کہ تمام دنیوی چیزیں روح کی تکلیف کا باعث ہیں بلکہ ہندوستانی، بدھی سائیہ مئی بھی پکار اٹھا کہ حیات ایک بڑی "بدی" ہے۔ سقراط اور شوپنہار ان سے بھی ایک قدم آگے بڑھے اور کہا کہ صرف "فنا" ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے ہر ذی بشر کو آرزو مند رہنا چاہئے۔ لیکن نہ ان بڑے فلسفیوں کے خیالات نے اور نہ میری اپنی عقل نے مجھے اپنے آپ کو تباہ کرنے پر آمادہ کیا۔ کیونکہ عین اس کشمکش میں ایک اندرونی آواز نے مجھے "زندگی کے وجود" سے آگاہ کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ اس خیال نے میری مایوسی کو دبا کر مجھے روح کی تکلیف سے چھڑایا۔ میں نے محسوس کیا کہ زندگی کا مطالعہ کرنے اور اس کا مقصد سمجھنے کے لئے مجھے اپنے طبقے کے لوگوں کو چھوڑ کر کروڑوں عوام میں خلط ملط ہونا پڑے گا۔ کیونکہ میرے نزدیک زندگی کا صحیح مطالعہ صرف اس صورت میں کیا جا سکتا ہے جس صورت میں وہ عوام کے درمیان ہے۔ میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ علم جو دلائل پر مبنی ہے اور جس کا متمدن لوگوں میں چرچا ہے وہ زندگی کے سربستہ راز کا انکشاف کرنے سے قاصر ہے۔ برخلاف اس کے عوام میں حیات کا ایک غیر مدلل احساس ہے جو حیات کے اعلیٰ ترین مقاصد سے ہمیں آشنا کرتا ہے

یہی غیر مدلل علم و عقیدہ تھا جس کو میں ناکارہ سمجھ رہا تھا۔ ایک خدا میں تین خداؤں کا تصور، شیطانوں، عفریتوں، بھوتوں اور فرشتوں کی پیدائش میں اعتقاد رکھنا ایک ایسی چیز تھی جس کو میں نہ دیکھ سکتا تھا نہ سمجھ سکتا تھا یہ چیزیں سراسر خلاف عقل معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے سخت مایوسی کی حالت میں سوچنا شروع کیا کہ شاید میں جن چیزوں کو معقول سمجھ رہا ہوں وہ ایسی نہ ہوں جیسا کہ مجھے دکھائی دیتی ہیں اور جن چیزوں کو خلاف عقل تصور کر رہا ہوں وہ بھی حقیقت میں ایسی نہ ہوں۔

اب میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ علمی تحقیق میرے سوالات کا جواب دینے سے عاجز ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ مذہب خلاف عقل جوابات دے رہا ہے۔ لیکن یہ جوابات یقیناً ایک اہم مسئلہ کو حل کر رہے ہیں۔ انہوں نے کم از کم میرے لئے "محدود" کا تعلق "غیر محدود" سے منکشف کر دیا۔

مذہب کیا ہے؟ یہ صرف خدا اور غیبی طاقتوں میں انسانی اعتقاد کا نام نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کے مقاصد کا سمجھنا ہے۔ یہ زندگی کی طاقت ہے میں نے اس درجے پر پہنچ کر سمجھنا شروع کیا کہ انسانی عقل کے عمیق ترین ماخذ کا پتہ ان جوابات میں مل سکتا ہے جو مذہب نے پیش کئے ہیں۔ مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ ان کے خلاف علم بغاوت بلند کروں کیونکہ صرف وہی زندگی کے پیچیدہ مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔

(۴)

لیکن پھر بھی مجھے گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ میرا دل معرفت کے نور سے روشن نہ ہو سکا۔ میں نے بدھ مذہب، اسلام اور عیسائیت کی مقدس کتب کو پڑھا۔ مذہبی پیشواؤں، راہبوں اور صوفیوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جو صرف خدا کو ہی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ تم اپنے اعتقادات کی روشنی میں زندگی کی تعبیر کیسے کرو گے؟ لیکن میں ان میں سے کسی ایک کے عقیدے کا بھی پیرو نہ ہو سکا کیونکہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان میں سے ایک نے بھی مسئلہ حیات کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس طرح ایک دفعہ پھر مایوسی کا مہیب احساس میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔

ان اشخاص کا عقیدہ مجھے اپنی طرف نہ کھینچ سکا جو ان اصولوں میں مخلص نہ تھے جن کا وہ پرچار کرتے تھے۔ یہ محسوس کر کے کہ وہ علم پر عمل نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور وہ بھی میری طرح نفسانی خواہشات کے غلام ہیں مجھے سخت رنج ہوا۔ میں ان کی طرف سے منہ موڑ کر سادہ دل غربا، کسانوں، جاتریوں اور تارک الدنیا لوگوں کے قریب زندگی کی تلاش میں پہنچ آیا۔

جتنا زیادہ میں سادہ عوام کی زندگیوں کو سمجھتا گیا۔ اتنا ہی زیادہ میں ان کے اعتقادات کا گرویدہ ہوتا گیا، اور یہی مذہبی حقیقت میں نے ان کے لئے اشد ضروری خیال کی۔ کیونکہ یہی دلیل بازی سے پاکیزہ

مذہب وہ چیز تھی جو زندگی کے معنی کو تفصیل سے بیان کر سکتی تھی اور دنیا کو ایک بہشت کی صورت میں پیش کر سکتی تھی۔ جو کچھ میں نے اس پس ماندہ طبقے میں دیکھا وہ میرے اپنے طبقے کے لوگوں کے افعال و اعمال کے بالکل برعکس تھا۔ میرے طبقے میں مذہب کے بغیر زندگی کا امکان تھا۔ یہاں ہزاروں مبہلغوں اور واعظوں میں ایک بھی صحیح راستہ پر نہ تھا۔ حالانکہ مزدور جماعتوں میں ہزاروں میں ایک بھی ملحد نہ تھا۔

جتنا زیادہ میں ان مخلص لوگوں کے قریب تر ہوتا گیا اتنا ہی زیادہ میں اُن کو پسند کرنے لگا۔ مجھے حقیقی معنوں میں زندہ رہنا آسان معلوم ہونے لگا۔ دو سال تک میں اُن کے فیض میں رہا۔ مجھے اپنی متمول اور متمدن جماعت کی زندگی بری معلوم ہونے لگی۔ یہ مجھے بچوں کے خالی کھلونوں کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ برخلاف اس کے مزدور جماعتوں کی زندگی اپنی صحیح اور اصلی صورت میں مجھے نظر آنے لگی۔

اب میں سمجھنے لگا کہ میں نے حیات کے مقاصد سمجھنے میں کہاں کہاں غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں نے زندگی کے متعلق سوال کے جواب میں اپنی زندگی کو پیش کیا نہ کہ عوام کی زندگی کو۔ میری زندگی میری نفسانی خواہشات کی غلامی میں گزری تھی۔ یہ بے معنی اور بے مقصد تھی۔ اس لئے ایسا جواب زندگی کے مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے دوسروں کی کبھی مدد نہ کی تھی۔ پورے تیس سال تک میری زندگی مزدوروں کے خون پر پرورش پاتی رہی۔ میں تصدیحیات سے ناواقف رہنے پر قانع رہا۔

کائنات کے پس پردہ ایک زبردست طاقت کام کرتی ہے۔ یہی طاقت کائناتی زندگی کا ماخذ ہے۔ اسی بڑی طاقت کے سمجھنے کے لئے ہمیں بغیر کسی حیل و حجت کے اُس کے تابع فرمان ہونا چاہئے۔ مزدور اپنے مالکوں کے خلاف کوئی شکوہ شکایت نہیں کر سکتے۔ جب مالک اُن کی مرضی کے مطابق اُن سے سلوک کرتے ہیں اگرچہ ہم اُن کو درندوں سے تشبیہ دینے کے عادی ہیں۔ برخلاف اس کے ہم جو اپنے آپ کو صاحب خرد سمجھتے ہیں اور اپنے مالک کی پیدا کردہ اشیا کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں کبھی اُن فرائض کو خوشی سے سرانجام نہیں دیتے جو اُس نے ہم پر عاید کئے ہیں۔ ہم ان فرائض کی انجام دہی کو احمقانہ حرکت تصور کرتے ہیں۔ ہماری ایسی حرکت کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ یہ کہ یا ہمارا مالک بے وقوف ہے یا ہمارا کوئی مالک ہی نہیں۔

(۵)

خیالات کی اس ادھیڑبن کے بعد میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ دلائل پر مبنی علم غلطی کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ کہ صداقت کا علم صرف سادہ اور بے عیب زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ مجھے اب بھیڑیوں کی سی زندگی کے بجائے ایک حقیقی زندگی کا متلاشی ہونا چاہئے اور یہ کہ زندگی کے معنی صرف اس صورت میں سمجھے جا سکتے ہیں کہ بڑے انسانی قبیلہ (Great Human Community) کی مجموعی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے۔

اِن تمام تجربات اور مشاہدات کے دوران میں میرے دل کے احساسات ایک اندرونی درد کے ساتھ گھل مل گئے۔ اس تجربے کو میں صرف اس صورت میں الفاظ کا لباس پہنا سکتا ہوں کہ یہ خدا کی تلاش تھی۔ یہ تلاش ایک جذبہ تھا نہ کہ علمی تحقیق۔ یہ وہ جذبہ تھا جو میرے دل کی گہرائیوں سے نکلا تھا اور جو میرے سوچ بچار کے طریقے کے بالکل برعکس تھا۔

کانٹ خدا کی ہستی کو ثابت کرنے سے قاصر رہا۔ لیکن پھر بھی مجھے اپنے گوہرِ مقصود کے ہاتھ آنے کی امید تھی۔ میں ابھی تک دعاؤں میں اس کو مخاطب کرتا تھا ــــ لیکن پھر بھی میں نے اُس کو نہ پایا جس کا میں متلاشی تھا۔

اکثر اوقات میں کانٹ اور شوپنہار کے فلسفہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا تھا اور دلائل پیش کرتا تھا کہ علت و معلول کا اُس سلسلے سے کوئی تعلق نہیں جس سے زمان و مکان اور خیال کا تعلق ہے۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میں کم از کم عدم سے معرض وجود میں آیا تو اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے اور یہی سبب تمام اسباب کا سبب ہے۔ بڑے غور و خوض کے بعد آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام کائنات کا سبب وہی مبدءِ حقیقی ہے جسے لوگ خدا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مجھے ایک بالاتر قوت کی ہستی کا براہِ راست پتہ چلا جس نے مجھ میں زندگی کے امکان کا احساس پیدا کیا۔ میں نے اپنے دل سے سوال کیا "یہ سبب کیا ہے؟ اور میرا تعلق اس سبب سے کیا ہے جسے میں خدا کے نام سے پکارتا ہوں؟" میرے اس سوال کا جواب مجھے وہی پرانا آشنا جواب ملا کہ خدا تمام کائنات کا پیدا کرنے والا ہے اور نظام کی پرورش کرنے والا ہے لیکن یہ جواب پہلی طرح مجھے اب بھی کوئی تسلی نہ دے سکا میں غیر مطمئن اور خوف

رہا جتنی زیادہ میں نے دعا میں مانگیں اتنا ہی زیادہ مجھے یقین ہوا کہ میری آہ و فریاد کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔

لیکن یہ خیال بار بار میرے دل میں پیدا ہوتا رہا کہ جس طاقت نے مجھے اس دنیا میں بھیجا ہے اس کا ایسا کرنے میں کوئی نہ کوئی مطلب ضرور ہے۔ اس طرح خدا کی ہستی کا قائل ہونے کے بعد مجھے اس کے ساتھ اپنے تعلقات کی کھوج ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہ اپنے بیٹے (یسوع مسیح) کے ذریعے ہماری التجائیں سنتا ہے۔ لیکن یہ عقیدہ ہی مجھے اپنی ذات اور دنیا سے بیحد دور اور الگ تھلگ نظر آیا اور یہ خدا پگھلتی ہوئی برف کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے مٹ گیا۔ ایک دفعہ پھر میں مایوسی کے بے پایاں سمندر میں مخالف ہواؤں کے تھپیڑوں کا شکار بنا۔

اس طرح مدت تک میں کبھی مایوس اور کبھی مسرور ہوتا رہا یہاں تک کہ ایک دفعہ جب میں ایک سنسان جنگل میں آوازیں سن رہا تھا اور چاروں طرف سناٹے کا عالم طاری تھا۔ ابتداء بہار کے اُس دن جب میں اپنے خیالات کی دنیا میں خدا کی تلاش کر رہا تھا اچانک روحانی مسرت کے ایک چمکارے نے میرے دل کو منور کر دیا۔ اس وقت میں نے کبھی کہ خدا کا خیال "خدا کی ذات" نہیں تھا میں نے محسوس کیا کہ میں صرف خدا کا حقیقی پرستار بن کر ہی حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔

خدا زندگی ہے۔

دنیا میں رہنے کا مقصد صرف خدا کی تلاش ہے۔ زندگی کا امکان خدا کے بغیر ناممکن ہے۔ اس وقت جو سوز میرے دل میں چمکا وہ مجھ سے کبھی جدا نہ ہوا۔ میں نے اپنے طبقے کی زندگی سے نفرت کا اظہار کیا۔ کیونکہ یہ بے حقیقت تھی اور اس کے افراد کی حد سے بڑھی ہوئی عیاشی نے زندگی کے مقصد کو کچھ نہایت مشکل بنا دیا تھا۔ میرے ارد گرد کے سادہ لوگ، اور مزدور جماعتیں ہی اصلی روسی قوم تھے انہوں نے مجھے زندگی کے معنی راعی ترین مقصد سے آشنا کر دیا۔ یہ معنی الفاظ کی صورت میں اس طرح بیان کئے جا سکتے ہیں۔

ہم میں سے ہر ایک کو خدا اس طریقے سے پیدا کرتا ہے کہ گویا انسان چاہے تو اپنی روح کو ضائع کر دے یا بچا لے۔ اگر وہ اپنی روح کو بچانا چاہتا ہے تو خدا کے احکام پر عمل کرے اور عجز و خیرات اور صبر و قناعت کو اپنا شعار بنائے اور زندگی کی تمام دوسری چند روزہ خوشیوں کو ترک کر دے — یہ ہے عام لوگوں کے لئے تمام مذہبی نظام کا مطلب جو ان کو آبا و اجداد کی طرف سے ورثے میں ملا ہے۔

محمد یعقوب بی اے

غزل

بہت اغماض بھی اچھا نہیں ہے — ہمارا کوئی حق ہے یا نہیں ہے؟

ضرورت تھی کہ تو غافل نہ ہوتا — مگر تقدیر سے ایسا نہیں ہے

مٹانا ہے تو کوتاہی نہ فرما — سسکتا چھوڑنا اچھا نہیں ہے

کسی کو تیری نسبت کیا بتا دوں — یہ دیکھا ہے کہ کچھ دیکھا نہیں ہے

کبھی اپنے سلوکوں پر نظر کر — شکایت ہو تو کچھ بے جا نہیں ہے

نگاہ لطف کی تکلیف فرما — کہ ضبطِ شوق کا یارا نہیں ہے

تعلق جان کو آیا ہوا ہے — ترے ہوتے بھی صبر آتا نہیں ہے

کبھی وہ سنگدل تک مہرباں تھا — اور اب قسمت سے بھی لہنا نہیں ہے

ترے جاب اور یہ کس مپرسی — تجھے کیا واقعی پروا نہیں ہے

اِدھر بھی۔ اک نگاہ لطف ادھر بھی
غریب آزاد مستثنیٰ نہیں ہے

حکیم آزاد انصاری

رہزنی

وہ دِل، وہ ذوقِ شعر و نوا کون لے گیا
وہ دن، وہ جشنِ صبح و مسا کون لے گیا

رنگینیٔ بہار کا افسوں کدھر گیا
سرمستیٔ خرامِ صبا کون لے گیا

وہ پرتوِ شراب سے زائد حسیں نظر
اے ساقیٔ فسردہ نوا! کون لے گیا

وہ دل میں جذب ہوتا ہوا نطقِ جانفزا
اس نطقِ جاں فزا کا مزا کون لے گیا

میرے لبوں کی تشنہ مزاجی کدھر گئی
تیرے دہن کا آبِ بقا کون لے گیا

وہ رقصِ گرم جوش، وہ طوفانِ بے خودی
وہ انبساطِ لغزشِ پا کون لے گیا

وہ شغل جن پہ جنتیں قرباں، وہ واقعات
جن کا کوئی جواب نہ تھا، کون لے گیا

وہ سجدہ ہائے مست و دل آویز کیا ہوئے
وہ عرشِ دوست ذوقِ دعا کون لے گیا

وہ گرمیٔ نیازِ جنوں کا رکیا ہوئی
وہ حدّتِ خلوص و وفا کون لے گیا

اُس شوخ کے تلوّنِ دلکش کو کیا ہوا
کافر کی خوئے جور و جفا کون لے گیا

وہ رُت، وہ کائنات، وہ اسبابِ زندگی
وہ ہم نفس، وہ آب و ہوا کون لے گیا

دنیا سے کیا، خدا سے بھی پرہیز ہے عدمؔ
مت پوچھ ہوئے صبر و رضا کون لے گیا

عدمؔ

انتقام

میں ایک معمولی کاشتکار ہوں۔ میری عمر بیالیس برس کے لگ بھگ ہے انگلستان کے شمال میں ایک چھوٹا سا قصبہ مانچسٹر ہے جس میں تھوڑی سی زمین مجھے ورثہ کے طور پر ملی ہوئی ہے جو میرے گزارے کے لئے بہت مشکل سے کفائت کرتی ہے۔ یہ زمین پتھریلی ہے، زرخیز نہیں۔ اس لئے سخت محنت کرنے کے باوجود بھی پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔ میں نے چند ایک گائیں بھی رکھی ہوئی ہیں تاکہ ان کا دودھ بیچ کر اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکوں۔ مگر یہاں کے باشندے اور خاص طور پر ڈھور ڈنگر باندھنے کے کمرے ایسے بنے ہوئے ہیں کہ ہر سال مرمت طلب ہو جاتے ہیں۔ جس سے میری مالی مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ مگر پھر درویش برجان درویش جس طرح سے بھی ہوتا ہے۔ گزر اوقات کرتا ہوں۔

جب میں نے یہ کام سنبھالا تو میں جوان تھا۔ بدن میں طاقت و ہمت تھی۔ اس لئے صبح سے لے کر ستاروں کی روشنی تک میں اپنے کام میں مصروف رہتا۔ میرا بوڑھا باپ بھی کبھی کبھی میرے کاموں میں میرا ہاتھ بٹا دیتا۔ اتوار کا دن میرے لئے آرام کا دن ہوتا۔ میں گاؤں کے اس گرجا میں جاتا جہاں اور میرے جیسے غریب کاشتکار عبادت کے لئے جمع ہوتے۔ میری آواز میں ایک سحر تھا۔ دلکشی تھی۔ اس لئے میں گرجا کی گانے والی پارٹی کا ایک معزز ممبر تھا اور میں سے اپنے لئے ایک بہت بڑی عزت سمجھتا تھا۔

جب میں بائیس سال کا تھا تو میں نے ایک لڑکی سے شادی کر لی جس کا نام ایڈنا تھا۔ وہ بڑی پیاری لڑکی تھی۔ اس کی بھوری آنکھیں اور سیاہ بال بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اپنے سر کو ناز سے ایک طرف جنبش دے کر جن آنکھوں سے دیکھنا اس کا ایک خاص انداز تھا۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے خوبصورت چہرے پر چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے جس سے اس کے حسن میں اور اضافہ ہو جاتا۔

میں نے اُسے پہلی بار گرجا میں دیکھا۔ اور ایک ہی نظر میں دل دے بیٹھا۔ وہ مانچسٹر میں سیر و تفریح کے لئے اپنی سہیلیوں کے پاس آئی ہوئی تھی۔ میں جتنا وقت بھی اپنے کام میں سے بچا سکتا تھا بچاتا اور اُس کی صحبت میں گزارتا۔ اُسے بھی مجھ سے عشق ہو گیا تھا۔ میں ایک مضبوط۔ دراز قد اور خوبصورت بالوں والا لڑکا تھا۔ ایڈنا ہارمونیم بجاتی اور میں جذبات سے بھرے ہوئے محبت کے گیت گاتا۔ اور اس طرح ہم دونوں کچھ دیر کے لئے محبت کی ایک نئی دنیا بساتے اور اس کی بے پناہ وسعتوں میں اپنے آپ کو گم کر دیتے۔

ایک اُداس شام تھی۔ میں اور ایڈنا ایک باغ میں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے دن ایڈنا نے اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔ یہ خیال میرے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا۔ جدائی کا طویل زمانہ مستقبل کی تاریکیوں میں مل جل کر ایک مہیب ڈراؤنی شکل پیش کر رہا تھا۔ میں اپنے جذبات میں گم تھا۔ رات کی تاریکیاں آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں۔ اگست کا وسط تھا۔ پروانے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ باغ میں ہر طرف خاموشی تھی۔ مگر دور کوئی گا رہا تھا۔ دھیمی آواز تھی۔ دُکھ بھرا لہجہ تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں یہ محبت کا پُر درد گیت میرے جذبات کی دُنیا میں اور بھی تلخی بھر رہا تھا کہ یکایک ایک ستارہ آسمان سے ٹوٹا۔ ایڈنا کانپ گئی اور خوفزدہ حالت میں میرے قریب ہوتے ہوئے بولی "جہان! یہ بُری قسمت کی نشانی ہے"۔ میں نے اپنا بازو اُس کی کمر کے گرد ڈال دیا اور اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ ایک چھوٹی سی نرم و نازک گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے بالوں سے رات رانی کے کھلے ہوئے پھولوں کی سی خوشبو بکھری پڑتی تھی۔ "نہیں پیاری۔ دُور نہیں"۔ میں نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ مگر وہ اپنی ضد پر قائم تھی۔ کہنے لگی "نہیں جہان یہ بدنصیبی کی نشانی ہے۔ شاید ہم پھر کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں"۔

میرے لئے یہ ایک اشارہ تھا۔ میں نے کہا "ایڈنا اگر تم چاہو۔ تو ہم کبھی بھی جدا نہیں ہو سکتے۔ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔ کیا تم ایک کاشتکار کی بیوی بننا پسند کرو گی۔ پیاری ایڈنا میں تمہارے سوا کسی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا"۔

اُس نے اپنے بازو میری گردن کے گرد حمائل کر دیئے اور کہنے لگی "جہاں تم ہو گے وہاں صحرا بھی میرے لئے گلشن ہو گا۔ مگر دوسرے آدمی کے ساتھ مجھے ملاقات بھی سُونے نظر آئیں گے"۔ ان الفاظ سے میرے جسم میں خوشی و مسرت کی لہریں

ڈوبی گئیں۔ ستارے مسکراتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

ہوا درختوں میں سے رباب آسا نغمے بکھیرتی ہوئی جا رہی تھی اور میں زندگی کے سہانے خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر فراق کی تلخیاں ابھی میری قسمت میں لکھی تھیں۔ ایڈنا کے والدین مصر تھے کہ وہ ابھی شادی نہ کرے کیونکہ ابھی کمسن ہے۔ اس لئے وہ تمام سردیوں کا موسم میں نے ایڈنا کو لمبے محبت بھرے خطوط لکھنے میں گزارا اور جب اس کی یاد بہت ستاتی تو اس کے وہ مختصر سے خطوط جن کے لفظ لفظ سے شرم وحیا کے چشمے اُبلا کرتے تھے۔ میری تسکین کا باعث بنتے۔

موسم بہار کے آغاز میں اچانک میری والدہ کی موت واقع ہو گئی۔ ایڈنا نے جب یہ سنا تو اُس نے آکر ہمارے گھر کے کام کاج کو سنبھال لیا اور جون کے مہینے میں ہماری شادی ہو گئی۔ زمانہ گزرتا گیا۔ مجھے کھیتوں پر سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ لوگ اکثر کہتے کہ میں نے شادی کرنے میں غلطی کی ہے۔ مجھے کسی مضبوط جسم کی دیہاتی لڑکی سے شادی کرنی چاہئے تھی۔ جو میرے کاموں میں میری مدد کر سکتی۔ لیکن میرے دل میں میری نازک اور محبت سے بھری ہوئی ایڈنا کے خلاف خیال تک نہ گزرتا۔ اور میں دنیا کی مضبوط اور تندرست لڑکیاں اُس پر قربان کرنے کو تیار تھا۔ وہ کھانا بہت اچھا پکاتی تھی۔ گھر کو صاف اور ستھرا رکھتی اور میرے لئے گویا وہ سورج کی ایک سنہری کرن تھی جس سے میرے گھر کی تاریکیاں دُور ہوتی تھیں۔ اس طرح چند سال بڑے عیش و آرام سے گزرے۔ اب ہمارے ہاں بچہ پیدا ہونے کی توقع تھی۔ ایڈنا ہر وقت چھوٹے چھوٹے کپڑے سینے میں مشغول نظر آتی اور انہیں دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی۔

اس سال فصلیں بھی بہت اچھی تھیں اور ہمارے مویشی بھی خوب تیار تھے۔ ہر طرف سے زندگی اپنے بیش بہا تحائف ہمارے قدموں پر ڈالتی نظر آتی تھی۔ مگر آہ۔ یہ سب کچھ ایک سطحی سکون تھا۔ جس کے اندر ہزاروں طوفان چھپے ہوئے تھے۔

جولائی کا مہینہ تھا۔ میرے والد باہر کھیتوں میں گھاس کاٹنے کے لئے گئے۔ ایڈنا نے تھوڑے عرصے کے بعد ٹھنڈے پانی کا ایک برتن اُٹھایا اور انہیں پلانے کے لئے گئی۔ لیکن اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے میرے والد کو گھاس پر مُردہ پایا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ جس نے معائنہ کرنے کے بعد کہہ دیا کہ موت حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اور سخت دھوپ میں کام کرنا مرحوم کے لئے جان لیوا ثابت ہوا ہے میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے بعد کے تین دن کس طرح گزرے۔ ایک طرف میرے باپ کی لاش پڑی تھی اور دوسری طرف ایڈنا جسے ایک کمزور لڑکی وقت سے پہلے پیدا ہو گئی تھی۔ حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ میں اس وقت چوبیس سال کا تھا۔ لیکن ان تین دنوں نے مجھے بُوڑھا بنا دیا۔ میری بے پروا ہنسی اور گونجتے ہوئے قہقہے سب کافور ہو گئے۔ اور زندگی ایک معمّا بن کے رہ گئی۔

میری لڑکی نے چُوسنا پھینا شروع کر دیا۔ لیکن ایڈنا اس کے بعد تندرست نہ ہو سکی۔ اس کے اعضا میں خرابی پیدا ہو گئی۔ وہ تھوڑا سا لنگڑاتی تھی۔ اور ہر وقت ایک چھوٹی سی کرسی میں بیٹھی ہوئی سینے پرونے کے کام میں مصروف رہتی۔ ایڈنا کی ایک بوڑھی خالہ تھی جس کا نام ہلڈا تھا۔ وہ ان مصیبت کے ایام میں ہمارے ہاں آکر ٹھیر گئی اور گھر کا سارا انتظام اس نے اپنے ذمہ لے لیا۔ میری لڑکی روُت جب بارہ برس کی ہو گئی تو ایڈنا کو گٹھیا کا مرض ہو گیا۔ ہم نے اس کے لئے ایک کمرہ مخصوص کر دیا۔ جہاں وہ ہر وقت بستر پر پڑی رہتی۔ مہینوں گزرنے تک بستر سے نہ اٹھتی۔ عزیز و احباب کا وہ اب بھی تبسم سے استقبال کرتی۔ لیکن اس تبسم میں ہزارہا حسرتیں جھلکتی ہوئی نظر آتیں۔ میں اس کے پاس کمرے میں سوتا، تاکہ وہ مجھے فوراً ضرورت کے وقت آواز دے لے۔

جب اسے درد کا دورہ نہ ہوتا تو وہ پہیوں والی کرسی پر گھر کے صحن میں چکر لگایا کرتی۔ یہ سب کچھ زندگی کو بے کیف بنانے کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ لیکن ان دنوں کے سوا جب ایڈنا کو زیادہ تکلیف ہو جاتی۔ زندگی میرے لئے اتنی بے لطف نہ تھی۔ ہلڈا ایک خوش مزاج عورت تھی اور ہمارا بہت خیال رکھتی تھی۔ میں کاشتکاری بھی کرتا اور دودھ بھی بیچتا تاکہ گزارہ چلتا رہے۔ ان سب تکالیف کو دور کرنے والی اور مجھ میں برداشت کی طاقت پیدا کرنے والی میری لڑکی روُت تھی جس کی محبت میری زندگی کا سہارا تھی۔ وہ ستاروں بھرے آسمان کی طرح پیاری تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی تیتری تھی جو موسم بہار میں پھولوں کی آوارہ خوشبوؤں میں تیرتی پھر رہی ہو۔ جس کی ہستی مجسم محبت اور الفت ہو۔ میں نے آج تک ایسا کوئی انسان نہیں دیکھا جو روُت کی طرح محبت سے بھرا ہوا اور محبت کا پیاسا ہو۔ میری محبت اس کے ساتھ پرستش کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ وہ خوبصورت تھی خوش مزاج اور نیک لڑکی تھی اور اپنی ماں کی طرح چھوٹے سے قد کی تھی۔ مگر مضبوط اور طاقتور تھی۔ میں اسے ہر ایک قسم کا آرام تو نہیں دے سکتا تھا۔ مگر جہاں تک میرے محدود ذرائع مجھے اجازت دیتے اس کی کوئی خواہش رد نہ کرتا۔ جب وہ اپنے نرم و نازک بازوؤں سے میرے

تھے میں ڈال کر مجھے پیار سے دیکھتی تو مجھے اپنی قربانیوں کا صلہ مل جاتا۔ میں نے اسے سلوا جانے کے لئے ایک بائیسکل خرید دیا۔ وہ اچھے اچھے کپڑے پہننا پسند کرتی اور معمولی معمولی کپڑوں کو ہلڈا سے اس طریقہ پر سلواتی کہ وہ اس کے جسم پر بہت بھلے معلوم ہوتے

مگر کے دھندوں کے سوا مجھے دنیا میں صرف ایک دلچسپی تھی اور وہ بھی گرجا سے۔ میری آواز میں ابھی تک رس تھا۔ اونچ تھا اور جب میں گرجا میں گاتا تو میری لڑکی بڑے فخر سے میری طرف دیکھا کرتی۔ دوسرے لوگ بھی میری اس وجہ سے عزت کرتے اور اس طرح سے اگرچہ میں اس علاقے میں کوئی مشہور آدمی نہ تھا۔ مگر اپنے اس چھوٹے سے گرجے میں ضرور اہمیت رکھتا تھا۔

قرب و جوار کی بستیوں جب میری بیوی کی عبادت کے لئے آتیں تو اس کے لئے مختلف تحائف لاتیں اور مسٹر گرمل دکاندار تو مجھ پر بہت مہربان تھے۔ ایک دفعہ جبکہ مانچسٹر سے ایک ماہر ڈاکٹر میری بیوی کو دیکھنے کے لئے آئے تو ان کی فیس مسٹر گرمل نے اپنی جیب خاص سے ادا کی۔ اور اگرچہ میں نے اس رقم کو واپس بھی کیا مگر مسٹر گرمل نے اسے قبول نہیں کیا۔ مسٹر گرمل کے ایک لڑکا پال تھا۔ وہ ایک دراز قد اور خوبصورت نوجوان تھا۔ گاؤں کی تمام لڑکیاں اسے چاہتی تھیں۔ مگر اس کی نظر انتخاب روت پر پڑی اور وہ ہمارے کھیتوں میں اکثر اسے ملنے کے لئے آتا اور اپنی کار میں اسے سیر کے لئے ہمراہ لے جاتا۔ ایڈنا اور میں بہت خوش ہوتے۔ کیونکہ پال ایک شریف اور محنتی لڑکا تھا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا اور اس کا باپ اس کی تعلیم کے تمام مصارف برداشت کرنے کو تیار تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر روت اس سے شادی کرے تو اس کا مستقبل بہت شاندار ہوگا۔

ان واقعات کو ایک سال ہی گزرا ہوگا کہ مجھ پر ایک ایسا جنون طاری ہوا جس کے لئے میرے پاس کوئی وجہ نہیں۔ میری بیوی اگرچہ مدت سے مریضہ تھی۔ لیکن میں نے کبھی کسی غیر عورت پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ اگرچہ میں جوان تھا۔ لیکن سارا دن سخت کام کرنے اور ہر لمحہ گھر بار کی فکر نے میرے تمام جذبات کو دبا رکھا تھا۔ نیز مجھے اپنی لڑکی سے اتنی محبت تھی کہ مجھے کوئی عورت دلچسپ معلوم نہ ہوتی تھی۔ لیکن جب ان جذبات نے مجھ پر قبضہ کیا تو میں انہیں روکنے سے اتنا ہی مجبور تھا۔ جتنا کہ اپنے خون کی گردش کو اپنے جسم میں روکنے سے۔ اور سب سے زیادہ ندامت کی بات یہ ہے کہ اس واقعے میں جس لڑکی کا ذکر آئے گا۔ وہ اس رذیل اور پست طبقے سے تعلق رکھتی تھی جن کے گھروں کے نزدیک سے شریف آدمی گزرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ تقریباً روت کی ہم عمر تھی۔ اس لڑکی کا نام لارا گلڈنگ تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ ماں کا میٹی پر کوئی دباؤ نہیں تھا۔ اس لئے لڑکی آزاد اور آوارہ ہو گئی تھی۔ میں نے کبھی اس لڑکی کو دیکھا تک نہیں تھا۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ اس نام کی کوئی لڑکی اس گاؤں میں رہتی ہے۔

اپریل کی ایک صبح تھی۔ میں اپنی چھوٹی سی کار میں حسب معمول خریداروں کو گاؤں میں دودھ دینے کے لئے روانہ ہوا۔ مطلع صاف تھا۔ ہوا خوشگوار تھی۔ درخت سیاہ پوش ہو رہے تھے۔ فضا مسرور نظر آ رہی تھی۔ ایسے سمے میں میرا دل بھی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ ایڈنا کو اب پہلے کی نسبت آرام تھا۔ اور روت ایک عمدہ کام پر مسٹر گرمل کی سفارش سے لگ گئی تھی۔ اسے نئی پوشاک خرید کر دینے کے لئے میرے پاس کافی رقم موجود تھی۔ میں نے گانا شروع کر دیا۔ دودھ کی بوتلوں کی کھڑکھڑاہٹ اور انجن کے چلنے کا شور میری ہمنوائی کر رہے تھے۔ شائد یہ موسم بہار کی روح تھی جو مجھ میں نفوذ کر رہی تھی۔ میرے خون میں جوش پیدا ہو رہا تھا۔ اور زندہ دلی کے جذبات کروٹیں لے رہے تھے۔ واپسی پر اپنے گھر جانے کے لئے میرے کھیتوں کو گاؤں سے دو راستے جاتے تھے۔ ایک گرجا کے نزدیک سے ریلوے پل کے نیچے سے جاتا تھا۔ دوسرا راستہ لمبا تھا۔ جو مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔ چونکہ پہلے راستے میں مرمت کا کام جاری تھا۔ اس لئے میں نے کار کو دوسرے راستہ سے جانے کے لئے ایک گلی میں ڈال دیا گلی کے موڑ پر لارا کا مکان تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو دوسری طرف سے ایک اور کار آ رہی تھی۔ میں نے اپنی کار کو روک لیا لیکن جب دوبارہ چلانا چاہا تو انجن کام نہیں کرتا تھا۔ میں نیچے اترا کہ اسے ٹھیک کروں۔

انسانی زندگی میں متعدد ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ انسان کو مجبوراً تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ جب مجھے ان واقعات کے سلسلے پر غور کرنے کی فرصت ملتی ہے جو انجن کے فیل ہونے سے ظہور پذیر ہوئے اور جن سے میری زندگی کے اوراق میں ایک تکلیف دہ حزنیہ باب کا اضافہ ہوا تو میں حیران ہوتا ہوں کہ آیا ان سب معاملات میں حضرت انسان ہی مورد الزام ہے۔ یا کوئی دوسری زبردست طاقت ہمارے اوپر کام کر رہی ہے۔ اور ہمیں اندھا دھند ایسے کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

سامنے کے مکان کا دروازہ کھلا اور میں نے اوپر جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ لارا میری طرف آ رہی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اسے غور سے دیکھا سورج کی تیز کرنوں میں اس کے گھنگریالے بال چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ہرنی

کی مانند تھیں۔ جن پر لمبی لمبی پلکیں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اس کا جسم سڈول اور خوبصورت تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے پینٹ کیا ہوا تھا۔ اس کی ہر ادا میں جاذبیت تھی۔ دلکشی تھی۔ جس سے بچنا بحال بکہ ناممکن تھا۔ اور وہ شائد اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ شریف آدمیوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالے۔

وہ میری کار کے پاس کھڑی ہوگئی۔ میں نے اُسے اِس طرح سے دیکھنا شروع کیا جیسے میں نے آج تک کسی عورت کو دیکھا ہی نہ ہو اور اُس کے چہرے پر سے نظریں ہٹا نے نہ ہٹتی تھیں۔ کیونکہ اس کے نازک لبوں پر ایک ایسا تبسم رقصاں نظر آرہا تھا جس سے مائنت مسکرا رہی تھی۔

"ہیلو۔ مسٹر جان ڈرینسن" اس نے میری کار کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔ لارا" میں نے جواب دیا۔

اس نے مذکار ڈپر ہاتھ رکھتے ہوئے میری کار کو ہلانے کی کوشش کی اور کہا "بڑی عمدہ کار ہے۔ کبھی کبھی کسی کو سیر ہی کے لئے لے جایا کرو۔" وہ مسکرا رہی تھی۔ میں اپنے اندر ایک انقلاب محسوس کر رہا تھا اور وہ جذبہ مجھ میں ہی پیدا ہو رہا تھا۔ جسے برسوں سے میں بھولا ہوا تھا۔ یہ جوانی کی ایک ترنگ تھی۔ اور ایک خوبصورت عورت کے ساتھ عیش وعشرت میں دن گزرنے کی یاد۔

"مجھے تو کوئی انکار نہیں۔ اگر کوئی میرے ساتھ سیر کو جانے کے لئے تیار ہو" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ آہ وہ مدھ بھری آنکھیں جن میں شراب کی سی مستی تھی۔ جو مجھے جوانی کی رنگینیوں کی طرف دعوت دے رہی تھی۔ میں اُن کی بے پناہ رنگینیوں میں سب کچھ بھول بیٹھا۔

میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ لارا نے مجھے اپنے پھندے میں پھنسانے کی کیوں کوشش کی جب کہ گاؤں میں سینکڑوں نوجوان اور موجود تھے جو اس کے ساتھ ایک شام گزار دینا گویا جنت پالینے کے مترادف قرار دیتے تھے۔ ایک دنیا اُس کی شیدائی تھی۔ میں ایک غریب مصیبت زدہ زمیندار تھا۔ جس کے چہرے پر جوانی کے چند مٹتے ہوئے نقوش کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ روپیہ میرے پاس نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مجھے ایڈنا اور روُت سے کتنی محبت ہے اور یہ کہ میں گرجا کو جس میں ہر اتوار میرا گانا ہوتا تھا کبھی نہیں بھول سکتا۔ لیکن ممکن ہے کہ میری کشش کے وجوہات ہی یہ ہوں اور شائد وہ اپنے ملکوتی حسن کے غرور میں ایک ایسے جانور کو نیم بسمل دیکھنا چاہتی ہو جو آج تک ایسے حسین شکاریوں کے تیروں سے زخمی نہ ہوا ہو۔ اس دن کے بعد میری زندگی میں ایک تغیر رونما ہونا شروع ہوا۔ مجھ پر ایک نشہ سا طاری رہتا۔ سب ضروری کام بھول گئے۔ صرف اسی کا خیال تھا جسے میں دل میں چھپائے لئے پھرتا تھا۔ دنیا مجھے صرف اسی کے آئینۂ حیات میں منعکس نظر آتی تھی۔

اس پہلی ملاقات کے بعد ایک شام میں گاؤں سے کچھ خریدنے کے لئے گیا۔ واپسی پر میری کار خود بخود اسی راستہ پر مڑ گئی۔ جس پر اس کا مکان تھا۔ تقدیر کی بات ہے کہ لارا مجھے راستہ میں تنہا اپنے گھر کو جاتی ہوئی مل گئی۔ میں نے اُسے کار میں بٹھا لیا۔ اور جب اس کے گھر کے سامنے موڑ کے قریب کار کو روکنے لگا۔ تو وہ بولی "جان تھوڑی دور تک اور چلو۔ دیکھو نا کتنی پیاری شام ہے" میں نے کار کو ایک سڑک پر ڈال دیا۔ اور چند میل نکل گیا۔ فضا خاموش تھی۔ رات کی تاریکیاں گہری ہوتی جارہی تھیں۔ آسمان پر ستارے چٹک زنی کر رہے تھے۔ لارا کا نرم جسم میرے نزدیک تھا۔ جس میں سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ قربت میرے لئے سخت اضطراب انگیز تھی۔ میرے تصوّرات کے چھپے ہوئے طوفان سر اٹھا رہے تھے۔ میں نے اس کی گردن کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور جذبات کی فراوانی سے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اس کے نازک لبوں پر ایک بوسہ دیا۔ اب میں ایک ایسے راستے پر گامزن تھا جس سے واپسی ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ اب وہ میری رگ رگ میں پنہاں تھی۔ اور میرے خون کے قطرے قطرے میں بس چکی تھی۔ جو باہر نکال پھینکنا میرے قبضہ میں نہ تھا۔

لیکن اس کے باوجود جو جذبات محبت ایڈنا اور روُت کے لئے میرے دل میں موجزن تھے۔ وہ ان جذبات سے کہیں زیادہ بلند اور پاکیزہ تھے۔ یہ ایک جنون تھا۔ ایک وحشت اور میری طاقت سے زیادہ طاقتور۔ ہر رات کو کھانا کھانے کے بعد میں کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر باہر آجاتا۔ لارا کو اپنی کار میں بٹھا کر جنگل یا کسی پارک کے تاریک کونے میں لے جاتا۔ جہاں میں اُسے آغوش میں لے کر پیار کرتا۔ حتیٰ کہ میرے خون کا ذرہ ذرہ اُبل پڑتا۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنے اوپر ضبط رکھتا۔ اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں کہ لارا کا اخلاقی معیار کس قدر پست تھا۔ اس تمام دیوانگی کے زمانہ میں میں نے اپنی بیوی کے حقوق سے بے وفائی نہیں کی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد میں نے لارا کو تحائف دینے شروع کر دیئے۔ ایک دن میں نے اس کے گلے کے ایک ہار کو توڑ دیا۔ جسے وہ بہت عزیز رکھتی تھی۔ لیکن دوسرے ہی دن اُسے ایک نیا خرید دیا۔ اور اس طرح وہ رقم جو میں نے روُت کی سالگرہ منانے کے لئے بطور انداز کر رکھی تھی خرچ کر دی۔ اور میں اپنی لڑکی کو کمالی کی گھڑی جس کا میں نے اُس سے

وعدہ کیا ہوا تھا نہ دے سکا۔

گھر کی زندگی میں کوئی خاص تغیر واقع نہ ہوا۔ ہاں اس سال کئی کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ اکثر میرے کھیتوں میں آتا۔ رُوت بردانہ وار اس کے اِرد گرد گھومتی۔ اس کے لبوں پر تبسم ہوتا۔ اور اس کی آنکھوں میں محبت کا خمار۔

ایک دن جب مجھے کچھ اپنے تصورات سے فرصت ملی۔ تو میں نے رُوت سے پوچھا "بیٹی بال یہاں اکثر آتا جاتا ہے۔ کیا تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو؟" اس نے میری گردن کے گرد اپنے بازو ڈالتے ہوئے کہا۔ ابا! ایسی باتیں چھوڑو۔ محبت۔ ہاں۔ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔" لیکن کچھ دیر کے بعد جب بال کی موٹر دروازہ پر آکر رُکی تو رُوت کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی اور وہ ایک چھوٹی سی بیٹری کی طرح اڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔

میرا خیال تھا کہ ایڈنا میرے اور لارا کے رازِ محبت سے ناواقف ہے۔ اور سمجھتا تھا کہ گاؤں میں کوئی بھی میرے اور لارا کے تعلقات کو نہ جانتا ہوگا۔ یہ میری بھول تھی۔ کیونکہ دنیا میں تاڑنے والی آنکھیں اور باتیں تراشنے والی زبانیں بہت ہیں۔ اور محبت کی آگ دھواں دیئے "بغیر نہیں جلتی جس کا چھپانا ناممکن ہے۔

اگست کی ایک شام کو میں اِس خواب سے جگا یا گیا۔ گرجا میں گانے کی مشق ہو رہی تھی کہ مسٹر گریل میرے پاس آئے اور مجھے تنہائی میں لے جاکر نہایت متانت سے کہا۔ "جان مجھے یہ بات کہتے ہوئے خود ہی نفرت سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مجبوراً مجھے کہنا ہی پڑا۔ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں تم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹتے رہے ہیں۔ جس کے لئے مجھے بہت افسوس ہے۔ اور جہاں تک مجھ سے بن پڑا۔ تمہاری مدد کرنے سے میں نے کبھی گریز نہیں کیا جب میں نے شروع شروع میں تمہاری بابت بُری افواہیں سنیں۔ تو مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ اور میں اُسے لوگوں کے حسد و بغض پر محمول کرتا تھا۔ لیکن جب یہ چرچے زیادہ عام ہوتے گئے تو میں نے تمہاری حرکات کو بنظرِ غائر دیکھنا شروع کیا اور مجھے بہت قلق ہوا جب میں نے اُن کو حرف بہ حرف صحیح پایا۔ اس لئے گرجا کے منتظمین نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ یا تو تم ایسی آوارہ لڑکی سے قطع تعلق کرلو۔ ورنہ تمہارا نام گرجا میں گانے والی پارٹی سے خارج کر دیا جائے گا۔"

اس رات میں بالکل نہ سو سکا اور بستر پر پہلو بدلتے ہوئے ساری رات آنکھوں میں کاٹی لیکن صبح تک میں نے فیصلہ کر لیا اور میں نے اپنی تمام طاقت کو جمع کرکے قسم کھائی کہ میں اس عورت کے خیال کو اپنے دل سے باہر نکال دوں گا۔ اور اس جگہ کو جو میں نے گرجا میں معزز آدمیوں کے درمیان حاصل کر رکھی ہے۔ کبھی نہ چھوڑوں گا۔

اس شام کو میں لارا سے قصداً ملا تاکہ اُسے بتا دوں کہ اس کے اور میرے تعلقات اب ختم ہو چکے۔ وہ مجھے ہمیشہ محبت اور نرمی سے ملا کرتی تھی لیکن میری باتوں کو سنتے ہی وہ ایک غصے سے بھری ہوئی بلی کی مانند غرائی جو اپنے بچوں سے میری آنکھیں نکالنے کو تیار ہو۔

"تم مجھے اس طرح نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ جو دنیا تمہیں مجھ سے اس طرح سے چھین رہی ہے۔ جانتے ہو کہ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ کیا تم لوگوں کی باتوں سے گھبرا گئے ہو۔ جو بول بے وفائی کر رہے ہو۔ یاد کرو کہ تم ایک افسردہ دل انسان تھے جسے میں نے اپنی جوان محبت کی حسین اور دلکش رنگینیاں بخشیں۔ اور تمہاری زندگی کی خزاں کو بہار میں بدل دیا۔ تم اس کا صلہ مجھے یہ دے رہے ہو۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن لارا! میری تو بیوی بھی ہے اور لڑکی بھی"۔ اور شاید تمہیں اس بات کا علم نہ ہو کہ میں اپنی لڑکی سے اس قدر محبت کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ ایک ہزار سال تک زندگی گزار دینے تک بھی نہیں کر سکتا۔"

لارا آخر کار عورت تھی۔ اور اس نے عورت کا آخری حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ رونے لگ گئی۔ ایک حسین عورت کے آنسوؤں سے زیادہ دنیا میں مرد کو پھسلانے کے لئے اور کوئی چیز نہیں اور پھر اُس وقت جب مرد اس سے محبت کرتا ہو یہ طوفان ثابت ہوتے ہیں جس میں مضبوط سے مضبوط ارادے بھی خس و خاشاک کی طرح برجاتے ہیں۔ اس نے محبت سے اپنے بازو میری گردن کے گرد حمائل کر دیئے۔ لیکن مجھے اپنی قسم یاد آگئی۔ میں نے اُسے اپنے سے دُور ہٹاتے ہوئے کہا۔ "لارا۔ ان باتوں کو اب فراموش کر دو۔ میں دیوانہ تھا اور اب میں ہوش میں آچکا ہوں۔ تم حسین ہو۔ جوان ہو۔ تم کیوں استاعم کرتی ہو تم آسانی سے کسی دوسرے کو میری جگہ اپنا بنا سکتی ہو۔"

ان الفاظ میں خدا جانے کیا بات تھی۔ کہ اس نے فوراً رونا بند کر دیا۔ رات ڈراؤنی اور بھیانک معلوم ہو رہی تھی اور تاریکی میں اس کا چہرہ ایک دھبہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن جذبات کا تلاطم اس کے سانس کی تیز آمد و رفت سے بخوبی جانچا جا سکتا تھا۔ وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح میری طرف لپکی اور میرے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ "بہت اچھا۔ جاؤ۔ میں تمہیں کبھی نہیں روکوں گی ..... لیکن ٹھیرو۔ میں اس کا انتقام ضرور لوں گی۔ عورت جب محبت کرتی ہے تو اپنا سب کچھ اپنے محبوب پر قربان کر دیتی ہے لیکن جب

اس کی محبت ٹھکرا دی جاتی ہے اور اس کی حسین آرزوئیں۔ رنگین تمنائیں تمہاری طرح دل کی بجائے برف کی قاش رکھنے والے مرد پامال کر دیں تو وہ دنیا کی ہر خوشی کو تیاگ دیتی ہے۔ اور پھر جب وہ انتقام پر تُل جائے تو وہ خیر و شر سے بالکل بے نیاز ہو کر ایک عالم کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ میں بھی انتقام لونگی اور ضرور لونگی اور دنیا دیکھے گی کہ اس گاؤں کی گلیوں میں چلنے والا کوئی شخص بھی اتنا بدنصیب اور غمگین نہیں ہوگا جتنے کہ تم۔"

لارا کا خیال آہستہ آہستہ مدھم پڑتا گیا اور میں اس کے گھر کی طرف جانے سے ایسا بچتا جیسے لوگ پلیگ زدہ علاقہ میں جانے سے گھبراتے ہیں۔ سارا دن کھیتوں میں کام کرتا اور رات ایڈنا کی تیمارداری میں گزار دیتا۔ اسے درد کے سخت دَورے پڑ رہے تھے۔ اُسے سکون دینے کے لئے چھوٹی چھوٹی مُسفید گولیاں تھیں۔ لیکن کبھی کبھی ان کا اثر بھی نہ ہوتا تھا اور مجھے پہروں اُس کے پاس بیٹھنا پڑتا تاکہ اس کا دل بہلتا رہے۔

خزاں کا آغاز تھا۔ بلڈا نے مجھے بتایا کہ رُوت بیمار ہے۔ وہ بہت زرد اور کمزور ہو گئی ہے اور اس کی خوراک اتنی بھی نہیں رہی جس سے ایک چھوٹا سا پرندہ بھی زندہ رہ سکے۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ رُوت افسردگی کی تصویر تھی۔ میں نے اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کو زور دیا مگر اُس نے جانے سے انکار کر دیا۔ میرے اصرار پر ایک مردہ سی ہنسی اس کے لبوں پر ظاہر ہوئی اور اس نے کہا کہ وہ بیمار نہیں ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

لیکن کئی دفعہ مجھے ایڈنا کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تو میں اوپر کے کمرے میں رُوت کے چلنے کی آواز سنتا اور اکثر آدھی رات گزر جانے کے بعد بھی اس کے کمرے کی روشنی گُل نہ ہوئی تھی۔ پال بھی اب میرے کھیتوں میں نہ آتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ رُوت اس کے لئے غمگین ہے۔ اور یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں اسے خود ہی لڑنا چاہئے تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت زیادہ رنج ہوتا کہ میری لڑکی کو اتنی چھوٹی سی عمر میں زندگی کے ان معاملات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

اکتوبر کی ایک رات مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ ہوا چیختی ہوئی مکانوں اور چمنیوں میں سے گزر رہی تھی۔ بارش کی بوچھاڑ دروازوں اور کھڑکیوں سے زور آزمائی کر رہی تھی۔ ایڈنا کو سخت تکلیف تھی۔ اور وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے وہی دو سفید گولیاں کھائی تھیں۔ لیکن تسکین نہ ہونے کی وجہ سے اور گولیاں مانگ رہی تھی۔ مگر میں ان گولیوں کو زیادہ مقدار میں دینے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر نے مجھے متنبہ کر دیا تھا کہ ان کا مقدار سے زائد کھانا مہلک ہے۔ بہت عرصہ کے بعد ایڈنا سو گئی اور میں نے اپنے بستر پر جانے کے لئے دوسرے کمرے کا رُخ کیا۔ ہوا تھم چکی تھی۔ فضا خاموش تھی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے راستہ میں ٹھہر گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی آہیں بھر رہا ہے۔ اُف میری پیاری رُوت اپنے دل کا غم تنہائی میں آہوں کے ذریعے نکال رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھا۔ اس کے دروازے پر دستک دی۔ کمرے میں فوراً خاموشی چھا گئی۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ لیمپ جلایا اور میرا دل حلک کر کے بیٹھ گیا۔ رُوت حسرت و یاس کی تصویر بنی بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ اور وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جن میں حرماں نصیبی کا وہ منظر تھا۔ جو میں نے آج تک کسی انسان کی آنکھوں میں نہیں دیکھا۔ میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا اور اُسے اپنے بازوؤں میں تھامتے ہوئے پدرانہ شفقت سے پوچھا "بیٹی۔ اپنے باپ سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔ میں تمہاری تکلیف کو ہر ممکن کوشش سے دور کروں گا۔" وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد اس نے اپنی زندگی کی سوگوار کہانی سنائی۔ یہ وہ کہانی تھی جو دنیا کی آفرینش سے اب تک ہزاروں بار سنائی گئی ہے اور لاکھوں بار دُہرائی جائے گی۔ جب تک کہ جوانی میں جوش۔ جوش میں مستی اور والہانہ پن ہے۔ جب تک جوان آدمی کی زبان میں رس ہے۔ لوچ ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش ہے۔ اور جب تک جوان لڑکیاں محبت کی بھوکی انجام سے بے خبر آگ کے شعلوں سے کھیلتی رہیں گی سادہ اپنی عزیز ترین متاع اس میں بھسم کر کے قربانیاں کرتی رہیں گی۔ یہ کہانی تشنۂ تکمیل ہی رہے گی۔ رُوت کو پال سے محبت تھی۔ عشق تھا۔ اور پال اس سے بے وفائی کر رہا تھا۔ پال کے لئے میرے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن جب میں نے اپنے اعمال پر نظر دوڑائی تو مجھے مرد کی محبت کے نظریہ کے متعلق کوئی فیصلہ دینے کا حق نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ میں اس آدمی کی بابت جس نے میری لڑکی کو دھوکا دیا تھا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ نیز اس میں میرا زیادہ قصور تھا۔ میں لارا کے حسن کا دیوانہ ہو کر رُوت کو بالکل بھول بیٹھا تھا اور جس طرح ایک باپ کو اپنی بیٹی کے معاملات میں غور و خوض سے کام لینا چاہئے میں نہیں لے سکا تھا۔ میں نے رُوت کو تسلی دی اور کہا۔ بیٹی غم نہ کرو۔ پال ایسا آدمی نہیں ہے۔ وہ اس غلطی کی ضرور تلافی کرے گا۔ اور اگرچہ وہ نہیں دو ہفتہ سے نہیں ملا۔ لیکن

صبح میں اُس سے اور اس کے باپ سے ملوں گا اور شناسی شادی اسی کے ساتھ ہو جائے گی۔ اپنے باپ پر اعتماد کرو اور اب سو جاؤ۔

اس رات میں بالکل نہ سو سکا۔ میرا دل غم سے بھاری تھا۔ صبح کا کھانا کھا کر میں گاؤں میں گیا۔ مجھے اس وقت تک یقین تھا کہ پال رُوت سے محبت کرتا ہے۔ میں مسٹر گریل کے مکان پر پہنچا۔ گھنٹی بجائی۔ لیکن جواب ندارد۔ میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی اور تھوڑے عرصہ کے بعد ایک خادمہ دروازے میں ظاہر ہوئی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا اور اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کسی سخت پریشانی میں مبتلا ہے۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔

"آپ مسٹر گریل کو نہیں مل سکتے۔ وہ بیمار ہیں"

میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ لیکن مجھے ان سے ضرور ملنا ہے"۔

اور یہ کہہ کر میں اس کے پاس سے گزر کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے پال کے قہقہے کمرے میں آوازیں سنائی دیں اور میں نے اس طرف کا رُخ کیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں یکایک رُک گیا۔ مسٹر گریل کھڑکی میں سے باہر خالی فضا کو تک رہے تھے۔ اور ان کی بیوی ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھی ہوئی اپنے ہاتھوں سے سر کو تھامے ہوئے رو رہی تھی۔ میں کھانسا۔ مسٹر گریل نے میری طرف مُنہ موڑا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں بڑے عجیب سے وقت پر آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ مگر مجبور ہوں۔ مجھے آپ سے ایک نہایت ضروری کام ہے" میں نے کہا۔

"ہاہ۔ کیا بات ہے جان" مسٹر گریل نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"میری لڑکی بڑی پریشان ہے۔ مسٹر گریل۔ اور اس کی ساری ذمہ داری پال پر ہے۔ میں آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں کہ پال کی شادی رُوت سے کر دی جائے" میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ گریل کے چہرے پر تشنج کے آثار پیدا ہوئے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ سفید پڑ گیا۔ اس نے خاموشی سے میز پر سے ایک لفافہ اٹھایا اور مجھے دے دیا۔ یہ تار تھا جو لندن سے کل کی تاریخ سے مسٹر گریل کے نام آیا تھا۔ میں نے اُسے کھولا یہ تار پال کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میں نے پوسٹیدہ طور پر لارا انگلڈنگ سے شادی کر لی ہے۔ اور اب ہم ہاکس منانے کے لئے جا رہے ہیں"۔

آہ۔ لارا نے انتقام لے لیا اور اس نے جان بوجھ کر پال کو اپنے پھندوں میں پھنسایا۔ تاکہ وہ اپنے خداداد حسن کی ستم رانیوں سے میری زندگی کو حسین بنا دے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ رُوت مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور رُوت کو تکلیف پہنچانا میرے دل کو زخمی کرنا تھا۔

جس طرح سے بھی ہو سکا میں گھر پہنچا اور رُوت کو اپنی آغوش میں تھام کر اُسے سارا واقعہ سنایا اور اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی پیاری بیٹی کے نازک دل کو چُور چُور ہوتے دیکھا کیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اس کی مدد کروں گا۔ لیکن میں خود نہیں جانتا تھا کہ کیسے اور کیونکر۔

صبح کا وقت تھا۔ بارش تھم چکی تھی مگر کالی بدلیاں اب بھی آسمان پر دوڑ رہی تھیں۔ میں اپنے کھیتوں میں کام میں محو تھا۔ ایڈنا تکلیف کی وجہ سے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ ہلڈا نے کھانا تیار کیا۔ لیکن ہم میں سے کسی نے بھی نہ کھایا۔ رُوت کرسی پر بیٹھی آنکھوں میں یاس کا منظر لئے فضا کے خلاء میں سارا دن بے معنی نظروں سے تکتی رہی۔ رات کے نو بجے کے قریب وہ اپنی ماں کے کمرے میں آئی۔ ہم دونوں کو سلام کیا اور اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں سیڑھیوں تک اس کے ساتھ گیا اور اسے آہستہ آہستہ چڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"مجھے امید ہے کہ تم اچھی طرح سے سو گی" میں نے کہا۔

"ہاں آپ فکر نہ کیجئے میں اچھی طرح سے سوؤں گی"۔

اس نے ہنستے ہوئے میری طرف مُنہ موڑ کر جواب دیا۔ یہ دن میں پہلا موقع تھا۔ کہ اس کے چہرے پر ہنسی دکھائی دی تھی۔ میں تھکان کی وجہ سے سو گیا۔ نصف شب کے قریب ایڈنا نے مجھے جگایا۔ اسے درد کی سخت تکلیف تھی۔ اس نے مجھ سے وہی سفید گولیاں مانگیں۔ میں نیم خوابی کی سی حالت میں اس کے کمرے میں داخل ہوا اور گولیوں کے بکس کو ہر طرف کرے میں تلاش کیا۔ لیکن وہ مجھے کہیں بھی نہ ملا۔ "شام تک تو وہ یہیں پڑا تھا"۔ ایڈنا نے کہا۔

خدا جانے کیوں۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ نیند کا اثر اب دور ہو چکا تھا۔ اور رُوت کا سفید چہرہ میری طرف غور سے تکتا ہوا میری نظروں میں گھوم رہا تھا۔ "ہاں۔ میں اچھی طرح سے سوؤں گی"۔ اس نے کتنی حسرت آمیز آواز سے کہا تھا۔ میں جلدی سے اوپر چڑھا اور رُوت کے کمرے میں داخل ہوا۔ لیمپ ابھی تک دھیمی دھیمی روشنی بکھیر رہا تھا۔ وہ اپنے بستر میں آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر عجیب قسم کی طمانیت برس رہی تھی۔ اس کے کالے کالے بال تکیے پر بکھرے پڑے تھے اور سفید گولیوں کا بکس فرش پر خالی پڑا تھا۔ ہاں۔ وہ سو رہی تھی۔ اور اب وہ اس دنیا کے غم و الم سہنے کے لئے کبھی نہ جاگے گی۔

اب پھر بہار کا موسم ہے۔ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ درخت نئی کونپلیں نکال رہے ہیں۔ میں پچھلے سال کی طرح اب بھی ہل چلاتا ہوں اور فصلیں بوتا ہوں۔ ایڈنا سارا دن بستر پر پڑی رہتی ہے۔ اس کی سیاہ آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں۔ اب بھی کبھی کبھی ایک مسکراہٹ سی اس کے چہرے پر کھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس مسکراہٹ کے نیچے زخمی اور خون شدہ دل آہیں بھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہلڈا گھر کے کام کاج میں اسی طرح بھاری بھاری قدموں سے مصروف ہے۔ لیکن روت جو اس گھر کی روح رواں تھی جس سے یہ زندگی زندہ رہنے کے قابل تھی، نہیں ہے۔

(ترجمہ) عبدالعزیز میانوی

رباعیات

برسات کے دریا

دریا امڈے، بہا طلا رسیال
بکھرے موجوں کے جابجا زریں جال
انسان کی کیا مجال نظروں کا کبھی
اِس پار سے اُس پار پہنچنا ہے محال

چمیلی کے پھول

تھے چادرِ ابر میں جو مستور نجوم
دلدادۂ فطرت کی نظر تھی مغموم
قدرت نے کھلا دیئے چمیلی کے پھول
پیارے پیارے حسین نازک معصوم

مرزا عباس بیگ محشر

ویسٹ اینڈ کا
کفایت شعاری پر مبنی درجہ

'SECUNDUS'

سیکونڈس گھڑیاں
خوبصورت اور دیرپا بالکل صحیح وقت دینے والی گھڑیاں انتہائی کم قیمتوں پر



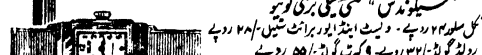
نکل سلور -/۲۳ روپے
رولڈ گولڈ -/۳۱ روپے

"سیکونڈس" فل سیکوئر



تمام نمونہ جات کی گارنٹی ایک سال ہے۔

"سیکونڈس" نئی سیلی بری ٹونیو



نکل سلور ۲۴ روپے۔ ویسٹ اینڈ ایور برائٹ سٹیل -/۲۸ روپے
رولڈ گولڈ -/۳۲ روپے۔ ۹ کیرٹ گولڈ -/۵۵ روپے
۱۸ کیرٹ گولڈ -/۸۰ روپے

"سیکونڈس" مینچسٹر ریکٹینگولر

ایور برائٹ سٹیل -/۲۷ روپے
رولڈ گولڈ -/۳۰ "
۹ کیرٹ گولڈ -/۴۰ "
۱۸ کیرٹ گولڈ -/۵۳ "

بڑی فہرست بغیر قیمت طلب کریں
ویسٹ اینڈ واچ کمپنی، بمبئی اور کلکتہ

WEST END WATCH Co.
BOMBAY - CALCUTTA

سہ آتشہ

حضرتِ فراق گورکھپوری نے یہ سہ آتشہ لکھ کر اپنی اس غیر معمولی قدرتِ بیان کا ثبوت دیا ہے جو اُن کی کوشاری میں حاصل ہے۔ اتنی طولانی اور سیر حاصل غزلیں کہنا قدیم رسم تھی جس کی طرف موجودہ مشاہیت کم توجہ کرتے ہیں۔ اب یہ پرانی طرز بھی اپنے اندر ایک جدت رکھتی ہے۔

(۱)

نو بنو داغِ محبت کا نمایاں ہونا — خوابِ ہستی کا وہ اک خواب پریشاں ہونا
چاک دل چاک جگر چاک گریباں ہونا — وحشیو یہ تو نہیں عاشقِ جاناں ہونا
اُسے دیکھا بھی تو اس طرح کہ دیکھا ہی نہیں — اُف وہ حسنِ نابلد عشوۂ پنہاں ہونا
بے قراروں کو ہے اب اک خلشِ پنہاں بھی — غمِ دوراں کو مبارک غمِ جاناں ہونا
فرشِ رہ دیدہ و دل میں ترے شتاقوں کے — تیری آمد میں کوئی سازِ نہ ساماں ہونا
پتے پتے میں ہے گلزار کے صد دشت جنوں — ذرّے ذرّے سے نمایاں ہے بیاباں ہونا
گلرخیں ہیں در و دیوار کی اور تیرے اسیر — سخت دشوار ہے شایستۂ زنداں ہونا
نوعِ انساں کو دو عالم میں سکوں مل سکتا — غمِ ہستی کو نہ آیا غمِ پنہاں ہونا
اپنا انجام اگر عشق سمجھتا ہے تو پھر — حسن کا کس لئے شرمندۂ احساں ہونا
اب تو تنگ آ گئے اس کشمکشِ پنہاں سے — دل کے شیرازہ کو آیا نہ پریشاں ہونا
سازِ بے سوز سے دنیا نہیں بدلا کرتی — کارِ ہر ذرہ نہیں نغمۂ مستاں ہونا
وحشتِ عشق کا بڑھنا تو عدم ہو جانا — سمٹ آنا تو سراپردہ امکاں ہونا

سر بسر برقِ فنا عشق کے حملے میں فراق
خانۂ دل کو نہ آباد نہ ویراں ہونا

(۲)

ہے ابھی جوہرِ ہستی کو نمایاں ہونا — حسنِ آفاق کو ہے رونقِ انساں ہونا
سر بسر جسم کے امکان میں ہو جاں ہونا — رگِ ہستی کو نہ آیا ابھی لرزاں ہونا
سازِ بے سوز ہے اے عشق یہ نظمِ ہستی — ان مجازوں کو سکھا شعلہ بداماں ہونا
رازِ سربستہ ہے شیرازۂ دل کی ترکیب — بیک انداز سے یک جا و پریشاں ہونا
دلِ سوزاں شبِ غم پیکرِ بے خبری ہے — نہ شبستاں نہ اسے شمع شبستاں ہونا
ہم بھی یوں قول سے غالب کے ہیں متفق لیکن — تا بکے حد سے بڑھے درد کا درماں ہونا
بات یہ ہے کہ میں آباد بھی رہا بھی ہوں — عقدۂ عشق کو دشوار نہ آساں ہونا
ذرہ اپنا بھی ہے خورشید قیامت لیکن — مجھے منظور نہیں چاک گریباں ہونا

(۳)

خود نما ہو کے نہاں چھپ کے نمایاں ہونا — الغرض حسن کو رسوا کسی عنواں ہونا
کبھی صحرا کبھی گلشن کبھی زنداں ہونا — اور عالم کو کبھی میرا اگر یاں ہونا
یوں تو اکسیر ہے خاکِ دو جہاں لیکن — کاوشِ غم سے اسے گردشِ دوراں ہونا
دیکھیں سے نہ باہر ہوئی وہ برقِ نگاہ — آج تک آ نہ سکا حسن کو حیراں ہونا
چارہ گر دردِ سرا ہوں مرے درد نہیں — باورآیا ہے تجھے نشترِ کارگِ جاں ہونا
مجھ سے بچنا ہی تو ناٹھیک ہے آدابِ دوست — کیا کبھی کو ہے فقط میرا گریباں ہونا
دفترِ رازِ محبت تھا ملال دل پر — وہ سکوتِ نگہِ ناز کا پُرساں ہونا
اب تو مجھ کو بھی مرے حال کا احساس نہیں — مشکلِ عشق مبارک تجھے آساں ہونا
رشکِ صد لطف دکرم ہے یہ نیاز و ناز و ستم — کچھ نہیں جان سکے تیرا پریشاں ہونا
اُف وہ بیرنگِ جنوں چاکِ گریباں کے — کبھی خنداں کبھی گریاں کبھی حیراں ہونا
اسے جو کچھ کوئی سمجھے اسے جو کچھ جانے — غمِ جاناں کو مگر کفر نہ ایماں ہونا
نگہِ شوخ نے چھیڑا ہے رگِ سازِ مجاز — دیکھ اب حسن حقیقت کا نمایاں ہونا
ہیں امیدیں بھی تغافل بھی تردّد بھی حجاب — اسے ہمراز نہ دمساز نہ پرساں ہونا
کتنی بے لاگ لگاوٹ نگہِ ناز کی تھی — یوں ملی جیسے اسے درد نہ درماں ہونا

آج در پردہ جنوں سلسلہ جنباں ہے فراق
کھل گیا گیسوئے پُرخم کا پریشاں ہونا

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

مُصوّر

"جی ہاں! آج کل اس لطیف فن کی قدر ہی نہ رہی جبھی میں اس قدر غریب ہوں"۔ مصوّر نے ایک سرد آہ بھر کر اجنبی سے کہا۔ اجنبی نے کمرے کی ہر چیز کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

کمرے کا پوسیدہ اور مختصر سا سامان مصوّر کی غربت کا آئینہ دار تھا۔ جو چیز تھی میلی شکستہ اور بے ترتیب تھی اور زبان حال سے مصوّر کی پریشان حالی کی داستان سنا رہی تھی۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی ٹوٹی ہوئی الماری تھی جس میں موٹے کاغذ کے چند ٹکڑے آٹھ دس کتابیں تین چار شیشیاں اور چار پانچ ٹوٹے ہوئے ڈبے تھے۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی کہنہ میز دھری تھی۔ اس پر چند شیشیاں دو ایک ڈبے تین پیالیاں اور آدھ درجن کے قریب برش منتشر حالت میں پڑے تھے۔ اور اس قدر گرد آلود جیسے مہینوں سے انہیں کسی نے چھوا بھی نہ ہو۔ میز کے ساتھ ہی ایک پرانی ٹوٹی ہوئی کرسی تھی۔ جس کی ایک ٹانگ تو تھی ہی نہیں اور دوسری نیم شکستہ تھی۔ ایک طرف چارپائی تھی جس پر پھٹے پرانے کپڑوں کا ایک ڈھیر تھا۔ کھڑکی کے پاس ایک گرد آلود دھتعدان تھا اور اس کے پاس ہی ایک مٹی کا چراغ فرش پر الٹا گرا ہوا۔ ایک پرانی اور بوسیدہ دری جس میں متعدد سوراخ تھے کمرے کے وسط میں بچھی ہوئی تھی۔ اس پر گرد و غبار کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مدت سے اس کمرے کو جھاڑو کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا ہو۔ دیواروں پر گرد سے ڈھکی ہوئی چند تصویریں تھیں جن کے اوپر اور ادھر ادھر مکڑیوں کے بے شمار جالے لٹک رہے تھے۔ چھت میں جا بجا گرد و غبار کی جھالریں آویزاں تھیں۔

اجنبی کمرے کی ہر چیز کو بغور دیکھتا ہوا اور مصوّر کی حالت کا جائزہ لیتا ہوا دزنک کچھ سوچتا رہا۔ اس وقت کمرے میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ البتہ کبھی کبھی الماری کے نیچے یا چارپائی کے نیچے کسی چوہے کے دوڑنے کی کھٹ کھٹ سے اس سکوت میں انتشار سا پیدا ہو جاتا تھا۔ یا چھت پر سے کسی چمگادڑ کی کرخت آواز اجنبی کی توجہ میں مخل ہوتی تھی جو کبھی مصوّر کی طرف دیکھتا اور کبھی حسرت بھری نگاہیں ادھر ادھر دوڑاتا۔

مصوّر شرم سے گڑھا جا رہا تھا۔ اس کی غناک آنکھیں اجنبی کے سامنے نہ اٹھتی تھیں۔ دل میں تلاطم مچا ہوا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ شرمندہ تھا کہ وہ آج ایک اجنبی کے سامنے جو وضع قطع سے امیر معلوم ہوتا ہے کتنا ذلیل ہوا۔ سارا جسم پسینہ میں شرابور تھا اور خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرتا ہوا ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا۔

اجنبی نے ایک سگار سلگایا اور ایک لمبا کش لگاتے ہوئے مصوّر سے انتہائی ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "اپنی تصویریں کسی نمایش میں کیوں نہیں بھیجتے؟"

مصوّر نے آنکھیں اجنبی کی طرف اٹھا کر پھر جھکا لیں اور خشک گلے کو کھانس کر تر کرتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ آج کل غریبوں کی کون پوچھتا ہے۔ ہر جگہ زر داروں کا بول بالا ہے"۔

اجنبی کے چہرے پر اطمینان کی جھلک سی نمودار ہوئی۔ اس نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔ "تو درست ہے"۔

کمرے میں پھر ایک بار خاموشی چھا گئی۔ مصوّر کی آنکھیں زمین پر گڑھی ہوئی تھیں اور اجنبی — وہ سگار کے کش پر کش لگا رہا تھا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کے بال پریشان کر رہا تھا۔ جیسے کسی بھولی ہوئی بات کو ذہن میں لانے کی کوشش کر رہا ہو۔ آخر اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پھر کہا۔ "آپ کو میری ایک تجویز منظور ہو تو میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس مصیبت سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر سکیں گے"۔

غریب مصوّر نے محسوس کیا کہ اجنبی کے ان الفاظ میں ہمدردی مہربانی اور امید مضمر ہے۔ اس نے شکریے کے طور پر سر جھکا کر کہا۔ "آپ کی عنایت ——— ارشاد!"

"میں تجارت پیشہ آدمی ہوں اور کم و بیش ہر شہر کے معززین میرے واقف ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنی شہرت اور رسوخ کی بدولت

آپ کی تصویروں کے لئے قدر دان خریدار پیدا کر سکوں گا۔ آپ سردست میرے ہی مکان پر نگار خانہ قائم کر کے مستعدی کے ساتھ کام شروع کریں۔ فی الحال آپ کو پچاس روپے ماہوار دے سکوں گا۔ اس کے علاوہ رہائش اور کھانا مفت۔"

عزیب مصور کے چہرے پر مسرت کی لہر سی دوڑی اور آنکھوں میں امید کی جھلک آگئی جیسے کالے بادلوں میں یکایک بجلی چمک اُٹھے۔ پچاس روپے ماہانہ بلکہ بھر میں اُس کی امیدوں کی دنیائی روشنی سے چمک اٹھی۔ چشم تصور میں روشن مستقبل کا نقشہ بندھ گیا اور خشک ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور اجنبی کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ "منظور ہے۔"

اجنبی نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے جیب سے ایک ملاقاتی کارڈ اور دس روپے کا نوٹ نکالے اور مصور کو دیتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا پتہ ہے۔ اور یہ سفر خرچ۔ میں ایک ہفتے تک آپ کا انتظار کروں گا۔" "بہت اچھا" مصور نے تشکر آمیز لہجے میں کہا اور ادب کے طور پر بیرونی دروازے تک اپنے محسن کے پیچھے پیچھے گیا۔

واپس آکر شوق سے اجنبی کا دیا ہوا کارڈ دیکھا۔ لکھا تھا۔ "سیٹھ جمنا لال ملک الجار مال روڈ لاہور۔"

مصور گو غریب تھا۔ لیکن قدرت نے اُسے دلفریب حسن کی دولت عطا کی تھی۔ وہ جوان تھا اور خوبصورتی اس کے پھٹے پرانے کپڑوں میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھی جیسے بادلوں کے پیچھے سے چاندنی۔ اس کے چہرے میں قدرتی اور پرکشش آنکھوں میں جادو اور آواز میں شیرینی تھی۔ سر عضو سے ثبات ٹپک رہا تھا۔ مصوری کا پیشہ اُسے ورثہ میں ملا تھا اور اس فن میں اُسے کافی دسترس اور پوری مہارت حاصل تھی۔ اگر وہ ترقی اور روشنی کی دنیا سے دور ایک گاؤں میں پیدا نہ ہوتا اور وہ بھی ایک غریب کے ہاں تو شاید دنیائے مصوری میں اس کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیا جاتا اور آج وہ بے شمار دولت اور عالمگیر شہرت کا مالک ہوتا۔ مگر اب ایک ایسے گاؤں میں جہاں اس کی حوصلہ افزائی کا ایک بھی ذریعہ موجود نہ تھا وہ فلاکت کے دن گزار رہا تھا۔ شاید اُسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں وہ جدت اور تخیل میں وہ بلندی موجود ہے جس سے مصوری کے لطیف فن کو چار چاند لگ سکتے ہیں۔ اُسے اس قسم کے وسائل بھی بہم نہ تھے کہ گاؤں سے نکل کر اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کر لیتا۔ ہاں البتہ جب دیوالی کے دن اس گاؤں کی ایک پہاڑی کے دامن میں میلہ لگتا اور لوگ نزدیک و دور سے آکر یہاں جمع ہو جاتے تو یہ بھی سال بھر کی محنت کے دو چار بہترین نمونے لے کر وہاں چلا جاتا اور سوا ڈیڑھ سو روپیہ کما لاتا۔ یہی اس کا واحد ذریعۂ معاش تھا۔

سیٹھ جمنا لال کسی مشہور امیر آدمی تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈیڑھ ایک کروڑ کے مالک ہیں۔ اپنے کئی کارخانے جاری تھے۔ متعدد کمپنیوں کے سرمائے میں ان کا حصہ تھا۔ اب کے جو نئی ریلوے سکیم مرتب ہوئی تھی اُس کا ٹھیکہ سیٹھ صاحب ہی کے نام منظور ہوا تھا۔ بڑی کمپنیوں کے مالک اِن کے قرضدار تھے۔ ان کا عالی شان مکان اور وسیع باغ قابل دید تھا۔ مال روڈ پر کی اکثر دکانیں انہی کی ملکیت تھیں۔

سیٹھ صاحب کی نسبت دو باتیں مشہور تھیں۔ ایک یہ کہ وہ بڑے طامع ہیں اور دوسرے یہ کہ انتہا درجہ کے خود دار ہیں۔ یہ دونوں باتیں بہت حد تک درست بھی تھیں۔ کیونکہ جہاں سیٹھ صاحب کی عمر ۶۵ سال سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ وہاں ان کی کاروباری سرگرمیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اب آخری وقت میں کمائی ہوئی دولت ہی پر اکتفا کر کے عاقبت کی فکر میں لگ جاتے خصوصاً جب ایک لڑکی کے سوا اُن کا کوئی وارث بھی نہ تھا۔ خود داری کا یہ حال تھا کہ اپنی عمر میں ان کا سر کسی کے سامنے نہ جھکا تھا۔ بے شمار دولت کمائی۔ لیکن کبھی کسی کی خوشامد نہ کی اور کسی کے زیر بار احسان نہ ہوئے۔ کوئی اُن کی ذات یا نیت پر حملہ کرتا تو اس سے بدلہ لئے بغیر دم نہ لیتے۔ اُن کے ناموس پر ذرا بھی حرف آجاتا تو شاید خودکشی پر آمادہ ہو جاتے۔

یہ سیٹھ صاحب کے طامع ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے مکان میں ایک نگار خانہ قائم کرنے کی ٹھان لی تھی اور غریب مصور کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کا در اصل مطلب ہی یہ تھا کہ اُسے دولت کمانے کا آلۂ کار بنایا جائے۔ گو اس میں اُس کا فایدہ بھی ضرور تھا۔

سیٹھ جمنا لال کی نظرِ التفات اس غریب اور گمنام مصور ہی پر کیوں پڑی۔ اس میں بھی ایک راز تھا۔ جب وہ گزشتہ مہینے کسی کاروباری سلسلے میں بمبئی گئے تو حسب معمول ایک پرانے دوست پنڈت ہری رام لال کے ہاں اترے۔ چودھری صاحب مصور تو نہ تھے۔ لیکن اس فن کے بڑے دلدادہ تھے۔ یوں تو وہ پہلے ایک متوسط الحال آدمی تھے لیکن اب کے ان کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ وہ ایک ہی سال میں اتنے امیر ہو گئے تھے کہ ایک اچھی خاصی

کوٹھی تیار کرلی تھی اور نوکر چاکر بھی رکھ لئے تھے۔

ایک رات کو چودھری جی نے باتوں باتوں میں سیٹھ صاحب کو بتایا کہ انہوں نے اس سال آل انڈیا آرٹس اگزیبشن میں ایک گمنام مصوّر سے خریدی ہوئی تصویر کی بدولت پچاس ہزار روپے کا انعام حاصل کیا۔ سیٹھ صاحب کب چوکنے والے تھے۔ جھٹ نے دل ہی دل میں ٹکٹیاں لیں آخر انہوں نے گریدگرید کر باتیں کرتے ہوئے مصوّر کا پتہ پوچھ ہی لیا۔ دریہ سن کر اُن کی حیرانی کی حد ہی نہ رہی کہ یہ گمنام مصوّر اُن کے اپنے وطن کے محض ہی ایک گاؤں میں رہتا ہے اور اس کا نام گوپال ہے۔

سیٹھ جمنالال صبح کے وقت اپنے صحن کے باغیچے میں گئے۔ اس وقت نسیم سحری کی سُبک خرامی ماحول میں ہلکا سا تبسم پیدا کر رہی تھی۔ خوشبو ہوا کے کندھوں پر اٹھکیلیاں کرتی ہوئی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ سورج کی شعاعیں پھولوں کا عطر کھینچ رہی تھیں۔ نوخیز کلیاں گھونگھٹ کھول کر نمایش حُسن میں مصروف تھیں اور خوش الحان پرندوں کے نغمے فطرت کو وجد میں لا رہے تھے۔ سیٹھ صاحب ایک روش سے دوسری روش پر کچھ گنگناتے ہوئے مستانہ وار ٹہل رہے تھے۔ اتنے میں صحن کا دروازہ کھلا اور ایک حسین نوجوان میلے کچیلے کپڑے پہنے اندر آیا۔ سیٹھ صاحب نے گوپال مصوّر کو جھٹ پہچان لیا اور اسے اپنی آراستہ بیٹھک میں لے گئے۔

دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دروازے کی طرف سیٹھ صاحب کی پیٹھ تھی اور گوپال کا مُنہ۔ اِدھر اُدھر کی موسمی گفتگو کے بعد معاہدہ کا ذکر چھڑ گیا۔ گوپال بار بار سیٹھ صاحب کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور سیٹھ صاحب اسے محض انسانی فرض بتا کر اپنی کسرِ نفسی کا ثبوت دے رہے تھے۔ آخر سیٹھ صاحب گوپال کے لئے ملازمت کا حکمنامہ لکھنے لگے۔

اسی وقت ایک دوشیزۂ حسن کی تمام دلفریبیوں میں لپٹی ہوئی بیٹھک کے دروازے پر آکر ٹھٹھک گئی۔ وہ مسکراہٹ کے پھول بکھیر رہی تھی۔ اُس کے کالے اور لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ موٹی موٹی ساغر سی آنکھوں میں محبت کا سرمہ جھلک رہا تھا۔ ہمراہ اسے شباب کی مستی ٹپک رہی تھی اور ہونٹ گلاب کی پتیوں کی مانند سُرخ اور شگفتہ تھے۔ اس کی آنکھوں نے گوپال پر پڑیں تو پھول سے چہرے پر دفعتہً سرخی سی دوڑی اور دل میں میٹھی سی خلش محسوس ہوئی۔ جیسے کسی نے اس پر جادو سا کیا ہو۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے دل کی گہرائیوں میں سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیا ہو۔ گوپال نے بھی دوشیزہ کی ترچھی نگاہوں کا اپنی ذرد دیدہ نظروں سے مقابلہ کیا تو اُس کے سارے جسم میں میٹھی سی حرارت پھیلی۔ دل میں گدگدی سی پیدا ہوئی اور اُسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے کسی نے اُس کے دل کا سکون لوٹ لیا ہو۔ دوشیزہ کی گردن پانی کی لہر کی طرح بل کھا کر جھک گئی۔ پھر وہ دو قدم دبے پاؤں دروازے سے ہٹ گئی۔ جیسے چاند اپنا جلوہ دکھا کر بادلوں میں چھپ جائے۔ مصوّر کی آنکھیں اُسی طرف کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔

سیٹھ صاحب حکمنامہ لکھنے میں مشغول تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اُن کی پیٹھ کے پیچھے اور منہ کے سامنے کیا کیا گُل کھِلے۔

سیٹھ جمنالال کے مکان کے ساتھ ہی ایک وسیع باغ تھا جس میں اُس نے ایک دو طبقہ دیوانخانہ بنوایا تھا اور جہاں وہ کبھی کبھی گھر کے شور و غل سے دُور تنہائی میں بیٹھ جاتے اور اپنے کاروبار کی نسبت پیچیدہ باتیں سوچ لیا کرتے۔ اسی دیوانخانے کی پہلی منزل میں نگارخانہ قایم ہوا اور سیٹھ صاحب نے مصوّر کو ہدایت کی کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر ایک ایسی تصویر تیار کرے جو اس کا شاہکار ہو۔ اور جب تک یہ مکمل نہ ہو جائے وہ نگارخانے سے باہر قدم نہ رکھے۔ گوپال کو کسی چیز سے واسطہ نہ تھا۔ روٹی وغیرہ سیٹھ صاحب کا ملازم وقت پر وہیں لے آتا۔ وہ صبح اور شام کے وقت اکثر تصویر کشتی میں مہک رہتا اور کبھی کبھی دن میں تھوڑی دیر کے لئے باغ کی سیر سے فرحت حاصل کرتا۔ یا چارپائی پر آنکھیں بند کئے ہوئے کچھ سوچے لگتا۔ یہاں تک کہ تصور کی دنیا میں گم ہو جاتا۔ بیچ پوچھئے تو وہ سیٹھ صاحب کا بے زبان قیدی تھا۔

گوپال نے اُس واقعے کو بھول جانے کی بہت کوشش کی۔ جو سیٹھ صاحب کے مکان میں قدم دھرتے ہی اُس کے پیش آیا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے محسن کے ساتھ غداری کرے اور اُس کی مہربانیوں کا یہ بدلہ دے کہ اُس کی لڑکی کے عشق کا دم بھرے۔ لیکن ۔۔۔ میں بالکل ناکام رہا۔ کیونکہ اُس حُسن و رشباب کے تڑپتے ہوئے مجسمہ کی محبت آنکھوں سے اڑ کر دل کی گہرائی میں پہنچ چکی تھی اور خون کے ساتھ تحلیل ہو کر رگ رگ میں سما چکی تھی وہ اُس کی یاد میں محو ہو جاتا اور پھر اٹھ کر جھومنے لگتا۔ رات کو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ حسینہ اُس کے سرہانے کھڑی نور بکھیر رہی ہے۔ اور اپنے تبسم سے ماحول کو وجد میں لا رہی ہے۔

اُسے اپنی حالت کا بھی پورا پورا احساس تھا۔ گو اس نے ساری

عمر عزت میں گزاری تھی لیکن اسے اس طرح چار دیواری میں نظر بند رہنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ سیٹھ صاحب نے اُسے مکان اور باغ سے باہر قدم رکھنے سے کیوں منع کیا۔ یہ اس کے لئے ایک معما تھا۔ کبھی کبھی اُسے خیال ہوتا کہ شاید وہ اس قید سے کبھی آزاد نہ ہو سکے گا اور وہ گھبرا جاتا۔ اس نے کئی دفعہ وہاں سے بھاگ نکلنے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن پھر اسے کوئی خیال سا آ جاتا اور وہ اپنا ارادہ ترک کر دیتا۔

سیٹھ جمالال کی لڑکی رادھا اکثر شام کے وقت باغ کی سیر کے لئے نکلتی اور دیر تک وہیں گلگشت میں مصروف رہتی۔ وہ عموماً ایک سرو کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتی جو اس نگارخانے کے بالکل قریب تھا جہاں اس وقت گوپال دین دنیا سے بے خبر تصویر کشی میں محو ہوتا۔ وہ درخت کے سہارے اسی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتی اور کسی خیال میں کھو سی جاتی۔ کبھی کبھی اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا اور آنکھیں ہوتی پر وہ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی قیمتی چیز کھو بیٹھی ہے۔

جب ہر طرف شام کا دھندلکا پھیل جاتا۔ تاریکی ہر سو روشنی کا تعاقب کرنے لگتی اور ہر چیز اندھیرے میں گم ہو جاتی تو وہ اٹھ کر دبے پاؤں نگارخانے کے پاس جاتی اور کھڑکی کی چلمن سے اندر جھانکتی۔ اس کی نظریں سیدھی اس تصویر پر پڑتیں۔ جسے گوپال سب کچھ بھول کر کھڑکی کی طرف پیٹھ کئے روشنی کے سامنے تیار کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوتا۔ وہ دفعتہً چونک سی پڑتی۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل جاتی اور دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ پھر لمبے لمبے سانس بھرتی اور مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی لوٹ آتی۔ اس وقت اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس سے کوئی پیاری چیز چھینی جا رہی ہے۔

سیٹھ جمالال جاہتے تھے کہ تصویر جلد تیار ہو جائے کیونکہ آل انڈیا آرٹس ایگزیبیشن عنقریب کلکتہ میں منعقد ہونے والی تھی۔ جب دوپہر کو گوپال روٹی کھانے کے لئے دالان میں نکلتا تو سیٹھ صاحب اکثر اس کے پاس جاتے اور تصویر کی نسبت دریافت کر لیتے۔ انہوں نے نگارخانے میں جانے کی کبھی کوشش نہ کی۔ کیونکہ گوپال نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تصویر تکمیل سے پہلے دکھانا قواعد فن مصوری کے خلاف ہے جب گوپال انہیں اطمینان دلاتا کہ تصویر مقررہ وقت پر ضرور مکمل ہو جائے گی تو ان کے چہرے پر مسرت کی جھلک نمودار ہو جاتی اور وہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ معقول انعام کا وعدہ کرتے

جب پورے تین دن گزر گئے تو سیٹھ صاحب شام کے وقت باغ میں گئے اور گوپال کو بلا بھیجا۔ گوپال کے آتے ہی سیٹھ صاحب نے بے تابی سے پوچھا "کیوں! تصویر تیار ہو گئی؟ آج آخری دن ہے"۔ جی ہاں" گوپال نے اطمینان اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "میں اسے کب دیکھ سکوں گا؟" سیٹھ صاحب نے پھر پوچھا۔ "کل صبح" گوپال نے جواب دیا۔

گوپال نگارخانے میں واپس آیا تو تصویر کے سامنے بیٹھ کر اپنی قابلیت کو خود سراہنے لگا۔ وہ اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کا شاہکار تیار ہو چکا تھا۔ اس کی انتہائی رعنائی اور دلکشی کو دیکھ کر وہ خود شک کرنے لگا کہ آیا ایسی لطیف اور حسین چیز واقعی اسی کے تخیل کا نتیجہ ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ سارا ماحول مسکرا رہا ہے اور اس کے درمیان وہ تصویر بھی مسکرا رہی ہے ـــ تب ـــ گوپال خود بھی مسکرا دیا۔

علی الصبح جب مرغ سحر نے کائنات کو بیداری کا پیغام سنایا سیٹھ صاحب بستر استراحت سے اٹھے اور سیدھا نگارخانے کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ گوپال اس وقت تصویر کے سامنے بیٹھا کچھ گنگنا رہا تھا۔ آواز سن کر چونک سا پڑا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ صاحب نے اندر آ کر بے تابی کے ساتھ پوچھا "تصویر کہاں ہے؟" گوپال نے آگے بڑھ کر تصویر پر سے پردہ اٹھا لیا اور داد لینے کی خاطر سیٹھ صاحب کے سامنے فاتحانہ انداز کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

سیٹھ صاحب نے تصویر پر نظر ڈالی تو دھک سے رہ گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ غصہ سے سارے جسم میں ارتعاش پیدا ہوا اور سانس پھولنے لگا۔ نتھنے پھڑکنے لگے اور ہونٹ خزاں زدہ پتوں کی مانند ہلنے لگے انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے انہیں کنوئیں میں دھکیل دیا ہو۔ انہوں نے خشم آلود نگاہوں سے گوپال کی طرف دیکھا جیسے ایک خونخوار شیر بکری کو تک رہا ہو۔ لیکن گوپال ہنس رہا تھا اور اپنی مست نگاہوں سے تصویر کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑا تھا۔

سیٹھ صاحب کے غصے کو وہ بالکل نہ سمجھ سکا۔ اسے خود معلوم نہ تھا کہ عشق کی بے خودی میں اس نے ان کی بیٹی رادھا کو اپنے شاہکار کا موضوع بنا رکھا تھا اور یہ تصویر اُسی کی تھی۔

دینا ناتھ دارکو شاہد کاشمیری

جُرمِ سنگین

چھوڑ اے دوست خیالی باتیں
دِل بہلانے والی باتیں
اپنے نہیں یہ بیگانے ہیں
مال و زر کے دیوانے ہیں
یہ سرمایہ دار ہیں سارے
دولت کے بیمار ہیں سارے
اپنی دُھن میں جھوم رہے ہیں
عیش کے پاؤں چوم رہے ہیں
اُن کے شیشوں میں جو مے ہے
جانتا ہے تو یہ کیا شے ہے
رنگِ ہوس کی گلکاری ہے
نشہ نہیں ہے بیماری ہے

دیکھ غریبوں کو تو جا کر
بیٹھے ہیں کیا ناوک کھا کر
چہرے زرد، لبوں پر آہیں
اشکوں سے نمناک نگاہیں
فاقوں سے یہ حال ہوا ہے
جینا ایک وبال ہوا ہے
راہِ قضا کی دیکھ رہے ہیں
شانِ خدا کی دیکھ رہے ہیں
دیکھ کے حال اِن مظلوموں کا
بھوے بھالے معصوموں کا
روحِ سکوں مضطر ہوتی ہے
چرخ کی آنکھ لہو روتی ہے
پتھر کا دِل موم بھی گر ہو
بے رحموں پر کچھ نہ اثر ہو
عیش کی گود میں جو سوتا ہے
کیا جانے غم کیا ہوتا ہے

اُن کا جُرم معاف نہ ہوگا
ہوگا تو اِنصاف نہ ہوگا

خاورؔ

دنیائے ادب

ادبیات ۱۹۳۶ء میں

تمام متمدن دُنیا کی پورے سال بھر کی ادبیات کا جائزہ لینا سمندر کی لہروں کو گننا ہے۔ کیونکہ نئی کتابوں کا کوئی شمار نہیں ہو سکتا۔ اور ادبی تحریکات سیاسی واقعات کی طرح نمایاں نہیں ہوتیں۔ وہ عموماً معاشرت یعنی سوسائٹی کی سطح کے نیچے کام کرتی ہیں۔ اور بہت مدت کے بعد ابھرتی ہیں۔ سالِ گذشتہ میں ادبی دنیا کی کیفیت اور حالات پر سرسری نظر ڈالنے سے کسی ایسی تحریک کا سراغ نہیں ملتا۔ جس کو خاص طور پر اس سال سے منسوب کیا جا سکے۔ اور نہ اس سال کے اندر بڑے مصنفین کی فہرست میں کسی نئے نام کا اضافہ ہوا۔ یورپ میں عام ادبیات کی روش وہی ہے۔ جو جنگِ عظیم کے بعد سے رہی ہے۔ جنگ کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ تمام دُنیا کے تجارتی، مالی اور معاشرتی انتظام میں خلل پیدا ہو گیا۔ سوسائٹی کے بعض طبقوں میں افلاس اور بے کاری بڑھ گئی اور اس کی وجہ سے وہ مخالفت جو سرمایہ دار اور مزدور جماعتوں کے درمیان پہلے سے موجود تھی اور زیادہ سخت ہو گئی۔ لیکن تعلیم یافتہ آدمیوں کو جنگ کے نتائج میں سے جس چیز کا سب سے زیادہ خیال پیدا ہوا وہ لاکھوں جانوں کا نقصان تھا۔ اور اس خیال کی وجہ سے ان کے دلوں میں امن پسندی اور صلح جوئی کے جذبات اور قوی ہو گئے۔ چونکہ کتابوں میں وہی باتیں لکھی جاتی ہیں جو انسان اپنے دل میں سوچتے ہیں۔ ان خیالات اور جذبات کا عکس یورپ کے ادبیات میں پایا جاتا ہے۔ ادبی مقاصد مختلف زبانوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں ادب کو سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل کی آمیزش سے پاک رکھنے کا خیال بہت عام تھا۔ لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ اور ہر قسم کی ادبی تصانیف یہانتک کہ شاعری، ناول اور ناٹک میں بھی ان تمام سوالات سے آگاہی اور دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ جو یورپ کے اپنے معاشرتی اقتصادی اور سیاسی زندگی کی جدید تنظیم میں درپیش ہیں۔ انیسویں صدی کے مقابلے میں آج کل کے ادبی مقاصد کا ایک اور اہم اختلاف یہ ہے کہ اب عقل اور عقل کے بنائے ہوئے سائنس پر اتنا بھروسہ نہیں کیا جاتا جتنا اس وقت کیا جاتا تھا۔ بلکہ عقل کے ساتھ وجدان کو بھی جگہ دی جاتی ہے جس کو ان تمام فطری محرکات کا مجموعہ خیال کرنا چاہیے۔ جو انسان اور دوسرے حیوانات میں مشترک پائے جاتے ہیں۔ یا جو انسان کے لئے مخصوص ہیں۔ ان محرکات میں ایک نہایت زبردست محرک جنسی کشش ہے۔ یعنی عورت اور مرد کا فطری لگاؤ جس پر یورپ کے مصنف اب ایسے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جو انیسویں صدی میں خلافِ تہذیب اور خلافِ اخلاق خیال کئے جاتے۔ اس بارے میں جس مصنف کا انگریزی ادبیات پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ D. H. Lawrence ہے۔ اور لارنس کی وفات کو چھ سال سے زیادہ گزر گئے۔ لیکن اس کی نظم و نثر کا اب بھی بہت چرچا ہے اور ہر سال اس کے متعلق نئی نئی کتابیں لکھی جاتی رہتی ہیں ۱۹۳۶ء میں اس کے متفرق مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جن میں سے اکثر اس کی اپنی زندگی میں اشاعت سے محروم رہ گئے تھے۔ اس مجموعے کا نام Phoenix ہے اور اس میں بہت سے ایسے مضامین ہیں۔ جن کو Lawrence کے فلسفۂ حیات اور اسلوبِ بیان کا بہترین نمونہ خیال کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی زبان کے ایک مشہور ادیب و شاعر W. B. Yeats کا قول ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں انگلستان میں شاعری کا جتنا زور رہا ہے وہ سوائے سترہویں صدی کے نصف اوّل کے اتنی مدت میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ خود Yeats کے علاوہ جن شعراء کے کلام پر ۱۹۳۶ء میں سب سے زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ ان میں Hardy اور Housman خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اس سال کے اندر اپنی کوئی نئی اہم نظم شائع نہیں کی۔ لیکن سال کے شروع میں ان کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ Hardy کی شاعری میں علاوہ بعض نئی جدتوں کے اس زمانے کی تمام ادبی، علمی اور معاشرتی تحریکات کی جھلک موجود ہے۔ اور یہ اثر یورپ اور امریکہ سے گزر کر مشرق میں بھی محسوس ہوا ہے ہمارے ملک

میں بنگال کے بعض شاعر جو دیسی شعراء کی بہ نسبت مغربی ادبیات سے زیادہ باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً سدھندر ناتھ دتا، مسٹر بریم انند ناتھ مترا اور مسز سمرسین ہمنڈ رع کی شاعری سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ یورپ میں ناول نئے خیالات کی ترجمانی اور اشاعت کا ایک بہت مفید ذریعہ قرار پا گیا ہے۔ اور بہت کم ناول ایسے لکھے جاتے ہیں۔ جن کا قصہ سے زیادہ کوئی مقصد نہ ہو۔ انگلستان میں گذشتہ سال جتنے ناول شائع ہوئے۔ اُن میں Morgan کا Sparkhan Brohe اور Aldous Huxley کا Eyeless in Gaza بعض لحاظ سے شاید سب سے زیادہ وقیع خیال کئے جا سکتے ہیں۔

Mr. Morgan کا ناول بظاہر حسن و عشق کی ایک داستان ہے لیکن اس کے ضمن میں شاعر طبع انسان کی ذہنیت کا جو خاکہ کھینچا گیا ہے وہ بہت سے باریک فلسفیانہ پہلو رکھتا ہے۔ اور Mr. Aldous Huxley کے ناول کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ اس زمانہ میں سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل میں سے کونسا ایسا مسئلہ ہے جس کا کچھ ذکر اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ اگرچہ ناول کی ایجاد کا فخر انگلستان کو حاصل ہے لیکن زمانہ حال میں اس کے بہترین نمونے غالباً اور ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں فرانس اور روس کے ناول نویسوں کی بہت شہرت تھی۔ اس لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ ۱۹۳۶ء میں ناول نویسی کے فن میں ان ملکوں کا کیا پایہ ہے۔ فرانس میں Balzac اور Zola کے زمانے سے Realism یعنی واقعیت کا تسلط رہا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ قصہ کے پیرائے میں روزمرہ زندگی کی تصویر پیش کی جائے جس میں زندگی کا سیاہ و سفید یعنی سب اچھی اور بُری چیزیں یکساں نمایاں ہوں۔ گذشتہ سال فرانس میں جو معرکتہ الآرا ناول شائع ہوئے ہیں۔ اُن میں یہ رنگ بدستور قائم ہے۔ ان میں شاید سب سے زیادہ دلچسپ ناول Jules Romain کا ضخیم ناول Men of good will ہے۔ جس کے بعض حصے گذشتہ سال اور بعض اس سے قبل شائع ہوئے تھے۔ جن میں بہت سے مردوں اور عورتوں کے کردار ہیں جن کو اس زمانہ کے شہر پیرس کے باشندوں کی تصویریں خیال کیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ ابھی مصنف نے اپنے قصے کو پورا نہیں کیا۔ اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ اس کا اصلی مقصد کیا ہے۔ واقعیت کے اس غلبہ کے خلاف بغاوت کے بھی کچھ آثار فرانس میں نمودار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں کئی ایسے ناول بھی شائع ہوئے۔ جن کے مصنفین نے جو عموماً نئی پود کے لوگ ہیں۔ واقعاتِ حاضرہ سے قطع نظر کر کے یا تو محض خیالی افسانے لکھنے کی کوشش کی اور اپنے ملک کی گذشتہ معاشرت اور پرانی عمارتوں کو اپنے قصوں کی بنیاد قرار دیا۔ موجودہ دور کی اُلجھنوں سے تخلص حاصل کرنے کا ایک طریقہ گذرے ہوئے زمانے کی یاد اور دور افتادہ ملکوں کی سیر بھی ہے۔ اور اس پر سفرنامہ اور تاریخی افسانوں کی دلچسپی قائم ہے۔ ۱۹۳۶ء کے بہترین تاریخی افسانے غالباً مشہور جرمن مصنف Feuchtwanger Thomas Mann اور اس کے بھائی Heinrich Mann کی وہ تصانیف ہیں۔ جن کا مافوق یہودیوں کی پرانی تاریخ ہے۔ یہ دونوں مصنف یہودی نسل سے ہیں۔ جنہوں نے جرمن حکومت کی موجودہ سیاسی روش کے دباؤ سے ترکِ وطن کیا ہے۔ اس سیاسی روش اور فلسطین میں عربوں کی مخاصمانہ جدوجہد کی وجہ سے یہودیوں کی روایات، اُن کی تاریخ اور اُن کے مستقبل میں یورپ کی دلچسپی از سرِ نو تازہ ہو گئی ہے۔ اور ۱۹۳۶ء میں یورپ اور امریکہ میں بہت سی کتابیں ان مضامین کے متعلق شائع ہوئی ہیں۔ جن میں سے بعض یہودیوں کے موافق اور بعض اُن کے مخالف ہیں۔

روسی افسانہ نگاری کا آخری مشہور علمبردار M. Gorky تھا۔ جس کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ گورکی اگرچہ روس کے موجودہ اشتراکی خیالات کا معتقد اور Lenin کا ذاتی دوست تھا۔ لیکن اس کی بہترین تصانیف اس معاشرت اور تمدن سے متعلق تھیں۔ جس کو بالشویکی انقلاب نے فنا کر دیا ہے۔ انقلاب کے بعد سے روسی ادبیات بالشویکی عقائد کی تبلیغ کے لئے وقف ہو گئی ہیں۔ اور کسی ایسے مصنف یا تصنیف کا نام لینا دشوار ہے۔ جس نے سالِ گذشتہ میں کوئی خاص امتیاز حاصل کیا ہو۔ دراصل اشتراکیت کسی قسم کے بھی غیر معمولی امتیاز کو پسند نہیں کرتی۔ اور اس کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ آئندہ اور صنعت و حرفت کے مانند تصنیف و تالیف بھی باہمی تعاون کے اصول پر کی جائے۔ یعنی یہ کہ کوئی کتاب ایک آدمی کی بنائی ہوئی نہ سمجھی جائے۔ بلکہ اس کے بنانے میں بہت سے آدمیوں کا ہاتھ ہو۔ جہاں تک مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم کا تعلق ہے۔ روسی خیالات کا اثر دور دور کے ملکوں پر پڑ رہا ہے۔ ۱۹۳۶ء کے آغاز سے امریکہ کی ادبیات خصوصاً مختصر افسانوں میں اشتراکی خیالات کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔ اس کی بُری وجہ غالباً یہ ہے کہ جنگ سے پہلے امریکہ ایک مالدار ملک سمجھا جاتا تھا لیکن تجارتی اور مالی نظام کی بربہی نے وبالِ بھی افلاس اور بیکاری کا ناگوار مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ اور لحاظ سے بھی امریکہ کی ادبیات میں وہی سب میلانات پائے جاتے ہیں جن کا یورپ میں سراغ ملتا ہے۔ اور برِ اعظم کے مصنفین میں جن Eugene O. Neide

کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کے مختلف ناٹکوں کی شہرت ۱۹۲۰ء سے سنی جاتی ہے۔ لیکن حال میں نوبل پرائز کے مل جانے سے اس شہرت پر مہر ثبوت لگ گئی ہے۔ امریکہ کے مغائل بحرالکاہل کے دوسرے ساحل پر بھی روس کے اشتراکی عقائد کا کچھ پرتو دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ چین کے نوجوان مصنفین کے جو ترجمے یورپین زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں یہ میلان خاصہ نمایاں ہے۔

انگلستان، فرانس اور جرمنی کے علاوہ یورپ کے اور ملکوں میں بھی ادبیات کو سیاسی، مذہبی اور معاشرتی معاملات سے کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ اور جس طرح تہذیب و تمدن کے ظاہری کوائف کے اعتبار سے مغربی دنیا کی سب اقوام ایک دوسرے سے مشابہ معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان کے خیالات میں بھی ایک حد تک یگانگت پائی جاتی ہے۔ ان ملکوں کے وہ مصنفین جو گذشتہ بیس پچیس سال میں ادبی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ (مثلاً ناروے کی مشہور ناول نویس Segrid Undset یا اٹلی کا ڈرامہ نویس Pirandello ۱۹۳۶ء میں بھی بیکار نہیں ہے۔ لیکن ان کی کوئی تصنیف بھی جو اس سن میں شائع ہوئی ہے۔ اُن کے اسلوبِ تحریر میں کسی نئے پیرائے کا آغاز یا اُن کی شہرت میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتی۔

مغربی ادبیات کا ایک رجحان جو ہمارے لئے خاص طور پر دلچسپ ہے، مشرق اور مشرقی خیالات کا ذوق ہے۔ جو اب کئی سمتوں میں دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں کرنس لارنس کی Seven Pillars of Wisdom نے جو ہل چل ادبی دُنیا میں پیدا کر دی تھی۔ وہ اس ذوق کا بیّن ثبوت ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک اس کتاب کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں بھی جن عنوانوں نے زیادہ مقبولیت حاصل کی اُن میں مشرقی سیاحت کی کتابوں کی تعداد غالب معلوم ہوتی ہے۔ یورپ میں مشرقیت کا شوق کوئی نئی چیز نہیں۔ لیکن پہلے یہ شوق صرف خاص لوگوں تک محدود تھا۔ اب عوام کو بھی اس سے دلبستگی ہوتی جاتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ یورپ کے بعض ایسے لوگ جن کو جدید ترین خیال کا ترجمان خیال کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی نظریات خصوصاً مشرقی روحانیات کو مہذب انسانوں کی دماغی تربیت کے لئے مفید خیال کرنے لگے ہیں۔ Mr. Bernard Shaw اور Mr. Aldous Huxley جیسے ہر دلعزیز لکھنے والے بھی اب اپنی تصنیف کو مشرقی سامانِ آرائش سے مزین کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور بعض کم عام پسند مصنفین تو مشرقی خیالات کے بہت ہی گرویدہ معلوم ہوتے ہیں۔ مشرقیت کے ذکر نے مجھے Rudyard Kipling کی وفات کی یاد دلا دی۔ جو ۱۹۳۶ء کے شروع دنوں میں واقع ہوئی تھی۔ Kipling چند سال سے تصنیف و تالیف کو عملاً ترک کر چکے تھے تو بھی انگلستان کے ادبی حلقوں اور انگلستان کے باشندوں کے دل میں اُن کی خاص جگہ تھی۔ ان کا اکثر ادبی سرمایہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے تجربہ سے فراہم کیا گیا تھا۔ اور اگرچہ اس ملک کی تعلیم یافتہ جماعت ان کی کہانیوں اور نظموں کو نسلی تعصب کی وجہ سے ناپسند کرتی تھی۔ لیکن ہم کو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ ایک مدت تک انگلستان کے طبقہ عوام کو ہندوستانیوں کا جو کچھ بھی علم تھا۔ وہ ان ہی کہانیوں اور نظموں کی بدولت تھا۔

"ساقی"

(ریویو فیصلہ مرزا محمد سعید صاحب ایم اے آئی ای ایس)

رُباعی

دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
ستانہ فیض مرشد ہوتا ہوں میں
جب مدینہ میں غروب ہو جاتا ہے
سایہ کیف طلوع ہوتا ہوں میں

(جوش)

"کلیم"

ترانۂ بہار

پھر دامنِ صبا میں ہے مے خانہ آج کل
پھر ہر نفس ہے گردشِ پیمانہ آج کل

پھر عقل میں ہے عنصرِ وحشت کی خواجگی
پھر فقر میں ہے شوکتِ شاہانہ آج کل

پھر جوش پر ہے موسمِ برنائیِ جمال
پھر باڑھ پر ہے عشوۂ ترکانہ آج کل

پھر صدرِ بزمِ حسن ہے عشقِ زمانہ سوز
پھر کارسازِ شمع ہے پروانہ آج کل

پھر لائقِ سجود ہے مینائے زرنگار
پھر قابلِ طواف ہے خمخانہ آج کل

پھر فرش پر ہے جلوۂ افلاک ان دنوں
پھر عرش پر ہے نعرۂ مستانہ آج کل

پھر زندگی زمان و مکاں پر ہے حکمراں
پھر وقت میں ہے خوئے غلامانہ آج کل

پھر ہر خدا پرست ہے آوارۂ بتاں
پھر ہر خرد فروش ہے دیوانہ آج کل

پھر ہر روش ہے ایک گلستانِ زلف و رخ
پھر ہر کلی ہے ایک صنم خانہ آج کل

پھر ہر کلہ ہے تاجِ ملوکانہ ان دنوں
ہر ہر خذف ہے گوہرِ یک دانہ آج کل

پھر ہر غلامِ دہر ہے آقائے بحر و بر
پھر ہر کنیزِ شہر ہے سلطانہ آج کل

پھر شادماں ہے جذبۂ گستاخ ان دنوں
پھر کامراں ہے جرأتِ رندانہ آج کل

جس پر نثار کون و مکاں کی حقیقتیں
پھر کہہ رہا ہے جوش وہ افسانہ آج کل

"کلیم"

(جوش)

نقد و نظر

جواہرِ سخن جلد دوم

جواہرِ سخن" اردو شعرا کے کلام کا انتخاب ہے جسے فاضل ادیب اور رشاعر مولوی محمد امین صاحب چریاکوٹی نے چھ جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ جلد دوم اُس دور شاعری پر مشتمل ہے جو ۱۱۸۵ھ سے شروع ہو کر ۱۲۵۰ھ کے قریب ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۳۸ اساتذہ اور دوسرے قابلِ ذکر شعرا کے مختصر حالات اور انتخاب کلام درج ہے اور نثر پر بیالیس ساڑھے آٹھ سو صفحات پر ختم ہوئی۔ شاعری کی تاریخ میں یہ دور بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ میر، سودا، درد، میر حسن، جرأت، انشا، مصحفی، شاہ نصیر، قائم جیسے باکمال شعرا کا زمانہ تھا، جنہوں نے اردو شاعری میں ترقی اور نشو و نما کی روح پھونک دی، زبان کو پکا بنا دیا اور وسعت دی، مختلف اصنافِ سخن کو اردو میں ایک اعلیٰ مرتبے پر پہنچایا، کئی نئی اصنافِ شعر ایجاد کیں اور اپنے بلند فکر و تخیل سے اردو شاعری کو آسمان پر پہنچا دیا۔ کلام کے انتخاب میں فاضل مرتب نے بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے اور عموماً حسنِ کلام کو وجہِ انتخاب ٹھہرایا ہے۔ یہ ایک بے حد مشکل کام ہے اور صرف ایک ذوقِ سلیم رکھنے والے شاعر ہی سے ممکن ہے۔ لیکن اگر وہ اُس زمانے کی زبان اور روش دکھانے کے لئے بعض ایسے شعر بھی درج کر دیتے جن سے ذوق وجدان تو لطف نہ اٹھا سکتے لیکن معلومات میں اضافہ ہو سکتا تو کتاب کی افادی حیثیت بڑھ جاتی۔ مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے نے اس کتاب پر نظر ثانی کی ہے اور ابتدا میں ایک پُر مغز دیباچہ لکھا ہے۔ کتاب عمدہ چھپی ہے نہایت صاف چھپی ہے لیکن طباعت کی غلطیاں کثرت سے رہ گئی ہیں۔ قیمت آٹھ روپے۔ مجلد کے لئے آٹھ آنے زائد۔ ملنے کا پتہ۔ ہند وستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ، الہ آباد۔

نقش و نگار

یہ حضرت جوش ملیح آبادی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر نظمیں اہلِ ذوق کے لئے نئی ہیں اور کچھ رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ جوش اس عہد کے تنہا ہندوستانی شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں مقامی اثرات کی اتنی روانی ہے جو ہم کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں دیکھتے۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر اعلیٰ و ادنیٰ اور اہم و غیر اہم شے میں حسن کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور اپنی شاعرانہ قدرت سے دوسروں کو بھی اس حُسن کا احساس کرا سکتے ہیں ان کے کلام کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زبان کے ہر لفظ کو اپنے دلکش شعروں میں استعمال کر کے حسین بنا دیا ہے۔ گویا اپنے ملک اور ماحول سے وہ ہمیں محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ ہمیں ان چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جن کو ہماری سطحی نگاہیں نظر انداز کر دیتی ہیں انہوں نے ہمارے لئے الفاظ میں ایسی شاعری پیدا کر دی ہے کہ شعرا کو انہیں اب اپنے اشعار میں استعمال کرنے سے عار نہیں آتی یہ تو تھیں اس بے بہا مجموعہ کی ملی خوبیاں ذوقِ وجدان کے لئے بھی اس میں کیف و اثر کا بہت سامان ہے۔ ہماری رائے ہے کہ یہ مجموعہ جدید شاعری کے ہر قدر دان کے پاس ہونا چاہیئے حجم دو سو صفحات سے زاید ہے۔ آغاز میں لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی کا ایک مبسوط اور فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت مجلد دو روپیہ اور جلد ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ جامعہ ملیہ دیوبند کے ہر دلعزیز مینیجر مولانا عبدالرحیم صاحب نشاط کی کوششوں سے یہ کتاب بہت عمدہ چھپی ہے۔

"میثاق النبیین"

مولفہ جناب مولانا عبدالحق صاحب فاضل سنسکرت و عربی۔ انبیاء عالم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ حضور نے تمام انبیاء عالم کی تصدیق کی ہے اور انبیاء ماقبل پر ایمان لانا ایک مسلمان کے لئے جزو ایمان ٹھہرایا ہے۔ اس کے بالمقابل حضور کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انبیاء عالم نے بھی آپ کی تصدیق کی ہے اور اپنی اپنی امتوں سے آپ پر ایمان لانے کا میثاق (مضبوط عہد) لیا ہے۔ حضور صلعم کی اس دوسری شان کو کتاب میثاق النبیین میں دکھایا گیا ہے اور حضور کے متعلق ژند و ستا۔ ویدِ اور صحفِ اولیٰ اور صحائف انبیاء بنی اسرائیل سے صدہا پیشینگوئیاں دکھائی گئی ہیں اور ان کتبِ مقدسہ کے بعض حوالجات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک محمد و احمد صریحہ کے واقعات زندگی کا تذکرہ بطور پیش خبری بیان ہوا ثابت کیا گیا ہے پیشینگوئیوں کا ترجمہ سنسکرت و عربی عبارت میں عکس دیا گیا ہے۔ بشارات کے کل حوالجات ساتھ ہیں اور ان کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ الگ الگ دیا گیا ہے بحیثیت مجموعی اس موضوع پر اردو زبان میں یہ سب سے پہلی تصنیف ہے جس کے لئے قابل مولف مستحق مبارکباد ہے ضخامت کتاب ۲۷۵ صفحات کتابت طباعت دیدہ زیب، کاغذ عمدہ لگایا گیا ہے قیمت اکیر روپیہ آٹھ آنے محصول ڈاک آٹھ آنے مینیجر دار الکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگس لاہور۔

منصور احمد

ڈاک کے ڈاکو ہزاروں خریداروں کی طرف سے ہمیں شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور ہمیں خریدار بنانے میں جو سلسلہ نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا حالانکہ پرچہ بھیجنا دھیرکی ذمہ دار کو نہیں بلکہ ڈاکخانہ کی غفلت سے کہ نہیں۔ دفتر اس بات میں کرتا ہے کہ ہر دوسری آنا ہی نمبر شامل ہو جاتے۔ اگر ہمیں ذرا سا بھی شک ہو کہ آپ کا پرچہ نہ ملنے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہوا۔ ایسی ایک شکایتی کارڈ اپنے علاقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک ہمیں لکھئے۔ اگر آپ کا پرچہ دو بار بھیجا جائے تو سمجھ لیجئے کہ ڈاک کے دو ڈاکو کی نذر ہوا۔ ایسی ایک شکایتی کارڈ اپنے علاقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک ہمیں لکھئے۔ اگر آپ کا پرچہ دو بار بھیجا جائے تو سمجھ لیجئے کہ ڈاک کے دو ڈاکو کی نذر ہوا۔ ایسی ایک شکایتی کارڈ اپنے علاقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک ہمیں لکھئے۔

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ اپریل ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ تصاویر:- (۱) الہام موسیقی (۲) رخصت **نمبر ۶**

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	آئینۂ عالم	ادارہ	۴۲۲
	افسانے		
۲	باپ کا گناہ	جناب منظور صاحب	۴۳۳
۳	کرشمۂ الفت	جناب یسین صاحب ایم اے	۴۴۲
۴	پریما	جناب آسی رامنگری	۴۶۰
۵	کیا دو سب تعالیٰ جلیکے	محترمہ سلیمہ سلطانی بیگم صاحبہ لکھنوی	۴۶۷
	علمی و ادبی مضامین		
۶	نظریۂ ادویت کی فلسفیانہ اہمیت	چودھری اکبر علی صاحب بی اے عثمانیہ	۴۲۹
۷	وہ رات	الف ایم ساقی صاحب	۴۴۰
۸	وکٹر ہیوگو کی محبت	حضرت خلیل	۴۵۰
۹	عشق اور خود داری	سید محمد یوسف صاحب مولوی عالم بھوپال	۴۶۴
۱۰	ایک راہبہ کے محبت نامے	جناب عظیم قریشی	۴۷۳
	حصۂ نظم		
۱۱	غزل	جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی اے	
۱۲	امید موہوم		۴۳۲
۱۳	جام صہبائی	جناب خواجہ عبدالمسیح صاحب پال اکثر صہبائی	۴۴۱
۱۴	طلسم گفتار	جناب عبدالمجید صاحب عدم بی اے	۴۴۲
۱۵	قطعات	حضرت نفیس فتح آبادی ایم اے	۴۴۸
۱۶	بزم فطرت	حضرت تاجور سامری	۴۴۹
۱۷	رباعیات	جناب سید محمد عسکری طباطبائی	۴۵۷
۱۸	گائے جا	جناب روشن نکودری	۴۵۸
۱۹	غزل	جناب عجم ندوی بی اے	۴۵۹
۲۰	آمد مسیح	"تیراجی"	۴۶۳
۲۱	غزل	حضرت سیفی نوگانوی	۴۶۶
۲۲	دعوت عمل	حضرت ابرار احمد صاحب فاروقی عزمی	۴۷۱
۲۳	رباعیات	حضرت حرماں شیر آبادی	۴۷۲
۲۴	اعتماد	حضرت عدم	۴۷۶
۲۵	دنیائے ادب		۴۷۷
۲۶	نقد و نظر	ادارہ	۴۸۴

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے (۵) ممالک غیر سے دس (۱۰) شلنگ

(گیلانی الیکٹرک پریس بیرون دہلی دروازہ لاہور میں باہتمام صفدر الدین احمد پٹھ و شائع کردہ ادبی دنیا کرشل بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔)

آئینۂ عالم

سوٹ کیس میں پوری لائبریری

ایک وکیل اپنی پوری لائبریری سوٹ کیس میں بند کر کے حاضر عدالت ہو سکتا ہے۔ قینچی کا چھوٹے سے چھوٹا سکول برٹش میوزیم کی تمام کتابیں خرید سکتا ہے۔ اچھی سے اچھی کتاب دو ڈھائی آنے میں فروخت کی جا سکتی ہے۔

لائبریرین مینیشن گرائی کر رہے ہیں کہ مائکرو فوٹوگرافی کے ذریعے سے یہ انقلاب عنقریب آنے والا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ہی یہ عمل تجارتی حیثیت اختیار کر لے گا اور آپ کا دو ہزار صفحات کی کتاب کا حجم ایک صفحہ کے برابر ہو جائے گا۔ ابھی سے نیویارک پبلک لائبریری، برٹش میوزیم اور لاس انجلیز کی ہنٹنگڈن لائبریری نے اس کا استعمال شروع کر دیا ہے۔

واشنگٹن کا صیغۂ مردم شماری ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے ..... ۵۰ ناموں کی فہرست کو ایک چھوٹی سی جلد میں منتقل کر رہا ہے۔ کتاب کا ورق کھول کر ایک متحرک گاڑی پر رکھ دیا جاتا ہے جو اونچائی پر رکھے ہوئے کیمرے کے نیچے ایک لائن پر چلتی ہے۔ کیمرے میں سے ایک لیمپ کتاب پر روشنی کی عمودی کرن ڈالتا ہے ایک دن کیمرے کو صحیح بلندی پر لاتی ہے۔ فوٹو سوداں کی ۴ بتیاں روشن کرتی ہے، اور ایک ہتھے کو دباتی ہے ایک "کرک" کی آواز آتی ہے اور کیمرا دوسرے صفحے کی طرف حرکت کر جاتا ہے۔ اسی طرح آگے اور پیچھے کیمرہ حرکت کرتا رہتا ہے تا آنکہ پوری کتاب کی تصاویر اتر آتی ہیں۔

بڑی سے بڑی لغات کے دو گنے حجم کی کتاب جس کا وزن ۱۲½ سیر ہے اور جس میں ۷۰۰۰۰ نام ہیں، چار انچ قطر کی فلم میں سما جاتی ہے اس طرح مردم شماری کا پورا ریکارڈ چھوٹی سی الماری میں سما جائے گا۔ پرانے اخبار اور اس قسم کے دوسرے ریکارڈ مائکرو فوٹوگرافی کے ذریعے سے محفوظ کئے جا رہے ہیں۔ نیویارک کی پبلک لائبریری میں لوگ "ہیرلڈ ٹریبیون" کی پوری اشاعت چند فٹ لمبی فلم پر سے پڑھ سکتے ہیں۔ یہ فلم ایک مشین میں داخل کی جاتی ہے جس کی شکل متحرک تصاویر کے کیمرے سے مشابہ ہوتی ہے اس کا فلم کیمرے کے نیچے ایک پردہ پر ظاہر ہو جاتا ہے جو اصلی سائز سے بڑا اور اتنا ہی صاف دکھائی دیتا ہے۔

یہ مشین اتنی گراں قیمت نہیں کہ چھوٹے چھوٹے کتب خانے اسے خرید نہ سکیں۔ واشنگٹن کی "سائنس سروس" ایک سنٹ فی صفحہ کے حساب سے عکس اتار دیتی ہے۔ اگر یہ اجرت زیادہ سمجھی جائے تو تصویر اتارنے اور پڑھنے کی دونوں مشینیں ۵۰ ڈالر میں خریدی جا سکتی ہیں۔

بڑے بڑے اداروں کے لئے سب سے قیمتی آلہ ایک ہزار ڈالر کا ہے۔ فلم پڑھنے کے لئے خوردبینی آلہ ابھی سے بازار میں فروخت ہو رہا ہے۔ ۱½ ڈالر میں فرانس کا بنا ہوا آلہ دستیاب ہو جاتا ہے اور امریکہ کی ایک کمپنی بڑھیا قسم کا آلہ ۵ ڈالر میں فروخت کر رہی ہے۔ ایسٹ مین کوڈک کمپنی کا آلہ جو اس وقت نیویارک لائبریری میں زیر استعمال ہے ۱۸۵ ڈالر کا ہے اور یہ اپنی قسم کا بہترین آلہ متصور ہوتا ہے جو پتلی سے پتلی فلم کے الفاظ کو نہایت صفائی سے واضح کرتا ہے۔ ان آلوں میں پردے "پہیلے سے لگے ہوئے ہیں لیکن کمرشیل آلوں میں پردے نہیں ہوتے بلکہ ان میں خوردبین کی طرح جھانکنا پڑتا ہے۔

ہیروں کے اجارہ دار

لندن کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے دو شخص دنیا کی سب سے بڑی تجارت یعنی روئے زمین کے ہیروں کے واحد اجارہ دار ہیں۔

ڈائمنڈ کارپوریشن کی دلچسپ داستان اور اس کے حصوں کی روز افزوں مانگ کی وجہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اخبار کے ایک نمایندہ کو بتایا گیا ہے کہ ہیروں کی مانگ دن بدن کیوں بڑھ رہی ہے اور صنعتی بادشاہ کس طرح دولت کے انبار لگا رہے ہیں۔ یہی وہ وجوہ ہیں جو ۱۲۰۰۰۰۰۰ روپے کے ہیرے بازار میں بیچ کر دنیا کو ششدر کر رہے ہیں۔

سر ارنسٹ آئن ہیمر گول چہرے والے خاموش طبیعت انسان جنوبی

افریقہ کے رہنے والے ہیں اور مشہور زمانہ ہیرے "جانگر" کے سابق مالک ہیں۔ آپ لائبریری کی کتابیں مسلسل پڑھتے رہتے ہیں۔

مسٹر جیک برنیٹو جن کی عمر ۷۴ سال کروڑ پتی اور گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کے مالک ہیں۔ آپ جنوبی افریقہ کے آبادکار مارنے برنیٹو کے بھانجے ہیں۔

یہ دو اصحاب اور ان کے مددگار دنیا کے ہیروں کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں اور روئے زمین کے ہیروں کی پیدائش میں ۹۵ فی صدی کے مالک ہیں۔

انہیں کے اعلیٰ استقلال کی وجہ سے بڑے بڑے انقلاب اور جنگ و خونریزی کے زمانے میں بھی ہیرا روپے کی بہترین ضمانت سمجھا جاتا ہے

سلطنتوں کے تختے الٹ جائیں، سکوں کی قیمتیں بدل جائیں لیکن ہیرے کی قدر و قیمت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔

اس کارپوریشن کو ہیرے کی برآمد پر بھی قابو حاصل ہے۔ چنانچہ مانگ سے زیادہ ہیرا بازار میں نہیں لایا جاتا اور یہ امر بالکل محال ہے کہ کسی وقت ہیرے کی بہتات اس کا نرخ گرا دے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس وقت روئے زمین کے مجموعی ہیروں کی قیمت قریباً ۴۰ کھرب پونڈ ہے اور تمام کے تمام ۱۲ مربع فٹ کے ایک ڈبے میں بند کئے جا سکتے ہیں۔ دنیا میں ہیروں کے سب سے بڑے ذخیرے ہندوستانی ریاستوں میں ہیں۔

کارپوریشن کے بڑے دفتر میں کانوں سے آئے ہوئے ٹکڑے اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے مختلف درجوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ دنیا کے تمام حصوں سے ہیروں کے دلال جو ہیروں کو تراشنے اور آب دینے والے کارخانوں کے نمائندے ہوتے ہیں خصوصاً انٹورپ اور ایمسٹرڈم کے کارخانوں کے، کارپوریشن کے دفتر میں جمع ہو کر ہیروں کو "دیکھتے" ہیں۔

قیمتوں کے متعلق کوئی دلیل یا عذر نہیں سنا جاتا کیونکہ ہر ٹکڑے کی قیمت پہلے سے مقرر ہوتی ہے۔ دلال خریدیں یا چھوڑ دیں"۔

وہ ہیرے جو کسی ظاہری طور پر خالص کاربن پر مشتمل ہوتے ہیں عورتوں کے زیورات میں استعمال ہوتے ہیں۔ آج کل بخارا کی فروغ اور شہنشاہ انگلستان کی تاجپوشی کی وجہ سے ہیروں کی مانگ بڑھ گئی ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے صنعتی ضروریات کی وجہ سے ہیرے کی مانگ قریباً دگنی ہو گئی ہے۔ بے آب اور بدرنگ ہیروں کے سب سے بڑے خریدار صنعتی کارخانے ہیں۔ ہیرا چونکہ دنیا کی سخت ترین چیز ہے اس لئے شیشے اور دھات کے کاٹنے اور سخت چیزوں پر کھدائی کا کام دیتے ہیں اس کے علاوہ تار کھینچنے، بجلی کے لیمپ کی بتی بنانے، سنگ خارا میں سوراخ کرنے اور انجنیئری کے ایسے ہی ہزاروں کاموں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

جاپانی گیشاؤں کی سٹرائک

کچھ عرصے سے دنیا کے ہر حصے میں اور کاروبار کے ہر شعبے میں سٹرائک کا دور دورہ ہو رہا ہے۔ لیکن جاپان کی ۳۰۰۰ گیشا لڑکیوں نے، پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے ایک مندر میں پناہ گزیں ہو کر سٹرائیک کرنے والوں میں ایک نئے طبقے کا اضافہ کیا ہے۔

یہ لڑکیاں اپنے مرد دوستوں کو خود منتخب کرنے کا حق طلب کر رہی ہیں اور اپنے مالکوں کے احکام کے ماتحت ہر کہ و مہ کو باریاب کرنے کے خلاف احتجاج کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ گیشا یونین کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔

بیکار رہیروں کے گیشی مقام یعنی اوساکا سے نکل کر یہ لڑکیاں فرار کوہ پر گیا کوزو کے مندر میں پناہ گزیں ہو گئی ہیں۔ مندر کے پروہتوں نے ان کی نمائندگی پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ لڑکیوں کو کھانا، شراب، سٹرائک کی تنخواہ اور سابق عشاق یہاں بھی مہیا ہیں اور وہ اپنا وقت اپنے مستقل خریداروں کو محبت آمیز خطوط لکھنے میں صرف کرتی ہیں۔

ہر روز علی الصباح گیشائیں نزدیک کے جنگلوں میں جا کر کنوؤں کے یخ بستہ پانی میں برہنہ ہو کر اپنے بدن کو پاک کرنے کے لئے نہاتی ہیں۔

فلوکو میاموتو نامی ایک حسین ترین گیشا جس کی عمر ۲۴ سال تھی، زندگی گیشاؤں کو مہاتما بدھ کی پرستش کرتے ہوئے دیکھ کر اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے چپکے سے شہر جا کر زہر کھا لیا۔ اس کی لاش پولیس کو ایک قحبہ خانے میں سے ملی ہے۔

تمام گیشاؤں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ان کی بہن کا جنازہ جو جاپانی تاریخ میں عورتوں کی سب سے پہلی سٹرائیک کی اولیں ہیروئن ہے، قومی اعزاز کے ساتھ اٹھایا جائے۔

گیشا کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

بے شمار لوگ گیشا لیڈر کی تقریر سننے کے لئے مندر میں آئے تقریر کا ملخص یہ تھا کہ "گیشائیں سستے جاپانی کھلونے نہیں ہیں"

خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سٹرائیک جاپان کے طول و عرض میں پھیل جائے گی۔

بیماریوں کے علاج اور جڑی بوٹیاں

محمد عالم قندھاری کو آسٹریلیا سے باہر بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن یہی وہ شخص ہے جو نہایت کامیابی کے ساتھ طب جدید اور جراحی کو ہر جگہ شکست دے رہا ہے۔ یہ شخص جنوبی آسٹریلیا کے باشندوں کی آنکھ کا تارا ہے ۴۵ سال سے متواتر وہ ہر قوم، فرقہ اور مذہب کے بے شمار مرد، عورت اور بچوں کا جڑی بوٹیوں کے ذریعے سے علاج کر رہا ہے۔ بنی نوع انسان کے دکھوں کو دور کرنا اس کا نصب العین ہے۔ ہر روز وہ چھ سو مریضوں کو دیکھا کرتا ہے جن میں دنیا کی تمام بیماریوں کے مریض ہوتے ہیں۔

پہلے پہل آسٹریلیا کے اخبارات نے اسے کوئی وقعت نہ دی لیکن اس کے بڑھتے ہوئے طالبوں نے طبیبوں کو ہیچ کر دیا اور اسے بدنام کرنے کے لئے ہر قسم کے ذرائع استعمال ہونے لگے لیکن وہ اپنے مریض کے دلوں میں گھر کر چکا تھا کیونکہ ان میں سے ایک بھی ناکام و نامراد واپس نہ جاتا تھا۔ اس کے علاج کے نتائج میں "افاقہ" اور "عارضی صحت" کے الفاظ کبھی استعمال نہیں ہوتے۔ اپریشن یا ناخوشگوار ادویات کا کبھی نام تک نہیں سنا چند منٹ کی تشخیص، چند بوٹیاں بس یہ علاج ہے اور اس کے نتیجہ میں شفا کلی

اس کے مریضوں کی فہرست میں بڑے بڑے اُمرا، آسٹریلیا کے سیاستدان اور حاکم موجود ہیں جن میں سے ایک ایڈیلیڈ کا پولیس کمشنر بھی ہے

طبقہ اطبا کی شدید مخالفت کی وجہ سے کچھ عرصے کے بعد وہ آزردہ ہو گیا اور اپنے وطن قندھار کو واپس چلا گیا۔ آسٹریلیا کے باشندوں نے ایک عظیم الشان عرضداشت جس پر انیس ہزار آدمیوں کے دستخط تھے اسے واپس بلانے کے لئے قندھار بھیجی۔ اس عرضداشت پر آسٹریلیا کے گورنر کی بیوی اور کمشنر پولیس کے دستخط بھی ثبت تھے۔ اس عرضداشت سے وہ بے حد متاثر ہوا اور اپنے گوشۂ عافیت سے نکل کر ایک دفعہ پھر اسٹریلیا میں وارد ہوا۔

لوگ کہتے ہیں یہ انسان ہے یا مجسم معجزہ۔ وہ طب جدید اور جراحی کو علی الاعلان دعوت مقابلہ دیتا ہے۔ اس کے مطب میں مرد اور عورتوں کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ ہمارے سڑیٹ کے ماہر اطبا مجموعی طور پر بھی اتنے مریض

کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔ اگر اس کی دواؤں کا اثر فوری، یقینی اور مستقل نہ ہوتا تو شاید اب تک وہ کئی مرتبہ عدالت میں رگیدا گیا ہوتا۔

تھوڑے ہی دن ہوئے توہین عدالت کے جرم میں ایڈیلیڈ کی عدالت میں اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن جج نے اسے ۲۶ پونڈ خرچہ دلائے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے وکیل کو عدالت سے روپیہ وصول کرنے سے روک دیا، یہاں تک کہ وکیل کو بل میں سے بھی وہ رقم وضع نہ کرنے دی اور پورا بل ادا کر کے چلا آیا۔

وہ آسٹریلیا کے ایک غریب ترین علاقہ میں رہتا ہے اور اس وقت تک اٹھارہ ہزار پونڈ خیرات کر چکا ہے۔

وہ اپنی ادویات کی قیمت بھی وصول نہیں کرتا۔ اس کے میز پر ایک برتن پڑا رہتا ہے جس میں مریض اظہار تشکر کے طور پر چند سکے ڈال جاتے ہیں اور وہ انہیں جمع کر کے غربا میں تقسیم کر دیتا ہے۔

محمد عالم اب تک کئی جائیدادیں خیرات کر چکا ہے۔ مغربی اسٹریلیا میں سونے کی کانوں پر وہ خانچہ لگاتا تھا۔ وسطی آسٹریلیا میں ساربانی کا کام کرتا رہا ہے۔ کوئنس لینڈ میں قلی اور چوکیدار رہا ہے۔ ملاحی اور کان کنی کا کام بھی کر چکا ہے۔

وہ قندھار کے ایک معزز خاندان کا فرد ہے اور گزارے کے لئے اس کے پاس کافی سہارا ہے۔ اس وقت اس کی عمر ۷۷ سال ہے لیکن یہ جنگل ۵۰ سال کا معلوم ہوتا ہے۔ وہ دن میں بیس گھنٹے کام کرتا ہے، اسلام کا سچا پیرو ہے اور کسی طرح بھی امیر بننے پر رضامند نہیں ہوتا۔

جوانی کے دنوں میں بھی وہ بڑا مخیر تھا اور جڑی بوٹیوں کے علاج میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ ہندوستان میں اس وقت بھی بہت سے لوگ بوٹیاں جمع کرتے ہیں لیکن نیم حکیموں نے اخلاص سے کام کرنے والوں کو بھی بدنام کر رکھا ہے

افغانستان میں ہندوستان کی طرح یہ علم سینہ بہ سینہ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا آتا ہے۔ محمد عالم کا ایمان ہے کہ خدا نے ہر مرض کے لئے بوٹیوں میں تاثیریں ودیعت کر رکھی ہیں اور جراحی یا ادویاتی ٹیکوں، دواؤں اور عمل جراحی کی ضرورت ہی نہیں۔ اس نظریے کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے طب جدید کو دعوت عام دے رکھی لیکن ابھی تک کسی شخص نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا۔

اُن کو یقین ہے اور انہوں نے لاکھوں مریضوں کے علاج میں

یہ ثابت کر دیا ہے کہ بوٹیوں کا اثر براہ راست بیماری پر حملہ کرتا ہے اور اسے جڑ سے اکھیڑ کر ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تو لے کو سانپ ڈستا ہے تو وہ بھی بوٹی کی تلاش میں دوڑتا ہے تاکہ اس تریاق کے ذریعے سے سانپ کے زہر کو باطل کرے۔ سائنسدان بھی اس بوٹی کی تلاش میں رہے ہیں لیکن ابھی تک اسے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

عالم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ مریض کو بیماری کے متعلق سوالات نہیں کرتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تیز سی نگاہیں جسم کو چیر کر بیماری کو تلاش کر لیتی ہیں۔

آسٹریلیا سے رخصت ہوتے وقت آپ نے فرمایا:۔

"لوگ اکثر مجھے ساربان کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ نئی سے نئی سرزمین میں "خدا کی ان بوٹیوں" کی تلاش میں پھرتا رہا ہوں۔ میں نے دنیا کے ہر حصے سے بوٹیاں جمع کی ہیں اور ان کی شفا بخش تاثیر کا ثبوت یہ ہے کہ میرے زیر علاج آج دس ہزار مریض ہیں۔

میری محنت رائگاں نہیں گئی کیونکہ اس وقت میرے پاس ہزارہا سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ قدرت نے ہمارے دکھوں کے لئے خود بخود علاج تجویز کیا ہے بوٹیاں خود بخود پیدا ہوتی ہیں اور ہر سال خود بخود سوکھ کر ہمارے استعمال کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ اس جراثیمی مواد کی طرح جو بے زبان جانوروں پر ظلم ڈھا کر حاصل کیا جاتا ہے اور جس نے بنی نوع انسان کے دکھوں کو مٹانے میں ابھی تک کوئی کامیابی نہیں دکھائی ہیری ادویات ایسے کسی ظلم کا نتیجہ نہیں ہیں۔

"زندہ جانوروں کو چیر پھاڑ کرنے والا نامرد ہے۔ وہ مفرد ضد جس کے ذریعے لوگوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ جراثیمی مواد یا عمل جراحی فوری اثر دکھاتے ہیں۔ بالکل غلط ہے۔ ان کا نتیجہ پہلے سے زیادہ سخت بیماریوں کی صورت میں نکلتا ہے۔

"جسم انسانی میں ان ادویات اور زہروں کا اثر یقیناً فوری ہوتا ہے اور بظاہر کی جیسیں پر کرنے میں کافی مدد دیتا ہے لیکن بنی نوع انسان کے دکھوں اور دردوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

"جراثیمی مواد ایک بیگار چیز ہے۔ صرف بیگار ہی نہیں بلکہ نقصان دہ شے ہے۔ میں کتنا ہوں کہ سائنسدانوں کے دماغ جو اسے ترقی دینے پر تلے کر رہے ہیں غلط راستہ پر گامزن ہیں۔ طب کے اس شعبے کو صحیح راستہ پر اس طرح ڈالنا چاہیے جس طرح آج سے سو سال پہلے کے فارما کوپیا میں گندہ دواؤں اور نفویات کے نام مٹا دیئے گئے تھے۔

"مختلف افراد اور ادارے اندھا دھند اور دیوانہ وار انعام و اکرام کی خواہش میں ہزاروں اور لاکھوں بے زبان جانوروں پر شب و روز بے پناہ ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کیا اس کے نتیجے میں بنی نوع انسان کا کچھ بھلا ہوا ہے؟

"اور اگر کچھ نتائج پیدا ہوئے ہیں تو میرے خیال میں وہ ایک غریب خرگوش کی جان کا بدل بھی نہیں ہیں۔ برلن، پیرس، بوڈاپسٹ اور ویانا میں جراثیمی علاج نے مرض کی شدت میں کوئی فائدہ نہیں دیا۔ اس لئے خبردار ہو جاؤ اور ان افعال شنیعہ سے احتیاط برتو اپنے احساس کی حفاظت کرو اور سمجھ کے قدرتی طریقے اختیار کرو جو شفائے مطلق نے ہمارے لئے تجویز فرمائے ہیں اور یقیناً وہ انسانی طبیبوں سے زیادہ حاذق ہے"

چند سال ہوئے آپ دوبارہ قفقاز چلے گئے لیکن اس دفعہ پیرس ہزار باشندگان آسٹریلیا نے عرضداشت بھیج کر آپ کو واپس بلا لیا۔

محمد عالم کے پاس اس وقت تیس ہزار سے زیادہ سندات ہیں اور آپ ان میں سے کسی ایک کو غلط ثابت کرنے پر پانچ سو پونڈ خیرات کے لئے دینے کا اعلان کرتے ہیں۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں جہاں ڈاکٹروں اور جراحوں نے مریض کو لاعلاج کر دیا لیکن آپ کے علاج سے مریض صحت یاب ہو گیا۔

محمد عالم شہرت اور دولت کے بھوکے نہیں ہیں۔ اُن کے گزارہ کے لئے جدی جائیداد کافی ہے۔ وہ صرف غریبوں کے دکھ دور کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی گاڑھے پسینے کی کمائی نام نہاد دواؤں کے عوض لوٹی نہ جائے۔

ایڈیلیڈ میں آپ شہر کے غریب ترین حلقہ میں رہتے تھے اور یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سوائے جمعہ کے جس روز آپ چھٹی کرتے تھے ہر روز آپ کے پاس چھ سو سے زائد مریض آتے تھے۔ آپ کے دروازے پر آپ کے نام کا بورڈ کبھی نہیں تھا اور یہ مشہور تھا کہ آپ سے ملنے کے لئے لوگوں کے انبوہ کے پیچھے پیچھے چلے جاؤ۔

آپ ادویات خود بناتے ہیں جس کا اثر فوری ہوتا ہے یہاں تک کہ سخت سے سخت بیماری چند منٹوں کے استعمال سے رفع ہو جاتی ہے۔

آپ کا مقصدِ زندگی خیر کبیر اور تعداد کثیر ہے۔
آج کل آپ مکہ جا رہے ہیں۔

دنیا کے امیر اور غریب

حال ہی میں امریکی سینیٹ میں ایک اعلان ہوا ہے جس کے ضمن میں کئی ہزار ایسے امریکنوں کے نام معلوم ہوئے ہیں جنہوں نے ۱۵۰۰۰ ڈالر سے زیادہ رقوم تنخواہ بونس یا کمیشن کے طور پر ۱۹۳۵ء میں کمائی ہیں۔
سب سے زیادہ آمدنی رکھنے والے پہلے دس نام یہ ہیں:۔

۱۔ ولیم۔ ینڈلف ہرسٹ، نامہ نگار	۵۰۰۰۰۰ ڈالر
۲۔ ے ویسٹ بلڈا کا نسلم	۴۸۰۸۳۳ ،،
۳۔ سی ڈبلیو گنٹریب، لوہے کا بیوپاری	۳۹۸۸۰۸ ،،
۴۔ الفریڈ پی سلون۔ جنرل موٹرز کا صدر	۳۷۴۵۰۵ ،،
۵۔ مارلین ڈوڈیش ادار کا نسلم	۳۶۸۰۰۰ ،،
۶۔ ولفینڈ شن، فاکس فلم کا صدر	۳۴۴۲۳۰ ،،
۷۔ ولیم نڈسن۔ جنرل موٹرز کا نائب الصدر	۳۲۵۸۶۹ ،،
۸۔ رنگ کراسبے، گوڈیا	۳۱۸۹۰۷ ،،
۹۔ بی۔ ڈی ملر، وڈ لو تھ کمپنی کا صدر	۳۰۹۸۰۸ ،،
۱۰۔ تھامس جے واٹسن صدر انٹرنیشنل بزنس مشین کارپوریشن	۲۹۶۵۲۸ ،،

انگلستان میں ۱۰۰۰ پونڈ سالانہ کمانے والوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس وقت ۳۰۹۰۰۰ آدمی ایسے ہیں جو ۱۰۰۰ پونڈ سالانہ سے زیادہ کما رہے ہیں۔ ایک لاکھ اور نوے ہزار آدمی ۱۰۰۰ سے ۲۰۰۰ پونڈ تک سالانہ کماتے ہیں۔ ایک لاکھ کی آمدنی ۲۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰ پونڈ تک ہے۔ دس ہزار کی آمدنی ۱۰۰۰۰ پونڈ سے زیادہ ہے۔

ان میں سے کئی اصحاب اب Super Tax کی زد میں آنے والے ہیں کیونکہ نئے بجٹ کی رُو سے ۲۰۰۰ کی بجائے ۱۵۰۰ کی آمدنی پر Super Tax عائد ہوا کرے گا۔

ایک ہزار پونڈ سالانہ سے زیادہ آمدنی رکھنے والی عورتوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ ان کی صحیح تعداد ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی لیکن اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجارت اور صنعت و حرفت کے انتظامی شعبے سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی آمدنی چار ہزار پونڈ تک پہنچ رہی ہے۔
دس ہزار پونڈ سالانہ سے زاید آمدنی رکھنے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کی آمدنی ۵۰۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰۰ تک ہے۔ ان کی اوسط آمدنی بیس ہزار پونڈ منتج ہے۔
ادنیٰ طبقوں میں پانچ لاکھ افراد سے زائد ایسے ہیں جو اسے ۲۰ پونڈ ہفتہ وار کماتے ہیں۔ ۵ سے ۱۰ پونڈ تک ہفتہ وار کمانے والوں کی تعداد پندرہ لاکھ سے زائد ہے۔
ان کے نیچے ۲½ پونڈ سے ۵ پونڈ تک ہفتہ وار کمانے والے تقریباً ۵۰۰۰۰۰ ربا پانچ لاکھ ہیں اور ان سے بھی نیچے تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ایسے ہیں جن کی آمدنی ۲½ پونڈ ہفتہ وار سے کم ہے۔

شہنشاہِ حبشہ جلاوطنی میں

سنڈے ایکسپریس کے ایک نامہ نگار سے شہنشاہ کے پست قامت اور چاق و چوبند سیکرٹری نے مغرور آمیز انداز میں استقبال کرتے ہوئے کہا "معاف کیجئے کہ ہم آپ کی مہمانداری کے فرائض پوری طرح سرانجام دینے سے معذور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام دربار روزے سے ہے اور سوگ میں بھی ہے۔ پچھلے دنوں ہم نے چالیس یوم کا روزہ رکھا تھا، لیکن اب کے صرف دو یوم کا ہے۔ ہر ہفتے ہم دو روز کا مسلسل روزہ رکھتے ہیں۔
عنقریب ہی ہم ایسٹر کا سات روز کا روزہ شروع کرنے والے ہیں اس دوران میں سوائے تھوڑی سی اُبلی ہوئی سبزی کے اور کچھ نہ کھایا جائے گا اور پینے کے لئے سادہ پانی۔ امید ہے کہ آپ ہمیں معذور تصور کریں گے۔
میں نصف گھنٹہ تک فیرفیلڈ کے برآمدے میں کھڑا رہا۔ یہی سابق شہنشاہ حبشہ کا موجودہ مکان ہے۔ باقی سے دو میل کے فاصلے پر۔
سیکرٹری کا نام سیرک ہیروئے ہے۔ آپ شہنشاہ کے وزیر خارجہ کے ۲۶ سالہ نوجوان فرزند ہیں۔
جنگ حبشہ کے دوران میں آپ ابے سینیا کے دفتر خارجہ میں اہم خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔
مسٹر ہیروئے نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی اخبارات فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ ان کے عنوانات دربار کے سوگ میں ہونے کی تشریح کر رہے تھے۔ ان میں شہنشاہ کے داماد اور اس دستار کے قتل کی خبر شائع ہو رہی تھی جو شہنشاہ کے آخری سرداروں میں سے تھے اور ابھی تک اطالویوں کے خلاف نبرد آزما پیکار رہے۔

مسٹر ہیرووے نے مجھے ایک سگرٹ پیش کرتے ہوئے کہا "یہاں کا ماحول اداس ہے۔ ہمارا گھر حقیقی معنوں میں عجائب خانہ بنا ہوا ہے۔ پیارے راس دستار کی موت کے قطع نظر بھی اس گھر میں مسرت کا وجود ناپید ہے اور ہم بے خانماں لوگوں کے دلوں میں مسرت آئے بھی کیسے؟ ہم میں سے صرف شہنشاہ کے بچے مسرور ہیں"۔

اس کے بعد مسٹر ہیرووے نے مجھے بتایا کہ اس وقت اس بادشاہوں کے بادشاہ کا دربار کن کن افراد پر مشتمل ہے۔

آپ نے فرمایا:۔

شہنشاہ یہاں اپنی ملکہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کا بارہ سالہ بچہ شہزادہ ہزار بالغ کے بورڈنگ سکول میں ہے اور ہر ہفتے چھٹی گزارنے کے لئے یہاں آتا ہے۔ وہ فٹ بال کھیلتا ہے، کہ بازی اور بائیسکل چلانے کا شوقین ہے اور انجن ڈرائیور بننا چاہتا ہے۔ شہزادہ کا چھوٹا بھائی جس کی عمر پانچ سال ہے یہیں رہتا ہے اور اس کی بہن جو لندن کے ایک ہسپتال میں نرس کا کام سیکھ رہی ہے کبھی کبھی یہاں آتی ہے۔

شہنشاہ کا نواسہ لیفی راس دستار کا بیٹا نائٹن کے سکول میں پڑھتا ہے اور ہفتہ وار چھٹی گذارنے یہاں آتا ہے۔ شاہی خاندان کے دوسرے بچوں کے علاوہ ہمارے ساتھ راس کا سابھی رہتے ہیں جو جنگ کے دنوں میں سپہ سالار تھے۔ آپ پکے مذہب پرست ہیں اور جلاوطنی کی مصیبت کو سب سے زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ شکست کا تمام تر الزام انہیں کے سر تھوپتے ہیں"۔

فیرفیلڈ کے عملے کے متعلق سوال کرنے پر مسٹر ہیرووے نے کہا ہمارے پاس ایک انگریز خانساماں ہے لیکن ہمارے متواتر روزوں کی وجہ سے اس کا کام بہت ہلکا رہ گیا ہے تین موٹروں کے لئے ایک انگریز شوفر ہے اور ایک انگریز نائی۔ باقی عملہ جبشیوں پر مشتمل ہے جن میں چار مرد تین خدمتگار عورتیں ہیں اور ان کے علاوہ میں اور ایک دسر یکٹری ہے۔ شہنشاہ جلد سو جاتے ہیں اور علی الصبح اٹھتے ہیں۔ وہ صبح اٹھتے ہی اپنی سیاہ ٹوپی اور سیاہ کیپ (Cape) میں ملبوس ہو کر باہر سیر کرنے نکل جاتے ہیں۔ ۹ بجے کے قریب وہ خطوط و کتابت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

ایک غریبانہ سے ناشتے کے بعد دو گھنٹے تک دعا اور مراقبے میں مشغول رہتے ہیں۔ تیسرے پہر ملاقاتیوں کو باریاب فرماتے ہیں اور پھر خطوط پر دستخط کرتے ہیں۔

شاہِ اشوریا کے خطوط

شاہ زمرلین کے خطوط کا ترجمہ حال ہی میں ایک فرانسیسی عالم ایم۔ ڈوسن نے علمائے کتبات قدیمہ کی ایک مجلس کے سامنے پیش کیا ہے۔ زمرلین ولادت مسیح سے ایک ہزار سال پہلے اشوریا پر حکمران تھا۔ یہ کتبے تل ہریری کے مقام سے مشہور ماہر آثار قدیمہ ایم پیرٹ نے برآمد کئے تھے۔ کسی زمانے میں اس مقام پر شہر ہاری آباد تھا۔

ایم ڈوسن کا بیان ہے کہ اب یہ خطوط جو ممالک غیر کے حکمرانوں، درباریوں اور ایلچیوں کے نام لکھے گئے تھے آسانی کے ساتھ پڑھے جا سکتے ہیں اور اسی طرح پرانے تاریخی حالات اور تجارتی معاہدے علماء کے مطالعے کے لئے آسان ہو گئے ہیں۔ ان معلومات کی مدد سے اشوریا کی تین ہزار سال قبل کی بیتی جاگتی تصویر اتاری جا سکتی ہے۔

ادارہ

غزل

جاتے ہوئے اک بار تو جی بھر کے رُلائیں
ممکن ہے کہ ہم آپ کو پھر یاد نہ آئیں

ہم چھیڑ تو دیں گے ترا محبوب فسانہ
کھچ آئیں گی فردوس کی مدہوش فضائیں

پھر تشنہ لبی زخم کی دیکھی نہیں جاتی
پھر مانگ رہا ہوں ترے آنے کی دعائیں

پھر بیت نہ جائے یہ جوانی، یہ زمانہ
آؤ تو یہ اجڑی ہوئی محفل بھی سجائیں

پھر لوٹ کے آئیں گے یہیں قافلے والے
اُٹھتی ہیں افق سے کئی غمناک صدائیں

شاید یہی شعلہ مری ہستی کو جلا دے
دیتا ہوں میں اڑتے ہوئے جگنو کو ہوائیں

اے کاش ترا پاس نہ ہوتا مرے دل کو
اٹھتی ہیں پہ رک جاتی ہیں سینے میں صدائیں

اک آگ سی بھر دیتا ہے رگ رگ میں تبسم
اس لطف سے اچھی ہیں حسینوں کی جفائیں

معبود ہو اُن کے ہی تصور کی تجلّی
اے تشنہ لبو آؤ بنیا دیر بنائیں

ہم سنگِ دریار پہ بے ہوش پڑے ہیں
کہہ دے کوئی جبریل سے اب تم نہ آئیں

ہاں یاد تو ہوگا تمہیں راوی کا کنارا
چاہو تو یہ ٹوٹا ہوا بربط بھی بجائیں

توبہ کو ندیم آج تو قربان کر دو گے
جینے نہیں دیتیں مجھے ساون کی گھٹائیں

احمد ندیم قاسمی بی اے



الهام موسيقى

نظریۂ مادیّت کی فلسفیانہ اہمیّت

مادیت سے میری مراد وہ وجودیاتی (ontological) نظریہ ہے جو حقیقت کے وجود اور ماہیت کے سوال کا جواب دیتا ہے کہ حقیقت بذات خود ایک جسم ہے جس کے صفات امتداد (extension) اور عدم تداخل (impenetrability) ہیں۔ اس کی فعلیت کی ابتدائی اور اصلی صورت حرکت ہے۔ لہٰذا اسی اصول سے حقیقت کے تمام افعال و اعمال کی اور خاص کر شعور کے حالات کی توجیہ ہونی چاہئے۔ مادیت اس بات کا دعویٰ کرتی ہے کہ قوۂ منظم اجزا (Multiplicity) کی توجیہ بسیط اور متحد اجزا جو اس کے نزدیک مادہ ہی ہے سے ہو سکتی ہے۔ مادہ تمام چیزوں کی اصل ہے روح کا وجود مادے سے علیحدہ نہیں۔ روح یا ذہن یا نفس، اس دائم التغیر مادے کی بے شمار صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔ مادیت کا اہم جزو ذہنی اعمال کی عنصری یا مادی اعمال میں تحویل ہے۔ مادیت کی حمایت میں مندرجہ ذیل ثبوت پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ طریقیاتی ثبوت (Methodical Proof)

یہ مفروضہ کہ ہمیں ایک غیر مادی، روحی جوہر ہے جو جسم کا محتاج نہیں اور اس سے علیحدہ ہے اور دائم الوجود ہے غیر سائنسانہ ہے اور بوام جاہلیت کی نشانی ہے۔ اس نظریے کا ماننے والا وجدانیوں کی سی ذہنیت رکھتا ہے جو نظریت کے ہر عمل کو ایک غیر مرئی دیوتا کا عمل تصور کرتا ہے۔ تجربے سے ہمیں سوائے جسم اور اس کے اعضا کے اور کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا۔ اس عضویت کے ہر عمل کو اور جو بھی اس عضویت میں گذرے ان تمام کو خود اسی عضو کے مختلف اعضاء کے تفاعلات (Functions) خیال کرنا چاہئے۔ ایک روحانی جوہر کا مفروضہ سائنسانہ طریقہ نہیں بلکہ بے معنی ہے۔ سائنس کو چاہئے کہ اس کو تعلیم یافتہ کے ذہن سے دور کر دے۔ ہر سائنس کے طریقے کو اس طریق عمل سے جو سائنس سے پہلے استعمال کیا جاتا تھا محض اس طرح ممیز کر سکتے ہیں کہ سائنس مظاہر کی توجیہ انواع، ذوات واعیان (Essences & Powers) سے نہیں کرتی بلکہ مقدم (antecedent) یا متوالی (Contignous) مظاہر سے کرتی ہے۔ اب حالات شعور بھی مقدم یا متوالی مظاہر دماغ اور نظام عصبی کے عضوی اعمال میں جیسا کہ نفسیات اور اصل عضویات (Physiology) ہے جو ذہنی اعمال کو محض عضوی اعمال تصور کرتی ہے۔ وہی عضوی قوت جو جسم کے ذریعہ غذا حاصل کرتی ہے، دماغ کے ذریعے فکر کرتی ہے۔ پروفیسر کارل وائٹ فکر کی تعریف میں کہتا ہے "دماغ فکر کو اسی طرح پیدا کرتا ہے جس طرح کہ جگر صفرے کو اور گردے پیشاب کو۔ دماغ سب سے زیادہ عجیب و غریب سب سے زیادہ نازک اور نفیس عضو ہے اس کا وظیفہ یا عمل مخصوص فکر ہے لہٰذا نفس و حیات، فکر و ضمیر تمام مادے کی پیداوار ہیں اور اگر کوئی خدا ہے تو وہ بھی بقول ایک گیسی دیوتا صدار ہے۔"

۲۔ آلی ثبوت (Mechanical Proof)

مادیت کی حمایت میں دوسرا آلی ثبوت پیش کیا جاتا ہے جو علوم فطرتیہ کا مسلّم اصول ہے۔ اس اصول کا حاصل یہ ہے کہ کائنات میں قوت یا انرجی کی مقررہ مقدار پائی جاتی ہے جو نہ زیادہ کی جا سکتی ہے اور نہ کم۔ مگر ہمیشہ اتنی رہتی ہے۔ اس کو قانون بقاء توانائی کہتے ہیں۔ آلی اصول کی صداقت میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ مگون (change) اس توانائی کی محض دوسری صورتوں میں تقسیم ہے۔ مثلاً حرکت حرارت میں بدل جاتی ہے اور حرارت حرکت میں۔ ایک منٹ طبیعی رو کو اگر پانی میں سے لے جائیں تو کیمیائی نتائج پیدا ہوتے ہیں اور یہ مفروضہ کہ کوئی توانائی کی تخلیق ناممکن ہے کائنات کی تمام میکانیت (Mechanism) کو بہت سادہ اور صریح بنا دیتا ہے۔ اب اگر ہم ایک دوسرے جوہر کا وجود فرض کریں جو جسم سے علیحدہ شے ہو اور جو اعصاب میں تنبہ پیدا کرتا ہو تو لازم آئے گا کہ دنیا کی موجودہ انرجی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دراں حالیکہ انرجی کی تخلیق ہو رہی ہے لہٰذا یہ مفروضہ قانون بقا، توانائی کے خلاف ہے جس کو علوم فطرتیہ

(Natural Science) نے قبول کر لیا ہے۔ اس لئے یہ غیر حکیمانہ ہونے کی وجہ سے قابل تردید ہے۔

۳۔ کونیاتی ثبوت (Cosmological Proof) کسی زمانے میں ہماری زمین محض ایک روشن گیسی جذبہ (Nebula) کی صورت میں تھی۔ ایسی حالت میں حیاتِ عضوی کا وجود ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن جب زمین رفتہ رفتہ سرد ہوئی اور حیاتِ عضوی کے موافق حالات پیدا ہوئے تو نباتی اور حیوانی زندگی کا وجود ممکن ہوا اور بعد میں چل کر انسان بھی جلوہ نما ہوا۔ لہٰذا ذہنی زندگی عضوی زندگی کے ساتھ پیدا ہوئی ہے اور اپنے سترائط کے لحاظ سے عضوی زندگی کے ساتھ محدود ہے۔ یہ فرض کرنا کہ ذہن عضویت سے کوئی علٰحدہ شے ہے بے معنی ہے کیونکہ اس کی ابتدا کا تعلق عضویت سے ہے اور دونوں ایک ساتھ فنا ہوں گے لہٰذا ظاہر ہے کہ حقیقی وجود صرف مادے اور حرکت کا ہی ہے اور جس عجیب و غریب لباس میں حرکت چند لمحوں کے لئے نمودار ہوتی ہے وہ کائنات کے لئے کچھ نہیں ایک لغزشِ کا دو روزہ رقص ہے جو مادیت اور لامحدودیت کے سمندر پر ہو رہا ہے۔

تنقید

طریقیاتی ثبوت کی تردید۔ ایک روحی جوہر کے مفروضہ کی مخالفت میں جدید نفسیات مادیت کا ساتھ دے گی۔ ذہنی اعمال کا خاصہ ہے کہ یہ ہمیں محض وقائع (Occurances) کے طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی عمل یا جوہر کا وجود ہی ناممکن ہے۔ اگر باوجود اس کے ہم کسی روح یا جسم کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری اس طرزِ گفتگو کا مدار ہمارے ادراک (Apperception) پر ہوتا ہے یعنی جب قوتِ تصدیق ہم میں پیدا ہوتی ہے تو ہم ہر موادِ فکر کو موضوع اور محمول کی صورت میں سوچتے ہیں جب تک نفسیات روح کے تصور کو اس معنی میں استعمال کرتی ہے جس معنی میں کہ ایک عالمِ طبیعات تناطیسیت اور برقیت کو استعمال کرتا ہے۔ یہاں تناطیسی اور برقی جوہر کا ہی صرف علم ہتا ہے۔ جب تک روح ذہنی اعمال کا موضوع سمجھی جاتی ہے اور ایک قایم بالذات جوہر نہیں خیال کی جاتی اُس وقت تک ہم اس طرزِ گفتگو کو غیر حکیمانہ نہیں کہہ سکتے

ہر جوہرِ ذہن کے لئے کسی نہ کسی قدر مادی پہلو رکھنا ہے خواہ کتنی ہی کوشش کے ساتھ ہر طرح کی مادیت اس سے دور کی جائے جس چیز کا بھی وجود ہوگا وہ ہمارے طریقِ تفکر کی وجہ سے ضرور بمکان پر حادی ہوگی اور اس لئے مادی ہوگی۔ مادیت جس جوہر کے مفروضہ کی اس شدت کے ساتھ مخالفت کرتی ہے وہ بالآخر ہمیں مادیت کی طرف لے جاتا ہے ہمیں چاہئے کہ مادی واقعات کو چھوڑ کر اپنی توجہ ذہنی اعمال و وقائع پر مرکوز کریں اور کسی روحی جوہر کو فرض نہ کریں۔ صرف یہی وقائع جن کا کوئی عمل نہیں مادے سے اصلاً مختلف ہو سکتے ہیں۔

سائنس کے سخت طریقہ کو اگر مدِ نظر رکھا جائے جو صرف واقعات کو بیان کرتا ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے عمومی تجربات اور عمیق جذبات میں کوئی شے ایسی ضرور ہے جو ہر مدرک بالحواس شے اور ہر مادی شے سے اصلاً مختلف ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ جس طریقۂ علم کی طرف مادیت اپیل کرتی ہے وہ ہمیں اس نظریے کے خلاف راہ دکھلاتا ہے۔

(۱) مادیت کا دعویٰ ہے کہ حالاتِ شعور دماغ کے مادی حالات کے سوا کچھ نہیں یا

ب۔ حالاتِ شعور مادی حالات کے نتائج ہیں

(۱۔ اول الذکر خیال مہمل ہے کیونکہ مادی حالات حرکت کی صورتیں ہیں لیکن شعور حرکت کی صورت نہیں۔ ممکن ہے کہ ذہنی حالات اور عضوی حالات میں معیت (Co-existence) ہو لیکن معیت کا علاقہ ہویت (Identity) کا علاقہ نہیں ہو سکتا۔ سایہ متحرک گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہے لیکن سایہ گاڑی نہیں۔ اسی طرح افکار گو دماغی حالات کے ساتھ چلتے ہیں لیکن اُن سے عینیت کا رشتہ نہیں رکھتے۔ کسی چیز کا تصور، تصویر کی طرح امتداد نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ دماغی مکسرات (Molecules) کا مجموعہ ہو سکتا ہے۔

ب۔ لہٰذا (۱) و (۲) دوسرے خیال پر اثر آتے ہیں کہ حالاتِ شعور اور دماغی افعال میں عینیت تو نہیں مگر (اول الذکر ثانی الذکر کا نتیجہ ہیں لیکن یہاں بھی وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعور کے بعض مادی شرائط ضرور ہیں۔ دماغ میں چند عضوی اعمال کے وقوع کے بغیر شعور ناممکن ہے لیکن شرائط علت نہیں ہو سکتے۔ ہم شعور کی توجیہ محض مادی شرائط سے ہرگز نہیں کر سکتے۔ تکرکاہ یہ بنیادی قانون ہے کہ معلول اپنی علت سے متوافق ہونا چاہتے لیکن حالاتِ شعور دماغی حالات سے مختلف ہوتے ہیں۔ دماغ کا اعلیٰ ترین علم بھی ہم کو سوائے مادے کے (جو حرکت میں ہے) اور کسی چیز کا علم نہیں بخشتا لہٰذا یہ کہنا کہ شعور محض دماغی عمل کا نتیجہ ہے بالکل ناقابلِ فکر ہے

Commensurate [1]

میکانکی ثبوت کی تردید۔ عوام اور حکما کی اکثریت اس ثبوت کو بہت یقین آور خیال کرتی ہے لیکن یہ ثبوت بالکل کمزور ہے۔ قانونِ بقا توانائی کا اطلاق صرف طبعی اور کیمیائی اعمال پر ہوتا ہے اور یہ قانون انہی کی حد تک صحیح ہے بلکہ بعض مشہور علمائے طبیعات ایسے بھی ہیں جو اس دائرے میں بھی اس قانون کی پوری صداقت کو نہیں مانتے بہرحال یہ قانون حیاتیاتی اعمال (Vital functions) کی توجیہ کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ عضوی موجودات کی مرکزی عضویتوں کے تمام حصص کا متصدد اور حد کے لئے آپس میں تطابق یہ ایسی چیزیں ہیں جو طبعی کیمیائی حدود میں نہیں سمجھائی جا سکتیں۔ حتیٰ کہ عضویت کا حیاتی ارتقا تخلیقی فعلیت کو ظاہر کرتا ہے اور جب ہم ذہنی اعمال کے ارتقاء پر غور کرتے ہیں تو اس امر پر مجبور ہوتے ہیں کہ وونٹ (Wundt) کے ساتھ نفسی توانائی کے اڈیا کو بطور اصول موضوعہ مان لیں۔ کیونکہ قانونِ بقاء توانائی کو ذہنی ارتقاء پر منطبق کرنے کی کوشش تجربے کے بعض بدیہی واقعات کی توجیہ نہیں کر سکتی۔

سچ تو یہ ہے کہ مادیین نے جو میکانکی ثبوت پیش کیا ہے اسے اگر اچھی طرح پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ثبوت نہیں بلکہ ایک مفروضہ قضایا (Postulation) ہے کیونکہ اگر ہم پہلے ہی سے فرض کر لیں کہ ہر عمل (حیاتی نفسی وغیرہم) طبعی و کیمیائی قوانین کے موافق سمجھا یا جا سکتا ہے تب کہیں قانونِ بقاء انرجی کی خلاف ورزی کا احتجاج درست ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم واقعات پر نظر کریں اور اُن کے مطابق عمل پیرا ہوں بجائے اس کے کہ کسی خاص نظریے کو پہلے سے ہی فرض کر لیں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ قانونِ بقاء انرجی سے ان واقعات کی قطعاً کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی جو نفسی اور عضوی اعمال کے دائرے میں پائے جا سکتے ہیں۔ جن واقعات کو اب تک ثابت کیا گیا ہے اور ذہنی ارتقا اب تک جس درجے کو پہنچا ہے ان تمام کی توجیہہ کے لئے ایک بالکل مختلف اصول کی ضرورت ہے۔ اس کا اعتراف بعض مشہور حکماء نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ وونٹ کہتا ہے کہ "یہاں ایک ترکیب تخلیقی سرگرم عمل ہے جس کی ماہیت اور جس کے اصول کے متعلق زیادہ غور و فکر سے تحقیق کی جانی چاہئے۔ میکانکی ثبوت کی قوت بالکل جاتی رہتی ہے جب ہم مادی معروضات کو ترک کر کے تجربے کے نامدفوع واقعات پر غور کرتے ہیں۔

کونیاتی ثبوت کی تردید۔ کونیاتی ثبوت ایسے مفروضہ سے بحث کرتا ہے جس کی تصدیق بہت مشکل ہے۔ حیاتِ ذہنی کی تکوین (اور اُس کی غائت کا تجزیہ نہیں ہو سکتا اگر ہم یہ ثابت بھی کر دیں کہ حیاتِ نفسی کے لئے بعض مادی شرائط ضروری ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ صرف انہی شرائط کے تحت پائی جاتی ہے ایک بات تو یقینی ہے کہ حیاتِ نفسی۔ حیاتِ من حیث الکل کی طرح خود اپنے قوانین پر چلتی ہے جن کو ہم لاعضوی (Inorganic) مادے سے حاصل نہیں کر سکتے۔ آیا کبھی کائنات بغیر حیاتِ نفسی کے ہوگی اور کیا اس طرح کی کائنات کا وجود ممکن بھی ہے ایسی باتیں ہیں جو ہمارے تجربے سے ماورا ہیں۔

تنقید بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام براہین ذہنی اعمال کے وجود پر جن کو ہم مادی اعمال سے بالکل مختلف پاتے ہیں کسی قسم کا اثر نہیں کرتے برگسان نے اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھا ہے اور ایسے امور بیان کئے ہیں جو ان اعمال کے سمجھنے میں بے حد مدد دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے ذہنی اعمال کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے وہ کسی طرح مادیت سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ مادیت نہ صرف ایک بنیادی اصول کے ناقابلِ قبول ہے بلکہ یہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بھی سخت مایوس کن ہے۔ یہ ہر قسم کے مذہب کے خلاف ہے اس کا میلان الحاد کی طرف ہے۔ کیونکہ یہ مادہ کے سوائے ہر چیز کا انکار کرتی ہے۔ مادہ سے مملو فضا میں دیوتاؤں۔ ارواح اور شیاطین کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ مادیت کے ایک مصنف کا قول ہے کہ مافوق الفطرت واقعات کی اصل، مشاہدۂ فطرت کے اصلی طریقوں میں التباس و توہم اور پادریوں کے دھوکوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے نتائج اخلاق کے لئے سخت تباہ کن ہیں۔ مذہب کی بیخ کنی کے ساتھ یہ اخلاق اور نصب العین کے تعین کا بھی خاتمہ کئے دیتی ہے۔ مادیت کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک نیکی ایک بے معنی چیز ہے بغیر ایک جنون ہے۔ قانونِ اخلاق پادریوں کی ایجاد ہے۔ اصل دانائی یہ ہے کہ زندگی خوشی سے بسر کی جائے اور جو کچھ لذت ہیں حاصل ہو سکے اٹھائی جائے۔

(چودھری) اکبر علی بی اے

(حشانیہ)

سیٹھ چودھری برکت علی مسو دحوار

اُمیدِ موہوم

اے سراسر سحر رنگیں! اے سراپا دلبری!
اے کہ تجھ کو دیکھ لینا ہے سرورِ سرمدی

اے کہ تجھ سے دُور رہنا موت سے کچھ کم نہیں
اے کہ تیرا قرب ہے اِک جاودانی زندگی

اے کہ تیری انگلیوں کے لوچ کی لمسِ خفیف
اک اِرم مدہوشیوں کا اِک بہشتِ بے خودی

اے ترے انفاس میں پوشیدہ وہ موجِ طرب،
خشک شاخیں زندگی کی جس سے ہوتی ہیں ہری

اے ترے اندام میں خوابیدہ وہ نازِ حیات،
بخشتا ہے جو محبت کو حیاتِ دائمی

اے ترے لبہائے شیریں پر وہ حرفِ شکّریں
انگبیں جس کی سماعت سے ہے تلخ زندگی

اے تبسم تیرا بے حس روح کو ایمائے رقص
اے تکلم تیرا جاں کو دعوتِ رامش گری

اے تری رفتار جس سے آرزوئیں پائمال،
اے تری گفتار جس سے زخم کی چارہ گری

اے کہ تو دوشیزۂ فطرت کا اک خوابِ حسیں
اے کہ تو تخئیلِ شاعر کی مجسّم دلکشی

اے سراپا رنگ و بُو! اے پیکرِ حسن و جمال!
اے غرورِ دلربائی، نازشِ سیمیں بری!

کس قدر بدمست وہ شب ہوگی جس شب ناگہاں
خواب سے بیدار ہوگی میری خفتہ اختری!

بے تکلف تو مرے پہلو میں ہوگا محوِ ناز
اور مرے شانوں پہ مچلے گی تری زُلفِ دراز!

سعید احمد اعجاز

باپ کا گناہ

(ایک سچی کہانی)

ڈارلنگ کا قصبہ جہاں مجھے بطور ڈسٹرکٹ نرس کام کرتے ہوئے آٹھ سال ہو گئے ہیں ایک وادی میں واقع ہے اس وادی کے ہر چہار طرف بلند پہاڑ ہیں۔ جنھوں نے اس جگہ کے باشندوں کی روحوں کو گویا مقید کر رکھا ہے۔ بظاہر یہ لوگ نہایت خاموش اور خود پسند ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز سے واقف نہیں اور جذبات سے بالکل معرّا ہیں۔ لیکن میرا ذاتی مطالعہ یہ ہے کہ ان کے پہلو میں بھی ایک دل ہے اور اس میں محبت اور نفرت کے احساسات اسی طرح موجزن ہیں جس طرح ہم باقی دنیا والوں کے دلوں میں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم جن جذبات کا اظہار فی الفور کر دیتے ہیں۔ یہ ان کو ایک عرصے تک دبائے رکھتے ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ دلچسپ ماں بیٹے کا وہ جوڑا تھا، جو ہر اتوار گرجے میں عبادت کے لئے آتا تھا مجھے نہ تو ان سے بات کرنے کا کبھی موقعہ ملا اور نہ کبھی مجھے ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ دونوں بریلے خاندان کے فرد تھے۔ ماں مسز بریلے ستر سال کی تھی اور لڑکا جان بریلے تقریباً پچاس برس کا تھا۔ ہر اتوار جان بریلے اپنی ماں کو گرجا لاتا۔ عبادت کے بعد اسے سہارا دے کر اپنی گاڑی میں بٹھاتا اور واپس لے جاتا کسی نے آج تک انہیں آپس میں بولتے نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی میں نے ڈارلنگ والوں کو ان کا تذکرہ کرتے سنا۔ جس کا مطلب شاید یہ تھا کہ ان کے لئے یہ بات تعجب انگیز نہ تھی۔

ایک رات دس بجے کا وقت تھا۔ میں اپنی خواب گاہ کی طرف سونے کے لئے جا رہی تھی کہ میرے دروازے پر موٹر کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر میں ٹام ہیریسن میرے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ "مس براؤن جلد میرے ساتھ آئیے۔ ڈاکٹر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں جان بریلے موٹر کے نیچے دب کر مر گیا ہے اور اس کی موت کی اطلاع اس کی ماں تک آپ ہی کو پہنچانی ہوگی۔ کوئی مرد یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ اس ضعیفہ کو اس کے بیٹے کے مرنے کی اطلاع دے۔"

میں ٹام کی موٹر پر سوار ہو کر مسز بریلے کے گھر پہنچی۔ میری دستک سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور پتلی دبلی بڑھیا مسز بریلے نے ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے دروازہ کھولا۔ یعنی وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ایسے بے وقت میرا وہاں کیا کام تھا

مسز بریلے، میں نے کہا۔ میں تمہیں بہت بری خبر دینے کے لئے آئی ہوں۔

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور کچھ جواب نہ دیا۔

تمہارے لڑکے کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ اس کی گاڑی کا تصادم ایک موٹر کے ساتھ ہوا۔ جس سے اس کی گاڑی الٹ گئی۔ لوگ اس کے پاس صرف ایک گھنٹہ ہوا پہنچے ہیں۔ وہ۔ وہ"

"میں جانتی ہوں وہ مر گیا ہے"، اس نے نہایت سکوت سے جواب دیا "وہ مر گیا ہے۔ یہی نا"

جان بریلے کی لاش گھر لائے جانے کے بعد میں تمام شب مسز بریلے کے ساتھ رہی۔ ڈاکٹر کو مسز بریلے کی اس خاموشی سے خدشہ تھا کہ مبادا اس کا دماغ اس صدمے کا تحمل نہ ہو سکے۔

ہُوگہ میں وہاں کی واحد کرسٹ نرس تھی۔ اس لئے لاش کے پاس تمام رات بیٹھنا میرا ہی فرض تھا۔ لیکن خلاف قیاس جب نشستگاہ کے پردے گرا دیئے گئے تو مسز بریلے مجھے سونے کے کمرے کی طرف لے چلنے کے لئے اٹھی۔

"اس کی خبر گیری میں کروں گی"، اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں موت سے خوف نہیں کھاتی۔ مس براؤن لاش کے پاس آپ کے بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نہ سمجھ سکی کہ اسے کیا جواب دوں۔ اس ضعیفہ کا سکوت کچھ بے تعلقی پر مبنی معلوم ہوتا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں سو جاؤں اور اُسے

لاش کے پاس اکیلا بیٹھنے کے لئے چھوڑ جاؤں۔

مجھے حیران دیکھ کر اس نے پھر اپنی پہلی بات دہرائی اور کہنے لگی تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ جان اور میں آپس میں تیس برس سے نہ بولے تھے۔

تیس برس، میں نے تعجب سے پوچھا

"ہاں، کالج تیس برس بعض آدمی بوڑھے ہوکر مر جاتے ہیں اور بعض عین شباب میں ہی مر جاتے ہیں لیکن انہیں زندہ رہنا پڑتا ہے۔ جان آج نہیں مرا بلکہ اسے مرے آج تیس سال ہو گئے ہیں"

میرا خیال تھا کہ شدتِ غم سے بڑھیا کے دماغ کا توازن غلط ہو گیا ہے لیکن وہ اپنا سر ہلا کر مسکرائی جس کا مطلب تھا کہ اس نے میرے خیالات کو بھانپ لیا ہے۔

میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں، اس نے کہا کہ جان دراصل میرا بیٹا نہ تھا۔

"جان تمہارا بیٹا نہ تھا" مسز بریلے یہ تم کیا کہہ رہی ہو"

ہاں۔ وہ میرا بیٹا نہ تھا۔ اسے مجھ سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ لیکن اگر میں آج زندہ ہوں تو اسی کی وجہ سے۔ اس نے میری جان بچائی تھی۔ اب شاید تم سمجھ سکو۔ تیس برس خیال تو کرو۔ کتنا لمبا عرصہ ہے۔ اب میں اس سزا کو اور زیادہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ ہم دونوں کو آپس میں گفتگو کئے تیس سال گذر چکے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت کے بعد بولنے کی چنداں حاجت بھی نہ رہی تھی۔ ایک مردہ آدمی کو بولنے کی خواہش نہیں ہوتی مس براؤن کیا تم میرے ساتھ متفق نہیں"

بہتر ہوتا، تم مجھے لاش کے پاس بیٹھا رہنے دیتیں" میں نے کہا

"نہیں میں دیوانی نہیں اس نے جواب دیا۔ اگر تم بیٹھنا فرض سمجھتی ہو تو آؤ نیچے از آؤ۔ میں تمہیں جان کی موجودگی میں بتاؤں گی۔ آخر مجھے بھی کسی نہ کسی سے کہنے کا حق ہے۔ شاید وہ سن سکے۔ وہ مرنے کے بعد بھی تیس سال زندہ رہا"

میں اس کے ساتھ ہی نیچے از آئی۔ جب وہ اپنی کہانی ختم کر چکی تو صبح کاذب ہو چکی تھی۔

میں اس کی کہانی کا صرف خلاصہ پیش کر سکتی ہوں جو اسی کے الفاظ میں ہوگا لیکن اگر میں نے کبھی انسانی دل کو بیلہ سے چیرا ہوا اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا ہے تو وہ نظارہ میرے۔ وہ بد اسی رات پیش ہوا۔

مسز بریلے کی کہانی اسی کی زبانی

جب میں نے بریلے سے شادی کی۔ میری عمر اٹھیس سال کی تھی۔ میرے ماں باپ ولنشائر میں خوشحال زمیندار تھے سکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد میرے والد کا ارادہ تھا کہ میں کالج میں داخل ہو کر معلمہ بننے کی اہلیت پیدا کروں۔ لیکن عین اس وقت میری بریلے سے ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کو پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں چھ سال بڑا تھا۔ وہ مرقع حسن کی تصویر تھا۔ ہمارے قصبہ میں وہ ایک زراعتی مشین بنانے والی کمپنی کا نمائندہ بن کر آیا تھا۔ وہ یہاں چار دن ٹھیرا جس کے دوران میں اس نے مختلف زمینداروں سے مشینیں خریدنے کے آرڈر لئے۔ اس کا طرزِ عمل کچھ ایسا تھا کہ عورت اور مرد اس کی طرف کھنچے جاتے تھے۔ میرے والد نے اسے پانچ سو پاؤنڈ کا آرڈر دیا۔

ہمارے گاؤں میں کوئی ایسی لڑکی نہ تھی جو سراسر اس کی محبت میں گرفتار نہ ہو۔ رائے میں ایک خاص انداز کی بے نیازی اور جوش تھا جس کو دیکھ کر بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ تن من دھن اس پر نچھاور کر دیا جائے۔ اس کی ہمراہی میں میرا کوئی ایسا لمحہ نہ گذرتا۔ جب میں یہ احساس نہ کرتی کہ میں نے دنیا میں وہ چیز پائی ہے جس کی قیمت متعین نہیں کی جا سکتی۔

میرے والد نے اسے شام کے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات پر میرا منہ چوم لیا۔ اس نے مجھے کہا۔ کہ وہ ایک مہینے کے اندر اندر پھر واپس آئے گا اور اس میعاد میں مجھے لے چلے گا جو کچھ دنوں میں وہاں منتقد ہونا تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس نے میرے علاوہ کئی اور لڑکیوں سے بھی یہ حرکت کی تھی۔

یہ اطلاع پا کر اوّل اوّل تو مجھے بہت غصہ آیا اور میری غیرت کو سخت ٹھیس لگی۔ میں نے حلف اٹھایا کہ میں رائے کو اس حرکت کا مزا چکھا کر رہوں گی۔ پہلے اس کا دل مٹھی میں لوں گی اور پھر اس کا تمسخر اڑاؤں گی تم ایک ۱۹ برس کی لڑکی کے جذبات کا اندازہ لگا سکتی ہو۔

رائے نے میلہ پر میرے ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ رائے میں یہ وصف بدرجہ اتم تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اپنے وعدے کو ضرور پورا کرتا

احساس کے ایفا میں کوئی جذبہ۔ احساس۔ فرض۔ ذمہ داری حائل نہ ہو سکتی تھی۔

میرے والد کی ذاتی رائے یہ تھی کہ اس نے رائے جیسا ایماندار آدمی کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے رائے کو ایسی بھاری رقم کا آرڈر دیا تھا۔ رائے صاف گو تھا اور اپنی بات کا دھنی۔ جب وہ کہتا کہ وہ ایک بات کرے گا تو وہ کر کے رہتا۔ وہ جوانی کے نشے میں مخمور رہتا اور زندگی اس کے لئے ایک کھیل تھی۔

رائے اپنے وعدے کے مطابق واپس آیا۔ میرے والد نے اس کا استقبال اس طرح کیا۔ جیسے کوئی ہمارا دیرینہ شناسا ہو۔ میں جس انتقام کے منصوبے اتنے عرصے سے باندھ رہی تھی، اس کے دیکھتے ہی بھول گئی۔ اب مجھے صرف یہ احساس تھا، کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور کوئی چیز مجھے اس سے باز نہیں رکھ سکتی۔ میں یہ سن کر پھولی نہ سماتی تھی کہ وہ خاص طور پر اس لئے آیا ہے، کہ مجھے اپنے ساتھ میلے میں لے چلے۔

اس میلے میں کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جو رائے کو اپنا دل نہ دے چکی ہو۔ مجھے رائے کی ہمراہی میں دیکھ کر ہر ایک کو رشک آتا تھا۔ شام سے قبل ہی وہ میری زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا۔ جب وہ کسی دوسری لڑکی سے مصروفِ گفتگو ہوتا، میں کن انکھیوں سے اسے دیکھتی اور فخر کرتی کہ میں ایک دوسرے سے محبت تھی۔ گو اس محبت کا شاہد صرف وہ پہلا بوسہ ہی تھا۔

رائے اس رات ہمارا مہمان تھا۔ جب میلہ ختم ہو گیا تو ہم گاڑی میں بیٹھ کر واپس گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ آدھے فاصلے تک ہم دونوں خاموش رہے۔ یکایک اس نے گھوڑے کی لگام تھام لی اور میری کمر میں باہیں ڈال کر کہنے لگا۔ "لیونی مجھے بوسہ دو"

"کیوں، میں نے جواب دیا۔ تم یہاں کئی ایک لڑکیوں کا بوسہ لے چکے ہو"

"اوہ! وہ اور بات تھی۔ اس نے کہا۔ مجھے تم سے محبت ہے کیا تمہیں مجھ سے نہیں؟"

"ضرور ہے، میں نے کہا لیکن میں اس وقت تک تمہیں بوسہ نہ دوں گی۔ جب تک تم مجھ سے شادی نہ کر لو گے"

یہ بات مجھ پر اب واضح ہوتی ہے کہ مجھ سے شادی کرنے کا خیال اس کے دماغ میں کبھی نہ آیا تھا، اس وقت میں اس بات سے بالکل نا واقف تھی کہ رائے کے لئے یہ زندگی محض ایک دلچسپ کھیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

"کیوں نہیں، اس نے مجھے جواب دیا" میں مزید تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ دیگر لڑکیوں کا اور تمہارا مرتبہ میرے دل میں ایک ہی ہے۔ کیا وہ تمہارے رتبے کو پہنچ سکتی ہیں۔ ان کا بوسہ لینا تو محض ایک خوش آیند مذاق تھا۔ اس کے بعد میں ایسا نہ کروں گا"

میرے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست ہو گئے اور میں اپنا انتقام بھول گئی۔

دو ماہ کے بعد ہم دونوں کی شادی ہو گئی۔ ہنی مون گذارنے کے بعد ہم دونوں یوسٹن میں جہاں اس کی فیکٹری تھی۔ ایک گھر لے کر رہنے لگ گئے۔ گو میں اس وقت نہ جان سکی، لیکن اب مجھ پر یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ شادی کے بعد بھی میں رائے کی محبت کما حقہٗ اپنی طرف مبذول نہ کر سکی تھی اس کے لئے میں ان لڑکیوں میں سے ایک تھی جن کا منہ اس نے پہلے دن ہمارے گاؤں میں آ کر چوما تھا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ شادی سے ایک مرد پر ایک ذمہ داری عاید ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے محبت محض ایک جسمانی کشش کا نام تھا۔

رائے ملازمت کے سلسلے میں زیادہ عرصہ باہر رہتا۔ بین بالعموم وہ ہفتہ کے دن گھر پہنچ جاتا۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ اس کا سلوک میرے ساتھ نہایت شریفانہ رہا۔ جب کبھی ہم دونوں اکٹھے سیر کو نکلتے تو وہ ایک نہایت خوش کن ہمراہی ثابت ہوتا۔ اس کا دھیان ہر وقت میری طرف رہتا۔ اس کی طبیعت میں شامل تھا کہ وہ اپنی ہمراہی میں دوسرے کو بشاش رکھے اور یہ بات کچھ میرے لئے مخصوص نہ تھی۔ ایک مرد ہمراہی کے ساتھ بھی اس کا سلوک ایسا ہی ہوتا۔ اس کے جذبات ابھی بیدار نہ ہوئے تھے۔ میں اپنا عندیہ صرف الفاظ میں ہی بیان کر سکتی ہوں۔

ان تمام باتوں کے باوجود میرے دوست مجھ پر رشک کرتے۔ میں خیال کرتی تھی کہ شاید شادی اسی کو کہتے ہیں۔ محبت کی کمی جو میں شروع ہی سے رائے کی طرف سے محسوس کر رہی تھی اب بھی ویسی ہی تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو اس بات سے تسلی دے لی تھی کہ ایک آدمی ہر چیز اپنی خواہش کے مطابق حاصل نہیں کر سکتا۔ میرے لئے تو کافی کچھ مہیا تھا۔ کاش میں رائے کی اصل شخصیت پہچان سکتی۔ رائے کی طرف سے

سرد مہری بعض وقت میرے لئے پریشان کن ثابت ہوتی۔ لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں تو میں سب کچھ بھول گئی اور اس وقت کے خواب دیکھنے لگی جب یہ بچہ میری گود میں ہوگا اور رائے کی طرف سے جو محبت کی کمی ہے اسے پورا کر دے گا۔

مجھے معلوم نہیں کہ کس شخص نے مجھے اخبار سے کاٹ کر وہ کتر بھیجی جس نے میرا تمام خیالی قلعہ یک لخت زمین پر گرا دیا۔ رائے کو باہر گئے ہوئے قریباً دو ہفتے ہوئے تھے۔ اس کتر سے ظاہر تھا کہ ایک لڑکی نے رائے پر دعویٰ دائر کیا ہے کہ وہ اس کے بچہ ماہ کے لڑکے کا باپ ہے۔ رائے کا پتہ اور نام اس وضاحت سے چھپا ہوا تھا کہ شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔

اگرچہ عدالت سے دعویٰ خارج ہو چکا تھا۔ لیکن رائے کا تعلق اس لڑکی کے ساتھ ثابت تھا۔

رائے چوتھے دن واپس آیا۔ میں نے یہ تین دن نہایت اضطراب میں گزارے۔ مجھے دیکھ کر اس نے متعجب ہو کر پوچھا "لیونی تم اداس کیوں ہو؟" اور مجھے بغل میں لے لیا۔

میں نے جھٹکا دے کر خود کو اس سے علیحدہ کیا اور میز پر پڑے ہوئے اخبار کی کتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ذرا پہلے اسے پڑھ لو۔

میں اس خیال میں تھی کہ وہ اسے دیکھ کر گھبرا جائے گا۔ لیکن وہ خوب زور سے ہنسا "وہی پرانی بات۔ میں چاہتا تو نہ تھا کہ تمہیں اس کا علم ہو۔ یہ تو اس زمانے کی بات ہے جب میں نے تمہیں دیکھا بھی نہ تھا۔ یہ میرے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی۔"

"کیوں نہیں"، میں نے جواب دیا۔ "میں تمہارے پاس پاک دامن آئی تھی اور شادی کے وقت میں اپنے خاوند سے بھی یہی امید رکھتی تھی۔"

اس پر رائے نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ جیسے میں نے اسے ایک بہترین لطیفہ سنایا ہو۔

"اگر تمہارا یہ خیال ہے"، اس نے کہا "تو معلوم ہوتا ہے کہ تم زندگی کی اصلیت نہیں سمجھیں۔ اگر میں فرشتہ ہوتا تب شاید یہ ممکن تھا۔ لیکن فرشتے دنیا میں موجود نہیں۔ جان من! بے وقوف مت بنو۔"

اس نے مجھے آغوش میں لے لیا۔ رائے میں ایک کشش تھی جیسا کہ میں بیان کر چکی ہوں جس سے گریز ناممکن تھا۔ اس کے لئے یہ بات بعید از شرم نہ تھی۔ اسی لئے اس نے معافی کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔ میں یہ محسوس کرنے لگی کہ میں اس کے سامنے قدیم زمانے کے پاردی کی حیثیت میں کھڑے

جوں جوں دن گذرتے گئے، اس واقعہ کی اہمیت کم ہوتی گئی اور میں نے فرض کر لیا کہ تمام مرد ایسے ہی ہوتے ہیں اور رائے اس بات میں کچھ ایسا زیادہ مورد الزام نہیں گردانا جا سکتا۔

کچھ دن بعد میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ میں نے اپنی لڑکی کا نام بھی رکھا۔ ابتدا سے ہی رائے کو اس کے ساتھ بہت محبت تھی اور وہ بھی اس کی ایسی گرویدہ ہو گئی کہ دو سال ہی کی عمر میں وہ رائے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ بعض اوقات تو میں خود اس کی اس بڑھتی ہوئی محبت سے حسد کرنے لگتی۔

اس دوران میں مجھے ایک بات مشوش کئے رکھتی تھی۔ گورنمنٹ کی تنخواہ کمیشن ملا کر خاصی معقول رقم پر مشتمل تھی۔ بایں ہمہ گھر میں کسی قسم کی فارغ البالی نہ تھی۔ رائے نہ تو شرابی تھا اور نہ ہی جوا باز۔ اس کے دوست بھی بظاہر شریف معلوم ہوتے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ میرے پاس کبھی بھی اس کی تنخواہ سالم کی سالم نہ آتی تھی۔ جب کبھی میں اس کے متعلق دریافت کرتی۔ رائے مجھے ٹال دیتا۔ کبھی کہتا فلاں چیز کی قیمت اس ماہ ادا کی گئی۔ کبھی یہ کہ اس نے اس ماہ اپنے بالوں کو پار لی دی ہے۔ غرض میں اس دن کے انتظار ہی میں رہتی جب میں اس کی پوری تنخواہ لوں گی اور خرچ کر سکوں گی۔ میری شادی کا پانچواں سال تھا۔ میں مشکل سے تین سال کی تھی کہ ایک دن رائے جب گھر واپس آیا تو اسے شدت سے بخار تھا۔ اس کے چہرے سے بشاشت مفقود تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مشکل سے گھر پہنچ سکا ہے ڈاکٹری تشخیص تھی کہ بخار نے ٹیپ محرقہ کی صورت اختیار کر لی ہے اس کے مشورے کے مطابق رائے کو ہسپتال میں لے گئے۔ شروع ہی سے اس کے اس بیماری سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔

تیسرے ہفتے ایک رات مجھے اطلاع دی گئی کہ رائے صبح تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب میں اس کے پاس پہنچی اس کے حواس کلیتہً بجا تھے۔ میں اس کے پلنگ کے پاس دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر از راہ محبت دبایا۔ یہ ندرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ میں رائے کو اگر سمجھ سکی اس کے آخری وقت میں۔

جب کچھ اس رات اس نے بستر مرگ پر مجھ سے کہا۔ وہ ایک حکایت سی تھی یہ توقع، اس سے ناراض ہونے کا نہ تھا۔ کون آدمی اس دنیا میں ایسا سنگ دل ہے جو دوسرے سے اس وقت ناراض ہو سکے جب وہ

بستر پر پڑا اپنے آخری سانس گن رہا ہو۔

'جان من' اس نے کہا 'اگر میں جانبر نہ ہو سکا تو میں تم سے ایک فرض کی ادائیگی چاہتا ہوں۔ تم یہ سن کر خفا تو ہو گی۔ لیکن مجھے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تمہیں بابی کو اپنے پاس رکھنا ہوگا اور اس کی پرورش کی تم ذمہ دار ہو گی۔

'بابی کون' میں نے استفسار کیا۔

'میرا لڑکا' اس نے جواب دیا۔ اس کی ماں اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی مر گئی تھی۔ یعنی گھبراؤ نہیں۔ یہ برداشت کرنے کی کوشش کرو۔'

'تو کیا بابی کی ماں تمہاری منکوحہ تھی' میں نے پوچھا۔

'نہیں' میں اس سے مزور شادی کر لیتا۔ لیکن شادی کی مقررکردہ تاریخ سے دو ہفتے پہلے میری تم سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کوشش کرتی رہی کہ مجھے تم سے علیحدہ کر دے۔ لیکن اس کی یہ کوشش ناکام گئی۔ میں طبعاً کمزور واقع ہوا ہوں۔ میں نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔'

'اس وقت بابی کی کیا عمر ہے'

وہ میسی سے چند ماہ ہی پہلے پیدا ہوا تھا' اس نے جواب دیا۔ میں لاچار تھا۔ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ہاں بیشک تم اس کا چارہ نہ کر سکتے تھے۔ میں نے اس سے متفق ہو کر کہا۔

اس لمحہ میں مجھ پر یہ روشن ہوا کہ کیوں رائے کی تنخواہ میں ہر ماہ کمی ہوتی تھی۔ بابی اپنی خالہ کے ہاں پرورش پا رہا تھا اور اس کے اخراجات کا کفیل رائے ہی تھا۔

'میری خواہش ہے' رائے پھر بولا کہ تم میسی کے ساتھ ہی اس کی پرورش کرو اور کبھی اس پر اس کی پیدائش کا حال ظاہر نہ کرو۔ اس کو یہ یقین دلانا کہ تم نے اسے گود لیا ہے۔ یعنی تم مجھ سے وعدہ کرتی ہو نا!'

آخری وقت میں بھی اس کا ذاتی سحر مجھ پر اپنا وار کر گیا اور میں نے اسے اپنا قول دے دیا۔

صبح سے پہلے ہی رائے اس دنیا کو خیرباد کہہ گیا۔

رائے کے مرنے کے بعد میں بابی کو اس کی خالہ سے لے آئی اور رائے کی زندگی کے بیمہ کی رقم سے میں نے کیوک میں ایک ہوٹل جاری کیا اور یہاں میں دونوں بچوں یعنی میسی اور بابی کے ساتھ رہنے لگی۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مجھے بابی سے شروع میں انتہائی نفرت تھی۔ اسے دیکھ کر میں اس کی مرحوم ماں سے حسد کرنے لگتی۔

موسم سرما کے آغاز میں دونوں بچے سکول میں داخل کر دیئے گئے۔ بابی جوں جوں بڑھتا گیا۔ اس کی رائے سے مشابہت زیادہ ہوتی گئی۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا کہ رائے ہی ایک بچے کی شکل میں میرے سامنے چل پھر رہا ہے اور یہی ایک بات تھی جو میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف کا موجب تھی۔ میں اس صدمے سے گو دیوانی نہ ہوئی لیکن میرے دماغ پر ایک غبار سا چھا گیا جس کا دور کرنا میرے لئے امر محال تھا۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ میں مرحوم رائے کی خدمت کرتی۔ لیکن رائے کو یہ کبھی منظور نہ ہوا اور اب جبکہ رائے میرے سامنے بابی کی صورت میں ایک چھوٹا بچہ بن کر آ گیا تھا۔ میرا وہ جذبہ رفتہ رفتہ عود کرنے لگا اور بابی سے میری وہ ابتدائی نفرت الفت میں تبدیل ہوتی گئی۔

میں نے آغاز ہی سے اس پر واضح کر دیا تھا کہ میں نے اس کو گود لیا ہے اور وہ مجھے چچی کہہ کر پکارے۔ تھوڑے ہی عرصے میں میری ننھی میسی اور بابی یک جان دو قالب ہو گئے۔ جب میں ان کو سکول اکٹھا جاتے دیکھتی تو کسی موہوم سی وجہ سے میری آنکھوں میں آ جاتا اور وہ غبار جس کا میں ذکر کر چکی ہوں۔ میرے دماغ پر چھا جاتا۔ گو میں اس وقت یہ پوری طرح نہ سمجھ سکتی تھی لیکن جو خطرہ مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والا تھا میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ میں محسوس کرتی کہ کسی نہ کسی طریق پر رائے کی مصیبت کا کفارہ اس کے یہ دونوں بچے ادا کریں گے۔

میسی اور بابی دونوں نے سکول کی تعلیم سے فراغت پا لی۔ اس کے بعد بابی کا خیال تھا کہ وہ قانون پڑھے گا اور میسی نے میرے پاس رہ کر مجھے ہوٹل کے انتظام میں مدد دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ نا معلوم سا خطرہ جسے میں اس وقت تک محض اپنے دماغ کی اختراع سمجھتی تھی مجھے اکثر مجبور کرتا اور میں کئی ایک نوجوانوں کو میسی کی توجہ کا مرکز بنانے کی کوشش کرتی۔ میں اندرونی طور پر خوش بھی تھی کہ باب ہم سے جدا ہو رہا ہے۔

کبھی تم نے اپنی زندگی میں ایک المیہ ڈرامہ کا افتتاح دیکھا ہے۔ کیسی عام سی بات ہمارے سامنے پیش ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی کیسی نا معلوم اور بھیانک ڈراما اب میرے روبرو شروع ہونے والا تھا۔

جب باب پہلے سال تعطیلات میں واپس گھر آیا اور میسی نے اس کا استقبال کیا تو اسی وقت سے ان کے اطوار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان دو ہستیوں کو جدا کرنا ناممکن ہے۔

باپ کے جسم میں مرحوم رائے بس رہا تھا اور میسی گویا میری ہی ذات کا دوسرا نام تھا۔ ہماری زندگی کے ڈرامے میں ہماری اپنی ہی اولاد ماں کا تھی۔ مجھے ان دونوں کی محبت مخوف کئے دیتی تھی۔ وہ وقت قریب آرہا تھا جب مجھے ان دونوں کو یا ان میں سے ایک کو حقیقت سے آشنا کرنا ہی ہوگا۔ میں دست بدعا تھی کہ ان دونوں کی محبت وقتی ثابت ہو۔

میں جان بوجھ کر دوسرے نوجوانوں کو میسی سے محبت کرنے کے لئے کہتی۔ لیکن میسی کسی طرح بھی انہیں قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کے دل میں باب کے سوا دوسرے کی جگہ ہی نہ تھی۔

بتدریج ہم دونوں یعنی میرے اور میسی کے دلوں میں کدورت پیدا ہونے لگی۔ میسی کو یہ علم تھا کہ میں اس کی اس محبت کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوں گو نہ تو اس نے کبھی مجھ سے اس کا تذکرہ کیا تھا اور نہ میں ہی اپنے میں کبھی یہ جرات پاسکی کہ اس ذکر کو چھیڑوں۔ لیکن یہ المیہ ڈراما بتدریج مختلف مراحل طے کرتا گیا۔

باب کو پھر دوسری تعطیلات پر واپس آنا تھا۔ اس دفعہ پھر قدرت مخالف سامان مہیا کر رہی تھی۔ ہوٹل کے تمام کمرے رک چکے تھے، اور لامحالہ ہم تینوں کو یک جا گذر کرنا تھا۔ باب آیا اور جس گرم جوشی سے میسی اس سے لپٹ گیر ہوئی۔ وہ ان کے اندرونی جذبات کو ظاہر کر رہی تھی۔ لیکن میں دل میں کہہ رہی تھی، نہیں نہیں تم ایک دوسرے کے لئے پیدا نہیں کئے گئے۔ میں اندھی نہیں۔

میسی نے میری طرف دیکھ کر کہا، ماں تمہیں مدت سے علم ہے کہ میں اور باب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ تم نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ہم دونوں کو علیحدہ کر دو۔ تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے پاس اس غلیظ اور بے ہنگام ہوٹل میں رہ کر تمہاری مدد کرتی اور سڑتی رہوں۔ تم ظالم ہو۔ بالطبیعت ہو،

باب میرے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے باہر آؤ۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے بالی کو مخاطب کر کے کہا۔ باب میرے ساتھ باہر آیا ہم دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

پھر اس نے مجھ سے سوال کیا۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے،

اور جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو میرے سامنے گویا مرحوم رائے بیٹھا تھا۔ ہاں وہی رائے جو جوانی میں اس قدر بے باک۔ خندہ رو اور خیرہ دست دار تھا۔

"تم" میں نے اس کو کہا "کسی صورت میں میسی سے شادی نہیں کر سکتے۔ مجھے تم سے آخر کہنا ہی پڑا۔ تمہارے باپ نے مرتے وقت مجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ میں کبھی تمہیں اس راز سے آگاہ نہ کروں۔ کاش میں ایسی حماقت سے کام نہ لیتی اور تمہیں بچپن ہی سے خبردار کر دیتی۔

"میرا باپ" باب نے کہا "میرا خیال ہے کہ میرا باپ تو مجھے تمہارے گود لینے سے پیشتر ہی مر گیا تھا،

"تمہارا باپ" میں نے کہا "وہی تھا جو میسی کا باپ اور میرا خاوند تھا"

اس کے بعد ایک سکوت سا چھا گیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر باپ کی طرف دیکھا۔ پھر وہی رائے میرے سامنے تھا۔ لیکن ایک نئے وجود میں جس سے میں واقف نہ تھی اور جس کے دل میں قدرے رحم اور زندگی کی تلخی کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔

"ماں میں سمجھ گیا" باب نے آہستگی سے جواب دیا لیکن کاش مجھے یہ علم پیشتر سے ہوتا۔ اس کے چہرے پر حقارت آمیز تبسم کھیل رہا تھا۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور میں نے چلا کر کہا "باب تم کیا کرنا چاہتے ہو،

"کچھ نہیں" اس نے بے تعلقی سے جواب دیا "صرف میسی کو حقیقت حال سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں، آخر یہ حق تو مجھ سے نہیں چھینا جا سکتا۔"

"مجھے کچھ دیر کے لئے ہم دونوں کو علیحدہ رہنے دو۔ میں اس کو آخری سلام کہنا چاہتا ہوں۔

"باب" میں نے کہا "یقیناً تم مجھ سے بغیر ملاقات کئے رخصت نہ ہوگے

"ماں بغیر تمہاری ملاقات کئے نہیں،

اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دئے اور میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ کہنے لگا "تم نے اس معاملے میں نہایت خوش اسلوبی سے کام لیا ہے۔ لیکن میں تم سے بہتر طریق پر میسی کو اس امر کے متعلق اطلاع دے سکتا ہوں۔ ہم دونوں کو کچھ وقفہ کے لئے اکٹھا رہنے کی اجازت دو"

اس نے اپنا منہ پھیر لیا اور جانے لگا اس کے کشادہ شانے چلتے وقت نیچے کی طرف سر جھکانا رائے کی خصوصیتیں تھیں۔ میرے سامنے رائے چلا جا رہا تھا۔

یہ خیال میرے دماغ میں اس وقت نہ آیا کہ ان دونوں کو یک جا چھوڑنا غلطی ہے۔ میں وہیں درخت کے نیچے بیٹھی اپنے خیالات میں مستغرق تھی۔ اب اس المیہ ڈرامے کا آخری سین تھا۔ اب تو میسی کو ضرور

اصلیت سے واقف ہونا تھا۔ میری رائے میں معاملہ اتنا نہیں بگڑا تھا کہ سلجھ نہ سکے۔ وہ جلد ہی ایک دوسرے کو بھول جائیں گے۔ جس وقت میں گھر جاؤں گی۔ باب آشتی پکڑ لیگیا ہوگا لیکن میسی اس کے متعلق مجھے یقین نہ تھا۔ لیکن میسی بھی بھول ہی جائے گی۔ وہ ابھی بالکل نوعمر ہے اور نوعمر جلد بھول جایا کرتے ہیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں ہوٹل جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ دور سے مجھے ایک کشتی جھیل میں جاتی دکھائی دی۔ بظاہر یہ معمولی بات تھی۔ بابی جو کشتی کو جھیل میں لا رہا تھا ایک ماہر ملاح تھا۔ لیکن میں پھر بھی خوفزدہ تھی میں دوڑ کر کشتی کے پاس پہنچی۔ میسی کشتی میں بیٹھی تھی اور بابی کا ایک پاؤں کشتی کے باہر اور ایک اس کے اندر تھا۔

دونوں نے میری طرف دیکھا۔ شام کے دھندلکے میں وہ دونوں غیر ارضی معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک تھی کہ میرا دل بیٹھ گیا۔

میں ان کی مرضی معلوم کئے بغیر کشتی میں ان دونوں کے درمیان بیٹھ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پر معنی نظروں سے دیکھا اور باب کشتی چلانے میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے لمحے ہوا کشتی کو جھیل کے وسط میں لے چلی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

رہ رہ کر میرے دماغ میں یہ سوال اٹھتا کہ ایسے وقت ان کا کشتی میں نکلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا ان کا ارادہ خودکشی کرنے کا تھا۔ کچھ بھی ہو، میرے آنے سے ان کے تمام ارادے درہم برہم ہو گئے تھے۔ میں خاموش بیٹھی تھی اور کشتی ہمیں جھیل کے عین وسط میں لے جا رہی تھی۔

آخر میں نہ رہ سکی۔ میں نے باب کو پکارا "باب تم کہاں جا رہے ہو آور آگے جانے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہم پہلے ہی کنارے سے بہت دور آ چکے ہیں۔"

باب نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور کہنے لگا "ہاں چچی تم ٹھیک کہتی ہو۔ آگے جانا بے سود ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ باب کے ان الفاظ میں ایک خاص مطلب پنہاں تھا۔ اس نے جلدی سے کشتی کا رخ کنارے کی طرف پھیرا۔ اچانک شمال کی طرف سے ایک طوفان اٹھا اور باب کی کوشش کے باوجود کشتی بے قابو ہو کر الٹ گئی اور میں اور میسی برف جیسے سرد پانی میں کشتی کے نیچے دب گئے۔

باب غوطے کھاتا ہوا میرے پاس پہنچا اور مجھے بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا۔ "چچی سنبھلو ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دو میں تمہیں کنارے پر بحفاظت پہنچا دوں گا۔"

پھر میسی کو چلا کر کہا "میسی تم خود کو سنبھالے رکھنا۔ میں چچی کو کنارے پر پہنچا کر ابھی آیا۔"

میسی اچھی خاصی تیراک تھی۔ لیکن میں تیرنے میں بالکل نااہل تھی۔

میں نے سنا کہ میسی باب کو یقین دلا رہی تھی۔ "باب میں خیریت سے ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔"

جب میں کنارے پر پہنچی۔ سردی سے نیم جان ہو چکی تھی۔ بمشکل تمام باب کو میسی کے بچانے کی ہدایت کر سکی۔ باب مجھے چھوڑ کر پھر جھیل میں غوطہ زن ہوا اور میں نے اسے میسی میسی پکارتے سنا۔ اس کے تیرنے کی آواز میرے کان میں آئی۔ اس کے بعد میں بیہوش ہو گئی۔

ایک عرصے کے بعد باب کے ہلانے پر مجھے ہوش آیا میں نے میسی کے متعلق دریافت کیا۔ لیکن باب نے بجائے جواب دینے کے ایک کالے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا جو کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔

میں گھسٹتی ہوئی۔ اس ڈھیر کے پاس پہنچی۔ میں نے میسی کے چہرے کو چھوا اور جان لیا کہ وہ اب اس خواب سے بیدار نہ ہوگی۔

باب نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا اور خود میسی کے ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتا رہا۔ وہ اس عمل کو نہ معلوم کب تک جاری رکھتا۔ لیکن میں جا کر ایک ڈاکٹر کو بلا لائی جس نے بعد تکمیل باب کو میسی کی موت کا یقین دلا کر اسے اس بے سود کوشش سے باز رکھا۔

میسی مر چکی تھی اور اس نے اپنے باپ کے اس ظلم کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ جو اس کے باپ نے باب کی ماں کے ساتھ روا رکھا تھا۔

میسی کے تجہیز و تکفین کے بعد میں نے ہوٹل بیچ دیا اور باب اور میں ہارلٹن میں آ گئے۔ یہاں پہنچتے ہی کھیتی باڑی کا کام شروع کر دیا۔ یہاں ہر نفس اس کو جان پر لیلے کے نام سے جانتا تھا اور میرا لڑکا سمجھتا تھا تم اور وہ سب ہمارے آپس میں نہ بولنے پر حیران تھے۔

اس رات سے جس رات میسی مری۔ میرے اور باب کے درمیان کبھی گفتگو نہ ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی موضوع ایسا رہا بھی نہ گیا

تھا جس کے متعلق ہم آپس میں بولتے۔

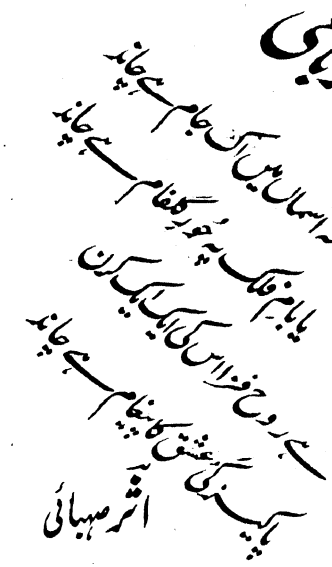
اکثر اوقات میں سوچتی ہوں کیا وہ دونوں جھیل میں خودکشی کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ لیکن اب یہ سوچ بے فائدہ ہے۔

باب نے میری جان بچائی تھی اور میں نے میری خاطر اپنی جان دی تھی۔ بس یہی میری رام کہانی ہے۔

لیکن جیسا تمہیں اب واضح ہو گیا ہو گا۔ باب آج نہیں آج سے تیس برس پیشتر مر چکا تھا۔ آج باب نہیں بلکہ جان بریلے مرا ہے وہ میرے جسم اور خون کا حصہ نہ تھا۔

خدا اس کی روح کو آسودگی بخشے۔

منظور ڈیرہ غازیخاں



وہ رات!

وہ رات!
میرے پیارے محبوب
کتنی حسین تھی وہ رات
جب ہماری روحیں
محبت کے شفاف نور سے روشن ہو چکی تھیں ہمارے دھڑکتے دل ایک دوسرے کے قریب تھے
ہاں میرے محبوب
کتنی روحانگیز تھی وہ تاریکی رات جب قدرت کی شہزادی انسانی وادیوں کو سنہری چادر میں لپیٹ چکی تھی۔
جب یہ دنیا سونے کے دریاؤں میں ڈوبا ہوا
سنہرا کھلونا معلوم ہوتی تھی
ہاں میری روح کے معبود
کتنی سحر آفریں تھی وہ رات جب جھلکتے ستاروں
اور آسمان پر جگمگاتے چاند کی حکومت میں ہماری روحیں محبت کے پرلگائے
پہاڑوں کی چوٹیوں۔ گھاٹیوں
زلف کی طرح بل کھاتی ندیوں
شفاف چشموں۔ گوہر بار آبشاروں
آبشاروں کے سنہری فینوں
مشکبار و عطر بیز ہواؤں
لالہ زاروں کی جلوہ ریز فضاؤں
سے گزر رہی تھیں
ہاں میرے مقدس دوست
کتنی دلکش تھی وہ سنہری رات
جس کے تصور میں اب
میرا دل ہے سرگوار
میری آنکھیں بھری بھری

الف۔ ایم ساقی

جام صہبائی

(۱)

مے عیش و نشاط کی پلائی آئی
خمر کیف و سرور کے لنڈھائی آئی
داماں جہاں سے بھر گیا پھولوں سے
یوں فصل بہار مسکرائی آئی

(۲)

پھولوں سے بھرا ہوا ہے داماں بہار
یا بحر جمال میں ہے طوفان بہار
ہر پھول دھلا ہوا ہے کوثر میں آج
فردوس سے ہو رہا ہے باراں بہار

(۳)

باغوں میں نہیں ہے گو بہاروں میں نہیں
سرو چمن نہیں ہے چاندتاروں میں نہیں
وہ حسن کہ ہے جو بت میں جلوہ پیرا
فطرت کے حسین آئینہ داروں میں نہیں

(۴)

ہنگامۂ فصل گل سے ہنگامۂ رنگ
ہے بربط بلبلاں سے افسانۂ رنگ
مینا خانۂ رنگ سے گلستان جہاں
ہے ساغر رنگ سے صہبا خانۂ رنگ

اثر صہبائی

طلسمِ گفتار

سرد آہیں بھروں گا، تو جوانی میں بھروں گا
مرنے کا ہے موسم یہی، جی بھر کے مروں گا

تو پیکرِ انساں میں، مرے سامنے آجا
یارب میں تجھے صدق بھرا سجدہ کروں گا

جو بات چھپاتا ہوں، وہ ہے پہلے ہی رسوا
لیتے ہیں ترا نام کہ میں آہ بھروں گا

آجاتی ہیں خود لب پہ مرے، آپ کی باتیں
اندیشہ ہے، میں آپ کو بدنام کروں گا

مرنا ہے تو پھر مرگِ حسیں کیوں نہ خریدوں
جاں دے کے عدمؔ عشق کی تکمیل کروں گا

اے عشق! وہ بُت رونقِ بت خانہ بنا دے
جو ہستیٔ یزداں کو بھی افسانہ بنا دے

ہے عشرتِ دیوانگیٔ عشق عجب چیز
دیوانہ بنا دے، مجھے دیوانہ بنا دے

ہر فکرِ جگر سوز کی بنیاد خرد ہے
اے دوست مجھے عقل سے بیگانہ بنا دے

گمنام ہوں، ناپید ہوں، گویا کہ نہیں ہوں
کیا دیکھ رہا ہے؟ مجھے افسانہ بنا دے

ہو سکتا ہے افسانے کا گر تو متحمل
پھر مجھ کو بڑے شوق سے افسانہ بنا دے

اے زاہدِ کم فہم! تجھے علم بھی ہے کچھ؟ ق دل کعبہ نہیں ہے اسے بتخانہ بنا دے

اللہ بھی اک بُت ہے، بُتِ اعظم و یکتا
اس رازِ دل آویز کو افسانہ بنا دے

دل مانگا تھا یارب یہ تجھے کس نے کہا تھا
پہلو میں مرے چھوٹا سا غم خانہ بنا دے

یہ آپ کی دزدیدہ نگاہی کہیں یوں ہی
دل میں مرے اک شہرِ تمنا نہ بنا دے

ہستی مری رہ جائے نہ جز نشہ و مستی
یوں دیکھ مجھے لغزشِ مستانہ بنا دے

اے جانِ عدمؔ آمری گفتار میں ڈھل جا
ہر شعر صنم رنگ کو بت خانہ بنا دے

عدمؔ

کرشمۂ الفت

ذیل کی سطور روس کے مشہور ناول نگار یوان الگزنڈر وچ گون چارووف (۱۸۱۲ء-۱۸۹۱ء) کے ناول اہلوآف رجہروڈ کے نام سے منسوب ہے کے ایک باب کا ترجمہ ہے اہلوف، مصنف کا غیر فانی کردار ہے، اُس نے اپنے کردار کی تصویر اس چابکدستی اور صفائی سے اتاری ہے کہ دنیائے ادب میں شیکسپیئر کے سیلف اور رومیو کے تاراتو کی طرح اہلوف بھی ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے، روسی ادبیات میں "اہلوفیت" ایک بیماری کا نام ہے جو کاہلی، آرام طلبی، اور لیت و لعل کی عادت کا ہم معنی ہے، اس میں شک نہیں کہ ماقبل انقلاب روس کی یہ مخصوص بیماری تھی، لیکن اگر جستجو کیا جائے تو ہر قوم میں چند ایسے افراد نظر آئیں گے جن کی زندگی میں اہلوفیت کا ایک ہلکا سا عکس نظر آتا ہے، اہلوف ایسا کاہل انسان تھا جس کا عملی پہلو بالکل مردہ تھا۔ حیاتک بن پڑا اُس نے ہر کام کو کل پر اٹھا رکھا، نہ کرنے کا عذر ڈھونڈا، بہانہ تلاش کیا۔ اور وے سکے لیکن کسی کو پورا نہ کیا، بستر اس کا رفیق، ڈریسنگ گاؤن اس کا مونس اور نیند اس کی دولت تھی، بستر سے ہم آغوش ہو کر وہ دن کو خواب دیکھا کرتا اور اس لذت پر اس نے ہر چیز، روح جسم، جوانی، زندگی، مال اور دولت سب کو بھینٹ چڑھا دیا، اس کے نیم روحی دوست اسٹولٹز نے اس کی زندگی کے عملی پہلو کو بیدار کرنے کی سعی کی اور اُس انتاک انجام سے جو قسمت کے لکھے کی طرح ناگزیر تھا، بچانا چاہا، اولگا کو اس کی نجات کا وسیلہ سمجھ کر اس کا اہلوف سے تعارف کرایا اولگا بہت زیادہ حسین نہ تھی، لیکن اُس کے تناسب اعضا میں ایسی بے پناہ دلفریبی تھی جس کی کشش سے کوئی انسانی قلب محفوظ نہیں رہ سکتا تھا، اس کی آواز میں ایک جادو تھا، جو آہستہ آہستہ دماغ کو سحر کر کے انسان کو از خود رفتہ بنا دیتا تھا، جب وہ گانے لگتی تو اہلوف کے مردہ دل میں بھی ایک ہیجان برپا ہو جاتا، اس کی روح وجد کرنے لگتی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جاتا، ایک ایسے ہی لمحے میں جبکہ اولگا نے اپنے سحر بارنغمہ سے اہلوف کو سحر کر دیا تھا، وہ ایک عالم وارفتگی میں اولگا سے اپنی محبت کا اظہار کر بیٹھتا ہے اور پھر ہوش آتے ہی احساس ندامت سے اولگا کے پاس سے اٹھ کر چل دیتا ہے، ذیل کا واقعہ اسی کے بعد کا ہے۔

اس واقعے کے بعد چند دنوں تک اہلوف اور اولگا کی پھر تنہائی میں ملاقات نہ ہوئی، جب کبھی اہلوف کی نگاہ اولگا پر پڑ جاتی تھی تو وہ اسکول کے ایک طالب علم کی طرح چھپ جاتا، اولگا کا رویہ بھی بدل گیا تھا، حالانکہ وہ اُس سے نہ اجتناب کرنا چاہتی تھی اور نہ سرد مہری ہی سے پیش آتی تھی، البتہ ذرا خاموش سی ہو گئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ سوچ کر فکر مند تھی کہ ایسا واقعہ کیوں رونما ہوا جس کی وجہ سے وہ اس لطف سے محروم ہو گئی جو اُسے اہلوف کو اپنی مستفسرانہ نگاہوں سے ستانے، اس کی کاہلی پر نیک نیتی سے طعنہ زنی کرنے اور اُس کی آرام طلبی و بھوہڑ پنی پر ملامت کرنے میں حاصل ہوتا تھا، اہلوف کی ہنسی اڑانے میں اُسے ایک خاص مزہ ملتا تھا، لیکن اس کے تبسم میں عداوت کا کوئی پہلو نہ تھا، بلکہ یہ ہنسی اس مسکراہٹ کے برابر تھی جو ایک ماں کے لبوں پر اپنے بیٹے کو مسخرے کے لباس میں ملبوس دیکھ کر پیدا ہو جاتی ہے۔ اسٹولٹز بھی جا چکا تھا، اور اب وہاں کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جس کو وہ اپنی خندہ پیشانی سے محظوظ کر سکے، اس کا پیانو بند پڑا تھا، دونوں کے دلوں پر احساس تنہائی سے ایک افسردگی سی چھائی ہوئی تھی، اولگا کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ دونوں کے ابتدائی مراسم کس قدر خوشگوار تھے، دونوں میں کتنا جلد تعارف ہو گیا تھا، اور کس آسانی سے دونوں دوست بن گئے تھے، اسٹولٹز کی نسبت اہلوف زیادہ سادہ مزاج اور نرم دل واقع ہوا تھا، یہ سچ تھا کہ اسٹولٹز کی طرح اہلوف اولگا کی دل جوئی نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس کی نظری حرکتوں سے اولگا کا دل بہل جاتا تھا، پھر وہ ہمیشہ اس کے تمسخرانہ ہنسی کو معاف کر دینے کے لئے تیار رہتا تھا، اس کے علاوہ اسٹولٹز نے چلتے وقت اولگا کو تاکید کر دی تھی کہ وہ اہلوف کی خبر گیری کیا کرے اور اُسے گھر میں پڑے رہنے سے باز رکھے اولگا نے اپنے ذہن میں ترکیبیں ایجاد کر لی تھیں کہ کس طرح وہ اہلوف کو کھانے کے بعد سونے نہیں دے گی، بلکہ دن کے وقت اُسے بیٹھنے کا موقع ہی نہ دے گی، جو وعدہ اُس نے اسٹولٹز سے کر لیا تھا اُسے پورا کر کے رہے گی، وہ خوب دیکھا کرتی کہ وہ اہلوف کو اُن کتابوں کو پڑھنے کی رغبت دلائے گی جنہیں اسٹولٹز

چھوڑ گیا تھا، اُس سے اجنار ڈیھا کر سے گی، دیہات کے کارندوں کو خط لکھا کرے گی۔ زمینداری کے انتظام کا خیال دلائے گی، باہر چلنے کے لئے آمادہ کیا کرے گی، کسی طرح بھی اُسے بے کار بیٹھ کر اونگھنے نہ دے گی، اور ہر وقت ایک نہ ایک کام اُس کے سامنے پیش کر دیا کرے گی، اُن چیزوں کا ہوش دلائے گی جن سے وہ رفتہ رفتہ غافل ہو گیا تھا۔ غرض وہ اس کی عادتوں میں اس قدر تغیر پیدا کر دے گی کہ واپس آنے پر اسٹوٹنر اس کو پہچان نہ سکے گا، وہی شرمیلی سی خاموش طبیعت والی لڑکی اولگا جس نے ہنوز دنیاوی زندگی میں قدم نہیں رکھا تھا، جس کی اطاعت کے لئے ہنوز کسی نے سر خم نہیں کیا تھا، دنیا کے سامنے ایک معجزہ پیش کر دے گی، وہ تبدیل فطرت کا باعث بن جائے گی، اُس نے اپنی تجاویز پر عمل کرنا بھی شروع کر دیا تھا، اور البوناف میں اُسی دن سے تبدیلی سی پیدا ہونے لگی تھی جس دن اس نے اولگا کو گانے سنا تھا۔ اب اس میں زندگی آجائے گی اور دنیا کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے گا، وہ اس احسان کے لئے اولگا کو دعائیں دے گا، مردہ جسم میں روح پھونکنا! اگر اُس ڈاکٹر کی جو ایک مایوس مریض کو دوبارہ تندرست کر دیتا ہے بے انتہا تعریف و توصیف ہوتی ہے تو پھر اس عورت کی کیا کم تعریفیں ہوں گی جس نے ایک روح و دماغ کو جو اخلاقی حیثیت سے مردہ ہو رہے تھے۔ از سر نو زندگی بخشی،

اس خیال سے شادمانی اور فخر کی ایک کپکپی اس کے سارے جسم میں محسوس ہوتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ قدرت نے اسے اس فرض پر مامور کیا تھا، اُس نے اپنے تصور میں البوناف کو اپنا سیکرٹری اور اپنی لائبریری کا محافظ بنا رکھا تھا۔ اب اس کی ساری امیدوں کا خاتمہ ہونے والا تھا، وہ حیران تھی کہ کیسا کرے، لہٰذا جب اس کا سامنا البوناف سے ہو جاتا تھا تو اُسے چُپ سی لگ جاتی تھی۔

البوناف کے لئے یہ خیال سوہان روح ہو رہا تھا کہ اُس نے اولگا کو آزردہ خاطر کر دیا تھا، جب وہ اُسے دور سے دیکھتا تو اُس کی برق پاش نگاہوں اور نغمہ شعاری کی سحر کے خوف سے لرزہ براندام ہو کر الگ ہٹ جاتا، وہ ٹہلنے کے لئے جنگل کی طرف چلا جاتا یا دیہات کو نکل جاتا اور وہاں کسی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھ کر بچوں کو کھیلتے اور بطخوں کو تالاب میں تیرتے دیکھتا رہتا۔ اُس کے مکان کے نزدیک ایک بڑا پارک تھا، وہاں وہ اس خوف سے نہیں جاتا تھا کہ مبادا اولگا کا سامنا ہو جائے، وہ سوچتا تھا کہ میں نے کیا ایسی بات منہ سے نکالی؟" لیکن کبھی اس نے دل میں یہ غور نہیں کیا کہ آیا اس کے الفاظ میں صداقت بھی یا نہیں! وہ دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے یا صرف نغمہ کے عارضی اثر کی پیداوار تھے۔ افسردگی، اور ندامت جسے وہ ذلت کا مترادف سمجھتا تھا اُسے اتنا موقع بھی نہ دیتی تھی کہ وہ اپنے الفاظ کا بغور پہ کرے یا پیسپے کہ اولگا سے اس کا کیا تعلق تھا، وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ کون سی چیز اس کے دل کے اندر داخل ہو گئی تھی، ایک بار تھا جو اس سے قبل وہاں موجود نہ تھا، اس کے سارے جذبات ندامت کے احساس سے مغلوب ہو گئے تھے، لیکن جب ایک لمحے کے لئے بھی وہ اولگا کا خیال دل میں لاتا تو اُس کی نگاہ تصور کے سامنے اولگا کی تصویر لا کر کھڑی ہو جاتی، جو سکون، زندگی اور مسرت کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی، آہ! یہ میں نے کیا کر دیا" وہ سوچتا "میں نے سب بنا ہوا کھیل بگاڑ دیا، شکر ہے کہ اسٹوٹنر یہاں موجود نہیں اولگا کو اُس سے کہنے کا موقع نہ ملا، نہیں تو میں زمین میں سما جانے کی دعائیں کرتا، محبت، آنسو . . . نہیں یہ میرا شیوہ نہیں، اولگا کی خالہ نے آج مجھے نہ اپنی خیریت کہلا بھیجی اور نہ چائے ہی پر بلایا، اولگا نے ضرور کہہ دیا ہوگا۔ اے میرے اللہ" اُن خیالات میں مستغرق وہ پارک کے درمیان ایک روش پر چل رہا تھا۔

اولگا کو صرف مشکل یہ تھی کہ وہ البوناف سے ملے گی کس طرح، کیا اس واقعے کے متعلق اُسے کچھ کہنا چاہئے یا اس طرح پیش آنا چاہئے کہ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی؟ لیکن آخر وہ ہے گی کیا؟ آیا اُسے ترش روئی برتنا چاہئے یا معذرانہ انداز اختیار کرنا چاہئے، یا اُس کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر رکھے پن اور سختی سے اتنا کہہ دینا چاہئے کہ "مجھ کو تم سے ایسی امید نہ تھی" اُس نے اولگا کو کیا سمجھ کر اس قدر گستاخی سے گفتگو کی تھی۔ لیکن کیا یہ واقعی گستاخی تھی؟ اُس نے اپنے دل سے پوچھا "اگر اس کے جذبات میں اصلیت تھی تو پھر ان کو ظاہر کر کے اُس نے کون سا قصور کیا، . . . لیکن بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے! ابھی تو میری اور اس کی اچھی طرح شناسائی بھی نہیں ہوئی، وہ میری طبیعت سے اچھی طرح واقف بھی نہیں ہے، کوئی مرد کسی عورت کو صرف تین چار بار کی ملاقات کے بعد ایسی بات نہیں کہہ سکتا، اور نہ کوئی اس قدر جلد محبت میں گرفتار ہو سکتا ہے، اس طرح کی باتیں صرف البوناف سے ہی ممکن ہیں" لیکن اب اُسے یاد آیا کہ اُس نے پڑھا تھا کہ کبھی کبھی محبت اپنا اثر جلد دکھاتی ہے۔" وہ جذبہ سے مغلوب ہو گیا تھا۔ جذبات کی ایک رو اُسے اچانک بہائے لئے گئی، اب وہ میرے نزدیک آنے سے ڈرتا ہے اور نادم معلوم ہوتا ہے، لہٰذا یہ اس کی گستاخی نہ تھی، پھر یہ قصور کس کا ہے؟"

وہ حیران تھی، اس نے سوچا کہ بے شک سارا قصور اسٹولٹز کا تھا۔ کیونکہ اسی نے اولگا کو گانے پر آمادہ کیا تھا، لیکن البوناف تو پہلے سننا نہیں چاہتا تھا، وہ آزردہ ہو گئی تھی اور اس نے اس بات کی کوشش . . . رشدت غیرت سے، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، ہاں اُس نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس کے جذبات کو بیدار کر دے، اسٹولٹز نے اُس سے کہا تھا کہ البوناف دنیا کی ساری چیزوں سے بیزار ہو گیا ہے، وہ کسی چیز میں بھی دلچسپی نہیں لیتا ہے اور اس کے اندر سارے حسیات مردہ ہو چکے ہیں، اس لئے اولگا نے آزمانا چاہا کہ واقعی ایسا ہے یا نہیں اور اس نے ایسا گایا کہ اس سے قبل کبھی نہیں گایا تھا"!

"آہ، یہ میرا قصور تھا، مجھے اس سے معافی مانگنی چاہیئے . . . لیکن کس لئے؟" اُس نے دل سے سوال کیا "میں اس سے کیا کہوں گی، مسٹر البوناف، قصور وار میں ہوں، ہاں ہی نے تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، کس قدر ذلت کی بات ہے، نہیں نہیں یہ جھوٹ ہے" وہ چیخنے اور غصے سے زمین پر پیر پٹکنے لگی "کس کی اتنی ہمت ہے کہ یہ گمان کر سکے . . بھلا مجھے کیا خبر تھی کہ وہ اس طرح متاثر ہو جائے گا، اگر ایسا نہ ہوتا، اگر اس کے منہ سے ایسی بات نہ نکلتی تو کیا ہوتا، میں نہیں کہہ سکتی" اُس نے سوچا اُسی شام سے اس کے دل میں عجیب قسم کے جذبات پیدا ہو رہے تھے، اُسے بے حد مسرت پہنچا تھا، اُسے حرارت سی معلوم ہوتی تھی اور اس کا گال تمتمایا ہوا تھا، . . "اعصابی ہیجان . . خفیف حرارت" ڈاکٹر کی یہی تشخیص تھی، "یہ سب البوناف کا کیا ہوا ہے، آہ! میں اُسے ضرور سبق سکھاؤں گی، تاکہ پھر ایسی حرکت کا اعادہ نہ ہو، میں خالہ جان سے کہہ دوں گی کہ وہ اُسے اپنے گھر نہ آنے دیں، اُسے اپنی حقیقت کو بھلانا نہیں چاہیئے اُس نے جرأت کیسے کی؟" ان خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ پارک میں مصروف خرام تھی، غیظ و غضب میں اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

یکایک اُس نے کسی کی آہٹ سنی۔

"کوئی آ رہا ہے" البوناف نے سوچا

دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"اولگا سرجیونا!" البوناف نے کہا، اس کا بدن پتے کی طرح کانپ رہا تھا،

"البوناف!" اولگا نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا،

دونوں ٹھٹک گئے۔

"خیر الصباح" البوناف نے کہا

"خیر الصباح" اولگا نے جواب دیا

"تم کہاں جا رہی ہو؟" اُس نے پوچھا

"کسی خاص جگہ نہیں" اُس نے اپنا سر اٹھائے بغیر جواب دیا

"میری وجہ سے تمہیں خلل تو نہیں ہوا؟"

"نہیں، مطلق نہیں" اولگا نے اپنی متجسسانہ نگاہوں سے بسرعت دیکھ کر جواب دیا

"تو کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں؟" اُس نے اچانک اولگا پر ایک مستفسرانہ نگاہ ڈال کر پوچھا

دونوں ایک روش پر خاموشی کے ساتھ ٹہلتے رہے، جس شدت کے ساتھ آج البوناف کا دل دھڑک رہا تھا اُستاد کے ڈنڈے کے ڈر سے بھی نہیں دھڑکا تھا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، اور اُس نے بولنے کی انتہائی کوشش کی، لیکن زبان حرکت نہ کرتی تھی، صرف اُس کا دل خوف ناک طریقے پر دھڑک رہا تھا، گویا اُس پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔

"اسٹولٹز کے یہاں سے کوئی خط آیا ہے؟" آخر اولگا نے دریافت کیا۔

"ہاں ایک خط آیا ہے"

"کیا لکھا ہے؟"

"اُس نے مجھے پیرس بلایا ہے"

"تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"میں جاؤں گا"

"کب؟"

"کچھ دنوں بعد . . نہیں، کل . . جس قدر جلد میں تیار ہو سکوں گا"

"اس قدر جلد کیوں؟" اس نے پوچھا

البوناف نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا تمہیں اپنا مکان پسند نہیں ہے؟ . . بتاؤ تم کیوں جانا چاہتے ہو؟"

"ڈھٹائی تو دیکھو کہ یہاں سے جانا چاہتا ہے" اس نے دل میں سوچا "کسی چیز نے مجھے کمزور و بد حال بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے میں نہایت اذیت میں مبتلا ہوں" اُس نے دبی آواز میں اولگا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ

چپ تھی، پھر اُس نے لیلاج کے پھولوں کا ایک گچھا اٹھا کر اُسے سونگھنے کے بہانے اپنا چہرہ ڈھک لیا۔

"آن کی بوکتنی بھینی ہے، ہے نا؟" اس نے اپنی ناک بھی ڈھک کر پوچھا، "یہاں وادی کے نیلوفر بھی ہیں، ٹھہرو، میں چند پھول تمہیں چن کر دیتا ہوں" گھاس کی طرف جھکتے ہوئے اُس نے کہا "ان کی بو زیادہ خوشگوار ہے، ان میں فطرت زیادہ نمایاں ہیں، لیلاج کے پودے ہمیشہ مکانوں کے قریب اُگتے ہیں اور اُن کی شاخیں گھر کی چیزوں کے اندر گھس جاتی ہیں، ان کی بو بھی نہایت تیز ہے، ذرا ان نیلوفر کے پھولوں کو دیکھو، شبنم سے اب تک نم ہیں"

اُس نے چند پھول اولگا کے ہاتھوں میں دے دئیے

"پھا تمہیں پسند ہے؟" اُس نے پوچھا

"نہیں، اس کی بو بھی بہت کڑی ہے، مجھے نہ گلاب پسند ہے نہ چمپا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ پھولوں سے مجھے زیادہ مشوق نہیں، باغوں میں خیر ایسے بُرے نہیں، لیکن مکان کے اندر تو تکلیف کا باعث ہوتے ہیں . . . پھولوں کی کثرت تمام گندگی . . ."

"تمہیں اپنے کمروں کی صفائی زیادہ عزیز ہے؟" اُس نے سترارت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا "تم سے گندگی برداشت نہیں ہوتی؟"

"نہیں، میرا ملازم ایسا . . ." وہ بڑبڑایا اور دل ہی دل میں اُس نے جملہ کو پورا کیا "بدمعاش ہے"

"تم سیدھے پیرس جاؤ گے؟" اولگا نے دریافت کیا

"ہاں، اسٹولٹنر کئی دن سے میرا انتظار کر رہا ہے"

"مجھ سے ایک خط لے لینا، میں اس کو ایک خط لکھنا چاہتی ہوں"

"تو آج ہی دے دو۔ کل میں ٹھہر کو چلا جاؤں گا"

"کل ہی؟" اُس نے پوچھا "اس قدر جلد کیوں۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تمہیں نکال رہا ہے"

"ہاں"

"کون"

"ندامت . . ." اُس نے دبی آواز سے کہا

"ندامت" اولگا نے بے اختیاری طور پر دُہرایا، وہ سوچنے لگی "اب میں اُس سے کہوں گی کہ سٹرابلوماف مجھے یہ توقع نہ تھی . . ."

"ہاں اولگا سرجیونا" آخر اُس نے دل کڑا کر کے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں تعجب ہوا ہوگا . . . بلکہ غصہ . . ."

"اب وقت آگیا ہے . . . بس یہی موقع ہے . . . اس کا دل دھڑکنے لگا "اُف میں نہیں کہہ سکتی"

ابلوماف نے جھک کر اس کے چہرے کا جائزہ لینا چاہا کہ ان باتوں کا اس پر کیا اثر ہوا ہے، لیکن وہ لیلاج اور نیلوفر کے پھولوں کو سونگھ رہی تھی اور خود بھی حیران تھی کہ وہ کس طرح متاثر ہوئی ہے، اور اُسے کیا کہنا اور کرنا چاہئے، آہ! میں کس قدر بے وقوف ہوں، میں کسی معاملے میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی" اُس نے مایوس ہو کر سوچا

"میں بالکل ہی بھول گئی تھی . . ." اُس نے کہا

"یقین مانو، کہ میں بالکل بے بس تھا، مجھے اپنی زبان پر قابو نہ رہا اور بے اختیاری کے عالم میں وہ الفاظ میرے منہ سے نکل گئے . . ."

اُس کی ہمت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی "اگر آسمان سے بجلی گر پڑتی اور میرے قدموں تلے کی زمین پھٹ پڑتی تو بھی میں کہے بغیر نہ رہتا۔ کوئی قوت بھی مجھے ایسا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی، خدا کے لئے یہ خیال نہ کرنا کہ میں نے قصداً . . . ایک منٹ کے بعد بڑی سے بڑی قیمت ادا کر کے میں اپنے الفاظ واپس لینے کو تیار تھا"

وہ اپنا سر جھکائے پھولوں کو سونگھتی چل رہی تھی۔

"اُسے بھول جاؤ" اُس نے اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اسے بھول جاؤ، خصوصاً جبکہ اس میں صداقت نہ تھی . . ."

"صداقت نہ تھی؟" دفعتہً پھولوں کو ہاتھ سے گرا کر اور سر اٹھا کر اُس نے سوال کیا۔

اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور اُن میں حیرت و تعجب کی ایک چمک پیدا ہو گئی تھی،

"صداقت کیوں نہ تھی؟" اُس نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔

"ہاں، خدا کے لئے اسے بھول جاؤ، اور خفا نہ ہو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک لمحے کے لئے از خود رفتہ ہو گیا تھا، تمہارے گانے کی وجہ سے . . ."

"صرف گانے کی وجہ سے؟"

اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا، اس کے گالوں کی تمتماہٹ دور ہو گئی تھی اور آنکھوں کی چمک بھی جاتی رہی تھی،

"تو سب ختم ہو گیا" اُس نے اپنے الفاظ واپس لے لئے، اب خفگی کے اظہار کا کوئی موقع نہ رہا، معاملہ درست ہو گیا اور اب پریشانی کی کوئی وجہ نہیں

ہے پہلے کی طرح ہم پھر آپس میں گفتگو اور ہنسی مذاق کر سکتے ہیں" وہ سوچ رہی تھی چلتے چلتے اُس نے ایک شاخ کو پکڑ کر کھینچا اور اُسے توڑ کر ایک پتہ کو دانت سے کاٹنے لگی، دفعتہً اُس نے شاخ اور پتہ دونوں کو روش پر پھینک دیا "تم خفا تو نہیں ہو گئیں؟ تم نے بھلا دیا ہے؟" البوماف نے اس کی پشت کی طرف سے جھک کر پوچھا۔

"لیکن یہ کیا؟ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو" اُس نے لرزتے ہوئے جواب دیا، بلکہ وہ جز بز ہو کر اس کی طرف سے ہٹی جا رہی تھی۔ "میں نے سب کچھ بھلا دیا ہے . . . اب مجھے کچھ یاد نہیں رہا"

البوماف چپ ہو رہا، وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے، اُس نے اولگا کو دفعتہً اُداس و رنجیدہ ہوتے دیکھا، لیکن اس کی وجہ معلوم کرنے سے قاصر تھا۔

"خدایا" اولگا نے سوچا" اب تلافی ہو گئی، وہ منظر ہی محو ہو گیا، خدایا تیرا شکر . . . پھر یہ کیا، اب اس کا کیا مطلب ہے"؟

"اب میں گھر جاتی ہوں" اُس نے دفعتہً کہا اور اپنی رفتار کو تیز کر کے ایک دوسری روش پر مڑ گئی۔

اس کے گلے پر ایک بار تھا، اور اُسے خوف تھا کہ وہ رو پڑے گی۔

"وہ راستہ اچھا نہیں ہے، یہ زیادہ قریب ہے" البوماف نے کہا، وہ مایوسی سے سوچنے لگا" احمق، اس عذر معذرت کا کیا فایدہ ہوا، اب وہ اور بھی بیزار ہو گئی، مجھے اس واقعے کی یاد نہیں دلانا چاہئے تھی خود آ گئی گئی بات ہو جاتی، اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں اُس سے معافی مانگوں"

"میں سمجھتی ہوں کہ میرے کبیدہ خاطر ہونے کی وجہ یہ ہے" وہ سوچ رہی تھی" کہ مجھے یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ مسٹر البوماف میرا ہمدرد ہے یہ خیال نہ تھا کہ تم اتنی جرأت . . . وہ میرے عندیہ کو پہلے ہی تاڑ گیا تھا، ہونہہ صداقت نہ تھی، تو وہ جھوٹ بھی بول رہا تھا، کیسے جرأت ہوئی اُس کی؟"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے بھلا دیا ہے؟" البوماف نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں، سب کچھ" اُس نے گھر جانے کی جلدی میں جواب دیا۔

"اچھا تو یہ دکھانے کے لئے کہ تم مجھ سے رنجیدہ نہیں ہو اپنا ہاتھ مجھے دو"

البوماف کی طرف نگاہ کئے بغیر اولگا نے اپنی انگلیوں کو بڑھا دیا لیکن جیسے ہی اُس نے انہیں چھوا اولگا نے کھینچ لیا،

"نہیں، تم ابھی تک رنجیدہ ہو" اُس نے سرد آہ کے ساتھ کہا، "آہ! تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ یہ ایک لغزش تھی، میں ہرگز جرأت نہیں کر سکتا تھا . . . نہیں، بس، اب میں پھر کبھی تمہارا گانا نہیں سنوں گا . . ."

"مجھے یقین دلانے کی تمہیں ضرورت نہیں، اور نہ مجھ کو تمہاری معذرت کی خواہش ہے" اُس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا" میں کسی صورت سے بھی نہیں گاؤں گی"

بہت اچھا، میں کچھ نہ کہوں گا، خدا کے لئے مجھ سے اس طرح علیحدہ نہ ہو ورنہ میرے دل پر ایک بار معلوم ہو گا"

وہ آہستہ آہستہ اس کی باتوں کو غور سے سنتی ہوئی چل رہی تھی۔

"اگر یہ سچ ہے کہ تمہارے گانے کے بعد اگر میں نہ روتا تو تم بھی نہ روتیں تو اس مرتبہ میں . . . اگر تم بغیر مسکرائے، بغیر اپنا ہاتھ میری طرف دوستانہ طور پر بڑھائے چلی جاؤ گی تو . . . مجھ پر رحم کرو، اولگا سرجیونا، میری طبیعت بگڑ جائے گی، میرے ٹخنے کانپ رہے ہیں۔ میں بمشکل کھڑا ہو سکتا ہوں . . ."

"کیوں؟" اولگا نے دفعتہً اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا

"مجھے خود نہیں معلوم" اُس نے کہا" اب ندامت کا احساس مجھ سے جاتا رہا، میں اپنے الفاظ پر نادم نہیں ہوں . . میں سمجھتا ہوں کہ وہ . . . . . "

اُس نے اپنے دل کے اندر پھر ایک کپکپی محسوس کی، پھر وہاں ایک بار معلوم ہوا، اور اولگا کی مہربان اور معصومانہ نگاہیں پھر اُسے تڑپانے لگیں، وہ کس ادا کے ساتھ اس کی طرف مخاطب ہو کر اس کے جواب کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔

"وہ . . . کیا؟" اس نے بے چینی سے دریافت کیا

"نہیں، مجھے کہتے ڈر معلوم ہوتا ہے، تم پھر مجھ سے خفا ہو جاؤ گی"

"تو تو" اُس نے آمرانہ لہجے میں کہا

وہ چپ تھا

"تو"

"اس وقت تمہیں دیکھ کر پھر میرے دل میں آنسو بہانے کی بے اختیار

خواہش پیدا ہو رہی ہے، . . . تم دیکھتی ہو کہ مجھ میں غرور نہیں، میں اپنے جذبات سے نادم نہیں ہوں . . ."

"لیکن آنسو بہانے کا سبب؟" اس نے نرمی سے پوچھا، گال پھر تمتما گئے تھے۔

"تمہاری آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے، . . . میں پھر محسوس کرتا ہوں کہ . . ."

"کیا؟" اس نے پوچھا، اب اس کے گلے پر بار نہ تھا، اور وہ سراپا انتظار بنی ہوئی تھی،

دونوں اولگا کے مکان تک پہنچ گئے۔

"میں محسوس کرتا ہوں کہ . . ." ابلوف اپنی بات جلد ختم کر دینا چاہتا تھا، لیکن وہ اتنا کہہ کر رک گیا۔

وہ آہستہ آہستہ زینے پر چڑھ رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے چڑھنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔

وہی لمحہ . . . وہی . . . جذبہ . . . وہی احساس . . . مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو، میں سچ کہتا ہوں کہ میں بالکل مجبور ہوں . . ."

"مسٹر ابلوف" اولگا نے سخت لہجے میں کہنا شروع کیا، لیکن یکایک اس کا چہرہ ایک تبسم سے منور ہو گیا، "میں رنجیدہ نہیں ہوں۔ میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔" اس نے نرمی سے کہا "ہاں صرف آئندہ . . ."

اپنا رخ سامنے کئے بغیر اولگا نے ایک ہاتھ ابلوف کی طرف بڑھا دیا، اس نے بھی تھام کر ہتھیلی کا بوسہ لے لیا، اولگا نے بھی آہستہ سے اپنی ہتھیلی کو اس کے لبوں پر دبا دیا اور فوراً شیشے کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی اور ابلوف مورت کی طرح جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

سید حسن ایم اے

قطعات

سب تیری جفائیں ہیں گوارا مجھ کو
کافی ہے وفاؤں کا سہارا مجھ کو
آخر تو گزر جائے گا دورِ نکبت
جینے دو کوئی روز خدارا مجھ کو

ناکام ہے ہر سعی الٰہی توبہ
یہ میری امیدوں کی تباہی توبہ
دنیا میں قیامت بھی کبھی آئے گی!!
ملتی ہے سزائے بے گناہی توبہ

ضیا
فتح آبادی ایم اے

بزمِ فطرت

(جنگل میں ایک شام)

مہرِ روشن چھپ گیا ضو ماند پڑ جانے لگی
پھر شفق کی ساحرہ نیرنگ دکھلانے لگی

طائروں کے زمزموں سے گونج اٹھے دشت و جبل
اک سیہ بدلی سی ہر سُو گیت برسانے لگی

پھر گئی جلووں پہ اک مدہم سی تاریکی کی رو
اور فضا میں زلف سی ظلمت کی لہرانے لگی

اِک سہانا نشہ سا ہر چار سُو چھانے لگا
خامشی کو جاگ اور شورش کو نیند آنے لگی

نغمۂ عشق آفریں چھیڑا کسی دہقان نے
دُور سے بنسی کی وجد آور صدا آنے لگی

تیرگی بڑھنے لگی گہرا دھندلکا چھا گیا
اک سیہ چادر تلے ہر شے سمٹ جانے لگی

جو بساروں سے ترنم کی صدا اُٹھنے لگی
دشت کی ہر چیز کا مِل وجد میں آنے لگی

آہ یہ خلوت پہ جنگل کی فضائے عشق زا
قلبِ محزوں کو کسی کی یاد تڑپانے لگی

چشمِ دل کو منظرِ فطرت ہوا خارِ مغیل
آہ تنہائی میں اب تو رُوح گھبرانے لگی

تاجور اٹھو خدا کے واسطے اب گھر چلو
بزمِ فطرت پر بھیانک خامشی چھانے لگی

تاجور سامری

وکٹر ہیوگو کی محبّت

یہ داستان وکٹر ہیوگو کی سیاسی سرگرمیوں، اس کی کامرانیوں اور ناکامیوں اور اس کے ادبی کارناموں سے کچھ تعلق نہیں رکھتی، دنیائے ادب میں جو افسانوی شاہکار اس نے باقی چھوڑے ہیں نہ صرف فرانس بلکہ ساری دنیا ان پر فخر کر رہی ہے، اس نے وطن کی آزادی کے لئے ایک سرگرم جماعت تیار کی اور اس جماعت میں روح پھونک دی اور روح پھونک کر حیاتِ جاوداں بخش دی، لیکن یہ داستان جو ہم آپ کو سنانے والے ہیں ان سرگرمیوں سے بالکل الگ ہے، یہ محبت کا رومان ہے جو اس کی زندگی کا اہم ترین اور زریں واقعہ ہے، یہ وہ درد بھرا افسانہ ہے جس کے اختتام پر اس کی شگفتہ زندگی کا تابناک دور ختم ہوا اور اس کی ادبی اور سیاسی زندگی کا المناک سلسلہ شروع ہوا۔

جب وکٹر ہیوگو سیاسیات کے چکر میں پھنسا تو قدرتاً اس کے مزاج میں فرق آگیا، وہ حد درجہ خود پسند، ہرجائی اور گمراہ سا ہوگیا۔ لیکن جب وہ ایڈل فوشر سے محبت کی پینگیں بڑھا رہا تھا تو بالکل ایک بچے کی طرح تھا، ایک جواں سال شاعر جس کی رگ رگ میں بچپن کی پاکیزگی دوڑ رہی ہو، وہ مایوسی اور دنیا کی تنگ ظرفیوں سے بالکل بے بہرہ تھا، ابھی تک اس کے عنوانِ تخیل نے اس سے خراج نہیں لیا تھا، ابھی تک اس کی غیر فانی استعداد کی کرنیں پر وۂ سحر کو چاک کرنے نہ پائی تھیں، وہ ابھی تک نادانستہ طور پر ایک خیال پرست انسان تھا جو حسن و محبت کی وادی میں اپنے آرٹ کی پرورش کے لئے سرگرداں تھا اور اجتہاد کرتے ہوئے یہ ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی محض محبت کے لئے ہی معرضِ وجود میں آئی تھی،

انسانی جذبہ جہاں دنیا بھر کے شاعروں کے لئے اہم ترین موضوع بنا رہا ہے۔ وہاں یہ الہام ربانی کا صحیح ترین سرچشمہ بھی ہے اور انسانی آبادی میں صرف شاعر اور مطرب اس جذبے کی تصویر دوسروں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں کیونکہ وہ محبت کی زبان سمجھتے ہیں، شاعر کی محبت دراصل شاعر کا خواب ہوتا ہے جس کے ساتھ متعدد دلکشیاں وابستہ ہوتی ہیں، معصوم فضا کی تازگی ہیں جو محبت وکٹر ہیوگو نے کی ——— وہ وکٹر ہیوگو جو دنیا کے بلند ترین شاعروں میں سے تھا اور سوائے شیکسپیئر کے ہم کسی کو اس سے بلند تصور نہیں کرتے ——— اس کی داستانِ عشق کس قدر روح انگیز ہوگی۔

ایڈل فوشر ہی ایک ایسی لڑکی تھی جو وکٹر ہیوگو کے تخیل پر چھا سکتی تھی، نہ صرف یہ کہ وہ حسین تھی بلکہ اس میں ایک نہاں جاذبیت بھی تھی جو جذبات میں ہیجان اور تخیل کو تحریک دیتی رہتی تھی، ایک طویل اخلاص بھرے معاشقہ کے باوجود وہ کرکو ہمیشہ یہ کھٹکا رہا کہ کہیں ایڈل اس کو چھوڑ نہ دے، وہ اپنی رگ رگ میں قوت اور زندگی پیدا کرتا رہا تاکہ وہ ایڈل کی پرستش کے قابل ہو سکے، ایڈل ہمیشہ اس کی آغوش سے دُور رہی اور قدرے بے اعتنائی سے کام لیتی رہی، اور اسی قسم کی جاذبیتوں کی وجہ سے عورت زمانے کی دست برد سے بچی رہتی ہے اور یہ ایک ایسا حُسن تھا جس کے لئے وکٹر عمر بھر گریت گاتا رہا، مرد میں شکار کرنے کا فطری خاصہ ہے اور اگر شکار آسان ہو تو خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو، وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔

ایڈل اور وکٹر گہوارے میں بھی ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ کیونکہ ان کے والدین کی آپس میں بہت محبت تھی اور مدت سے ہمسائے چلے آتے تھے، بوڑھے اپنی گزشتہ زندگیوں کے متعلق گفتگو کر رہے ہوتے تو اس وقت دو ننھے منّے، بچے معصومانہ جذبات کو لئے ہوئے دوش بدوش مسرت بھری فضا میں کھیل کود رہے ہوتے، چونکہ ان کی عمر میں صرف ایک سال کا تفاوت تھا، اس لئے وہ ہر جگہ اور ہر وقت اکٹھے رہ سکتے تھے۔

وہ صرف ساتھی ہی نہ تھے، وکٹر بچپن سے ہی خواب و خیال کی دنیا میں مگن رہتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایڈل اس کے خواب

کی تصویر تھی اس نے سب کچھ ایڈل میں پا لیا تھا، وہ دونوں اپنے سینوں میں رومانیت سے لبریز زندگی کو لئے ہوئے قدیم ترین محبن جن کی نضا میں پھولوں کی نکہت کی طرح آوارہ رہتے تھے۔

وکٹر اسی نوخیزی کے عالم میں لکھا کرتا تھا۔

"ایڈل کی آنکھیں بڑی بڑی اور جگمگیلی تھیں۔ گھنے دار لیفیں، چہرے کی سنہری اور تابناں رنگت، لعلیں ہونٹ اور رخسار گلابی تھے۔"

پھر لکھتا ہے۔ "ہماری مائیں کو رنے پھاندنے کے لئے ہمیں باہر بھیجا کرتیں لیکن ہم سیر کو ترجیح دیتے۔ ہمیں کہا جاتا کہ ہم دوسرے بچوں کی طرح کھیلیں لیکن ہم باتوں میں وقت بسر کرتے، ہم ایک ہی عمر کے بچے تھے گو ہم جنس نہ تھے۔ اس پر بھی . . . ہم اپنی طاقت کے تجربات کر لیا کرتے تھے، ایک دفعہ میں نے اس کے ہاتھ سے ایک بڑا سیب چھین لیا تھا، اور دوسری دفعہ میں نے اُسے تھپڑ رسید کیا کیونکہ وہ مجھے پنسے کا گھونسہ نہیں دیتی تھی . . .

"ایک وقت وہ بھی آیا کہ وہ میرے بازو پر ڈھیری ہو کر چلتی اور میں مغرور رہتا اور مجھ میں تازہ کیفیتیں پیدا ہونے لگیں، ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور اس کی نرم و نازک آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس نے اپنا رومال گرا دیا تو میں نے اٹھایا، ہمارے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو کر کانپ گئے، وہ تتلیوں، پرندوں، ستاروں، درختوں کے عقب میں شفق کی سُرخی، ہچکولیوں، فراک اور فیتوں کے متعلق گفتگو کرنے لگی، نہایت معصومانہ لہجے میں ہم بالکل معمولی چیزوں پر بحث کرنے لگے اور لطف یہ کہ ہم دونوں کے چہروں پر حیا کی سرخی دوڑنے لگی، کیونکہ ایڈل اب جوانی کے قریب تر پہنچ چکی تھی۔"

ایک عرصے تک یہ معصوم محبت نہایت اطمینان اور مسرت کی وادی میں کھیلتی رہی، لیکن ۱۸۱۲ء میں جبکہ وکٹر ہیوگو سولہ برس کا اور ایڈل پندرہ کی تھی، ہیوگو خاندان میں کشیدگی پیدا ہوئی، جنرل ہیوگو اور اس کی بیوی ایک سیاسی تنازعہ کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے، مادام ہیوگو ساتھ دے رہی تھی۔ یوجن جماعت کا جنرل ہیوگو چونکہ گورنمنٹ سے پنشن پا رہا تھا۔ اس لئے یہ کبھی بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔

مادام ہیوگو (وکٹر کی ماں) نے اپنے خاوند سے قطع تعلق کر لیا اور اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ایک معمولی سا مکان کرائے پر لے کر رہنے سہنے لگی لیکن وہ مادام فوشہ والدہ ایڈل، کو نہ بھول سکی اور ہر شام اپنے دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر اس کے مکان پر جاتی۔

یوجنی وکٹر کا بڑا بھائی، اس قسم کے میل ملاپ کو پسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھتا تھا، لیکن وکٹر کے لئے وہ سنہری لمحے ہوتے تھے، اس کی نگاہیں ایڈل پر جمی ہوتی تھیں، وہ نگاہیں اتنی دیر تک اس کے چہرے پر پیوست رہتیں کہ بے چاری ایڈل شادماں بھی ہوتی لیکن ساتھ ہی گھبرا بھی جاتی، وہ جاننا چاہتی تھی کہ ان نگاہوں کے کیا معنی ہو سکتے ہیں لیکن وکٹر بہت شرمیلا تھا، اتنا شرمیلا کہ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ ان نگاہوں کا کیا مطلب ہو سکتا ہے، صرف ایک وھندلا سا احساس پیدا ہوا کہ اس کی زندگی میں ایک انقلاب سا برپا ہو رہا ہے اور بس۔

اب خاموش پوجا کی منزل طے ہو چکی تھی۔

ایڈل بھی جرات کے ساتھ اس کی نگاہوں کا مقابلہ کرتی تھی جس سے اس کی نگاہوں میں ایک پنہاں سی روشنی نمودار ہوتی اور شاعر کا سینہ مسرت سے لبریز ہو جاتا، محبت کا سوز اب وہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکتے تھے، چنانچہ ایڈل نے ایک دن اسے تنہا ملنے کا اہتمام کیا۔

یہ ۲۶ اپریل ۱۸۱۲ء کا دن تھا۔

ایڈل نے نرم و نازک آواز میں کہا "وکٹر! مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک بہت بڑا راز تمہارے سینے میں پوشیدہ ہے۔ اگر وہ تم مجھے بتا دو تو میں بھی تمہیں ایک راز بتاؤں گی"۔

وکٹر نے بلا تکلف کہہ دیا "میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔ حسین ایڈل نے جواب دیا "میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں"۔

ان دو مختصر فقرات سے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا محبت کا دیوتا ان پر سایہ گی اور معصومی کے پھول برسا رہا تھا، انہوں نے پیمان زندگی باندھنا چاہے وہ محبت کہنے لگے لیکن ان کا خیال تھا کہ ان کے والدین اسے معصومانہ حماقت سے زیادہ وقعت نہ دیں گے۔ چنانچہ اس لئے انہوں نے اس راز کو اپنے سینوں تک ہی محدود رکھا، آنے والا کل ان کی شیریں زندگی پر اثر انداز نہ ہو سکتا تھا، نگاہیں، ہاتھ دبانا، بوس و کنار، خفیہ ملاقاتیں، ان کی رومانی زندگی میں لئے پھر رہی تھیں، آہستہ آہستہ ان کے سینوں میں محبت کا اہم ترین راز بیدار ہوا۔

موسم سرما ختم ہوا تو حسب معمول فوشہ خاندان کے لوگ آسی چلے گئے، اس میں شک نہیں کہ یہ شہر پیرس سے بہت دور نہ تھا لیکن وکٹر

کی والدہ کے لئے ہر روز وہاں جانا بالکل ناممکن تھا، وکٹر اکیلا وہاں جانا نہ چاہتا تھا کیونکہ اس طرح راز افشا ہونے کا خطرہ تھا چنانچہ وہ پیرس میں بالکل اکیلا رہ گیا، فراق کی روح فرسا گھڑیاں اس کے دل و دماغ پر چھا گئیں اور اٹھتے بیٹھتے ہر وقت ایڈل اس کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگی۔ کیا وہ بھی اسے یاد کرتی تھی؟ ——— وکٹر کو اب معلوم ہوا کہ محبت بچوں کا کھیل نہ تھا جبکہ وہ لطیف جذبہ ایک ایسا شعلہ بنا جو بجھائے نہ بجھ سکتا تھا، اسے محبت کی عظمت کا احساس ہوا، موسم سرما کے ابتدا میں جب ایڈل لوٹ کر آئی تو ہیگو گو اور ایڈل تادان پنجے نہ رہے ——— ایک عورت اور ایک مرد جو محبت کے عقدۂ اللہ تحل میں پھنس چکے تھے،

جب کبھی ایڈل کی والدہ باہر جاتی تو وہ دونوں باغ میں درختوں کے نیچے سرگرم گفتگو ہوتے، یا جب کبھی ایڈل خرید و فروخت کے لئے بازار جاتی تو وہ دونوں گلیوں میں کھڑے ہو کر محبت کی لگائی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرتے لیکن ان کے لئے یہ کافی نہ تھا چنانچہ وہ ہر روز ایک دوسرے کو خط لکھنے لگے۔

وکٹر جس کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ اس کی محبت ہمیشہ جوان رہے گی اور اپنی استقامت پر اسے پورا اعتماد تھا اس واقعے کو ایک بلند ترین رومان تصور کر رہا تھا لیکن ایڈل محبت کو پوشیدہ رکھنے میں ایک توہین سی خیال کرنے لگی، اور ہر ایک بے ثبوت اور خود ساختہ حسینہ اس احساس میں حق بجانب ہے۔ ایڈل کی خواہش تھی کہ وہ اپنی ماں کو اپنا ہمراز بنائے لیکن اسے جرأت نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ انجام سے تو باخبر ہی تھی۔

ایک روز مادام فوشر نے ایڈل کے پاس شعروں کی ایک کتاب دیکھی جو ہیگو نے اسے بھیجی تھی، ایڈل کی ماں اس سے بہت ناراض ہوئی اور اسے تنبیہ کی کہ وہ ایسے شخص سے جس سے وہ شادی نہیں کر سکتی کسی قسم کا تحفہ خواہ وہ توجہ ہی کیوں نہ ہو قبول نہ کرے، کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اپنا وقار کھو بیٹھے گی اور جہاں وقار باقی نہ رہے وہاں محبت بھی نہیں رہتی،

ایڈل گویا چونک اٹھی، اسے محسوس ہونے لگا کہ واقعی وہ وکٹر کو جرأت دلا کر اپنے وقار کو صدمہ پہنچاتی رہی ہے، اس خیال سے اسے اس قدر تکلیف ہوئی کہ محبت کی فراوانی بھی اُسے تسکین نہ دے سکی،

وکٹر ہیوگو نے ایک خط میں لکھا۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میرے لئے تم کیا ہو! اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر محبت کرتا ہوں تو یہ بالکل معمولی بات ہوگی تم جانتی ہو کہ میں زندگی کو بالکل عزیز نہیں سمجھتا، . . . .

تم اس قسم کی باتیں مجھ سے کیوں کرتی ہو کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں یا تمہاری توقیر میرے دل میں نہیں، کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے وقار کے احساس کے بغیر ہی تم سے محبت کرتا رہا ہوں، تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تمہارے اس الزام نے مجھے کس قدر دکھ دیا ہے . . . کیا تم نہیں جانتیں کہ مجھے تم سے کتنی پاکیزہ اور بے لوث محبت ہے، میں تمہارا خاوند ہوں، کم از کم میں تو ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔

"تم جانتی ہو کہ ایک خیال سے میری مسرت کی انتہا نہیں رہتی! ان تمام رکاوٹوں کے باوجود میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ممکن ہے مجھے تمہارا خاوند بننے کی اجازت دے دی جائے خواہ ایک دن کے لئے کیوں نہ ہو۔ فرض کرو کہ میری اور تمہاری آج شادی ہو جائے اور دوسرے دن میں خودکشی کر لوں، اس طرح کم از کم ایک دن کے لئے تو میں اپنی مسرت کی انتہا دیکھ لوں گا، اس کے بعد تمہیں کوئی مطعون نہیں کر سکتا، لوگ یہی کہیں گے "یہ اس مرحوم کی بیوہ ہے" پیاری ایڈل ایسا ایسے ہو سکتا ہے۔

. . . صرف ایک دن کے لئے، ایک دن کی مسرت عمر بھر کے اندوہ و غم سے بہتر ہے"

لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دن کی مسرت بھی ان کے مقدر میں نہ تھی، محبت کا راستہ کبھی صاف نہیں ہوا کرتا چنانچہ ان معصوم روحوں پر مصیبتیں ٹوٹ پڑیں۔

جب سے ایڈل کی ماں کو اس کتاب کا قصہ معلوم ہوا تو وہ اپنی بیٹی کی حرکات کا نہایت غور سے مطالعہ کیا کرتی تھی، اس کے دل میں شکوک پیدا ہونے گئے جو جلد ہی پایۂ یقین تک پہنچ گئے، اور اس نے ایڈل پر نہایت سختی سے سوالات کی بوچھاڑ کر دی، ایڈل خوفزدہ ہو گئی اور اس نے تمام باتوں کا اعتراف کر دیا، اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اس اعتراف پر غضبناک نہیں ہوئی بلکہ وہ نہایت ہمدردی اور پیار کے ساتھ تمام باتیں سنتی رہی اور آخر میں کہا۔

"بیٹی! میں اس معاملے پر غور کروں گی اور تمہارے باپ سے بھی مشورہ کروں گی"

ایڈل خوشی سے تن تنا اٹھی، اس کے باپ نے بھی اس معاملے میں رضامندی کا اظہار کیا، وہ گلر کی خداداد قابلیت کی ہمیشہ تعریف کیا کرتا تھا اور اس کی سعادتمندی کی وجہ سے اسے بہت پسند کرتا تھا،

۲۶ اپریل ۱۸۲۱ء کو موسیو فوشر اپنی بیوی کو ساتھ لے کر مادام ہیوگو کے پاس گیا تاکہ اس رشتہ کی سلسلہ جنبانی شروع ہو جائے۔

مادام ہیوگو کے لئے یہ خبر بالکل نئی تھی اس لئے وہ حیران رہ گئی۔

"ڈاکٹر محبت کر رہا ہے!"

اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی،

"وہ تو ابھی بچہ ہی ہے، ایسے وقت میں آپ لوگوں کو نہ آنا چاہئے تھا۔"

اس کے بعد وہ دیر تک ہنستی رہی، اس کی ہنسی بالکل مایوس کن تھی کہ اس کا بچہ جو بالکل معصوم تھا کس طرح ایک لڑکی کو محبت کرنے لگا، مجھے تو کہہ دیتا، دنیا میں میں صرف اسی سے محبت کرتی ہوں، میرے لئے سب کچھ وہی ہے لیکن وہ مجھے بھلا کر کس طرح ایک الہڑ لڑکی کے جال میں پھنس گیا، ماں کو بھی خبر حاصل ہے کہ ایسے موقعوں پر رشک کو اپنے دل میں جگہ دے، وہ بے قرار ہو گئی اور فوشر خاندان کو برا بھلا کہنے لگی، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جنرل ہیوگو کا بیٹا فوشر خاندان کی لڑکی گھر میں لائے، اس کے علاوہ اس نے اور بہت سی باتیں کہیں جس پر موسیو فوشر بھی تیز ہو گیا کہ فوشر خاندان فرانسیسی معاشرت میں ہیوگو سے کسی صورت میں بھی کم نہیں ہے بلکہ آف آزر کے تمغے ہمارے پاس موجود ہیں، ہماری فوجی خدمات تم لوگوں سے کم نہیں ہیں، کافی عرصے تک یہ بک بک ہوتی رہی بالآخر یہ قرار پایا کہ آیندہ دونوں خاندانوں کے تعلقات ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جائیں۔

ڈاکٹر کو بھی اس وقت بلا لیا گیا، وہ ماں کے سامنے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا، سر جھکائے خاموش سنتا رہا لیکن جب ایڈل کے والدین چلے گئے تو وہ بے اختیار ہو کر اپنی ماں کی گود سے باہر بھاگ نکلا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے اتنا رویا کہ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو باقی نہ رہا، اس کی ماں اسے بہت سمجھاتی رہی لیکن ڈاکٹر محسوس ہو رہا تھا کہ ایڈل کو اب وہ کھو چکا ہے، اس کی ماں نے اس کی معصوم امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔

اسے محبت کی فراوانی کا بھی آج ہی اندازہ ہوا، اس کے بغیر اب زندگی کیا رہے گی؟ تاریکی ——— خوفناک تاریکی ——— موت ———

ایک اٹھارہ سالہ معصوم نوجوان کے سینے میں وحشت انگیز مایوسی گھر کرنے لگی،

ایڈل بھی عجیب مصیبت میں مبتلا تھی کیونکہ اسے اصل گفتگو سے مطلع نہ کیا گیا، صرف اتنا کہا گیا کہ وہ ڈاکٹر کا خیال دل سے نکال دے بلکہ نام بھی زبان پر کبھی نہ لائے کیونکہ وہ ایڈل کے بالکل قابل نہ تھا، ان کا خیال تھا کہ اتنا کہہ دینے سے ایڈل اپنی محبت کو بھول جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے ایڈل کے لئے کوئی رشتہ تلاش کرنے کی سلسلہ جنبانی شروع کر دی، لیکن ایڈل ڈاکٹر کو کیسے بھول سکتی تھی، اسے یقین نہ آتا تھا کہ ڈاکٹر کبھی اس سے دغا کرے گا، ڈاکٹر تو اس کا اپنا تھا وہ کیسے چھوڑ سکتا تھا، کئی ہفتے گزر گئے ڈاکٹر کی طرف سے اسے کوئی خط نہ ملا، ایڈل کی ماں نے اس کے لئے بہت سی نئی دلچسپیوں کے سامان مہیا کئے، اسے خوش رکھنے کے لئے سو طرح کی تدبیریں کیں لیکن سب بے سود۔ ایڈل محسوس کر رہی تھی کہ اس سے ایک ایسی چیز چھن گئی ہے جو اس کی تمام مسرتوں کی بنیاد تھی، رقص، پارٹی، تھیٹر اس کے لئے بالکل بے کیف سی چیزیں بن کر رہ گئیں، صرف تنہائی اسے تسکین دینے لگی کیونکہ ڈاکٹر کی محبت کا تخیل وہ صرف تنہائی میں پا سکتی تھی، ڈاکٹر کو اپنے دماغ سے وہ کیسے نکال سکتی تھی؟ اس کے جواب کے لئے وہ ہر روز خلوت میں اس کے گذشتہ خطوط پڑھا کرتی، اور اس کا آخری خط جس پر اس کے پورے دستخط تھے ایڈل کو رلا دینے کے لئے کافی تھا، فضا میں وہ الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے تھرا رہے تھے۔

"پیاری ایڈل! میرا یہ وعدہ اٹل ہے کہ میں سوائے تمہارے کسی اور کو اپنی بیوی نہ بناؤں گا۔ . . ہیں دنیا کٹھالہ ہونے دے تو نہ سہی لیکن میں تمہارا ہوں اور ابد تک تمہارا ——— وی ایم۔ ہیوگو۔"

وفور محبت کی وجہ سے وہ دونوں امید کا دامن نہیں چھوڑ سکتے تھے، ڈاکٹر جب پہلے صدمے سے ذرا سنبھلا تو اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے ناولوں سے روپیہ کما کر ایڈل کو جیتے گا، چنانچہ اس نے ادبی کاوشوں کی طرف مکمل توجہ دی، اس زمانے میں اس نے بے نظیر ادبی شاہکار پیدا کئے کیونکہ ان کے پس پردہ اسے ایڈل نظر آرہی تھی جو اسی راستے سے اس کی ہو سکتی تھی، چنانچہ قسمت نے اسے ایک موقع دیا۔

موسیو فوشر نے ایک کتاب شائع کی جس میں فوجی بھرتی کے متعلق چند فنی باتیں تھیں اور چند ذاتی فوجی تجربات بھی تھے، ہیوگو نے اس موقع سے فایدہ اٹھایا اس نے فوراً اپنے رسالہ Le Conservateur Litteraire

میں ایک پورے صفحے کا تبصرہ لکھا گویا کہ وہ دنیائے ادب کا بہترین شاہکار تھا، اور اس رسالے کی ایک کاپی براہِ راست موسیو فوشر کے پاس بھیجی۔

موسیو فوشر اس ریویو کو پڑھ کر جامے میں پھولا نہ سمایا لیکن کشیدگی کی بنا پر اس کا شکریہ ادا نہ کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے دل میں وکٹر کی قدر و منزلت پیدا ہو گئی، وکٹر اس کی خاموشی سے مایوس نہ ہوا، چنانچہ جب شاہِ فرانس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کی آرزو تمام ملک میں ہو رہی تھی وکٹر نے ایک قصیدہ لکھا اور پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے موسیو فوشر کے نام پر معنون کیا، محبت میں انسان کیا کچھ نہیں کرتا جواں سال شاعر کو خیال تھا کہ ممکن ہے یہ الفاظ اس کی محبوبہ ایڈل کی نظر سے گزریں اور اس طرح کشیدہ تعلقات از سرِ نو خوشگوار ہو جائیں

موسیو فوشر اب خاموش نہ رہ سکتا تھا۔ وکٹر اس کی پبلک میں عزت افزائی کر رہا تھا اور اس وقت شکریہ ادا نہ کرنا بالکل غیر مناسب تھا۔ اس نے براہِ راست تو وکٹر کو کچھ نہ لکھا البتہ مادام ہیوگو کو چند سطریں لکھیں۔

"میں وکٹر کا بہت ممنون ہوں کہ اس نے میری کتاب پر ایک نہایت حوصلہ افزا تبصرہ کیا اس کے بعد شہزادے کی پیدائش پر جو نظم لکھی اور میرے نام پر معنون کی اس کا بھی شکر گزار ہوں، میری بیوی بھی مرحومہ منت ہے۔ کیونکہ ہم دونوں اس نظم سے انتہائی لطف اندوز ہوئے۔"

اس کے بعد دونوں خاندانوں کے تعلقات خوشگوار ہونے لگے لیکن ایڈل اور وکٹر پر کڑی نگہداشت رہنے لگی اور انہیں والدین کی موجودگی میں بھی اکٹھے بیٹھنے کی اجازت نہ تھی، اس کے باوجود وکٹر اور ایڈل ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے، لیکن وکٹر ملاقات کے لئے نہایت بے قرار تھا، ایک دن اسے معلوم ہوا کہ ایڈل مصوری سیکھنے لگی ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً وہ اسکول معلوم کر لیا اور صبح دم اس کے راستے میں چھپ کر بیٹھ گیا، وہ دن وکٹر کو نہیں بھول سکتا کیونکہ اس طویل فراق کے بعد جب وہ ایڈل سے ملا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اسے اب تک نہ بھولی تھی، اس کی محبت ویسے ہی جوان تھی، وکٹر کو محسوس ہوا کہ اس کی زندگی کی روشن ترین شعاع اس کے نزدیک آگئی ہے اور اب پھر دنیا اس قابل ہو گئی ہے کہ وہ اس میں زندہ رہ سکے۔

اس طرح وہ خفیہ خفیہ ایک دوسرے سے ملتے رہے حسین دہشتوں اور رنگین بے قراریوں کے ساتھ ایک سال اور گزر گیا۔

۲۶ اپریل ۱۸۲۱ء کے دن وکٹر نے ایڈل کو لکھا۔

"پیاری ایڈل! کیا تمہیں یاد ہے کہ یہ دن ہماری سالگرہ کا دن ہے؟ میری زندگی کی ابتدا اسی دن سے ہوئی تھی، . . . اوہ! مجھے بتاؤ کہ تم بھی وہ دن ابھی تک نہیں بھولیں، میری مسرتوں اور حسرتوں کا آغاز اسی دن سے ہوتا ہے، میں اسی روز سے اپنے آپ کو زندہ تصور کرتا ہوں اور آج تک اسی دن کو دل میں رکھ کر سانس لے رہا ہوں . . . صرف تمہاری صورت میرے سامنے ہے، میری زندگی کی ابتدا اور انتہا تم ہی ہو . . ."

۲۷ جون کو مادام ہیوگو رائی ملک عدم ہوئی تو اب وکٹر کے لئے ایڈل کے سوا دنیا میں کوئی نہ تھا، وکٹر اپنی ماں سے بے حد محبت کرتا تھا، باوجودیکہ ایڈل کے معاملے میں وکٹر کو مصیبت میں ڈالنے کا وہی باعث ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کی پرستش کرتا رہا، وکٹر کے لئے اس کی ماں ایڈل سے بھی بڑھ کر قابلِ احترام ہستی تھی، جب اوائل مئی میں وہ بیمار ہوئی تو وکٹر نے دنیا کے تمام کاروبار چھوڑ دئیے اور ماں کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گیا، یہاں تک کہ ایڈل کی طرف بھی متوجہ نہ ہو سکا، متواتر دو مہینے تک وہ بستر مرگ پر پڑی رہی اور اس دو مہینے میں وکٹر اس کی تیمارداری میں مصروف رہا، اس عرصے میں اس نے ایک دفعہ بھی ایڈل کو خط نہ لکھا، اتنی تیمارداری کے باوجود اس کی ماں زندہ نہ رہ سکی اور اپنے بیٹے کو اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔

نوجوان وکٹر غم سے نڈھال ہو گیا، اس کو اپنی ماں کی صحیح قیمت کا اندازہ اس کی موت کے بعد ہوا، مدت ہوئی۔ اس کا باپ انہیں چھوڑ چکا تھا اپنے بھائی کے متعلق اسے کچھ علم نہ تھا اور اب وہ بالکل بے خانماں سا ہو کر رہ گیا، وہ حیران تھا کہ وہ کدھر جائے؟ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ایڈل نے بھی اسے چھوڑ دیا ہے۔

آہ! ماں کے چلے جانے سے وہ دنیا کو ویران سمجھ رہا تھا۔

اس کی ماں کی نقلیں کی تیاریاں ہو رہی تھیں وہ فرطِ غم سے گھبرایا ہوا باہر نکل گیا، وہ یہ منظر برداشت نہ کر سکتا تھا، شام کی تاریکی میں ایک غمزدہ روح گلیوں میں سے ٹھوکریں کھاتی ہوئی جا رہی تھی ——— بلا ارادہ اور بے مقصود وہ نوٹرڈیم ہوٹل میں جا پہنچا، برآمدے سے گزر رہا تھا کہ موسیقی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، وہ بھاگا ہوا ادھر گیا، یک دروازے کے شیشے سے جھانک کر اندر دیکھا، ایڈل رقص کر رہی تھی، اس نے اپنا بخار

سے پھینکا ہوا چہرہ شیشے پر رکھ دیا، بعد ازاں وہ ایک خط میں ایڈل کو لکھتا ہے

"پیاری ایڈل! اس دن تمہارا وکٹر ماتمی لباس پہنے ہوئے تمہیں حیران ہو کر دیکھ رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے، اس دن میرا دل ٹوٹ گیا . . . میں اس مسرت گاہ میں ایک بھوت کی طرح تھا۔ وہاں ہر ایک شاداں و فرحاں نظر آتا تھا، ہر ایک ——— یہاں تک کہ میری ایڈل بھی مسرور تھی اور دوسروں کی مسرت میں حصہ لے رہی تھی ——— مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا، میں اپنی حماقتوں کے خواب سے بیدار ہوا اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا، اور شکست خوردہ قمار باز کی طرح واپس گھر پہنچ گیا، اپنی ماں کی لاش کے قریب دو زانو ہو کر میں نے تمہارے لئے دعا کی ——— اس وقت غالباً تم رقص کر رہی ہو گی ———"

واقعہ یوں ہے کہ ایڈل کو لڑکی ماں کے مرنے کی خبر اس وقت تک نہ پہنچی تھی، ایڈل کے والدین نے مصلحت اسی میں خیال کی کہ وہ ایڈل کو اس واقعے کی اطلاع نہ دیں چنانچہ جب یہ بات واضح ہوئی تو اس نے وکٹر کو خط لکھا تھا کہ مجھ علم ہوتا تو میں دنیا کے تمام خطرات کو پھاند کر تمہارے غم میں آ کر شریک ہوتی۔

یہ الفاظ وکٹر کے سینے میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے کے لئے کافی تھے، ایڈل نے اپنے والدین کو اس انتخاب پر بہت برا بھلا کہا جب مادام فوشر مائم پرسی کے لئے ہیوگو کے پاس گئی تو معصوم نوجوان کے چہرے پر امید کی چمک نمایاں ہو گئی، تھوڑے دنوں بعد ایڈل اپنے والدین سمیت پہاڑی مقام پر چلی گئی اور اس دفعہ وکٹر نے ان کے پیچھے جانے کی جرأت کی، بے چارے کے پاس پیسہ تو تھا نہیں اس لئے وہاں تک وہ پیدل چلتا گیا، تین دن اور تین راتوں کے بعد وہ وہاں پہنچا، تکان سے وہ بالکل چور ہو چکا تھا لیکن وہاں پہنچتے ہی اسے ایڈل اور اس کا باپ سیر کرتے ہوئے مل گئے، اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ آج تک پیدل چلا ہی نہ تھا، انہیں دیکھ کر شاعر نے ایک مضحکہ خیز تعجب کا اظہار کیا اور ایک سرائے میں پہنچ کر اس نے موسیو فوشر کو خط لکھا۔

"میں یہاں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں مل سکا اس لئے میں نے یہاں دو چار روز ٹھہرنے کا ارادہ کیا، قسمت کا کھیل دیکھئے، میں آپ کو یہاں دیکھ کر ششدر رہ گیا، میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ خواب تھا، لیکن آپ میری گستاخی کو معاف کر دیں گے اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ آپ کے ساتھ ایڈل کو دیکھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی، مجھ میں اتنی جرأت پیدا ہو گئی ہے کہ میں آپ سے برملا راست کہہ دوں کہ میں ایڈل کو اپنی روح کی تمام طاقت کے ساتھ محبت کرتا ہوں اور میری تنہائی اور غم کی تاریکی میں صرف ایڈل کا خیال مجھے زندہ رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔"

موسیو فوشر وکٹر کے اس شاندار جھوٹ پر مسکرایا تو ضرور ہو گا لیکن اس کو وکٹر کی حالت پر ترس آ گیا اور اس نے اجازت دے دی کہ کسی تیسرے آدمی کی موجودگی میں وہ ایک دوسرے سے "لکسمبرگ" باغ میں صرف ایک دفعہ مل سکتے ہیں، نیز وکٹر کو یہ جتا دیا گیا کہ جب تک اس کی مالی حالت درست نہ ہو جائے وہ کسی صورت میں بھی اپنے منسوب ہونے کا اعلان نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس دوران میں وہ ایک دوسرے سے خط و کتابت کریں۔

وکٹر خط لکھنے کے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ایڈل کے باپ کو محبت بھرے خط لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا، مثال کے طور پر وہ خط لیجئے جو اس نے ۲۸ جولائی کو لکھا۔

"مجھے ایڈل اپنی زندگی سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ میں اس کی مسرت کے لئے زندہ ہوں اگر وہ میرے بغیر خوش رہ سکتی ہو تو میں آج کسی دور دراز ملک کی طرف چلا جاؤں ——— یہ امید لئے ہوئے کہ ممکن ہے ہم ایک دوسرے کو پھر مل سکیں۔"

کچھ دنوں بعد اس نے پھر لکھا۔

"ایک خفیف سی رکاوٹ عظیم ترین ہمت کے راستے میں روڑا نہیں اٹکا سکتی، اس میں شک نہیں کہ مستقبل میں بہت سے خطرات محسوس کر رہا ہوں لیکن میری بہادری نے مجھے یہ سکھایا تھا کہ مصیبتوں سے انسان کیسے سینہ سپر ہو سکتا ہے، بہت سے آدمی سنگلاخ زمین پر چلتے ہوئے لڑکھڑاتے ہیں لیکن وہ شخص جس کی ذہنیت شفاف ہو اور جس کا مقصد اعلیٰ ہو خطرناک زمین پر بھی قدم رکھتے ہوئے نہیں جھجکتا اور اس کے پاؤں کو لغزش نہیں ہو سکتی۔"

اب وکٹر کے سینے سے محبت کے جوش کھائے ہوئے چشمے پھوٹ کر بہہ رہے تھے جن کا رکنا محال نظر آتا تھا، ایڈل کا باپ وکٹر کی محبت دیکھ کر رضامند ہو گیا، وکٹر کی زندگی درخشاں نظر آنے لگی اس کامیابی کے جوش میں وہ اپنی مالی حالت کو سدھارنے کے لئے پوری جدوجہد کرنے لگا،

وہ محسوس کرنے لگا کہ جو دقتیں نہایت اٹل نظر آرہی ہیں شبینہ روز محنت سے دور ہو جائیں گی۔

"ایڈل! تم میرے وفور جوش پر مسکرا رہی ہو، تم ہی تو ایک ایسی ہستی ہو جس نے میری روح میں طاقت پھونک دی ہے۔ میں اپنے آپ کو اس رنگ میں کیوں نہیں سمجھتا جیسا کہ تم ہو، تم کو شرف کے لئے ایک فرشتہ ایک روح، ایک شعر کی مانند ہو، تم اسی حد تک زمین پر رہنے والی فانی چیزوں سے تعلق رکھتی ہو جس حد تک کہ تم اس شخص کی قسمت میں حصہ لو جس کے ساتھ صانع ازل تمہیں وابستہ کرنے والا ہے۔"

ایڈل اور اس کے والدین کی رضامندی کے باوجود ابھی بہت سی رکاوٹیں باقی تھیں، سب سے پہلے یہ کہ وہ اپنے لئے کسی مستقل آمدنی کا ذریعہ بن سکے۔ دوسری یہ کہ اس عقد کے لئے اس کے باپ کی رضامندی ضروری تھی، فرانسیسی قانون کے مطابق وہ والد کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ پچیس برس کی عمر کے بعد یہ قید باقی نہ رہتی تھی۔ اس معاملے میں ایڈل کا باپ نہایت سختی سے اڑا ہوا تھا اور اس کے متعلقین اسے پہلی رکاوٹ پر بھی توجہ دلا رہے تھے، نیز وہ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ جوان لڑکی کو پانچ سال تک بٹھائے رکھنا کہاں کی عقلمندی ہے، ان کے نزدیک ہیوگو اس معصوم لڑکی کے لئے بالکل نامناسب ہے، نہیں تقاضا کر سکتا ہے، اسے سے رشتے دار اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ ہیوگو کے ساتھ رشتہ نہ ہو۔

نوجوان فرانسیسی شاعر کو ان طعنوں سے ایک صدمہ پہنچا، لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا، بار بار اس کے ذہن میں یہ خیال آرہا تھا، کہ وہ اپنے باپ کی رضامندی کیسے حاصل کرے؟ کب اس کی مستقل آمدنی ہو گی؟ ایک معصوم سا مستقبل اس کے سامنے تھا اور وہ ان سوالات کا جواب مطلق نہیں دے سکتا تھا، چنانچہ وہ ایڈل کو تسکین دیتا رہتا اور یہ کہتا۔

"پیاری ایڈل! ایک وقت آنے والا ہے کہ تنہا [redacted] ہیوگو ہے گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ میرے سامنے کھلنے والا ہے۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا، شاعر کا خواب جھوٹا ثابت نہ ہوا ۱۸۲۲ء میں گورنمنٹ نے اس کی خدمات کے معاوضہ میں اس کی پنشن مقرر کر دی، کچھ زیادہ پنشن نہ تھی، صرف ۱۰۰۰ فرانک سالانہ لیکن اتنی تسلی تھی کہ یہ مستقل آمدنی ہے۔ اس نے ایڈل کو لکھا۔

"ایڈل! میری ایڈل!! میں خوشی سے دیوانہ ہوا جاتا ہوں، اس ہفتے میں ایک بلائے آسمانی کا انتظار کر رہا تھا لیکن خدا نے مجھ پر مسرتوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔"

اب صرف جنرل ہیوگو کی اجازت کی ضرورت باقی تھی، لیکن یہ بہت مشکل کام تھا، وکٹر کو اس بات کا علم تھا کہ وہ کبھی بھی اجازت نہ دے گا، اس کے دماغ میں اپنے باپ کی ہیبت چھائی ہوئی تھی، وہ اس سے یہ سوال ہی نہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ اگر ایک بار اس نے انکار کر دیا تو پھر سوائے پانچ سال اور تخمیر نے کے اور کوئی راستہ نہ رہے گا، اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ ایڈل کے والدین اتنی مدت انتظار نہ کر سکیں گے، اور دن بروز وہ اس فیصلہ کن سوال کو ملتوی کرتا رہا، آخر کار ۱۶ مارچ کے روز اس نے خط لکھنے کی جرأت کر ہی دی، اس نے ایڈل کو لکھا۔

"میں نے وہ خط لکھ دیا ہے جس پر میری قسمت کا فیصلہ ہو گا، ہم دونوں کو اس لمحے کا منتظر رہنا چاہئے کیونکہ اس وقت ہم اپنی زندگیوں کے نازک ترین دور میں سے گزر رہے ہیں، معاف کرنا میں اپنی زندگیوں لکھ رہا ہوں کیونکہ میں اپنی بدقسمتی کے چکر میں تمہیں بھی ساتھ ساتھ گھسیٹ رہا ہوں، لیکن جب میں یہ دیکھوں گا کہ میری زندگی سے تمہاری مسرتوں کا خون ہو رہا ہے تو میں فوراً اپنا خاتمہ کر دوں گا۔

ممکن ہے حالات ہمارے حق میں ہو جائیں، تمہاری محبت میں مجھے کئی بار مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس وقت بھی میں مایوس نہیں ہوں گو امید کا بہت ہی تھوڑا امکان ہے، میری امیدیں نہایت قیمتی اور نہایت شیریں ہیں . . . دیکھیں قسمت ہمارے لئے کیا کرتی ہے!"

ایک ایک دن گنتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا، اس انتظار میں وکٹر کی عجیب حالت تھی، آخر کار آٹھویں دن جواب آگیا جس نے دونوں میں خوف طاری کیا ہوا [redacted] کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وکٹر نے خط کھولا تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔

جنرل ہیوگو نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔

اور ناراض ہو جانے کی بجائے اس نے اپنے بیٹے سے التجا کی کہ وہ اسے معاف کر دے،

"میں نے تمہاری ماں کو بہت دکھ پہنچایا ہے، میں نے ایک اور عورت سے شادی کر لی ہے اور غالباً اس عورت کی وجہ سے تمہاری

ماں کا دل ٹوٹ گیا تھا، میری یہ دلی خواہش ہے کہ میں تمہیں خوش دیکھوں غالباً میری اس خواہش سے تمہاری ماں کی روح بھی خوش ہو گی۔"

ڈاکٹر مسرت سے اچھلنے لگا، لیکن اپنے باپ کی دوسری شادی کی خبر سن کر اُسے صدمہ ہوا، وہ ایڈل کو لکھتا ہے۔

"میں نے آج اپنے باپ کو خط لکھا ہے جس میں میں نے اپنے درد کا اظہار بھی کیا ہے۔"

۱۲ اکتوبر کے دن ان کی شادی قرار پا گئی، جس دن انہوں نے محبت کا عہد و پیمان کیا، اس دن سے پورے اڑھائی سال بعد ان کی شادی ہوئی۔

شادی سے چند روز پیشتر ڈکٹر نے ایڈل کو لکھا۔

"پیاری ایڈل! تمہیں اس بات پر تو شک نہیں ہو گا کہ ہماری زندگیاں ایک عجیب گردش میں رہیں۔ ہماری روحوں کی گہرائی میں مسرتیں کھیل رہی ہیں جو زمین اور آسمان دونوں سے اخذ کی گئی ہیں، ہماری ہونے والی شادی عوام کو بتانے کے لئے ایک رسم ہو گی۔ ورنہ ہم خدا کے سامنے مدت ہوئی ایک مقدس معاہدہ کر چکے ہیں، وہی ہماری شادی تھی، اسی عہد کو آج لوگوں کے سامنے بیان کیا جا رہا ہے۔"

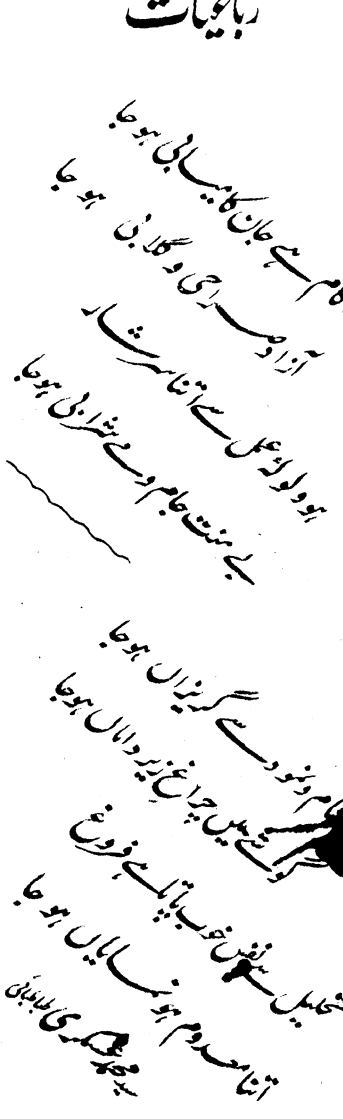
. . . . .

افسوس یہ شادی ایک مقدس معاہدہ ثابت نہ ہو سکا۔ ایڈل ہمیشہ وفادار بیوی رہی لیکن ڈکٹر صحیح راستے سے بھٹک گیا، ایڈل نے کبھی شکایت نہ کی، وہ جانتی تھی کہ اس نے ایک طباع انسان سے شادی کی ہے اس لئے خاموشی کے ساتھ وہ سارے دکھ سہتی رہی۔

محبت کے آغاز کے دن ایڈل کی ساری زندگی کو تر و تازہ رکھنے کے لئے کافی تھے۔

(ترجمہ) خلیل

رباعیات



گائے جا!

روح افسردہ سی ہے۔ بہلائے جا
جسم میں اک لہر سی دوڑائے جا
خود تڑپ اوروں کو بھی تڑپائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے جا

چٹکیاں لیتا ہے شوقِ جستجو
گدگداتی ہے کسی کی آرزو
ذکرِ الفت سے مجھے گرمائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے گا

ربطِ باہم کا نہ ٹوٹے سلسلہ
محو ہو جائے نہ یادِ دل ربا
میٹھے میٹھے درد سے گھبرائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے جا

چھیڑتا ہوں روز میں سازِ شباب
دیکھتا ہوں روز میں رنگین خواب
راز ہائے زندگی سمجھائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے جا

روشن نکودری

غزل

فصلِ گل دیتی ہے طعنے ترے دیوانے کو
دھجیاں جیب کی ملتیں نہیں نذرانے کو

علم واعظ کو کہاں، آئیں جو سمجھانے کو
ہم تو ہیں دل میں چھپائے ہوئے بتخانے کو

واسطہ دیر سے کچھ ہے نہ حرم سے مطلب
اک ترے در سے غرض ہے ترے دیوانے کو

دل ہوا ان کا طرفدار تو اپنا کیسا
ہم تو پہلو میں جگہ دیں گے نہ بیگانے کو

مستیاں لیتی ہیں جھک جھک کے بلائیں سرِ راہ
تم تو آنکھوں میں لئے پھرتے ہو میخانے کو

وہ کہاں فرق نشیں اور یہ پامالِ حرام
دل صد چاک سے تشبیہ نہ دو شانے کو

نام رہتا ہے شہیدانِ وفا کا زنہار
عمرِ خضری ہے میسر مرے افسانے کو

عالمِ جذب میں کیا جانئے کیا بک جائے
کوئی للہ نہ چھیڑے ترے دیوانے کو

موت کا ایک سبب فرطِ مسرت بھی ہے
کیوں گلے شمع لگا لیتی ہے پروانے کو

خاکساری کا عوض دہر میں ملتا ہے ضرور
ہو کے مٹی لقبِ نخل ملا دانے کو

نثر میں بھی وہی اشعار کی موسیقی ہے
گاتے پھرتے ہیں عنادل مرے افسانے کو

شب جو محفل میں انہیں مشقِ ستم کی سوجھی
شمع جلوا کے جلاتے رہے پروانے کو

کیا ستم ہے کہ پیپیے سرِ تربت آ کر
چھیڑتے رہتے ہیں بھولے ہوئے افسانے کو

سخت جانی سے مری ہے متحیر قاتل
دیکھتا ہے کبھی خنجر کبھی دندانے کو

میکدے میں ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا
رو پڑے دیکھ کے ٹوٹے ہوئے پیمانے کو

نجمؔ ہر لفظ میں اک درسِ وفا پنہاں ہے
اہلِ دل غور سے دیکھیں مرے افسانے کو

نجمؔ ندوی بی اے

پریما

بسنت کی سہانی رات تھی۔ چاند کی روپہلی کرنیں آم کی ہری ہری پتیوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔

بسنت رت کی چنچل ہوا پریما اور سوریش کو گدگدا کر چاند سے آنکھ مچولیاں کھیلتے ہوئے تاروں میں جا ملتی تھی۔ ان دونوں پریمیوں کے دلوں میں بہتے ہوئے دنوں اور آنے والے زمانے کی نہ جانے کتنی بیلیاں گنگا کی لہروں کی طرح اٹھ کر غائب ہو جاتی تھیں۔

"سوریش! ذرا دیکھنا آکاس پر تارک بالاؤں کی سندر سبھا" پریما تاروں کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔

"ہاں یہ راس لیلا تو صدا سنسار کے من کو موہتی رہے گی لیکن آہ ہماری یہ پریم لیلا تو چار دن کی چاندنی ہے۔" سوریش کسی قدر افسردہ لہجے میں بولا۔

"اس چار دن کی چاندنی . . . ؟"

"تم نہیں سمجھیں بھولی پریما! ہماری یہ پریم لیلا بدھاتا کو ایک آنکھ نہیں بھائی۔"

"بدھاتا . . . ؟"

"سماج!"

"نہیں نہیں کبھی"

"اوہو پریما تم کتنی بھولی ہو! اس نے تمہاری اُتم ہڈیوں کے مقابلے میں میری ہڈیوں کو مدھم اور نیچ بنایا ہے۔"

"پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا . . . ؟"

"آہ نتیجہ وہی ہوگا جو جاگ میں لکھا ہوگا۔"

گنگا کی چنچل لہریں نرم رو ہوا سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور چاند تاروں کے ساتھ آنکھ مچولیاں کھیل رہا تھا۔ سوریش اور پریما دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف چلتے چلتے پریما کے منہ سے نکل گیا — "آہ زمانے کے لوگ!"

. . . . . .

پریما کے باپ کیلاش بہاری مصر لڑکا تلاش کرتے کرتے تھک گئے۔ لیکن اونچی ہڈی کا لائق لڑکا نہ ملا۔ آخر مجبور ہو کر ایک نالائق اور بے جوڑ ہی بر کے ساتھ پریما کو بیاہ دیا اور اس بات پر خوش تھے کہ برنالائق اور بے جوڑ سہی لیکن اونچی ہڈی کا تو ہے!

پریما کے پتی دیو کا نام ہری کرشن رائے تھا۔

. . . . . .

"چھی چھی۔ مرد ہو کر روتے ہو؟"

"پھر کیا کروں دل پر بھی کوئی بس ہے؟"

"دھیرج سے کام لو . . . ."

"آہ یہ بھی کوئی اپنے بس کی بات ہے!"

"مرد ہو دھیرج سے کام لو۔ کوئی لائق لڑکی دیکھ کر اپنی گرہستی کھڑی کر لو اور ان خوشی کے دنوں میں مجھے بھی بلانا" پریما بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ مجھ سے نہ ہوگا" سوریش آنسو پونچھ کر بولا۔

"پھر مجھ سے ملو گے؟" پریما اس کے ہاتھ کی انگلیاں پکڑ کر بولی۔

"ضرور ملوں گا"

"ہاں ضرور ملنا"

دونوں خاموش کھڑے تھے۔ لیکن ان کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

"پریما؟"

"؟"

"پریما اتنی ادھیر نہ ہو"

"نہیں سوریش میں ادھیر نہیں ہو رہی ہوں۔ میں تمہارے آنے والے دنوں کی سوچ میں پڑی ہوں۔ بولو میرے نہ رہنے کی حالت میں اپنے دن سکھ سے بیتاؤ گے نہ؟"

"اور تم . . . ؟"

"میری چنتا نہ کر و سوریش سنتی ہوں ان کا خاندان بڑا ہے۔

میں کسی طرح اپنا دل بہلاؤں گی"
"کبھی کبھی خط لکھ سکو گی؟"
"ضرور ضرور۔ بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے"
بس میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ جہاں بھی رہو سکھ سے رہو۔ میری پریما میں اسی میں سکھی رہوں گا۔"
"اچھا سوریش اب رخصت چاہتی ہوں اور آخری رخصت"
سوریش نے دیکھا پریا کانپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی پاراندی اُمڈ رہی تھی۔
"پیاری پریا! اوہ کوئی آگیاں؟" سوریش نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
بس میری ایک یہی پرارتھنا ہے کہ اپنے دل کے کسی کونے میں مجھے تھوڑی سی ایسی جگہ دو جہاں سے میں کبھی کبھی تمہاری یاد کے ساتھ یہی سہانا کھیل کھیل سکوں . . . ."

. . . . . .

پریا اب ایک نئی دنیا میں آبسی تھی۔ یہاں کا ماحول وہاں سے بالکل جدا تھا۔ قدم قدم پر قانون اور پابندیوں کا کانٹا۔ کل کی بن کی آزاد کوئل آج سماج کے پنجرے کے اندر بند تھی۔ کبھی کبھی دوسرے کو ماں کہہ کر پکارنے والی پریا اب خود ماں بن گئی تھی ——؟ اس حیرت انگیز انقلاب سے وہ جتنا بھی گھبراتی کم تھا۔
خطرناک صورت حالات کی موجودگی میں بھی پریا کسی نہ کسی طرح آدھا خط لکھ چکی تھی لیکن گھر والوں کی آنکھ کہاں تک بچاتی؛ ہری کرشن کے چھوٹے لڑکے انوپ نے اسے کئی دن لکھتے دیکھا تھا۔ بے چاری پہنائے گئی تھی۔ انوپ نے خط اڑا لیا اور جا کر باپ کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ انوپ ابھی دوسرے ہی درجے میں پڑھتا تھا۔ بھلا ہاتھ کا لکھا ہوا خط اس سے کیسے پڑھا جاتا؟ الٹ پلٹ کر دو چار جملے اِدھر اُدھر کے پڑھ رہا تھا۔ باپ نے پوچھا "کیسا کاغذ ہے انوپ؟"
"نئی ماں کی چٹھی ہے" انوپ نے خط لفافے میں بند کرتے کرتے کہا۔
رائے صاحب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غصے سے ہونٹ کانپنے لگے۔ گرج کر بولے —— "پڑھ بے پڑھ . . ."
انوپ نے لفافے کے اوپر کے پتے کو پڑھنا شروع کیا —— "سو . . . ریش . . . چند . . . . ر . . . . میڈ . . . یکل . . . کالج . . . پٹنہ۔"
بس کر و بس۔ میں سمجھ گیا۔ افوہ اتنی دلیری؟ ڈائن ہے ڈائن" ہری کرشن رائے نے لڑکے کے ہاتھ سے خط لے کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ اس کے بدنصیب پریا پر کیا گذر رہی ہے اس کے سوا کون جانے؟

. . . . . .

ڈاکٹر سوریش چندر کا سنگرام پور میں تبادلہ ہوا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ایک کامیاب اور تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔
ڈاکٹر صاحب نے ابھی تک اپنی شادی نہیں کی ہے۔ اس لئے ان کی عزت و شہرت دیکھ کر ہر روز کوئی نہ کوئی لڑکی والا ان کے پاس پہنچا ہی رہتا ہے۔ شاید ڈاکٹر ہونے کے بعد انہوں نے کسی عمل سے اپنی مدھم ہڈیوں کو آہن بنا لیا ہے۔
لیکن ڈاکٹر صاحب کسی وجہ سے صاف انکار کرتے جاتے ہیں۔
اسی طرح کچھ دن گذر گئے۔
بسنت رُت کی دوپہر تھی۔ ڈاکٹر صاحب نسخہ لکھنے میں مصروف تھے۔ بڑی بھیڑ تھی۔ "مادھو ہوں سرکار" ایک بوڑھے نے بیل گاڑی سے اترتے ہوئے کہا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا کمرے میں آگیا۔
"کیا ہوا ہے؟ مونیا بند؟" ڈاکٹر نے فوراً اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔
"مال دکھ کا مارا ہوں سرکار۔ روگ پرانا ہو گیا ہے" بوڑھے نے رو کر کہا۔
تمہاری آنکھوں کا پریشن ہوگا۔ تمہارے ساتھ اور کوئی ہے؟"
لڑکے نے مار پیٹ کر الگ کر دیا ہے سرکار۔ اب اور کون ہوگا؟ وہی بڑھاپے کی لکڑی . . ."
ڈاکٹر نے بات کاٹ کر کہا —— "بات ختم کرو۔ کون ہے بلاؤ"
گاڑی سے اتر کر ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ گھونگھٹ سے ڈھکا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بار بار دیکھا لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر کپاؤنڈر سے مریض کا بندوبست کرنے کے لئے کہہ کر چلے گئے۔ لیکن ان کے دل میں گونا گوں خیالات کا ایک ہنگامہ برپا تھا۔
وہی بسنت رُت کی شام اپنی سیاہ چادر سے دنیا کو ڈھک رہی

تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہسپتال کے صحن میں کرسی پر بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے اور وہ عورت بھی برآمدے میں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد افق کی اوٹ سے چاند بھی جھانکنے لگا۔ عورت اٹھ کر دھیرے ایک طرف چلی۔

"ڈاکٹر بابو!" عورت گھونگٹ کھول کر بولی۔

ڈاکٹر کا رہا سہا شک بھی جاتا رہا اور وہ کھڑے ہو کر پکار اٹھے "پریما ——!"

عورت چپ چاپ ان کی طرف دیکھتی رہی۔

ہر چند کہ گردشِ زمانہ سے پریما کے رنگ روپ میں زبردست تغیر ہو گیا تھا۔ پھر بھی اتنے قریب آ کر وہ سوریش کی آنکھوں سے چھپ نہ سکی۔

"پریما!" ڈاکٹر نے پھر کہا۔

"سو . . . ر . . . یش . . . عورت نے دھیرے سے کہا۔

عورت کا اتنا کہنا تھا کہ ڈاکٹر نے دوڑ کر اسے سینے سے لگا لیا اور دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی اپار ندی امڈ پڑی۔

"آہ میری دکھ بھری کہانی سن سکو گے سوریش!" عورت سسک کر بولی۔ ڈاکٹر چپ رہا۔

"ضرور سن سکو گے۔ کیونکہ تم مرد ہو اور تمہارا دل مضبوط ہو گا اور میں دکھ کی ماری ابلا ہوں۔ لٹ چکی ہوں۔ تم سن تو سکو گے لیکن میں سنا بھی سکوں گی!" عورت سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔

ڈاکٹر حیران رہ گیا ——

عورت نے کہنا شروع کیا —— اچھا تو سنو —— یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ جس وقت میری شادی ہوئی۔ اس بوڑھے کی عمر آدھا اس سے ڈھل چکی تھی۔ جب میں سسرال پہنچی تو گرہستی کا سارا بوجھ میرے سر پڑا۔ بوڑھے کی پہلی استری چل بسی تھی اس کے تین لڑکے تھے اور دو لڑکیاں۔ دو لڑکوں کی بہوئیں موجود تھیں۔ تیری ساس بن کر میں پہنچی گھر کا سارا بوجھ مجھے سنبھالنا پڑا اور اسی پر بس نہیں تھا سب کی کڑوی بولیاں بھی سہنی پڑیں۔

یہ تو تم جانتے ہو کہ بے جوڑ بوڑھے بچے بن جاتے ہیں۔ اس کا بڑا لڑکا رامو بوڑھے کی آنکھیں دھول جھونک کر میرے پیچھے پڑا۔ آہ سوریش سنو! تمہیں اس پاپی کی کہانی —— اچھا سنو۔ اس نے میرے ساتھ نامناسب رشتہ جوڑنا شروع کیا اور میرے لئے بازار سے مٹھائیاں اور بناؤ سنگار کے سامان لا کر مجھے دینے لگا۔ موقع بے موقع میرے کمرے میں بھی آ پہنچتا اور کھلے لفظوں میں اپنے دل کی بات مجھ سے کہہ بیٹھتا۔ آہ اس وقت میرے دل میں کیسی ٹھیس لگتی تھی! یہ کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ ہاں تو وہ نیچ پاپی کبھی کبھی رات کو بھی میرے پاس پہنچتا اور مجھے اپنے قابو میں لانے کے لئے اپنی طاقت سے کام لیتا۔ جب اس طرح بھی اس کا بس نہ چلتا تو میرے اوپر ظلم کا جو پہاڑ وہ ڈھاتا اسے تمہیں دیکھنا ہو گا! اتنا کہہ کر عورت نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی۔ جس پر لاٹھیوں کی چوٹ کے سیکڑوں نشانات موجود تھے۔

عورت سسکیاں لیتی ہوئی کہنے لگی —— سوریش! مجھے یہ تو نہیں یاد رہا کہ اس پر کتنی لاٹھیاں پڑی ہیں۔ لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ سات برس تک برابر اس پر لاٹھیاں برسی ہیں . . . آہ سوریش! میری رام کہانی کہاں تک سنو گے؟ اور میں کہاں تک سنا سکوں گی۔ بس اب مجھ سے نہیں کہا جاتا۔ ہائے رے بے رحم سماج . . . !"

اتنا کہتے کہتے پریما بے ہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر نے چیخ کر نوکر کو پکارا —— "رامو! رامو! اے اور امو!!"

آسی رام نگری

آمدِ صبح

دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا!
نہ ٹھہرے گا یہ سر پر رات کی رانی کے اک پل کو؛

یہ روشن اور اجلا چاند یعنی رات کا پریمی
یہ اس کو جگمگاتے، پیلے تاروں سے
سجا کر لایا ہے گھر سے۔
مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد؛
دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا!

ہے دل میں چاند کے جذبہ محبت کا،
چھپاتا ہے وہ غیروں کی نگاہوں سے اڑھا کر اک دوپٹہ اس کو تاروں کا؛
مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد،
فضا کے گلستاں میں پھرتی ہے اٹھکیلیاں کرتی،
ہوائیں گیسوؤں کو اس کے چھو کر دوڑ جاتی ہیں،
دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا!

وہ لو، پیلا پڑا روشن سا چہرہ چاند کا بالکل!
اُسے افسوس! اندیشوں نے گھیرا ہے،
اُسے خطرہ ہے غیروں کا،
ہے جذبہ اُس کے دل میں تند چاہت کا۔

مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد،
وہ اِن کیفیتوں کو دل میں لاتی ہی نہیں بالکل!

دوپٹہ شب کا ڈھلکا، ہاں وہ ڈھلکا جس طرح نغمہ
کسی راگی کے دل سے اُٹھ کے اک دم بیٹھ جاتا ہے!

پرندے چہچہاتے ہیں،
وہ لو، سورج بھی اپنی سیج پر اب جاگ اُٹھا ہے!
گئی رات اور دِن آیا!

میراجی

عشق اور خودداری

تمام انسانی جذبات میں عشق و محبت جیسے شریف جذبہ کو جو درجۂ فضیلت و امتیاز حاصل ہے۔ وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو عالمگیر تاثیر کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی ہمہ گیری ایک امر مسلّم ہے۔ ہر دل میں اس کا جلوہ اور ہر شے پر اس کا تسلط۔ یہ ایک ایسا جادو ہے جس کے دائرۂ اثر سے اس کائنات کی کوئی چیز باہر نہیں۔ تمام نوعِ انسانی میں بلا لحاظ قوم و نسل و ملک یہ جذبہ مساوی طور سے پایا جاتا ہے۔ ہر فرد بشر پر اس کی کارفرمائی ہے۔ نوعِ انسانی کا کوئی فرد خواہ وہ ایرانی ہو یا ہندی۔ عرب ہو یا ترک۔ جرمن ہو یا فرانسیسی یکساں طور پر شرابِ عشق میں سرشار نظر آتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کا لٹریچر اور کسی زبان کا ادب عشق و محبت کی روح پرور داستان سے خالی نہیں خصوصاً شاعری جو جذبات کے اظہار اور برانگیختگی کا نام ہے۔ عشقیات کے ایک بڑے جزو پر مشتمل ہوتی ہے۔ عالمگیر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ یہ ایک نہایت وسیع عنوان بھی ہے۔ مختلف زبانوں کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کا لٹریچر عاشق و معشوق کی ایک علیحدہ تصویر پیش کرتا ہے۔ ان متعدد تصویروں میں بہت سے رنگ عام ہوتے اور بہت سے مخصوص بھی۔ بعض ایک تصویر میں زیادہ ابھرے ہوتے ہیں۔ اور بعض دوسری میں۔ عشق کے بہت سے ایسے پہلو اور عاشق و معشوق کی بہت سی ایسی خصوصیات ہوتی ہیں۔ جو ایک زبان میں پائی جاتی ہیں۔ اور دوسری میں نہیں یا جن پر ایک قوم کے ادبیات میں زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اور دوسری میں کم۔

اگر ہم اُردو اور عربی کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ عشقیہ سوز و ساز۔ راز و نیاز۔ ہجر کے آزار۔ وصال کی پُرکیف لذات۔ وداع کی متلاطم کیفیات۔ معشوق کی شوخی۔ ستم ظریفی۔ ادا۔ بانکپن۔ ناز اور عاشق کی عاجزی۔ نیاز۔ بے کسی و تسلیم۔ صبر و رضا۔ اور ناز برداری کے تذکرے دونوں زبانوں میں بطریق اکمل موجود ہیں۔ البتہ عاشق کی نفسیات کا ایک اہم پہلو ایسا ہے۔ جس پر عربی شاعری میں تو خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور بڑے زور کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن ہماری زبان میں اس کی صرف ایک دھندلی سی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ دونو زبانوں میں عاشق کی جو تصویریں ہمارے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ ان میں مابہ الامتیاز "عاشق کی خودداری" ہے۔ عربی میں عاشق کی صفات میں سے خودداری کو ایک اہم صفت قرار دیا جاتا ہے۔ بخلاف اُردو کے کہ اس میں اس کی طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی ہے۔

جس طرح ایک ہندی عاشق معشوق کی پرستش کرتا ہے۔ اس کی ایک ایک ادا پر دل قربان کرتا ہے۔ ہجر میں مر مر کر جیتا ہے۔ اس کے لئے تمام دنیا سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک عرب کا دردمند محبت اور ایک ریگستان عرب کا صحرا نورد بھی اپنے محبوب پر دل و جان سے فدا ہوتا ہے۔ اس کے لئے طرح طرح کے مصائب و آلام برداشت کرتا ہے۔ جنگلوں جنگلوں مارا پھرتا ہے۔ راہ میں جتنی مشکلات پیش آئیں ان کا سامنا کرتا ہے۔ ہاں صرف فرق اتنا ہے۔ کہ ایک عربی عاشق کو ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اپنی خودداری کا بھی پاس ہوتا ہے۔ معشوق کی ناز برداری میں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا وہ بھی اس پر صد ہزار جان سے والا و شیدا ہے۔ اسے قدرت کی قوتِ تخلیق کا بہترین نمونہ تصور کرتا ہے۔ وہ بھی جفا کی لذتوں کا حریص ہے اور اقبال کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہتا ہے۔ ع

ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزہ ہی نہیں

مگر معشوق کی تحقیرانہ نگاہ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ عشق کی راہ میں وہ کسی قسم کی تذلیل برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ معشوق کے منہ سے دشنام سننے کا آرزومند نہیں۔ وہ اس کی نظر میں وقیع اور باعزت ہو کر رہنا چاہتا ہے۔ وہ بوالہوس نہیں وہ معشوق کا غلام نہیں بلکہ اس کی شمع حسن کا پروانہ ہے۔ اسے عشق نے "نکما" نہیں کر دیا ہے۔ عشق نے اس کے احساس خودداری کو مردہ نہیں بنا دیا ہے۔ عشق اس کے لئے ذلت و خواری کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اس کو اپنی عزت کا پاس ہے۔ اس کی خودداری کو کوئی ٹھیس نہیں لگ سکتی۔ اس کی یہ آرزو نہیں کہ وہ معشوق کے پاؤں میں پڑا رہے یا معشوق کی ٹھوکریں کھائے یا اس "سیمتن کے پاؤں" دھو دھو کر پیئے۔ عشق کی امانت کو اپنے سینہ میں رکھ کر وہ اس بات کی امید نہیں کرتا کہ دربان تو کجا خود محبوب کے منہ سے گالیاں

سے۔ اس کو یہ تمنا مضطرب رکھتی ہے کہ وہ معشوق کے پاؤں میں نہیں بلکہ نظروں میں رہے۔ وہ اپنے پاسِ عزت کو اپنی وفا شعاری کا ضامن بناتا ہے چنانچہ جب کبھی معشوق کی بے اعتنائی اور سرد مہری دیکھتا ہے۔ شریفانہ طور پر علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اگر معشوق کی جانب سے ذرا تذلیل آمیز اعراض پایا جاتا ہے۔ تو اس کے پاس اس کی تیز رفتار اور منفی موجود ہے۔ تمام تعلقاتِ محبت کو یک لخت قطع کر کے فوراً روانہ ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان کے بعد یہ صاف کر دینے کی ضرورت ہے کہ عربی عاشق کی محبت، ناز برداری، یا وفاداری میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اپنی خودداری کا پاس سچے جذبۂ محبت کے منافی نہیں۔ پاؤں دھو کر پینا یا دشنام سننے کی آرزو کرنا ناز برداری کے مفہوم میں داخل نہیں۔ عشق سے نکما نہ ہو جانا۔ خودداری کے خیال سے تعلقاتِ محبت کو قطع کر دینا اور ان تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو جنہیں اس نے اپنے خونِ جگر سے تربیت دیا تھا خیرباد کہہ دینا بے وفائی نہیں بلکہ اوّل درجہ کی علوہمتی کی دلیل ہے۔ جو مردانہ اوصاف میں محمود ترین وصف ہے۔ اگر کوئی محبت قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے تو اسی شخص کی جسے اپنی عزت کا پاس ہو۔ اگر کوئی شخص وفادار کہا جا سکتا ہے تو وہ وہی شخص ہے جو اپنی خودداری کو نہ کھو بیٹھا ہو۔ ناز برداری میں ایک عربی عاشق بھی کمی نہیں کرتا۔ وہ ہر قسم کے ناز اٹھانے کے لئے تیار ہے۔ لیکن ناز کو تذلیل کا مرادف نہیں سمجھتا۔ وہ ہر طرح کے امتحانِ محبت کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ ہاں! البتہ اپنی تذلیل کو وہ محبت کا معیار قرار نہیں دیتا۔ وہ اپنے عشق و وفا کو ذلت و تحقیر کے پیمانہ سے نہیں ناپ سکتا۔ اس کے اپنے خیال میں عشق سے اس کی قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی قدر و منزلت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ عاشق کی خودداری۔ عاشق کی عاجزی اور نیاز کے کسی طرح منافی نہیں۔ اس خودداری کے یہ معنے نہیں کہ معشوق کا احترام بالکل خاک میں ملا دیا جائے۔ اس کا درجہ بالکل مبتذل ہو جائے اور اس سے ہر وقت تو تو میں میں ہوا کرے۔ اردو کے بعض شعراء اور خصوصاً مرزا آغا کے یہاں اس قسم کی بے اعتدالیاں بہت پائی جاتی ہیں۔ اور یہ ان کی غزل کا بہت بڑا عیب ہے۔ ایک طرف تو مساویانہ گفتگو بالکل عام بات ہے۔ بلکہ کہیں کہیں معشوق کو بہت سخت دھمکیاں دی گئی ہیں۔ اور دوسری طرف بعض جگہ خاکساری سے گزر کر بازاری عشق میں نہایت ذلت اختیار کی ہے اور اپنے کو بہت مبتذل بنا دیا ہے۔ اس موقع پر مرزا غالب کا ایک شعر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے معشوق کے مرتبۂ ناز اپنے فخر و غرور کا اس خوبصورتی سے اظہار کیا ہے کہ عاشقانہ عجز و نیاز کی شان قائم رہ گئی ہے۔ ؎

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیا دریغ
رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

ذیل میں ہم چند اشعار دونوں زبانوں کے پیش کریں گے جن سے مذکورۂ بالا نظریہ کی صداقت کا ایک حد تک اندازہ ہو سکتا ہے:۔

ذوق کو دیکھئے کس نشہ میں مخمور ہیں:۔

(۱) دشنام ہو کے وہ ترشِ ابرو سزا رہے ۔ یاں وہ نشے نہیں جنہیں ترشی اتار دے

غالب کہتے ہیں:۔

(۲) رہے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے ۔ پر بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

(۳) بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی ۔ آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

(۴) واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب ۔ یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

(۵) دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پاؤں ۔ رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

غالباً یہ ارذل ترین شعر ہے۔ اس میں شاعر نے اپنے درجہ کو بالکل مبتذل بنا دیا ہے۔ ایسی صورت میں کیا تعجب ہے اور کیا بے جا ہے اگر غالب کے متعلق لوگ نے ان کو اس لائق بھی نہ سمجھا کہ وہ پاؤں دھو کر پئیں!

اس کے مقابلہ میں عربی شعراء کے جذباتِ محبت و خودداری ذیل کے اشعار کے آئینہ میں ملاحظہ کیجئے:۔

لبید بن ربیعہ عرب کا بلند پایہ شاعر ہے۔ نوار اس کی معشوقہ کا نام ہے۔ پیرِ فلک نے اس کی منظورِ نظر کو اس سے کوسوں دور کر دیا ہے۔ لبید کو اس کی جانب سے بے اعتنائی کا شبہ ہوتا ہے۔ جس پر اپنے واردات قلب کا ان اشعار میں اظہار کرتا ہے:۔

(۱) قَاطِعُ لُبَانَةَ مَنْ تَعَرَّضَ وَصْلُهُ ۔ وَلَخَيْرُ وَاصِلِ خُلَّةٍ صَرَّامُهَا

اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے لبید! تو اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو اس شخص سے قطع کر دے جس کی محبت معرضِ زوال میں ہو۔ اور جس کا مزاج بدل گیا ہو۔ بیشک سب سے بہتر محبت کرنے والا وہ شخص ہے جو اس کو منقطع بھی کر دے (جب محبت میں تغیر دیکھے)

(۲) وَاهْجُ الْمَحَابِلَ بِالْجَمِيلِ وَصَرْمُهُ ۔ بَاقٍ إِذَا قَطَعَتْ ذَرَاعَ تَوَامُهَا

جو تجھ سے اچھی طرح پیش آئے۔ اس کی طرف بہت زیادہ عنایت و محبت کر اور جب اس کی چال سیدھی نہ رہے (یعنی اس کی محبت میں فتور آئے) تو اس کو ترک و قطع کر دینے کا تجھ کو اختیار حاصل ہے۔ اُس وقت اُس سے

سیر اسر منہ نفسیا ل ۔

قطع محبت کرے۔

اسی قصیدہ دیں آگے چل کر اپنی محبوبہ نوار سے خطاب کرکے کہتا ہے:۔

(۳) أَوَلَمْ تَكُنْ قَالَتْ لِيَ نَوَارِ إِنَّمَا ۔ وَصَالُ عُقَيْلِيَّاتِ جِدَّةُ أَمْهَا

اے نوار! تو مجھ سے الفظ کرکے چلی گئی اور تو نے یہ نہ جانا کہ میں محبوبہ محبت اور مواثیق عشق کا بڑا توڑنے والا اور تیز توڑنے والا ہوں یعنی جو مجھ سے بے رحمی کا برتاؤ نہ کرے اس کے لئے مجسم وفا ہوں اور جو بے رحمی برتے اسکو فوراً چھوڑ دیتا ہوں۔

(۴) تَرَكْتُ امْكُنَّةً إِذَا لَمْ أَرْضَهَا ۔ أَوْ يَبْتَطِنْ بَعْضَ النُّفُوسِ حِمَامُهَا

کیا نوار نے یہ بھی نہ جانا کہ میں ان مقامات کو جنہیں میں پسند نہ کروں اور جو میرے لئے سازگار نہ ہوں (یعنی ذلت کی جگہوں کو) فوراً ترک کر دیتا ہوں مگر یہ کہ میری موت آ جائے کہ اس وقت میں وہاں کے قیام پر مجبور ہوتا ہوں مطلب یہ ہے کہ میں جیتے جی ذلت برداشت نہیں کر سکتا اور ذلت کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

ایک اور مشہور شاعر امرء القیس جس کو عربی شاعری کا علمبردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اپنی محبوبہ کے ساتھ اپنی گذشتہ صحبتوں کو یاد کرکے کہتا ہے:۔

(۵) وَيَوْمًا عَلَى ظَهْرِ الْكَثِيبِ تَعَذَّرَتْ ۔ عَلَيَّ وَآلَتْ حَلْفَةً لَمْ تَحَلَّلِ

"اور اس معشوقہ نے ایک دن جبکہ ہم ایک ٹیلہ کی پشت پر بیٹھے ہوئے تھے مجھ پر بڑی سختی کی اور مجھ سے جدائی کی قطعی قسم کھائی اور اتنا، اللہ بھی نہ کہا کہ اس قسم کو توڑنے کا موقع ہوتا"

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد اپنی محبوبہ کو مخاطب کرکے کہتا ہے:۔

(۶) أَفَاطِمُ مَهْلًا بَعْضَ هٰذَا التَّدَلُّلِ ۔ وَإِنْ كُنْتِ قَدْ أَزْمَعْتِ صَرْمِي فَأَجْمِلِي

اے فاطمہ! اگر تیرا فیصل از راہ ناز تھا تو اپنے اس ناز کو کسی قدر چھوڑ دے اور اگر تو نے مجھ سے علیحدگی کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو اے اچھائی کیساتھ کرنیوالی شریفانہ طور سے مجھ سے علیحدہ ہو جا۔

(۷) أَغَرَّكِ مِنِّي أَنَّ حُبَّكِ قَاتِلِي ۔ وَأَنَّكِ مَهْمَا تَأْمُرِي الْقَلْبَ يَفْعَلِ

بے شک تجھ کو میرے اس امر نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے کہ تیری محبت میری قاتل ہے اور تو میرے دل کو جو حکم کرتی ہے وہی کرنے لگتا ہے۔

اس کے بعد کیسا اچھا شعر کہا ہے:۔

(۸) وَبَيْضَاءَ تَمْلَأُ عَيْنَيَّ مِنْهَا خَلِيقَةٌ ۔ فَمِنْ تَبَايُنٍ مِنْ ثِيَابِكِ تَنْسُلِ

اگر تجھ کو میری کوئی عادت بری معلوم ہوئی ہے تو میرے دل کو اپنے دل سے نکال دے اور جدا کر دے تاکہ میں تجھ سے علیحدہ ہو جاؤں اور تو مجھ سے بے غم ہو جائے یعنی اگرچہ میں یہ خوب جانتا ہوں کہ تجھ سے علیحدگی میری ہلاکت کا سبب ہوگی لیکن چونکہ تو مجھ سے محبت نہیں کرتی ہے اور مجھ سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے میں اسی کو پسند کرتا ہوں۔ عاشقانہ خودداری اور تسلیم کی بہترین مثال ہے۔

سید محمد یوسف مولوی عالم از بھوپال

غزل

ہر ایک بات تھی گو حسبِ مدعا تیری
ہوئی نہ میرے موافق کبھی قضا تیری

بھلا تو دیتی ہے باتوں کو وقت کی رفتار
یہ مجھ کو بھولنے دیتی نہیں وفا تیری

مری زبان کو مانع ہے پاسداری راز
تجھے بھی روکتی ہے بات سے حیا تیری

نگاہ روک کے ہاتھوں سے دل پکڑتا ہوں
کہیں سے کان میں آتی ہے جب صدا تیری

قرار دیتی تھی اس دل کو بے قراری میں
کہاں ہے صبر و تحمل بھری ادا تیری

یہ بات کیا ہوئی سیفی برا نہ تھا آغاز
ہوئی ہے قابلِ افسوس انتہا تیری

سیفی

کیا وہ سب تھا بھول جانے کے لئے

(۱)

ستمبر کا خوشگوار مہینہ تھا۔ آسمان پر بادل نام کو نہ تھے۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی نیلا ہی نیلا آسمان تھا۔ البتہ چیلیں کثرت سے منڈلایا کرتی تھیں سورج کی تمازت دنا بھی ناگوار نہ گذرتی۔ ہاں! دوپہر کے وقت اکثر تیز ہوا چلتی تھی۔ گلابوں کا موسم تھا۔ سرخ۔ گلابی۔ زرد۔ نہ عنرانی۔ سب ہی رنگوں کے گلاب جا بجا نظر آتے۔ سورج مکھی کے پھول بھی کھلنا شروع ہو گئے تھے۔ امرود کے درختوں پر چمگادڑیں آنے لگی تھیں۔

ایسے پیارے موسم میں میں جواں بخت کے اسکول میں داخل ہوئی۔ جواں بخت ایک خوشرو نوجوان تھا۔ وہ اوپر کی منزل یعنی کالج میں پڑھتا تھا اور میں نچلی منزل یعنی اسکول کی ایک چھوٹی کلاس میں تھی۔

ایک روز اتفاق سے ماسٹر صاحب نہ آئے تھے اور ہم لوگ دل کھول کر شرارتیں کر رہے تھے۔ کمرے کے دروازے بند کر لئے تھے تاکہ دوسری کلاس میں شور کی آواز نہ جائے۔ اس لئے نہیں کہ ہمیں دوسری کلاسوں کے طالب علموں کے مجروح کا خیال تھا بلکہ یہ ڈر تھا کہ کہیں دوسرے ماسٹر صاحب آکر خفا ہوں اور ہمیں کوئی کام دے جائیں تو یہ ساری چہل پہل خاک میں مل جائے گی۔ ایک لڑکے نے میری کاپی میں سے دو تین سوالات زبردستی نقل کر لئے۔ مجھے انتہائی غصہ آیا، کیونکہ وہ مجھے اپنی کاپی نقل کرنے کے لئے کبھی نہ دیتا تھا۔ میں جھنجھلا کر کلاس سے باہر چلی آئی اور اوپر کالج کی لائبریری میں پہنچ گئی۔ وہاں جواں بخت کسی کتاب کی تلاش میں الماری کے خانے میں منہ دیئے کھڑے تھے۔ میں نے کرسی میز کی طرف اس زور سے گھسیٹی کہ جواں بخت نے چونک کر پیچھے دیکھا اور مسکرانے لگے۔ اس کے جواب میں میں نے ایک قہقہہ لگایا، پھر باہر دیکھنے لگی۔ کھڑکی سے باغ نظر آرہا تھا۔ گل اشرفی کا درخت ہوا سے جھوم رہا تھا۔ سرخ سرخ پھول زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو سنجیدہ بنانے کی کوشش کی۔ سوچا کہ باغ کے خوشنما منظر میں اپنی ہنسی بھول جاؤں۔ بڑی مشکل سے تھوڑی دیر خاموش رہی۔ ایک بار جواں بخت کی طرف دیکھا اور پھر ہنسی آگئی۔ دوسری طرف منہ پھیرا تو کتابوں کی شیشے کی الماری میں اپنی ہنستی ہوئی صورت نظر آئی۔ اب تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ مجبوراً نیچے بھاگ آئی۔ بس یہ تھی میری اور جواں بخت کی پہلی ملاقات!!!

اس ملاقات کے بعد میں جواں بخت کو قریباً ہر روز دیکھتی تھی لیکن کبھی باتیں کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس روز کے واقعہ کا خیال آتا تو بے اختیار ہنس دیتی۔ وہ بھی مسکرانے لگتے۔

(۲)

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جواں بخت میرے والد کے ایک دوست کے لڑکے تھے۔ ایک روز والدہ جواں بخت کی بھاوج سے ملنے گئیں میں بھی ساتھ گئی۔ یہ میرے لئے جواں بخت کے گھر جانے کا پہلا اتفاق تھا۔ اس وقت وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ میں ان کے کمرے میں پہنچی۔ کتابوں کی الماری میں چند انگریزی رسائل رکھے تھے۔ میں نے نکال کر الٹنا پلٹنا شروع کئے۔ اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ جو قصاویر پسند آئیں قینچی سے کاٹ لیں۔ پھر کاپیوں پر ہاتھ صاف کیا۔ جگہ جگہ پنسل سے جواں بخت کی تصویریں بنائیں اور لکھ دیا "جواں بخت کو سزا مل رہی ہے"۔ "جواں بخت کان پکڑ کر اٹھ بیٹھ رہے ہیں"۔ "جواں بخت کرکٹ میچ ہارنے کے بعد"۔

میں نہایت اطمینان سے تصویریں بنا رہی تھی کہ اتنے میں وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ خدایا!!! خوف کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ جواں بخت گھبرا کر میرے قریب آئے۔ میں آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "جواں بخت! معاف کیجئے"۔

وہ مسکراتے ہوئے بولے "کیا معاف کر دوں؟ لیکن تم چیز

کیوں پڑی تھیں؟"

یہ کہہ کر بعد دیگرے میں نے تمام کاپیاں ان کے سامنے رکھ دیں۔ تصویریں تو ایسی اچھی نہ تھیں کہ دیکھنے سے سمجھ میں آ جائیں۔ لیکن نیچے لکھے ہوئے الفاظ تشریح کر رہے تھے۔ جواں بخت اپنے آپ کو ہر رنگ میں دیکھ کر بہت ہنسے۔ میں ڈر رہی تھی کہ دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے پیار سے میرے سر پر ایک چپت رسید کی اور کہا۔ "تم بے حد شریر ہو! اسکول میں بھی شرارتیں کرتی ہو اور گھر پر بھی باز نہیں آتیں۔"

ان کی خوش مزاجی دیکھ کر میرا ڈر جاتا رہا۔ میں نے بچی کی ہوئی تصویریں بھی ان کے آگے رکھ دیں۔

وہ میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولے۔ "اچھا تم بہت کچھ کر چکی ہو! تم نے سارے رسالے خراب کر ڈالے۔ لیکن تمہیں پینسل لے دو۔"

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کا شکریہ ادا کیا اور بستے کھینچ سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ جواں بخت خاموش بیٹھے تھے۔ میں ان کے گلابی گلابی ہونٹوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ دفعتہً انہوں نے مخمل دان سے بنفشہ کے دو نیلے نیلے پھول نکال کر میرے بالوں میں لگا دئے۔

میں نے کہا۔ "یہ کیا۔ مخمل دان میں اچھے خاصے رکھے تھے۔ اس میں سے کیوں نکال لئے؟"

کہنے لگے۔ "تمہارے بالوں میں زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔"

سورج نصف النہار سے گذر چکا تھا۔ روشن دان سے عجب کیف پرور کرنیں آ رہی تھیں۔ خوشگوار ہوا سے جواں بخت کے بال اڑ رہے تھے۔ وہ اس وقت نہایت غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن میں مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ ان کے بالوں کا تماشا دیکھ رہی تھی وہ بے حد خوب صورت معلوم ہو رہے تھے۔ اتنے میں والدہ نے مجھے پکارا اور میں کمرے سے بھاگ گئی۔

اس ملاقات کے بعد مجھے اتنا احساس اچھی طرح ہونے لگا تھا کہ مجھے جواں بخت کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی ہے۔

(۳)

سردیوں کا موسم آہستہ آہستہ گذر گیا۔ خزاں اور بہار میں باہم جنگ ہو رہی تھی۔ بعض درختوں میں کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ بعض کے پتے زرد ہو کر گر رہے تھے۔ چڑیاں دھوپ کی تیزی کی وجہ سے آنگن سائے ہی میں پھدکتی پھرتیں۔ گلہریاں سوکھی پتیوں پر دوڑ دوڑ کر ایک لطیف کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔

سات مارچ کو اسکول اور کالج کا سالانہ اجتماع (Social gathering) تھا۔ ہم لوگوں نے کئی دن پہلے سے تیاری شروع کر دی تھی۔ کلاس کو اچھی طرح سجایا۔ دو ایک لڑکوں نے نظمیں یاد کی تھیں پوری کلاس مل کر ایک ڈراما کرنے والی تھی۔ دوسری کلاسیں بھی تیاری کر رہی تھیں لیکن ایسے موقعوں پر چھوٹی کلاسیں زیادہ دلچسپی سے کام لیتی ہیں۔ ہم لوگ بہت محنت سے تیاری کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بے چینی سے اس روز کا انتظار بھی تھا۔ اس مرتبہ تجویز ہوئی تھی کہ مختلف طبقہ تمام استادوں کی نقل کریں۔ جواں بخت نے مجھ سے کہا۔ "تم عربی کے مولوی صاحب کے وعظ کی نقل کرنا بڑا لطف رہے گا۔"

میں راضی ہو گئی۔ اب تو مجھے واقعی شوق پیدا ہو چلا تھا مولوی صاحب کی نقل چڑ تو اچھی ہو گی۔

کالج کے باغ کے ایک کونے میں جواں بخت مجھے وعظ کی مشق کراتے۔ تھوڑا سا استادی اور شاگردی کا حال بھی ملاحظہ ہو۔

جواں بخت۔ "کہو۔ بچہ۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ مذہب کی طرف سے بہت بے پروا ہوتے جا رہے ہو۔ بس دنیا ہی میں نیک نامی اور عزت حاصل کرنا چاہتے ہو۔"

اس کے جواب میں میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

جواں بخت۔ "دیکھو ہنسو نہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "بچہ! میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ مذہب کی طرف سے . . . ."

جواں بخت۔ "ذرا آواز اونچی کرو۔"

"اوہ آپ تو بیچ میں ٹوک دیتے ہیں۔ پورا جملہ بھی نہ بکنے دیا۔ ہم نہیں کہتے۔" یہ کہہ کر میں نے جواں بخت کی طرف سے پیٹھ موڑ لی اور قریب کی جھاڑی سے گلاب توڑ کر اس کی پنکھڑیاں گھاس پر بکھیر دیں۔

جواں بخت۔ "پھولوں پر کیوں غصہ اتار رہی ہو۔ اچھا بی! پورا جملہ ختم ہونے کے بعد بتایا کروں گا۔"

میں ہنس کر جواں بخت کی طرف مڑ گئی اور پھر کہنا شروع کیا۔

اسی طرح روٹھ روٹھ کر مشق کرتی رہی۔ جس دن اچھی طرح کہہ لیتی تو مجھ سے زیادہ جواں بخت خوش ہوتے۔ کئی دن بعد مولوی صاحب کا

لہجہ اختیار کر لیا۔ مولوی صاحب کی ایسی آواز تو بنائے نہ سکتی تھی۔

بہار کی خوشگوار رات تھی۔ جوہی اور بیلے کی بھینی بھینی خوشبو سے چاندنی کی ساری فضا معطر ہو رہی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں ہلکے ہلکے بادل بھی تھے۔ مجھے نیند نہ آئی تھی۔ کیونکہ صبح سالانہ اجتماع کا روز تھا۔ خوشی، شوق اور بے تابی نیند اڑائے گئی تھی۔ میں کبھی وعظ کے مجمے دوہرانے لگتی اور کبھی مولوی صاحب کی شکل یاد کر کے خود ہی مسکرا دیتی۔ کم عمری میں ایسے موقعوں پر بڑی مشکل سے نیند آتی ہے۔ بس وہی حال میرا تھا۔ گیدڑ بڑی ٹراؤنی آواز سے چیخ رہے تھے۔ اس وجہ سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ صبح کے قریب آنکھ لگی۔

اسکول میں صبح سے بڑی چہل پہل تھی۔ دن بھر نہایت پر لطف پروگرام ہوتے رہے۔ شام کو میری باری آئی۔ میں کچھ گھبراتی، شرماتی اور جھجکتی ہوئی سٹیج پر جا پہنچی۔ پھر نہایت سنجیدہ منہ بنا کر کہنا شروع کیا۔

"بچو! میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ مذہب کی طرف سے بہت بے پرواہ ہوتے جا رہے ہو۔ بس دنیا ہی میں نیک نامی اور عزت حاصل کرنا چاہتے ہو۔ یہ دنیاوی عیش کسی کام نہ آئے گا۔ رزاق پر اعتبار کرنا سیکھو! ایک دن سبھی نہیں سب کو اس کے حضور میں جانا ہے اور اپنے اعمالوں کا جواب دینا ہے۔ ڈرو اس خدا سے کہ وہ رحمٰن و رحیم ہے لیکن قہار بھی ہے ذرا سوچو کہ وہ تم کو پل میں کیا سے کیا بنا سکتا ہے۔ کیا تم کو نوح کا طوفان یاد نہیں! اس کا حکم ہے کہ نماز پڑھا کرو۔ نماز پڑھنا کتنا آسان کام ہے لیکن اس کی فضیلت بڑی ہے۔ افسوس ہم میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو ایک وقت کی نماز بھی پابندی سے نہیں پڑھتے۔ نماز پڑھنے سے چہرے پر نور آتا ہے۔ اس کی زندہ مثال ہمارے مولوی صاحب ہیں۔"

مولوی صاحب کی شکل نہایت بھونڈی تھی، لہٰذا اس جملے کے ساتھ ہال میں ایک مسلسل قہقہہ گونجا۔ بس اسی طرح کا ٹوٹا پھوٹا وعظ کہا۔ لیکن وعظ کے دوران میں ہنسنا تو کیا معنی مسکرانے تک نہیں۔ مجھے خود اپنی سنجیدگی پر تعجب ہو رہا تھا۔ وعظ ختم ہونے پر سارا ہال قہقہوں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ پرنسپل صاحب نے فرطِ مسرت سے گود میں اٹھا کر مجھے پیار کیا اور ایک کہانیوں کی کتاب دینے کا وعدہ کیا۔ میری اتنی ہمت تو نہ پڑی کہ دیکھتی کہ مولوی صاحب پر کیا گذری۔ لیکن جاں بخت نے بتایا۔ کہہ رہے تھے۔

"لڑکی کو گلستانِ سعدی پڑھانا ہے۔ استغفر اللہ! قرآن شریف اور حدیث کی باتوں کا مضحکہ اڑایا جائے۔"

ہمارا اسکول دریا کے کنارے تھا۔ رات کو دریا میں متعدد ننھے ننھے چراغ جلتے گئے۔ عجب پر رونق چراغاں تھا۔ ہم لوگ ٹولیاں بنا کر مختلف کشتیوں میں دریا کی سیر کرنے روانہ ہوئے۔ بڑا اچھا وقت تھا۔ کسی کی کشتی میں بانسری بجائی جا رہی تھی۔ کہیں صرف گانا ہو رہا تھا۔ ہماری کشتی میں ایک لڑکا ولن پر گا رہا تھا۔ اسی کشتی میں جاں بخت بھی تھے۔ کشتی کے اور لوگ گانے کی طرف متوجہ تھے کہ جاں بخت نے مجھے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ اس رات کو میں بے حد مسرور تھی۔ وہ رات! اس رات کا کیف! دریا میں چراغوں کی روشنی! پھر لہروں سے مدہوش فضا آج تک یاد ہے۔ میرا سر خود بخود جاں بخت کے شانے پر جھک گیا۔ میرے اللہ!!! جاں بخت نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔

"لڑکی جلدی سے بڑی ہو جاؤ اور محبت کرنا سیکھو۔"

میں نے بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا۔

گھر واپس آ کر لباس تبدیل کیا اور سونے چلی گئی۔ دن بھر کی مصروفیات کی وجہ سے تکان تو بے حد تھی۔ لیکن پھر بھی نیند نہ آتی تھی۔ یا اللہ!! یہ محبت کیا ہوتی ہے؟ محبت کرنا کیسے سیکھتے ہیں؟ اماں مجھے کتنا چاہتی ہیں۔ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ میں بھی اماں سے محبت کرتی ہوں تو کیا یہی محبت ہے؟ لیکن جواں بخت اماں تو نہیں جو ان کو چاہنے لگوں پھر میں نے اماں کے لئے محبت سیکھی تو نہیں۔ وہ تو ہمیشہ سے میرے دل میں ہے نہیں نہیں تو یہ ہے میں بھی کس قدر بیوقوف ہوں۔ ابھی ننھے دن ہوئے "شیریں فرہاد" تم نے دیکھا۔ وہ محبت تھی۔ فرہاد نے کتنے مشکل کام کئے تھے اور پھر خود ہی مر گیا تو کیا محبت میں مرجانا پڑتا ہے؟ تو یہ اتنی محنت کی اور پھر مر گئے۔ میں بھی محبت میں مر گئی تو اماں، ابا، اپنا گھر، یہ سب کہاں ملیں گے؟ شیریں قبر میں زندہ دفن ہو گئی تھی۔ کیا مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا؟ مجھ سے تو کبھی نہ ہوگا۔ فرہاد نے پہاڑ کھودا تھا اور یہاں تو ایک کیاری کھودنے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ مجھ سے اچھا تو مالی ہی ہے۔ وہ دن میں کئی کیاریاں تیار کر لیتا ہے۔ اللہ! جب محبت اتنی مشکل چیز ہے تو میں کیسے سیکھ سکتی ہوں۔ بھلا اس میں پڑنے ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ خدا جانے میں کب بڑی ہو جاؤں گی۔ کیا اس وقت مجھ سے اتنے مشکل کام ہو سکیں گے؟

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ گذری رات کی تکان تھی ہی۔ پلکیں بھاری ہوئیں۔ پھر آنکھ لگ گئی اور محبت کا معصوم فلسفہ ختم ہوا۔

(۴)

ایک دن میں دریا کے کنارے خربوزوں کی باڑی میں کھڑی کچے پکے خربوزے توڑ رہی تھی۔ باڑی کا مالک مجھے منع کر رہا تھا لیکن میں کب ماننے والی تھی۔ اتنے میں جواں بخت آ گئے۔

"آؤ! اس چلچلاتی دھوپ میں تم یہاں ہو۔ تمہیں اس وقت یہاں آنے کی کس نے اجازت دی؟ لُو بھی چل رہی ہے۔ فوراً گھر چلو۔"

ہم دونوں گھر کی طرف چل پڑے۔

"اور جواں بخت! آپ خود اس دھوپ میں اتنی دور کیسے آ گئے؟"

"مجھے ایک ضروری کام تھا۔ اس طرف اپنے ایک دوست کے گھر گیا تھا۔ واپسی میں سوچا کہ کچے راستے سے چلا جاؤں۔ شاید میں تم نظر آئیں۔"

میں کیا کروں۔ دوپہر کو گھر میں سب سو جاتے ہیں۔ میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔ اس لئے چلی آئی تھی۔"

"ایک بات پوچھوں؟ بتاؤ گی۔"

"کہئے!"

"تم میرے ساتھ شادی کرو گی؟"

مجھے ہنسی آ گئی۔ لیکن میں نے اپنے سے بڑی لڑکیوں کو شادی کے نام سے شرماتے دیکھا تھا۔ مجھے تو ذرا بھی شرم نہ آئی۔ ہنسی ضرور آئی۔ میں نے منہ پر رومال رکھ لیا اور گردن نیچی کئے راستہ طے کرنے لگی۔ میں سوچ رہی تھی۔ "شادی! سرخ سرخ کپڑے۔ عطر اور ابٹن میں بسی ہوئی دلہن۔ بارات کے باجے۔ دولہا کا جگمگ جگمگ سہرا۔ زرق برق کپڑے۔ باغ بہاری کا لٹنا۔ آتش بازی کی بہار۔ سسرال میں دلہن کی منہ دکھائی۔ دلہن ایسی دلچسپ چیز۔" بس اس وقت میرے لئے شادی کا مفہوم صرف یہی باتیں تھیں۔

جواں بخت نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بولو!" میں نے زمین کو گھورتے ہوئے "ہاں" کہہ دیا۔

تھوڑی دیر میں ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔ لیموں کا شربت پیا اور ایک ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ گئے۔ باہر خوب لو چلتی رہی۔ بگولے بھی اٹھ رہے تھے۔ ہم لوگ برقی پنکھا لگائے بڑے مزے سے باتیں کرتے رہے۔ شام کو جواں بخت اپنے گھر چلے گئے۔

(۵)

موسم گرما کی تعطیلات آ گئیں۔ زیادہ تر وقت بیکاری میں گذرنے لگا۔ پڑھائی کی مصروفیتیں اس کے بعد اتنی طول طویل فرصت۔ بڑی مشکل سے دن کٹتا تھا۔

ایک دن میں دریا پر نہا رہی تھی۔ جیٹھ سے تھوڑی دیر پہلے کا وقت تھا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ کچھ کرنیں دریا کے پانی کو سنہرا بنا رہی تھیں۔ کچھ دریا پار پہاڑوں پر پڑ رہی تھیں۔ ناقابلی فہم دریا کی ہنگامہ خیز موجوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ دن بھر کے تھکے ماندے پرندے مسند فقار سے اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے تھے۔ دریائی چڑیاں مایوس آواز سے بول رہی تھیں۔ گائے بھینسیں جنگل سے شہر کی طرف واپس آ رہی تھیں اور میں اُتھلے پانی میں کھڑی ہوئی نہایت انہماک کے ساتھ ناموں رہی تھی۔ میرے سامنے دیہاتی عورتیں اور دھوبنیں بیٹھی تھیں ہنس رہی تھی۔

"دیکھو! ہم نے سنا ہے ایک عورت دیکھی تھی وہ اس طرح تالاب میں ناچتی تھی۔"

دیہاتی عورتیں ہنس ہنس کر دیکھ رہی تھیں۔ جب میں ذرا تھک گئی تو سر اٹھا کر دیکھا۔ میرے اللہ! میری روح کھل گئی۔ سر چکرا گیا۔ پگ ڈنڈی پر جواں بخت مع اپنے چند دوستوں کے مسکرا مسکرا کر میرا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ڈوب مروں! جسم پر صرف تیرنے کا لباس تھا وہ بھی بھیگا ہوا۔ وہیں بیٹھ گئی۔ گردن جھکا لی۔ کپڑے اتنی دور تھے کہ زمین پر کافی چلنا ہوتا اور پانی سے نکلنے کے بعد میں ان لوگوں کے لئے ایک اور مضحکہ خیز سین پیش کرتی۔

اپنی کم سنی کے زمانے میں شاید اسی روز مجھے سب سے زیادہ اور حقیقی معنوں میں شرم کا احساس ہوا۔ یا یوں کہئے جی چاہتا تھا یہیں ڈوب مروں۔ جواں بخت نے مجھے یوں دیکھیں اور پھر وہ بھی نہاتے ہوئے۔

تھوڑی دیر میں ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھائی تو وہ لوگ جا چکے تھے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کپڑے پہن کر لڑکھڑاتی ہوئی چال سے گردن نیچی کئے گھر آئی۔ لیکن حیا سے عرق عرق ہوئی جاتی تھی۔ کچھ عجیب خفت تھی اللہ بچائے۔

اس دن سے میری ہمت نہ پڑی کہ جواں بخت کے گھر جاؤں۔

حالانکہ چھٹیوں کے دن تھے۔ جی بھی بہت چاہتا تھا۔ لیکن اس شام کا خیال آتے ہی قدم رک جاتے۔

(۶)

اکثر شام کے وقت میں ایک چبا کے درخت کے پاس بیٹھ جاتی تھی۔ وہاں سے ساحل اور دریا اچھی طرح نظر آتے تھے۔ جوان بخت کا انتظار کرتی کہ شاید اس طرف سے کبھی گذریں۔ چند روز بعد میں نے سنا کہ وہ چھٹیاں گذارنے اپنے وطن جا رہے ہیں۔

اسی روز شام کو میں نے ساحل پر انہیں دیکھا۔ وہ میرے ہی گھر آ رہے تھے۔ بڑی ہمت کر کے میں خود ان کے پاس چلی گئی ملنے آئے تھے کہنے لگے۔

"چھٹیوں کے بعد فوراً ہی آؤں گا۔ تم مجھے یاد تو نہیں کرو گی؟"

"کیوں نہیں ـــــ ضرور یاد کروں گی۔ آج کل چھٹیوں میں تو وقت بھی نہیں کٹتا۔"

کچھ مسکرا کر بولے "اچھا تو پھر میں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔ تم انتظار کرنا خدا حافظ۔ مجھے اور جگہ بھی ملنے جانا ہے دوست انتظار کر رہے ہوں گے"

"خدا حافظ! ذرا جلد آئیے گا۔"

(۷)

ان واقعات کو سالہا سال گذر گئے۔ چبا کا درخت اپنی جگہ بدستور کھڑا ہے میں روز شام کو جواں بخت کا انتظار کرتی ہوں۔ سورج دریا پر نور کی بارش کرتا ہوا غروب ہو جاتا ہے شفق کی دلفریب سرخی میں کبھی امید اور کبھی نا امیدی کی جھلک نظر آتی ہے۔ کسی کسی دن وہی سرخی ہوتی ہے جیسی جواں بخت کے جانے کے روز تھی۔ ایسے دن مجھے امید ہوتی ہے کہ شاید جواں بخت اب آتے ہوں۔ یہی رنگت ایک دن انہیں یہاں کھینچ لائی تھی۔

اونچے اونچے پیڑ شاید میرے ناکام انتظار پر ہنسا کرتے ہیں۔ شام کی اداس سیاہی میں پرندے اپنے آشیانوں کا رُخ کرتے ہیں۔ سرد ملکوں کے پرندے ہر چھ ماہ بعد آتے ہیں۔ لیکن جواں بخت نہیں آتے۔ دریائی پرندے سیٹی بجا بجا کر مجھے اپنی مایوسی کا احساس دلاتے ہیں۔ دریا میں طغیانی آتی ہے۔ ادھر میرے آنسو مسلسل بہنے لگتے ہیں۔ تاروں بھری راتیں اب بھی آتی ہیں۔ دنیا والے دریا کی سیر کا لطف اٹھاتے ہیں۔ لیکن آہ! شاید میری دریا کی سیر اسی روز ختم ہو گئی تھی۔ جواں بخت! آ جاؤ! دیکھو اب میں کتنی بڑی ہو گئی ہوں۔ شاید اب مجھے محبت کرنا بھی آ گیا ہو۔

سلیمہ سلطانی بیگم لکھنوی

دعوتِ عمل

زندگی کیا ہے؟ نمودِ پیچ و تاب!
موت کیا شے ہے؟ جمودِ انقلاب!
سرِ عیشِ جاودانِ پاستاں!
سوز و ساز و عشق و جرأت کا شباب!
روحِ محفل! بادہ و رقص و سرود!
ورنہ ہیں بے سود طاؤس و رباب!
"ہر چہ در خود داشتی! در باختی"
تجھ کو خوش آئی نہ افرنگی شراب!
دل کی غفلت، موت! بیداری، حیات!
اس کی جنبش، شورِ یم! سکنت، سراب!
گوہرِ شہوار بر ساحل مجو!
"تیشہ زن بر صدف و یم منزل بیاب!"

ابرار احمد فاروقی عربی

رباعیات

(۱)

فطرت نہیں کوئی بات سننے کے لئے
بے چین ہے دل کی بات کہنے کے لئے
اے جانِ سخن لبوں کو اپنے جنبش دے
اب وقت نہیں خموش رہنے کے لئے

(۲)

محفل میں ملے گا وہ نہ تنہائی میں
کہسار میں ہے نہ پھول کی رعنائی میں
نوحیں کی تلاش میں شب و روز نہ پھر
آ دیکھ وہ ہے میرے دل کی گہرائی میں

(۳)

ہر چیز کو بے نقاب دیکھا نہ گیا
ذرہ کوئی آفتاب دیکھا نہ گیا
کچھ سوچ کے منہ چھپا لیا پردے میں
آپ اپنا سا کوئی جواب دیکھا نہ گیا

(۴)

بدلیں کے دل کو بہت بدلتے دیکھا
بیگانہ کی آنکھ کو بھی جلتے دیکھا
کہتے ہیں جو ہر شے میں تفاوت پایا
ان سکندروں کو اور پتھر کے دیکھا

حرماں خیرآبادی

ایک راہبہ کے محبت نامے

(تعارف)

اس سے پیشتر کہ ہم ان خطوط کا مطالعہ شروع کریں، یہ جاننا ازبس ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاتون کون تھی جس کی طرف سے یہ خطوط لکھے گئے، اور ان کا مخاطب کون تھا؟

ان خطوط کی لکھنے والی پرتگال کی ایک راہبہ تھی جس کا نام **میری آنا الکافاریدو** تھا، اور ان کا مخاطب ایک فرانسیسی نوجوان نوئل باوٹن ڈی شامیلی تھا جو بعد میں مارکوئس آف شامیلی کے نام سے مشہور ہوا۔

خطوط کی اصل زبان جس میں یہ لکھے گئے، پرتگالی ہے، انگریزی زبان میں ترجمہ ہو کر یہ خطوط اس قدر ہر دلعزیز ہوئے اور پسند کئے گئے کہ تقریباً بیس مرتبہ کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوئے۔

ایک فاضل نقاد لکھتا ہے "اسپین اور پرتگال کی مابین خونریز جنگ و جدل سے جو بہترین اور بیش بہا خزانہ دنیا کے ہاتھوں میں آیا وہ ایک پرتگالی راہبہ کے محبت نامے ہیں!!

اس سے پہلے کہ ان خطوط پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے، ہمارا شوق ہمیں یہ جاننے کے لئے مجبور کرتا ہے، کہ محبت کا وہ دردناک ڈراما کیسے شروع ہوا جس کی وجہ سے یہ غیر فانی محبت نامے وجود میں آئے! ۱۶۶۶ء میں نوئل باوٹن ڈی شامیلی جو سینٹ لیگر کا کاؤنٹ بھی تھا، شاہِ فرانس کے اشارے سے فرانسیسی فوجوں کا سپہ سالار بن کر پرتگال کی سرحد پر آ کر ٹھیرا۔ یہ نوجوان سپہ سالار اس وقت بیس عنفوان شباب میں تھا، اور میری آنا اس وقت بیچارہ پرتگال کا ایک چھوٹا سا قصبہ جس کے ایک معبد میں راہبہ کی حیثیت سے اپنی خاموش اور پُرسکون زندگی گزارتی تھی۔ ناگاہ اس نوجوان کپتان نے اپنی مداخلت سے یک بیک بنائش نظر معصوم راہبہ کی زندگی کے سطحی خوابوں کو درہم برہم کر دیا!! وہ تقریباً ہر روز معبد کے گرد آ کر طواف کرتا، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ آہستہ آہستہ اس نے اس راہبہ کو اپنے دامِ محبت میں پھنسا کر ہی دم لیا، جسے بعد میں وہ تنہا آتشِ عشق کے ساتھ کھیلنے کے لئے اور اپنے ہمدرد تا عمر سسکیاں بھرنے کے لئے چھوڑ کر اپنے وطن یعنی فرانس چلا گیا!!

فرانس جا کر اس رنگیلے نوجوان نے پھر بدنصیب **میری آنا** کی طرف رُخ تک بھی نہ کیا، یہاں تک کہ اُسے بالکل فراموش کر دیا!! یہ مسکین مظلوم میری آنا نے اپنے اس بے وفا عاشق کو جسے عاشق کہنا سراسر محبت کا خون کرنا ہے۔ مرتے دم تک اپنے دل سے نہ بھلایا، اور اس اولین محبت کو فطرت کا ایک غیر فانی عطیہ تصور کرتی رہی!!

اُس نے ایک معمولی دنیا دار انسان کی طرح نہیں بلکہ اپنا مذہب سمجھ کر اپنے جان کر اپنے جانِ جاں کو محبت کی پرستش کی!!

وہ محبت کو اپنی زندگی کی حقیقی مسرت خیال کر کے اپنے یاس اور تیغ مستقبل کو بھلاتی رہی!!

اُس نے کبھی اس گمان کو اپنے دل میں جگہ نہ دی کہ محبت ناشکر گذار، بے رحم اور بے مروت بھی ہوتی ہے!! اُس نے اپنے عاشق کی سخت سے سخت لغزشوں کو بھی بھول جانے کی کوشش کی اور ساری عمر اسی خام امید میں جیتی رہی ؎

باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را!!

اس کا ذکر کرنا بھی ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کہ اُس مظلوم و بدنصیب راہبہ کی سچی اور پاکیزہ محبت کا ذرا سا احساس بھی کئے بغیر اس کے بے وفا عاشق نے فرانس کے ایک معزز اور متمول گھرانے کی لڑکی سے شادی بھی کر لی!! یہ کوئی نئی بات نہیں، ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ دنیا میں اس نوع کے قصوں کا فقدان نہیں!! ــــ آہ، سچی محبت کے لئے دنیا روتی بھی ہے، ــــ اور ساتھ ہی ساتھ اُس کا مذاق بھی کس خوبصورتی سے اڑاتی ہے!!!

کیا دنیا کی کوئی عورت سے فریب میری آنا کی محبت کا تلخ انجام

معلوم ہو۔ اپنی جنس کے چند بہ حمایت سے متاثر ہو کر مارکوئس ڈی شمایلی کے اس تصور کو کبھی معاف کر سکتی ہے؟

. . . . . .

ان محبت ناموں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک محبت کی راندی ہوئی خاتون کی لطیف نگارش کے مرہونِ منت ہیں، اور ایک یاس طرہ اور دل شکستہ روح کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں!!

ان محبت ناموں کا کوئی جملہ ایسا نہیں جس میں درد و الم کی چنگاریاں ملفوف نہ ہوں اور جسکے کا کوئی لفظ ایسا نہیں جو ایک رقت انگیز خلش اپنے اندر نہ لئے ہوئے ہو!! ہر اک محبت نامے سے گداز محبت کے انگارے اُبل رہے ہیں!! (ان محبت ناموں کی تعداد پانچ ہے)

سب سے آخری محبت نامہ اس مظلوم راہبہ کی بدنصیب محبت کا فیصلہ ہے مرگ ناکام!! اور اس بے رحمانہ فیصلے کا نتیجہ ہے جو اُسے اپنے بے وفا اور سفاک عاشق سے اپنی پر خلوص محبت کے عوض میں ملا۔

مترجم

پہلا خط!!

آہ، اے مظلوم میری آنا تو کتنی نادان رہی کہ اپنی محبت کی صلاحیت کو بھی نہ جان سکی اور آہ، اے بدقسمت انسان! تو نے خود بھی فریب کھایا اور مجھے بھی جھوٹی امیدوں کی دنیا سونپ دی۔

محبت کا وہ اولین معصوم جذبہ جو ہم دونوں کی مسرتوں کا ایک رنگین خواب تھا، اب اس میں ایک ابدی محرومی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ جدائی کے بے رحم لمحوں نے محبت کی دوامی بہار لوٹ لی۔

آہ! کیا یہ جدائی جس نے میری محبت کی دنیا کو پر یاس بنا دیا، اب مجھے تم سے کبھی نہ ملنے دے گی۔ کیا میں ان آنکھوں کا نظارہ اب نہ کر سکوں گی۔ جن کی حسین شعاعیں میری محبت کی آفرینش کا خلاق بنیں اور جن کی کیف آور مستیوں نے میری روح کو قرار و سکون کے ساتھ ہمکنار کیا۔

افسوس اُس دل میں جس سے کبھی میں تمہاری پرستش کیا کرتی تھی۔ اب سوائے نا امیدیوں اور حسرتوں کے کچھ نہ رہا۔ یہ معلوم کر کے کہ تم نے اب مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا رہنے کی قسم کھالی ہے، مجھ پر غم و اندوہ کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور میرے حواس کھوئے گئے ہیں۔ آہ تمہاری جدائی کا صدمہ میں زندہ رہ کر کیونکر برداشت کر سکوں گی!! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری آرزوؤں کو خاک میں ملانے والے صرف تم ہی ہو۔ میں نے پہلی بار دیکھتے ہی تمہیں اپنا سب کچھ دے دیا۔ اب بھی میں اپنی زندگی کی تمام رنگینیاں تم پر نثار کرنے کے لئے تیار ہوں۔

میں دن بھر تمہاری محبت کے خواب دیکھتی رہتی ہوں، اور روتی رہتی ہوں۔ میرے غمزدہ دل کی خاموش آہیں تمہیں تلاش کرنے جاتی ہیں۔ مگر تمہاری جانب سے ناکام ہو کر لوٹ آتی ہیں۔ میری سیہ بختی کی دلیل اس سے زیادہ اور یاس کن کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے مظلوم و ستم رسیدہ دل کو خود ہی کچلتی ہوں۔

بدنصیب میری آنا! آنسو نہ بہا، آہیں نہ بھر، ناحق اپنے دل کو غم سے پاش پاش نہ کر۔ تو جس محبوب کی جستجو میں پریشان ہو رہی ہے۔ وہ تجھے اب کبھی حاصل نہ ہو سکے گا۔ وہ تجھ سے جدا ہو کر سمندر کی انتہائی بھی پرے چلا گیا ہے۔ وہ فرانس کی بزمِ طرب میں مصروفِ عیش و نشاط ہے وہ تیرے خلوص، تیری محبت اور تیرے غموں سے بالکل بے پروا ہے۔ وہ تیری آہ و زاری کو بھولا ہوا ہے اُس کا دل تیرے معصومانہ اعترافِ محبت سے ہرگز ہرگز گداز نہ ہو سکے گا!!

مگر نہیں، میں تمہاری محبت کو اس قدر سنگدلی سے مجرم قرار نہیں دے سکتی۔ میں نے تم سے بے انصافی کی۔ تم بے قصور ہو، بے گناہ ہو، میں یہ کیسے مان لوں کہ تم نے مجھے بھلا دیا ہے۔ یہ صرف میرے دل کے شکوک ہیں اور اُن کی فریب کاریاں جن کی وجہ سے میں ناامید ہو رہی ہوں۔ آہ، میں اُن تکلیفوں اور کاوشوں کو جو تم نے میری محبت کو آسان بنانے میں برداشت کیں کیسے بھلا سکتی ہوں۔

تمہاری محبت کی سرگرمیوں اور خلوص نے ہی مجھے تنہا سا شیدا بنایا تھا، یقیناً یہ ناشکر گزاری ہو گی۔ اگر میں بھی تمہیں ان ہی صمیم جذبوں کے ساتھ نہ چاہوں جن سے تم نے میرے ساتھ محبت کی۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسے سحر کن لمحوں کی یاد گار اس قدر تلخ ہو؟ مگر گزشتہ لطف و نشاط کی ساعتیں مجھے جس دم یاد آتی ہیں میں بے قرار ہو جاتی ہوں۔

یقین جانو۔ کہ تمہارے پچھلے محبت نامے کو پڑھ کر جو صدمہ میرے

دل کو ہوا اور میرے ذہن کے ساتھ جو گزری وہ حالت نہایت روح فرسا اور ناقابل بیان ہے! جی چاہتا تھا کہ میں اپنے دل کی انتہا درجہ کی خستگی اور پائمالی کے ہمراہ تمہاری تلاش میں نکل پڑوں۔ مجھ پر یاس و نامیدی کے مجروح کن جذبات نے اتنا غلبہ ڈالا کہ میں قریباً تین گھنٹے تک بالکل بے ہوش پڑی رہی۔ کاش! میں اُس بے ہوشی اور بے حالی کی حالت میں ہی مر جاتی! اور اپنی اُس زندگی کی جسے ہر وقت تمہارے قدموں میں نچھاور کرنا چاہتی ہوں تمام خوشیوں کو تمہاری محبت کے غم میں کھو ڈالتی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجھے ہوش آیا میں نے اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دی کہ میں تمہاری محبت میں جان توڑ رہی تھی اور ساتھ ہی یہ جان کر مسرور بھی ہوئی کہ اب میرا دل تمہاری مفارقت کے غم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہا ہو جائے گا!!

بیداری الفت کے ابتدائی لمحات سے لے کر اب تک میں تمہاری جدائی کی تلخیوں میں تڑپ رہی ہوں اور جب تک تم مجھے نظر نہ آؤ گے یوں ہی تڑپتی رہوں۔

تمہاری فرقت کے غم میرے لئے مسرت کے پیغام ہیں کیونکہ وہ میری پُر یاس و حرماں خلوت میں تمہاری طرف سے دل خوش کن فتحے لاتے ہیں جن کی رنگینیوں میں میرا دل محبت کے سنہری خواب دیکھتا ہے!

آہ کیا میری پُر خلوص محبت کا انعام یہی ہے کہ میں تمہارے ہجر کے غموں سے ہی اپنے آپ کو خوش کرتی رہوں! مجھے تم سے کسی قسم کا صلہ نہیں چاہئے۔ کیونکہ میں نے اب عہد کر لیا ہے کہ میں دنیا میں تمہارے سوا اور کسی سے محبت نہ کروں گی! میں صرف تم کو ہی اپنی آرزوؤں کا مرکز بنانا چاہتی ہوں اور اپنی یہ ناکام زندگی تمہارے ہی لئے وقف کر چکی ہوں!!

کاش میں بھی یہ امید کر سکتی کہ تم بھی میرے سوا اور کسی کو پیار نہ کرو گے۔ کسی اور کو نہ چاہو گے! اگر میں پوچھتی ہوں۔ کیا تم میری محبت میں اتنے سرگرم اور ثابت قدم ہو سکتے کہ میں تمہیں یقین دلا دیتا میں مجھ سے جتنے تم کئی بار اپنی زبان سے محو خواب صورت کہہ چکے ہو زیادہ حسین و جمیل صورتیں مل جائیں گی۔ مگر محبت سے خالی۔ ۔ ۔ اور ظاہر ہے کہ محبت کے بغیر حسن کی لطافتیں کثیر بے رنگ و بے کیف ہیں!

خلوت میں اس قسم کی باتیں لکھ کر کہ میں تمہیں یاد کیا کروں۔ میرا دل نہ دکھاؤ۔ کیونکہ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ تم نے مجھے یہ امید دلائی ہے کہ تم مجھ سے ملنے کے لئے آؤ گے اور کچھ عرصہ میرے پاس رہو گے بھی کیا میں اس کا یقین کر لوں!!! میرے دل کی آرزو ہے کہ تم اپنی ساری کی ساری زندگی میرے پاس گزار دو۔ آہ اگر یہ ممکن ہو سکے کہ میں اس کمبخت معبد کو چھوڑ سکوں تو میں سرزمین پرتگال میں بیٹھ کر تمہارے عہد و پیمان کی تکمیل کی کبھی بھی منتظر نہ رہوں۔ اپنے انجام سے بے خبر ہو کر میں تمہاری جستجو میں چل پڑوں۔ تم چاہے کہیں بھی ہو میں تمہارا تعاقب کرتی رہوں اور تمہیں محبت کرتی جاؤں! مگر آہ! یہ تو سب دل کے بہلانے کی باتیں ہیں۔ ایسا کیوں ہونے لگا میری امیدیں کبھی بار آور نہ ہوں گی۔ مجھے فطرت نے صرف غم جھیلنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے خوشیوں کے لئے نہیں اتنا غنیمت ہے کہ میرے بھائی کی وساطت سے مجھے یہ موقعہ ملا کہ میں تمہاری طرف کچھ لکھ کر بھیج سکوں۔ اس خیال نے میرے غم کے بار کو کچھ نہ کچھ ہلکا کر دیا اور عارضی طور پر کچھ لمحوں کے لئے میں اپنے غم کو بھولی بھی رہی!

میں تمہیں قسم دلا کر پوچھتی ہوں کہ جب تم جانتے تھے کہ میرا ساتھ نہ نبھا سکو گے تو تم نے مجھے اس قدر رجھانے اور اتنا لبھانے کی کوششیں کیوں کیں۔ اور مجھ تک بے رحمی سے تباہ و برباد کیوں کیا تم نے میرا رہا سہا نہ سکون مجھ سے کیوں چھینا! میری روح کا اطمینان کیوں لوٹا! کیا میں نے کبھی تمہیں کوئی تکلیف دی تھی!!!

مگر آہ، مجھے معاف کر دو میں تمہیں کوئی الزام دینا نہیں چاہتی میں نے تم سے انتقام نہیں لینا میں اس معاملے میں صرف اپنی روسیاہ قسمت کو ہی سزاوار ٹھیراتی ہوں اس ظلم پیشہ ساحرہ نے ہی ہمیں ایک دوسرے سے جدا کیا۔ اس نے ہماری مسرتوں کو تاراج کیا۔ اس نے ہماری محبت کو مجروح اور پائمال کیا!!

خیر قسمت خواہ کیسی ہی سخت گیری سے ہم پر ظالم ڈھائے۔ ہمارے دل کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ محبت نے جو ہر طرح قسمت سے زیادہ پائیدار ہے۔ ہمارے دلوں کو زندگی بھر کے لئے ایک کر دیا ہے

اگر تمہیں بھی مجھ سے کچھ محبت ہے تو مجھے خط کے ذریعے ہی کبھی کبھی یاد کر لیا کرو۔ کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں بھی تم سے اپنے دل کا حال پوچھا کروں اور کم از کم تمہارے ماحول کی سرگرمیوں سے ہی آگاہ ہوتی رہوں!

اچھا اب ان باتوں کو چھوڑو اور سب سے پہلے مجھے بتاؤ کہ تم مجھے ملنے کے لئے کب آ رہے ہو؟ جی نہیں چاہتا کہ اس کاغذ کے پرزے کو ہاتھوں سے چھوڑوں۔ اس لئے کہ اس نے تمہارے ہاتھوں کو چھونا ہے۔ کاش مجھے بھی ایسی خوش قسمتی حاصل ہوتی!

دیکھا! اتنی احمق ہوں میں! جب کہ مجھے اس کا خوب علم ہے کہ میرے ایسے نصیب کہاں! الوداع ۔ ۔ ۔ اب مجھ سے کچھ نہیں لکھا جاتا سوائے اس کے کہ تم مجھے اپنی نہ بھولنے والی محبت سے ہمیشہ چاہتے رہو! اور میرے مظلوم دل کی تڑپ کو بڑھاتے رہو!!!

عظیم قریشی

اعتماد

مضحکہ خیز نظر آتی ہے یہ بات مجھے
کیا جوانی کی روایات سے آگاہ نہیں
کہ بلند عرش سے جرأت کا علَم رکھتے ہیں
اس پہ حیراں ہوں کہ ہے برق کوئی ایسی بھی
کہ مری راہ میں ڈٹ جائے جگر داری سے
کوئی بپھرا ہوا طوفان ہے ایسا بھی مگر
کارواں مست جوانی کا جدھر جاتا ہے
یہ چٹانوں کو اُلٹتے ہوئے دریا کیا ہیں
جس کو چھو جائے تنفّس بھی، وہ مر جاتا ہے
گردشِ شام و سحر حکم پہ سر دھنتی ہے
اہرمن سجدۂ تعظیم بجا لاتا ہے!

کر رہے ہیں ہدفِ یورشِ آفات مجھے
یہ ستمگر مگر اس بات سے آگاہ نہیں
سینۂ مہر پہ ہم لوگ قدم رکھتے ہیں!
جس کی فطرت میں ہو شوریدہ سری ایسی بھی
موت سے آ کے لپٹ جائے جگر داری سے
جس کا دم توڑ کے رکھ دے نہ مرے غیض کا ڈر
زلزلے ڈال کے ہر سمت گزر جاتا ہے
آندھیاں کیا ہیں، دہکتے ہوئے صحرا کیا ہیں
موت کے دیو کا چہرہ بھی اتر جاتا ہے
بات جو کہتے ہیں فطرت اُسے خود سنتی ہے

ہم جہاں جاتے ہیں ہمراہ خدا جاتا ہے

عدمؔ

دنیائے ادب

شہر قدیم پومپیائی

دنیا میں بعض ایسے نفائس موجود ہیں کہ ان کا تعلق کسی خاص قطعہ یا ملک سے نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتاً وہ تمام اہل دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور جس شخص کو کچھ بھی علم یا آرٹ سے مس ہو، وہ ان کے خراب یا معدوم ہونے سے افسوس ظاہر کرتا ہے اور ان کے دیکھنے یا کم از کم ان کا حال نہایت شرح وبسط کے ساتھ سننے سے خوشی محسوس کرتا ہے۔ آج ہم ناظرین کو اٹلی کے ایک قدیم تاریخی شہر کی سیر کرائیں گے۔ اس شہر کا نام پومپیائی ہے، جو تقریباً سترہ سو برس خاک کے نیچے دبا رہا ہے۔ اس کے تمام ظاہری آثار مٹ گئے تھے کہ اتفاق سے زمین کے نیچے سے اس کے چند نشانات ظاہر ہوئے اور اس طرح دنیا کو اس شہر کا حال معلوم ہوا۔

پومپیائی دولاوت مسیح کے اوائل میں ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا اور اٹلی کے مغربی ساحل پر کوہ ویسیویس کے جنوبی دامن میں مشہور شہر نیپل سے چار پانچ میل مشرق کی جانب واقع تھا۔ سلطنت روما کے اشراف واعیان گرمی کا موسم اسی مقام پر گزارتے تھے۔ اس شہر کی آبادی بیس ہزار نفوس تھی۔ لوگ آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے اور اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ اس پر نشاط وادی کے نیچے شرر بار آگ مشتعل زن ہے اور کسی دن سخت پتھروں کو پھاڑ کر آتش باری شروع کر دے گی۔ جدید کشفیات علمی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوہ ویسیویس نہایت قدیم زمانے میں آتش فشاں رہا ہے۔ لیکن اس زمانے میں جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں نہایت سرسبز اور دلکش پہاڑ تھا۔ اس کے جاں بخش اور روح افزا مناظر دور دور سے لوگوں کو کھینچ لاتے تھے۔ لیکن آتش فشانی کے کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے تھے۔ چنانچہ جغرافیائے عمومی میں لکھا ہے کہ اس پہاڑ کے سرسبز دامن میں مغربی جانب ایک دریا بہتا تھا پہاڑ کی چوٹی تک تمام زمین مزدرد تھی اور کسی شخص کو بھی یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ اس سرسبز اور پھولوں سے پُر سرزمین کے تکمہ میں آگ محو آسودہ ہے۔

۲۴ اگست ۷۹ء کی رات کو اچانک پہاڑ آتش فشاں ہوا۔ کوہ آتش فشاں جس کو یورپین زبانوں میں والکان[1] کہتے ہیں کی شکل ایک مخروطی مینار کی مانند ہوتی ہے۔ اس کی چوٹی سے ہمیشہ دھواں اور نجایات خارج ہوتے رہتے ہیں اور کبھی اس طرح ہیجان میں آتا ہے کہ ابلتا ہوا پانی، پتھر اور دوسرے پگھلے ہوئے مادے نہایت شدت سے اس میں سے نکلتے ہیں اور بعض اس قسم کے پہاڑ ہیں کہ ہمیشہ حالت ہیجان میں رہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں بہت سے پہاڑ آتش فشاں تھے۔ جو اب خاموش اور جامد ہو گئے ہیں۔ ان میں سے دکن کی سطح مرتفع بھی ہے۔ جو گزشتہ زمانے میں آتش فشاں تھی اور اب بالکل خاموش ہے۔ اس وقت بھی روئے زمین پر تقریباً ۱۳۲۰ آتش فشاں پہاڑ موجود ہیں۔ ان میں سے ۲۷۰ زیادہ اہم ہیں۔ ۴۰۰ سے بھی زیادہ ہیں کہ اس وقت خاموش ہو گئے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہیجان میں آنے سے پہلے ان سے بعض علامات ظاہر ہوتی ہیں اور دوسری یہ کہ یکبارگی قسم کی علامات پیشیں کے ناگہانی طور پر آتش فشانی شروع کر دیتے ہیں جو علامات قسم اوّل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ زیادہ تر بادل کی گرج کی مانند آوازیں ہوتی ہیں، جو اندرون زمین سے سنی جاتی ہیں یا قرب وجوار کی زمین میں زلزلہ آتا ہے اور ہوا اتنی ساکن ہو جاتی ہے کہ سانس لینا بھی دشوار ہوتا ہے۔ چشمے خشک ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد اس قدر بلند آواز اور تیزی سے آتش فشانی شروع ہوتی ہے جیسے یک دم کئی توپیں داغی جائیں۔ اس وقت اس کے دہانے سے

---

[1] والکان مفرد والکانوس سے جو آتش فشاں پہاڑ کے دیوتا کا نام ہے ماخوذ ہے اور قدیم یونانی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس دیوتا نے اپنی دھونکنی اور بھٹی کو اس پہاڑ کے نیچے رکھا ہوا ہے اور اسے دھونکتا ہے جس کی وجہ سے یہ آتش فشانی ہوتی ہے۔

بخارات اور لطیف و کثیف دھواں باہر نکلتا ہے۔ بجلی کڑکتی ہے اور زمین کا مواد لاوے کی صورت میں بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ باہر گرتا ہے۔ آخر کار مواد ذائقہ پگھلے ہوئے لوہے کی مانند ہوا میں ایک فوارے کی شکل میں اچھلتا ہے اور زمین پر بہہ نکلتا ہے۔ اس ہیجان کے کچھ عرصہ بعد پہاڑ میں سکون ہو جاتا ہے لیکن پھر جلد ہی اسی طرح پہاڑ کے دانے سے دھواں اور بخارات بلند ہوتے ہیں اور دوسرے ہیجان تک بلند ہوتے رہتے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑوں کی قوت اور مادے کی مقدار حیران کن کے تسلیم کرنے میں تامل ہوگا۔ چنانچہ جزیرہ سسلی میں جو پہاڑ اٹنا ہے وہ جب ہیجان میں آیا تو ایک ہی آتش فشانی میں اس نے قریباً تین ہزار مکعب میٹر مواد آتشیں باہر نکال پھینکا اور اسی کوڈیسیو دیس سے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں ایک موقع پر اتنا لاوا نکلا کہ جب وہ منجمد ہو گیا تو اس کا حجم تقریباً ساڑھے تین ہزار مکعب میٹر تھا۔ اور یہاں تک کہ ایک دوسرے ہیجان میں مادہ ۱۴ ہزار مکعب میٹر تک پہنچ گیا اور اسی طرح جزیرہ آئیسلانڈ میں ایک پہاڑ سے ۱۷۸۳ء میں لاوے کے دو بڑے بڑے آتشیں دریا جاری ہوئے۔ ان میں سے ایک کا طول سات کوس اور عرض دو کوس اور دوسرے کا طول بارہ کوس اور عرض چار کوس تھا۔ ان کی گہرائی بیابانوں میں تین گز اور دروں میں قریباً بیس گز تھی اور کبھی کبھی بڑی بڑی چٹانیں اور پتھر کہ ان میں سے ایک ایک کا وزن بیس بیس من تھا، دو تین میل کے فاصلے پر پڑے ملے۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ کوہ ویسیو دیس نے بڑے بڑے پتھروں کو ہوا میں ۱۲۰۰ گز کی بلندی تک پھینکا ہے۔

شہر پمپیائی جس کا ہم ذکر کر رہے تھے جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے۔ میلاد مسیح کے اوائل میں بہت عمدہ اور صاف شہر تھا۔ ہر طرف سے روم کے اعیان و اشراف تفریح اور عیش و مسرت کے لئے یہاں آتے تھے۔ چنانچہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ ۵۹ء میں یعنی اس شہر کے برباد ہونے سے بیس سال پہلے اس کے ایک تماشہ خانہ میں شہریوں اور ان تماشائیوں میں جو کہ اطراف شہر سے تماشہ دیکھنے کے لئے آتے تھے ایک جھگڑا پیدا ہو گیا۔ طرفین کے بہت سے آدمی مجروح ہوئے اور مارے گئے۔ حکومت روم نے اہل شہر کی تنبیہ کے لئے حکم دے دیا کہ شہر مذکور میں دس سال تک کوئی کھیل یا تماشہ نہ دکھایا جائے۔ آج جبکہ شہر کے کھنڈرات خاک اور خاکستر کے نیچے سے کھودے گئے ہیں تو ایک مکان کی دیوار پر اس جھگڑے اور پکڑ دھکڑ کی تصویر منقوش ملی جو نہایت صاف دکھائی دیتی ہے۔

۶۳ء میں اس شہر میں ایک سخت زلزلہ آیا جس سے بہت سی عمارات اور مکانات منہدم ہو گئے اور لوگ اس ناگہانی قہر خدا سے اس قدر خوفزدہ اور سراسیمہ ہوئے کہ روم کی مجلس اعیان (سنا) نے مکانات کی دوبارہ تعمیر و ترمیم روک دی۔ لیکن شہر والوں نے آہستہ آہستہ اجازت حاصل کر لی اور جیسا کہ موجودہ کھنڈرات سے نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ انہوں نے ویران شدہ عمارات کو تعمیر کرنے کا کام ابھی شروع کیا ہی تھا کہ ناگہاں ۲۴ اگست ۷۹ء کی رات کو کوہ ویسیو دیس نے آتش فشانی کا آغاز کیا اور پمپیائی کو دو اور قریب کے شہروں کے ساتھ جن کا نام ہرکولانیم اور استابی تھا نہایت قلیل مدت میں مکمل طور پر منہدم اور ویران کر دیا اور مٹی، راکھ اور مادے کے بلند طبقات کے نیچے پنہاں کر دیا۔

اس وحشتناک واقعے کی تفصیل یوں ہے کہ مذکورہ رات کو پہاڑ کی چوٹی سے دھواں نکلنا شروع ہوا۔ کبھی روشنی ہو جاتی تھی اور کبھی تاریکی خاک اور پگھلا ہوا مادہ اس سے بلند ہوتا تھا اور ریت اور بڑے بڑے پتھروں کی بارش برستی تھی جس نے شہر کو ایک گز کی گہرائی تک ڈھانپ لیا۔ بہت سے اہالیان شہر اسی ہنگامے میں ہلاک ہو گئے اور بعض جو بھاگ نکلے انہیں موت نے راستے ہی میں جا لیا۔ بعض ایسے جسم خاک کے نیچے سے برآمد ہوئے ہیں جو اسی بھاگنے کی حالت میں ہاتھ میں نقدی کی تھیلیاں لئے صدیوں مٹی کے نیچے دبے رہے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی حالت فرار میں پنجۂ اجل میں گرفتار ہو گئے۔ غرضیکہ اس قدر پگھلا ہوا مادہ، مٹی، راکھ اور ابلتا ہوا پانی شہر پر گرا کہ ان کے طبقات کی گہرائی سات گز تک پہنچ گئی اور شہر مکمل طور پر اس میں چھپ گیا اور روئے زمین سے ایک عرصے کے لئے مفقود ہو گیا۔ ہرکولانیم میں بھی اس مادے کی گہرائی تین گز سے زیادہ تھی۔

کوہ ویسیو دیس کی آتش فشانی کی تفصیل پلینیوس خورد مشہور رومی ناثر نے اپنے دو خطوط میں جو اس نے اسی زمانے میں اپنے دوست اور مشہور رومی مورخ ٹاسیت کو لکھے تھے خوب وضاحت سے قلمبند کی ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ باوجودیکہ اس کا چچا پلینیوس قدیم اس موقع پر شہر مزکور کے نزدیک ایک بندرگاہ میں ایک جہاز کے امیر البحر کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا تھا اور ان تینوں شہروں میں سے وہ استابی شہر کے باشندوں کو بچانے کے لئے نہایت سرعت سے وہاں گیا تھا اور

اسی کوشش میں گندے بخارات کے اثر سے خود بھی مسموم ہو گیا تھا۔
جب وہ کوہ ویسیوس کی آتش فشانی کا ذکر کرتا ہے تو پومپیائی، ہرکولانیم اور اسٹابی کے متعلق ایک کلمہ بھی نہیں لکھتا، لیکن ایک دوسرے یونانی مورخ نے جس کا نام دیوں کاسیوس تھا۔ اپنی مشہور تاریخ روم میں ان شہروں کی بربادی کا حال بھی لکھا ہے۔ یہ مورخ تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں ہوا ہے۔ اس کی تفصیلات بہت دلچسپ ہیں۔

اس واقعے کے پندرہ سو برس گزر جانے کے بعد جب یہ ہولناک سانحہ لوگوں کے دلوں سے مکمل طور پر فراموش ہو چکا تھا۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں اتفاقاً ایک مکان کی بنیاد کھودتے ہوئے دو کتبے برآمد ہوئے۔ لیکن یہ کتبے لوگوں کی توجہ اچھی طرح اپنی طرف منعطف نہ کرا سکے اور کسی نے انہیں کوئی وقعت نہ دی۔ ۱۰۴۸ھ میں ایک کنواں کھودنے کے موقع پر پومپیائی کا اصلی مرکز معلوم ہو گیا۔ لیکن اس کے کھودنے کے لئے جو قدم اٹھایا گیا وہ ۱۱۶۱ھ میں تھا۔ لیکن پھر بھی کام کسی اصول یا نقشہ کے مطابق نہ تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت میں کھدائی ۱۱۷۳ھ میں شروع ہوئی۔ ۱۱۷۶ھ سے ایک منظم اسی آدمیوں پر مشتمل عملہ سمجھ دار اور قابل آثار قدیمہ کے ماہروں کے تحت نظر کھدائی میں مشغول ہے۔ اس وقت تک انہوں نے شہر کا ۳/۴ حصہ خاک کے نیچے سے کھود دیا ہے۔ سب سے پہلے جو چیزیں برآمد ہوئیں۔ ان میں سے قابل ذکر چار ڈھانچے ہیں جو اسی حالت میں بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے اس وقت تک پڑے ہوئے تھے اور اب انہیں ناپل کے عجائب گھر میں رکھا گیا ہے۔ ان چار ڈھانچوں میں سے ایک عورت کا ڈھانچہ ہے، جس کے پہلو میں اس وقت کے ۹۱ مختلف سکے، دو چاندی کے پیالے، ایک چاقو کا پھل اور جواہرات پائے گئے تھے اور ظاہری طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انہیں اٹھایا ہوا تھا تاکہ انہیں لے کر بھاگ جائے اور اسی حالت میں ہلاک ہو گئی۔

یہ عورت ڈھانچوں کے بائیں طرف پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر نقاب اور انگلیوں میں دو انگوٹھیاں تھیں۔ اس کے پہلو میں ایک اور عورت، ایک لڑکی اور ایک مرد پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد تدریجاً اور بہت سے انسانی جسم برآمد ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے آثار قدیمہ مجسموں، ستونوں، عمارات، محلات، عام مکانات، عبادت گاہوں، سیدلوں، حماموں اور دکانوں کی صورت میں کھود دے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سی ایسی چیزیں جنہیں حمل و نقل کیا جا سکتا ہے اب ناپل کے عجائب گھر میں پڑی ہیں۔

پومپیائی شہر کی سڑکیں اور گلیاں عموماً سیدھی اور مستقیم ہیں اور ان میں اور بہت سے پرانے شہروں کی گلیوں کی طرح کوئی پیچ و خم نہیں۔ ... ان کی چوڑائی ۴ سے ۹ فٹ تک ہے اور ان پر پتھر کا فرش لگا ہوا ہے پیدل چلنے والوں کے لئے الگ پٹڑیاں بنی ہوئی ہیں جو سڑک کی سطح سے قدرے اونچی ہیں اور چوڑائی میں دو فٹ سے زیادہ نہیں۔

ارکان سلطنت میں سے قابل ذکر وہ محل ہے جس کا نام ہے، کازدال فونز کا محل، اس کی دیواروں کی منڈیر پر نہایت عمدہ خاتم کاری سے بہت دلکش تصویریں منقش کی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور تصویر ہے جو سکندر اعظم اور دارائے سوم بادشاہ ایران کی جنگ کا نقشہ ظاہر کرتی ہے اس تصویر کا انکشاف ۱۲۴۷ھ میں ہوا اور تاریخی و علمی لحاظ سے بہت گراں بہا ہے۔ کیونکہ غالب ہے کہ یہ تصویر یا تو خود سکندر کے عہد میں یا اس سے کچھ عرصہ بعد کندہ کی گئی ہے۔ اس تصویر کی تمام جزئیات لباس، مگرڑوں کے ساز و سامان، اسباب جنگ اور ہتھیاروں کی حیثیت سے بالکل واقعہ کے مطابق ہیں، اس تصویر کے بائیں طرف سکندر کے رو در رو دارا سوم بادشاہ ایران ایک جنگی رتھ پر بیٹھا ہے۔ اس کے ارد گرد ایرانی لشکر ہے جو سکندر کے لشکر کے ہجوم کرنے کی وجہ سے بھاگ رہا ہے۔ دارا کے پیچھے ایک سوار دوڑتا گھوڑا ہاتھ میں اٹھائے کھڑا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ خاتم کاری کا یہی حصہ خاص طور پر شکستہ ہے جس کی وجہ سے جھنڈا اچھی طرح ظاہر نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جھنڈے کا بالائی حصہ اور نیزے کی نوک جس سے جھنڈا بندھا ہوا ہے اور اسی طرح وہ حصہ جہاں سجاوٹ کے لئے رنگا رنگ کی جھنڈیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ خوب نمایاں ہیں۔

لارڈ لٹن مشہور انگریزی ناول نگار نے ایک ناول "لاسٹ ڈیز آف پومپی آئی" کے نام سے لکھا ہے۔ یہ ناول پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ مصنف مذکور نے نہایت محنت اور کوشش سے معلومات تاریخی اور کشفیات تازہ کو جمع کر کے اس زمانے کی جبات اجتماعی کو مجسم کرنے کی سعی کی ہے اور حقیقت میں اس نے اپنے کام کی ذمہ داری کو پورا پورا ادا کیا ہے۔

(ترجمہ)

"شاہکار"

عبدالرشید صدیقی

غزل

غم دینے والا شاد رہے پہلو میں ہو غم ہی سہی
لب اُن کے تبسم ریز رہیں آنکھیں میری پُرنم ہی سہی

گر جذبِ عشق سلامت ہے یہ فرق بھی مٹنے والا ہے
وہ حسن کی اک دنیا ہی سہی میں حیرت کا عالم ہی سہی

ان مست نگاہوں کے آگے پینے کا ذکر نہ کر ساقی
میخانہ ترا جنّت ہی سہی پیمانہ جامِ جم ہی سہی

ملتا نہیں جب مونس کوئی اس وقت یہی یاد آتا ہے
اپنا دل پھر بھی اپنا ہے خو کہ وہ ذوقِ رم ہی سہی

جب دونوں کا انجام آگ پھر چون و چرا سے کیا حاصل؟
تدبیر کا میں قائل ہی سہی تقدیر کا تو محرم ہی سہی

بندوں کے ڈر سے تجھے پوجوں؟ میں ایسی ریا سے باز آیا
دل میں ہے خوف ترا یا رب! سر پائے صنم پر خم ہی سہی

آغازِ محبت دیکھ لیا، انجامِ محبت کیا ہوگا!
قسمت میں حفیظ بیکس کی آوارگیِ پیہم ہی سہی

ہمایوں" حفیظ ہوشیارپوری

پیامِ بہار

زمیں اُگل دے گی گنجِ پنہاں جہاں میں دورِ بہار ہوگا
کلی کلی عطر بیز ہوگی چمن سراپا نگار ہوگا

فلک پہ چھا جائیگی گھٹائیں چلیں گی فردوس کی ہوائیں
شجر شجر جھومنے لگے گا چمن چمن بادہ خوار ہوگا

فلک نے بنیاد ڈال دی ہے جہاں میں اک باغ دلکشا کی
کسے یہ معلوم ہے کہ کس کس کا خون صرفِ بہار ہوگا

تلاش منزل کو آپ ہوگی ہمارے گم گشتہ کارواں کی
نہ دورِ گردوں خلاف ہوگا نہ بخت ناسازگار ہوگا

کسی کا قصرِ بلند مٹ کر بنے گا کیونکر غبارِ رہ میں
اسے وہ دانا سمجھ سکے گا جو چرخ کا رازدار ہوگا

عجب ادا سے مرے سرہانے کھڑی ہیں مینا بدوش حوریں
زباں سے کہتی ہیں یا الٰہی یہ مست کب ہوشیار ہوگا

فرات پر کل تری رضا میں جو تشنہ لب سر کٹا دیا ہے
تو آج بھی تیرے آستاں پر نثار یہ جاں نثار ہوگا

غمِ محبت میں میرے دل کو ہر اک تڑپ میں نیا مزا ہے
خود اس کی چارہ گری کرو گے تو اور بھی بے قرار ہوگا

نوائے شیریں میں دے ہی دیں گے نظیر دو گز زمیں مجھے بھی
اُسی چمن کا ہزار ہوں میں اُسی چمن میں مزار ہوگا

"انقلاب" نظیر لودھیانوی

مظلوم بچّہ

بحسرت مالکہ کے حکم سے اک ناتواں بچہ
جھکا میداں میں جھاڑو دے رہا ہے یکّہ و تنہا
سحر کا وقت ہے، شادابیاں ہیں نرم جھونکوں میں
گلی سے آرہی ہیں کھیل کی مخلوط آوازیں
پیاپے کھیل کا میدان جب آواز دیتا ہے
ذرا سا سر اٹھا کر مالکہ کو دیکھ لیتا ہے
صدائیں کھیل کی آآ کے جب اوسان کھوتی ہیں
اسے اپنے جگر پر ٹھوکریں محسوس ہوتی ہیں
تقاضا کم سنی کا دل میں جب دھومیں مچاتا ہے
لرز اٹھتا ہے گردن موڑتا ہے، سر کھجاتا ہے
دما دم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے
رُخِ طفلی پر اک بیچارگی سی دوڑ جاتی ہے
غریب افلاس! تجھ کو دھیان میں لاتی نہیں دنیا
ترے معصوم بچوں تک کو بہلاتی نہیں دنیا

"کلیم"

جوشؔ

عام پسند مغالطے

(۱) ہم میں سے کتنے ہیں جو اُن امور میں اپنی واقفیت کا دعویٰ کرتے ہیں جن سے وہ بالکل ناواقف نہیں اور کتنے ہیں جو ان امور میں اپنی عدم واقفیت کا اظہار کرتے ہیں، جن سے وہ واقف ہیں۔

(۲) ہم اچھوں کا روپ بھر کر سامنے آتے ہیں اور ہماری ذات میں لے دے کے صرف اتنی ہی خوبی پائی جاتی ہے کہ ہمارا ظاہر بہت خوشنما ہوتا ہے۔

ہم اب اس نقطۂ زوال تک آپہنچے ہیں کہ صرف شکل و شمائل کی تو عزت کر سکتے ہیں لیکن معنوی و حقیقی محاسن تک ہماری نظر نہیں پہنچتی۔ کیا ظاہر کو ابھارنے اور باطن کو چھپانے کا فن ہم ابھی طرح حاصل نہیں کر چکے ہیں؟ کیا ہم پُر عیب نہیں ہیں، اور ہم نے اُسی کے ساتھ ساتھ ہنر نہیں سیکھا ہے؟ کیونکہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ کہ عیب کے چھپانے کے لئے بھی ہنر کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۳) ریاکاری غالباً اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ نسل انسانی اور سب سے پہلے ریاکار کو اس فن کی باریکیوں میں کمال حاصل ہونا چاہئے۔ یہ پہلا ریاکار کون تھا؟ اور وہ کیوں ریاکار تھا؟

(۴) انسان اپنی زندگی کے چند ابتدائی سال گویائی حاصل کرنے میں صرف کر دیتا ہے اور اس کے بعد کیا وہ اپنی تمام بقیہ زندگی کے ماہ و سال اس سعی میں صرف نہیں کر دیتا کہ وہ کیونکر خاموش رہے۔

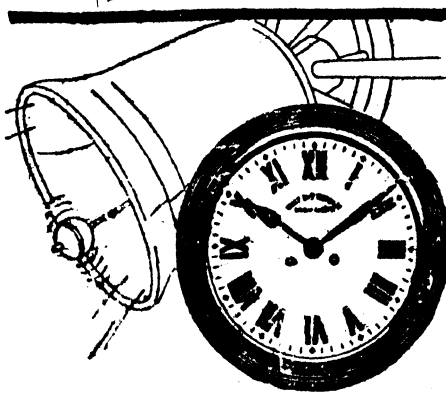
(۵) انسان عملی زندگی میں اپنے قائل کئے جانے پر صرف ناک بھوں ہی نہیں چڑھاتا بلکہ جو شخص اُسے قائل کر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے، وہ اُس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح نظری طور پر کیا یہ ایک اچھا مشغلہ نہیں ہے کہ کسی جاہل انسان کے قائل کرنے کی سعی کی جائے؟

(۶) چند افراد ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ دراصل انہیں کس چیز کی ضرورت ہے، اور وہ چیز انہیں مل جاتی ہے بعض یہ جانتے ہوئے بھی کہ انہیں کس چیز کی ضرورت ہے، اس چیز کو حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا ایسے بھی لاتعداد انسان موجود نہیں ہیں جو درحقیقت یہ جانتے ہی نہیں کہ انہیں اصل میں کس چیز کی ضرورت ہے، اور ہمیشہ اس چیز سے محروم رہتے ہیں؟

(۷) کیا یہ ہر شخص کے لئے طے کرنے کی بات نہیں ہے کہ آیا اُس پتھر کو جو اُس کی راہ میں حائل ہے، سنگِ راہ کی صورت میں وہیں پڑا رہنے دیا جائے یا اُسے تراش کر زینے میں تبدیل کر لینا چاہئے!

(۸) جب کوئی غیر متوقع اور خلافِ امید امر پیش آجائے تو اُس سے ایسا ہی سلوک کیوں نہ کرو گویا وہ سر بسر حسبِ توقع اور حسبِ امید واقع ہوا ہے؟

"کلیم"



ویسٹ اینڈ کا زیادہ خوبیوں والا دیوار کلاک

بہت سے دفتروں کو جہاں وقت کے صحیح ہونے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے ویسٹ اینڈ کا تحفہ گرانی زیبت بخشتا ہے۔ ڈیکوریٹر، ریلوے کلبوں اور دوسری ایسی ہی جگہوں پر اس کی مقبولیت بے حد ہے۔ اپنی بہتر قسم کی ساخت کی وجہ سے شاگارد بازار کے دوسرے گھڑیال کاموں سے بدرجہا بہتر ہے اور موجودہ تخفیف شدہ قیمتوں پر خریدنا بھی چیز خریدنے والوں کے لئے بہت اچھا سودا ہے۔

دی سگاگو

آٹھ دن کی چابی۔ گھنٹے اور آدھ گھنٹے کا اعلان کرنے والا

مبلغ چھتیس روپے

مفصل فہرست درخواست آنے پر بطور ارسال ہوگی

ویسٹ اینڈ واچ کمپنی۔ بمبئی و کلکتہ

WEST END WATCH Co
BOMBAY CALCUTTA

نقد و نظر

انقلاب روس

مصنفہ جناب کشن پرشاد صاحب کول، ممبر سروس آف انڈیا، سوسائٹی مکتبہ صفحہ ہستی پر سیکڑوں نہیں ہزاروں ہی انقلاب آئے ہوں گے اور فرزند آدم پر لاکھوں مرتبہ مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے ہوں گے۔ ہماری موجودہ تاریخ نے بیسیوں سلطنتوں کو تاخت و تاراج ہوتے دیکھا ہے لیکن جو نقشہ انقلاب روس نے پیش کیا ہے اس کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

یہ انقلاب سابقہ حکومت اور تخت و تاج پر ہی نہیں آیا بلکہ اس نے نہ صرف حکومت اور طرز حکومت کو، اور افراد اور ان کی قسمت کو منقلب کر دیا ہے بلکہ خیالات کی ذہنیت، مذہب اور معاشرت کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

فاضل مصنف نے کتاب کو پانچ مبسوط حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

حصہ اول میں روس کے ابتدائی حالات، جنگ عظیم اور زمانۂ ما بعد جنگ تک کے تاریخی حالات درج ہیں۔

حصہ دوم میں سوشلزم کے نشو و نما، ہنگامۂ انقلاب اور اس کے اسباب و علل پر بحث کی گئی ہے۔

حصہ سوم، دستور حکومت اور آئین و قوانین کے متعلق ہے۔

حصہ چہارم، ملکیت اور صنعت و حرفت، زراعت اور کوآپریشن کی تفاصیل پر منطبق ہے

حصہ پنجم میں تعلیم، مذہب اور طرز معاشرت پر بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تدوین و تالیف میں کافی تحقیق سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود پیرایۂ بیان اس قدر دلآویز ہے کہ کسی دلچسپ افسانے کا شبہ ہوتا ہے۔

کتاب عربی ٹائپ کے حروف میں شائع ہوئی ہے اور بڑے سائز کے ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے مجلد تین روپے۔ ہندوستانی اکیڈیمی، الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

تمدن عتیق

مصنفہ جناب ابو ظفر عبدالواحد صاحب ایم اے و جناب عبدالرحمٰن صاحب بی۔ اے۔ سٹی کالج، حیدرآباد دکن۔

فاضل مؤلفین نے سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں کرۂ ارض کے معرض وجود میں آنے اور اس پر زندگی کے ادوار سے لے کر حضرت انسان کے ورود اور اس کے معاشری اور تمدنی ارتقا پر بحث کی ہے اگرچہ جو تاریخ مستنبط کئے گئے ہیں انہیں قطعی اور آخری نہیں کہا جا سکتا لیکن فرسودہ توہمات اور قیاسات کے مقابلے میں ان کی دلائل واقعات اور شواہد کی استوار بنیادوں پر قائم ہیں۔ انداز بیان شستہ اور عام فہم ہے۔

کتاب ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے قیمت بے تصویر ایڈیشن دو روپے باتصویر ایڈیشن تین روپے۔ مصنفین سے براہ راست طلب فرمائیے۔

عجائبات سائنس

مصنفہ ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ٹیکنیکل سکول، لاہور

مادہ، توانائی اور سائنس کے دیگر نظریوں پر عام فہم زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب علمی نقطۂ نظر سے اچھی ہے اور ان لوگوں کے معلومات میں جو انگریزی سے بے بہرہ ہیں اس صنف میں گانی اضافہ کر سکتی ہے۔ بعض جگہ نقشے اور تصاویر سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۲۰×۳۰/۱۶ سائز کے ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت بلا جلد بارہ آنے ۱۲ مجلد ایک روپیہ

ڈاکٹر صاحب موصوف سے براہ راست طلب فرمائیے۔

(ادارہ)

ڈاک کے ڈاکو ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور ہمیں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا حالانکہ اچھا پرچہ اور پھر خریدار کو نہ بھیجنا پاگل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ دفتر ایسا نہیں کرتا۔ ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۱ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ اگر بیس تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھئے کہ محکمہ ڈاک کے ڈاکو کی قدر ہوا۔ پس ایک شکایتی کارڈ اپنے علاقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک سے دوبارہ رجسٹرڈ تک دی جائے (مدیر)

فہرستِ مضامینِ ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ — تصویر: منصور احمد — نمبر ۵

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	آہ منصور	صلاح الدین احمد	۴۸۶
۲	نوحۂ منصور	جناب علامہ پروفیسر تاثیر کیفی دہلوی	۴۸۷
۳	آئینۂ عالم	ادارہ	۴۸۸
	افسانے و ڈرامے		
۳	بے چارہ	جناب اقبال صاحب	۵۱۵
۴	یا دالیٹے کہ	جناب خلیل احمد صاحب	۵۱۱
۵	اڈیٹر	جناب غلام عباس صاحب مولوی	۵۰۷
۶	اجنبی	جناب منظر حسن صاحب	۵۰۳
۷	سرخ دھاگا	جناب قیوم نظر بی اے	۵۲۹
	علمی و ادبی مضامین		
۸	ہماری زبان کا نام	مولانا سید سلیمان ندوی	۴۹۳
۹	سررشتۂ تالیف و ترجمہ عثمانیہ	حضرت مکین کاظمی بی اے	۵۲۳
۱۰	کائنات میں تنظیم	جناب عبدالعزیز خاں صاحب	۴۵۹
۱۱	ایک راہبہ کے تجربات	حضرت عظیم قریشی	۵۳۸
۱۲	مہاتما گاندھی سے بات چیت	ادارہ	۵۴۰
	حصۂ نظم		
۱۳	صبح تصور	جناب احسان ابن دانش	۴۹۲
۱۵	غزل	جناب نذیر احمد خانصاحب مرغوب ایم اے	۴۹۷
۱۶	شاہد رعنا میں ایک شام	جناب احمد یکہ صاحب بی اے	۴۹۸
۱۷	غزل	حضرت امجد حیدرآبادی	۵۰۱
۱۸	دریا	جناب خواجہ عبدالحسیب صاحب بال آنریری مجسٹریٹ الہ آباد	۵۰۲
۱۹	طیارہ	حضرت نظیر بدوجیاوی	۵۰۶
۲۰	نوائے فراق	جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے	۵۱۰
۲۱	سرود فطرت	جناب ناجور سامری	۵۱۲
۲۲	غزل	جناب قیوم نظر بی اے	۵۱۴
۲۳	اعجاز بیان	جناب سعید احمد صاحب اعجاز	۵۲۱
۲۴	بہار	جناب سیفی نوگانوی	۵۲۲
۲۵	غزل	جناب محمد عبدالسلام ذکی بی اے	۵۲۷
۲۶	احساس تغافل	جناب روشن نگینوی	۵۲۸
۲۷	غزل	جناب الطاف شہیدی	۵۳۲
۲۸	رباعیات	جناب عباس بیگ صاحب محشر	۵۳۷
۲۹	انقلاب	جناب منور بہائم	۵۷۱
۳۰	دنیائے ادب		۵۴۲
۳۱	نقد و نظر	ادارہ	۵۴۷

سالانہ چندہ محصول ڈاک اوروی ملا کر پانچ روپے (۸ شلنگ) ممالک غیر سے دس روپے (۱۵ شلنگ)

(بقیہ حالات بمقام ۱۰۷ ہوور روڈ بتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر فنتاسی بی دنیا کمرشل مارکس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا)

آہ! منصور احمد

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد

ادبی دنیا کے ناظرین کو یہ سُن کر بے حد صدمہ ہوگا کہ مولوی منصور احمد ایڈیٹر ادبی دنیا جنھوں نے اپنی عمر کی ابھی بیشمل چھتیس منزلیں طے کی تھیں تین ماہ کی علالت کے بعد ۷ مئی کو جمعہ کے دن دو بجے۔ اس عالم فانی سے جہان باقی کو انتقال فرما گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ مرحوم یکم مئی کو بحالی صحت کے لئے کوہ مری تشریف لے گئے تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی مولوی مظفر احمد آپ کے ساتھ تھے۔ بیمار پرپہنچکر آپ کی طبیعت تھوڑی دیر کے لئے سنبھل تو گئی لیکن پھر یکایک ایسی بگڑی کہ آپ نے واپس وطن آنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ ۶ مئی کی شام کو لاہور واپس آ گئے۔ آئے تو سفر کی کوفت سے حالت اور بھی خراب تھی۔ ۶ اور ۷ مئی کی درمیانی شب بڑی تکلیف سے بسر ہوئی۔ صبح ٹیکہ لگایا گیا لیکن بے سود۔ آخر دو بجے کے قریب جانِ شیریں جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور ہم سب کو عمر بھر کے لئے روتا چھوڑ گئے۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ موت کے بعد مرنے والے کی خوبیاں بیان کرتے اور برائیوں کو بھول جاتے ہیں لیکن حق بات یہ ہے کہ ہم نے منصور احمد کی تمام زندگی میں کسی کے منہ سے اس کی برائی نہ سنی اور نہ کبھی اس کے منہ سے کسی کے حق میں بُرا کلمہ نکلا جس کسی کو کبھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا، یا ان سے کسی قسم کا واسطہ پڑا۔ وہ اپنے دل پر اُن کی شرافتِ نفس۔ پاکیزگی فطرت اور علوِ سیرت کا نقش راسخ اپنے دل پر لے کر اٹھا۔ راقم الحروف کے تعلقات اُن سے گزشتہ پچیس برس سے قائم تھے اور تعلقات بھی ایسے جو دوستی کے میدان سے گزر کر یک دلی و یگانی کی حدود میں آ چکے تھے لیکن اُن کی سنجیدگی سیرت۔ اور وضع داری کا یہ عالم تھا کہ کبھی اپنے منہ سے اپنی کسی پریشانی کا مجھ سے اظہار نہ کرتے اور انتہا درجہ کی بے تکلفی کے باوجود اپنی مخصوص متانت اور تہذیب کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے۔ جھوٹ کیسا ہوتا ہے۔ یہ انھیں معلوم نہ تھا۔ اہلِ دنیا سے معاملات کس طرح کئے جاتے ہیں۔ وہ اس سے بالکل بے خبر تھے زبان و ادب سے انھیں عشق تھا۔ اور ان کی ادبی خدمات اس زمانے سے بھی برس ہا برس پیشتر شروع ہوتی ہیں۔ جب انھوں نے ہمایوں کی ادارت سنبھالی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں خیابانستان جاری کیا۔ اور اگرچہ وہ ابھی بالکل نوعمر تھے لیکن ان کی پختگی تحریر اور سلیقۂ ادارت کو دیکھ کر علامہ اقبال اور پروفیسر مرزا محمد سعید جیسے بلند پایہ اصحاب علم نے اس زمانہ میں لکھا تھا کہ یہ ہونہار ادیب زبان و ادب کی بیش بہا خدمات بجا لائے گا۔

نوجوانوں میں صحیح و ذوق ادب پیدا کرنے کا شوق اس قدر تھا کہ ہر روز اپنے قیمتی اوقات کا ایک معقول حصہ ان ہونہار ادیبوں کے مضامین کی درستگی میں صرف کر دیتے جو اپنی پہلی ادبی کاوشیں لے کر دفتر "ادبی دنیا" میں آتے اور انھیں مشق جاری رکھنے کا حوصلہ دلاتے۔ راقم پر بعض دفعہ یہ ادبی پرورشیں کچھ ناگوار گزریں تو فرمایا کرتے بھئی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہی گھگھیوں چلنے والے کسی دن عرصۂ ادب کے شہسوار ہو جائیں گے۔ مرض الموت میں گرفتار تھے لیکن اصطلاحات ادب" برابر مرتب کر رہے تھے۔ میں نے منع کیا تو کہنے لگے کہ بہت سے نوآموز شاعر اور ادیب بڑی موزوں طبیعتیں رکھتے ہیں لیکن علمی تربیت کی کمی کے باعث نادانستہ غلطیاں کر جاتے ہیں۔ اگر میرے ہاتھوں اُن کی چھوٹی سی خدمت ہو جائے تو کیا بُرا ہے۔ آہ کے خبر تھی کہ موت کی آندھی اس شمع فروزاں کو عین اس وقت گل کر دے گی جب اس کی روشنی صحن و در سے نکل کر اقصائے دنیائے ادب تک پہنچنے لگی تھی۔ سبحان اللہ ؎

لوٹا سرِ راہ قافلۂ عمر قضا نے منصور ابھی وارد منزل نہ ہوا تھا

غم نصیب :- صلاح الدین احمد

نوحۂ منصور

داغ سینہ ہیں کہ دل میں کوئی ناسور نہیں
پھر یہ کیا سنتا ہوں افسوس کہ منصور نہیں

کون منصور خلوص اور محبت کی شبیہہ
ایسے اوصاف تو اس دور کا دستور نہیں

کون منصور وہ دنیائے ادب کا خورشید
اب صحافت کی فضا دھندلی ہے پُرنور نہیں

پیکرِ نیکی و اخلاق تھا منصور احمد
کونسا دل ہے کہ اس صدمہ سے چور چور نہیں

پدرِ پیر کی حالت نہیں دیکھی جاتی
دن قیامت کا مگر آج سے کچھ دُور نہیں

وہ مرض لگ گیا جو جان کو لے کر ہی گیا
ورنہ کس دُکھ کی دوا علم میں مذکور نہیں

تھا جو ممکن وہ کیا اس کے بچانے کے لئے
موت کو روکے۔ کسی کا بھی یہ مقدور نہیں

بدلی گو آب و ہوا۔ ہائے نہ بدلی قسمت
کہہ سکے کون اب انسان کو مجبور نہیں

کیفی غم زدہ کا ساتھ دیا اور ایسا
بھائی[1]۔ اُلفت کا تو کچھ خوب یہ دستور نہیں

کیفی

[1] مرحوم کے والد کی طرف خطاب ہے۔

آئینۂ عالم

زارِ روس کے حقیقی قاتل

شہنشاہ جارج پنجم نے اپنی وصیت میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ ان تمام تاریخی واقعات کی توضیحات شائع کی جائیں جن کے وقوع نے زار روس اور اس کے خاندان کو اس دردناک انجام پر پہنچایا تھا۔

شہنشاہ کی زندگی ہی میں اس کتاب کی تالیف شروع ہو گئی تھی۔ ہمیں اس حسرت ناک واقعہ کی تفصیلات جمع کی جا رہی تھیں۔ بس بلا شبہ ڈگڈیل، لارڈ بالفور کی بھانجی شہنشاہ کی امداد اور ہدایات کے مطابق اسے مرتب کر رہی تھی۔ بس ڈگڈیل کو شہنشاہ نے کئی مرتبہ اسی ضمن میں اپنے حضور میں طلب فرمایا اور حکم صادر فرمایا کہ تمام متعلقہ سرکاری مسودات یہاں تک کہ دفتر خارجہ کی یادداشتیں بھی بس ڈگڈیل کو بہم پہنچائی جائیں۔

شہنشاہ کی ذاتی توجہ کی وجہ سے تمام ضروری مواد تکمیل کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ اور ملکہ اپنے مرحوم شوہر کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لئے عنقریب اسے شائع فرمانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

سلطنت روس کے آخری وزیر اعظم ایم الگزنڈر کیرنسکی نے مجھے ایک ملاقات خصوصی میں جو پیرس میں ہوئی مندرجہ ذیل واقعات بتائے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح لائڈ جارج نے زار روس اور اس کے گھرانے کو بچانے کے لئے جارج پنجم کی تمام کوششوں کو ناکام بنایا اور نہیں انگلستان لانے سے باز رکھا۔

ایم کیرنسکی نے کہا: "میرے لئے اور ان تمام لوگوں کے لئے جو شہنشاہ جارج کو جانتے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ وہ شہنشاہ کو ان تمام تاریخی واقعات کے شائع کرنے کی رائے دیں جو شہنشاہ کے عم زاد بھائی اور اس کے خاندان کی بربادی کا موجب ہوئے تھے۔ شہنشاہ چاہتے تھے کہ وہ دنیا کو ان تمام کوششوں کی تفصیلات بتا دیں جو انھوں نے زار کو بچانے کے لئے کی تھیں۔ اور ان الزامات سے بری الذمہ ہو جائیں جو ان کو ایسا نہ کرنے کی صورت میں ان پر عائد ہوتے تھے۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے زار اور اس کے خاندان کو روس سے انگلستان تک بھگا لے جانے کے لئے ہر امکانی کوشش کر ڈالی اور ان کوششوں کے ناکامیاب رہنے کے لئے وہ کسی طرح بھی مورد الزام نہیں ہو سکتے۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کو زار اور اس کے خاندان کو سرخ ڈاکوؤں کے پنجے سے چھڑانے نہ دیا گیا اور اس واقعہ نے آپ کی باقی ماندہ زندگی کو پژمردہ سا کر دیا۔ آپ اکثر اپنے دوستوں سے اپنی کوششوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ آپ کو اس ناکامی کا نہایت ہی قلق تھا اور باوجود اپنی بے بسی کے علم کے آپ اپنے ضمیر کے سامنے سرخرو نہ ہو سکتے تھے۔ اس وقت سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک آپ روس کے متعلق ہر بات میں دلچسپی لیتے رہے۔ اور جو لوگ آپ کو جانتے تھے ان کا خیال ہے کہ موجودہ روس کے متعلق ان کی معلومات دنیا کے ہر آدمی سے زیادہ تھیں۔

ایم کیرنسکی نے اس کے بعد ان ناشادیام کی ساری سرگزشت کہانی مجھے کہہ سنائی۔

"۱۹۲۴ء میں شہنشاہ نے زار کی شاہی گارڈ کے افسر پال یولجن کی ایک کتاب کی اشاعت کے حق میں رائے دی تھی جو ان حالات پر منطبق تھی۔

۱۹۱۸ء میں آپ نے بولجن کو فوراً روس جانے کا حکم دیا۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ شاید غیر مفتوح اضلاع میں ابھی تک شاہی خاندان کے افراد زندہ ہوں۔ چونکہ ہنگامۂ بغاوت میں صحیح اطلاعات نہ مل سکتی تھیں۔ اس لئے شہنشاہ یہ امید رکھتے تھے کہ شاید خاندان شاہی کے چند افراد بھاگ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگئے ہوں۔

بولجن نے واپسی پر بتایا کہ شاہی خاندان کے تمام ممبروں کا وہی حشر ہوا ہے جو خود زار کا ہوا اور وہ ایسے وقت میں پہنچا کہ موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

"ہنگامہ انقلاب کے شروع ہونے کے ساتھ ہی زار اور شاہی خاندان کے تمام افراد کو قید کر لیا گیا تھا۔ جوں ہی ان کی گرفتاری کی خبر لندن پہنچی شہنشاہ نے فوراً اپنے سفیر متعینہ سینٹ پیٹرز برگ سر جارج بوکانن کو ہدایت بھیجی کہ وہ حکومت روس کو مطلع کرے کہ شہنشاہ جارج زار اور شاہی خاندان کو لندن میں پناہ دینے پر تیار ہیں۔ سر جارج نے ہماری حکومت سے یہ بھی کہا کہ ہم شاہی خاندان کو بحفاظت انگلستان پہنچا دینے کا ذمہ لیتے ہیں۔

"اس کے بعد شہنشاہ نے احکام صادر فرمائے کہ ایک انگریزی تباہ کن جہاز ساحل روس پر بھیج دیا جائے۔ تاکہ وہ زار اور شاہی خاندان کو لندن لے آئے۔ اس کے ساتھ ہی حکومت ڈنمارک کے ذریعے سے قیصر الیگزنڈر ثانی تک رسائی حاصل کی گئی۔ اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے جنگی بیڑے کو ہدایات دے دے گا کہ اس انگریزی تباہ کن کشتی کے کسی قسم کی باز پرس نہ کی جائے۔

"میں اور سابق حکومت روس اس بات سے نہایت ہی مسرور ہوئے کہ شہنشاہ نے اتنی فراخ دلی کا برتاؤ کیا ہے کیونکہ ہم خود زار کے منقبل کے متعلق نہایت فکرمند تھے۔ چنانچہ میں نے زار کی گاڑی کے ساتھ مرمانسک کی بندرگاہ تک جانے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ بدقسمتی سے ریل اس وقت سرخ فوج کے قبضے میں تھی جس کی وجہ سے سفر نہایت خطرناک ہو رہا تھا ہم نے روانگی کا ارادہ اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا۔ جب تک حالات کسی حد تک روبراہ نہ ہو جائیں۔

شہنشاہ کی یہ پیش کش چونکہ ذاتی حیثیت سے اور رشتہ داری کے تعلقات پر مبنی تھی اس لئے زمانہ جنگ کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج۔ لبرل پارٹی اور مزدور طبقہ اس سے مشتعل ہو گیا۔ لندن کے ایک اخبار نے جس سے لائڈ جارج کے گہرے تعلقات تھے۔ اس تجویز کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس کا یہ سلسلہ شروع کر دیا جس کے نتیجے میں دفتر خارجہ کو ایک سرکاری بیان شائع کرنا پڑا جس کا ملخص یہ تھا کہ "شاہ انگلستان کی حکومت اس دعوت کو جو زار روس کو پناہ دینے کے سلسلے میں دی گئی تھی جاری نہیں رکھنا چاہئے اور اپنی پیش کش کو واپس لیتی ہے"۔

اخبارات کے ذریعے سے زار اور اس کے خاندان کے خلاف عوام کے دلوں میں نفرت پیدا کی گئی۔ سب سے زیادہ زارینہ کو ہدف ملامت بنایا گیا اور ظاہر کیا گیا کہ جرمنی کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت گہرے ہیں۔ اور انگلستان میں اس کی موجودگی نہایت تباہ کن نتائج پیدا کرے گی۔ اس کے علاوہ مختلف ذرائع سے شہنشاہ پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اپنے خیال سے باز آجائیں

"اپریل ۱۹۱۷ء کے اوائل میں سر جارج بوکانن کو لندن سے ایک تار موصول ہوا۔ تار کو پڑھ کر اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ اپنی بیٹی کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ اتفاق سے اس وقت اس کے کمرے میں موجود تھی۔ انھیں زار کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے انگلستان میں بلانا نہیں چاہتے۔ انھیں ڈر ہے کہ اس کی موجودگی انگلستان میں سیاسی پیچیدگیاں پیدا کر دے گی"۔

اس تمام عرصے کے دوران میں زار اور اس کا خاندان۔ لندن کی خبروں کا نہایت بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ روس میں حالات بھی اب کسی حد تک بہتر ہو گئے تھے اور مرمانسک تک سفر کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ میں روسی وزیر خارجہ کے پاس گیا اور اسے کہا کہ وہ حکومت انگلستان سے اس تباہ کن جہاز کا مطالبہ پیش کرے جس کا انھوں نے وعدہ کیا تھا۔ ہم اور سفیر انگلستان اس عرضداشت کے جواب کا نہایت بے تابی سے انتظار کرتے رہے لیکن افسوس کہ اس کے جواب میں ہفتوں ہی گزر گئے۔ آخر ایک دن سر جارج ہمارے وزیر خارجہ کے پاس آیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ حکومت انگلستان زار روس کو اپنے ہاں پناہ دینے پر آمادہ نہیں۔

"یہ خط لائیڈ جارج کی کرتوت تھا۔ اس نے زار کے سفر کو اپنی تمام امکانی کوششوں سے روکا۔ اس نے شہنشاہ سے کہا روجبھی تک اپنے پہلے ارادے پر قائم تھے کہ اگر زار کو انگلستان بلایا گیا تو نہایت ہی سنگدل سیاسی مشکلات پیش آجائیں گی۔ اس نے کہا کہ صنعتی طبقے نے اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے کہ اگر زار کو بلایا گیا تو تمام بندرگاہوں، کانوں اور اسلحہ خانوں میں ہڑتال کر دی جائے گی۔

"اس موضوع پر لائیڈ جارج سے میں نے ایک طویل بحث کی ہے اب وہ زار کی بربادی کا تمام تر الزام ہماری حکومت کے سر دیتا ہے۔ میں اسکی

جگی یادداشتوں کی اشاعت کا منتظر ہوں اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر اس نے واقعات اور حقائق میں ذرا سا رد و بدل بھی کیا تو میں انگلستان کی کسی عدالت میں یک دم استغاثہ دائر کر دوں گا۔ میں نے ان یادداشتوں میں سے ایک کا مطالعہ کیا ہے۔ اس نے ان "واقعات" کا ذکر تو کیا ہے جو مارچ اور اپریل ۱۹۱۷ء میں وقوع پذیر ہوئے یعنی جب زار کو رخصت دی گئی تھی لیکن وہ ان واقعات کو بالکل نظر انداز کر گیا ہے جو جون ۱۹۱۷ء میں واقع ہوئے یعنی اس رخصت کی واپسی کو۔ اگرچہ ہماری حکومت پر جو حملے اس نے کئے ہیں اس کا مداوا نہیں کیا لیکن اس نے مجھے عدالت میں جانے کا موقع بھی نہیں دیا۔"

ایم کیرنسکی نہایت بے تابی سے شہنشاہ جارج کی فرمودہ کتاب کی اشاعت کا انتظار کر رہے ہیں جس سے ۱۹۱۷ء کے روسی واقعات حقیقی روشنی میں آجائیں گے اور زار کی موت کی ذمہ داری سے شہنشاہ کی ذات ہمیشہ کیلئے پاک ہو جائے گی۔

آخر میں اس نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب آخر کار میرے کندھوں سے ذمہ داری کا وہ بوجھ اٹھالے گی جو مسٹر لائڈ جارج نے میری ذات پر ٹال رکھا ہے۔ اور نیا پیرو ذر روشن کی طرح واضح کر دے گی کہ زار اور اس کے خاندان کے دردناک حشر کے تمام تر ذمہ دار صرف مسٹر لائڈ جارج اور ان کی حکومت ہیں۔"

ڈاک کے پرانے ٹکٹ

آسٹریلیا کی پہلی ہوائی ڈاک کا لفافہ ۳۰ پونڈ میں نیلام ہوا ہے اگر آپ چند روپے ہفتہ وار اس کام میں لگائیں اور کچھ سوچ بچار سے کام لیں تو کافی دولت کما سکتے ہیں۔ شہنشاہ جارج پنجم کے جشن سیمیں کے ۴۹ ٹکٹوں کا مجموعہ جو صرف اسی تقریب پر برطانوی مقبوضات میں جاری کئے گئے تھے پہلے پہل چار شلنگ میں فروخت ہوئے لیکن اس وقت ان کی قیمت ۹ پونڈ ۱۰ شلنگ ہے۔

شوقین امراء پرانے اور نایاب ٹکٹوں کی قیمت ہزاروں پونڈ تک ادا کرتے ہیں۔ ابتدا میں ٹکٹ جمع کرنے کے لئے آپ خوش قسمتی کا انتظار کرتے ہیں لیکن جب آپ اس کام میں پڑ جائیں تو اس کام کی دلچسپی قیمت خود آپ کو شوقین بنا دیتی ہے۔

ابتدائی ایام میں کافی لوگ اس میں دلچسپی نہ لیتے تھے لیکن اب صرف انگلستان میں تربیا دس لاکھ آدمی نہایت شوق سے اس میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان لوگوں میں سب سے زیادہ تعداد ڈاکٹروں کی ہے اور ان سے دوسرے درجے پر پادریوں کی۔

ٹکٹوں کا سب سے قیمتی ذخیرہ شہنشاہ جارج پنجم کا تھا۔ آپ نے اپنی شہزادگی کے ایام میں اس کی ابتدا کی تھی۔ آپ ٹکٹوں کے شوقینوں کی انجمن کے صدر تھے۔ دوسرے قیمتی ذخائر کے مالکوں میں جارج روبی۔ بابی ہوز جنجر روجرز اور ایڈولف سچو جیسی متعدد ہستیاں ہیں اور اس کے بعد معاشرہ کے تمام طبقوں سے گزر کر سکول کے بچے تک اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔

ایک دفعہ جب یہ خبط کسی کے سر میں سما جائے تو وہ ہزار ہا پونڈ کی قیمت کا ٹکٹ یا اپنے مجموعے کی تکمیل کے لئے کسی اور نئے ٹکٹ کے حصول کے لئے کیسا بے تاب اور مضطرب رہتا ہے۔ سیکڑوں لوگ جنھیں اس سے قبل ٹکٹ جمع کرنے کا خواب و خیال بھی نہ تھا جشن سیمیں سے اس میں شامل ہو گئے اور ابھی سیکڑوں جشن تاج پوشی کی تقریب پر ٹکٹ جمع کرنے شروع کر دیں گے۔

سب سے بڑی دلچسپی ان کی لاتعداد اقسام اور پھر ان کے متواتر و مسلسل اجرا میں مضمر ہے۔ کیونکہ ہر وقت کوئی نہ کوئی نیا ٹکٹ جاری ہوتا رہتا ہے۔ ذخیرہ کرنے والوں کے لئے چھوٹی موٹی اقسام ہیں ان میں سے پہلی تین کمیاب اور قیمتی ہیں اور آخری تین زیادہ آسانی سے مل جاتی ہیں۔

پہلی تین میں اول نمبر برطانی نوآبادیات کا ہے جیسے ولیٹ انڈیز یا ریاست ہائے آسٹریلیا۔ یا کسی ایک ملک مثلاً فرانس کی تمام ٹکٹوں کا مجموعہ۔

دوسرا نمبر ان ٹکٹوں کا ہے جن کے کنارے دندانے دار نہیں ہیں سنہ ۱۸۶۱ء سے سنہ ۱۸۸۰ء تک کے عرصے سے پہلے تمام ٹکٹ اسی قسم کے ہوا کرتے تھے۔ ان ٹکٹوں میں ایک ٹکٹ ماریشس کے ڈاک خانے کا نہایت کمیاب ہے اس پر غلطی سے بجائے OFFICE کے POST PAID کے الفاظ طبع ہو گئے تھے۔ یہ ٹکٹ ایک سرکاری جلیئہ سرود کے جہازوں کے دعوتی رقعوں پر ۱۸۴۷ء میں لگایا گیا تھا۔ یہ غلطی معلوم تو ہو گئی لیکن اس وقت جب کہ چند لفافے ڈاک میں ڈالے جا چکے تھے۔ باقیوں پر غلطی کی تصحیح کر لی گئی۔ اس ٹکٹ کی اصلی قیمت ایک پنس تھی لیکن اس وقت اس ٹکٹ کے عوض میں ۳۰ پونڈ مل سکتے ہیں۔

تیسری قسم ان ٹکٹوں کی ہے جن پر کسی اور ٹکٹ کے مختم ہونے کی وجہ سے دوسری قیمت دوبارہ طبع کی جاتی ہے۔ مثلاً باربیڈوس کا ایک ۵ شلنگ

کا ٹکٹ ایک لیبل کے ساتھ شائع کیا گیا۔ جسے درمیان میں سے کاٹا گیا تھا اور ہر حصہ ایک منس کا تھا۔

حال ہی میں فرانس کے چار ایسے ٹکٹ ۶۰۰ پونڈ میں فروخت ہوئے ہیں۔ اصل میں یہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئے تھے۔ ان کی اصلی قیمت ۵ سنٹائم تھی۔ جب یہ ڈاک میں نیویارک بھیجے گئے تو ان پر زائد محصول وصول کیا گیا۔

ٹکٹوں کی باقی تین اقسام کیا ب نہیں ہیں۔

چوتھی قسم کے وہ ٹکٹ ہیں جو خاص خاص تقریبوں کے موقع پر شائع ہوتے ہیں۔ مثلاً جشن سیمیں کے یا سلور ایوبلی کے سٹ جو ۱۹۳۳ء میں غلامی سے نجات حاصل کرنے اور ولیم ولبرفورس کی موت کے موقع پر شائع کئے گئے تھے۔ شروع میں ان کی قیمت دو پونڈ تھی۔ مگر اب ۵ اپونڈ میں ملتے ہیں۔

ایسے تقریبی ٹکٹ صرف چند ماہ تک جاری رہتے ہیں۔ اور اس کے بعد باقی بچے ہوئے تلف کر دئے جاتے ہیں۔ اور پھر وہی پرانے ٹکٹ جاری ہو جاتے ہیں جو حکومت یا بادشاہ کے عہد حکومت تک جاری رہتے ہیں

پانچویں قسم ذاتی دلچسپیوں پر مشتمل ہوتی ہے جو انواع و اقسام کے رنگ اور مختلف ڈیزائنوں کے لئے جمع کئے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ ان میں سے صرف تصویری ٹکٹوں کے جمع کرنے کے شائق ہوں۔ جن میں گو اکاوہ ٹکٹ بھی شامل ہے جس پر ایک برہنہ عورت کی تصویر ہے

چھٹی قسم ہوائی ڈاک کے ٹکٹوں کی ہے جو اپنی دلچسپیوں کی وجہ سے سب میں ممتاز ہے۔ عموماً عورتیں ان کے جمع کرنے کی سب سے بڑی شائق ہیں۔ انگلستان کی اولین ہوائی ڈاک جو ۱۹۱۰ء میں لندن سے ونڈسر پہنچائی گئی۔ یا شمالی بحر الکاہل کی اڑان جو ۱۹۱۹ء میں عمل میں آئی اس سفر میں ہوا باز اور ڈاک کے خطوط کو بہ شکل بچایا گیا تھا۔ ان تاریخی واقعات کے حامل لفافے کافی قیمت پاتے ہیں۔

سب سے زیادہ قیمتی ٹکٹ اس ڈاک کا ہے جو مارکوس ڈی پینڈر ۱۹۲۷ء میں اپنے ریکارڈ توڑنے والے ہوائی سفر میں لایا۔ اس کی اصلی قیمت ۶۰ سنٹ ہے لیکن اس کے فوراً ہی بعد ۵ پونڈ ہو گئی اور اب ۴۰۰ پونڈ ہے۔

اگر آپ بھی ٹکٹوں کا ذخیرہ جمع کرنے کے متعلق عزم کر رہے ہوں تو آپ دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی ٹکٹ خرید سکتے ہیں۔ جو اس وقت قابل فروخت ہے۔ یہ ٹکٹ برطانیہ گیانا سے ۱۸۵۶ء میں ایک سنٹ کے لئے جاری ہوا تھا۔ ایک شوقین نے ۱۹۲۰ء میں اسے ۳۵۰ پونڈ میں خریدا۔ یہ اپنی قسم کا ایک ہی ٹکٹ ہے اور کسی ذخیرے میں اس کا ثانی موجود نہیں۔

اصحابِ کہف کا بھائی

ایک شخص لندن کے ایک سنیما کی تاریکی میں بیٹھا ہوا پردے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ آنکھیں جھپک رہا تھا۔ یکایک حیرت کے مارے اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ وجہ یہ تھی کہ سنیما کے پردۂ سیمیں پر ایک اداکار بول رہا تھا اور مسٹر ولیم انگلس نے آج تک متکلم فلم نہ دیکھی تھی۔

مسٹر انگلس جنگ عظیم کے دوران میں اعلان صلح سے ایک ماقبل ایک بم سے زخمی ہوا تھا اور اس وقت سے لے کر اب تک لندن کے ایک ہسپتال میں زیر علاج تھا۔ مسٹر انگلس کی عمر اس وقت بیالیس سال ہے اور بیس سال تک موت و حیات کے درمیان لٹکتے رہنے کے بعد چند ہی دن ہوئے ہیں کہ وہ پھر زندوں کی دنیا میں لوٹ آیا ہے۔

"دنیا اس قدر بدل چکی ہے کہ اب پہچانی ہی نہیں جاتی" مسٹر انگلس نے مجوبے پر مجوبہ دیکھنے کے بعد کہا۔ سنیما کی ایک عالیشان عمارت دیکھ کر بولا "یہ خوب صورت عمارت سنیما ہال کیسے ہو سکتی ہے؟ ہمارے زمانے میں یہ عمارتیں چوہے کے بلوں کی طرح ہوتی تھیں۔ جہاں ہم دو آنے میں چھ آنے کی برابر تاریخی خرید سکتے تھے۔

مسٹر انگلس حیرت زدہ ہو کر پانچ گھنٹے تک ٹریفک کی تبدیلوں کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھتا رہا اور انتہائی عزم و خوص کے بعد بھی ان کے خود بخود بدلنے کا راز نہ پا سکا۔

بجلی کے لفٹ کو اس نے موجودہ زمانے کا سب سے بڑا معجزہ خیال کیا اور اس کے ذریعے اوپر اور نیچے بار بار سفر کرنے پر مصر رہا۔

آخر اس دنیا کے عجائبات سے محظوظ اور مسرور ہو کر اس نے اپنی نئی زندگی کا پہلا دن ختم کیا۔

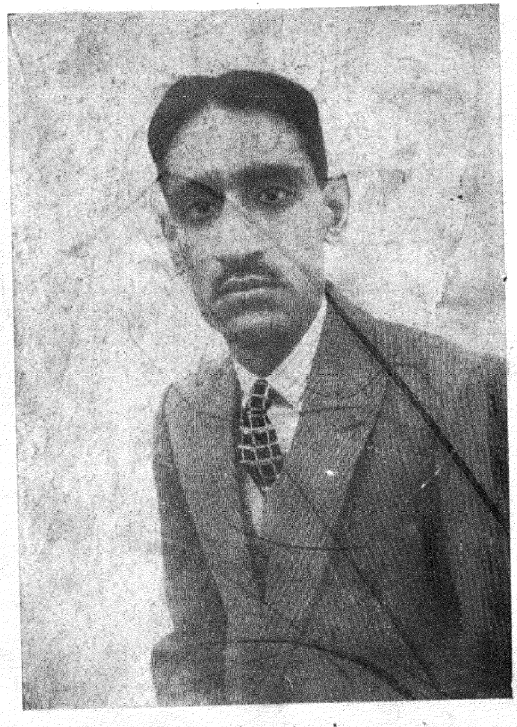
ادارہ

صبح تصوّر

اللہ رے عالم سے شبِ تار کی رخصت — افسانۂ تنویر نہیں گرچہ مکمل
ہے چرخ ستاروں کی کشاکش سے سبکدوش — انفاس زمیں شورشِ مخلوق سے بوجھل
مشرق کی تجلّی میں مچلتی ہوئی بدلی — خورشید کے رخسار سے اڑتا ہوا آنچل
مرغانِ سحر خیز کے نغموں کے اثر سے — سینے میں ہے طوفان بپا روح میں ہلچل
اب عقل و جنوں ایک ہی مرکز پہ نگوں ہیں — ایمان کے مطلع پہ نہیں ہے کہیں بادل
خاموش بلندی سے یہ رستا ہوا کہر — پلکوں سے فضاؤں کی یہ بہتا ہوا کاجل
کانپی ہوئی شبنم پہ یہ خورشید کی نظریں — چلنے سے ہواؤں کے یہ جاگا ہوا جنگل
بہکانے سے جھونکوں کے یہ لہکا ہوا سبزہ — رستوں کے کناروں پہ یہ پھیلی ہوئی مخمل
پھولوں کے کٹوروں میں یہ صہبائے بہاراں — رقاصۂ موسم کی چھلکتی ہوئی چھاگل
بھیگی ہوئی چمپا کے شگوفوں سے خموشی — فطرت نے ہر اک کنج میں کھولی ہوئی بوتل
خورشید پہ باریک سی گلرنگ سی بدلی — جبریل نے ماتھے پہ لگایا ہوا صندل

اب دستِ تصور میں بیک وقت ہیں دو جام
اک غیرتِ تریاق ہے اک زہرِ ہلاہل

ترجمان وارثی



منصور احمد صادق



ہماری زبان کا نام

یہ تقریر آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں ۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نے فرمائی۔

حضرت اقوموں اور زبانوں کی تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی، ان کا خمیر اٹھتے، مزاج بنتے اور ایک صورت پکڑتے صدیاں لگتی ہیں،

آج ہم جس ملک کو اس آسانی سے "ہندوستان" کہہ دیتے ہیں، اور اس سے ہمالیہ کے دامن سے بحر شور کے ساحل تک کا علاقہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس کا نہ یہ نام تھا اور نہ یہ اس کی وسعت تھی، اور نہ مسلمانوں سے پہلے اس ملک کا کوئی ایسا نام تھا جو اس پورے ملک کو بتا سکے جو پنجاب کی سرحد سے شروع ہو کر بنگال، مدراس، اور بمبئی کے کناروں پر جا کر ختم ہوتا ہے، بلکہ انتہا یہ ہے کہ اس پوری قوم کے لئے بھی جس نے اپنے کو "ہندو" کے نام سے ایک قوم بنا لیا ہے کوئی ایک نام نہ تھا، کہتے ہیں کہ اس ملک کے ایرانی ہمسایوں کی زبان میں اس ملک کا نام سندھو تھا اور قدیم ایرانی اور سنسکرت زبانوں میں تھ اور س کا باہم مبادلہ ہو جاتا ہے، اس طرح سندھو ہندو ہوا، اس ملک کے دوسرے بحری ہمسایہ کی زبان میں دو لفظ تھے، السنہ واہلند، کشمیر کی ترائی سے لے کر موجودہ سند کے کناروں تک کو وہ سندھ اور گجرات اور لاٹ سے باقی اندرونی ملک کو وہ ہند کہتے تھے، اس ہند نے یورپ جا کر اہد کی اور انڈ نے انڈیا کی صورت اختیار کر لی، ہندوالوں کو عرب "ہندی"، اور خراسانی ہندو" کہتے تھے، اور عرب ہندی کی جمع ہنود اور خراسانی ہندوان بناتے تھے،

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ان میں سے اہل عرب نے اس ملک کو ہند کار، اور اہل خراسان نے ہندوستان کا نام دیا۔ لفظ ستان، جگہ یا زمین کے لئے فارسی اور سنسکرت دونوں میں بولتے ہیں، اس لئے ہندوستان ہندو استھان بھی ہو سکتا تھا،

اس ملک میں جو بولی بولی جاتی تھی وہ بھی ایک نہ تھی، ہر صوبے کی بولی الگ الگ تھی، لیکن مسلمانوں نے یہاں کی ہر بولی کا ایک ہی نام رکھا، یعنی ہندی یا ہندیہ،

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ اس سرزمین کے ایک ملک کا ایک نام ہندیا ہندوستان، اور یہاں کی رہنے والی قوموں کا ایک نام ہندو، اور یہاں کی مختلف زبانوں کا ایک نام ہندی مسلمانوں نے رکھا، اور حقیقت میں یہ مسلمانوں ہی کی ذہنیت اور ذہانت تھی جس نے اس پوری سرزمین کو ایک ملک اور یہاں کے رہنے والوں کو ایک قوم، اور یہاں کی بولیوں کو ایک زبان سمجھنے کا تصور پیش کیا،

اس ملک میں عرب، عربی، ایرانی، فارسی اور ترک ترکی بولتے ہوئے آئے، مگر کچھ ہی دنوں کے بعد یہاں کے اصلی باشندوں سے مکمل مکالمتاً کر ہمیں کسی کوئی زبان بولنے لگے جس کا نام انہوں نے ہندی یا ہندوی رکھا، ورنہ ہندی نام کی کوئی زبان اس ملک میں ان کے آنے سے پہلے نہیں بولی جاتی تھی، اس زبان نے ترقی شروع کی تو گجرات میں اس کو گوجری، دکھن میں دکھنی، اور اودھ میں اودھی کہنے لگے، لیکن صوبہ وار ناموں کو چھوڑ کر پورے ملک کی اس ملی جلی بولی کا نام ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی بھی پکارا جانے لگا، میں نے آج سے چند سال پہلے یہاں "ہندوستان میں ہندوستانی" کے نام سے جو مقالہ پڑھا تھا، اس میں ہندوستانی نام کے پرانے تاریخی حوالے پیش کئے ہیں،

شاہجہاں کے زمانے میں جب دہلی شاہجہاں آباد بنی تو شاہی قلعہ یا بازار کے لئے ترکی لفظ "اردو" اردوئے معلی کی ترصیعی ترکیب سے رواج پایا، اور صوبہ وار نئی دیسی بولیوں کے لئے اس اردوئے معلی کی شاہی بولی کا ڈھنگ اس زبان کی صحت اور صفائی کا معیار رہا، اور اس طرح اس نئی مہاری بولی کو اضافت کے ساتھ "زبان اردوئے معلی" کہنے لگے، اور آج سے کوئی سو ڈیڑھ سو برس پہلے زبان اردوئے معلی کی لمبی ترکیب کے بجائے "زبان اردو" یعنی اردو کی زبان بنی، اور پھر اس سے بھی مختصر ہو کر اردو" ہوئی،

جب انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکا، تو فورٹ ولیم میں سیاست کے

کھلاڑیوں نے علم و دانش کے پانسے پھینکے، دو رہنی سے ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جد و جہد کے بعد ایک قوم بنی تھی جس کا تمدن جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی، اس کو پھر دو قوموں میں بانٹ کر علیحدہ علیحدہ کئے جانے کے لئے کوششیں شروع کیں، اور ہندی اور ہندوستانی یا اردو دو زبانیں بنا کر ایک کے لئے ہندوؤں اور دوسری کے لئے مشنی اور مروای نوکر رکھ کر دو زبانوں کے لئے سامان درست کر لیا، ابھی انھارھویں صدی ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگروں کے منتر سے اردو اور ہندی کے دو خاکی پتلے فولادی سپاہی بن کر ملک کے طول و عرض میں مرنے کٹنے لگے۔

ہندو بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سلطنت کے دابوے وہ آزاد ہو چکے ہیں تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہیے، اس بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت کارآمد ثابت ہوئی اور سب سے پہلے اس کا اثر زبان کے معاملہ میں ظاہر ہوا، اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہو لی، اور بعض صوبوں میں یہاں تک کیا گیا کہ اردو خط تک عدالتوں سے خارج کر دیا گیا، اور اب یہ تحریک یہاں تک زور پکڑ چکی ہے کہ یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس صوبے کے چند شاعروں نے جس بھاشا میں کچھ مذہبی نظمیں کبھی لکھی تھیں وہی پورے ملک کی زبان بنا دی جائے

لیکن اس کے برخلاف ملک کے بہت سے سمجھ دار ہندو اور مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ایک ہزار سال کی محنت میں جس زبان کو پیدا کیا اور پڑھایا اور یہاں تک پہنچایا وہی ہمارے دیس کی زبان ہو، اور جو ہندو مسلمان دونوں قوموں کے میل ملاپ کی پہچان ہو،

بہر حال اب صورت یہ ہے کہ ملک کی اس زبان کی جگہ جس کو ہم بولتے ہیں، اور جس کو ہمارے بزرگ ہندی یا ہندوی کہتے تھے، ہندو بھائی زبردستی اپنی ایک خاص زبان اور خاص رسم الخط کو ہندی کہنے لگے، اور اس نام کو اس زبان کے معنی میں اتنا انہوں نے برتا کہ وہ انہی کی چیز ہو گئی، اور مسلمانوں نے بھی حیرت کے مارے غیرت برتی اور خوشی سے یہ نام ان کے حوالے کر دیا، اور اپنی زبان کو پہچان کے لئے ہندی یا ہندوی کے بجائے اردو کہنے لگے اور اس طرح سارے ہندوستان کے میدان کو چھوڑ کر صرف اردو دی مٹی کی چہار دیواری میں سمٹ کر رہ گئے۔

یہ حالت دیکھ کر آج سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یومین ہال میں سب سے پہلے یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس زبان کا نام اردو کے بجائے جو انھارھویں صدی کے خاتمہ کی ایجاد ہے۔ جب واقعی ہندوستان کی شاہجہاں

کراردوئی معلی کے صحن و دیوان میں محدود ہو گئی تھی، اس کو واقعی طور سے اس کے پرانے نام ہندوستانی سے یاد کیا جائے، جو اس وقت کا نام ہے، جب ہندوستان کی شہنشاہی سارے ملک ہندوستان میں پھیل ہوئی تھی، تاکہ یہ زبان پورے ملک کی مملکت کا دعوے کر سکے۔

مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ یہ تجویز ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے یا ہندوؤں کا یہ سمجھنا کہ یہ ان کو دھوکا دینے کے لئے سازش کی جا رہی ہے بدگمانی کی انتہا ہے

یہ تحریک خالص لسانی اصول و مبادی کی بنا پر اٹھائی گئی ہے، جس کے بہت سے سبب ہیں، میں ان میں سے ایک ایک کو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں،

۱۔ اس زبان کے وہ پرانے نام تاریخوں میں ملتے ہیں، زیادہ تر ہندی یا ہندوی، اور اس کے بعد ہندوستانی، اب چونکہ ہندی کا نام ایک خاص زبان اور رسم الخط کے لئے بولا جانے لگا ہے، اس لئے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو اس زبان کے لئے خاص کرنا چاہئے جس کو اب غلطی سے عام طور سے "اردو" کہنے لگے ہیں،

۲۔ دنیا کی ساری یا اکثر زبانوں کے نام کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس قوم کی نسبت سے مشہور ہوتی ہے، جو اس کو بولتی ہے، یا اس ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہے جس میں وہ بولی جاتی ہے، اسی اصول کی بنا پر عرب کی زبان عربی، فارس کی زبان فارسی، ترکستان کی زبان ترکی، انگلستان کی انگلش، فرانس کی فرنچ، جرمن قوم کی جرمن، ترکی قوم کی ترکی وغیرہ کہی جاتی ہے، اسی اصول کے مطابق اس زبان کو جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی جاتی ہے، ہندوستانی کا نام دینا چاہئے،

۳۔ ایک شائستہ اور مہذب زبان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آ جائے، جس کو اس زبان سے نسبت ہے، نہ یہ کہ زبان کا نام لینے کے بعد اس کے ساتھ ایک تاریخی یا تعریفی فقرہ اضافہ کیا جائے، جس سے اس کے جنم بھوم کی کہانی معلوم ہو، لفظ "اردو" سے اس قسم کی کوئی مدد ذہن لسانی کو نہیں ملتی، اس لئے اس کی جگہ اس کے اصلی نام ہندوستانی کو رواج دینا چاہئے،

۴۔ ہم کو اپنی بولی کا ایک ایسا نام رکھنا چاہئے جس کے سننے کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس پورے ملک کی بولی ہے، لفظ اردو کے ساتھ اس قسم کا کوئی تصور ذہن میں نہیں آتا، برخلاف اس کے ہندوستانی نام بولنے کے ساتھ پورے ملک کا نقشہ ہمارے ذہن میں آ جاتا ہے اور اس کے پورے

ملک کی بولی ہونے کا یقین متعلق کی آمیزش کے بغیر صرف نفسیاتی اثر سے ہمارے اندر اور ہر سننے والے کے دل کے اندر پیدا ہو جاتا ہے،

۵۔ اس زبان کو ایک غیر متعلق پدیسی لفظ سے موسوم کرنے سے ہر اجنبی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ جیسا یہ پدیسی نام ہے ویسی ہی پدیسی زبان بھی ہوگی، اور ہم کو اس کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ایک لمبی تقریر کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے یا بھی ہندوستانی نام قبول کرنے سے فوراً دور ہو جاتا ہے،

۶۔ ہم کو اپنی زبان کے لئے ایک ایسا نام چاہئے جس سے ملک کے ہر صوبے کو برابر کی نسبت ہو، تاکہ ہر صوبہ اس کو اپنے وطن کی بولی سمجھنے اور قرار دینے کا برابر کا دعوے کر سکے، لفظ اردو میں یہ بات نہیں، یہ بات ہندوستانی کو حاصل ہے، جس کی بنا پر صرف لکھنؤ اور دہلی ہی نہیں بلکہ بمبئی، مدراس، لاہور، کلکتہ، پٹنہ، پشاور سب کو اس کی ملکیت کا حق پہنچتا ہے، اور سب کو اس سے یکساں لگی اور وطنی محبت معلوم ہوتی ہے، اور کسی صوبے میں وہ اجنبی اور بیگانہ نہیں قرار دی جا سکتی ہے۔

۷۔ لفظ اردو میں ایک فوجی تسلط اور شخصی شہنشاہی کی تاریخ چھپی ہوئی ہے جس سے مرعوبیت کے سوا کوئی محبت کا جذبہ نمایاں نہیں ہوتا، اگر ہم اپنے پیارے ملک کی نسبت سے اس زبان کو پکاریں، تو اس نام سے ہر ہندوستانی کے دل میں وطنی محبت کا جذبہ ابھرے گا۔

۸۔ اس ملک کا نام ہندوستان مسلمانوں کے آنے کے بعد پڑا، اسی طرح یہ بولی بھی مسلمانوں کے اس ملک میں آنے اور اس ملک کے لوگوں سے میل جول پیدا ہونے کے بعد نکلی، اس لئے اس بولی کا نام ہندوستانی رکھنا مناسب ہے، تاکہ تاریخی مناسبت کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے برابر کے میل جول کی کہانی بھی ہم کو ہمیشہ یاد رہے،

۹۔ لفظ اردو سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مسلمان ترکستان و خراسان سے کوئی بولی لے کر یہاں آئے تھے جس کو وہ ترکی میں اردو کہتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبانیں اور تھیں، اور یہ وہ بولی ہے جس کو انھوں نے ہندوستان آکر اختیار کر لیا، یہ واقعہ اس بولی کو ہندوستانی کے اصلی اور صحیح نام سے پکارنے سے ساری دنیا کے سامنے روشن ہو جاتا ہے، اور اس کے بدیسی پن کا بے وجہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ اس زبان کو اردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ناواقف گرامرین اس کی صرف و نحو کو عربی و فارسی کی صرف و نحو سے جانچ کر اس کے اصول بنانے لگے، اور انہوں نے اس غلط طریق و روش کی بنا پر بہت سی غلطیاں کیں، اور اس کے جوڑوں کو عربی و فارسی قاعدوں سے جوڑنے لگے، گو اب ہماری زبان کے نئے مخبروں نے اس غلطی کو ہر طرح سے دور کرنے کی کوشش کی، مگر ابھی تک بات حلق سے نیچے نہیں اتری ہے۔ اب اس کو عام طور سے ہندوستانی کہہ کر پکارنے سے اس زبان کی صرفی و نحوی، اور لغوی تحقیقات کا رُخ ایران و خراسان و ترکستان کی طرف سے مڑ کر ہندوستان کے صحیح قبلہ کی طرف ہو جائے گا، اور اس سے زبان کی اصولی و لغوی تحقیقات کی بہت سی راہیں کھلیں گی۔

۱۱۔ اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ پورے ملک کی مشترک زبان ہے تو اس دعوے کی اس سے زیادہ مضبوط دلیل کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ اس کا نام ہندوستانی ہے، اس کے اس پرانے نام کو رفتہ رفتہ بھلا دینے سے غلط طور کی ہمدردی کر کے ہم نادانستہ اس کے دعوے کی بنیاد کھوکھلی کر رہے ہیں۔

۱۲۔ چونکہ شروع شروع میں جو پرتگالی، یا اسپینی یا اور انگلے یورپین یہاں آئے بلکہ خود انگریزوں نے بھی اس زبان کو صحیح طور سے ہندوستانی کہا تو ہم میں سے اکثروں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے حالانکہ اس زبان کا یہ نام ہم اپنے ہندوستانی کے مقابلہ میں بتا چکے ہیں کہ بادشاہ نامہ اور تاریخ فرشتہ تک میں موجود ہے، فرشتہ میں عادل شاہ ثانی والی بیجاپور کے متعلق ہے کہ "نامہ ہندوستانی متکلم نمی شد"۔ شاہجہاں کی درباری تاریخ بادشاہ نامہ میں ہے "بتمیز سرایان ہندوستانی زبان تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں، اس لئے یہ شبہہ دور ہو جانا چاہئے کہ اس زبان کا یہ نام فرنگیوں نے رکھا ہے، بلکہ یقین کرنا چاہئے کہ ہندی کے بعد ہماری زبان کا یہ وہ نام ہے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا، اور ہم کو بھی اس نام کو باقی رکھنا چاہئے۔

۱۳۔ اہل نظر سے چھپا نہیں کہ اس زبان کی صحیح تاریخ کے سمجھنے میں میر امن دہلوی سے لے سرسید، بلکہ آزاد مرحوم تک جو غلط فہمی ہوئی کہ یہ لشکری بولی ہے یا بازاری، جیسا کہ میر امن کا بیان ہے:

> جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان تیموریہ کی سن کر حضور میں جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی، جدی بدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان مقرر ہوئی۔
>
> جب حضرت شاہجہاں صاحب قران نے . . . شہر دہلی کو اپنا دارالخلافت بنایا . . . اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلّٰی خطاب دیا۔

سرسید نے یہی حکایت شاہجہاں کے عہد کی نسبت لکھی ہے، اور

لکھا ہے کہ چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے، اس غلطی کا سبب صرف لفظ اردو ہے، اس لئے اس نام کو باقی رکھنا اس غلط تاریخ کا باقی رکھنا ہے، اور اس کی اصلی تاریخ کو جواب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، برباد کرنا ہے،

۱۴۔ بعض دوست لکھتے ہیں کہ چونکہ نہرو رپورٹ اور پنڈت جواہر لال نے اپنی آپ بیتی میں "ہندوستانی زبان" کی اکثریت کو تسلیم کیا ہے اور اپریل ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس ناگ پور میں "ہندی یعنی ہندوستانی" کی تجویز منظور ہوئی ہے اور ان سب سے "مراد ہندی" ہے، اس لئے ہندی اور ہندوستانی ہم معنی لفظ ہو گئے ہیں، اس لفظ سے پرہیز کرنا چاہئے،

میری عرض یہ ہے کہ یہ تو مسلمانوں کی بے حواسی سے الجھا ہوا، شاہ عبدالقادر صاحب کے زمانے تک اردو کا نام "ہندی متعارف" تھا، اور سرسید نے آثار الصنادید کے طبع اول میں اردو کے لئے "ہندی" کا لفظ استعمال کیا ہے، اور اسی کو ہندی کہتے تھے، ہندی والوں نے اس لفظ پر ایسا قبضہ کیا کہ آپ کو اس نام پر سے ملکیت کا دعوے اٹھا لینا پڑا، اب ایک لفظ "ہندوستانی" رہ گیا تھا، جو خالص طور پر اردو کے معنوں میں ہمیشہ استعمال ہوا ہے، اگر آپ اس کو بھی چھوڑ دیں گے تو دوسروں کے قبضۂ مخالفانہ سے وہ ہرگز نہیں بچ سکتا، یہی وقت ہے کہ آپ معاملے کی سنجیدگی کو سمجھیں، اور اپنے قبضہ سے خود بخود ہاتھ اٹھا لینے کا گناہ نہ کریں، لیکن ہم اپنے بدگمان دوستوں کو بار بار کرانا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے اصرار سے اور مسلمانوں ہی کی طفل تسلی کے لئے رکھا گیا ہے، اور اس سے مراد ہماری وہی زبان ہے جو ہماری عام بول چال میں ہے، ہم کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے کہ ہندی اور ہندوستانی کو ہم معنی اور مرادف کیوں ٹھہرایا گیا ہے، افسوس ہے کہ ایسے مسئلہ کو جو سراسر ادبی اور لسانی ہے غلط طور سے سیاسی بنایا جا رہا ہے، جذبات سے خالی ہو کر واقعات اور دلائل پر غور کرنا چاہئے اور وہ قدم اٹھانا چاہئے جو ہماری زبان کی حفاظت اور ترقی کا باعث ہو۔

یہ تجویز کسی تحریک و تائید اور رائے شماری کی غرض سے نہیں پیش کی جا رہی ہے، اور نہ اس طرح سے ادبی و لسانی مسئلوں کا فیصلہ ہوتا ہے بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ اپنی زبان کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے، اس قسم کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ رائے عامہ کو متاثر کر لیتی ہیں، اردو کا نام اردو کس ایک شخص یا کانفرنس نے رکھا؟ یہ تو پہلے کسی کسی کی زبان پر آیا، پھر بڑھتا اور پھیلتا گیا، یہاں تک کہ سب پر چھا گیا، غور کیجئے کہ ابھی چند سال ہوئے کہ اس خیال کو کہ اردو کا موزوں نام ہندوستانی ہے، آپ کے درمیان پیش کیا گیا، اور کبھی کبھی مضمونوں میں اور اشارے کئے گئے، اتنے پر یہ نام مدراس وغیرہ کے رسالوں میں چھپنے لگا، اور کہیں کہیں اس کا چرچا ہونے لگا، یہاں تک کہ آج اس کھلے اجلاس میں اس پر بحث تک نوبت پہنچ گئی، غرض ضرورت مباحثہ اور مناظرہ کی نہیں ہے، بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اپنی زبان اور قلم سے اس کا استعمال شروع کر دیں، اس سلسلہ میں ہماری مدد سب سے زیادہ اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر کر سکتے ہیں، امید ہے کہ وہ ادھر توجہ فرما کر اپنی زبان کے قدیم نام کو زندہ کر کے پچھلے سو برس کی غلطی کو دور کریں گے اور ثابت کریں گے کہ ہندوستان کی عام زبان کا نام "ہندوستانی" ہی ہونا زیادہ موزوں ہے، اور یہ وہی زبان ہے جو عام طور سے ہم ہندوستانیوں کے بول چال میں ہے،

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اردو کا علمی نام ہندوستانی رکھنے کی تحریک آج کل کی زبانی کشمکش کا نتیجہ ہے، بلکہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی ناگ پور میں جس میں ساہتیہ پرشد نے اپنا مشہور فیصلہ سنایا، آج سے چھبیس برس پہلے ۱۹۱۱ء کی مسلم لیگ کے اجلاس میں عزیز مرزا مرحوم نے بعینہٖ یہی تحریک پیش کی تھی اور اس کے بعد ساہتیہ پرشد کے اجلاس سابق سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین میں یہ تجویز دوبارہ پیش کی گئی تھی۔

یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی زبان میں کوئی ایسی تبدیلی کر لیں جس سے وہ ہندی یا ہندی کے قریب بن جائے، حاشا و کلا، اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ بعینہٖ اسی اردو اسی زبان، اسی بول چال کو جو ہم بولتے ہیں، ہم ہندوستانی کہتے ہیں۔

ہم کو اس سے بھی اختلاف نہیں کہ اس زبان کا گھریلو نام اردو باقی رہے، لیکن عمومی طور پر اس کے پرانے نام ہندوستانی ہی کو رواج دیا جائے۔ ہمارے بزرگوں نے اس زبان کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا، ایک کا نام ریختہ جو غزل کی زبان تھی، اور دوسرے کا نام ہندی بتایا تھا، جو عام بول چال کی زبان تھی، ہندی کا لفظ چھن گیا، اب جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اس کے پرانے نام ہندی کی جگہ اس کے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو رواج دیجئے، خواہ اپنی غزلوں کا نام ریختہ کی جگہ لے دوہی رکھئے

اس میں کچھ ہرج نہیں، مگر اپنی ہی قبیلی، وطنی اور سیاسی تحریکات ہیں عام طور سے اس کو ہندوستانی کے صحیح نام سے یاد کر کے ثابت کیجئے کہ یہ پورے ملک ہندوستان کی زبان ہے، اور اس کا یہی نام اس کے پورے ملک کی زبان ہونے کی دلیل ہے،

ہم اس فریب میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس صحیح نام ہندوستانی کے رواج دے دینے سے ہماری زبان کی ساری خشکیں ختم ہو جائیں گی، گرمایہ نام کوئی جادو کی چھڑی ہے جس کے گھماتے ہی ساری بلائیں دور ہو جائیں گی بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آج جب ہم اپنی زبان کی اصلی پوزیشن کو دنیا پر واضح کرنے اور اس کے ہمہ گیر تمدن کو ثابت کرنے، اور اس کو سارے ملک کی زبان بنانے کا تہیہ کر رہے ہیں، تو ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اس کو اس کے اس نام سے روشناس کرائیں جس سے اس کی اصلی حیثیت واضح ہوتی ہے، اور پورے ملک کی اس کے اندر سمائی ہوتی ہے، اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعی اس پورے ملک کی زبان ہے، اور جو اس پورے ملک کی زبان بننے کی مدعی ہو اس کا یہی نام ہونا چاہئے۔

ہم کو امید ہے کہ اس زبان کے سبھی خواہ اس تحریک کی تائید کریں گے، اور بحث و مناظرہ کے بجائے جو فرسودہ ہے کہ ہر پندید تحریک میں ہماری عادت ہو گئی ہے، عملاً اس کے رواج دینے کی کوشش کریں گے، تاکہ اس کا جو نام صرف خواص کو معلوم ہے وہی عوام میں پھیل جائے۔

ابھی مولوی عبدالحق صاحب نے آپ کے سامنے جو صدارتی خطبہ پڑھا ہے اس میں انگریزی کے جتنے پرانے اقتباسات انہوں نے پیش کئے ہیں، آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ان میں ہر جگہ اس زبان کا نام یورپ کے سیاحوں، تاجروں، کمپنی کے حاکموں اور لکھنے پڑھے ہندوستانیوں کی زبان پر ہندوستانی ہی آیا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کا اصلی نام یہی ہے، یہی مشہور و معروف تھا، جواب عام طور سے متروک ہو رہا ہے ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اسی مرے ہوئے نام کو دوبارہ جلانا ہے۔

سید سلیمان ندوی

غزل

دل مرا محوِ تماشائے جہاں ہونے کو ہے
اس پہ عریاں جلوۂ کون و مکاں ہونے کو ہے

ہو رہا ہے پھر نثارِ دوست تاجِ خسروی
حسن پھر اب جلوۂ برقِ تپاں ہونے کو ہے

بادۂ تندِ جوانی میں ہے پیدا انتشار
آرزو کے خوں سے رنگیں داستاں ہونے کو ہے

عاشقی میں مہرباں نامہرباں کا کیا سوال
مدعیٔ عشق تیرا امتحاں ہونے کو ہے

آج تک تو ضبطِ دل تھا پردہ دارِ رازِ عشق
آہ فرطِ درد سے وہ بھی عیاں ہونے کو ہے

کودنے کو دل ہے نارِ عشق میں دیوانہ وار
برترازاندیشۂ سود و زیاں ہونے کو ہے

وہ بھی کہتے ہیں کہ ہے رنگِ تغزل دلفریب
شاید اب مرغوبِ مرغوبِ جہاں ہونے کو ہے

نذیر احمد خاں مرغوب ایم اے

شاہدرہ میں ایک صبح

سونی ہوئی لہروں پہ ہیں کرنوں کے سفینے
یا عرش کے سینے پہ ہیں چاندی کے خزینے

کیا رات کو غلمان نے جبریل کو چھیڑا
کلیوں سے ٹپکتے ہیں فرشتوں کے پسینے

جھونکے ہیں کہ حوروں کے پروں کی ہیں صدائیں
کرنیں ہیں کہ روحوں کے چمکتے ہوئے زینے

سبزہ ہے کہ فردوس کی مخمل کا بچھونا
گل ہیں کہ ثریّا کی انگوٹھی کے نگینے

کھب جاتا ہے آنکھوں میں چنبیلی کا تبسم
اور دل میں سما جاتے ہیں سوسن کے قرینے

ندی کے کنارے پہ چمکتے ہوئے پتھر
جنت کے حسینوں کے دمکتے ہوئے سینے

لہروں پہ ملائم سا تلاطم ہے نمایاں
بن بن کے بکھر جاتے ہیں بہتے ہوئے زینے

اک کیف سا بھر دیتے ہیں سوئے ہوئے دل میں
شرمائے ہوئے پھولوں کے دھوئے ہوئے سینے

یہ ریت کے ذرے ہیں کہ الماس کے ٹکڑے
گیتی نے اگل ڈالے ہیں تاروں کے دفینے

یہ تیتریاں تیرتی پھرتی ہیں ہوا میں
یا عرش سے اترے ہیں زمرد کے سفینے

بادل ہیں کہ پھر جھومتی آتی ہے جوانی
مے خانے کو جنت سے انڈیلا ہے کسی نے

اے دوست، یہ بہکے ہوئے، بدمست نظارے
اک بے سروسامان کو دیتے نہیں جینے

احمد ندیم قاسمی بی اے

کائنات میں تنظیم

اور مادے کی حقیقت

کائنات کے طول و عرض میں انتہائی تنظیم اور ہم آہنگی ہے۔ یہ قانون بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی اشیا میں یکساں طور پر جاری و ساری ہے۔

علم ہیئت کے حقائق ثابتہ کا تھوڑا سا علم بھی ایک ایسی کائنات کا منظر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس میں بے شمار ستارے اپنی حیرت انگیز تعداد اور اقسام میں جھلملا رہے ہیں۔ بعض ستارے ہمارے آفتاب کی طرح "اوسطی" قد و قامت کے ہیں، بعض جسیم ہیں لیکن کئی اتنے عظیم الہیئت ہیں کہ ان کی پیمائش کے اعداد انسانی دماغ کو چکرا دینے کے لئے کافی ہیں۔ مثلاً الطالجوزا ہمارے آفتاب سے ۔۔۔۔۔ ۲۵ روکر (پچاس لاکھ) گنا بڑا ہے۔ اگر یہ ستارہ ہمارے آفتاب کی جگہ پر ہو تو اس کے کنارے مریخ تک جا پہنچیں اور ہماری زمین اور اس کا محور اس عظیم الجسامت آفتاب کے اندر یکسر غائب ہو جائیں۔

فضا کی دوسری قندیلیں جنہیں ہم قائم ستاروں کا نام دیتے ہیں اور جو ہمیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے نظر آتے ہیں، درحقیقت فضائے آسمانی میں ۷۰۰ میل فی منٹ کی رفتار سے دوڑ رہے ہیں۔ لیکن اپنی دوری کی وجہ سے ہمیں ایک ہی جگہ پر قایم دکھائی دیتے ہیں۔ بعض ستارے فضا کی گہرائیوں میں گچھوں کی صورت میں نظر آتے ہیں اور ہم انہیں "خمیرہ کی کائناتوں" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک ایک کائنات نہیں بلکہ کئی کئی کائناتوں کا مجموعہ ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ستارے فضا میں اتنی عمیق گہرائیوں میں ہیں کہ ان کی روشنی جو ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کر رہی ہے ہم تک پہنچنے میں کروڑوں سال لیتی ہے۔ اسی فضا کے بعد میں چمکدار گیس کے آتشیں "بادل" ہیں جو حقیقت میں ستاروں کے بھٹے کے بھٹے ہیں اور بعض کے نزدیک دوسرے نامعلوم ستاروں کے آباؤ اجداد یہی ہیں۔ طاقت کی اس مقدار کا اندازہ لگائیے جو یہ اجسام اشعاع (RADIATION) کے ذریعے سے خرچ کر رہے ہیں۔ صرف ہمارا آفتاب اپنے جسم کو ۔۔۔۔۔ ۴۰ (چالیس لاکھ) ٹن فی سیکنڈ کے حساب سے اشعاع کے ذریعے سے خرچ کر رہا ہے۔ لیکن اس کی جسامت اتنی زیادہ ہے کہ اس اسراف کے باوجود ہم اس کے قد و قامت میں کسی قسم کی کمی محسوس نہیں کرتے۔

ہندسین نے نہ صرف خلاء کی گہرائیوں کو ناپا ہے اور ان طاقتوں کو جانچا ہے جن سے یہ آفتاب قایم ہیں بلکہ اپنی گز کی لکڑی لے کر فضائے آسمانی کی پیمایش پر نکل گئے ہیں۔ ان کے نتائج بدرجہ غایت دلچسپ اور حیران کر دینے والے ہیں۔ چنانچہ اضافیت کے نئے نظریے کے مطابق یہ کائنات جسے ہم ہر پہلو سے غیر محدود تصور کرتے چلے آتے ہیں حقیقت میں ہر سمت سے محدود ثابت ہوتی ہے۔ نہ صرف فاصلے میں بلکہ وقت میں بھی۔ وہ ثبوت جن سے ہم ان نتائج پر پہنچے ہیں نہایت مشکل اور دقیق ہیں اور اس کی دلائل ہمارے روزمرہ کے تجربات سے بلند تر ہیں۔

اس نظریے کے مطابق ہمیں فاصلے کے چار بعد بتلائے جاتے ہیں جو طول، عرض، بلندی اور وقت پر مشتمل ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا تصور اس چار بعد والی کائنات کی تصویر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ صرف انہی دلائل کی مدد سے ہم کائنات کی بظاہر بے ربط اشیا کے اس پھیلاؤ کو اپنی اپنی جگہ پر مرتب کر سکتے ہیں۔

یہ تاروں بھرے آسمان، ان عظیم الہیئت آفتابوں اور حسین کہکشاں کے منظر کی بنیادی خصوصیت تنظیم اور باقاعدگی ہے۔

نظام شمسی کا ہر ستارہ، جن میں ہماری زمین بھی شامل ہے ایک

مقررہ رفتار کے ساتھ ایک مقررہ خط کے اندر اپنے بوجھ کو یکساں رکھے ہوئے آفتاب کے گرد گھوم رہا ہے۔ اگر کسی ستارے کے توازن میں ایک ذرے کے برابر بھی فرق آجائے تو ایک لمحے میں ہر چیز خلا میں ادھر اُدھر بکھر کے رہ جائے۔ اس تمام نظام کو ان کار ربیائی ستارہ یعنی آفتاب منضبط کئے ہوئے ہے۔

ایک خاص طاقت کے ذریعے سے جسے کشش ثقلی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو موجود ذرات کی اضافت کے رُو سے اب کسی اور نام سے پکاری جاتی ہے۔ ستاروں کا مقررہ راستہ اور ان کا ربیائی کرتے کے گرد گردش کرنا قایم رہتا ہے۔

بعض ستاروں ـــــ خصوصاً مشتری کا حل اور زمین کے گرد چھوٹے ستارے یعنی ان کے نائبین گردش کرتے ہیں۔ چاند جو ہماری زمین پر مدوجزر کی صورت میں اثر انداز ہوتا ہے انہیں نائبین میں سے ہے۔ کائنات کی جس چیز کی طرف بھی ہم نظر اٹھا کر دیکھیں گے ہمیں تنظیم اور باقاعدگی بدرجۂ غایت دکھائی دے گی۔ سرِ رشتے سے بڑا نظام اپنے سفر کے دوران میں کسی نہ کسی ہمسایہ نظام کو منسلک کئے ہوئے ہے اور یہ عمل ایک بے مثال باقاعدگی سے جاری ہے۔

اب انتہائی بڑی چیزوں کو چھوڑ کر انتہائی چھوٹی چیزوں پر غور کیجئے تو یہاں بھی آپ کو تنظیم و توازن کا وہی دستور العمل جاری دکھائی دے گا۔

کیمیا دان ہر مادی شے کو کسی نہ کسی عنصر سے موسوم کرتا ہے یا چند عناصر کا مرکب بتاتا ہے۔ عناصر کی تعداد ۹۰ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ عنصر یا مرکب چند سالموں یا جوہروں کے مجموعوں پر مشتمل ہوتا ہے کیونکہ جوہر تنہا یا آزاد نہیں رہ سکتا بلکہ چند اور جوہروں سے منسلک یا پیوست ہو کر "قیام" کی اہلیت پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ پانی کا ایک سالمہ جو بطور خود قایم رہ سکتا ہے دو عناصر سے مرکب ہوتا ہے جس میں دو جوہر آکسیجن کے اور ایک ہائیڈروجن کا ہوتا ہے۔

چند سال ہی گذرے ہیں کہ جوہر کو مادے کا جزو لاینجزا سمجھا جاتا تھا اس کا تجزیہ کرنے کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی تھی اور اس ابتدائی اینٹ سے تعبیر کیا جاتا تھا جس سے تمام اجسام کی تعمیر ہوئی ہے۔ گذشتہ صدی کے آخر تک انسان کا علم اس سے آگے نہ بڑھا تھا لیکن یکایک ایک نئے انکشاف نے جوہر کے متعلق پھیلے تمام نظریوں کو باطل کر دیا۔ اب معلوم ہوا کہ جوہر جزو لاینجزا نہیں بلکہ یہ خود چند اجزا سے مرکب ہے جنہیں برقیوں کا نام تفویض کیا گیا ہے۔ ہر جوہر ایک یا اس سے زیادہ برقیوں پر مشتمل ہوتا ہے جو منفی برق کے حامل ہوتے ہیں اور ایک صدر (NUCLEUS) کے گرد گھومتے ہیں جس میں مثبت برق کی مساوی مقدار ہوتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جوہر دراصل نظام شمسی کا ایک ننھا سا نمونہ ہے۔ صدر کی بناوٹ نہایت پیچیدہ ہوتی ہے سوائے ہائیڈروجن کے صدر کے جو مثبت برق کے حامل صرف ایک کرے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسے پروٹون کہتے ہیں۔ ہائیڈروجن کے جوہر میں صدر کی جگہ صرف ایک پروٹون ہوتا ہے اور ایک برقیہ گردش کرتا ہے لیکن باقی عناصر میں چار یا اس سے زیادہ پروٹون صدر ہوتے ہیں اور بہتیرے مختلف تعداد میں ان سے منسلک ہوتے ہیں اور گردش کرنے والے برقیوں کے محتاج نہیں ہوتے۔

دوسرے عناصر کے جوہروں میں نہ صرف صدر کی بناوٹ ہی پیچیدہ ہوتی ہے بلکہ گردش کرنے والے برقیوں کی تعداد بھی کسی قطعی قاعدے کے ماتحت کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ اسی فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے نام عناصر کی ایک فہرست بنائی گئی ہے جس سے ثابت ہوا ہے کہ عناصر کا آپس میں فرق صرف برقیوں اور پروٹون کی کمی بیشی بن کی گوناگون تقسیم اور ان کے مدار پر منحصر ہے۔

یہ بات مجربے میں آچکی ہے کہ ایک عنصر دوسرے عنصر میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ یورینیم (URANIUM) اشعاع دے دے کر آخر کار رجست کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ رجست کو سونے کی صورت میں تبدیل کرنے کا خواب قدیم زمانے سے ہوس دیکھتے چلے آئے ہیں آخر کار اتنا مضحکہ خیز نہیں ہے جتنا کہ خیال کیا جاتا تھا۔

ان نوے عناصر کی فہرست میں جوں جوں ہم اوپر کی طرف نظر ڈالتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ جوہر اپنے مختلف مدارج میں بدلتا چلا جاتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ سالمے کے بنانے میں ایک جوہر کا دوسرے کے ساتھ تعلق مختلف مدارج میں مختلف ہوتا چلا جاتا ہے ـــــ یہ اختلاف بے قاعدہ اور غیر محاسب نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص قاعدے اور ترتیب کے ماتحت عمل میں آتا ہے۔

یہ سالمے اور جوہر یہ دلوں اور برقیے ایک ڈھیر کی صورت میں پھینکے ہوئے نہیں ہیں بلکہ سادہ ترین اجزا سے لے کر مجرد العقول پیچیدگی کے مظاہر تک ہر چیز ایک ہی ضابطے اور قانون کی پابند ہے اور جس طرح عظیم ترین موجودات میں ایک نظام عمل جاری ہے۔ اسی طرح حقیر ترین اشیا

میں بھی وہی باقاعدگی اور ترتیب نظر آتی ہے۔

آئیے اب ہم مضمون زیر بحث سے ذرا تجاوز کر کے جوہر کا تجزیہ اس کے آخری معلومہ اجزا تک کریں اس کے نتائج ذیل میں ظاہر ہوں گے۔

اب تک جو کچھ ہمیں جوہر کے اجزا کے متعلق معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا ایک جزو تو سالمہ ہے اور دوسرے وہ برقیے جو اس کے گرد گردش کرتے ہیں اور یہ سارا نظام ایک خاص سطح (SPACE) میں محدود ہے۔ ان برقی ذروں کی اگر مزید تحقیقات کی جائے تو ایک نئی اور حیران کن حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ یہ برقیے اور پروٹون حقیقت میں "ذرے" نہیں ہیں جیسا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ منفی اور مثبت برقی "امواج" ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بعض دفعہ تو وہ ذرے معلوم ہوتے ہیں اور بعض اوقات امواج کا شبہ ہوتا ہے۔ اسی لئے پروفیسر ایڈنگٹن نے ان کا نام "موج ذرے" (WAVICLE) تجویز کیا ہے جس سے ان کے دوگونہ صفات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ذرے یا امواج، جو کچھ بھی یہ ہیں، نہایت پر اسرار اور عجیب و غریب شے ہیں۔ ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ وہ کیا ہیں اور شاید ہمیں کبھی اس کا علم نہ ہو سکے لیکن ہم ان کی عادات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ عام طریقوں سے ان کی کوئی توضیح نہیں کی جا سکتی اور نہ ان کے لئے کوئی مثال دی جا سکتی ہے اور بالآخر ان کے اظہار کے لئے نہایت پیچیدہ اور معموں کی طرح کی چند ہندسی علامات وضع کرنی پڑی ہیں۔

اس تمام بیان کا ملخص یہ ہے کہ انہیں اجزائے برق کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اب بتائیے کہ مادے کا وجود کہاں رہا؟ کیا وہ بالکل غائب نہیں ہو گیا؟

ان تمام تجربات اور تحقیقات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مادہ بذات خود بالکل ناقابل توجہ شے رہ جاتا ہے۔ مادے کی حیثیت سے اب اس کا کوئی وجود نہیں اور آئندہ اسے برقی امواج سمجھنا چاہئے۔

منطقی نقطۂ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر عنصر، ہر مرکب، ہر پودہ، ہر حیوان اور انسان چونکہ مختلف عناصر اور ان کے مرکبات کے علاوہ اور کسی چیز کی مدد سے نہیں بنا اس لئے ان کا وجود سوائے برقی امواج یا برقی ذروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی

"اُس شے سے ہم بنے ہیں جس سے بنی ہیں خوابیں"

عبدالعزیز خاں

غزل

کسی مستِ شباب کی دنیا
ایسی ہے، جیسے خواب کی دنیا

ہائے ظالم کی مست آنکھوں میں
بس رہی ہے شراب کی دنیا

حُسن اس شوخ کا، خدا کی پناہ
ہے مہ و آفتاب کی دنیا

چین دم بھر، اسے نصیب نہیں
دل ہے، یا انقلاب کی دنیا!

محوِ غفلت ہے کائنات تمام
ساری دنیا ہے خواب کی دنیا

موت میں دو جہاں کی راحت ہے
زندگی ہے عذاب کی دنیا

حرصِ دنیا میں پھنس کے اے امجد
تو نے اپنی خراب کی دنیا!

امجد حیدرآبادی

دریا

دریا ہے کہ دیوانۂ آتش تہ پا ہے — خود قافلۂ شوق خود آوازِ درا ہے!
شوریدہ و سرمست ہے سرگرمِ سفر ہے — کچھ شام کی پروا ہے، نہ پروائے سحر ہے
اس شور میں بھی نغمے کا انداز ہے پیدا — بے زخمہ و بے تار عجب ساز ہے پیدا
جاری سحر و شام ہے اک نغمۂ مستی — یہ نغمۂ مستی ہے کہ ہنگامۂ ہستی!
کس عالمِ پرکیف میں منزل کو رواں ہے — گرم تگ و دو، رقص کناں زمزمہ خواں ہے
اک نعرۂ مردانہ ہے یہ نغمہ نہیں ہے — اک شورشِ مستانہ ہے یہ نغمہ نہیں ہے
افسردہ دلوں کے لئے پیغامِ بقا ہے — درماندہ مسافر کے لئے بانگِ درا ہے

ہو شوق تو مشکل کوئی مشکل نہیں رہتی
رہرو کے لئے سختیٔ منزل نہیں رہتی،

اثر صہبائی



اجنبی

تاریکی میں سے نکل کر یکایک ایک آدمی ہمارے آگ کے الاؤ کے پاس روشنی کے چھوٹے سے حلقے کے اندر ایک ٹیلے پر آن بیٹھا اور نہایت کرخت لہجے میں بولا "اس علاقے میں آنے والے تم پہلے آدمی نہیں ہو"

ہم میں سے کسی شخص نے اس کے بیان کو جھٹلانے کی جرأت نہ کی کیونکہ اس کا اپنا وجود اس کے دعوے کی دلیل تھا۔ وہ ہمارے ساتھیوں میں سے نہ تھا اور بہت ممکن ہے کہ جب ہم پناؤ ڈیرہ لگا رہے تھے تو وہ یہیں کہیں نزدیک ہی موجود ہو۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھی بھی کہیں دور نہ ہوں گے کیونکہ اس علاقے میں کسی اکیلے دکیلے شخص کا تن تنہا رہنا یا سفر کرنا بالکل ناممکن تھا۔ فریبتا ایک پہنتے سے ہم ایسی سرزمین میں سے گزر رہے تھے جہاں لینے اور اپنے جانوروں کے علاوہ ہمیں صرف سانپ اور زہریلے بیتنک ہی نظر آتے رہے۔ روسی ترکستان کے اس دشوار گذار علاقے میں انسان صرف ایسے ساتھیوں کی معیت میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ اس کے ساتھ باربرداری کے جانور، اسباب خورد و نوش ہتھیار اور اسی قسم کا مکمل سامان ہونا ضروری ہے اور جب یہ تمام چیزیں ہوں تو اس کے ساتھ مددگاروں کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اس اندیشے نے کہ معلوم نہیں اس اجنبی کے ہمراہی کس قماش کے لوگ ہوں گے اور پھر اس کے ساتھ ہی اس کے بیزار طلبانہ لہجے نے ہم چھپوں کو اٹھا کر بٹھا دیا اور ہر ایک نے اپنے اپنے ہتھیار کو گرفت میں لے لیا۔ ہمارا یہ طرز عمل اس وقت اور موقع کے پیش نظر احتیاط کی پیش بندی کے طور پر غیر موزوں بھی نہ تھا لیکن اجنبی نے اس کی پروا تک نہ کی اور اسی کرخت لہجے میں جس میں اس نے پہلا فقرہ ادا کیا تھا اپنے سلسلۂ کلام کو یوں جاری رکھا:

"تیس سال ہوئے اسلم، اکرم، فضل اور اکبر سرحد افغانستان کے چار پہاڑی بہادر کافی سازوسامان کے ساتھ تمام انسانی آبادیوں سے گذر کر آگے بڑھ گئے۔ ہم سونے کی تلاش میں آئے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ اگر ہماری کوششیں کامیاب نہ ہوئیں تو ہم اس غیر آباد علاقے کو عبور کر کے پار نکل جائیں گے جہاں ہمارے خیال میں روسی حکومت کی آبادیاں شروع ہوتی تھیں۔ ہمارا ساز و سامان تو کافی تھا لیکن ہمارے ساتھ کوئی راہبر نہ تھا۔ صرف اسلم، اکرم، فضل اور اکبر جا رہے تھے۔"

وہ شخص ان ناموں کو آہستہ آہستہ اور صاف آواز کے ساتھ یوں دہراتا تھا جیسے اپنے سامعین کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہو۔ ہم میں سے ہر شخص نہایت توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے مطلق طرز عمل نے اب وہ خطرہ تو دور کر دیا تھا جس کا اندیشہ ہمیں اس کی ذات سے تھا۔ لیکن تاریکی کی اس دیوار کے پیچھے جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی اس کے چھپے ہوئے نامعلوم ساتھیوں کی طرف سے ہم ابھی تک چوکنے تھے۔ اس کا اپنا طرز عمل روشنی کے بجائے دیوانگی کے زیادہ قریب تھا۔ ہم لوگ تجربے سے جانتے تھے کہ آبادیوں میں رہنے والے ان ویران علاقوں میں رہ کر ایسی عادات و اطوار اختیار کر لیتے ہیں جن کا دیوانگی سے امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انسان کی مثال ایک درخت کی سی ہے جو اپنے ساتھیوں کے درمیان سیدھا اور تنا ور کھڑا رہتا ہے لیکن اگر اسے بیجنسوں سے دور کسی کھلے میدان میں لگا دیا جائے تو اس میں بیکاروں قسم کے خم پیدا ہو جاتے ہیں آگ کی تیز روشنی سے آنکھوں کو بچانے کے لئے اپنی جھکے دار ٹوپی کو آگے کی طرف جھکاتے ہوئے کچھ اس قسم کے خیالات میرے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ بے شک بے چارہ سیدھا سادا آدمی ہے لیکن اس ویران اور صحرائی مقام میں یہ کیا کر رہا ہے؟

چونکہ اس سکوت کو کسی نے نہ توڑا اس لئے اجنبی پھر گویا ہوا:

"اس زمانے میں یہ علاقہ آج کی طرح نہیں تھا۔ جھاڑیوں کا نام و نشان نہ تھا۔ پہاڑیوں میں کہیں کہیں شکار بھی مل جاتا تھا اور بعض آبی گڑھوں کے گرد گھاس بھی اگا ہوا تھا جس پر ہمارے جانور کسی حد تک گذارا کر کے فاقہ کشی کی موت سے بچے ہوئے تھے۔ اگر ہماری خوش قسمتی ہمیں وحشی لٹیروں سے بچائے رکھتی تو شاید ہم اس ویران حصہ سے گزر کر آبادی میں پہنچ جاتے

لیکن ہوا یہ کہ ایک ہی ہفتے کے دوران میں بجائے دولت کے انبار لگنے کے ہمیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ ہم آتما آگئے نکل گئے تھے کہ واپسی کے خیال میں کوئی کشش باقی نہ رہی تھی کیونکہ جن مصائب میں سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے تھے ان سے بدتر مصائب کا تصور ہی نہ ہو سکتا تھا۔

چنانچہ راتوں کی تاریکی میں وحشیوں کی نظروں سے حتی الامکان چھپتے ہوئے ہم آگے ہی بڑھتے گئے۔ بعض اوقات ہمارا کھانا اور پانی بالکل ختم ہو جاتا اور ہم کئی کئی دنوں تک بھوکے اور پیاسے سفر کرتے رہتے لیکن یکایک کوئی چشمہ یا پانی کا گڑھا مل جاتا جس سے ہمارے ہوش و حواس پھر درست ہو جاتے اور ہم ان جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کے قابل ہو جاتے جو شاید موت کے متلاشی ہوتے تھے۔ ہمارا شکار کبھی پرندہ ہوتا کبھی بارہ سنگھا اور کبھی بھیڑیا یا لومڑی یا بیجا۔ غرضکہ جو کچھ بھی خدا ہمیں کھانے کے لئے بھیج دیتا ہم صبر و شکر سے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔

"ایک روز مل الصبح ہم ایک طویل پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے کہ شاید اسے عبور کرنے کے لئے کوئی درہ مل جائے یہ مقام اس جگہ سے نزدیک ہی ہے کہ ناگہاں وحشیوں کی ایک ٹولی نے ہم پر حملہ کر دیا یہ لوگ پچھلی وادی سے ہمارا تعاقب کرتے چلے آ رہے تھے۔ وحشی چونکہ ہماری تعداد سے دس گنا زیادہ تھے اس لئے انہوں نے چھپ کر حملہ کرنے کے بجائے اپنی عادت کے خلاف کھلم کھلا چیختے چلاتے ہوئے اور گولیاں سرکرتے ہوئے ہم پر گھوڑے دوڑا دیئے۔ ہمارے لئے ان کے ساتھ نبرد آزما ہونا جنون سے کم نہ تھا۔ ہم اپنے مریل جانوروں کو جہاں تک قدم رکھنے کی جگہ ملتی گھاٹی پر چڑھائے گئے اور پھر گھوڑوں سے اتر کر ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو گئے اور اپنے تمام سامان کو دشمنوں کے رحم پر چھوڑ دیا۔ لیکن ہم نے اپنی بندوقیں نہ چھوڑیں۔ اسلم، کریم، فضل اور اکبر چاروں کے پاس بندوقیں موجود تھیں"۔

یکایک ہمارا ایک سخنور ساتھی بول اٹھا "وہی پرانی فوج" لیکن ہمارے سردار کے ناپسندیدگی کے اظہار نے اسے فوراً خاموش کر دیا اور اجنبی نے اپنے قصے کو پھر جاری کر دیا۔

"وحشی بھی گھوڑوں سے اتر پڑے اور گھاٹی پر اس جگہ سے بھی اوپر آ گئے جہاں ہم اترتے تھے اور ہمارے بھاگ نکلنے کا جو راستہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی مسدود کر دیا۔ چنانچہ ہم اور اوپر چڑھ گئے۔ بدقسمتی سے جو ٹیلہ ہمیں پناہ دیئے ہوئے تھا یہاں آ کر ختم ہو گیا اور اس کی اوٹ سے ظاہر ہوتے ہی ہم پر بارہ گولیوں کی باڑھ پڑی۔ وحشی قبائل جلدی میں صحیح نشانہ نہیں لگا سکتے چنانچہ خدا نے ہم سب کو بچا لیا۔ ہمارے مقام سے بیس گز کی بلندی پر ٹیلے کی چوٹی سے پرے دو عمودی چٹانیں تھیں جن کے درمیان ایک تنگ سا غار نظر آ رہا تھا۔ ہم ہانپتے ہوئے اس کی طرف دوڑے اور دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے سے کمرے کے برابر ہے۔ کچھ عرصے تک ہم یہاں محفوظ تھے۔ اور ہمارا صرف ایک آدمی اپنی بندوق سے اس علاقے کے تمام وحشیوں کو روک سکتا تھا۔ لیکن بھوک اور پیاس کے مقابلے کا ہمارے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ حرارت و ہمت ابھی تک موجود تھی لیکن امید ایک خیال ہو گئی تھی۔

اس کے بعد ان وحشیوں میں سے ایک کی شکل بھی ہمیں نظر نہ آئی لیکن ان کی آگ کی چمک اور دھوئیں کی موجودگی ہمیں بتا رہی تھی کہ وہ دن رات اپنی بندوقیں بھرے تیار بیٹھے ہیں اور ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم میں سے ایک بھی باہر نکلا تو قبل اس کے کہ تین قدم بھی چلے وہ گولیوں سے چھلنی ہو جائے گا۔ تین دن تک ہم باری باری سے پہرہ دیتے ہوئے اپنے محاصرین سے محفوظ رہے لیکن اب ہماری تکالیف ناقابل برداشت ہو چکی تھیں۔ پھر چوتھے دن کی صبح کو اسلم بولا "بھائیو میں خدا پر ایمان نہیں رکھتا اور نہ مجھے معلوم ہے کہ اسے خوش کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے میں نے اپنی زندگی مذہب سے بیگانہ رہ کر گزاری ہے۔ بھائیو مجھے معاف کرنا کیونکہ میرے لئے وقت آ گیا ہے کہ میں وحشیوں کی آرزوؤں کو پامال کر دوں"۔

"وہ غار کے سنگیں فرش پر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور "اماں اسلم" کی روح آ رہی ہے" کہتے ہوئے پستول کی گولی اپنی کنپٹی میں مار کر ہلاک ہو گیا اور کریم فضل اور اکبر باقی رہ گئے۔

میں ان کا سردار تھا اس لئے مجھے اس موقع پر کچھ کہنا چاہیئے تھا۔ چنانچہ میں نے کہا:۔ اسلم ایک دلیر انسان تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کب اور کس طرح مرنا چاہیئے۔ واقعی بھوک اور پیاس سے مرنا یا وحشیوں کی گولیوں کا شکار ہونا یا گرفتار ہو کر زندہ کھال اتروانا بے وقوفی اور بد ذوقی کی دلیل ہے آؤ ہم بھی اسلم سے جا ملیں۔

"میں تائید کرتا ہوں" کریم بولا

"میں بھی متفق ہوں" فضل نے کہا

"میں نے اسلم کی لاش کو لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر دیئے اور اس کے منہ کو رومال سے ڈھک دیا۔ پھر کریم بولا کہ میں بھی چاہتا ہوں کہ مر کر اسی طرح نظر آؤں اور فضل بولا کہ ہم اتنا کچھ دیر کے لئے میں بھی اسی طرح رہنا

چاہتا ہوں۔

میں نے کہا ایسا ہی ہوگا اور ان وحشی کتوں کو ہماری لاشیں ٹھکانے کرنے کے لئے کم از کم ایک ہفتہ اور انتظار کرنا پڑے گا۔ کریم! اور فضل! اپنے ہتھیار نکالو اور دو زانو ہو جاؤ۔

انہوں نے تعمیل کی اور میں ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"اے غفور و رحیم خدا" میں نے کہا

"اے غفور رحیم خدا" کریم نے کہا

"اے غفور رحیم خدا" فضل نے دہرایا

"ہمارے گناہوں کو معاف کر دے" میں نے کہا

"ہمارے گناہوں کو معاف کر دے" انہوں نے دہرایا

"اور ہماری روحوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے"

"اور ہماری روحوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے"

"آمین"

"آمین"

چنانچہ میں نے ان کی لاشوں کو بھی اسلم کے پہلو میں لٹا دیا اور ان کے چہروں پر رومال ڈال دئے۔

یکایک ہمارے آگ کے الاؤ کے پرلی طرف ایک شور سا اٹھا اور ہمارا ایک ساتھی ہاتھ میں پستول لئے ہوئے پکا "اور تم... تم جان بچا کر نکل بھاگے! ان کو مار کر تم زندہ بچ نکلے! بزدل کمینے، کتے!!! میں تمہیں بھی ان کے پیچھے بھیج کے رہوں گا خواہ مجھے اس کے بدلے میں تختہ دار پر کھڑا ہونا پڑے۔"

لیکن ہمارا کپتان چیتے کی طرح جھپٹ کر حملہ آور پر جا گرا اور اس کے پستول والے ہاتھ کو اپنی آہنی گرفت میں لے کر بولا "صبر کرو اختر! صبر کرو!"

ہم سب کھڑے ہو گئے تھے لیکن اجنبی بے حس و حرکت اور نہایت بے اعتنائی کے ساتھ اس طرح اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ کسی نے اختر کا بازو پکڑ کر پرے گھسیٹ لیا۔

میں نے کہا "کپتان، اس تمام معاملے میں کچھ غلطی ضرور ہے یہ شخص یا تو دیوانہ ہے یا بھٹرا ہے — ایسا بھڑوا جیسے ہمیں روزمرہ کی زندگی میں ملتے رہتے ہیں اور اختر اس کے قتل کرنے میں کسی طرح بھی حق بجانب نہیں ہے اگر یہ شخص انہیں لوگوں کا ساتھی ہوتا تو وہ پانچ ہوتے اور بہت ممکن ہے کہ اس نے دیدہ دانستہ پانچویں کا نام نہیں لیا یعنی اپنا"

"ہاں" کپتان نے کہا اور اختر کا بازو چھوڑ دیا "اس میں کچھ راز ضرور ہے

کوئی غیر معمولی بات ہے۔ کئی سال کا ذکر ہے اس غار کے منہ پر چار آدمیوں کی لاشیں ملی تھیں۔ ان کی کھوپریاں چور چور ہو رہی تھیں اور نہایت خوفناک طریقے پر ان کے اعضا کی قطع و برید ہو رہی تھی۔ انہیں وہیں دفن کر دیا گیا تھا میں نے ان کی قبریں بھی دیکھی تھیں اور کل تم سب کو دکھاؤں گا۔"

اجنبی کھڑا ہو گیا۔ الاؤ کی لپکتی ہوئی آگ کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ اور بھی لمبا نظر آ رہا تھا۔ اس کی کہانی سننے میں ہم اس طرح محو تھے کہ الاؤ پر لکڑیاں ڈالنا بھی بھول گئے تھے۔

اجنبی پھر بولا "وہ چار تھے — اسلم، کریم، فضل اور اکبر"

ناموں کو آخری مرتبہ پکار کر وہ تاریکی کی طرف چل پڑا اور پھر ہم نے اسے کبھی نہ دیکھا۔

اسی وقت ہمارا ایک ساتھی جو پہرہ پر کھڑا تھا ہاتھ میں بندوق تھامے ہوئے کچھ مضطربانہ انداز میں بھاگتا ہوا آیا۔ اور بولا:۔

"کپتان صاحب! میں آدھے گھنٹے سے ان بھاڑیوں کے پاس تین آدمیوں کو کھڑے ہوئے دیکھتا رہا ہوں" اس نے اس سمت کی طرف اشارہ کیا جس طرف اجنبی گیا تھا۔ "وہ مجھے بالکل صاف نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ چاندنی کی تابانی سے چمک رہا ہے۔ ان کے پاس کوئی بندوق نہ تھی اور میں نے انہیں اپنی بندوق کے نشانے پر لے رکھا تھا اور منتظر تھا کہ وہ کوئی حرکت کریں تو میں اپنا کام کر دوں — لیکن انہوں نے حرکت ہی نہیں کی۔ لیکن کپتان صاحب عجیب بات یہ ہے کہ ان کی طرف دیکھ دیکھ کر میرے اعصاب کا کچھ نکل گیا ہے اور اب وہ نظر نہیں آتے۔"

"اپنے پہرے پر واپس جاؤ اور اس وقت تک کھڑے رہو جب تک وہ تمہیں دوبارہ نظر نہ آئیں" کپتان نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور تم سب دوبارہ لیٹ جاؤ ورنہ میں سب کو آگ میں دھکیل دوں گا۔"

پہرہ دار بڑبڑاتا ہوا اپنی جگہ پر جا پہنچا اور پھر واپس نہ آیا۔ ہم اپنے کمبل درست کر رہے تھے کہ آتش مزاج اختر بولا "خطا معاف ہو، کپتان! لیکن وہ شیطان تھے کون؟"

"اسلم، کریم اور فضل"

"لیکن اکبر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ اسے قتل کر دینا ہی مناسب تھا۔"

"بے فائدہ، کیونکہ جتنا وہ مر چکا ہے اس سے زیادہ تم اسے نہیں مار سکتے۔ اب سو جاؤ!"

مظفر احمد

(ترجمہ)

طیّارہ

ذرا دیکھ اے صاحبِ سوز و ساز
ہوا میں ہے پرّاں ہوائی جہاز

یہ افلاک پیما ہے سیّارہ ہے
یہ پہنائے گردوں کا طیّارہ ہے

یہ شہزادۂ ملکِ افلاک ہے
ہوا کے سمندر کا تیراک ہے

فرشتہ ہے شہرِ ثریّا کا یہ
پیمبر ہے تاروں کی دنیا کا یہ

فضاؤں میں اس کی تگ و تاز ہے
کہ انسان کا ذوقِ پرواز ہے

یہ صرصر کی مانند ہے تیز گام
سحر ہے کراچی میں برلن میں شام

تھپیڑے ہواؤں کے کھاتا ہوا
اڑا جاتا ہے مسکراتا ہوا

گذرتا ہے مانندِ ابرِ بہار
کھڑے دیکھتے ہیں اسے کوہسار

کئی بحر و امصار طے کر گیا
کئی دشت و گلزار طے کر گیا

نہ جاندار ہے یہ نہ پردار ہے
مگر سب پرندوں کا سردار ہے

نہ کرگس نہ طاؤس پرّاں ہے یہ
کمالِ تمنائے انساں ہے یہ

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی

اڈیٹر

کردار

۱۔ اڈیٹر فلمی رسالہ "پردہ سیمیں" بی اے ۴۔ دو کاتب
۲۔ اڈیٹر کی تیسری بیوی ۵۔ دو ملازم
۳۔ اس کا سات سالہ بھتیجا ۶۔ اور دو صوبی

مقام:۔ باب الہند بمبئی

زمانہ:۔ عہد حاضر

پہلا منظر

دفتر "پردہ سیمیں"

(ایک تنگ کمرہ جس میں صرف ایک کھڑکی اور ایک دروازہ ہے کھڑکی کے قریب اڈیٹر کی تین ٹانگ کی میز دیوار سے ٹکا کر رکھی ہوئی ہے۔ اس کے پاس ہی ایک نہایت اونچی کرسی ہے جو بظاہر کسی اسٹول خانہ کی معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بید کی دو اور کرسیاں موجود ہیں۔ کمرے کے ایک تہائی حصہ پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ دیواروں پر کئی کیلنڈر اور ایکٹرسوں کی تصویریں ٹنگی ہیں۔ میز پر دو موٹی موٹی کتابیں، چند اخبارات اور رسائل بکھرے ہوئے ہیں۔ قلمدان اور دوات کے اردگرد روشنائی کے بے شمار دھبے پڑے ہیں جو دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ میز کے ایک سرے پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ کاتب حضرات ایک بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے کتابت میں منہمک ہیں۔ دروازے کے پاس ایک اسٹول پر ملازم بیٹھا گنگنا رہا ہے ؎

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا

ایک لمحہ بعد ملازم خاموش ہو جاتا ہے۔ بھاری قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور اڈیٹر کمرے میں داخل ہوتا ہے ٹوپی اتار کر ایک طرف پھینکتا ہے اور میز کے اوپر بیٹھ کر کرسی پر پیر پھیلا دیتا ہے)

اڈیٹر۔ آج کی ڈاک سے کوئی منی آرڈر آیا تھا؟

ایک کاتب۔ ابھی ڈاک نہیں آئی جناب!

(عین اسی وقت ڈاکیہ داخل ہوتا ہے)

ڈاکیہ۔ (ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے) ایڈیٹر پردہ سیمیں۔

اڈیٹر۔ ہاں (لفافہ لے کر چاک کرتا ہے)

ڈاکیہ۔ ڈھائی آنے دلوائیے حضور!

اڈیٹر۔ (منہ بگاڑ کر) ہیرنگ ہے یہ؟

ڈاکیہ۔ جی ہاں۔

اڈیٹر۔ (کاتب سے) ڈھائی آنے دے دیجئے۔ میرے پاس اس وقت چک ہے روپے لانے پر لوٹا دوں گا۔ یا دو لائیے گا!

کاتب۔ (جیب ٹٹول کر دوسرے کاتب سے) میرے پاس چھ پیسے ہیں، چار آپ دے دیجئے۔

دوسرا کاتب۔ چار پیسے، اچھا لاؤ آنے سے سگرٹ آپ کے ذمے رہا پھر!

(ڈاکیہ پیسے پاکر چلا جاتا ہے۔ کاتب لکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں! اڈیٹر لفافہ کھولتا ہے جس میں سے ایک مقامی اخبار کی نارنجی قطع کا ایک ورق نکلتا ہے جسے وہ ایک جگہ سے سرگوشیوں کے لہجے میں یوں پڑھتا ہے)

اڈیٹر۔ کھاس چھینے چھیلنے اڈیٹر صاحب پردہ سیمیں کو یہ کیا سوجھی جو فلوں

لیٹیے پر مضمون لکھنے بیٹھ گئے . . . ؟

(چراغ پا ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ اس اثنا میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

اڈیٹر۔ (ٹیلیفون کا ریسیور کان سے لگا کر) ہلو، کون؟ حامد بھائی! ——— جی ہاں میں نے بھی اسے دیکھا۔ بلکہ کسی کم بخت نے مجھے وہ ورق کامل کر کے بھیج دیا ہے ——— دنیا میں کیسے کیسے کینے بستے ہیں! ؟ ——— اں ——— حامد بھائی میں ذرا اس وقت بہت عدیم الفرصت ہوں پھر مفصل گفتگو ہوگی ——— اچھا . . . (سلسلہ منقطع کرتا ہے)

کاتب۔ کیا بات ہے صاحب؟

اڈیٹر۔ کچھ نہیں!

(پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

اڈیٹر۔ (فون لے کر) ہلو، ہلو، کون؟ وکیل صاحب! ——— شکریہ ——— اں اں میں نے دیکھا۔ کس قدر لغوبات ہے ——— مقدمہ دائر کر دوں؟ فائدہ؟! بہت خوب، میں غور کروں گا۔ اس وقت اڈیٹوریل لکھ رہا ہوں، معاف فرمائیے . . .

کاتب۔ (سر اٹھا کر) اس صفحہ پر بیسات سطریں بچ رہی ہیں۔

اڈیٹر۔ لکھ دو جلی قلم سے رک رک کر لکھواتا ہے) مستقبل قریب کی کسی اشاعت میں . . . مس الیسی کی . . . خاص زاویہ سے . . . کھینچی ہوئی سرگرمی تصویر کا بے صبری سے انتظار کیجئے۔ بیٹھو۔

(پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

اڈیٹر۔ ہلو۔ یوسفی؟ کیسے مزاج ہیں؟ ——— میں بھی اسی فکر میں ہوں۔ کوئی تنقید ہے کہ بحث وہ کیا فسانی بلی کھانوچنے والی بات ہے! میں اسی کے متعلق اپنے وکیل سے مشورہ لے رہا ہوں۔ بے چارے بڑی دیر سے بیٹھے ہیں۔ اچھا . . .

(سلسلہ منقطع کرتا ہے کہ پھر گھنٹی بجتی ہے)

اڈیٹر۔ (جھنجھلا کر کاتب سے) دیکھو فون پر کون ہے کون ہے، کوئی ہمیں پوچھے تو کہہ دو نہیں ہیں۔

کاتب (فون لے کر) ہلو، ہلو، کیا؟ کیا؟ اور سب کہاں سے بولتے ہیں جی؟؟

اڈیٹر۔ کیا کہتے ہو؟

کاتب۔ (لے کو منہ سے لگاتے ہوئے) دیکھئے صاحب پوچھتا ہے۔ کہاں سے بولتے ہو۔ کہہ دوں منہ سے بولتے ہیں؟

اڈیٹر۔ ہیں ہیں! تم نے کیا کہہ ڈالا۔ لاؤ لیک کر فون چھین لیتا ہے) ہلو، کون؟ پولیس سٹیشن؟ جی ہاں، دفتر پر وہ یہیں اور ہیں؟ ——— میں جنرل منیجر جی کیا؟ ہمارا ملازم گرفتار ہو گیا۔ سائیکل کا حادثہ؟ لیکن اڈیٹر صاحب تو نہیں ہیں دفتر میں . . . .

دوسرا کاتب۔ (جو اب تک خاموش تھا) یہ تو ہونے والی بات تھی۔ دفتر کی سائیکل میں نہ تو گھنٹی تھی نہ بریک، حادثہ نہ ہو تو کیا ہو۔

(اڈیٹر پریشانی کے عالم میں کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتا ہے، سگرٹ جلاتا ہے، آدھا پینے کے بعد بجھا کر جیب میں رکھ لیتا ہے اور پھر ٹیلیفون پر آتا ہے)

اڈیٹر۔ رکسی سے سلسلہ ملائے بغیر کاتبوں کو سنانے کے لئے ذرا بلند آواز سے) دیکھو آؤ۔ انجنیر صاحب ہیں مکان پر؟ خیر، بھائی ذرا لپک کر دوسری منزل پر میرے اں در یافت کر لو کہ تھنے کی طبیعت اب کیسی ہے۔ دو منٹ توقف کے بعد) کیا؟ بھانجا نیز ہو گیا، وہ بے ہوش ہے؟ اف یہ کیا ہو گیا، اچھا تو میں آرہا ہوں رکاتبوں کی طرف دیکھ کر) تھا بہت علیل ہے۔ میں مکان جا رہا ہوں۔

کاتب۔ اور فادر بے چارے کی رہائی۔

دوسرا کاتب۔ میں نے اس سے پہلے ہی کہا تھا کہ سائیکل پر نہ جاؤ خدا نخواستہ . . .

اڈیٹر۔ . . . اچھا اچھا، میں غور کروں گا۔

(اڈیٹر ٹوپی سنبھال کر کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

(پردہ)

دوسرا منظر

اڈیٹر کا مکان۔

(ایک آراستہ ڈرائنگ روم۔ دائیں جانب لیک دروازہ جو خوابگاہ میں کھلتا ہے۔ اس میں ایک سہری نظر آتی ہے جس پر کچھ رانی پڑی ہے۔ اڈیٹر گردن تک ایک سفید کی کرسی میں دوا ہوا سگریٹ کی ڈبیہ سے کھیل رہا ہے۔ خواب گاہ کے دروازے سے اس کی بیوی مسکراتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

بیوی۔ آج بے وقت کیسے آ گئے، خیریت تو ہے؟

اڈیٹر۔ آگئے ہماری مرضی، بے وقت آگئے تو کیا گھر میں نہ گھسنے دوگی؟

(اڈیٹر کا بھتیجا پھلنا کودتا داخل ہوتا ہے)

بھتیجا۔ (اڈیٹر کے قریب آکر) چچا جان دیکھئے میں کب سے کہہ رہا ہوں چچی جان مجھے . . .

اڈیٹر۔ (طمانچہ رسید کرکے) تم بہت شریر ہوگئے ہو ننھے! جاؤ کھیلو۔

(رومال نکالنے کے لئے شیروانی کی تمام جیبیں ٹٹولتا ہے ملازم داخل ہوتا ہے)

ملازم۔ دھوبی آیا ہے۔

(پیچھے پیچھے بغل میں پشتارہ دبائے دھوبی آتا ہے اڈیٹر کی بیوی اندر چلی جاتی ہے)

دھوبی۔ سلام صاحب!

اڈیٹر۔ رومال لائے؟

دھوبی۔ جی حضور، (تمام کپڑے گنتا ہے) دو پتلون، ایک بنیان، ایک جوڑا موزے، دو قمیص، ایک کالر، شیروانی ——— صاحب رومال تو پھر بھول آیا . . . اس کمیپ میں ضرور . . .

اڈیٹر۔ (شیروانی اٹھاکر) اس کا گلا بھی پھاڑ لائے۔

دھوبی۔ وہ پہلے ہی پھٹا تھا صاحب۔

اڈیٹر۔ بکو مت، اب بہت کپڑے چرانے لگے ہو۔

ننھا۔ (باہر سے آکر) ڈاکیہ آیا ہے، چچا جان!

اڈیٹر۔ آیا ہے تو ہم کیا کریں، ملنے آیا ہے وہ ہم سے؟ کوئی خط ہوتو لے لو

ملازم۔ (جو اس اثنا میں باہر جاکر پھر اندر آتا ہے) اور حضور پیسے۔

اڈیٹر۔ کیسے پیسے؟

ملازم۔ پیرنگ ہے حضور!

اڈیٹر۔ پیرنگ! کہہ دو نہیں چاہئے۔

ملازم۔ مگر وہ آپ کے نام کا ہے، کہہ دوں نہیں چاہئے؟

اڈیٹر۔ شریفوں کا قاعدہ ہے پیرنگ خطوط نہیں لیتے۔ یہ ہندیہ کے خلاف ہے۔

ملازم۔ پہلے تو آپ رومال کر لیا کرتے تھے حضور۔

اڈیٹر۔ (کرخت لہجے میں) بکو اس نہ کر، جاتا ہے کہ نہیں یہاں سے! بدذات

(ملازم زیر لب بڑبڑاتا ہوا واپس چلا جاتا ہے۔ پیچھے پیچھے دھوبی بھی ہاتھ ملتا ہوا کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

(پردہ)

تیسرا منظر

دفتر پردہ سیمیں

(اڈیٹر اپنی میز پر بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔ بال پریشان ہیں۔ شیروانی اور اس کے اندر قمیص بٹن کھلے ہیں)

اڈیٹر۔ (سر اٹھاکر) کاتب صاحب آپ کو میرا وہ شعر یاد ہے؟

کاتب۔ (قلم روک کر) کونسا؟

اڈیٹر۔ وہ کچھ ایسا ہی تھا ؎

شومئی قسمت جب امیدوں کا لنگر توڑ دے

کاتب۔ شومئی قسمت . . .

اڈیٹر۔ . . . . . جب امیدوں کا لنگر توڑ دے ——— مصرع ثانی کیا ہے اس کا؟

کاتب۔ صاحب اس کا ثانی نہیں . . .

اڈیٹر۔ کیا؟

کاتب۔ حضور مجھے اس کا مصرع ثانی یاد نہیں ہے

دوسرا کاتب۔ (قلم کو تہبند سے پونچھتے ہوئے) اگر اجازت دیجئے تو مصرع ثانی میں بنا دوں۔

اڈیٹر۔ (طنزاً) مگر اس کے تو حقوق محفوظ ہوں گے؟

دوسرا کاتب۔ نہیں نہیں، بخشا ہوا سمجھئے۔

اڈیٹر۔ اچھا جلدی کہو کچھ سوجھا!

دوسرا کاتب۔ (ترنم سے) شومئی قسمت جب امیدوں کا لنگر توڑ دے

ملازم۔ (قریب آکر) بھئی واہ!

پہلا کاتب۔ شومئی قسمت جب امیدوں کا لنگر . . .

دوسرا کاتب۔ توڑ دے . . . ہمی عرض کیا ہے ع

ناخدا کو چاہئے کشتی خدا پر چھوڑ دے

ملازم اور کاتب۔ واہ واہ! خوب! بھئی واہ! کیا گرہ لگائی ہے! واہ . . .

(کاتب کھڑا ہوکر آداب بجالاتا ہے اور بار بار شعر پڑھتا ہے۔ داد دینے والے خاموش ہو جاتے ہیں لیکن وہ سلام کئے جاتا ہے اور جب اس کو احساس ہوتا ہے تو یک بارگی چہرہ کو سنجیدہ بنا کر کتابت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اڈیٹر دوبارہ لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور سکرائے ہوئے اپنے لکھے کو دھراتا ہے)

اڈیٹر۔ اداریہ کی اخیر سطر لکھ رہا تھا کہ ایک شعر حسب حال ہوگیا جو درج ذیل ہے ؎

شومئی قسمت . . . .

(پردہ)

غلام عباس "ہولی"

نوائے فراق

وفورِ شوق کو کچھ جوشِ حسنِ راہ تو دے
یہ برقِ جلوہ تری فرصتِ نگاہ تو دے

رہے گا کھل کے کبھی رازِ ہوش و غفلت بھی
پتہ کچھ اپنا سیہ مستیٔ نگاہ تو دے

دل اپنا ڈوب چلا جب تو ذکر ساحل کیا
یہ ناؤ بیٹھ کے دریائے غم کی تھاہ تو دے

غم و خوشی میں۔ ترے حسنِ بے پناہ کی خیر
تباہ حال دلوں کو کہیں پناہ تو دے

علاجِ خوبیٔ تقدیرِ عشق کیا ہمدم
وہ دل سے عہدِ وفا باندھ کر نباہ تو دے

بتائے کون خموشی کو داستاں کرنا
کہ یہ پیامِ نہاں دے تری نگاہ تو دے

اک آہ سرد سہی اک نوائے درد سہی
یہ ضبطِ غم کبھی بے چارگی کو راہ تو دے

ہر اک کی ہوش کا کھل جائے گا بھرم ساقی
کچھ اذنِ بادہ کشی مستیٔ نگاہ تو دے

بجا یہ عالمِ مستی۔ یہ کیفیت برحق
خبر کچھ اپنی مگر نرگسِ سیاہ تو دے

نہیں ہے چین جو قسمت میں اے غمِ جاناں
کشاکشِ غمِ دنیا سے کچھ پناہ تو دے

رہی ہے راز سراسر اگرچہ فطرتِ حسن
ہوا کسی کو مگر دامنِ نگاہ تو دے

تمام عمر اسی انتظار میں گذری
کہ نازِ حسن کو بے تابِ عشق راہ تو دے

ظہورِ حسن سہی، عالمِ شہود سہی
پتہ مرا بھی کہیں تیری جلوہ گاہ تو دے

کسی کی رنجشِ بے جا سے دل بھی نادم ہے
کچھ آج اپنی صفائی یہ بے گناہ تو دے

حجابِ حسن کو بے باک بھی بنا لیں گے
پتہ کچھ اپنا تری شرمگیں نگاہ تو دے

فنا کی موج کا سر سے گذر مبارک ہو
اُترنے والوں کو دریائے عشق تھاہ تو دے

خبر نہیں ترے گم گشتگانِ عشق کو کچھ
فضائے غم میں ہوا دل کی سرد آہ تو دے

نہ بے قرار رہے گا نہ با قرار کوئی
پیامِ ہوش ربا گردشِ نگاہ تو دے

ذرا دو راہۂ ہجر و وصال سے بچ کر
فراقؔ دل میں کبھی اپنے دل کو راہ تو دے

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

یاد ایامے کہ ...

اکتوبر کا آخیر تھا۔

فضا میں رفتہ رفتہ سردی سما رہی تھی۔

سردی کی آمد، ہلکی خوشگوار ہوا اور ٹھنڈے پانی کے خیال سے میرے ناتواں جسم میں جان سی آگئی۔ گرمی مجھ ایسے خفقانی انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ جون جولائی کی جھلسی ہوئیں میری روح کی تازگی کو چوس چکی تھیں۔ اب صرف ایک مجلسا ہوا بدن تھا جو مہینوں سے پلنگ پر پڑا تھا۔

میرے آس پاس کوئی جاندار چیز نہ تھی سوائے ایک شکستہ دل کے جو صدمات سے بوڑھا ہو گیا تھا اور اب نواس کی رفتار بھی مدھم پڑ گئی تھی۔ دوسری چیز ایک برتی پنکھا تھا جو شب و روز گھومتا تھا مگر اُس کی آہنی خاموشی میری برداشت کی حد سے بڑھ گئی تھی۔ اُس نے میری بے قراری، میری پریشانی دیکھی تھی۔ میرے آنسو اپنے آنچل کی ہوا سے خشک کئے تھے، میری پیشانی کے سفید سفید قطرے میری زندگی کی نشانی، بڑی پھرتی سے چاٹ لئے تھے مگر اُس نے کبھی انہار ہمدردی نہ کیا تھا! اس کی بے پروائی ظلم کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اُس کی خشک ہوا نے میرے حواس سُن کر دیئے تھے۔ مجھے اس سے نفرت تھی گو وہ مہینوں سے میری خدمت کر رہا تھا!

اگر میں جیتا تھا تو اُسی بوڑھے دل کے سہارے، جو ہر حالت میں میرا غمگسار تھا۔ میری بے قراری سے وہ بے قرار ہو جاتا۔ میرے ضعف سے اس کو ضعف آجاتا۔ اُس کو مجھ سے محبت تھی، وہ مجھے چاہتا تھا اور میں اس کو۔

جب کبھی میں کمرے کی خاموشی سے گھبرا جاتا تو بوڑھے سے باتیں کرنے لگتا۔ وہ ایسی میٹھی میٹھی باتیں سناتا کہ کلفت دور ہو جاتی اور میری تھکی ہوئی آنکھیں جھپک جاتیں۔ میرے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ بوڑھا میرے اِک اِک راز سے واقف ہے اور اس کو وہ تمام واقعات یاد ہیں جن سے مجھ کو اُنس تھا۔ رات کی تاریکی میں جب نیند مجھ سے دور بھاگتی تھی یہ بوڑھا مزے لے لے کر پرانے واقعات سناتا۔ اُسے معلوم تھا کہ مرحومہ سے مجھے کتنی محبت تھی، اس کو وہ تمام عہد و پیمان یاد تھے جو ہم دونوں نے موت سے بے خبر ہو کر باندھے تھے۔ اس کو ہماری باتیں حرف بہ حرف یاد تھیں۔ گزشتہ واقعات اس خوبی سے دُہراتا کہ میں اپنی بیماری اور اُس کی موت کو بھول جاتا۔ گزرا ہوا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا اور اُس کی پیاری پیاری آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی!!!

"اُف، کیا زمانہ تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے خواب و خیال ہو کر رہ گیا۔ کسے معلوم تھا کہ حالات یوں بدل جائیں گے۔ ایک مختصر سا زمانہ ہے جس میں ابتدا سے انتہا ہوئی اور عروج سے زوال مگر اس کے نقوش کچھ اتنے گہرے ہیں کہ مٹائے نہ مٹیں گے، شاید اس لئے کہ یہ اُس عہدِ ماضی کی یادگار ہے۔

ع۔ جب دنیا اپنی جنت تھی اور زندگی اک کھیل

بیماری اور تنہائی کا یہ کٹھن زمانہ بوڑھے کی خوش کلامی کے طفیل گزرا، وہ میرے مزاج سے خوب واقف ہو گیا تھا۔ روزانہ سرِ شام ہی کوئی بھولا ہوا قصہ چھیڑ دیتا اور ساری ساری رات باتوں میں کٹ جاتی۔ اُسے سب کچھ یاد تھا، اُسے وہ دن بھی یاد تھے۔ جب عائشہ اور میں دن بھر اکٹھے کھیلا کرتے تھے اور ہمارے دن بچپن کی معصوم مسرتوں سے رچے ہوئے تھے اور راتیں میٹھی نیند میں بسی ہوتی تھیں اور وہ دن بھی جب چاندنی راتیں تھیں اور میں تھا۔ خیالوں کی دنیا میں محو میلوں نکل جاتا تھا۔ مگر کمبختوں کی تازگی اور میدانوں کی وسعت میرے لئے سامانِ سکون مہیا نہ کر سکتے تھے!

سب سے زیادہ اُسے وہ زمانہ پسند تھا جب کہ وہ خود بھی جوان تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ بعض واقعات اُسے تمام تفصیل سے یاد تھے۔ وہ گرمی کی دوپہر جس کو گزرے ہوئے آٹھ سال کا زمانہ ہوتا ہے، اس کو اس طرح یاد تھی جیسے کل کی بات ہو۔ میں اپنے کمرے کے ایک گوشے میں

پہلے، اسکول کا کام کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے چپکے سے آکر میری آنکھیں بند کر لیں۔ میں چونک اُٹھا اور جب مڑکر دیکھا تو وہ ہنس رہی تھی۔ مجھے اس حرکت پر خفیف سا غصہ آگیا تھا اور غیر ارادی طور پر ماتھے پر شاید شکن پڑ گئے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھ سے ایسی بدسلوکی ہوئی، مگر یہی پہلا موقعہ تھا کہ مجھے اس سے کبھی نہ بھولنے والی محبت بھی ہوئی تھی۔ وہ بہت ہی کمزور دل لڑکی تھی۔ ذرا سی بات سے خوفزدہ ہو جاتی تھی اور اپنی غلطی کی معافی بڑی عاجزی سے مانگتی تھی۔ مجھے منانے کے لئے اس نے فوراً اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ پلکوں والی آنکھیں میری منت کر رہی تھیں کہ میں اُسے معاف کر دوں۔ وہ برابر اس طرح دیکھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں کچھ اور دیر خاموش رہا تو اس کی نگاہ مجھے تحلیل کر دے گی۔ مگر میں اپنے اندرونی ہیجان کی وجہ سے خاموشی پر مجبور تھا، مجھے فقط اتنا احساس تھا کہ وہ مجھے بہت ہی اچھی لگ رہی تھی، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اسے دیکھتا ہی رہوں۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میری روح انہیں دو گہری آنکھوں میں مقید ہے۔

آخر بمشکل تمام میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "ارے تم یہ کیا کر رہی ہو اور تم یہاں کیوں آئی تھیں؟" اس کی شوخی تو رخصت ہو گئی تھی۔ مگر اسے یقین تھا کہ میں خفا نہیں ہوں۔ چنانچہ اس نے ہلکے سے کہا "آپ کی چھٹی ہے نا، صفدرے آپا آئی ہوئی ہیں اور نسیم بھی ہیں۔ ہمیں باغ میں لے چلئے، وہاں ہم کھیلنا چاہتے ہیں" رُک رُک کر اور میری طرف نیچی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے جلدی جلدی بستہ سنبھالا، اور کہا، اچھا، چلو۔ تیار ہو جاؤ۔"

ہم چار پانچ آدمی سامنے والے باغ میں پہنچ گئے وہ سب بھاگتے ہوئے چلے گئے اور آن کی آن میں درختوں کے پیچھے چھپ گئے میں ہی ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہ ایک دوسرے کو پکڑنے کے لئے دور دور بھاگ جاتے تھے اور جب کبھی کوئی پکڑا جاتا تو وہ جگہ شور سے گونج اٹھتی تھی۔ اکثر بے چاری عائشہ ہی پکڑی جاتی۔ اس سے تیز نہیں بھاگا جاتا تھا اور وہ جلدی ہی ہانپ اٹھتی تھی۔ اس کے مال اس کو بہت تنگ کر رہے تھے۔ وہ بار بار اُن کو سنبھالتی تھی۔ مگر ہوا کے ایک ہی جھونکے سے وہ پھر اس کے منہ پر بکھر جاتے تھے۔ بعض دفعہ تھک کر وہ بیٹھ جاتی تھی اور بالوں کو خوب اچھی طرح باندھ لیتی تھی، مگر دوڑنے سے پہلے وہ سب پھر اس کے چہرے پر آگرتے تھے۔ جب وہ چور ہونے لگتی تھی تو میں اس کی مدد کے خیال سے نیم یا صفورے کے چھپنے کی جگہ اشارہ سے بتا دیتا تھا۔ وہ ان کو پکڑ کر بہت خوش ہوتی تھی، اگر جب کبھی صفورے یا نسیم کو معلوم ہو جاتا تو وہ مجھ سے شکایت کرتی تھیں کہ "بھائی وقار آپ عائشہ کی بہت رعایت کرتے ہیں، ہم اس طرح نہیں کھیلیں گے۔"

بڑے سے کو ایک شام اور بھی یاد تھی۔ واقعی وہ ایک دلفریب اور دل گداز شام تھی اور مجھے بھی مدت العمر یاد رہے گی۔ عائشہ اور میں اب تک بہت مانوس ہو گئے تھے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ منسوب ہو گئے تھے، سب کو معلوم تھا کہ عائشہ وقار کی ہو چکی۔ ہم دونوں اکثر شام کو سیر کی غرض سے نورانی پر چلے جاتے تھے۔ نورانی شہر سے کچھ فاصلے پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان ایک شاداب جگہ تھی۔ جہاں سنگترے کے گھنے درختوں کے سائے میں ایک مصنوعی جھیل تھی جسے پتوں کی دلفریب دھوپ چھاؤں اور رنگترں کی مست خوشبو نے حسن بن صباح کی بہشت کا نمونہ بنا دیا تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے نیلے آسمان پر دوڑتے پھرتے تھے اور شفق اُن کو چوم چوم کر پیارے سے رنگا رنگ کے چھینٹے دے کر جھنجھلا رہی تھی۔ شام کی خاموش فضا، سبزے کی کچی کچی خوشبو اور شفق کے ہلکے رنگ مجھے مخمور کئے دیتے تھے۔ ہم جھومتے جھاتے جھیل کے کنارے پر آبیٹھے۔

شام کا آسمانی ہیلا ختم ہو چکا تھا۔ شفق اپنا رنگ لٹا چکی تھی کبھی کبھی کسی بھٹکے ہوئے پرندے کے پروں کی آواز آجاتی تھی ورنہ ایک مکمل خاموشی طاری تھی۔ چاندنی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ ہوا سے جھیل کی سطح پر باریک باریک لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ عائشہ پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، اور پانی اچھال رہی تھی۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا اور اپنی کہی ہوئی پرانی نظمیں دہرا رہا تھا۔ میرے مدھم سُر پانی کی لہروں کی ہلکی ہلکی موسیقی، اور عائشہ کے قہقہے، خود رو پھولوں کی تیز خوشبو، ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس، چاندنی کا پھیلتا ہوا سیلاب اور نیلے آسمان میں چمکتے ہوئے تارے، آہ، ہم اس شب و روز کی افسردہ دنیا سے کتنی دور تھے۔ نہ معلوم ہم نے ایک دوسرے سے کیا کیا کہہ ڈالا۔

عائشہ کو ایک اور شرارت سوجھی وہ دوڑتی ہوئی گئی اور ہوا

سے گرے ہوئے صاف صاف پتوں کو چُن لائی اور پھر ان کو ایک ایک کر کے جھیل کی لہروں پر چھوڑتی رہی۔ وہ ہوا کے جھونکوں سے سیدھے ترنتھے تیرتے چلے جا رہے تھے۔ جب کبھی ٹکرا جاتے تو وہ پتوں کا بیڑا بکھر جاتا۔ پتوں کی قطار دور تک نظر آ رہی تھی اور بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے بھی کچھ پتے چھوڑے جو تیرتے تیرتے اس کی "کشتیوں" کے پاس پہنچ گئے، وہ چلائی "دیکھئے اپنی کشتیوں کو الگ رکھئے ورنہ جنگ ہوتی ہے"۔ ساتھ ہی اس نے چھوٹے چھوٹے کنکر برسانے شروع کر دئیے تھے۔ اتفاق سے ایک پتہ الٹ گیا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "بس! اب کیا ہوگا، ہماری کشتی" تو الٹ گئی"۔ نہ معلوم کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ نہیں وقار! ایسا مت کہو۔ میں دعا کرتی ہوں کہ میری ساری کشتیاں الٹ جائیں! میں نے کنکر کیوں برسائے تھے! ذرا سی بات سے وہ خوفزدہ ہو جاتی تھی، وہ بار بار افسوس کر رہی تھی، اس کی آنکھوں میں وہی قیامت کی عاجزی آ گئی تھی۔ کتنی مشکل سے میں نے اس کا وہم دور کیا تھا!!

اب سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ ہم واپس چلے آئے، راستے میں وہ کچھ خاموش ہی رہی، افسوس کہ پھر اس عرصے میں ہمیں "نورابی" جانے کا اتفاق نہ ہوا، مگر اس کی یاد ہمیشہ عزیز رہے گی۔

عائشہ جیسی بھولی محبت کرنے والی لڑکی شاید ہی ملے، افسوس کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہی، میری زندگی اسی کی چند روزہ زندگی کی یاد سے وابستہ ہے، اور دل اسی زمانے کے واقعات سے غمی، خوشی کے موقعوں پر بھی میرے بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں . . .

آہ۔ تنہائی تیری سوگوار خوشیاں!!!

خلیق احمد

سرودِ فطرت

لبِ دریا ہے اور سنسان جنگل
سہانی رات ظلمت چھا رہی ہے
فضا ہلکے ترنم سے ہے معمور
گماں ہوتا ہے ہر شے گا رہی ہے
عجب روحانیت طاری ہے ہر سُو
کہ یادِ قدرتِ حق آ رہی ہے
یہ تارے ہیں کہ ہیں نغمے مجسّم
مگر زہرہ فلک پر گا رہی ہے
فضا لہرائی جنگل جھوم اٹھا
نوائے نے کہیں سے آ رہی ہے
ہوائے مست دھیمے دھیمے سر میں
کوئی دلکش ترانہ گا رہی ہے
یہ فطرت کی ترنم آفرینی
دلِ محزوں کو تسکیں آ رہی ہے
چلو بھی تاجور اب گھر کی جانب
چلو بھی، رات بھیگی جا رہی ہے

تاجور سامری

غزل

مرگِ دلِ نشاط کوش قصۂ دوش ہی سہی — جسرتِ گرمجوش کا ساز خموش ہی سہی

حاصلِ دردِ عشق ہے زندگیٔ مآل سوز — نغمۂ بے خودی مرا ماتمِ ہوش ہی سہی

دیکھ لے کاش ایک بار پرتوِ حسنِ روئے یار — تشنگیٔ جہانِ شوق میکدہ نوش ہی سہی

دل میں رواں ہے موجِ خوں ہاتھ میں دامنِ جنوں — گر نہیں عالمِ سکوں محشرِ جوش ہی سہی

حسنِ نظر فریب کی چھپ نہ سکے گی سادگی — ان کی ادائے دلبری جلوہ فروش ہی سہی

برقِ تجلّیٔ جمال کر گئی آشنائے حال — شاہدِ ماجرائے طور دیدہ و گوش ہی سہی

کون کرے گا حشر میں اپنے قصور کو قبول — غیرتِ حسن و ننگِ عشق دوشِ بدوش ہی سہی

گرمیٔ عشق سے نظرؔ پختگیٔ کلام ہے
تیری نوائے دل گداز بانگِ سروش ہی سہی

قیوم نظر

بے چارہ

ہفتے کی سہ پہر تھی۔ بہار کی حسین دھوپ میں لندن کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ منظر آشنا دل رہا تھا کہ اس کی حقیقی تصویر صرف تخیل ہی پیش کر سکتا ہے۔ سورج کی کرنیں بیک وقت روپہلی، گلابی اور نارنجی تھیں چمن کا گوشہ گوشہ نشۂ بہار میں مدہوش تھا۔ ہر شجر سے نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ بہار کے ساتھ ہی لندن کے میلے گلی گوچوں، ننگ بازاروں، تاریک مکانوں اور افسردہ و مردہ باغات میں نئی زندگی کا دور دورا تھا جو کل بے جان تھا آج زندہ تھا اور پھر جنہوں نے اس موت کو زندگی میں بدلتے دیکھا وہ خود اپنے میں تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔

موسم کے خوشگوار ہوتے ہی جذبات میں ہلچل مچ گئی تھی۔ الفت و محبت کی داستانیں غیر معمولی جوش کے ساتھ دہرائی گئیں۔ باغات میں بچھڑے ہوئے جوڑوں کی بات بات سے شادمانی ٹپکی پڑتی تھی۔ زندہ دل نوجوانوں نے سیٹ آمارے اور بیچوں پر بیٹھ کر دل میں نیک ارادے باندھے جو زیادہ تر سوسکی کی فکر میں ٹائپ کرنے والی خوب صورت لڑکیوں اور سوریے جانے کے متعلق تھے۔ ادھیڑ عمر اصحاب نے باغ میں سے ہو کر گھر جاتے ہوئے اتنا ہوئے کاروباری دلوں میں ایک دفعہ پھر وہی پرانی تڑپ محسوس کی۔ انہیں اپنی بیویوں کا خیال آیا اور یہ خیال آتے ہی اگرچہ شادی کو تیس برس ہو گئے تھے مگر گزشتہ محبت عود کر آئی۔ "واپس جاتے ہوئے ضرور بازار سے ہوتے چلیں گے" انہوں نے سوچا "اور ــــ کے لئے ایک تحفہ سا تحفہ خریدیں گے"۔ یہ کیا ہوگا؟ محفوظ شدہ پھلوں کا ایک ڈبہ؟ بابا بالوں میں لگانے کے لئے ــــ اور پھر نہیں یکایک یاد آیا کہ یہ تو ہفتے کی سہ پہر تھی، تمام دکانیں بند ہوں گی۔ ذرا سنجیدہ انداز میں انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا اور نگاہیں کھیلتے ہوئے بچوں پر، ہری گھاس پر بیٹھے ہوئے خوشحال نوجوان لڑکے لڑکیوں پر جم کر رہ گئیں۔ یہ ہے ہماری زندگی۔ جب دل کھلا ہو تو دکانیں اکثر بند ہوتی ہیں۔

پیٹر برٹ پر بھی سہانے موسم اور نوشگفتہ پھولوں کا اثر دوسروں سے کم نہ تھا۔ اس بہار سے اس کے تنہائی کے احساس میں اور اضافہ ہوا اس کے دل نے نصف بہتر کی ضرورت غیر معمولی شدت سے محسوس کی اس کے ارد گرد قہقہوں کا یوم تھا لیکن اس کا دل کہیں دور تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔ یہ سچ ہے بہار اپنے ساتھ بہتوں کے لئے پیام مسرت لائی تھی لیکن اسے کسی سے کیا غرض جبکہ وہ جیسا پہلے تھا ویسا اب تھا۔ دوسرے اپنی اپنی محبوبہ کے ہاتھ میں ہاتھ دئے محو خرام تھے لیکن وہ اکیلا چل رہا تھا۔ بہار کے باوجود، دھوپ کے ہوتے ہوئے بھی، اگرچہ آج ہفتہ تھا اور کل اتوار ہوگا وہ جانتا تھا کہ جو چیزیں دوسروں کو مسرور کر رہی ہیں۔ وہ ساری کی ساری نہ سہی ان کے کچھ حصے پر اسے بھی دسترس حاصل ہے تاہم وہ افسردہ تھا اور غمگین منہ بنائے ائیڈ پارک میں پھرتا رہا۔

سول کے مطابق اسے تصورات ہی کی دنیا میں پناہ ملی۔ مثلاً ایک کمسن کا فرحال لڑکی کسی اکھڑے ہوئے پتھر سے ٹھوکر کھا کر ٹھیک اس کے آگے گر پڑے اور اس کے نخچیں موج آجائے تو نشتریاں کو چہرے سے ہٹاتا ہوا حسین پیٹر فوراً اس کی مدد کو دوڑ پڑے گا۔ وہ اسے ٹیکسی میں سوار کرکے اس کے گھر لے چلے گا۔ وہ ایک نواب کی لڑکی ثابت ہوگی۔ وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگیں گے . . .

یا اس نے ایک بچے کو گول تالاب میں ڈوبنے سے بچا لیا اور اس طرح ہر ایک سے داد حاصل کی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بچے کی امیر بیوہ ماں کو ہمیشہ کے لئے ممنون کر لیا۔ بیوہ ماں پیٹر بچے کی ماں ہمیشہ ایک امیر بیوہ قرار دیتا اور ہمیں اس کے خیالات کی نوعیت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی وہ ابھی نوجوان تھا اور اس نے ایک اچھے گھرانے میں پرورش پائی تھی بایں کہ تنہا میں کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہ آئے۔ وہ ایک لڑکی کو ریچھ پر تنہا بیٹھے دیکھے۔ وہ بہت خوبصورت ہو اور اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار ہوں۔ وہ آداب مجالس کو پیش نظر رکھتے ہوئے آگے بڑھے گا ہیٹ اتارے گا اور مسکرائے گا۔ "مجھے خوب معلوم ہے آپ کا دنیا میں کوئی نہیں! اس کا لہجہ نہایت لطیف ہوگا۔ اور اس کے چہرے پر قدرتی تبسم رقص کرتا ہوگا۔ اس کے الفاظ میں ذرہ بھر بھی لکنت نہیں ہوگی جس سے اس کے توتلے پن کا ثبوت ملے اور جو ہمیشہ گفتگو اس کے

لئے مشکل کر دیتا تھا۔ میں جانتا ہوں آپ زندگی اکیلی بسر کرتی ہیں۔ خیر میرا بھی یہی حال ہے۔ کیا میں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟" وہ مسکرائے گی اور وہ بیٹھ جائے گا۔ تب وہ اسے بتائے گا کہ وہ ایک یتیم ہے اور دنیا میں سوائے ایک شادی شدہ بہن کے اس کا کوئی نہیں اور وہ کہے گی "میں بھی یتیم ہوں۔ بس بات پکی ہو گئی۔ وہ ایک دوسرے کو بتائیں گے کہ ان کی زندگی کتنی تکلیف دہ تھی۔ وہ رو پڑے گی۔ وہ کہے گا "مت رو۔ میں تمہارا ہوں۔" یہ سن کر اس کی طبیعت قدرے سنبھلے گی۔ پھر وہ لکھتے سیکھتا جائیں گے اور آخر کار ان کی شادی ہو جائے گی۔ لیکن اس کہانی کا یہ حصہ کچھ مبہم سا تھا۔

لیکن کوئی ایسا اتفاق یا حادثہ وقوع پذیر نہ ہوا اور وہ ابھی تک کسی کو نہیں بتا سکا تھا کہ تنہائی کی زندگی سے وہ کتنا بیزار ہے۔ سب سے بڑا نقص اس کا تولتا پن تھا۔ وہ ایک ٹھگنے سے قد کا اور عجیب الطرفین آدمی تھا۔ عینک استعمال کرتا تھا اور قریباً ہمیشہ اس کا چہرہ پھنسیوں سے پُر رہتا۔ اس کا سیاہ سوٹ کثرتِ استعمال سے نئے نئے رنگ بدلتا رہتا۔ اس کے بوٹ اگرچہ بڑی احتیاط سے پالش کئے گئے تھے لیکن پالش اُن کے سستے پن کو عوام کی نگاہوں سے چھپا نہیں سکی تھی اور اس سے بھی کہ اس کے دماغی انتشار کا باعث یہی بوٹ تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نواب کی لڑکی سے نیکی میں کس قسم کی گفتگو کی جائے کہ دفعتہً اس کا خیال اپنے بوٹوں کی طرف منتقل ہوا۔ کتنے بھدے ہیں! اور ان امیر لڑکوں کے چمکیلے بوٹوں سے کتنے مختلف۔ یہ جب نئے تھے۔ تب بھی کچھ کم بدنما نہ تھے۔ اب تین سال متواتر استعمال کرنے سے سونے پر سہاگے کا معاملہ ہو گیا تھا۔ ایڑیاں گھسی ہوئیں اور ٹو تو کسی کی دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ پالش کے اندر سینکڑوں جھریاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ بائیں بوٹ کی ایڑی اکھڑ گئی تھی اور دوبارہ لگوائی گئی تھی۔ جا بجا سلائی کے نشان تھے۔ تین سال سے باندھتے اور کھولتے رہنے سے سوراخوں کا ملغ اکھڑ گیا تھا اور وہ اپنے قدرتی سفید رنگ میں ظاہر ہو گئے تھے۔

آہ۔ یہ بوٹ حقیقی معنوں میں منحوس صورت اور بیزار کن تھے لیکن ان سے تو وہ ابھی ایک سال اور گزارنا چاہتا تھا۔ پیلے ایک دفعہ پھر قمیں جمع کرنے لگا۔ اگر وہ روزانہ ایک آنے کی کمر توڑ سائے۔ اگر دفتر بس میں جانے کی بجائے پیدل چلا جائے۔۔۔!

لیکن خواہ وہ کتنی احتیاط سے پیسے جمع کرتا اخیر میں سوائے بارہ چودہ آنوں کے اور کچھ جمع نہ ہوتا۔ بوٹ مہنگے تھے اور ایک دفعہ اس نے ایک جوڑا خریدنے کے لئے رقم پس انداز کر بھی لی لیکن سوٹ کا مسئلہ ہنوز لاینحل تھا۔ وہ اپنی حالت قابلِ رحم تصور کر رہا تھا کیونکہ اس نے دیکھا کہ دوسروں کے پاس تشحیذ کے لئے عورتیں بھی تھیں سوٹ بھی اور بوٹ بھی۔ لیکن خدا نے اسے ان میں سے ایک نعمت بھی عطا نہ کی تھی۔ حقیقت اسے آج حد سے زیادہ تلخ محسوس ہو رہی تھی۔ جونہی وہ کوئی خیالی قلعہ تعمیر کرنے لگتا بوٹ اس خوابوں کی دنیا سے واپس کھینچ لاتے۔ پھر وہ تھا یا فہنی کرب۔

دو نوجوان لڑکیاں ہجوم سے نکلیں اور جلدی واٹ سٹریٹ کے راستے پر ہو لیں۔ پیٹر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ ہوا میں ان کے گزرنے سے ایک لطیف خوشبو پیدا ہو گئی ہے۔ وہ لمبے لمبے سانس لے کر اردگرد کی تمام ہوا ایک ہی دفعہ سونگھ جانا چاہتا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ وہ لڑکیاں عام انسانوں سے برتر تھیں۔ رعنائی حسن اور شباب کی ہر وہ خصوصیت ان میں موجود تھی جو شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس لافانی خوبصورتی کو دیکھ کر وہ دل کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اس لئے کہ وہ ان کے قریب ہو سکے اور شاید کوئی کرامات یا معجزہ ظہور پذیر ہو جو اس کو ان کی ہستیوں سے وابستہ کر دے اس نے قدم تیز کر لئے۔

ان کے نفیس عطر کی مہک اس کے ناک سے گزرتی ہوئی دل کو معطر کر رہی تھی۔ وہ اسے سونگھتا نہیں تھا بلکہ نگل رہا تھا گویا کہ اس کی زندگی کا انحصار ہی اس پر تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں نازک اندام سرو قد تھیں۔ ایک کا کوٹ سفید رنگ کا تھا جس پر سیاہ سمور لگی ہوئی تھی۔ دوسری کا کوٹ تمام تر سمور پر مشتمل تھا۔ پہلی کی جرابیں سفید اور دوسری کی فاختئی رنگ کی تھیں۔ ایک پستہ قد سیاہ بلڈاگ ان کے ساتھ تھا جو کبھی ان کے پیچھے اور کبھی آگے ہو کر دوڑنے لگا۔

پیٹر ان کے اتنا قریب ہو کر چل رہا تھا کہ جب ہجوم کم ہوا تو وہ ان کی گفتگو تک بخوبی سننے لگا۔ ایک کی آواز کوئل کی طرح باریک تھی اور دوسری کی قمری کی مانند لوچدار۔

"کیسا زندہ دل انسان!" آخری جملہ "حقیقی معنوں میں زندہ دل!"

"اور جبھ بھی ہی کہتی تھی" کوئل نے رومال سے منہ صاف کرتے

ہوئے کہا۔

"اور دعوت بھی نہایت پُرتکلف تھی۔ جب ہم آنے لگے تو میں نے کہا کہ بہت مشکل سے کوئی نیکی دست یاب ہوگی۔ اس پر اس نے یہ فقرا حیت کیا کہ اگر میں اس کے دل کے اوڈے تک پہنچ گئی تو بہت سی نیکیاں مل جائیں گی اور مزید یہاں کرایہ مقابلتہً کم ہو گا۔"

دونوں قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔ پاس سے گزرتے ہوئے لڑکوں کے شور نے پیٹر کے کان تک تھوڑے عرصے کے لئے کوئی لفظ نہ پہنچنے دیا۔ وہ دل ہی دل میں ان کو کوسنے لگا۔ لڑکے چرخے۔ پر سر عام کوؤں کی طرح شور مچانا کون سی عقلمندی ہے۔ یقیناً ان کے والدین سوسائٹی کے ادنیٰ طبقے کے افراد ہوں گے۔

پیٹر واقعی خاموشی پسند کرتا تھا۔ دیہاتی زندگی کا وہ دلدادہ تھا یہاں تک کہ وہ اس نواب کی لڑکی کے ساتھ بھی کسی گاؤں میں زندگی بسر کرنی چاہتا تھا۔ وہ اس دنیا سے جس میں پُرتکلف دعوتیں ہوتی ہیں۔ جہاں زندہ دل انسان نوجوان دیویوں کو دل کی نیکیاں تلاش کرنے کے لئے کہتے ہیں قطعی ناواقف تھا۔ اب وہ اس سے قدرے آشنا ہو چلا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ آج تک وہ اس من موہنی پُرکیف اور ملذذ دنیا سے کیوں اجنبی رہا۔ اب اس کے دل کی سب سے بڑی خواہش اس رنگین دنیا میں داخل ہونے کی تھی۔ وہ اس کی رکنیت حاصل کرنے کے لئے گراں سے گراں قیمت ادا کرنے کو تیار تھا۔ فرض کرو وہ دونوں اس سامنے پڑے ہوئے پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑیں۔ فرض کرو . . . لیکن وہ دونوں اس پتھر پر سے چھلانگ لگاتے ہوئے گزر گئیں۔ دفعتہً یاس کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شعاعِ امید نمودار ہوئی۔

بلڈاگ دوسری طرف جا کر پودے سونگھ رہا تھا۔ جلد ہی وہ پنجوں سے زمین کریدنے اور بھونکنے لگا اُدھر سے ایک ٹیریر نے ظاہر ہو کر جواباً بھونکنا شروع کیا۔ بلڈاگ مٹی کریدنا چھوڑ کر آگے بڑھا۔ دونوں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے گرد پھرنے لگے ناک سے سوں سوں اور منہ سے بھوں بھوں کرتے ہوئے وہ اور قریب ہوئے۔ پیٹر ٹکٹکی باندھے ایک موہوم سی امید دل میں لئے ان کو دیکھتا رہا۔ اگر کتے لڑ پڑیں تو واقعی اس کے بوارہ تھے۔ اس کا طائرِ خیال کہیں دور پرواز کر رہا تھا۔ اگر وہ لڑ پڑیں تو جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ دوڑ پڑے گا۔ ان کو فوراً ایک دوسرے سے علیحدہ کر دے گا۔ شاید وہ اُسے کاٹیں بھی لیکن کتوں کے ایسا کرنے سے وہ دیویوں کے تشکر یے کا اور زیادہ مستحق ہوگا۔ وہ چاہتا تھا کہ کتے ایک دم لڑ پڑیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہوگی اگر دیویاں یا ٹیریر کا مالک کتوں کے لڑنے سے پہلے مداخلت کرے۔ "او خدا!" اس نے نہایت خشوع سے دعا مانگی۔ "ان کو کتے بلانے نہ دینا۔ کتوں کو لڑا دو۔ یسوع مسیح کے لئے آمین۔"

لڑکے گزر چکے تھے۔ دیویوں کی آوازیں پھر سنائی دے رہی تھیں۔ قمری کہہ رہی تھی۔

"وہ کتنا گندہ آدمی ہے۔ میں نے اسے بارہا کہا ہے کہ مجھے بہو دیوں سے نفرت ہے اور یہ بھی کہ میں اُسے بدصورت بدتماش بد وضع خیال کرتی ہوں۔ لیکن وہ اپنی ہی ہانکے جاتا ہے۔" تمہیں اسے کارآمد بنانا چاہئے کوئل نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔"

"ہاں ایسا تو میں کرتی ہی ہوں۔ ابھی کل اُس نے ایک قیمتی گھڑی مجھے بذریعہ ڈاک بھیجی تھی۔"

ایک وقفہ ——— پیٹر نے دعا دہرائی۔

"اگر عاشق صاحبان اتنا سمجھ لیں کہ" ——— قمری کی آواز ڈرامائی غراہٹ اور بھونکنے کے شور میں گم ہو گئی۔ دونوں مڑیں اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلائیں "پونگو۔ پونگو۔"

لیکن ان کے بلانے پر بھی لڑائی میں کوئی تغیر و دنما نہ ہوا۔ پونگو اور ٹیریر اچھل اچھل کر ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔!!

"مامی! مامی!!" ایک چھوٹی لڑکی جو آیا کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ دوڑتی ہوئی چلائی "مامی ادھر آؤ۔"

آخر وقت آن پہنچا بے قراری سے انتظار کیا ہوا لمحہ آن پہنچا دل میں نعرۂ شادمانی بلند کرتے ہوئے پیٹر نے خود کو کتوں پر گرا دیا۔

"فعول واہیات کتا" وہ ٹیریر کو ٹھوکر مارتے ہوئے چلایا۔ کیونکہ اس کی نگاہوں میں سارے فساد کا باعث یہی تھا اور بلڈاگ ——— ان کا بلڈاگ اس کی رائے میں بے قصور تھا "بے ہمہ" وہ تقریباً بھول گیا تھا کہ وہ فرنچ ہے اور کوئی لفظ بھی دو تین مرتبہ کوشش کرنے کے بغیر ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن آج وہ "پرے ہٹو" نہایت بے تکلفی سے بول رہا تھا۔ اس نے کتوں کو دموں سے پکڑ کر کھینچا اور ان کو علیحدہ کرنے میں پوری قوت صرف کر دی مگر کامیاب نہ ہوا۔ گاہے گاہے وہ ٹیریر کو ٹھوکر لگاتا جاتا۔ لیکن جو کتا اُسے کاٹ رہا تھا وہ بلڈاگ تھا۔ بلڈاگ ———

کم فہم بلڈاگ بے چارے پیٹر کا دلی تعلق ' جو اس کی مالکہ کے لئے اس کے ذہن میں قایم ہو چکا تھا سمجھنے سے قاصر تھا لیکن پیٹر کو اس پر تعلق غصہ نہ آیا اور نہ ہی اُس کے کاٹنے سے کوئی درد محسوس ہوا۔ اس کے بائیں ہاتھ سے خون آہستہ آہستہ تمام انگلیاں تر کرتے ہوئے نیچے ٹپکنے لگا۔

"اُف ۔ اُف" ۔ کوئل نے درد بھرے لہجے میں کہا گویا یہ اس کا اپنا ہاتھ تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ "ذرا احتیاط سے کام لو" قمری نے مضطرب ہو کر کہا "ذرا احتیاط سے"۔

ان کی دل خوش کن آوازوں سے اس کے تھکے ہوئے اعضا میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ وہ اور تیزی سے پیر کو کوٹ مار کر اور بلڈاگ کو بانٹ سے پھاڑنے لگا۔ اور آخر غضب ناک حیوانوں کو اس نے علیحدہ کر ہی دیا۔ بلڈاگ کو کان سے پکڑتے ہوئے اُس نے اوپر اٹھا لیا۔ پیر بڑا پھل پھل کر دشمن تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن پیٹر نے ساری قوت مجتمع کر کے بلڈاگ کو جہاں تک اُس کا بازو اٹھ سکتا تھا اٹھا لیا ساتھ ہی وہ پیٹر کو ٹھوکریں لگاتا جاتا۔ چھوٹی لڑکی اور اس کی آیا قریب پہنچ چکی تھیں اور کچھ دیر بعد پیٹر کو دوسری طرف گھسیٹ کر لے گئیں۔

پیٹر ہراساں دیویوں کی طرف بڑھا۔ قمری کی آنکھیں دلکش اور چہرہ گلابی تھا۔ کوئل گداز بدن اور سفید و سُرخ رنگ کی تھی۔ پیٹر نے ایک سے دوسری کی طرف دیکھا اور فیصلہ نہ کر سکا کہ کونسی زیادہ خوبصورت تھی۔ اس نے پونگو کو آہستہ سے زمین پر رکھا۔ "یہ رہا آپ کا کتا ـــــ" وہ کہنا چاہتا تھا لیکن رعبِ حسن سے یا شاید توتلے ہونے کی وجہ سے اس نے کہنا شروع کیا۔

"یہ رر۔ رر۔ ـــــ" لیکن وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ وہ تلملایا۔ پیر کو زور سے زمین پر مارا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی ـــــ

"یہ رر۔ رر۔ آپ پپ پالتا کتا" ـــــ آخر کار وہ کہہ ہی گیا۔

"بہت بہت شکریہ۔ مہربانی۔ نوازش"۔ کوئل نے کہا۔

"شاباش تم نے بہت جوانمردی دکھائی۔ قمری بولی۔ "تمہارا زخم زیادہ خطرناک تو نہیں؟"

"اوہ۔ یہ کچھ بھی نہیں"۔ پیٹر نے ہاتھ پر رومال شانِ استغنا سے لپیٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ خطرناک نہیں؟" قمری نے اصرار کیا۔ "ذرا مجھے دکھانا تو"۔

پیٹر نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے رومال کھولا اور ہاتھ سامنے کر دیا۔ اس نے سوچا کہ ابھی تک سب کچھ اس کی امید کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ناخنوں میں میل بھری ہوئی تھی۔ کاش ـــــ کاش کہ صبح نہاتے وقت اُسے ناخن صاف کرنے کا خیال آیا ہوتا! وہ کیا خیال کریں گی! شرماتے ہوئے اُس نے رومال باندھنے کی کوشش کی۔ لیکن قمری نے اُسے ایسا کرنے سے روکا۔

"ذرا ٹھہرنا" اس نے کہا اور پھر تشویشناک لہجے میں بولی۔ "زخم بہت گہرا ہے"۔ "خطرناک" کوئل نے اس کے ہاتھ پر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے سخت افسوس ہے کہ میرے کتے نے ـــــ"

"تمہیں فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس جا کر پٹی بندھوانی چاہئے" قمری نے اس کے ہاتھ سے نگاہیں اٹھا کر اس کے چہرے کی جانب اٹھائیں "ہاں ڈاکٹر کے پاس"۔ کوئل نے تائید کی۔

پیٹر ہکے بکے ہوئے شخص کی طرح ایک سے دوسری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مدہوشی اس کی رگ و پے میں سرایت کرتی جاتی تھی۔ وہ آنکھیں ـــــ ہمدردی سے لبریز آنکھیں۔ وہ مسکرایا۔ سر کو اس طرح حرکت دی گویا خواب دیکھ رہا ہو۔ ہاتھ کو جلدی سے رومال میں لپیٹا اور بولا۔

"یہ کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں ڈاکٹر کو ضرور دکھاؤ۔"

"ہاں ضرور"

"مگ کچھ بھی نہیں"۔ وہ ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش دیویوں کے پاس ٹھہرنے کی تھی۔ کوئل قمری کی طرف مڑی اور دونوں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ قمری نے پلٹ کر پیٹر کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ اس کے سستے ہیٹ سے اس کے سستے بوٹوں پر اُس کے زرد چھائیوں بھرے چہرے سے اس کے گندے ہاتھوں پر اس کی لوہے کی کمانیوں والی عینک سے اس کے بغیر گھڑی کے تسمے پر سے ہوتی ہوئی اس کا جائزہ لینے لگی۔ پیٹر نے دیکھا کہ وہ اس کی طرف غور سے دیکھ رہی ہے۔ وہ ایک شرمیلے انداز میں مسکرایا۔ وہ کتنی خوب صورت تھی! وہ سوچنے لگا کہ دونوں آپس میں کیا کانا پھوسی کر رہی تھیں۔ شاید معاملہ زیرِ بحث یہ تھا کہ اُسے (پیٹر کو) چائے پر مدعو کیا جائے۔ اور جوں ہی یہ خیال اس کے ذہن میں گزرا اسے اس کا

یقین ہوگیا۔ کیسا اتفاق تھا۔ سب کچھ اس کے خوابوں کے مطابق واقع ہو رہا تھا۔

قمری نے جھک کر کوئل کے کان میں کچھ کہا۔ کوئل نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا نکالا۔

"تم نے بہت جوانمردی دکھائی" قمری نے پیٹر سے مخاطب ہو کر اپنا فقرہ دہرایا۔ پیٹر جو اب میں صرف سر ہلا سکا۔ اس نے ان شفاف، جادو بھری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے نظریں نیچے جھکا لیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے بغور دیکھے۔ مگر ایسا کرنے کی جرأت اپنے میں نہ پائی۔

"شاید تم کتوں کی عادات سے بخوبی واقف ہو؟" اس نے پوچھا "تمہارا اپنا کتا ہے"؟

"نہ۔ نہیں"

"خیر اس سے تمہاری بہادری کی قیمت اور زیادہ بڑھ گئی" قمری نے یہ کہتے کہتے اس کا ہاتھ پکڑ کر گرم جوشی سے دبایا۔ "اچھا خدا حافظ"۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "ہم تمہارے بہت شکر گذار ہیں"

میں۔ میں کیا وہ جا رہی ہیں؟ پیٹر نے دفعتہً سہانے خواب سے چونکتے ہوئے سوچا۔ سچ مچ جا رہی ہیں! اس کو چاہئے کہ بدعو کرنے یا اپنا نام و نشان بتلائے بغیر! وہ چاہتا تھا کہ دیویاں کوئی دم اور اس کے پاس ٹھہریں۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اپنا عندیہ کبھی الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکے گا۔ وہ اس شخص کی مانند تھا جو آنکھوں کے سامنے اپنی بربادی دیکھ رہا ہو۔ لیکن کوئی مزاحمت نہ کر سکے۔ آہ! اس نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ جملہ پورا کرے دوسری اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے ہلانے لگی۔

"تمہارے جیسے دلیر انسان دنیا میں بہت کم پائے جاتے ہیں"، کوئل نے کہا۔ "لیکن ڈاکٹر کو ضرور زخم دکھانا۔ اچھا خدا حافظ ــــ" یہ الفاظ ادا کرتے کرتے اس نے سلیقے سے تہ کیا ہوا ایک پاؤنڈ کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی انگلیوں میں دبا دیا۔

پیٹر کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے میں اکٹھا ہو گیا۔ اس نے سر ہلایا۔ "نہ۔ نہ" وہ بولنے لگا نوٹ کو واپس کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مسکرا کر کہا۔ "میری خاطر یہ قبول کر لو" اور یہ کہتے ہی اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ دوڑ کر قمری کے پاس جا پہنچی جو اس عرصے میں بونگو کی زنجیر پکڑے چل رہی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ کوئل نے اس کے پاس جاتے ہی کہا۔

"اس نے لے لیا؟"

"ہاں"۔ بات کا رُخ بدلتے ہوئے۔ "ہاں تو مسئلہ زیر بحث کیا تھا؟"

. . . . . .

"نہ۔ نہ۔ نہیں۔ آخر پیٹر نے کہا۔ لیکن وہ تو کب کی جا چکی تھیں اس نے ایک دو قدم ان کی سمت میں اٹھائے لیکن پھر رک گیا۔ یہ مناسب نہ ہوگا۔ وہ اس کے جذبات کو نہیں سمجھ سکیں گی۔ شاید وہ گلو خلاصی کرانے کے لئے ایک اور نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں اور چلتی بنیں۔ وہ انہیں دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ بازار کی دوسری جانب جا کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

اس کی نگاہِ تخیل میں سارا منظر از سر نو بپھر گیا۔ ایسے نہیں جیسے کہ وہ حقیقی طور پر تھا بلکہ ایسے جیسا کہ اسے ہونا چاہئے تھا۔

جب کوئل نے نوٹ اس کے ہاتھ میں دیا تو اس نے مسکرا کر واپس کرتے ہوئے کہا "معاف کیجئے آپ کو غلطی ہوئی۔ ایک قابل درگزر غلطی۔ میں مانتا ہوں میری ظاہری ہیئت میری غریبی کا راز فاش کر رہی ہے۔ لیکن یقین جانئے میں ایک شریف آدمی ہوں۔ میرا باپ ایک ڈاکٹر تھا اور میری ماں ایک ڈاکٹر کی لڑکی۔ میں ان کی موت تک ایک اچھی درسگاہ میں تعلیم پاتا رہا۔ میں سولہ برس کا تھا کہ وہ اس دار فانی سے یکے بعد دیگرے رخصت ہو گئے۔ اب مجھے اپنی روزی آپ کمانی پڑی لیکن میں کمینہ نہیں ہوں۔ آپ کے پیسے کو ہاتھ لگانا حرام جانتا ہوں۔ میں نے ان کتوں کو اس لئے لڑنے سے روکا کہ میں آپ اور آپ کی سہیلی کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ آپ کتنی معصوم کتنی خوب صورت کتنی بھولی ہیں"۔ کوئل اس کی تقریر سے بہت متاثر ہوئی۔ اس نے پیٹر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے معافی مانگی۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ پھر کوئل نے اس سے پوچھا کہ وہ ان کے ساتھ چائے پینا گوارا کرے گا؟ اس سے آگے پیٹر کے خیالات زیادہ دھندلے ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ دفعتہً نواب کی لڑکی، منشی، جیرو اور یتیم و دوشیزہ کی تصویریں اس کی آنکھوں کے آگے ناچنے لگیں ــــ لیکن ان سب فرضی باتوں کی بجائے اس وقت تو دو دیویاں تھیں اور ان کے وجود خیالی نہیں بلکہ حقیقی تھے۔

یہ ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہوئے بھی وہ جانتا تھا کہ واقعات اس

طرح معرضِ وجود میں نہیں آئے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی چل دیں گی۔ اگر وہ ان کے پیچھے دوڑتا تب بھی اپنا مطلب واضح نہیں کر سکتا تھا۔ شاید وہ اس کے توتلے پن کا مذاق اڑاتیں۔ اس نے نوٹ لے لیا تھا۔ انہوں نے شاید اسے ایک بازاری لونڈا سمجھا جس نے یہ خط اس لئے مول لیا تھا کہ کوئی بخشیش ملے۔ انہوں نے اسے اپنے پر ادا بھی نہ سمجھا اور تم کو ہی استعمال کرتی رہیں۔ چاہے اور اپنا نام یا گھر کا پتہ بتانے کا تو ذکر ہی کیا . . .

لیکن اس کا تخیل ہنوز بڑے انہماک سے مصروفِ کار تھا۔ اس نے سوچا کہ نوٹ بغیر کچھ کہے سنے اُن کی طرف پھینکا جا سکتا تھا۔ اس نے ایسا کیوں نہ کیا؟ لیکن ایسی حالت میں اس پر سست ہونے کا الزام عاید نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بہت جابد کھسک گئی تھیں اور یہی اصل سبب تھا۔ اور پھر اگر وہ ان کا تعاقب کرتا تو نوٹ کسی چھپر کرے کے ہاتھ واپس بھیجا جا سکتا تھا۔ ایک عمدہ ترکیب ——— لیکن اس پر عمل کرنے کا وقت گذر چکا تھا۔

ساری سہ پہر پیٹر پھرتا رہا۔ بیٹھ کر دونوں ہاتھ رکھے آنکھیں جھکائے پھرتا رہا۔ کبھی کبھی اپنی غریبی کا خیال اس کے بدن میں سنسنی سی پیدا کر دیتا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے رکتا اور پھر چلنے لگ پڑتا۔

دن ڈھلنے لگا۔ دھندلی ملگجی تاریکی میں عاشق نے محبوبہ کو اور زوہ کے ساتھ بھینچا۔ زرد قندیلوں کی قطار دفعتہً جاگ اٹھی اور اونچے آسمان میں چاند کا ایک چوتھائی حصہ نظر آرہا تھا۔ تنہائی اور رنجِ تنہائی اس کے لئے اب ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ وہ پارک سے نکلا اور آہستہ آہستہ ایک چائے کی دکان کی طرف چل دیا۔

"ہاتھ کیسے زخمی کیا؟" خادمہ نے پوچھا

"اے۔ اے۔ اے ایک کتے نے کاٹ کھایا!"

اور یہ کہتے ہی دبے ہوئے جذبات میں از سرِ نو اشتعال پیدا ہوا۔ ہاں انہوں نے اسے ایک بازاری لونڈا سمجھا۔ جیسے کہ وہ انسان نہیں تھا۔ گویا کرائے کا مزدور تھا جسے معاوضہ دینے کے بعد مزید توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس ذلت کے خیال ہی میں اتنا پس بھرا تھا کہ یاد آتے ہی نہ صرف اسے ذہنی کرب بلکہ جسمانی کوفت کا بھی شکار ہونا پڑا اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

آخر رنج و غم، شرمساری و ناکامی کے خیالات لئے وہ دکان سے باہر نکلا۔ اگرچہ بہت تھکا ہوا تھا لیکن اس نے اپنی بے مقصد گشت کو برابر جاری رکھا۔ بازاروں سے گزرتا ہوا۔ عالی شان عمارتوں پر مجلو غلط انداز ڈالتا ہوا وہ گلیوں سے ہو کر واپس جانے لگا۔

ایک عورت تیزی سے اس کے سامنے آکر رُک گئی۔ "جانی" اس نے پھوٹتے ہی کہا "بڑے اُداس معلوم ہوتے ہو۔"

پیٹر نے اس کی طرف حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اس سے باتیں کر رہی تھی۔؟ ایک عورت ——— کیا یہ ممکن تھا!۔ وہ خوب جانتا تھا کہ لوگ ایسی عورتوں کو برا سمجھتے ہیں لیکن اس کا پیٹر سے مخاطب ہونا کچھ کم تعجب کی بات نہ تھی۔ اس کی برائی پر اس کے تعجب کا پردہ پڑ گیا۔

"آؤ نہ میرے ساتھ" وہ بولی۔

پیٹر چل پڑا۔ اسے یقین نہ تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہے۔ عورت اس کے بازو میں بازو ڈال کر ساتھ ہو لی۔

"مال تو تمہارے پاس ہوگا ہی؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

پیٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا کسی جنازے سے واپس آرہے ہو شکل سے وحشت ٹپکتی ہے۔"

"مم۔ مم۔ میں اکیلا ہوں۔ تنہا۔ واحد۔" پیٹر نے گھگھیا کر کہا وہ رونے کو تیار تھا۔ وہ رونا چاہتا تھا۔ رو کر دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ اس کی آواز ٹوٹے ہوئے تار کی طرح کانپ رہی تھی۔

"اکیلے ہو! کیسی عجیب بات ہے! تم جیسا بانکا جوان اور اکیلا!" وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی خشک اور جذبات سے خالی تھی۔

اس کے کمرے میں مدھم سی روشنی تھی۔ سستے عطر کی خوشبو یا بدبو ہوا میں موجود تھی۔

"ایک منٹ ٹھہرنا" اس نے کہا اور ایک دروازہ کھول کر غائب ہو گئی۔ وہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ وہ جلد ہی واپس آگئی اور اس کے زانوؤں پر بیٹھ گئی۔ برہنہ بانہیں اس کے گلے کے گرد حمائل کر دیں۔ اور بوسوں کا ایک تانتا سا باندھ دیا۔ اس کی آنکھیں پژمردہ اور ڈراؤنی تھیں۔ نزدیک سے دیکھنے پر اس سے گھن آتی تھی۔

پیٹر نے سب کچھ دیکھا ——— اس کے رو کھے بوسوں کی حقیقت سمجھا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ نواب کی لڑکی یتیم دوشیزہ اور بیوہ

جس کا لڑکا تالاب میں گر پڑا۔ کومل اور قمری اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ اوہ۔ اوہ۔ آہ۔ اس نے اسے زور سے پرے دھکیلا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"معاف کرنا۔ مجھے اسے۔ اسے ایک ضروری کام ہے۔"

اس نے ہیٹ اٹھا لیا اور دروازے کی جانب مڑا۔

وہ عورت اس کے پیچھے دوڑی اور اسے بازو سے پکڑ لیا۔ "پاجی خبیث ایک لڑکی کو بلانا اور پھر بغیر ادا کئے کھسک جانا" ——— اور پھر گالیوں کا ناخوشگوار سلسلہ شروع ہوا۔

پیٹر نے ہاتھ جیب میں ڈالا۔ کومل کا سلیٹ سے تہ کیا ہوا نوٹ نکالا۔ "یہ لیجئے۔ مجھے جانے دیجئے۔" اس نے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

جب وہ مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے نوٹ کو کھول رہی تھی۔ وہ نکل بھاگا۔ اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے اور تاریک سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے وہ گلی میں جا پہنچا۔

(ترجمہ)

اقبال

رباعی

آجا ترا حدیثِ فراست یہی تو ہے
کس اوج پہ ہیں مرد مسلماں سنا تو دے
تو نے الٹ دیا جہاں سا غر کو
اس خاکِ ملک نشاں کا نشاں بتا تو دے

سعید احمد اعجاز

اعجازِ بیان

کیا کہئے شباب ان کا اب کیا نظر آتا ہے
اک جام چھلکتا ہے، ایسا نظر آتا ہے

پہلو میں وہ بیٹھے ہیں، سینے سے وہ لپٹے ہیں
کیا حسنِ تصور ہے، کیا کیا نظر آتا ہے

فطرت کے پسِ پردہ اس دیدۂ بینا کو
اک شاہدِ رنگیں کا جلوا نظر آتا ہے

بھری ہے ثریا تک سرمستی و سرشاری
یہ گنبدِ مینائی، میخانہ نظر آتا ہے

اعجاز یہ میخانہ مدت سے تھا ویرانہ
پھر آج ترے دم سے شیشہ نظر آتا ہے

سعید احمد
اعجاز

بہار

فصلِ بہار جہاں میں آئی،

فصلِ بہار جہاں میں آئی دنیا جاگی لی انگڑائی
شاخ شاخ میں روح سمائی بلبل چہکی شاما گائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

پتے نکلے جوشِ نمو سے دشت و جبل مہکے خوشبو سے
گونجے کوئل کی کو کو سے آزادوں نے دھوم مچائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

فرشِ زمرد کا کیا کہنا ارزاں کپڑے سستا گہنا
شاخوں نے پھر خلعت پہنا دُلہن کی ایسی شکل بنائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

جھرمٹ باندھ پرندے آئے ٹہنی پکڑی پاؤں جمائے
پھولے اُچھلے پر پھیلائے بے خود ہو کر تان اڑائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

بیلیں لپکیں آثاروں پر دروازوں پر دیواروں پر
بادل گرجا گلزاروں پر چاروں کونے رونق چھائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

سردی گرمی دونوں کم کم تازی ہوا گوارا موسم
ہلکی بارش بھاری بھر کم پتے دھوئے گرد دبائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

سیفی نوگانوی

سررشتۂ تالیف وترجمۂ جامعہ عثمانیہ

اور اس کی خدمات

سلطنت آصفیہ نے علوم وفنون اور اردو کو جو ترقی دی ہے وہ کبھی بھلائی نہیں جاسکتی۔ نواب میر نظام علی خاں کے عہد حکومت سے لے کر نواب میر محبوب علیخاں یہاں کے عہد حکومت تک علوم وفنون کی سرپرستی کی جاتی رہی اور علماء فضلاء وشعرا کی غیر معمولی امداد کی گئی یہی وجہ ہے کہ آزاد بلگرامی سے لے کر شاہ نصیر اور داغ دہلوی تک ہزاروں علماء وشعرا سرزمین دکن میں آسودہ نظر آتے ہیں۔ مگر یہ ابتدائی دور تھا گویا دکن کی علم نوازیوں اور ادب پروریوں کا عہد طفولیت تھا شباب اس وقت آیا جب ہز اگزالٹڈ ہائنس نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر نے تخت ریاست پر جلوہ فرمایا۔ حضور کے تخت نشین ہوتے ہی ملک میں ایک جان سی پڑ گئی اور چند ہی سال میں دکن کیا سے کیا ہو گیا۔ ایک عثمانیہ یونیورسٹی ہی کو لیجئے حضور نے نہ صرف اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا کر اردو کو بقائے دوام کا خلعت سرفراز عطا فرمایا بلکہ مادری زبان کے ذریعہ تعلیم قرار پانے کی وجہ سے ہر شخص کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور ڈگری پانے میں سہولت ہو گئی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب حیدرآباد میں ایک پی ایچ ڈی سیاحت کنان وارد ہو گیا تھا جسے لوگوں نے تماشا بنا لیا دیکھنے جاتے تھے کہ آخر پی ایچ ڈی ہوتا کیسا ہے۔ مگر اب خدا کے فضل وکرم سے ملک میں ہزاروں پی ایچ ڈی ایل ایل ڈی، ڈی سی ایل، ڈی فل، ڈی لٹ، وغیرہ موجود ہیں جو دکن ہی کے نونہال اور جامعہ عثمانیہ کے فرزند ہیں۔

من جملہ اور کارآمد سررشتوں کے ایک سررشتہ تالیف وترجمہ بھی ہے جس نے ملک کی تعمیری خدمت اور اردو کی غیر معمولی دستگیری کی ہے۔ کسی قوم میں زندگی کے آثار اس وقت تک محسوس نہیں ہوتے جب تک کہ وہ جدوجہد نہ کرنے لگے اور علمی ادبی ترقی کے لئے غیر زبانوں کے ذخیرے کو اپنی زبان میں منتقل نہ کرے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت سر رشتۂ تالیف وترجمہ قائم ہوا جس کے ساتھ ہی ساتھ مجلس وضع اصطلاحات بھی قایم ہو گئی اور عمدہ طریقے پر کام شروع کر دیا گیا۔

۱۷ ۱۹۱۸ء موافق ۱۳۲۷ھ ریکم آبان ۱۳۲۷ف میں دارالترجمہ قائم ہوا جس کے ارکان حسب ذیل مقرر کئے گئے۔

(۱) عبدالحق بی اے، ناظم (۲) قاضی محمد حسین ایم اے، رینگلر مترجم ریاضیات۔ (۳) چودھری برکت علی بی ایس سی مترجم سائنس (۴) سید ہاشمی فرید آبادی، مترجم تاریخ: (۵) محمد الیاس برنی ایم اے، مترجم معاشیات (۶) قاضی تلمذ حسین ایم اے، مترجم سیاسیات، (۷) ظفر علی خاں۔ بی اے، مترجم تاریخ، (۸) عبدالماجد بی اے مترجم فلسفہ ومنطق (۹) مولوی عبدالعلیم شرر مولف تاریخ اسلام (۱۰) سید علی رضا بی اے۔ مترجم قانون۔ (۱۱) مولوی عبداللہ عادی مترجم عربی (۱۲) حاجی مصفی الدین ناظر مذہبی (۱۳) علی حیدر طباطبائی ناظر ادبی؛

ان مترجموں کے علاوہ مصحح منتظم، اہلکار وغیرہ ایک خاصا عملہ مقرر کیا گیا۔

کتابوں کے ترجمے کا انتظام اس طرح کیا جانے لگا کہ جامعہ عثمانیہ کی مجلس نصاب جس کتاب کے ترجمہ کی ضرورت محسوس کرتی اسے مجلس اعلیٰ سے منظوری لے کر دارالترجمہ میں روانہ کر دیتی اور دارالترجمہ اس کے ترجمہ کا انتظام شروع کر دیتا، قبل ازیں جن ارکان کے نام لکھے گئے وہ تنخواہ یاب یعنی ملازم ارکان یا مترجم ہیں ان کے علاوہ ملک کے اور بیرون ملک کے قابل افراد کو بھی دارالترجمہ کا رکن بنایا گیا ہے جن کو معاوضہ دے کر ترجمہ کرایا جاتا ہے۔

اس وقت اراکین اور عملۂ دارالترجمہ کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

افسران

ناظم ۱-۰-۱۵۰ اضافہ سالانہ ۵ تا ۱۰۰۰) مترجم ۱۱۰-۱-۰ (۳۵۰ اضافہ ۲۵ تا ۶۰۰) ۹-۰-۲۰۰ ۵-۱-۴۰۰ ۱۴-۰-۳۰۰ ۳-۰-۵۰۰ جملہ ۲۵ نفر میزان خرچ ۵۳۴۰ (۱ روپیہ سالانہ

عملہ اہلکاران اور ادنیٰ ملازمین کے مشاہرے ملاکر

جملہ میزان خرچ دارالترجمہ ۴۲ف (۷۹۳ ۱۵) و ۴۳ف ف (۷۹۲ ۶۰ ۱) روپیہ سکہ عثمانیہ

اس کے علاوہ مطبع کا خرچ حقیقی ۴۴ف ف (۲۳۱ ۴۵) روپیہ سکہ عثمانیہ۔ دیکھو موازنہ تفصیلی ۴۴ف ص۸۵۔

اس طرح دارالترجمہ اور اس کے پریس پر مندرجہ ذیل رقوم ہر سال خرچ ہوتے ہیں۔

خرچ حقیقی سررشتۂ تالیف وترجمہ ۴۲ف (۷۶۱ ۹۲ ۱) ۴۳ف (۳۶۷ ۵۶ ۲) ۴۴ف (۲۸ ۵۹ ۲) سکہ عثمانیہ۔

خرچ حقیقی مطبع ۴۲ف (۳۴۰ ۸۰) ۴۳ف (۸۲۹ ۴۹ ۱) ۴۴ف (۸۹ ۶ ۱) سکہ عثمانیہ۔

(دیکھو موازنہ جمع وخرچ ۴۴ف ص ۱۶۱ خرچ صدر مد ۴۳ تعلیمات)

اس وقت حسب ذیل ارکان دارالترجمہ کے کارگذار ہیں۔

(۱) محمد الیاس برنی ناظم (۲) عبداللہ عمادی مترجم عربی، (۳) قاضی تلمذ حسین مترجم پولیٹکل سائنس، (۴) مسعود علی محوی بی۔اے۔ (۵) سید ابراہیم مترجم عربی (۶) فضل کریم خاں۔ ایم۔بی بی ایس مترجم طبیعیات (۷) عثمان خاں مترجم طبیعیات (۸) سردار بلدیو سنگھ مترجم سائنس (۹) ڈاکٹر سید مختار حسین مترجم طب (۱۰) ڈاکٹر غلام دستگیر مترجم طب (۱۱) ڈاکٹر محمد حسین مترجم طب (۱۲) فدا علی طالب، مترجم فارسی، (۱۳) محمد احسان احمد بی اے مترجم فلسفہ (۱۴) رشید احمد بی اے مترجم معاشیات، (۱۵) ابوالخیر مودودی مترجم عربی (۱۶) نذیر الدین ایم اے مترجم ریاضی، (۱۷) عبدالستار ایم اے مترجم تاریخ۔ (۱۸) خواجہ عبدالقدوس ایم اے مترجم فلسفہ

(دیکھو سوال نمبر ۱ صفحہ تلکم آذر ۱۳۴۳ف)

قیام دارالترجمہ کے بعد حسب ذیل ارکان مجلس وضع اصطلاحات کے لئے مقرر کئے گئے۔

(۱) مولوی مرزا مہدی خاں کوکب (۲) مولوی حمید الدین بی اے۔ (۳) مولوی سید علی حیدر طباطبائی (۴) مولوی وحید الدین سلیم (۵) مولوی عبدالحق بی اے (۶) خان فضل محمد خاں ایم اے رنیگر (۷) مولوی عبدالواسع (۸) مولوی عبدالرحمن خاں (۹) مولوی مرزا ہادی رسوا بی اے (۱۰) مولوی سید سلیمان ندوی (۱۱) مولوی سید داس مسعود، ان میں سے نمبر ۲ و ۳ و ۴ و ۷ و ۹ نے انتقال کیا اور نمبر ۱ حیدرآباد سے چلے گئے جس کی وجہ سے ایک دوسری مجلس کی تشکیل کی گئی جس میں پروفیسران کلیہ جامعہ عثمانیہ، میڈیکل، کالج انجینئرنگ کالج، ٹریننگ کالج کے علاوہ مترجمان دارالترجمہ اور باہر کے علم دوست اور ماہرین حضرات بھی شریک کئے گئے ہیں۔

ارکان دارالترجمہ جو ملازم اور تنخواہ یاب ہیں ان کے علاوہ ان ارکان کو جو دارالترجمہ کے ملازم نہیں مگر دارالترجمہ کی کتب کا ترجمہ کرتے ہیں حسب ذیل معاوضہ دیا جاتا ہے۔

میٹرکولیشن کی نصابی کتب کے ترجمہ کے لئے کیمیا کی کتابوں پر فی صفحہ انگریزی تین روپیہ سکہ عثمانیہ ریاضیات کی کتابوں پر فی صفحہ تین روپے سکہ عثمانیہ۔

انٹرمیڈیٹ کی نصابی کتب کے لئے کیمیا، ریاضیات، اور طبعیات پر فی صفحہ انگریزی پانچ روپیہ سکہ عثمانیہ اور فلسفہ و تاریخ کے لئے فی صفحہ انگریزی تین روپیہ سکہ عثمانیہ،

بی۔اے کی نصابی کتب کے لئے، کیمیا، ریاضی اور طبعیات پر فی صفحہ انگریزی چھ روپیہ سکہ عثمانیہ فلسفہ کی کتب پر پانچ روپیہ سے سات روپیہ سکہ عثمانیہ تک اور معاشیات پر فی صفحہ پانچ روپیہ سکہ عثمانیہ تاریخ کے لئے ایک روپیہ بارہ آنے سے تین روپیہ فی صفحہ تک۔ قانون کے لئے چھ روپیہ فی صفحہ سکہ عثمانیہ۔ ایم اے کی نصابی کتب کے لئے سائنس اور ریاضی فی صفحہ آٹھ روپیہ تاریخ فی صفحہ تین روپیہ۔ فلسفہ چھ روپیہ، اور سات روپیہ فی صفحہ انگریزی اور جرمنی کے لئے۔

طبی کتب کے ترجمہ کے لئے فی صفحہ چھ روپیہ اور آٹھ روپیہ۔ انجینئرنگ کے لئے چھ روپیہ سکہ عثمانیہ بعد ترجمہ نظر ثانی کے لئے سو صفحہ کے لئے تیس روپے سے ساٹھ روپیہ سکہ عثمانیہ تک۔

ترجمہ و تالیف شدہ کتب کو نیز ہی نقطۂ نظر سے جانچنے کے لئے تاکہ اس میں کوئی بات ایسی نہ رہ جائے جو کسی مسلم عقیدے کے خلاف ہو ایک ناظر نیز ہی مقرر ہے جس کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار ہے۔ اسی طرح ادبی نقطۂ نظر سے جانچنے کے لئے کہ عبارت بے ربط نہ ہو اور زبان و محاورے کی غلطیاں نہ رہ گئی ہوں ایک ناظر ادبی مقرر ہے جس کی ماہوار تنخواہ پانچ سو

روپیہ سکۂ عثمانیہ ہے۔

مجلس وضع اصطلاحات کی شرکت کے لئے فی میٹنگ ہر ایک رکن کو بطور فیس یا خرچۂ سواری پانچ روپیہ دیئے جاتے ہیں۔

دارالترجمہ نے کم تعداد میں سہی مگر چند عمدہ تالیفات بھی شائع کی ہیں چنانچہ ان کی تفصیل یہ ہے۔

اب تک دارالترجمہ نے تاریخ ہند پر (۳۲) تاریخ انگلستان پر (۶) تاریخ یورپ پر (۸) تاریخ یونان پر (۷) تاریخ روما پر (۸) تاریخ اسلام پر (۱۵) جغرافیہ پر (۵) سیاسیات پر (۶) دستور انگلستان پر (۳) معاشیات پر (۶) عمرانیات پر (۲) فلسفہ پر (۱۰) منطق پر (۴) مابعد الطبیعیات پر (۲) نفسیات پر (۹) اخلاقیات پر (۵) قانون پر (۹) ریاضیات پر (۱۹) طبعیات پر (۱۸) کیمیا پر (۹) طب پر (۳۴) انجنیری پر (۱۶) اصطلاحات پر (۱) جملہ (۲۰۴) دوسو چار کتابیں شائع کیں جن میں سے بعض تالیفات اور بقیہ عربی، انگریزی، عربی، فارسی، بہترین کتب کے تراجم ہیں (۷۷) کتب ترجمہ و تالیف شدہ زیر طبع ہیں اور ۳۷ کتب زیر ترجمہ و تالیف ہیں جن کی مجموعی تعداد ۳۶۹ ہوتی ہے۔

ابتداءً دارالترجمہ قایم ہوا تو مولوی محمد عبدالحق بی اے (علیگ) معتمد انجمن ترقی اردو ناظم مقرر کئے گئے اور ۱۱ ستمبر ۱۹۱۷ء سے ۱۵ ستمبر ۱۹۱۸ء تک ناظم رہے، مولوی صاحب ہی نے تنظیم کی اور اراکین کا انتخاب وغیرہ کرکے اپنے خاص خاص اعتماد کے آدمیوں کو دارالترجمہ میں رکھا۔

۲۲ جنوری ۱۹۱۸ء سے ۲۹ جنوری ۱۹۳۵ء تک مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے، دہلوی، ناظم دارالترجمہ رہے۔ مولوی عنایت اللہ نہ صرف اچھے انشاپرداز اور عمدہ مترجم ثابت ہوئے بلکہ مترجمین کی مدد بھی بہت دیتے رہے مگر افسوس ہے کہ مولوی صاحب کو دفتری کاروبار سے دلچسپی اور انتظامی تجربہ نہ تھا جس کی وجہ سے دارالترجمہ اور پریس کی حالت کچھ زیادہ حاصل نہ رہ سکی اور نہ مطبوعات کی تشہیر و فروخت کا معقول انتظام ہی ہوسکا۔ چونکہ مولوی صاحب کی مدت ملازمت ختم ہو رہی تھی اس لئے وظیفہ ریٹائر پر سبکدوش کئے گئے اور ایک لائق، سمجھدار تجربہ کار مترجم کا نظامت کے لئے انتخاب عمل میں آیا چنانچہ مولوی محمد الیاس برنی نے ۳۰ جنوری ۱۹۳۵ء کو نظامت دارالترجمہ کا جائزہ لیا۔

مولوی الیاس برنی ایم اے، ملک کے ممتاز عالم اقتصادیات ہونے کی حیثیت سے ۱۳ ستمبر ۱۹۳۰ء کو دارالترجمہ کے مترجم اقتصادیات مقرر کئے گئے۔ ۲۰ اگست ۱۹۳۱ء سے جامعہ عثمانیہ نے آپ کی خدمات پروفیسر معاشیات کی حیثیت سے حاصل کیں، مگر آخر میں آپ کو پھر دارالترجمہ نے کھینچ لیا،

چونکہ مولوی برنی دارالترجمہ کے کام سے تفصیلی طور پر واقف ہونے کے علاوہ انتظامی سلیقہ بھی رکھتے ہیں، ایک عالم اقتصادیات کی حیثیت سے آمد و خرچ کی بھی فکر رکھیں گے اس لئے دارالترجمہ کی نظامت پر آپ کا انتخاب نہایت موزوں ہوا ہے۔ امید ہے کہ اب دارالترجمہ باضابطہ کام شروع کر دے گا اور معمولی بے ترتیبیاں جو درمیان میں پیدا ہوگئی تھیں اب باقی نہیں رہیں گی۔

دارالترجمہ نے اب تک جس قدر انگریزی جرمن وغیرہ زبانوں کی کتابیں ترجمہ کی ہیں، ان کے ناشروں سے ترجمہ کی اجازت لینے کے بعد ترجمہ کرایا گیا ہے اور اکثر ناشروں کو حسب شرائط معاوضے بھی دیئے گئے ہیں،

ترجموں میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ ترجمہ صحیح ہو، واضح ہو، سلیس ہو اور رواں ہو،

ترجمہ کرنے کے بعد اولاً مترجم خود نظرثانی کرتا ہے اور اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو متعلقہ پروفیسر سے یا اس موضوع کے کسی ماہر سے نظرثانی کرائی جاتی ہے، اس دوبارہ نظرثانی کے لئے پہلے معاوضہ دیا جاتا تھا۔ مگر اب نہیں دیا جا رہا ہے۔

اب تک مترجمین دارالترجمہ نے جو رکن اور تخمیناً ۵ باب ہیں (۱۸۹) کتابوں کا ترجمہ کیا ہے، اور غیر ملازم اصحاب نے معاوضہ پر (۱۵۷) کتابوں کا ترجمہ کیا ہے، اور (۳۹) کتابیں اس وقت زیر ترجمہ ہیں بعض خاص خاص فنی کتابوں پر دارالترجمہ نے بہت زیادہ رقم خرچ کی ہے، و نہایت فراخ دلی سے معاوضہ دیا ہے، افسوس ہے کہ ہمارے استفسار کے باوجود دارالترجمہ سے ایسے اعداد فراہم نہیں کئے گئے جن سے بعض خاص خاص کتابوں کا معاوضہ متخمن ہوسکتا مگر جہاں تک معلوم ہوسکا ہے دارالترجمہ نے آج تک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں کی جس کا معاوضہ سو روپیہ سے کم دیا گیا ہو بلکہ سینکڑوں کتابیں ایسی شائع ہوئی ہیں جن کا معاوضہ کئی کئی ہزار روپیہ دیا گیا ہے، اس معاملے میں سرکار عالی نے نہایت دریا دلی سے روپیہ صرف کیا ہے۔

اس وقت تک مجلس وضع اصطلاحات نے تقریباً چالیس ہزار اصطلاحات کا اردو ترجمہ کیا۔ ان اصطلاحات کا ایک مجموعہ (مرتبہ جانکی پرشاد) ۱۹۲۶ء میں فلسکیپ سائز کے (۱۹) سطری مسطر کے (۲۱۵) صفحات پر طبع ہو چکا ہے جس میں صرف وہ اصطلاحات ہیں جو ۱۳۳۴ف سے ۱۳۳۵ف تک مجلس نے وضع کی ہیں۔ یہ مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کا طبع اول ختم ہو گیا۔ اب طبع ثانی کا انتظام ہو رہا ہے۔ اس مجموعے میں تقریباً (۵۰۸۴) اصطلاحات ہیں۔

دوسرا مجموعہ جس میں ۱۳۳۵ف سے ۱۳۴۲ف تک کی وضع شدہ اصطلاحات ہیں، زیر طبع ہے،

دارالترجمہ کی مطبوعات عام طور پر فلسکیپ سائز (۱۲+۸) اور رائل سائز (۱۰×۷) پر طبع ہوئی ہیں،

فلسکیپ سائز زیادہ کم کتابیں طبع ہوئی ہیں ورنہ عام طور پر دارالترجمہ کی کتابوں کا سائز رائل رکھا گیا ہے۔ کتابوں کے لئے کاغذ نہایت عمدہ ولایتی چکنا استعمال کیا جاتا ہے، عام طور پر کتابیں دو قسم کی طبع کی گئی ہیں۔ ایک نہایت اچھے اور عمدہ کاغذ پر جو مجلد فروخت ہوتی ہیں دوسری معمولی کاغذ پر جو غیر مجلد ہوتی ہیں مجلد اور غیر مجلد کی قیمتوں میں بہت کم فرق رکھا گیا ہے۔

مطبوعات دارالترجمہ کی قیمتیں نہایت بے ڈھنگے پن سے اور زیادہ مقرر کی گئی ہیں مثلاً مقدمہ مابعد الطبیعات (ہنری برگسان) مترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی (۴۸) صفحات پر چھپا ہے، عام طور پر رائل سائز کے تین جزو کی کتاب چار پیچھے آنے میں فروخت ہوتی ہے مجلد ہونے کی وجہ سے آٹھ دس آنے تک قیمت رکھنی چاہئے تھی مگر اس کی قیمت ایک روپیہ چودہ آنے سکہ حالیہ اور ایک روپیہ دس آنے سکہ برٹش انڈیا مقرر کی گئی ہے، جو بہت زیادہ ہے۔ قیمتوں کی زیادتی ہی کی وجہ سے دارالترجمہ کی مطبوعات کم مقبول ہو رہی ہیں۔ کتابوں کی قیمتوں کے قرار دادیں کوئی اصول پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے ۱۲، ۱۵ تک روپوں پر بڑھا لئے گئے ہیں۔

عام طور پر ان کتابوں کو مشتہر بھی نہیں کیا گیا، ہماری تحریک پر مولوی الیاس برنی ناظم دارالترجمہ نے وعدہ کیا ہے کہ قیمتوں میں مناسب حد تک تخفیف کر دیں گے۔ بہتر ہوگا کہ دارالترجمہ کی ہر جدید مطبوعہ کتاب علمی رسائل اور اخبارات کو ریویو کی غرض سے روانہ کی جایا کرے۔ تاکہ ان کتابوں پر ریویو ہوں اور عام لوگوں کو معلوم ہو سکے،

لکھائی چھپائی پر نہایت فراخ دلی سے روپیہ صرف کیا جا رہا ہے ایک مستقل پریس "دارالطبع جامعہ عثمانیہ" اور اس کا عظیم الشان عملہ موجود ہے مصحح، مصلح سنگ اور کاپی نویس، فورمن، کثیر تعداد میں موجود ہیں جنہیں بہت زیادہ تنخواہیں دی جا رہی ہیں مگر جیسی عمدگی طباعت میں پیدا ہونی چاہئے اور جو نفاست اتنا روپیہ خرچ کرنے کے بعد لازمی تھی مصارف کی زیادتی جس صحت و صفائی کی مقتضی تھی۔ وہ اب تک حاصل نہیں ہوئی ہے، اس کی وجہ معاشی اور اقتصادی اصول سے بے تعلقی اور عدم نگرانی ہے۔ اب ہمیں توقع ہے کہ مولوی برنی ان سب اسقام کو دور فرمادیں گے۔

نواب ڈاکٹر سر حیدر نواز جنگ بہادر (حیدری) صدر الہام فینانس و نائب صدر اعظم نے شروع سے جامعہ کے قیام اور اس کے کاروبار میں بے انتہا دلچسپی لی ہے اور اب تک لے رہے ہیں یہ سر حیدری ہی کی کوششیں ہیں جو جامعہ عثمانیہ اس قدر کامیاب اور دارالترجمہ یوں مستقل طور پر کام کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سر حیدری کو تاریخ و کن کی طرف متوجہ کرائیں یعنی دارالترجمہ میں دکن کی تاریخوں کے ترجمہ کے لئے خاص طور پر توجہ کرنے کی رائے دیں۔ امید ہے کہ سر حیدری دکن کی تاریخوں کو خصوصیت سے ترجمہ کرانے کی کوشش فرمائیں گے۔

دارالترجمہ ۱۹۱۷ء میں قایم ہوا، اٹھارہ سال میں اس ادارے نے (۳۰۹) کتابیں پیش کیں، یہ ظاہر اٹھارہ سال کے عرصے میں ساڑھے تین سو سے زایہ کتابوں کا ترجمہ کچھ زیادہ امید افزا نظر نہیں آتا مگر جب معاشیات، عمرانیات فلسفہ، منطق، مابعد الطبیعات، نفسیات، اخلاقیات، ریاضیات، طبیعات، کیمیا، حیاتیات، طب، اور انجنیری کی موٹی موٹی معرکۃ الآرا کتابوں پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ سال ان کتابوں کے ترجموں کے لئے بہت کم ہیں۔ فنون اور اصطلاحات کا ترجمہ کرنا ایک نئی نویلی، لیلیٰ زبان میں موٹے موٹے علمی اور فنی مسائل کا بیان۔ حیرت انگیز کامیابی ہے اس کی اہمیت وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو علمی اور فنی تراجم کی دقتوں سے واقف اور اس کام کا تجربہ رکھتے ہیں۔

انٹرنیشنل کانفرنس میں ۱۹۲۹ء مقام دہلی سر حیدری نے دارالترجمہ کی مطبوعات پیش کیں تو لارڈ رومن کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ "یہ حیرت انگیز کارنامہ ہے"۔ بغداد اور قرطبہ نے علم و فن کی بڑی خدمت کی مگر "زوال ملک مستعصم" کے ساتھ ساتھ یہ خدمات بھی "دجلہ برد"

ہوگئیں، اب حقیقی معنی میں اگر آپ بغداد کو دیکھنا چاہتے ہوں تو حیدرآباد دکن آیئے۔ یہاں آپ کو ہارون اور مامون کی علمی سرپرستیوں کی زیارت کے علاوہ یونانی اقلیدسیہ کی زیارت بھی نصیب ہوگی۔

آج ہندوستان کیا بلکہ دنیا بھر میں صرف ایک سلطنت آصفیہ ہی نظر آتی ہے جو اپنے خزانے کا ایک بہت بڑا حصہ تعلیم، تربیت، علم اور فن پر صرف کر رہی ہے جس نے اردو کو بامِ عزت پر پہنچا دیا جس نے ہر مٹیلہ یادگار کو باقی رکھنے کی کوشش کی اور از سرِ نو جو عیسی مغلی بیداد دار کردہ پروان چڑھایا کہ یہی المیلی، رسیلی طرز بیانی اردو جو کسی فنی اور علمی مجلس میں آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی تھی۔ آج بڑے بڑے فنوں پر جرأت زبانی کے ساتھ گفتگو کرتی ہے اور اس کی تنی سی زبان بلا روک ٹوک کلکتہ کی کنڑی سی سی پلی ہے۔ یہ اونی کرشمہ ہے حضور نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ کی علم پروری اور معارف نوازی کا

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را اردو دکن
شاد باش اے حضرت عثمان علی خاں شاد باش

مولوی الیاس برنی ایم اے: ناظم دارالترجمہ کا مشکور رہوں کہ آپ نے میری استدعا پر دارالترجمہ کی مکمل فہرست جدید اندراجات کے ساتھ روانہ کی اور متعلقہ مواد کے علاوہ میرے استفسارات کے جواب بھی نہایت اخلاق سے بروقت ادا کئے۔ مجھے یقین ہے کہ مولوی صاحب موصوف میرے ان پر خلوص مشوروں پر بھی توجہ فرمائیں گے جو ان اوراق میں پیش کئے گئے ہیں۔

جو حضرات دارالترجمہ کی فہرست یا کتابیں وغیرہ طلب کرنا چاہیں اس پتے سے مراسلت کرسکتے ہیں۔

ناظم صاحب دارالترجمہ سرکار عالی
یونیورسٹی مامون (اڈمی ہیٹ)
حیدرآباد دکن

سید تمکین کاظمی
حیدرآباد دکن

غزل

تمہارے درد محبت کو اور کیا کہئے
اسے جو کہئے تو درمانِ جانفزا کہئے
جو کچھ کہوں تو وہ دیتے ہیں درسِ خاموشی
جو چپ رہوں تو وہ کہتے ہیں مدعا کہئے
صنم کہا تو برا ماننے کی بات نہیں
تمہیں صنم جو نہ کہئے تو کیا خدا کہئے
کسی کی وہ نگہِ لطف اب نہیں نہ سہی
گلے فضول اسے خواب ما مضےٰ کہئے
اُسے جو آپ سے اس درجہ سوءِ ظن ہے ذکی
اِسے عدو کا فریب و فانما کہئے

محمد عبدالسلام
بی۔ اے

احساسِ تغافل

(سانیٹ)

ابھی تک آنکھ کے تل میں تری تصویر رقصاں ہے
ابھی تک حشر برپا ہے تمناؤں کے ایواں میں
ابھی تک گم ہیں میرے ہوش اک دنیائے پنہاں میں
ابھی تک دل میں تیری یاد اک عشرت کا ساماں ہے

ابھی تک شبنمِ مہر و محبت ہے ادا تیری
ابھی تک تیرے دم سے ہے کمالِ دلکشی پیدا
ابھی تک روحِ افسردہ میں ہے اک تازگی پیدا
ابھی تک لطف دیتی ہے مرے دل کو جفا تیری

ابھی تک پھول جھڑتے ہیں ترے لب ہائے خنداں سے
ابھی تک تیری باتوں میں وہی اندازِ پنہاں ہے
ابھی تک تیرے نغموں میں وہی اعجازِ پنہاں ہے
ابھی تک کھیلتے ہیں میرے ارماں تیرے داماں سے

مگر حیرت ہے تُو اس قرب پر کیوں دور رہتی ہے؟
تری صورت مری آنکھوں سے کیوں مستور رہتی ہے؟

روشن نکودری

سُرخ دھاگا

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افراد

پاشا ——— ایک دُکاندار
فیروزدین ——— گاؤں کا نمبردار
امجد بیگ ——— فیروزدین کا دوست
گل خاں ——— ایک معزول شدہ سپاہی
دولت یار ——— ہوٹل کا مالک
ایک مسافر ———

منظر۔ شہر سے باہر کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے ہوٹل کا ایک کمرہ۔ کمرے کی چھت قدرے پست ہے۔ دائیں طرف ایک کھڑکی اور سامنے آتش دان ہے جس میں کوئلے دہک رہے ہیں۔ بائیں جانب دروازہ ہے جو باہر کھلی کی سمت کھلتا ہے۔ کمرہ معمولی طور پر سجا ہوا ہے۔ چند ایک چھوٹی چھوٹی چٹائیاں جو ایک دوسرے کے مختلف جگہوں پر پڑی ہوئی ہیں۔ تین چار رنگین قطعے بھی دیواروں سے آویزاں نظر آتے ہیں۔ آتش دان کے قریب ہی بجلی کی انگیٹھی کا بٹن لگا ہوا ہے۔ فروری کا مہینہ ہے۔ موسم نہایت خراب ہے۔ سرد ہوا کے تیز و تند جھونکے کھڑکی کے راستے سے کبھی کبھی اندر آتے ہیں۔ شام کا وقت ہے لیکن مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے باہر گہری تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔

پاشا، امجد بیگ اور فیروزدین ایک میز کے گرد بیٹھے ہیں جس پر تین بلوری گلاس پڑے ہوئے ہیں۔ امجد بیگ جو اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں سے زیادہ عقلمند سمجھتا ہے اور فیروزدین جو حلیہ باز اور کسی حد تک بے وقوف واقع ہوا ہے دروازے کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ پاشا اپنے خیالات میں گم ہے۔ وہ ایک مضبوط اور قوی الجثہ آدمی ہے۔ تمام ڈرامے کے دوران میں اس کے چہرے پر بدحواسی کے آثار نمایاں رہتے ہیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ دولت یار دروازے میں راستہ روکے کھڑا ہے۔

گل خاں دروازے کے باہر کھلی میں ایستادہ نظر آتا ہے۔

دولت یار۔ (فیصلہ کن انداز میں) نہیں گل خاں میں تمہیں اور نہیں دے سکتا۔ میری مانئے میں اب تم گھر جاؤ اور بہتر ہے کہ سو رہو۔

گل خاں۔ کیا میں نے نہیں کہا کہ تمہیں قیمت صبح ادا کر دوں گا؟

دولت یار۔ بالکل درست۔ مگر میرا یہ مطلب نہیں۔ خان تم نہیں سمجھتے۔ میرا مطلب۔ لائسنس۔ سب کچھ ضبط ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں۔

گل خاں۔ جانے بھی دو۔ لاؤ مجھے ایک بوتل دو۔ وسکی!

دولت یار۔ نہیں تم کافی پی چکے ہو۔

گل خاں۔ (اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے) کمینے! (چلا جاتا ہے۔ اس کے پاؤں کی آہٹ سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے سنائی دیتی ہے۔ پھر کسی بھاری دروازے کے کھلنے اور زور سے بند ہونے کی آواز آتی ہے۔ دولت یار مسکراتے ہوئے

پاشا کی طرف دیکھتا ہے)

امجد بیگ۔ ہاں ٹھیک ہے۔ وہ بہت زیادہ پی گیا ہے۔

فیروز دین۔ عجب آدمی ہے۔ کیسے آرام کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا ہے۔ کیوں پاشا؟

پاشا۔ (جیسے کوئی خواب سے بیدار ہوتا ہو) کون؟ وہ گل؟ میں تو اس سے بیزار ہوں۔ ہمیشہ میری دکان میں ادھر اُدھر سے جھانکتا رہتا ہے اور ہر وقت کوئی نہ کوئی چیز بغیر دام ادا کرنے کے اٹھالے جانے کی تکڑ میں رہتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی جب میں دکان کو بند کر رہا تھا تو یہ سر پھرا دکان کی ہر چیز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ میں نے ڈانٹ کر ہٹا دیا تھا۔

(اس پر پھر پہلی سی حالت طاری ہو جاتی ہے)

دولت یار۔ یہ اس کا جسم نہیں دماغ ہے جو سب کچھ کر رہا ہے اور اگر یہ سچ پوچھو تو دوستو میں اُس سے نہیں بلکہ اُس کے لئے ڈرتا ہوں کاروبار کی سخت بری حالت ہے۔ خدا جانتا ہے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بہت جلد گل جیسے آدمیوں سے تنگ آجاتا ہوں۔ پورے ایک سال سے بے کار ہے، اور حالت دن بدن بدتر ہوتی جارہی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کب اور کہاں سے وہ روپیہ لاتا ہے۔ ہاں گھنٹی ——

امجد بیگ۔ (گلاسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پھر وہی۔

(دولت یار گلاس اکٹھے کرتا ہے)

پاشا۔ (غنودگی کے عالم میں) میرے لئے نہیں میں اب گھر جاؤں گا۔

امجد بیگ۔ نہیں۔ ایک اور۔ ہاں ہم سب کو ایک ایک اور رہا پاشا گلاس ہاتھ سے رکھ دیتا ہے) اور سنو دولت یار میں پاشا کی اس حالت پر بالکل حیرت میں نہیں ہوں۔ عزیز کا واحد دوست اس سے جدا ہو گیا ہے۔ دونوں ——

دولت یار۔ ہاں ٹھیک ہے امجد لیکن اس کے باوجود میں ایک آدمی کا اعتدال کی حد میں رہتے ہوئے غم غلط نہ کرنا پسند نہیں کرتا (گلاس لے کر باہر چلا جاتا ہے)

امجد بیگ۔ آہ کتنا طویل دن تھا۔ میری زندگی میں شاید یہ طویل ترین دن گزرا ہوگا۔

فیروز دین۔ نہیں اتنا نہیں جتنی کہ آرام کے لئے گل کی رات تھی۔

پاشا۔ (سر کو اٹھائے بغیر) گل کی رات۔ اُف! میری روح!

(دونوں اس کی طرف دیکھتے ہیں)

فیروز دین۔ آہ ہم نے ضرور محسوس کیا ہوگا۔ پاشا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ایسا منظر دیکھنے کے لئے کیوں گئے؟ آہ یہ خیال کرنا کہ صبح آٹھ بجے وہ انسان نما شیطان اکرام پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا تھا جتنی کہ وہ۔

امجد بیگ۔ بس بس! تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اکرام نے اپنے کئے کی سزا پائی اور بس۔

پاشا۔ (سر اٹھاتے ہوئے) مجھے گھر جانا چاہئے۔ مجھے کچھ وہم سا ہو گیا ہے کہ میں اپنی نقدی کی صندوقچی کی کنجی وہیں گدی پر چھوڑ آیا ہوں اور شاید قفل بھی اچھی طرح بند نہیں کیا۔ میری طبیعت بہت پریشان تھی (کھڑا ہوتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ بیٹھ جاتا ہے)

فیروز دین۔ پاشا فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمہارا اندوختہ جوں کا توں پڑا ہوگا۔ آہ اکرام کی حالت پر ترس کھانا چاہئے۔ اگرچہ ہم میں سے کوئی بھی اس جیسا نہیں ہے۔ لیکن یہ درست ہے کہ اس کا مقدمہ پوری طرح سے لڑا گیا اور اس کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوا ہے۔ اس لئے نہیں کہ مجھے اس کے قاتل ہونے میں کوئی شک ——

پاشا۔ ایسا مت کہو۔ یہ بہت رنجدہ ہے۔ اکرام عجب قسم کا آدمی تھا اور پھر —— (رک جاتا ہے) اور بے شک وہ مجرم تھا۔ کیونکہ گواہوں نے ایسا ہی ثابت کیا۔ کیا میں نے جھوٹی گواہی دی ہے؟

فیروز دین۔ بے شک گواہوں نے ایسا ہی ثابت کیا۔ لیکن ——

(دولت یار داخل ہوتا ہے اور ہر ایک کے آگے شراب سے بھرا ہوا ایک ایک گلاس رکھ دیتا ہے)

امجد بیگ۔ ہم صبح کے المناک واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں (جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیتا ہے)

دولت یار۔ ہاں درست ہے۔ درست۔ بہت المناک (نوٹ اٹھاتے ہوئے) تمہاری باتوں سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ گل خاں بھی تم میں موجود ہے۔

فیروز دین۔ کیا؟ وہ؟

امجد بیگ۔ وہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا عزیز دوست اکرام پھانسی پا چکا ہے۔

دولت یار۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جس جج نے اکرام کو پھانسی کی سزا دی ہے اس کے پیٹ میں جا تو گھونپ دوں گا اور گواہوں کو زہر ——

فیروز دین۔ بے وقوف۔ وہ ضرور دیوانہ ہو گیا ہے۔

امجد بیگ۔ (زاہدانہ انداز میں) جب آدمی شراب پیتا ہے تو اس کا یہی حال ہوتا ہے۔

فیروز دین (مذاق کے لہجے میں) گستاخی معاف۔ لیکن گل خاں تو کبھی مدہوش نہیں ہوا۔

امجد بیگ۔ بہت خوب! بہت خوب! (ریاکارانہ طریق پر ہنستا ہے)

پاشا۔ اور اگر گل اپنے ارادے کا پکا ہو تو۔

امجد بیگ۔ کیا؟

فیروز دین۔ تو کیا! جج یا گواہوں کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔

دولت یار۔ (گھبرا کر) کیا ہے پاشا؟

(پاشا بغیر کچھ جواب دیئے ہوئے سر جھکا لیتا ہے)

امجد بیگ۔ (آہستہ سے) کمزوری! محض کمزوری۔

دولت یار۔ ٹھیک ہے مجھے بھی اس کا کچھ تجربہ ہے۔ بلکہ میں اس وقت بھی اس کا شکار ہو رہا ہوں۔

فیروز دین۔ اچھا! (پینے کی رغبت ظاہر کرتے ہوئے امجد بیگ کو اشارہ کرتا ہے) ہاں! (پینا شروع کر دیتا ہے)

دولت یار۔ میں یہ خیال بلکہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ہمارا مدنصیب دوست گل خاں آج رات ضرور یہاں آئے گا۔ مگر میں اس کا یہاں آنا پسند نہیں کرتا۔

امجد بیگ۔ ہم تمہیں مدد دیں گے —— اخلاقی مدد ہاں کو شراب نہ دینی میں

دولت یار۔ بہت مشکور ہوں گا۔ میں اس کو کبھی بھی شراب نہیں دوں گا۔ میرے ضمیر کا یہی تقاضا ہے۔

فیروز دین۔ اور تمہارا لائسنس —— اور اس کے علاوہ اس کے پاس ایک دمڑی تک نہیں ہے۔

دولت یار۔ بے شک (باہر چلا جاتا ہے)

فیروز دین۔ دیکھو پاشا یہ خالص شیمپین ہے۔ تمہارے لئے ازبس مفید ہے

پاشا۔ (جیسے کوئی گہری نیند سے چونک اٹھتا ہو) میں نے گل خاں کو آج صبح جیل خانے میں دیکھا تھا۔ میری طرح وہ بھی کسی طریق سے اکرام کو پھانسی پر لٹکتے ہوئے دیکھنے گیا ہوا تھا۔ وہ اپنے منہ اور سر کو بری طرح پیٹے ہوئے تھا۔ لیکن میں نے پھر بھی اُسے پہچان لیا۔ خدایا! میں کبھی اس کا چہرہ بھول سکتا ہوں! جب اکرام کو پھانسی پر چڑھایا گیا تو اس کی آنکھوں سے خوفناک وحشت برس رہی تھی۔

فیروز دین۔ (بے تاب سا ہو کر) اس کی صورت کیسی تھی!

امجد بیگ۔ خاموش فیروز خاموش —— غم میں ڈوبی ہوئی ہمگی مزہ

پاشا۔ وہ ایک —— ایک انتہائی اذیت کے عالم میں تھا۔

امجد بیگ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ انسانیت کا عنصر موجود ہے۔ اگرچہ جب وہ اس کو نے میں رکوبے کی طرف اشارہ کرتا ہے) بیٹھ کر شراب پیتا ہے تو مجھے اس کی شرافت پر شک گزرتا ہے (اپنا گلاس اٹھا کر پیتے لگتا ہے) اس سے ظاہر ہے ہمیں اپنے ہمسائیوں کو پرکھنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

فیروز دین —— ممکن ہے اس میں اور اکرام میں ہمارے گمان سے زیادہ دوستی ہو۔ ہاں وہ بہت گہرے دوست تھے (موٹر کے ٹھہرنے کی آواز آتی ہے) کون ٹھہرنے آیا ہے یہاں! (اٹھ کر کھڑکی میں جاتا ہے) ایسی بھیانک رات میں موٹر کی سواری کا بھی لطف لیا شاید موٹر کار رنگ بھی سیاہ ہے۔ اُف! (کانپ جاتا ہے) خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ مجھے کہیں دور نہیں جانا ہے آسمان پر بجلی چمکتے دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ کھڑکی بند کرنے لگتا ہے کہ ہوا کا ایک تند جھونکا اندر آ جاتا ہے)

(پاشا اوچ مار کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر کانپتے کانپتے خود بخود بیٹھ جاتا ہے)

امجد بیگ۔ ایسے موسم میں غیر متوقع طور پر آیا ہے۔ پاشا کیا بات ہے۔ تم کچھ بیمار سے معلوم ہوتے ہو۔ کوئی خوف کی بات نہیں۔

پاشا۔ (جذبات کا اظہار کرتے ہوئے) آہ۔ آج رات کوئی آفت آنے والی ہے۔ ضرور کہیں نہ کہیں کوئی سخت ظلم ہوا ہے۔ مجھے گھر جانے سے ڈر لگتا ہے۔

فیروز دین۔ (کرسی پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے) چھوڑو ایسی باتوں کو۔ اس طرح کچھ نہیں ہو گا (گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس کے دو ایک گھونٹ پیو۔ تمہیں ضرور افاقہ ہو جائے گا۔ تمہیں آج صبح اکرام کو دیکھنے کے لئے نہیں جانا چاہئے تھا۔

پاشا۔ (رکا پہنچتے ہوئے) فیروز! میں نے جبی کے اس اشارے سے بعض اکرام کو دیکھا ہے اور وہ ایک ——— ایک سرخ دھاگے سے لٹک رہا تھا۔

(فیروزدین اور امجد بیگ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

امجد بیگ کیا!

پاشا۔ (مجنونانہ انداز میں) صرف سرخ دھاگا اور وہ مردہ اور پتھر کی طرح بے حس و حرکت اور ——— اس کا سر ایک ——— ایک طرف کو لٹکا ہوا۔ لبوں پر اُف ——— خوفناک مسکراہٹ جیسے ———

فیروزدین۔ (جلدی سے سانس لیتے ہوئے) مسکراہٹ!

امجد بیگ ——— تو یہ!

(دروازہ کھلتا ہے۔ ایک مسافر داخل ہوتا ہے۔ پیچھے پیچھے دولت یار ہے)

مسافر۔ (اپنا بھیگا ہوا کوٹ اتارتے ہوئے) بس یہ ٹھیک ہے۔ میرے لئے علیحدہ ایک کمرے میں آگ روشن کرو اور ایک میرے ڈرائیور کے لئے۔ مگر پہلے مجھے ایک برانڈی کا گلاس دو اور کچھ گرم پانی بھی (آتشدان کے قریب جاتا ہے اور دونوں ہاتھوں کو ملا کر آگ تاپنے لگتا ہے)

دولت یار۔ بہت بہتر (چلا جاتا ہے)

(کمرے میں چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے جس کے دوران میں فیروزدین اور امجد بیگ پہلے مسافر کی طرف اور پھر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ پاشا اپنی ٹھوڑی چھاتی سے لگائے بے خبر بیٹھا ہے۔ باہر ہوا کا زور کم معلوم ہوتا ہے لیکن اچانک ہی ایک تند جھکڑ کھڑکی سے آکر ٹکراتا ہے)

فیروزدین۔ خدایا اس کے کیا معنی؟

امجد بیگ۔ کچھ نہیں۔ جھکڑ چل رہا ہے (مسافر کو مخاطب کرتے لگتا ہے)

پاشا۔ (سوئے ہوئے) سرخ دھاگے سے لٹک رہا تھا اور مسکراہٹ ——— ہاں خوفناک مگر معصوم ——— (آواز ہلکی ہوتی جاتی ہے) بے گناہ مظلوم ——— لب ہلتے ہیں لیکن کچھ سنائی نہیں دیتا)

فیروزدین۔ (دبی ہوئی آواز میں) ہیں!

امجد بیگ۔ (پاشا کی طرف جھک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے) کچھ فکر نہ کرو۔ میرے دوست (فیروز کو اشارہ کرتے ہوئے) میرا خیال ہے کہ پاشا یہاں آنے سے پیشتر ہی منوم ہو گا۔

(کھانستا ہے اور مسافر کو اپنی طرف مخاطب کرتا ہے) بہت بری رات ہے جناب۔

مسافر۔ (رُخ بدلتے ہوئے) بہت خراب (کسی قدر سرد مہری سے) شاید میں آپ کی محفل میں مخل ہوا ہوں۔ مگر آگ تاپنے کی جو صرف یہیں ہے

امجد بیگ۔ نہیں صاحب۔ مطلق نہیں۔ یہ کوئی خاص کمرہ نہیں ہے اور اگر خاص بھی ہوتا تو ایسی سرد رات میں آپ کبھی بار خاطر نہ ہوتے۔

مسافر۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں (کرسی گھسیٹ کر آتشدان کے قریب کرتا ہے۔ جماہی لیتا ہے اور سیگرٹ کیس نکال کر ایک سیگرٹ سلگاتا ہے (امجد بیگ اور فیروزدین غور سے اس کی طرف دیکھتے ہیں) یہاں نزدیک ہی کوئی گاؤں بھی معلوم ہوتا ہے۔

امجد بیگ۔ ہاں۔ سڑک کے اس پار ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ فیروزدین جہاں پاشا رہتا ہے۔

مسافر۔ تو پھر تم جانتے ہو گے۔ کیا وہاں کوئی ہیرا ——— پتھر کی طرح کانوں سے ہیرا آدمی بھی رہتا ہے اور شاید وہ گونگا بھی ہے۔

امجد بیگ۔ نہیں جناب۔

فیروزدین۔ (ایمد کی جھلک لئے ہوئے) ہاں ایک آدمی رہتا ہے۔ لیکن وہ تو عشقہ کا مریض ہے۔

مسافر۔ نہیں نہیں! یہ شخص شاید بستی کو جا رہا تھا۔ ظالم نے میرے اور میرے موٹر ڈرائیور کے بدن پر رونگٹے ہی تو کھڑے کر دیئے۔

(دولت یار داخل ہوتا ہے اور مسافر کے آگے اس کی برانڈی رکھ دیتا ہے)

امجد بیگ۔ (شائستگی کے ساتھ) یعنی کیا ہوا جناب!

مسافر۔ (دولت یار سے) بس شکریہ (برانڈی کو گلاس میں انڈیلتے ہوئے) ہاں۔ بادوباراں کے اس طوفان میں وہ سڑک کے عین وسط میں کمال اطمینان کے ساتھ جا رہا تھا۔ ہم نے ہر چند پورے زور سے موٹر کا ہارن بجایا۔ لیکن بے سود۔ اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ ہمیں مجبوراً موٹر کو آہستہ کرنا پڑا۔ آخر کار خود بخود ہی وہ سڑک سے پرے ہٹ گیا۔ لیکن جوں ہی ڈرائیور نے موٹر تیز کی چشم زدن میں ظالم پھر سامنے آگیا (دولت یار جو کہ دروازے کی طرف جا رہا

تھا کھڑا ہو جاتا ہے اور سننے لگتا ہے) بس موڑ اس کے اوپر سے گزر ہی چلی تھی کہ میرے ڈرائیور نے کمال ہوشیاری کے ساتھ موٹر کو اتنی قدموں پر روک لیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہوا ہمارے مخالف نہ ہوتی تو موٹر الٹ جاتی اور ہم اس وقت بجائے اس آتشدان کے پاس بیٹھ کر گرم ہونے کے پوری طرح سرد ہو چکے ہوتے اور اس پر طرہ یہ کہ اس بھلے مانس نے منہ پھیر کر دیکھا تک نہیں۔ مزے سے چلتا گیا۔ (ریانڈی کا گھونٹ پیتا ہے)

امجد بیگ۔ توبہ! کیا کسی نے کبھی ایسا واقعہ سنا ہے؟ اور جناب پھر آپ نے کیا کیا؟

مسافر۔ میں چلایا جتنی کہ میری آواز میری مدد کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ میرا خیال ہے پھر وہ جلد ہی سڑک سے اتر گیا۔ کیونکہ جب ہم نے دوبارہ موٹر کے انجن کو درست کر کے چلایا تو اس کا کہیں پتہ نہیں تھا (وحشیانہ انداز میں) کاش میں اس سے گفتگو کر سکوں!

امجد بیگ۔ کوئی دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا آپ نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا؟

مسافر۔ نہیں۔ مجھے صرف اس کی پشت ہی دکھائی دی ہے (ریانڈی کا ایک اور گھونٹ پیتا ہے) اس کا قد دراز تھا اور پولیس کے سپاہیوں کا سا بڑا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کی ٹوپی بھی تھی۔

فیروز دین۔ یہاں کئی لمبے قد بڑے کوٹ اور سیاہ رنگ کی ٹوپیوں والے رہتے ہیں۔

مسافر۔ اس نے اپنی گردن کے گرد ایک مفلر بھی لپیٹا ہوا تھا۔ شاید گلے کو بارش سے بچانے کے لئے اور جب موٹر کے لیمپ کی روشنی اس کے اوپر پڑی میں نے دیکھا کہ اس کے مفلر کا رنگ سرخ تھا۔

(فیروز دین کے جسم میں کپکپی سی دوڑ جاتی ہے اور وہ کانپ اٹھتا ہے)

امجد بیگ۔ (چیختے ہوئے) کیا؟

دولت یار۔ (دور دراز سے کوزور سے چلاتے ہوئے بڑبڑاتا ہے) مفلر کا رنگ سُرخ تھا۔

(پاشا آہستہ آہستہ اپنے خواب سے بیدار ہوتا ہے)

مسافر۔ ہاں کچھ عجیب قماش کا آدمی تھا۔ ــــ میں کہتا ہوں تمہارے دوست کو کیا ہوا ہے! (پاشا کی طرف اشارہ کرتا ہے)

امجد بیگ۔ اسے معاف فرمائیے گا۔ اس نے کچھ زیادہ پی لی ہے۔

پاشا۔ (بڑبڑاتے ہوئے) سرخ دھاگے سے لٹکا ہوا ــــ اور مسکراہٹ ــــ

امجد بیگ۔ (تسکین دیتے ہوئے) بس بس پاشا۔

پاشا۔ (جیسے اس نے امجد بیگ کی بات کو سنا ہی نہیں: مسافر کی طرف مخاطب ہوتا ہے اور کانپتی ہوئی انگلی سے کھڑکی کی جانب اشارہ کرتا ہے) آدھ اس کی روح تھی جو تم نے سڑک پر دیکھی ــــ اکرام کی روح جو قتل کے الزام میں آج صبح کے جیل میں پھانسی دیا گیا اور وہ ــــ وہ اسی سرخ مفلر کے دھاگے سے لٹکایا گیا تھا۔ خدا اس کی روح کو تسکین دے (اس پر وہی غنودگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے)

مسافر۔ (امجد بیگ سے) میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ میری طاقت سے باہر ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کے دوست کی یہ حالت زیادہ شراب پینے کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی سخت ذہنی اور روحانی صدمے کے باعث ان کا یہ حال ہو رہا ہے۔

فیروز دین۔ (امجد بیگ کی ترجمانی کرتے ہوئے) ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ پاشا نہایت شریف آدمی ہے اور اتنا ایماندار جتنا کہ کسی دکاندار کو اس سرد بازاری میں ہونا چاہیئے۔ اپنی مالی مشکلات پر نہایت ہوشیاری سے قابو پاتا ہے۔ دراصل پاشا کو آج صبح اکرام کو پھانسی چڑھتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہئے تھا۔ بات یہ ہے کہ پاشا ہی صرف موقع کا گواہ تھا اور سب سے بڑی ہی شہادت تھی جس کی بنا پر جج نے اکرام کو پھانسی کی سزا دی۔ بدقسمتی سے پاشا کو ایک وہم سا ہو گیا تھا کہ اکرام کو پھانسی ملتے ہوئے ضرور دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

مسافر۔ (ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے) اور اکرام ــــ اور سرخ مفلر!

فیروز دین۔ ہاں ــــ

امجد بیگ۔ (بات کو کاٹتے ہوئے) موسم سرما میں اکرام ہمیشہ سرخ مفلر باندھا کرتا تھا۔ اس کا یہ مفلر مشہور تھا۔ بلکہ ایسا اوقات تو وہ اسی مفلر کے نام ہی سے پکارا جاتا تھا۔ کیونکہ اس بستی میں اور کوئی آدمی ایسا مفلر نہیں باندھتا تھا۔ ایک رات اس نے ایک

کسان کو جو شہر میں روئی بیچ کر آ رہا تھا، اسی سڑک پر مار ڈالا اور غریب چار سو روپیہ جو اس نے ایک تھیلی میں باندھا ہوا تھا لے کر چمپت ہو گیا۔ ظالم نے ہتھوڑے سے اس کا دماغ پاش پاش کر دیا تھا۔ (ایک ہلکی سی آہ بھرتا ہے)

فیروزدین۔ اور وہ ہتھوڑا اکرام کے گھر میں پایا گیا۔ اس پر خون لگا ہوا تھا۔ بلکہ دو ایک سر کے بال بھی خون کے ساتھ اس پر چپکے ہوئے تھے۔ لیکن تعجب تو اس بات پر ہے کہ آج تک اس روپوں والی تھیلی کا سراغ نہیں ملا۔ خبر نہیں اس نے کہاں چھپا رکھی ہے نیز یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ اس وقت اکرام کو روپے کی اشد ضرورت تھی۔ کیونکہ اس کی لڑکی کی شادی انہی دنوں میں ہونے والی تھی۔ ہاں عدالت میں اس نے ان الزامات سے انکار کر دیا تھا اور بیان دیا تھا کہ جب یہ واقعہ ہوا وہ اپنے گھر میں سو رہا تھا۔

امجد بیگ۔ لیکن اس کی جان اس کے اس سرخ مفلر نے لی۔ اگرچہ اور بھی بہت سی شہادتیں اس کے خلاف تھیں۔ اس نے وہ مفلر ضرور کہیں چھپایا یا جلا دیا ہو گا۔ کیونکہ اس کے بعد ہزار تلاش کے باوجود بھی وہ نہ مل سکا۔ مگر اکرام حلفیہ بیان کرتا تھا کہ اس کا مفلر کہیں گم ہو چکا ہے۔

فیروزدین۔ لیکن مظلوم کسان کے خون میں اس مفلر کا ایک باریک دھاگا اٹکا ہوا تھا۔ آہ غریب نے اپنی جان بچانے کے لئے خدا معلوم کتنے جتن کئے ہوں گے۔ اسی لئے یہ درست ہے کہ اکرام ایک سرخ دھاگے سے پھانسی پر لٹکایا گیا۔

دولت یار۔ (آگے بڑھ کر کھانستے ہوئے) اور جناب کو یہ بھی علم ہونا چاہئے کہ سزا ہونے کے بعد بھی اکرام کا خیال بلکہ یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی غیر معمولی حادثہ ضرور رونما ہو گا۔ جس سے اس کی جان بچ جائے گی ـــــ مگر (سر ہلاتے ہوئے) وہ پھانسی پر چڑھایا گیا اور اسی طرح مر گیا جس طرح ہم سب نے مرنا ہے۔ میں اکرام کو نہیں جانتا۔ وہ کبھی میرے پاس نہیں آیا لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آج کا دن بہت تکلیف دہ تھا۔

(گھڑیاں نو بجاتا ہے)

مسافر۔ کیا شہر میں بھی مارشل لا جاری ہے؟

دولت یار۔ جی ہاں۔ اور اس علاقہ میں بھی نو بجے رات کے بعد کوئی آدمی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ لیکن یہاں قانون کی ہیبت سختی سے پابندی نہیں کی جاتی۔ (فیروزدین اور امجد بیگ کو مخاطب کرتے ہوئے) کیا آج رات یہیں قیام کرو گے۔

امجد بیگ۔ (گھبراہٹ کے عالم میں) نہیں نہیں۔ کم بخت بارش تھمتی ہی نہیں۔ (امجد بیگ اور فیروزدین کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فیروزدین پاشنا جگانا چاہتا ہے)

مسافر۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اگر آپ صاحبان چند منٹ اور یہاں تشریف رکھیں۔ شاید اس عرصے میں بارش بھی تھم جائے (دونوں مسکراتے ہیں اور کچھ توقف کے بعد بیٹھ جاتے ہیں) ہاں اور لانا برانڈی۔

دولت یار۔ بہتر جناب اور اگر آپ ایک لمحے کے لئے مجھے معاف فرمائیں تو میں نیچے دروازہ بند کر آؤں۔ میں قانون کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتا رہا چاہتا ہے)

مسافر۔ تو کیا آج رات آپ اپنے دوست کو یہیں چھوڑ جائیں گے؟

امجد بیگ۔ بہتر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بیدار نہ کیا جائے یا اور تھوڑے عرصے میں ہم دونوں اسے گھر پہنچا دیں گے۔ بیچارے کے دل پر صبح کے واقعے کا کتنا اثر ہوا ہے!

مسافر۔ (سیگرٹ سلگاتے ہوئے) اچھا تو آپ کا آپ کے دوست کے مطابق اکرام کی روح والے مسئلے کے متعلق کیا خیال ہے؟

امجد بیگ۔ ذاتی طور پر میرا بھوت پریت اور روحوں وغیرہ پر کوئی یقین نہیں

فیروزدین۔ اور نہ ہی میں ایسی باتوں کا قائل ہوں۔

امجد بیگ۔ اور میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں کہ اس بستی اور اس کے گرد و نواح میں کوئی فرد نہیں نکلے گا جس نے سرخ مفلر باندھا ہو۔

فیروزدین۔ تو پھر وہ (اچانک کوئی آواز سنتا ہے اور دوسروں کو خاموشی رکھنے کے لئے ہاتھ بلند کرتا ہے) شاید کوئی اور آ رہا ہے۔

(باہر کچھ ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ دولت یار کی آواز آتی ہے۔ "نہیں نہیں میں یہ نہیں کر سکتا۔ تو نیچے کے صدر دہاں کوئی داخل نہیں ہو سکتا")

امجد بیگ۔ اگر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گل خاں وہ دوبارہ آ گیا ہے۔

مسافر۔ گل خاں کون؟

امجد بیگ۔ پھانسی لگنے والے کا دوست اور میرا خیال ہے کہ دولت یار کے لئے اب مشکل ہو گئی ہے۔ پہلے ہی صبح سے خود کام کر رہا ہے

بے چارے کے دونوں لڑکوں سے نمونیہ میں مبتلا ہیں۔

مسافر۔ میں بھی حیران تھا کہ اس ہوٹل میں کوئی ملازم کیوں نظر نہیں آتا!

(دستک کی آواز نزدیک تر ہوتی جاتی ہے۔ گل خاں گالی گلوچ بک رہا ہے اور دولت یار کبھی خوشامد اور کبھی ملتجیانہ لہجے میں کلام کرتا ہوا سنائی دیتا ہے)

دولت یار۔ (باہر) اب ــــ اب گل خاں خدا کے لئے ہوش میں آؤ کیا تم میر الائنس ضبط کر دانا چاہتے ہو۔ توپ کے بچ چکے ہیں۔ اگر تمہیں کسی نے اندر آتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ آہ! میں نے دروازہ وقت پر کیوں بند نہ کیا۔

گل خاں۔ (باہر) مجھے گزرنے دے۔ شراب کی بوتل لا۔ ہاں میرے پاس روپیہ ہے۔ سنتے ہو ہاں ہاں جلدی لاؤ شراب۔

دولت یار۔ (باہر) ہوش میں آؤ۔ گل خاں خدا کے لئے آرام سے بات کرو۔

(اتھاپانی کی آواز آتی ہے)

اگر میں تمہیں اندر آجانے دوں تو کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ ــــــ

(گل خاں دروازے کو زور سے دھکا دیتا ہے اور اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے پیچھے مخموم سا چھولئے دولت یار کمرے کے اندر آتا ہے۔ گل خاں ایک بڑا سپاہیوں والا کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ کوٹ کے تمام بٹن ہیں اور اس سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ اس کا سر ننگا اور چہرے پر سرت کی سی سنسنی چھائی ہوئی ہے۔ نہایت استقلال کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے حسب معمول کمرے کے ایک گوشے میں کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

دولت یار۔ (دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہوئے معذرت کے طور پر) افسوس ہے میں اسے باز نہ رکھ سکا۔

مسافر۔ خدایا! کیا صورت بنائی ہے! (دولت یار کو اشارہ کرتا ہے)

گل خاں۔ (خالی کرسی کی طرف دیکھتے ہوئے اور کسی قدر زعم کے ساتھ) رم کے پیٹ میں جاؤ۔ بوتل شراب کی مجھے ردولت یار دبے پاؤں آتا ہے) دے۔ فوراً

مسافر۔ (دولت یار کے کان میں) خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ اسے ایک گھونٹ تک مت پلاؤ۔

دولت یار۔ نہیں! کبھی نہیں (آہستہ سے) کیا یہ ــــ کیا یہ مدہوشی ہے!

مسافر۔ مدہوشی! خدا معلوم کیا ہے! ــــ خیر۔ دروازہ بند کر دو اچھا ٹھہرو تیار ہو جاؤ۔

گل خاں۔ (بغیر کسی طرف توجہ کئے) زہر سب گواہوں کو۔ بوتل شراب کی بھیجے۔

(مسافر اپنی کرسی کے بازو پکڑے ہوئے کمال احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ آگے کی طرف جھکتا ہے۔ خیرزدین ہیوقوفانہ انداز میں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے۔ پاشا نیند سے بیدار ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے)

امجد بیگ۔ (سر پر ہاتھ رکھ کر کھانستے ہوئے) میرے خیال میں اسے گرم گرم چائے پلانی چاہئے۔

(مسافر خاموش رہنے کے لئے اشارہ کرتا ہے۔ کمرے میں پورا پورا سکوت ہے۔ لیکن باہر ہوا سائیں سائیں کر رہی ہے اور کبھی کبھی کھڑکی سے بھی ٹکراتی ہے)

گل خاں۔ (پہلے کی طرح) بوتل شراب کی ــــ

(یاشا گل خاں کی موجودگی کو محسوس کرتا ہے اور خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا ہے۔ بجلی چمکتی ہے اور بادل کے گرجنے کی آواز بڑے زور سے سنائی دیتی ہے۔ گل خاں کے سوا باقی سب دم بخود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ہوا کا شور رد عمہ پڑ جاتا ہے)

گل خاں۔ (پہلے کی طرح) بوتل شراب کی ــــ (معاً اسے کچھ خیال آتا ہے اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے) قیمت! کم قیمت مانگنے پر ــــ (بجلی کی سی سرعت کے ساتھ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے کوٹ کے بٹن کھولتا ہے اور اندر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ نقدی سے بھری ہوئی مٹھی باہر نکالتا ہے اور ایک لمحے کے لئے اس کا جسم تن جاتا ہے) قیمت! (ہاتھ میں پکڑی ہوئی تمام نقدی زمین پر دے مارتا ہے) قیمت۔ دولت۔ شراب (سب چپ چاپ اس کی طرف دیکھتے ہیں) ناکافی ہے! ہا! ہا! پھر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے اور گاڑھے کی ایک تھیلی نکالتا ہے) بوتل شراب کی رقیبل کو دولت یار کے قدموں میں دے مارتا ہے) لو۔

دولت یار۔ (خوف سے سکڑتے ہوئے) او خدا! مظلوم کسان کی تھیلی! کسان کا قاتل ــــ

(خیرزدین امجد بیگ کے بازو کو زور دباتے ہوئے تھیلی

کی طرف حیرت کے عالم میں اشارہ کرتا ہے۔ پاشا پتھرائی ہوئی
آنکھوں کے ساتھ اپنی جگہ پر آہستہ آہستہ کھڑا ہوتا ہے اور
کرسی کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے
اس کے ہونٹ بغیر کسی آواز کے ہلتے ہیں)

گل خاں۔ (بوتل شراب کی رہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو جاتا ہے)
(بوتل شراب کی رہ پھر ایک لمحے کے لئے خاموش ہو جاتا ہے)۔
اکرام ـــــ پھانسی ـــــ اکرام۔
(اس کا منہ آہستہ آہستہ کھلتا اور کھلا بند ہوتا ہے۔ مسافر اٹھتا
ہے۔ دولت یار کو اشارہ کرتا ہے۔ گل خاں کا منہ بند نہیں ہوتا
اور وہ مشین کی طرح رد قدم آگے بڑھتا ہے۔ مسافر اور نزدیک آ
جاتا ہے۔ گل خاں بچوں پر کھڑا ہو جاتا ہے)

مسافر۔ (دولت یار سے) جلدی۔
(گل خاں اور آگے بڑھتا ہے۔ مسافر اور دولت یار اسے پکڑ لیتے ہیں)
یہاں میری کرسی پر۔ اتار دو اس کا کوٹ (دولت یار کوٹ اتارتا ہے
اور سرخ مفلس کی گردن اور چھاتی کے گرد لپٹا ہوا نظر آتا ہے) بس
یہی آدمی تھا جس نے ـــــ

فیروز دین۔ (رفاقتانہ انداز میں) خوب! کسان کی ٹھیلی اور سرخ مفلر۔ ہاں
ہاں!

مسافر۔ خاموش (اپنا کان گل خاں کے سینے پر دل کے اوپر رکھتا ہے
اور ایک لمحے کے بعد غمگین صورت بنائے سر اٹھاتا ہے) افسوس!

پاشا۔ (آگے بڑھتا ہے۔ ایک دم سے اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے
اور دوسرا گل خاں کی طرف اٹھائے ہوئے) گل! اور ذلیل کتے
ـــــ چور! میری صندوقچی سے تمام نقدی چرا لایا (اپنے الفاظ
کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ اس پر سکتے کا عالم طاری ہو جاتا ہے)
(مسافر، امجد بیگ، فیروز دین اور دولت یار یکے بعد دیگرے
اس کی طرف دوڑتے ہیں)

پردہ گرتا ہے

(تبصرے سے قبل)

قیوم نظر

غزل

زہے قسمت گلستانِ تمنا میں بہار آئی
مری اجڑی ہوئی راتوں میں سوزِ جانفزا لائی

سنبھل اے رونے والے! آہ تیری چھپ کے راتوں کو
فلک سے بربطِ ناہید کے نغمے چرا لائی

کسی کے سرمئی گھونگھٹ میں جلوے تلملا اٹھے
کسی کے دل کے ناسوروں پہ اک بجلی سی لہرائی

پسینہ آ گیا کالی گھٹاؤں کی جبینوں پر
جو اُن شانوں پہ لی زلفوں نے متوالی سی انگڑائی

مرے افکار کی قندیل سے کونین روشن ہیں
میری تخیل سے شمس و قمر نے ہے ضیا پائی

الطاف مشہدی

رباعیات

برسات

برسات کا موسم ہے شباب فطرت
برسات سے زائل ہے نقاب فطرت
برسات نے چھیڑا ہے
آویزش ابر و باد نے چھیڑا ہے رباب فطرت
پر کیف و دلآویز رباب فطرت

بجلی

بجلی یہ نہیں ابر کے ہیں زرّیں تیر
یا ابر یہ مست کی لرزاں شمشیر
یا ابر و ہوا نے کھینچ لی ہاتھوں سے
کھینچی ہے فلک پہ یک سنہری تحریر

پپیہا

برسات کی گلریز ہواؤں میں ہے دھندلا
برسات کی گہربار گھٹاؤں میں دھندلا
سرشار و گہربار
شاید تری رنگین سپیدی ہل جائے
جگنو سے بھری ہوئی فضاؤں میں دھندلا

بگلے

زمین کی کوئی شاخ گلبار ہوئی
یا ابر سیاہ میں سے بگلوں کی قطار
یا چرخ پہ کہکشاں نمودار ہوئی

عباس بیگ مرحوم

ایک راہبہ کے محبّت نامے!

دوسرا خط!!

اپنے خطوں میں جب میں تمھیں اپنی کیفیتِ غم لکھتی ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کو تم تک پہنچانے میں اپنے جذباتِ دل کے ساتھ میں نے ایک سنگین ظلم کیا ہے۔ کاش کبھی تم بھی اپنی بے رحمی اور غفلت شعاری کو سامنے رکھ کر میری مظلومیت کا اندازہ کرتے۔ مگر میں تم سے کسی قسم کی امید نہیں رکھ سکتی اور یہ سچا اظہار کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتی کہ تمھیں مجھ سے اس قدر روکھے پن اور بے پروائی سے پیش نہیں آنا چاہئے۔ آہ، کس قدر معیوب حرکت ہے یہ تمھاری سنگ دل اور جابرانہ ذہنیت کی کہ تم میرے دل کی شکستگی پر بھی ترحم نہیں کھاتے میں تم سے بے انصافی نہیں کر رہی جو اپنی مصیبتوں کا شکوہ تم سے کرتی ہوں۔ اپنی ان مصیبتوں کا شکوہ جن کی قسمت کا حال مجھے اس وقت ہی معلوم ہو گیا تھا۔ جب تم مجھ سے جدا ہو کر چلے گئے تھے۔

یہ راز مجھ پر اب کھلا کہ میں نے خود کو فریب دیا۔ یہ سمجھ کر کہ تم مجھ سے عام لوگوں کا سا سلوک روا نہ رکھو گے۔ مجھے محبت کی بے اختیاریوں نے مجبور کر ڈالا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں نے تم کو دنیا کے اور انسانوں کی طرح نہ جانا۔ میں نے تمھارے خلوص پر اعتماد کیا اور تم سے غیر معمولی وفاداری کی امیدوار رہی مگر آہ! تمھاری جدائی کی سختیوں نے مجھے اب اس قابل نہیں رکھا کہ میں تم سے کسی قسم کے انصاف کی آرزومند رہوں۔ اگر تم یہ خیال کر کے کہ میں تمھیں چاہتی ہوں۔ مجھ سے محبت کرتے تو یقیناً اس طرح میرے دل کی تشنگی نہ ہوتی۔ میں تو ہمیشہ تم سے تمھارے دلی شوق کی بھیک مانگتی رہی ہوں مگر افسوس یہ اب تک تم مجھ پر ظاہر نہ کر سکے کیونکہ چھ ماہ کے اس قدر طویل عرصے میں تم نے مجھے ایک بھی خط نہ لکھا۔ میں اپنی تیرہ بختی کی تمام تر مایوسیوں کو اپنی محبت کے اندھے پن پر محمول کرتی ہوں اور الفت کے اس لگاؤ کا [جو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کئے ہوئے ہے]۔ ذمہ دار اپنے احمق دل کو ٹھیراتی ہوں۔ کاش اس وقت جبکہ میری اولین مسرتیں زخمی ہو رہی تھیں میں اپنی محبت کے انجام کو بھی تصور میں لے آتی!!!

کیا میں امیدوار رہوں کہ تم اپنے وطن کی موجودہ رنگین صحبتوں کو چھوڑ کر پرتگال چلے آؤ گے اور میری محبت کی بے قراریوں کو آکر مٹاؤ گے میری زخم نصیب روح کو تم سے اور کچھ نہیں چاہئے۔ صرف ہمدردی اور بس!!

ہماری الفت رفتہ کی رنگین یادیں جو غضب میرے دل پر ڈھاتی ہیں۔ آہ۔ میں وہ تمھیں کیونکر بتاؤں؟

اچھا! تو کیا میری آرزوؤں کو ٹھکرا دیا جائے گا، اور کیا اب تم اپنے نظارے سے میری پُر اشتیاق نگاہوں کو محروم رکھو گے؟ مگر آہ، میں تو فریب کھا رہی ہوں۔ کیونکہ میرے دل کو اب اس کا پورا یقین ہے کہ محبت کے جن رنگین جذبوں سے تم نے میری پرستش کی تھی وہ عارضی تھے ——— محض فانی!! اور ان خوش گوار لمحوں [جن میں ہم ایک دوسرے کی محبت میں مدہوش و مسرور رہتے تھے] کے ساتھ ہی فنا ہو گئے!!!

کاش میں تمھاری الفت میں اس قدر دیوانی نہ ہوتی۔ اور تمھاری محبت کے اتنی مہلک شدت کے ساتھ مزے نہ لیتی ——— اور اپنی ان موجودہ کرب زائیں اور طلسمی کو بھی وسیان میں رکھتی!!

میں نے احمق بن کر اپنی زندگی کی تمام راحتیں۔ اپنی روح کی ساری آسائشیں تم پر نثار کر دیں اور اپنی اس وارفتگی اور دیوانگی میں محبت کے بے رحم مستقبل کا کچھ بھی خیال نہ کیا اور اس ہنسی خوشی میں یہ بھی نہ سوچا کہ نظرت نے میرے رلانے کے لئے آنسو بھی پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں۔

مجھے اپنی محبت کی انتہائی مسرت میں اس کا احساس تھا کہ میرا تمھارا ساتھ دوامی نہیں۔ تم مجھ سے ایک نہ ایک دن ضرور چھین لئے جاؤ گے ملاقاتوں کے دوران میں تم سے اکثر کہا کرتی تھی کہ تم میری محبت کو ویران بنا کر

چھوڑو گے مگر میرے دل کے یہ سب خدشات وخطرات تمھاری محبت کی سرمستیوں میں ہی ضائع ہو کر رہ گئے یہاں تک کہ تمھارے جھوٹے اقراروں اور وعدوں کی سحر کاری نے میری سب بدگمانیاں بھلا ڈالیں اپنی زخم نصیب روح۔ آہ! اپنی الفت شکستہ کی حقیقت مجھ پر اب کھلی میرے لئے یہ کس قدر آسان تھا۔ اگر میں آغاز محبت میں ہی تمھیں رد کر بھلا ڈالنے کی سعی کرتی۔ میں اب محبت کے سب دکھ سب بلائیں خوشی خوشی جھیلوں گی مگر تمھاری محبت ترک کر دوں۔ یہ مجھ سے ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا کیا ہم دونوں کی محبت کا دار و مدار تنہا مجھی پر ہے۔ مجھ پر محبت نہ کرنے کا الزام ہرگز عائد نہیں ہو سکتا کیونکہ میں نے شروع محبت سے اب تک ایک لمحہ بھی تمھاری یاد ..... تمھاری چاہت کے بغیر نہیں گزارا!

میری نسبت تم زیادہ اس معاملے میں ملامت کے قابل ہو۔ میری طرح سے محبت کی ظلمتوں میں کھو جانا کہیں اچھا ہے۔ آن مٹ جلنے والی فانی طرب زائیوں سے جو تمھیں فرانس کی خوب صورت اور نازک اندام عورتیں مہیا کر رہی ہوں گی!!

میں تمھاری بے اعتنائی کی شاکی نہیں۔ مگر تمھیں مظلوم سمجھتی ہوں ..... صرف مظلوم!!!

اچھا میں کہتی ہوں کہ تم مجھے بھول جاؤ۔ بالکل بھول جاؤ۔ میرے دل کو پورے طور سے تسلی ہے اور یقین بھی کہ تم میرے بغیر اپنی زندگی کی تمام تر خوشیوں کو ادھورا پاؤ گے اور تم سے میں ہر حالت میں خوش و خرم رہوں گی۔ اس لئے کہ میں تمھاری محبت میں مصروف ہوں!!

چند دنوں سے مجھے کانونٹ [خانقاہ] کا محافظ بنا دیا گیا ہے جس کسی سے مجھے بات کرنے کا موقع ملتا ہے وہ مجھے دیوانی سمجھتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انھیں کیا جواب دوں۔ کانونٹ کی دوسری لڑکیاں مجھ سے زیادہ باگل اور سودائی ہیں جو یہ خیال کرتی ہیں کہ میں کچھ سمجھ سکنے کے قابل ہوں!!

فرانسسکو اور ایاگو [تمھارے دونوں خادموں] پر مجھے کتنا رشک آتا ہے۔ کاش ان کی طرح میں بھی تمھارے ساتھ رہتی۔ اور ایک وفادار خادمہ کی حیثیت سے ہی تمھاری خدمت کیا کرتی!! مجھے دنیا میں کسی شے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہے تو ایک صرف تمھاری! تم اگر مجھے مل جاؤ تو پھر دنیا میں اور رہ کیا گیا جس کی میں آرزومند ہوں؟!!

کبھی کبھی کم از کم مجھے یاد تو کر لیا کرو۔ فاکہ میں صرف اسی خیال سے کہ تم بھی مجھے یاد کیا کرتے ہو اپنے غم زدہ دل کو شاد کام کر لیا کروں۔ مگر آہ! مجھے یہ کیونکر یقین آئے کہ تم مجھے کبھی یاد بھی کرو گے!

میں نے کیوں نہ اس وقت تمھاری چاہ سے اپنی امیدوں اور ارمانوں کو محدود کر لیا۔ جب میں تمھیں ہر روز دیکھ سکتی تھی۔

یہ تم نے مجھ پر خوب واضح کر دیا ہے کہ میں صرف عجز و نیاز سے تمھارے آگے سر تسلیم خم کیا کروں اور تمھاری مرضی کو اپنی مرضی سے مقدم فرض کیا کروں۔ میری بے کسی اور مظلومیت دیکھو کہ میں نے ہمیشہ ایسے ہی کیا۔ اپنے جذبات کا نہیں، تمھارے جذبات کا احترام کیا۔ اس قدر جاننے کے بعد پھر بھی میری سادگی کی جانب نگاہ کرو کہ تمھاری۔ آہ! صرف تمھاری ہی محبت کی انتہاؤں کی آرزومند ہوں!!

تم مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ میں پھر بھی ناخوش نہیں۔ تمھاری مفارقت [چاہے کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو] میری محبت کی سرجوشیوں کو کم نہیں کر سکتی!!

میں چاہتی ہوں کہ میری محبت رسوائے عام ہو جائے۔ میں اسے راز بنا کر چھپانے کی کوشش کیوں کروں۔ جب کہ میں جانتی ہوں یہ بات میرے لئے انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ میں نے اپنی محبت کے فرائض نہایت ایمان داری سے ادا کئے ہیں۔ میں تمھیں اپنی عزت سمجھ کر نہیں بلکہ اپنا ایمان جان کر آزادانہ اور والہانہ طور پر محبت کرتی رہی ہوں۔

میں یہ سب کچھ اس لئے نہیں لکھ رہی کہ تمھارے جذبۂ رحم کو متاثر کروں۔ یا تم سے اپنی محبت کا کچھ صلہ مانگوں۔ خدا کے لئے اپنے آپ کو مجبور کر کے میرے لئے کبھی کچھ نہ کرنا۔ میں ہرگز ہرگز آرزو نہ کرونگی کہ تم مجھے اپنے دلی شوق سے نہیں بلکہ کسی اور خیال سے مرغوب ہو کر چاہو۔

تمھاری محبت کی نشانیاں [جو تم نے وعدہ کیا ہے کہ بھیجو گے] میں قبول نہ کروں گی!!

کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ میں تمھاری غلطیوں کو معاف کر کے کتنا خوش ہوتی ہوں۔ میں ایسا اس لئے کرتی ہوں کہ تم بھی شاید کبھی میری ہی طرح خوش ہو کر میری خاطر کچھ لکھنے کی تکلیف گوارا کرو۔ تمھارے قصوروں کو نظر انداز کرنے میں واقعی مجھے ایک انتہائی مسرت ایک روحی کیف میسر ہوتا ہے!!

آج صبح ایک فرانسیسی انسر کافی دیر تک [شاید میری حالت سے

متاثر ہو کر) مجھ سے تمھارے متعلق باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فرانس میں اب امن و امان ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو کیا پھر تم مجھ سے ملنے کے لئے نہ آؤ گے اور اپنے ہمراہ مجھے بھی فرانس نہ لے چلو گے ؟!

جو تمھارا جی چاہے کرو۔ میری مظلوم محبت تمھارے اس سفاکانہ رویے سے کبھی بھی بچ نہ پائی۔ تمھاری آخری ملاقات کے دن سے اب تک میں نے اپنے دل کو ایک لمحہ بھر کے لئے بھی خوش نہ پایا پھر بھی میری یہ حالت ہے کہ میں دن میں ایک بار نہیں ہزار ہزار بار تمھارے محبوب نام کو دُہراتی ہوں اور اسی طرح اپنا دل بہلاتی رہتی ہوں۔ میری ہتھیلیاں [جو جانتی ہیں کہ تم ہی نے مجھے اس قابل رحم حالت کو پہنچایا ہے] اکثر تمھارا ذکر مجھ سے چھیڑ دیا کرتی ہیں !!

میں اس کمرے کے باہر [جو ہماری اولین ملاقاتوں کی یادگار ہے] جہاں تک ممکن ہوتا ہے کم ہی جاتی ہوں۔ اور تمھاری پیاری تصویر کو [جو مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز اور مرغوب ہے] دیکھ کر ہی اپنا جی بہلاتی رہتی ہوں اور بجائے دیوانگی اسے بار بار دیکھتی رہتی ہوں !!

تمھاری تصویر کو دیکھ کر میں تھوڑے عرصے کے لئے خوش تو ہو جاتی ہوں۔ مگر آہ ! جب یہ خیال کرتی ہوں کہ اب تمھیں کبھی نہ دیکھ سکوں گی تو اس خوشی کو ایک دم بھول جاتی ہوں اور پھر محبت کے جاودانی غم میں مبتلا ہو جاتی ہوں !!

آہ کیا یہ سچ ہے کہ میں تمھیں اب کبھی نہ دیکھ سکوں گی ؟ کیا تم مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہو ؟

میں تمھیں خط لکھ رہی ہوں اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی ہیں۔ تمھاری ستم زدہ میری آقا۔ اب محبت کی تلخی کو برداشت کرنے سے معذور ہو چکی ہے۔ خط کا آخری جملہ ہے اور مجھ پر غشی کی سی حالت طاری ہے۔ الوداع ——— خدارا مجھ پر رحم فرماؤ !!!

عظیم قریشی

گاندھی جی سے بات چیت

مندرجہ ذیل مضمون کے تحت ایک مدلل اور مسکت کھلی چٹھی سپرد ادارت صاحب کی طرف سے مہاتما جی کے نام ادبی دنیا کے مدتی کے پرچے میں اشاعت پذیر ہو چکی ہے

سید صاحب نے جس وضاحت اور عالمانہ استدلال کے ساتھ مہاتما جی کو قائل کرنے کی کوشش کی ہے اس سے ہمدرد بیغل میں کوئی مخلص اور محب وطن ہندوستانی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا

سید صاحب اپنے نگرگی نامہ مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۳۷ء میں تحریر فرماتے ہیں:-

"میں نے کرگانڈھی جی اردو اچھی طرح لکھ پڑھ نہیں سکتے زیر نذکرہ مضمون ناگری میں لکھوانا پڑا جس نے سو صفحوں سے زیادہ مجلد گھیری حلاکر اردو ٹائپ اسے ۳۵ صفحوں سے زیادہ نہ بڑھا سکا۔

ناگری میں لکھی ہوئی کاپی پر اردو ٹائپ کی ۳۵ صفحے والی کاپی مکہ کے جوابی جہاز سے گاندھی جی کے پاس بھجوائی۔ یہ اس لئے کہ گاندھی کا خیر مقدمی پیغام اور دستخط کا اختفا بھی ساتھ ہی ساتھ مہاتما دیکھ لیں۔ گاندھی جی نے اس کا جو جواب دیا وہ یہ ہے کہ مکاست بعینہٖ مدرج ذیل ہے۔

مہاتما کا پہلا خط | ایمانی صاحب۔ آپ نے بہت محنت سے کام لیا خط لکھا ہے لیکن جو بات میں نے کبھی نہیں کی اس پر آپ نے اپنا لیکچر بنا لیا ہے۔ میں تو اردو زبان کی بڑی قدر کرتا ہوں اردو زبان اچھی طرح جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے جو خیالات دس برس پہلے اور دور میں ظاہر کئے تھے وہی آج بھی ہیں۔ اب آپ کیا مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ آپ کا گاندھی

سید صاحب کا جواب | مہاتما جی آپ نے پوری محنت نہیں پڑھی اسے پڑھ لیتے تو پھر آپ مجھ سے یہ نہ پوچھتے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟ اچھا آپ نے مجھ سے جو کہا اور مدد میں میں آپ کو جو کہنا پڑا کیا یہ دونوں ایک ہیں۔ پر تمام کی پوری محنت پڑھئے اور پھر جو آپ کو لکھنا ہے وہ لکھئے۔

مہاتما کا دوسرا خط | سید صاحب۔ آپ کا خط ملا میں نے آپ کی محنت پوری پڑھ لی تھی۔ میرا کہنا تو یہ تھا نہ کی جو آپ نے ان لیا۔ میں نے کہا تھا وہ میں نے کہا ہی نہیں تھا۔ آپ کو تو یہ بتانا ہے جو میں نے ایسا کہاں کہا تھا جی ہاں جو میں نے مدراس میں کہا سو میں نے یہ فیصلہ کیا ہے مانا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اخبار والوں نے کیا لکھا ہے۔ آپ کا

گاندھی

اس خط و کتابت پر ہمارا کچھ لکھنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ غالب مرحوم پچھتر برس پہلے فرما گئے ہیں۔ ؎

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

ادارہ

انقلاب

نئے سرے سے مجھے وقفِ اضطراب نہ کر
ستم کے واسطے دل میرا انتخاب نہ کر

گذر نہ جھوم کے دل کی غریب راہوں سے
نہ دیکھ مجھ کو محبت بھری نگاہوں سے

سنا نہ عشرتِ امروز کا پیام مجھے
بنا نہ دل کی تمناؤں کا غلام مجھے

نہ چھیڑ ٹوٹے ہوئے سازِ دل کے تاروں کو
جگا نہ خفتہ تمناؤں کے شراروں کو

زباں سے شعلہ نوائی کا کام لینے دے
دلِ نظر سے مجھے انتقام لینے دے

جگر کو حسن کی نظروں سے چھیدنے والو
بتوں کے عشق و محبت سے باز آ جاؤ

نہیں پسند طلسماتِ رنگ و بو مجھ کو
ہے اور ہی کسی جلوے کی جستجو مجھ کو

عبث جہان کی رنگینیاں لبھاتی ہیں
نظر کو نور بھرے شعبدے دکھاتی ہیں

سرور و کیف مرے دل کو ورغلاتے ہیں
مری نگاہ میں آ آ کے پھر سماتے ہیں

وہ اُن کا شرم سے گردن جھکا کے یہ کہنا
مرا سہاگ ہو تم میری زیست کا گہنا

وہ ان کا میرے تغافل سے مضطرب ہونا
وہ بار بار مرے ہاتھ چوم کر رونا

نیاز و عجز کا دفتر حسین نگاہوں میں
گداز دل کے ثمر ملکی ملکی آہوں میں

مگر کچھ اس طرح دیوانہ ہو گیا ہوں میں
نئے خیال کی دنیا میں کھو گیا ہوں میں

کوئی خیال مرے دل پہ چھا نہیں سکتا
کوئی بھی ہوش میں مجھ کو لا نہیں سکتا

جنوں نے چھوڑ دیا کس مقام پر لا کر
بسی ہے ایک نئی دل میں آرزو ہو کر

وہ آرزو جو کرے استوار ایماں کو
وہ آرزو جو کرے سرفراز انساں کو

نظر کی حد سے بہت دور ہے مکاں میرا
مہ و نجوم سے آگے ہے کچھ جہاں میرا

جسے خیال کی پرواز پا نہیں سکتی
نگاہ دامنِ تصویر میں لا نہیں سکتی

تڑپ کے جی اٹھا پھر جذبۂ فغاں میرا
جنوں نے کر دیا ہر حوصلہ جواں میرا

فلک کی وسعتِ بیحد عبور کرنا ہے
مہ و نجوم کی چھاتی پہ پاؤں دھرنا ہے

خیالِ منزلِ موہوم کا شرار ہوں میں
اگرچہ کچھ بھی نہیں ایک تازہ دم ہوں میں

خاور (سہسرام)

دنیائے ادب

داستان گوئی کا فن

دیہی زندگی کا ایک دلچسپ منظر

داستان گوئی کا فن ہندوستان سے آہستہ آہستہ معدوم ہوتا جاتا ہے۔ اب ہمیں وہ پرانے گویّے اور داستان گو نظر نہیں آتے جو گاؤں گاؤں پھرتے رہتے تھے اور ستار یا سارنگی پر گا گا کر پرانے قصے کہانیاں، جنگ و نبرد کی داستانیں اور شجاعت اور دلیری کے قدیم واقعات سنایا کرتے تھے۔ گاؤں کا کتھک بھی اب لاپتہ ہے۔ لیکن ابھی تک گاؤں کی زندگی میں اُس کی جگہ لینے والا کوئی عنصر پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہ خلیج اب شاید ہی بھرے۔ گاؤں کی سادہ معاشرت میں کتھک اور داستان گو ایک نہایت اہم اور مفید خدمت انجام دیتے تھے۔ یہی لوگ مقامی روایات کے محافظ و امین ہوتے تھے اور یہ روایات سینہ بسینہ منتقل ہوتی چلی آتی تھیں۔ یہ لوگ گاؤں والوں میں شجاعت و مردانگی اور قربانی اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا کرتے رہتے تھے۔ پھر اہم واقعات اور حادثات بھی انہیں کی زبانی گاؤں میں مشہور ہوتے تھے۔

داستان گو صرف مورخ اور شاعر ہی نہ ہوتا تھا۔ یہی شخص گاؤں میں ناچ رنگ اور ناٹکوں کا بھی موجد ہوتا تھا۔ سینما اور تھیٹر اس وقت ناپید تھے۔ جہاں تک گاؤں کی زندگی کا تعلق ہے یہ اب بھی ناپید ہیں۔ گاؤں کی اکثریت نے کبھی خواب میں بھی سینما یا تھیٹر نہ دیکھا ہوگا۔ نوٹنکیاں ہوتی تھیں لیکن ان کا دائرہ عمل بڑے بڑے قصبوں اور شہروں تک محدود رہتا تھا۔ گاؤں میں لے دے کر یہی کتھک اور داستان گو ہوتا تھا جو گاؤں والوں کی ادبی پیاس بجھاتا تھا اور جن چیزوں کو وہ خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ داستان گو ان کا نقشہ کھینچتا تھا اور اس سے انہیں محظوظ کرتا تھا... وہ اپنی شیریں زبانی سے بہادری، قربانی، جنگ و ہنگامہ اور آخر کار حق و صداقت کی فتح کی تصویریں خاص انداز میں کھینچتا جس سے گاؤں والے پوری طرح لطف اندوز ہوتے تھے۔

لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ داستان گو کی خدمات یہیں ختم ہو جاتی تھیں۔ وہ صرف ایک فرد نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو ایک ایسا ادارہ ہوتا تھا جس کے بغیر گاؤں کی زندگی سونی بے مزہ اور غیر دلچسپ ہو جاتی۔ وہ گاؤں کی ساری تفریحات کا محرّج اور مرکز ہوتا تھا — ایسا مرکز جو گاؤں کی معاشرت اور معاشی زندگی میں شیرازہ کا کام دیتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کے پاس کہانیاں سننے کے لئے اکٹھے ہوتے لیکن یہاں صرف کہانیاں ہی نہ سنی جاتیں، سب لوگ تبادلۂ خیالات کرتے اور گاؤں کے سارے مسائل زیر بحث آتے۔ داستان گو کی چوپال سیاسی کلب کا کام دیتی اور گاؤں کی عدالت گاہ بھی ہوتی جہاں گاؤں والے اپنے رسم و رواج اور معیار قابلیت کے مطابق عدل و انصاف کے معبد میں نذر عقیدت پیش کرتے اس چوپال یعنی سیاسی کلب کا کوئی نام نہ تھا اور نہ اس کی شہرت تھی۔ نہ کوئی یہاں اُس خوف اور احترام کے جذبے کے ساتھ آتا جو موجودہ عدالت گاہوں میں نظر آتا ہے۔ اس وقت تک جب تک کہ لوگ یہاں اپنی مرضی اور خوشی سے اکٹھے ہوتے تھے کسی کو اس کا احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ چوپال اتنی اہمیت رکھتی ہے۔ سب یہی محسوس کرتے تھے کہ یہ چوپال کتھک کی قیام گاہ ہے اور یہاں کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔

کتھک کی دُنیا

کتھک گاؤں کی زندگی سے شاذ و نادر ہی کہیں اور جاتا — اس کا ذہنی اور دماغی ماحول گاؤں کی فضا سے بنتا — اُس کی تصویریں

کسی بیرونی اثر کی آمیزش مشکل ہی سے ہوتی۔ اُس کے تخیل کی پرواز اتنی بلند نہ ہوتے پاتی کہ گاؤں والے اُس سے لطف اندوز ہی نہ ہو سکیں۔ اور گاؤں والوں کی خوشی پر اُس کی زندگی اور اُس کے ذرائع آمدنی کا انحصار رہتا تھا ـــــ وہ شجاعت اور فرزانیوں کے قصوں سے گاؤں والوں کو مسرور اور متاثر کرتا لیکن وہ ان قصوں میں کوئی ایسی بات نہ بیان کرتا جس سے گاؤں والوں کو لطف نہ آئے جو اُن کے مذاق اور عقل سے بلند ہو۔ وہ ان کہانیوں میں گاؤں کے مقامی تشبیہ و استعارات سے مدد لیتا اور ان کی آمیزش سے اپنی کہانیوں پر حقیقت اور واقعیت کا رنگ چڑھا دیتا۔

ہندوستان میں مذہب کا عام تخیل رہبانیت اور قربانیوں کا تخیل ہے لوگ خیال کرتے ہیں کہ مذہب روزانہ زندگی اور اس کے تجربات سے لاپروائی کا نام ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذہب میں یہ تمام باتیں پوشیدہ ہیں لیکن پھر بھی مذہب صرف انہیں چیزوں کا نام نہیں کیونکہ ایسی صورت میں روزانہ عبادتیں اور نیکیاں اور اطاعت گذاریاں کہاں داخل کی جائیں ـــــ زندگی کی جسمانی حرکتوں میں یہ بھی تو شامل ہیں ـــــ قدیم زمانے کا کتھک وہ غلطی کبھی نہ کرتا تھا جو ہم لوگ کرتے ہیں۔ اُس کی کہانیوں میں مذہب کا عنصر بھی پایا جاتا تھا اور وہ انہیں بھی زندگی کی حقیقتیں تصور کرتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مذہب کے تار سے بھی اپنی کہانیوں کے راگ نکالتا تھا۔ پیاری اور شجاعت کی تمام کہانیاں قدیم اعتقادی افراد اور واقعات کے گرد حلقہ کئے ہوتیں اور انہیں افراد کی زندگی سے وہ نتیجہ نکالتا اور انہیں کو وہ نمونہ بنا کر پیش کرتا۔

لوگ ہندوستان کے گاؤں والوں کی فلسفیانہ قناعت پسندی اور اطاعت گذاری پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر زندگی کا معیار پست ہو اور انسان کی مادّی ضرورتیں پوری نہ ہو سکیں تو اس میں تقدیر پرستی، حسرت اور قناعت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ فرد اور قوم دونوں کی یہی خصوصیت ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ خود فریبی اور فلسفیانہ قناعت پسندی کی بھی ایک حد ہوتی ہے، انسانی زندگی کی ضروریات بہت زیادہ نہیں ہیں اور وہ اگر حالات موافق ہوں تو آسانی سے پوری ہو سکتی ہیں لیکن اس وقت بھی جب ہندوستانی کسان کو کھانے کی کمی نہ تھی۔ وہ تقدیر کے رازہائے سربستہ پر غور کیا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے کرداروں کو اس ڈھانچہ میں ڈھالنے میں آب و ہوا کا ہاتھ بھی ہو لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہاں کے دیہاتی کا زاویۂ نگاہ فلسفیانہ ہوتا ہے اور وہ تقدیر اور اُس کے متعلقہ موضوعات پر اس قدر بے باک طریقہ پر اور اتنی دقتِ نظر کے ساتھ گفتگو کر سکتا ہے کہ اجنبیوں کو حیرت ہوتی ہے۔

ـــــ اس بے تکلفی اور رواداری اور قناعت پسندی پر یہ معلوم کرنے کے بعد اور بھی حیرت ہوتی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں تقریباً ہر دیہاتی ان پڑھ اور جاہل ہوتا ہے۔ پھر آخر کار ان کا دماغ اس قدر "متمدن" کیونکر ہے جب کہ انہیں حرف پہچاننا تک نہیں آتا۔

مذہب

یہ راز اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب ہم گاؤں کے کتھک کی خدمات اور اس کے فرائض کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اُس کا کام یہ تھا کہ گاؤں والوں کو مذہب اور اخلاق کی تعلیم دے اور اس کے قصے کہانیوں سے تعلیم کی ضرورت بہت کچھ پوری ہو جایا کرتی تھی ... آج بھی جہاں کتھک یا داستان گو موجود ہے یہ ضرورتیں تھوڑی بہت پوری ہوتی رہتی ہیں۔ آج بھی فلسفہ علم الاصنام کی شکل میں موجود ہے قصہ کہانیوں کے ذریعے اخلاق کی تعلیم نہایت آسانی سے دی جا سکتی ہے۔

داستان گو کے فن پر اس پہلو سے عجیب و غریب تبصرہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں منتہی ادب نے ترقی کی ہندوؤں میں تو کتھک کو اپنے قصوں کا مواد رامائن اور مہابھارت اور پران کے قصے کہانیوں سے نہایت آسانی اور افراط کے ساتھ مل سکتا تھا۔ لوگ یہ قصے کہانیاں سن کر خوش بھی ہوتے تھے اور اُن سے سبق بھی حاصل کرتے تھے ـــــ اس طرح ہندو مذہب کی تعلیم عوام میں عام ہوئی اور لوگ بہت کثرت کے ساتھ ہندو مذہب کے قدیم بزرگوں اور اُن کے خیالات سے واقف ہوتے گئے۔ لیکن مسلم داستان گو کو مقابلتہً یہ آسانیاں نہیں تھیں کیونکہ اسلام میں علم الاصنام نظر بظاہر معدوم ہے۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ لوگ مذہبی تعلیمات اور اخلاقی پند و نصائح سے بھی ہر وقت لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اگر مجبوروں پر بھی انسانی حقائق کا پردہ نہ ڈالا جائے اور اُن کی تلخیوں کو انسانی زندگی کی شیرینیوں سے کم نہ کیا جائے تو کوئی اُن سے محظوظ نہ ہوگا۔ ہندو مذہب کے قصوں، بھوں، اخلاقی کہانیوں میں سازشوں و غابازیوں اور فاشکاریوں کی آمیزش ہوتی ہے لیکن مسلمان داستان گو ان دشواریوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے والا نہ تھا۔ اگر اسلام میں اس قسم کے قصے کہانیاں نہیں تھے تو کیا وہ ان کو گھڑ لینے سے قاصر تھا۔؟

اکبر کا تجربہ

دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی مانند اس شعبہ میں بھی اکبر ہی نے پہل کی۔ اُسی نے سب سے پہلے اس کا ایک منتظم تجربہ کرنا چاہا ـــــ ممکن ہے کہ یہ چیز اکبر سے قبل شروع ہو چکی ہو ـــــ گمان غالب ہے کہ اس تجربے کا آغاز اس سے پہلے ہو چکا تھا لیکن شاذ و نادر ہی حقیقی موجد کو دنیا موجد تسلیم کرتی ہے۔ کیونکہ دنیا کی نظروں میں موجد وہ ہوتا ہے جو اصل موجد کی خامیوں کو دور کر دے اور اس کی خوبیوں کو اپنا لے۔ بہرحال قصہ یوں ہی مشہور ہے کہ اکبر ہی نے سب سے پہلے اپنے مشہور درباری بیربل کو مہابھارت کو اسلامی رنگ میں لکھنے کا حکم دیا ـــــ کچھ دنوں کے بعد بیربل نے بادشاہ سے عرض کیا کہ جہاں پناہ میں نے اسلامی مہابھارت کا خاکہ تیار کر لیا ہے۔ البتہ ایک بات حضور سے دریافت کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مہابھارت میں دروپدی کے پانچ شوہر تھے۔ اب آپ فرمائیں کہ اسلامی مہابھارت میں دروپدی کے لئے میں کتنے شوہر متعین کروں۔"

ممکن ہے کہ قصہ بالکل فرضی ہو۔ لیکن اس فرضی قصہ کی تہ میں بھی چند حقیقتوں کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ یقینی ہے کہ مسلمانوں نے بھی داستان گوئی کی ضرورت محسوس کی ہوگی۔ یہ ضرورت کس طرح پوری ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے طلسم ہوشربا اور طلسم نورافشاں، قصہ چہار درویش وغیرہ جیسی کتابیں دیکھی ہوں۔ یہاں ایک ایک جلد مہابھارت کو مات کرنے والی تھی اور آج تک ان کتابوں کے قصے گاؤں میں بکثرت سنائے جاتے ہیں۔

ان کہانیوں کا نہ یہی ڈھانچہ ہر جگہ ایک ہے لیکن ان ڈھانچوں پر جو گوشت پوست چڑھایا گیا ہے اُس کی شکل ہر صوبے میں مختلف ہے۔ بنگالی کا رام تلسی داس کے پیش کردہ رام سے مختلف ہوتا ہے۔ بنگال کے کرشن جی متھرا کے کرشن سے مختلف ہیں لیکن یہ فرق مدارج کا ہے نوعیت کا نہیں ـــــ مسلمانوں کی طلسمات کی کتابوں میں بھی فرق ہوگیا ہے۔ طلسم ہوشربا کے امیر حمزہ بنگالی زبان کے امیر حمزہ سے مختلف ہوتے ہیں۔

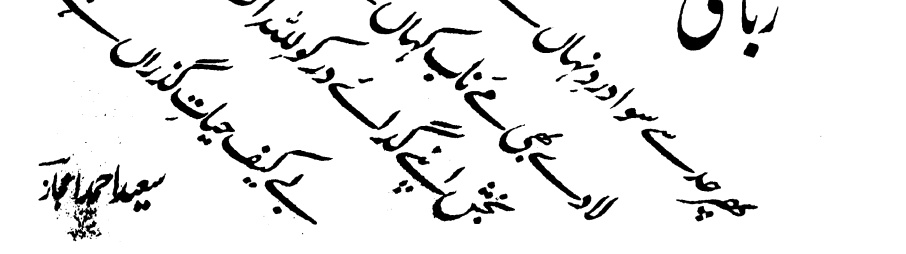
لیکن صوبوں کا ادبی ادب اپنی مشابہت میں اتنا دلچسپ نہیں جتنا اپنے اختلافات میں ہوتا ہے ـــــ کیونکہ ان اختلافات سے صوبے کی سماجی تاریخ اور وہاں کے رسم و رواج معلوم ہوتے ہیں جو خاص فضا اور حالات میں پیدا ہوئے ـــــ بنگال کی دیہی کہانیوں اور گانوں میں سفر کا ذکر اکثر آتا ہے وہاں کا ہیرو بادشاہ نہیں بلکہ سوداگر ہوتا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں عموماً اس قسم کی کہانیوں کا مرکز کوئی شہزادہ ہوتا ہے۔

لیکن اب یہ تمام باتیں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ روزانہ کے واقعات نہیں۔ البتہ کہیں کہیں اب بھی کسی داستان گو کی صورت نظر آجاتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح کسی مٹتی ہوئی قوم یا نسل کی ماں کی قدیم خصوصیتیں اب پھر واپس آنے والی نہیں۔ اب تفریح کے نئے سامان پیدا ہو رہے ہیں اور نئی نئی ایجادیں انہیں دعوت مبارزت دے رہی ہیں لیکن وہ خلیج جو داستان گو کے فنا ہو جانے سے پیدا ہو گئی ہے اب تک نہیں بھری ـــــ اس کے ساتھ گاؤں کی چند مسرتیں بھی جاتی رہیں۔

"پیام"

رباعی

سعید احمد اعجاز



سچائی

دریا کے کنارے پر گھنے درختوں کے وسط میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔

جوگی لڑکا مویشی گھر واپس لے آیا تھا،
اور دہکتی ہوئی آگ کے قریب بیٹھا ہوا،
اپنے آقا گوتم کی نصیحت آمیز گفتگو سن رہا تھا۔

اتنے میں ایک اجنبی لڑکا حاضر ہوا، اس نے پھل اور پھول پیش کئے، مہاتما کے قدم چومے اور سریلی آواز میں کہنے لگا۔

"مہاراج میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں! مجھے سچائی کا راستہ بتائیے۔ میرا نام ستیا کاما ہے"!

تجھ پر برکتیں نازل ہوں، میرے بچے تو کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے! صرف برہمن ہی اس بارِ عقل کو حاصل کر سکتے ہیں"!

"مہاراج یہ تو میں نہیں جانتا کہ میں کس خاندان سے ہوں۔ لیکن میں اپنی ماں سے پوچھ کر بتاؤں گا"!

یہ کہہ کر ستیا کاما مہاتما سے رخصت ہوا اور چشمے کے کنارے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا اپنی جھونپڑی میں واپس آیا۔ یہ جھونپڑی ریگستانی ویرانے کے اختتام اور خوابِ آلود گاؤں کے کنارے واقع تھی۔ جھونپڑی میں مدھم چراغ روشن تھا اور ماں اندھیرے میں دروازے پر کھڑی اپنے بیٹے کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

ماں نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا، اُس کے بال چومے اور مہاتما کے پاس جو پیغام لے گیا تھا اس کی بابت دریافت کیا۔

"پیاری ماں میرے ابا کا کیا نام ہے"؟

مہاتما جی نے مجھ سے کہا کہ راہِ حق صرف برہمن ہی حاصل کر سکتے ہیں"

عورت کی نگاہیں جھک گئیں اور لڑکے کے کان میں چپکے سے بولی۔

جب میں جوان تھی تو بہت غریب تھی۔ پیٹ پالنے کے لئے میں نے بہت جگہ نوکری کی، میرے پیارے تو اپنی ماں کی گود میں اس وقت آیا جبکہ اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی"۔

صبح کے آفتاب کی اولین شعاعیں جنگلی درختوں کی پھنگیوں پر ناچ رہی تھیں، قدیم درخت کے نیچے طلبہ مہاتما کے سامنے باادب بیٹھے تھے۔ اُن کے الجھے ہوئے بال صبح غسل کرنے کی وجہ سے ابھی تک بھیگے ہوئے تھے۔

ستیا کاما آیا، اور مہاتما کی قدم بوسی کے بعد خاموش کھڑا ہو گیا۔

تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو، مجھے بتاؤ"۔

مہاراج مجھے یہ نہیں معلوم، لیکن میرے پوچھنے پر میری ماں نے مجھ سے کہا "میں نے کئی جگہ نوکری کی تھی، اور تو اپنی ماں کی گود میں اس وقت آیا جبکہ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی"۔

قدیم درخت کے نیچے ستائی ہوئی شہد کی مکھیوں کے غصے کی طرح بھنبھناہٹ گونجنے لگی، اور طلبہ اس غیر مہذب کی بے شرم گستاخی پر بڑبڑانے لگے۔

مہاتما جو اپنی جگہ سے اُٹھے، انہوں نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور لڑکے کو اپنے سینے سے لگا کر کہا۔

"میرے بچے تو تمام برہمنوں سے افضل ہے۔ کیونکہ تو سچائی کا اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔

(ریگور)

(ساقی)

سعد منیر

شعر

ابتدا وہ تھی کہ تھا جینا محبت میں محال
انتہا یہ ہے کہ اب مرنا بھی مشکل ہو گیا

جگر مراد آبادی

ایک اندھی لڑکی کی دُعا

تو نے تاروں کو ضیا بخشی ہے سورج کو جمال
بارشِ انوار سے دنیا کی کھیتی ہے نہال
نور پاشی میں قمر ہے آپ ہی اپنی مثال
مجھ کو ان چیزوں کی کچھ خواہش نہیں اے ذوالجلال
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

لوگ کہتے ہیں کہ رنگوں کی کئی اقسام ہیں
سرخ ہیں کالے ہیں پیلے اور نیلی فام ہیں
اور ان رنگوں سے وابستہ بہت سے کام ہیں
مجھ کو کیا؟ یہ آنکھ والوں کے لئے انعام ہیں
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

سنتی آئی ہوں کہ کھلتے ہیں چمن میں لالہ زار
روئے گل پر رنگ برساتی ہے سلون کی پھوہار
تازگی سی روح میں بھرتا ہے کلیوں کا نکھار
میں نہیں کہتی کہ یہ سب دیکھ لوں پروردگار
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

میری آنکھوں کو بصارت کی ہوس اصلا نہیں
بے بصر ہوں میں مگر اس کی مجھے پروا نہیں
تو نے سمجھا ہے میں عاجز ہوں مگر ایسا نہیں
مجھ کو ہرگز آرزوئے دیدۂ بینا نہیں
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

غلام رسول نازکی کشمیر

"کلیم"

نقد و نظر

رہنمائے تعلیم کا تعلیم جدید نمبر

ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ "رہنمائے تعلیم" نے اپنی عادت مستمرہ کے مطابق اس دفعہ بھی ایک عظیم الشان خاص نمبر شائع کیا ہے جو ۳۲۰ کے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

کسی قوم کی بہبودی اور سرفرازی کا تمام تر انحصار اس قوم کے نونہالوں کی صحیح اور قرار واقعی تعلیم پر منحصر ہے۔ رہنمائے سابقہ کے تعلیمی طریقے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق ہوں تو ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان سے موجودہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کا مقابلہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

اقوام عالم معراج کمال کی اُن بلندیوں تک جا پہنچی ہیں کہ ہندوستان ابھی اس کا تصور بھی صحیح طور پر نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے ہر عمل کو سائنٹفک اصول قوانین کے مطابق کرتے ہیں لیکن ہندوستانی ابھی تک اسی پرانی لکیر کی مسخ شدہ صورت کو پیٹ رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے اس کے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ درخت کی نشوونما کے لئے اس کی جڑوں میں پانی دینا کسی خشک اور بے برگ و بار درخت کی تر و تازہ شاخوں کو آب حیات سے دھو کر بھی وہ نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے۔

آئندہ نسلیں ماسٹر جگت سنگھ جی کو ان محسنین میں شمار کریں گی۔ جنہوں نے قوم کو فلاح کا سیدھا راستہ بتایا اور اپنی رہنمائی کا پورا حق ادا کیا۔

جہاں تک ہم نے اس خاص نمبر کا مطالعہ کیا ہے اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ ماسٹر صاحب موصوف نے جدید طریقۂ تعلیم پر بہترین مواد فراہم کیا ہے۔ ہم اپنے ان قارئین سے جو تعلیمی معاملات میں تھوڑی بہت بھی دلچسپی رکھتے ہیں اس نمبر کے مطالعے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے

مینیجر رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور سے طلب فرمائیے۔

ادارہ



چند قابل ذکر ہندوستانی مصنوعات

لکھنؤ میں راج زینت ورکس کے نام سے ٹائلٹ کی اشیاء کی تیاری کے لئے ایک کارخانہ کھولا گیا ہے جس نے ان اشیاء کی بہتری اور صفائی کی بنا پر تھوڑے ہی عرصہ میں بہت کافی نام پیدا کر لیا ہے اور یوپی کی بڑی نمائش میں نمونہ دستفکیٹ بھی حاصل کیا ہے۔ کارخانہ ہذا کی تیار کردہ "لوکھ طیبیت" اسلے درجہ کی خوشبودار، بھرشن زائقہ اور دافع پائوریا ہونے کے علاوہ جملہ امراض دہنداں سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔

ران سفوہ ہیر کے داغ دھبے اور جھائیاں دور کرتی ہے۔ ملائم اور چکیلا بنا کر صحیح معنوں میں عورت کے حسن کو دوبالا کرنے کا یہ جاذبیگانہ ہی کارخانہ ہذا کی اشرفی کو دیکھ کر ملک کے بڑے بڑے اخبار نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیڈ راآباد رقمطراز ہے۔ اس کارخانے کی تیار کردہ کولڈ کریم ٹوتھ پاؤڈر اور پلز کے نمونوں کو دیکھنے سے نہایت تسلی بخش پایا۔ مشراج بی شرما کی محنت اور مستقل قابلیت اس پائے پر ٹھہرا ہے کہ نہایت قلیل عرصہ میں ٹائلٹ کی اشیاء تیار کرنے والوں میں راج زینت ورکس لکھنؤ نے اپنا نام پیدا کر لیا ہے۔ ٹوتھ پاؤڈر سفوہیر کریم اور دیگر اشیاء بہت اچھی طرح مقابلہ کر سکتی ہیں مشری والی صنعتی مسابق وزیر یوپی گورنمنٹ فرماتے ہیں کہ ہمیں امید واثق ہیں کہ یہ اشیاء ہندوستان گھر گھر میں اپنا گھر بنا لینگی صوبہ پنجاب کے ٹکا رخانہ ہذا کا براچ آفس امرت دھارا بلڈنگ لاہور میں بھی کھول دیا گیا ہے۔

منیجر ادبی دنیا۔ لاہور

لانبے لانبے گھنگریاں تے وچ سونے دی تار

امرت دھارا امرتم

کرنڈ مارپیہ کی سرسوں کے برابر کالے سیاہ کرا کرا کچی ہیں ۱۰ر شعاد امرتم ان کو زیرہ کر کے پوٹاش میورٹ آف سوڈا ملا کر بنایا گیا ہے۔ ہر قسم کی سوزش دل، ہیضہ، خارش جسمانی، پیٹ کچھ، دردِ گردہ، دردِ مثانہ کی بیماری ہو کسی بھی استعمال ہو کسی بھی ہماڈ کر کڑوا ہی رہیں کی ہی تو کر کے دوا ہے کے بھوٹ بنیں فوراً مجھے ہیں۔ دردِ سر جب بھی چیز بنتا ہے تو کچھ ہی تکلیف ہوتی ہے تکلیف ہو آپ کس کو بھی استعمال کر کریں۔ جو اس کو آزما کر دیکھ چکا ہے ہمیشہ ضرورت پڑنے پر اسی کو استعمال کرتا رہا ہے۔ قیمت فی ڈبیہ ایک روپیہ (عدد)

امرت دھارا انوکھر

بازاری مٹھائی کھانے کے نقصان دہ ہونے سے امرت دھارا کی معمولی مٹھائی کو بچے مٹھائی کی طرح کھاتے ہیں اور امرت دھارا کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

دعوتوں کے موقع پر اچھا ہضم ہے۔ مانگ مزاج عورتیں یا مردان ہی کو مزے سے کھا کر امرت دھارا کا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ ہاضمہ کو معدہ گلے کے امراض کو نافع منیت صرف ۴ رنی ڈبیہ

امرت دھارا صابن

بازار میں وطرح کے صابن ملتے ہیں ایک عام سے کے واسطے۔ دوسرے صحت یا جلد کی امراض کو دور کرنے والے۔ دونوں کے خصوصیات دھارا میں ہے۔ ٹوں انگلشٹ طبی ماؤں در جہ کا اور خوشبو کی دھارا اور سل ہائے میں آں در جہ ہے جلدی امراض دور ہوں خارش پیپ کی دنیرہ کو سفید ہوا اور جاری کی صحت ہے بچانے والا اور ایسے صابنوں کی طرح بدبودار نہیں بلکہ خوشبودار ہے کہ امرت دھارا شامل ہے۔ قیمت ٹھہرائی گئی

۵ رنی ٹکیہ

امرت دھارا

آزمائش کا زمانہ گزر چکا کوئی گھر والا انسان اب ایسا نہیں جو یہ نہ مانتا ہو کہ امرت دھارا کا ہر وقت ہر گھر ملک ہر جیب میں ہنا ضرورتی ہے ایک شیشی بدات خود ایک چھوٹا سا ہسپتال ہے۔ تمام درد ہا مادر دنی زیر دنی، تمام زہروں کے اثرات اور ہیضہ انفلوانزہ جیسی زہریلی امراض تقریباً تمام جانی امراض پر معجزہ نما اثر رکھتی ہے جس نے ایک بار آزمایا ہمیشہ کے واسطے یار بنایا اور بہت سے خرچ تکلیف اور تشدد سے اپنے آپ کو بچایا۔

باقی چھوٹی اکسیروں میں امرت دھارا شامل ہے اور سب امرت دھارا لاہور سے مل سکتی ہیں قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (۲/۸) نصف شیشی سوا روپیہ نمونہ ۸ ر

امرت دھارا امچھر تیل

جو بھی خوشبو مکھی مچھروں کے واسطے نہایت مضر بخش اثر جو زبردست دی جو زہر جو زہریلے جانے والے کیسی مچھر ہمیشہ ہونگے واسطے بدبو دار ہے۔ امرت دھارا کے ساتھ اور خوشبو اور خاص تیل لوکر ایک امرت دھارا مچھر تیل بنایا گیا ہے جسم کے ننگے حصوں پر تھوڑا سا اس تیل کو ملنے سے مچھر نہیں کاٹیں گے اور مچھر نہ ماریں گے

قیمت

فی شیشی آٹھ آنے (۸/)

امرت دھارا الوشن

لاکھوں روپے کے خرچ کے بعد ہم نے ایک ایسا مالک تیار کیا ہے جو دنیا کے تمام ملکوں سے بہتر ہے۔ ہندوستان میں تو ہے ہی مغرب کے ولایتی ملکوں سے بھی بہتر ہے۔ ایک چیز موجود ہے۔ ناک جلن کے امراض کو دور کرنے۔ زکام نزلہ کو ہٹانے کے واسطے بہترین لوشن ہے۔ اعلیٰ لوشنوں کی طرح اور سب کام بھی دے گا۔

قیمت

فی شیشی ایک روپیہ

المشتہر سینیٹر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بلڈنگ۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ٹاک خانہ۔ لاہور

"کہاں جائیں؟"

عزیزم! تمہارا سوال کہ "کہاں جائیں"۔ ایک یاس انگیز ذہنی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ سچ کہتا ہوں۔ مبالغہ نہیں جس دل سے یہ سوال نکلے۔ اس کی جذباتی ویرانی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی۔ یہیں پڑھ لکھ کر جوان ہوئے۔ اب کہتے ہو کہاں جائیں؟ کیا تمہارے لئے اس جنت نشان ملک میں کوئی دلچسپی کا مقام نہیں۔ میں نے تو کہا تھا دلی چلے آؤ۔ یہاں سات سلطنتوں کی یادگاریں ہیں۔ قدیم زمانے سے دلی ستیاحوں کے لئے دل کشی کے ہزاروں سامان رکھتی ہے۔ جامع مسجد۔ لال قلعہ قطب مینار لوہے کی لاٹھ۔ نئی دہلی۔ ہمایوں کا مقبرہ۔ نظام الدین اولیاؒ۔ کس کس کا ذکر کروں۔ یہ تو ہو کر اٹھے کا نام نہیں لیتے لاہور بھی مرکزی شہر ہے۔ مدرسوں کا بڑا گھر ہے۔ اس کے علاوہ شالامار۔ جہانگیر کا مقبرہ۔ نورجہاں کا مزار۔ شاہی مسجد قلعہ کھیل۔ تماشے تم لکھو تو سہی۔ یہ کیا زندگی ہے کہ آدمی ایک ہی جگہ پڑا سڑا کرے۔ بلکہ میرا ارادہ تو پشاور جانے کا بھی ہے۔ بہت قدیم شہر ہے۔ وسط ایشیا۔ ترکستان۔ ایران۔ افغانستان وغیرہ سے روز کاروان آتے ہیں اور سوداگری کا مال لاتے ہیں۔ کیا یہ دیکھنے کی بات نہیں کہ جل، جہاز، ہوائی جہازوں کا زمانہ ہو۔ اور ایشیا کے لدو جاؤروں سے کام لے رہے ہیں تو تمھیں درۂ خیبر دیکھنے کے لئے بھی کہتا۔ مگر بھئی سردی ہے اور پھر سرحدی علاقہ ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ تاریخی درہ ایک دفعہ ضرور دیکھنا چاہئے۔ ہاں کراچی سے بھی ایک صاحب مدت کی دعوت دے رہے ہیں۔ تم اگر تیار ہو جاؤ تو ان کے شکوے کی تلافی ہو جائے۔ کراچی بمبئی کے بعد بڑی بخش بندرگاہ ہے مخصوصاً کلفٹن ساحل۔ بندر روڈ۔ جہازوں کا آنا جانا دیکھنے کی چیزیں ہیں اور پھر کشتی میں سمندر کی سیر۔ اس کے علاوہ سندھی شکارپوری تاجرانہ سرگرمیاں۔ واپسی پر حیدر آباد (سندھ) دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ شہر تعمیر اور فضا کے لحاظ سے قابل دید ہے۔ میں تمھیں ماہنجوڈارو۔ اور ٹیکسلا دیکھنے کی کیا ترغیب دوں۔ بھاری طبیعت تو ایک بے چراغ سی مسجد سے گھبرا جاتی ہے۔ اور یہ تو ہزاروں برس کے پرانے کھنڈر۔ تو شاید تمھیں پاگل ہی بنا دیں۔ البتہ ایسے ویرانوں کا ہی لطف اٹھا سکتے ہیں۔ جو پرانی تہذیب کو دیکھنے کا شوق رکھتے ہوں۔

عزیزم! یہ خیال نہ کرو کہ شمال مغربی ہند دکھانے سے میرا کوئی خاص مطلب ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی طرح کر کے چھوڑو کھینچل اتارو۔ اور واسودیو مالب کو خدا حافظ کہہ کر حرکت میں آؤ۔ اپنے لئے تو ہر سب کچھ ہیں۔ آج دکھن سب برابر ہیں۔ میں ذکر تو نہ کرتا مگر یہ اچھوتا نے اور وسط ہند کی آبادیاں قریب ہیں۔ ان کے رستے دیرانے ہی سہی مگر ان شہروں کی عالی شان عمارتیں اور لاگ قدیم ایام کی یادگاریں ہیں اور پھر کراچی تک قدیم ہندوستان کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

تم دور نہ جانا ہم آگرے سے آگے قدم نہ اٹھائیں گے۔ اکبر آباد اور اس کے آس پاس غلبۂ قبال کے بے نشان نشان باقی ہیں۔ انھیں دیکھ کر بڑے بڑے سیاح عش عش کر اٹھتے ہیں کہ ہندوستان کی کیا شان تھی اور مسلمانوں کیسے لازوال ترکہ کے وارث ہیں۔ کسی خاموش مقام سے قلعہ پر نظر ڈالئے۔ ہندوستان کی سطوت و تبدرت سے تمام فضا معمور ہوئی محسوس ہوگی۔ پاس سکندرآباد میں غلبۂ سہلال آغوش لحد میں سو رہا ہے ذرا آگے شیخ سلیم چشتی کا مزار اور اس کے آستانہ پر اکبری عقیدت دنیا کی بتی یعنی فتحپور سیکری کے خاموش محلات میں اور بلند دروازہ تو اپنے بنانے والے کے عزم کا اعتراف کر رہا ہے۔ ہاں تاج جہان اللہ ایک مرمریں گیت ہے جو لب دریا ایک ابدی کیف کا الہامی اظہار ہے۔ رانی تاج اور اس کی حسن کاری اس محبت کم گشتہ کی تحریر کی تعبیر ہے جو صبح ازل کی معصوم نکہت بیزیوں میں بیدار ہوئی جس نے آفتاب عالمتاب کی طرح دنیا کو منور کر دیا جس کی ارغوانی شام راحت و نشاط کا پیام لائی۔ اور وہ محبت جو رات میں چاند اور ستاروں سے ہم آغوش و ہم نوا ہی تاج ایک طلسم ہے نہیں اعجاز جو ہر ایک دل و دماغ کو مختلف اوقات میں مختلف انداز سے متاثر کرتا ہے اس کے حسین و جمیل گنبد کے نیچے عہد وفا کی پابند دو ہستیاں محو خواب ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ایسے مقامات کی زیارت ہو جائے تو یہ سفر فرد کس سے کم نہیں۔

ایک اور تجویز ہے۔ الہ آباد بھی کیا طبیعت کی جگہ ہے گنگا جمنا کا سنگم ایک پر لطف اتحادی سبق ہے پھر بنارس ہے جہاں بت اور بتکدے حسن و شباب اور رنگ و بو جوش عبودیت میں سرشار ہیں۔ یہاں سے گھوم جا سکتے ہیں لکھنؤ اور اس کی شان کیا کہنا سارے اودھ کی جان ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ جو ارادہ ہو۔ اطلاع دو۔

عباد اللہ

امپیریل سٹوڈیو نیوز!

از دفتر امپیریل فلم کمپنی بمبئی نمبر ۷

موٹر کار موٹر سائکل سے ٹکرا گئی | امپیریل فلم کمپنی کی سسٹنٹ پکچر پوسٹ بنگالی کاوہ دسمنی خیز سین ہے جس کو اداکاری کے ساتھ اور بہت سے حیرت انگیز اور دل ہلا دینے والے مناظر آپ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ اس پکچر کو مشہور نوجوان ڈائرکٹر مسٹر ایس۔ پی ایرانی ڈائرکٹ کر رہے اور مس حسن بانو۔ جیونت دیسے عبدل۔ سید احمد۔ غلام رسول وغیرہ اس میں بہترین اداکاری کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ اس کے مکالمے اور گانے اردو کے مشہور رجنلسٹ اور ملک کے علم الثبوت شاعر دوانشا پرداز حضرت ساحل بلگرامی تحریر کر رہے ہیں۔

سلوچنا کمیونسٹ ہوگئیں | حقیقت میں نہیں بلکہ صرف امپیریل کی فلم "سرچ لائٹ" میں جن میں خانہ پستی اور دہریت کی کشمکش کو نہایت عمدہ طریقہ پر دکھایا گیا ہے۔ اس فلم کو امپیریل کے مشہور ڈائرکٹر ماسٹر بھوی ڈائرکٹ کر رہے ہیں اور ملکہ حسن مس سلوچنا۔ ڈی ملیسو۔ یا۔ نرلو جمشید جی۔ غلام رسول رشید اور عبدل وغیرہ اپنے اپنے پارٹ ادا کرنے میں نہایت محنت سے کام لے رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ فلم پردہ پر آکر ایک انقلاب پیدا کر دے گی۔

نکمے بیٹے نے باپ کی لاج رکھ لی | امپیریل کی اس فلم کا نتیجہ جس کا نام میرے لال ہے اور جسکو امپیریل کے پچریہ کا ڈائرکٹر مسٹر گجبال نہایت تعدد سے ڈائرکٹ کر رہے ہیں بہت غزنوی بی۔ اے مس پریلا۔ مسٹر ملیسو۔ ایم خان۔ نرلو جمشید جی وغیرہ اس میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہے ہیں اس کے مکالمے اور گانے مشہور قابل مصری لکھ رہے ہیں جو ایک تجربہ کار مکالمہ نویس ہیں۔

پردہ پر بہار چمنی | آج کل سٹرگڈوانی ایک نگین فلم کی آوٹ ڈور شوٹنگ کر رہے ہیں اور جسمیں مس پدما اور مسٹر نثار کے علاوہ امپیریل کے بہترین اداکار سید احمد وغیرہ کام کر رہے ہیں امپیریل سیکرٹان کی پہلی فلم کمپنی ہے جس نے رنگین فلموں کو تیار کر کے ملک کے سامنے پیش کرنے کا انتظام کیا ہے۔ آپ اس فلم کی رنگینی دیکھ کر بہت ہی محظوظ ہوں گے اس کے مکالمے اردو کے مشہور انشا پرداز مسٹر سعادت حسن منٹو لکھ رہے ہیں۔

رتن بائی کی مزدور کی بیٹی | تیار ہو چکی ہے اور اب سٹرٹار لکھی کسی دوسری پکچر کی شوٹنگ کا بیڑہ اٹھانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ عنقریب ہی شوٹنگ شروع ہو جائے گی جس میں رتن بائی اور حافظ جی کام کریں گے۔

بجلی کے پنکھے کرایہ پر

نرخ واجبی

سروس اعلےٰ

نیز سائیکل۔ گراموفون آسان قسطوں پر بھی مل سکتے ہیں

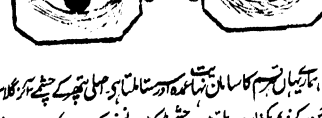
مفصل حالات پتہ ذیل سے دریافت کریں

لاہور سائیکل مارٹ

نزد

لکشمی انشورنس کمپنی میکلوڈ روڈ۔ لاہور

بینائی کی حفاظت اور چہرے کی خوبصورتی



ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت عمدہ اور مناسب داموں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ حال ہی میں ہم نے چشمے آرنگلاس اور فریمز کی نئی نئی ڈیزائن کے فریم بکمالیت ملتے ہیں۔ چشمے ڈاکٹری نسخے کے مطابق بھی نہایت حسن خوبی سے تیار کئے جاتے ہیں اور آنکھ کا معائنہ کیا جاتا ہے بیوپاریوں کے لئے خاص رعایت ہے۔

با تصویر فہرست مفت طلب کیجئے "ادبی دنیا" کا حوالہ ضرور دیں

دی ایسٹرن آپٹیکل کمپنی رجسٹرڈ

ہول سیل اینڈ ریٹیل ۲۲۳ عبدالرحمن سٹریٹ بمبئی نمبر ۳

برانچ آفس ایسٹرن آپٹیکل کمپنی ۳۰۶ بوبازار۔ کلکتہ

ڈاک کے ڈاکو ہمارے بہت سے خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچے نہیں ملتے۔ ہم بھی شکایتیں سنتے ہیں لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ روانہ نہیں ہوا۔ حالانکہ پرچہ بھیجا اور پرچہ بھیجا۔ کونہ سمجھیا پاگل ہیں اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ وغیرہ ایسا نہیں کرتا۔ اپریل انیام ماہ کی ۱۹ تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے۔ آخر تین تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو کہہ دیجئے کہ کسی ڈاک خانے کا قصور ہوا۔ بس ایک شکایتی کارڈ اپنے علاقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔ (مینجر)

فہرستِ مضامینِ ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ جون ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ — تصویر:- غمِ روزگار — نمبر ۸

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	ماتمِ منصور	صلاح الدین احمد	۵۴۸
۲	نوحۂ منصور	حفیظ ہوشیارپوری ایم اے	۵۵۲
۳	غمِ منصور	جناب جلال الدین صاحب اکبر بی اے	۵۵۳
۴	منصور نہیں	حضرتِ نیاز فتح آبادی ایم اے	۵۵۴
۵	منصور سے	جناب شہید ابنِ علی	۵۵۵
۶	منصور احمد کی آخری مجلس	ادارہ	۵۵۶
۷	آہ منصور	جناب مطلع خاں صاحب آنادی بی اے	۵۵۷
۸	درویش خیال دوست	جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی	۵۵۸
	افسانے و ڈرامے		
۹	سرِ دلبراں	عاشق حسین بٹالوی بی اے ایل ایل بی	۵۶۲
۱۰	سوز ناتمام	جناب نذیر احمد خاں صاحب مرغوب ایم اے	۵۸۵
۱۱	عورت	جناب بابر بٹالوی بی اے آنرز	۵۹۳
	علمی مضامین		
۱۲	ظہورِ قدسی	جناب سید ابوالقاسم رکن دارالترجمہ حیدرآباد	۵۹۹
۱۳	ذکی بلگرامی بحیثیتِ مرثیہ گو	جناب شاہد حسین صاحب رضوی	۶۵۴
	ادبی مضامین		
۱۴	حرفِ صحرا کے نام	"ع"	۶۰۲
۱۵	ایک راہبہ کے بحث ہے	حضرتِ عظیم قریشی	۶۰۴
	حصۂ نظم		
۱۶	گوالے	حضرتِ احسان دانش	۵۶۵
۱۷	تجلیات	جناب عبدالمسیح صاحب بال آنرز ہمایوں ایم اے ایل ایل بی	۵۷۱
۱۹	غزل	جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی	۵۸۴
۲۰	غزل	جناب پنڈت کنول نین صاحب جوہر بی اے پی سی ایس	۵۹۱
۲۱	غزل	جناب پنڈت لکشمی نرائن صاحب	۶۰۱
۲۲	سانیٹ	جناب سکندر	۶۰۳
۲۳	نقد و نظر	ادارہ	۶۰۵

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اوروی پی یا پانچ روپے ممالک غیر سے دس (۱۰) شلنگ

(گیوانی ایکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں بتہام صلاح الدین احمد پرنٹر و شائع چھپکر "دفتر ادبی دنیا" ٹمپل بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا)

ماتمِ منصور

زباغِ جوانی گلے برنہ چیدہ — سوئے خلد شتافت منصور احمد

بجاں آفریں دادجانِ عزیزش — حیاتِ ابد یافت منصور احمد ۵۶ ۱۲

(حفیظ ہوشیارپوری)

منصور احمد مرحوم کے اٹھ جانے سے اُن کے عزیزوں اور دوستوں کی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ تو یقیناً کبھی معمور نہیں ہوگا لیکن رنج و غم کا وہ اظہار بھی جو اُن کی بے وقت موت پر ملک کے گوشے گوشے میں کیا گیا ہے۔ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ طبعاً ایک نہایت خاموش طبیعت انسان تھے اور خود نمائی و خود ستائی سے سخت متنفر لیکن ان کی متمائلیں اور باوقار شخصیت اور ان کی سیرت کی نمایاں خوبیوں سے وہ اصحاب بھی جنہوں نے مدۃ العمر کبھی اُن سے بالمشافہ ملاقات نہیں کی تھی اسی طرح متاثر نظر آتے ہیں جس طرح ان سے ہر روز ملنے والے احباب۔ مدفتاً ادبی دنیا میں روزانہ کئی اصحاب بہ نفسِ نفیس اظہارِ افسوس کے لئے تشریف لاتے ہیں اور ہر ڈاک سے ہمیں تعزیت کے بے شمار خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ ہیں ان تمام حضرات کے خلوص اور ہمدردی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُنہیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے ہمدردانہ جذبات ہی ہمارے ڈھارس بندھانے کا موجب ہوئے ہیں اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ جو مقصد منصور مرحوم کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا یعنی خدمت زبان و ادب۔ ہم اُس کے حصول کے لئے اپنی بے بضاعت کوششیں سرگرمی سے جاری رکھیں گے۔

بے انصافی ہوگی اگر ملک کی ادبی انجمنوں اور مجلسوں کی قرار دادیں جو مرحوم کے ماتم میں منظور کی گئیں اور اُن کے دور افتادہ احباب اور قلمی معاونین کے پرسوز خطوط جن میں مرحوم کی سیرت کی بعض لطیف خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادبی دنیا کے ہزاروں ناظرین سے جو منصور احمد کے ماتم میں ہمارے برابر کے شریک ہیں مخفی رکھے جائیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ سلسلہ دراز ان چند ماتمی صفحات میں جو ہم نے اس غرض کے لئے محفوظ کر دئے ہیں کسی طرح سما نہیں سکتا۔ اس لئے مناسب یہی سمجھا گیا ہے کہ اس بارے میں انتخاب اور اختصار سے کام لیا جائے۔

معاصرین میں سے ہم ہمایوں۔ ساقی۔ نرجس۔ نگار۔ خاتون۔ سماج اور اکثر کے مراسلین منت ہیں کہ انہوں نے اپنے کالم مرحوم کے ماتم کے لئے وقف کر دئے اور منصور جیسے ادیب کیلئے سوگ میں ہمارے شریک ہوئے۔ علاوہ بریں وہ روزانہ اخبارات بھی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے مرحوم کے انتقال کی خبر ملک کے طول و عرض میں ان کے احباب اور مخلصین تک پہنچانے میں ہماری مدد کی۔

حضرت علامہ کیفی۔ جناب جلال الدین اکبر۔ جناب مصطفےٰ خاں آزاد حضرت علی منظور حیدرآبادی۔ جناب حفیظ ہوشیارپوری۔ جناب شہید ان علی اور حضرت ضیا فتح آبادی نے مرحوم کی یاد میں دل گداز مرثیے لکھے ہیں۔ علامہ کیفی کا مرثیہ پچھلی اشاعت میں درج ہو چکا ہے۔ باقی حضرات کا کلام اس اشاعت میں شامل ہے اور حق یہ ہے کہ مرحوم کی سیرت کی یہ تصویریں جان کے احباب نے مختلف زاویوں سے کھینچی ہیں ان میں ستائش بے جا یا مبالغہ کا نقش موہوم تک نہیں۔

آخر میں ہم جناب عاشق حسین بٹالوی بی اے ایل ایل بی اور حضرت حفیظ ہوشیارپوری ایم اے کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے میری اور مرحوم کے برادر اصغر مولوی منظور احمد صاحب کی خواہش پر مرحوم کی جانشینی یعنی ادبی دنیا کی ادارت کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ عاشق صاحب کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سرزمین ادب اُن کے قلم کی بہار آفرینی سے رشک صد گلزار ہے اور وہ اس وقت اردو کے چوٹی کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں، حضرت حفیظ ہوشیارپوری نوجوان ہونے کے باوجود بے حد پختہ مشق ہیں اور ان کی قادر الکلامی اور

رنگین بیانی نے ان کے لئے ملک کے اوّل درجہ کے شعرا کی صف میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے اور یہ ایک قابل فخر امر ہے کہ موصوف انجمن اردو پنجاب کے اسسٹنٹ سکرٹری کی حیثیت میں پہلے ہی سے خدمت اردو میں مصروف ہیں۔ منصور مرحوم تو مجمع الصفات تھے۔ وہ اگرچہ بہت کم شعر کہتے تھے لیکن شاعر گر واقع ہوئے تھے۔ ترجمے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سلیس اور پرزور اردو لکھنے میں وہ اپنی طرز کے موجد تھے۔ اور تنقید ادبی و شعری پر تو انہیں ایسی استادانہ قدرت حاصل تھی کہ بہت بڑے بڑے لوگ جن کا نام اس ضمن میں سن کر آپ حیران ہو جائیں۔ اس میدان میں اُن کا لوہا مانتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں فن ادارت کا بے نظیر سلیقہ و دیعت ہوا تھا۔ دوست دشمن سب ایک بات پر متفق ہیں کہ منصور احمد جیسا میگزین ایڈیٹر اردو صحافت نے آج تک پیدا نہیں کیا۔ یہ واقعہ ہے مبالغہ نہیں۔ ایسے شخص کی جانشینی کچھ ہنسی کھیل نہیں تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ مجھے ایسے دور رفیق کار میسر آگئے ہیں جن کی قابلیت اور خوش ذوقی اور جن کی مقبولیت خاص و عام میری ہمت بندھاتی ہے اور مجھے امید دلاتی ہے کہ ادبی دنیا منصور احمد کی بہترین اور پائیدار یادگار ثابت ہوگا۔

صلاح الدین احمد

روز و شب رویا کئے شام و سحر رویا کئے
کچھ نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رویا کئے

معزز معاصر ہمایوں اپنی تازہ اشاعت میں رقمطراز ہے۔

"کس طرح انہوں نے ہمایوں کے لئے برسوں دن رات محنت کی۔ ہمایوں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ کیسے انہوں نے ترقی کی اُن کے قلم میں کیسا زور پیدا ہوا۔ اقتباس ترجمہ نظم تنقید کیونکر ان تمام ادب کے شعبوں میں ان کی طبیعت نے اپنا زور دکھایا۔ ان سب باتوں کا ایک گہرا نقش ہمایوں کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے موجود رہے گا۔ دن رات کی ادبی محنت اور غور و فکر نے ایک صحتمند جسم کو اور کمزور بنا دیا۔ بجز راہ ہمایوں سے علیحدہ ہوئے لیکن جب تھوڑی مدت آرام کرنے سے صحت بہتر ہوئی تو ان کی حساس طبیعت کو پھر ادب نے اپنی طرف کھینچا۔ اس کے بعد انہوں نے کیا کچھ کیا۔ ادبی دنیا اور اُس کے شاندار سالنامے اس کے شاہد ہیں۔

اردو ادب کے وہ سینکڑوں خدمتگار جن کی خدمت کی بنیاد دلی شوق اور محبت کے درجے تک پہنچتی ہے جن کی اس سیاست زدہ زمانے میں کماحقہٗ قدر نہیں ہو سکتی جن پر دنیا کی نظریں کم پڑتی ہیں لیکن جن کا خلوص اور یک سوئی ان کا ایمان ہے۔ ان سیکڑوں میں منصور احمد کی محبوب شخصیت کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو ادب کی راہ میں شہید ہوئے یقین جانئے کہ وہ ادب جسے ایسے ایسے مخلص شہیدوں کا خون سیراب کرے کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔

بشیر احمد

"منصور کی طویل علالت نے اس کے جسم عنصری کو بے حد لاغر کر دیا تھا۔ مگر آج اس کے بارجود مجھے اُس کی موت مرگ ناگہاں معلوم ہوتی ہے یہ اس لئے نہیں کہ مجھے اس کے نحیف پیکر کی طاقت برداشت پر اعتماد تھا۔ بلکہ میں شاید یہ سمجھتا تھا کہ جس زبردست ارادے اور پرجوش عزم کی آگ اس شش خاکستر میں سلگ رہی ہے۔ اس کو موت نہیں آسکتی۔ میرے اس خیال کی اصلیت کچھ بھی ہو زندگی کے ساتھ منصور کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ اب بھی دنیا سے اس کی رائی علیحدگی کا یقین کرنا دشوار ہے۔ اگر عزم و جرأت اور ہمت و استقلال کی بنا پر زندگی عطا ہوتی تو منصور کو حیات جاوداں مل چکی ہوتی۔ اس کی تمام زندگی ایک طویل اور خاموش جدوجہد تھی جس سے وہ نہ کبھی تھکا اور نہ گھبرایا۔ اس جدوجہد کے جو پہلو دنیا کی نظر کے سامنے آسکے وہ خیالستان ہمایوں اور ادبی دنیا کے ساتھ منصور کے تعلقات ادارت تھے۔ اس کے ذوق عمل کی یہ کیفیت تھی کہ وہ بایوسی کے نام سے ناآشنا تھا۔ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ پژمردگی و درماندگی انسان کی زندگی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ موت نے اُسے میدان جنگ میں گرا ہوا نہ پایا

ادبی دنیا جون ۱۹۷۸ء ۔۔۔

انجمن اردو پنجاب لاہور

انجمن اردو پنجاب کی مجلس عاملہ کا سالانہ جلسہ زیر صدارت پنڈت برجموہن صاحب کیفی دتاتریہ ۱۵ مئی کی شام کو المنظر میں منعقد ہوا۔ اور مندرجہ ذیل قرارداد تعزیت جو صدر محترم کی طرف سے پیش ہوئی۔ حاضرین نے کھڑے ہو کر متفقہ طور پر منظور کی:۔

"انجمن اردو پنجاب کا یہ اجلاس مولانا منصور احمد صاحب ایڈیٹر ادبی دنیا کی بے وقت اور ناگہانی موت کو اردو ادب و صحافت کے لئے نقصان عظیم تصور کرتے ہوئے انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔"

پنجاب لٹریری لیگ لاہور

پنجاب لٹریری لیگ کا ایک غیر معمولی اجلاس ۲۵ مئی کو لیگ کے کلب ہاؤس میں منعقد ہوا میاں بشیر احمد بی اے آکسن ہیرسٹرایٹ لا صدر تھے اور پنجاب کے ممتاز ادبا اور اخبار نویسوں کے علاوہ دیگر اہل علم اصحاب بھی شریک جلسہ تھے۔ صاحب صدر کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خاں ایم اے۔ عاشق حسین صاحب بٹالوی بی اے ایل ایل بی۔ ملک عطاء اللہ کلیم ایم اے۔ سید محمد جعفری ایم اے مسٹر ایس ایم فاروقی ایم اے۔ مسٹر ایف ایم ساقی اور مسٹر اپندر ناتھ اشک نے ماتمی تقاریر کیں۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ

"مسٹر منصور احمد اگرچہ دنیا کی نظر میں ایک بے مثال ادیب تھے اور وہ انہیں اسی حیثیت سے یاد رکھے گی لیکن ان کا اصلی مرتبہ کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جنہیں قریب سے ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ درحقیقت ایک بہت بڑے انسان تھے۔ راستی۔ حق پرستی۔ خودداری اور حقیقی مروت ان کی سیرت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔"

عاشق صاحب نے تجویز پیش کی کہ مرحوم کی کوئی یادگار قائم کی جانی چاہئے۔ مسٹر اندر لال داس قمر ایم اے اور دیگر اصحاب نے اس کی پرزور تائید کی اور اسے جامۂ عمل پہنانے کے لئے ایک خاص اجلاس طلب کرنے کی تجویز پر جلسہ برخاست ہوا۔

بزم ادب ڈیرہ غازی خاں

۱۹ مئی کو بزم ادب ڈیرہ غازی خاں کا اجلاس خصوصی زیر صدارت ادیب شہیر مولانا صادق ایوبی صاحب جنرلسٹ بغرض تعزیت منعقد کیا گیا جس میں صاحب موصوف نے مولانا منصور احمد کی علمی و ادبی مرگرمیوں کا تذکرہ کیا۔

صدر ازاں سید فضل الحسن شفقت کاظمی نے یہ قرارداد پیش کی کہ بزم ادب ڈیرہ غازی خاں کا یہ اجلاس خصوصی مولانا منصور احمد صاحب کی موت پر اظہار افسوس کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

انجمن ترقی اردو کشمیر

جموں۔ ۱۲ مئی۔ انجمن ترقی اردو جموں و کشمیر کا ایک عام اجلاس انجمن ہذا کے دفتر میں زیر صدارت شیخ محمود احمد صاحب صبا منعقد ہوا۔

صاحب ناظم حسن شاہ صاحب فارقی نے حضرت منصور احمد صاحب ایڈیٹر ادبی دنیا کی بے وقت اور ناگہانی موت پر اظہار افسوس کا ریزولیوشن پیش کیا جو باتفاق رائے منظور کیا گیا اور مرحوم کے حق میں دعا کی گئی کہ خدا انہیں جنت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

بزم ادب اردو کوئٹہ

کوئٹہ ۱۴ مئی۔ بزم ادب اردو کوئٹہ کا اجلاس خصوصی منعقدہ ۱۳ مئی سنگسۂ ہندوستان کے قابل ترین دایۂ ناز ادیب جناب منصور احمد صاحب ایڈیٹر ادبی دنیا کی وفات حسرت آیات پر اپنے انتہائی رنج و الم کا اظہار کرتا ہے۔

بزم سخن پشاور

بزم سخن پشاور کا ایک اجلاس خصوصی منصور احمد صاحب مرحوم کی تعزیت کے لئے منعقد کیا گیا جس میں مرحوم کی علمی و ادبی خدمات پر پشاور کے بہتیروں ادبا نے تقریریں کیں اور بالاتفاق قرار پایا کہ بزم سخن مرحوم کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتی ہے اور اسے ادب اردو کے لئے ایک صدمۂ عظیم تصور کرتی ہے۔

دور افتادہ اصحاب کے خطوط

خان بہادر مولوی ضیاء الدین احمد ایم اے ایل ایل بی ڈسٹرکٹ و سیشن جج بہاول پور اپنے گرامی نامہ کے دوران میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آج ہمیں منصور احمد کی جملہ ادبی قابلیتوں کی یاد اتنا نہیں ستاتی جس قدر ان کی ملنسار اور محبوب شخصیت کی جدائی۔"

جناب مہرلال سونی صاحب ضیاء فتحپوری ایم اے۔ لکھتے ہیں:۔

اپنی ادبی مصروفیتوں کے سلسلہ میں بہت سے ادیبوں اور ادیبوں سے ملا ہوں مگر یہ بالکل واقعہ ہے کہ منصور احمد ایک ملنسار اور خلیق انسان کی حیثیت سے سب سے بلند اور زیادہ باوقار تھے۔ ان سے ملنے والے اپنے دلوں

ہیں اُن کے لیے محض وقت اور احترام کا جذبہ ہی محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ محبت اور وہ بھی ایک بے پایاں محبت کا ورد یا اندتا دوا پاتے تھے۔

ادب اردو کو منصور احمد سے جو توقعات تھیں۔ قدرت کی ایک نامعلوم کروٹ نے اُن سب کو ایک دم خاک و خون میں ملا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جانے والا اپنے پیچھے راستے پر نقوش چھوڑ گیا ہے جو ابد تک بعد میں آنے والوں کے لئے رہنما بن کر منزل کی طرف اشارہ کرتے رہیں گے۔

آسمان صحافت کا وہ درخشندہ ستارہ بظاہر غروب ہو چکا ہے مگر اس اندھیرے میں وہ حقیر ذرے جو اُس کے روشن ماحول میں رہتے ہوئے اس کی روشنی کا کچھ حصہ لے چکے ہیں اب اُس کا نام روشن کرنے کے لئے مستقبل قریب میں اپنی چمک سے آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دینے والے ہیں۔

علامہ محمد حسین صاحب عرشی رقمطراز ہیں:۔

یہ میں کیا سُن رہا ہوں! منصور بھی چل بسے! ہیہات! میری ان کی قلمی شناسائی آج سے سترہ سال پہلے سنہ سے تھی، جب انہوں نے خیالستان خلا آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

مجھے امید ہے کہ آپ ان کی علمی یادگار "ادبی دنیا" کو قائم رکھیں گے۔

سعید احمد صاحب اعجاز پٹنہ سے لکھتے ہیں:۔

منصور احمد صاحب کی وفات حسرت آیات سے دل کو سخت صدمہ پہنچا ہے رب کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے۔ مرحوم کی ذات بڑی خوبیوں اور اخلاق مندیوں سے متصف تھی۔ اگرچہ آپ کا میرا غائبانہ تعارف تھا، پھر بھی آپ کے خطوط میں محبت اور خلوص کی ایسی جھلک ہوتی تھی جس نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا۔ منصور صاحب کے اُٹھ جانے سے اردو ادب کو جیسا محسوس نقصان ہوا ہے، اُس کی توضیح کی حاجت نہیں، اہل نظر بھی طرح جانتے ہیں ابھی نہ جانے کیسے کیسے دُرِ خوش آب آپ کی قلم سے سلکِ تحریر میں آنے والے تھے، کہ یکایک موت نے ہاتھ روک دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جناب عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم اے ایل ایل بی وکیل سری نگر سے لکھتے ہیں

مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ایک ذہین اور طباع انسان ایک صاحب ذوق ادیب، ایک حق پسند اور حق گو نقاد اور پھر ایک مخلص اور محبت بھرا دوست، اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے، مرحوم کی علیحدگی سے ادبی دنیا پر ایک کوہ گراں ٹوٹ پڑا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ آپ ادبی دنیا کے معیار اور وقار کو برقرار رکھ سکیں۔

سید علی منظور صاحب حیدرآباد دکن سے رقمطراز ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مرحوم کی ملاقات کا شرف مجھے حاصل نہیں ہوا لیکن انھوں نے یگانۂ فن غالب کی طرح مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا تھا، میں نے ان کے سبق آموز کردار کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس کو ان ہی کے خطوط کی ایک جھلک سمجھئے۔

اُردو کی خدمت میرے مرحوم دوست جس سنجیدگی کے ساتھ کر رہے تھے اُس کی داد مجھ جیسا لاابالی شاعر کیا دے سکتا ہے، مولانا شاہد احمد صاحب بی اے آرزو دہلوی، مرحوم کو فلسفی اڈیٹر اردو ان کے رسالہ "ادبی دنیا" کو اردو کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا رسالہ کہتے ہیں۔ ایک جدید تعلیم یافتہ آزاد خیال اہل زبان ایسی فیصلہ رائے یونہی نہیں دے دیتا۔ مرحوم کی تعریف میں نے بلا مبالغہ کی ہے، وہ جیسے بے باک تھے اُس سے دنیائے ادب آگاہ ہے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے آدمی تھے اگر آپ ان کی کوئی مفید یادگار عصری ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر قائم کرنا چاہتے ہیں تو میں بھی اپنی حیثیت کے موافق آپ کی تائید کروں گا۔ انشاء اللہ

سید تسکین عابدی صاحب نے حیدرآباد دکن سے لکھا ہے۔

مجھے ہر وقت ادبی دنیا کا تازہ پرچہ دیکھنے سے جو مسرت حاصل ہوتی تھی افسوس کہ اس مرتبہ وہ مسرت رنج سے بدل گئی۔ پنڈت کیفی کا نمونہ منصور اور آپ کا نوٹ پڑھ کر جو صدمہ ہوا وہ عرض نہیں کر سکتا۔

بھائی! جب ہم کوسوں پار کے نادیدہ دوستوں کو منصور کی موت سے جو صدمہ ہوا وہ ہمارے لئے ایک صدمۂ عظیم ہے تو ظاہر ہے کہ آپ کے لئے کیا نہ ہوگا۔

جناب ناصر عسکری بی اے ایل ایل بی اسسٹنٹ سیکرٹری کشمیر کونسل لکھتے ہیں "منصور کے کسی دوست کو یہ یقین کیونکر آسکتا ہے کہ اس نے خشونت و سختی توڑ کر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدائی اختیار کی"۔

جناب سیفی نوگانوی شاہ آباد سے تحریر کرتے ہیں۔

کیونکر سمجھوں کہ وہ مخلص رفیق اس دنیا سے چلا گیا جس سے میری ادبی دلچسپیاں وابستہ تھیں، جس کی قدردانی اور جوہر شناسی سے ہمت بڑھی تھی جس نے میری سادگی کو پسند کر کے تحریر کے میدان میں ہاتھ پکڑ کے اس طرح چلایا کہ اپنی کمزوریوں کا خیال نہ رہا اور قدم بقدم اُس عاشق ادب کے ساتھ ہو لیا۔

ہیہات کون یاں سے نہ جائے گا منصور!
حیف یہ ہے کہ نوجوان گیا

ادبی دنیا کو میں مرحوم کی یادگار سمجھتا ہوں۔ اگر آپ اسے جاری رکھیں تو جو خدمت اب تک کرتا رہا ہوں کرتا رہوں گا۔

جناب مہر محمد خاں صاحب شہاب بمبئی سے لکھتے ہیں۔

کیا میں پنجاب کے اردو اخبارات کی اس اطلاع کو صحیح باور کر لوں کہ آپ کے رفیق قدیم اور فقیر کے مخلص ترین دوست اور اردو زبان کے فلسفی ادیب و نقاد مولوی منصور احمد صاحب وہاں پہنچ گئے۔ جہاں سب کو جانا ہے اور جہاں جاکر آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔

برادرم! منصور کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں لیکن منصور کی خوبیوں کے عاشقوں میں سے ایک یہ بے نوا بھی ہے۔ میں عنقریب مرحوم کی سیرت و اخلاق اور علمی و ادبی کمالات اور اپنے ان سے ذاتی تعلقات کے متعلق ایک مضمون لکھوں گا و باللہ التوفیق۔

جناب سید احمد حسین صاحب میٹرو سکول فارالکٹریشنز لدھیانہ سے تحریر فرماتے ہیں:۔

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد۔ آپ کے قوتِ بازو مولانا منصور احمد صاحب مرحوم کی بے وقت موت کا حال اخبارات میں پڑھ کر بے حد رنج و ملال ہوا۔ مرحوم نہایت شریف۔ بے حد لائق و خلیق نوجوان تھے۔ یہ موت بڑی دردناک ہے کہ جوانی میں انتقال ہوگیا۔ افسوس۔

سید یوسف بخاری صاحب دہلی سے تحریر فرماتے ہیں:۔

"زمیندار" میں مولانا منصور احمد کی وفات حسرت آیات کی خبر پڑھ کر بے انتہا صدمہ ہوا۔ خدا مرحوم کو بخشش فرمائے۔ ایک روز سب کو یہاں سے جانا ہے لیکن اُن کی اس بے وقت جدائی نے "اردو" کو ایک مخلص خادم کی خدمات سے محروم کر دیا جو آخر وقت تک اردو کی ترقی کے لئے کوشاں تھا۔ آہ! "ادبی دنیا" کا مسیحا چل بسا!!

میر زمان خاں سلطان ضلع ہزارہ سے لکھتے ہیں۔

ان کی وفات کا صدمہ میرے لئے بھی ویسا ہی جانکاہ ہے جیسا آپ صاحبان کے لئے۔ اس لئے میں غالب کی طرح آپ کو مبارکی تلقین کیسے کر سکتا ہوں۔ جبکہ اس صدمے سے خود میں متاثر ہوں۔

جناب حمید عرفانی ایم اے۔ پشین بلوچستان سے رقمطراز ہیں

منصور اپنی نظیر آپ تھا۔ جس شخص کو منصور سے ذاتی تعارف کا موقعہ ملا۔ وہ اُس کی سادگی اور خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں منصور کو پنجاب کی صحافی دنیا کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں اور بحیثیت ایک انسان کے میں نے اُس سے بہتر شخص نہیں دیکھا۔ نجانے کتنی خوشی تھی کہ اب کے وہ یہاں آئیں گے اور اس دور دراز کونے میں چند دن لطف سے گزریں گے۔ منصور ایسے انسان کا کھو جانا کوئی معمولی بات نہیں یہ ہماری زبان اور ملک کی بدنصیبی ہے۔ ہماری آنکھوں میں "ادبی دنیا" ہی منصور کی نشانی ہے اور خدا کرے اس کو ہر طرح سے کامیابی ہو۔ ذاتی طور پر میں مرحوم کا ممنونِ احسان ہوں۔ ڈرامائی شاعری کی طرف نہ صرف مرحوم نے مجھ کو توجہ دلائی بلکہ اصلاح تک بھی دی۔ اس وقت میرے سامنے وہ منظوم ڈراما ہے۔ جو مرحوم کے ایما سے میں نے پچھلی صدی کی انگریزی شاعری کے نمونے پر تحریر کیا اور ان سطور پر سرخ پنسل کے نشانات اور اشارات ہیں۔ میرے پاس تو شاید چند خطوط اور یہ ڈراما مرحوم کی ذاتی یادگار ہیں۔

جناب مرزا یاس یگانہ چنگیزی سب رجسٹرار لاتور دکن نے یہ جامع تعزیت نامہ بھیجا ہے۔

منصور احمد مرحوم و مغفور
بندہ بھی مجبور و نظرت بھی مجبور

انا للہ وانا الیہ راجعون

جناب سید عابد علی صاحب طالب ایم اے الہ آباد سے لکھتے ہیں۔

منصور مرحوم کے انتقال کی خبر سے رسمی اور دلی نہیں روحانی تکلیف ہوئی۔ اب بہترین یادگار یہی ہوگی کہ رسالے کو کامیاب سے کامیاب تر بنانے جائے۔

جناب صلاح الدین ملک صاحب پٹنہ سے تحریر فرماتے ہیں۔

آہ! آج ہم سے وہ شخص جدا ہوگیا جس سے ہم نوجوانوں کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ کتنا نیک اور کتنا شفیق۔ نور کا پتلا اور معصومیت کی تصویر بچوں کا ہمنوا اور نوجوانوں کا ہمدرد، ہم لوگوں میں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا۔ آہ!! آج صحافت کا آفتاب جس سے جہان اردو روشن تھا، ہم لوگوں کو تاریکی میں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ امید ہے کہ تمام نوجوان دہلی و زبان ہندوستانی (اردو) مرحوم کی یاد باقی رکھنے کے لئے جریدہ ادبی دنیا کو جو مرحوم کی سچی یادگار ہوگی قایم رکھنے کی کوشش فرمائیں گے۔

(باقی مضمون بر صفحہ ۶۰۷)

نوحۂ منصور

خاک اڑاتی ہے گلستاں میں صبا تیرے بعد
چاک کرتے ہیں گل و لالہ قبا تیرے بعد

کیوں "عروسِ ادب و شعر" نہ فریاد کرے
پھر کوئی چاہنے والا نہ ملا تیرے بعد

پیکرِ صدق و صفا تجھ سا نہ پیدا ہو گا
روز بدلے گا جہاں رنگ نیا تیرے بعد

کھو کے پایا ہے تجھے رازِ محبت ہم نے
ہم کو معلوم ہوئی قدرِ وفا تیرے بعد

آہ! وہ چین نہ آتا تھا جنہیں تیرے بغیر
ہو گئے قائلِ تسلیم و رضا تیرے بعد

جی رہے ہیں کہ ترا نام ہے زندہ ہم سے
ورنہ دل اپنا ہے جینے سے خفا تیرے بعد

کھل گیا ہم پہ بھرم آج وفاداری کا
کس سے باندھے کوئی پیمانِ وفا تیرے بعد

تیرے جینے کی دعائیں ہوئیں ثابت بیکار
اب نہ اُٹھے گا کبھی دستِ دعا تیرے بعد

وسعتیں ہو گئیں دل پر غمِ ہستی کی عیاں
بھید تقدیر کا لیکن نہ کھلا تیرے بعد

بن گیا نغمۂ دل نالۂ ماتم منصور!
آہ وہ لطفِ تغزل نہ رہا تیرے بعد

انتہا دیکھ چکا ہے غمِ فرقت کی حفیظ
غم نہ ہو گا کوئی اس غم سے سوا تیرے بعد

غمزدہ
حفیظ ہوشیارپوری

غمِ منصور

جان سے آہ گزر جاؤں تو کچھ دور نہیں
انجمن میں نظر آتا کہیں منصور نہیں

کون سا دل ہے کہ غم میں ترے رنجور نہیں
کون سا سینہ ہے جس میں ترا ناسور نہیں

کون سی تیری مساعی میں کہ مشکور نہیں
کون سی بزم ہے جس میں ترا مذکور نہیں

بزمِ اربابِ ادب میں ترے جلوے کے بغیر
دل بھی مسرور نہیں آنکھ میں بھی نور نہیں

ایک سے ایک ہے اربابِ ادب میں بہتر
کوئی منصور نہیں ہے کوئی منصور نہیں

جان پر کھیل کے کی خدمتِ اردو تو نے
جاں کنی شیوۂ ہر چاکر و مزدور نہیں

تیرے مٹنے سے مٹی رسم وفا صد افسوس
اب زمانے میں وفا کا کہیں دستور نہیں

حق تو یہ ہے کہ مروت میں، وفاداری میں
نظر آتا کوئی ہم پایۂ منصور نہیں

یاد ہیں چاندنی راتوں کی وہ سیریں باہم
آج ان چاندنی راتوں میں مگر نور نہیں

یاد میں تیری تڑپتا ہوں شب و روز مگر
کیا مصیبت ہے ملاقات کا مقدور نہیں

یہ تو ممکن ہے کہ مرنے سے مجھے تو مل جائے
موت سے پہلے مگر مرنے کا مقدور نہیں

اس کا مونس تھا تو ہر غم میں پہ تیرے غم میں
کوئی پرسانِ دلِ اکبرِ رنجور نہیں

جلال الدین اکبر

منصور نہیں

دور وہ ہم سے بظاہر ہے مگر دور نہیں
کون کہتا ہے کہ اب بزم میں منصور نہیں

یوں بھی جاتا ہے کوئی چھوڑ کے اپنوں کو بھلا
مشربِ عشق و وفا میں تو یہ دستور نہیں

مستیِ بادۂ عشرت میں جدائی کا الم
ہم کو منظور نہیں اس کو بھی منظور نہیں

اور اگر سچ ہے کہ وہ چھوڑ گیا ہے ہم کو
نقصِ تقدیر ہے، انسان کا مقدور نہیں

اُٹھ گیا محفلِ احباب سے منصور احمد
کوئی تسکین کی صورت دلِ رنجور نہیں

منحصر قوتِ بینائی تھی جس پر نہ رہا
شمع روشن ہے مگر بزم میں وہ نور نہیں

ذرّے ذرّے سے برستی ہے جہاں میں وحشت
جب وہ ساحر ہی نہیں پھر کوئی مسحور نہیں

یہ کرشمہ بھی ہے ادراک کی حد سے باہر
آدمی زیست پہ مجبور ہے، مجبور نہیں

چشمِ ظاہر سے اگر دور ہے منصور تو کیا
اے ضیاؔ دیدۂ باطن سے تو مستور نہیں

ضیاؔ فتح آبادی

منصور سے

کیا جنتِ کشمیر کی آئی نہ ہوا راس ؟ کیوں جنتِ فردوس کو منصور سدھارا؟
اِس عالمِ فانی سے گیا سوئے عدم تو یا دامنِ افلاک سے ٹوٹا کوئی تارا
پینا ہی پڑا ہم کو وہ زہرِ غمِ فرقت غیروں کے لئے بھی جو نہ کرتے تھے گوارا

کھول آنکھ ذرا شاعرِ نوعمر و جواں مرگ کیوں محفلِ احباب سے کرتا ہے کنارا
اُٹھ تجھ کو تری ہمتِ عالی کی قسم ہے اٹھ لے کے فلک گیر عزائم کا سہارا
اُٹھ بہرِ خدا دیکھ، رواں ہجر میں تیرے احباب کی آنکھوں سے ہے خونناب کا دھارا
کیا پاس تجھے گریۂ والد کا نہیں ہے اُٹھ کشتۂ اندوہ نہ کر اس کو خدارا
اٹھ بزمِ ادب تیرے لئے سوگ نشیں ہے اٹھ تیری خموشی نہیں یاروں کو گوارا
اٹھ عشق گراں گام کو پھر درسِ جنوں دے
اٹھ اور دلِ بے تاب کو تعلیمِ سکوں دے

شہید ابن علی

منصور احمد کی آخری جھلک

مندرجہ ذیل اشعار منصور احمد مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں سپرد قلم کئے تھے۔ ۱۰ر مئی کی شام کو وہ کوہ مری سے واپس ماڈل ٹاؤن پہنچے اور پھر کچھ دیر کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ درمیانی شب کے کسی حصہ میں خدا جانے کس جذبہ بے اختیار سے مجبور ہو کر انہوں نے یہ شعر کہے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے یہ تین شعر کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر اپنے بستر کے تکیے کے نیچے رکھ دیئے۔ ان کی وفات کے بعد یہ پرزہ مرحوم کے چھوٹے بھائی مولوی محمود احمد صاحب کو ملا۔

منصور احمد کو تمام عمر جس جذبۂ عمل نے مصروف و سرگرم رکھا حیرت ہے اُس کی تپش اُن کی رگوں میں اُس وقت بھی ارتعاش پیدا کر رہی تھی جب زندگی کی آخری رمق انہیں اور راح کہنے کو تھی۔ یہ اشعار اس رجائیت، اُس روشن خیالی اور اُس مذہبی و زندہ دلی کے آئینہ دار ہیں جو مرحوم کی سیرت کا سب سے نمایاں اور سب سے گرانمایہ پہلو تھا۔ عین اُس وقت کہ موت سر پر منڈلا رہی ہو اور ایک نحیف و نزار جسم مرض کی شدت سے گھل گھل کر خنجر گھڑی کا نہاں رہ گیا ہو مزاج کا یہ ثبات و استقلال اور طبیعت کا یہ عزم و استحکام ہمیں حیرت زدہ بنا دیتا ہے۔

ادارہ

بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھک گئے ہیں دنیا میں میرے آگے
مقابلہ کر چکا ہوں میں اس کی رستمی اور بہمنی کا
سکوں سے ناآشنا ہے دل مضطرب ہے جاں کا ہر ایک ذرّہ
عمل سے ہے زندگی مری، راز ہے عمل میری زندگی کا
مرے ہی قلبِ حزیں کی ہے شمعِ جاوداں یہ یقین جانو
جہانِ تاریک میں سراسر ظہور ہے جس کی روشنی کا

منصور احمد



غم روزگار

(عمل اویاما)

آہ منصور!

(۱)

یاروں کو رلائے گی بہت فرقتِ منصور — پیری کی نہیں موت، یہ ہے مرگِ جوانی
کل تذکرے شادی کے ہوا کرتے تھے جس کی — آج اس کی مجھے کرنی پڑی مرثیہ خوانی
کل تک جو نوا سنج تھا خود بزمِ ادب میں — آج اس کی حکایات ہیں اوروں کی زبانی
دنیائے صحافت میں جو کل سحر رقم تھا — مفقود ہے آج اس کی وہ سب سحر بیانی
اک ڈھیر ہے مٹی کا دبائے ہوئے اُس کو — کل تک جو تھا دنیا کے لئے بحرِ معانی
مشکل ہی سے منصور سے ملتے ہیں جہاں میں — بے عیب جو سیرت تھی، تو پاک اس کی جوانی

(۲)

منہ پھیرے ہوئے جاتے ہو دُنیائے دنی سے — آیا نہ پسند آہ تمہیں عالمِ فانی؟
رُوٹھے ہوئے جاتے ہو جو گھر والوں سے یوں تم — یہ کس نے سکھایا تمہیں، کیا دل میں ہے ٹھانی؟
کہہ دو گے کہ بھائی تو ہیں دونوں ہی جواں اب — ماں باپ تو بوڑھے ہیں، سنو اُن کی کہانی
احباب نے بھی تم سے جفا کوئی نہ کی تھی — پھر کیوں ہوئی اب اُن سے یہ بے وجہ گرانی
کہتا نہ تھا میں تم سے کہ صحت ہے مقدم — لیکن نہ سُنی تم نے مری اور نہ مانی
اب کس سے بتاؤ گے ہم لطف کی باتیں — اور جا کے سنائیں گے کسے اب رازِ نہانی

یاد آئیں گے اوصاف تمہارے ہمیں ہر دم
ہر چند کہ تم فانی تھے اور ہم بھی ہیں فانی

مصطفیٰ خاں آزاد

روشن خیال دوست

یہ سُن کر کہ منصور جاتا رہا — کہا دشمنوں نے مزا کیا رہا
بیاں کیا کروں میں کہ خود میرے ساتھ — سلوک اُس کا ہر وقت کیسا رہا
کبھی اُس نے ٹالی نہیں ایسی بات
نہاں فایدہ جس میں سب کا رہا — وہ آخر تک اپنوں کا شیدا رہا
عدُو سے جھجک کر لپٹتا نہ تھا — وہ خوش حوصلہ بڑھ کے گھٹتا نہ تھا
کبھی غیر سے اس نے سازش کی — ندامت سے ہرگز سمٹتا نہ تھا
ندامت ہو جس پر وہ کوشش نہ کی
سبق وقت سازی کا پڑھتا نہ تھا — کبھی اپنے مرکز سے ہٹتا نہ تھا
جو تھا مجھ سے "آئین" میں اختلاف — اسے میرے آگے بھی کہتا تھا صاف
جسے حق سمجھتا رہا اس کا دل — نہ کرتا تھا اس سے کبھی انحراف
نہ ہونے دیا میں نے اس کو خجل
کیا اس کے علم الیقیں کو معاف — کہ باتیں نہ تھیں اس کی لاف و گزاف
بہ ظاہر وہ ناکام و ارماں رہا — مگر سنئے مجھ سے تو شاداں رہا
یہ دنیا و ذلیل اس کا طالب ذلیل — وہ اپنی قناعت پہ نازاں رہا
نہیں راز عزت "متاعِ قلیل"
وہ ملت فروشوں پہ حیراں رہا — رہا تو انہیں سے پریشاں رہا
غضب اس کی تھی "خسکش" زندگی — وہ رُخ وہ شرافت کی تابندگی
نہ کی پُرسکی اس نے کس دن تلاش — ہوئی ختم کب اس کی درماندگی
تہیدست پا کر اُسے بدمعاش
اٹھاتے رہے لطفِ شرمندگی — خیالوں میں اس کے نہ تھی گندگی

طریقِ کرم اس نے دکھلا دیا — مرے دل کو بروقت گرما دیا
نہ دے جس کی فطرت زمانے کا ساتھ — زمانے نے کب ساتھ اس کا دیا
نہ پھیلایا اس نے کہیں اپنا ہاتھ
مجھے اس کی غیرت نے تڑپا دیا — سبق جو دیا عبرت افزا دیا
کہے العطش جس کا خالی سبو — سیہ مست وہ تشنہ آرزو!
مجھے یاد ہے اُس کی شانِ غیور — وہ تھا سب کی نظروں میں باآبرو
اُسے قعر پستی سے رکھتی تھی دُور
طرب آفریں شوکتِ گفتگو — نہ ہو کیوں مجھے اس کی پھر جستجو
نہ لے جو کسی سے "نہائے ضمیر" — وہ خود دار انساں بنے کیا امیر
ملاتے جو اس کی نظر سے نظر — کہاں آج وہ ذی وجاہت فقیر"
مرا نیک دل دوست المختصر
بیاقت فضیلت میں تھا بے نظیر — سپہر سجابت کا مہر منیر
نگر آہ اس کا یہ فضل و کمال — نہ ہے گا مجھے یاد باصد ملال
نہ کی میں نے کچھ قدر اس کی نہ کی — گیا اس جہاں سے وہ آشفتہ حال
تمہارا بھی ہے دوست ایسا کوئی
تو ہر آن رکھو تم اس کا خیال — نظر آئے تا عارفانہ جلال"
وگرنہ مری طرح دُکھ پاؤ گے — بہت اپنی غفلت پہ شرماؤ گے
کوئی تم کو غافل نہ کر دے کہیں — جب آجائے گا ہوش گھبراؤ گے
"گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"
نہ کھونے کی شے کھو کے پچھتاؤ گے — اسی غم میں تم خود بھی مر جاؤ گے

علی منظور حیدرآبادی

ظہورِ قدسی

عالمِ رنگ و بو کی پرکیف انگڑائیاں اکثر خمارِ نظارہ بن چکی ہیں۔ فصلِ گل ہمیشہ نکہت بدوش ہواؤں کے قافلے کے قافلے ساتھ لاتی رہی ہے۔ بزمِ دہر بارہا ایسے ساز و سامان سے آراستہ ہوئی ہے کہ نگاہیں فرشِ راہ بن کر رہ گئی ہیں۔ نگارخانۂ وجود کے بام و در بخشتِ فروغِ مسرت سے معمور نظر آئے ہیں۔ لیکن گلکدۂ دہر کی اس طرح کی نظر فروزی، فصلِ بہار کی اس طرز پر عطر بیزی، انجمنِ عالم کی اس نہج پر آراستگی، ایوانِ ہستی کی اس روش پر تابانی کبھی کسی ربیع الاول میں چشمِ روزگار نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

ماہ ولادت کے متعلق تو سب کا اتفاق ہے کہ ربیع الاول ہی میں ارضِ بطحا کے مقدر کا ستارہ چمکا۔ لیکن تاریخ ولادت کی تعیین میں اختلاف ہے یہ اختلاف بھی چھ سے سترہ تک میں منحصر ہے اس سے آگے نہیں۔

محمود پاشا فلکی ناقد علم ہیئت نے اپنے ایک رسالے میں ربیع الاول کی نویں، پیر کا دن، ۲۰ اپریل ۵۷۰ء ولادت باسعادت کی یہ تاریخ بتفصیل ریاضی اولاً سے ثابت کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ جناب ابراہیم دلگرگوشۂ رسول الثقلین، کی رحلت کے وقت سورج گہن ۱۰ ہجری کا واقعہ عام طور پر مسلم ہے۔ اس وقت شہنشاہ کونین کی عمر گرامی ترسٹھ برس کی تھی۔ ریاضی کے قاعدوں سے اس امر کی تصریح ہوتی ہے کہ ۲۸ جنوری ۶۳۲ء آٹھ بج کر تیس منٹ پر ۱۰ھ کا گہن لگا تھا۔ تمری حساب سے ترسٹھ برس پیچھے ہٹنے پر سال ولادت ۵۷۰ء اور تاریخ ولادت ۲۰ اپریل ۵۷۰ء مطابق ۹ ربیع الاول روز دوشنبہ قرار پائی ہے۔

یہ وہ نگینِ آفرینشِ معسود ہے جس تک پہنچنے کے شوق میں دستِ سپہر نے نہ معلوم کتنی مرتبہ کہکشاں کی تابناک کمندیں پھینکیں دن رات کے مسلسل قاصد بھیجے۔ مہر و ماہ کے زرافشاں اور سیم افشاں کتنے سرمہر بلفے روانہ کئے۔ سیارہ فلک قوس قزح کے نظر افروز ضعت، ستاروں کے پُر ضیا جواہر انتظار کی کشتی میں لگائے کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔

قضا و قدر نے عناصر کی کارفرمائیاں، مہر و ماہ کی ضو پاشیاں، سحاب دربار کی گہربرزیاں شمیم عطرفشاں کی نکہت انگیزیاں، خلّتِ ابراہیمی، حسنِ یوسفی، اعجازِ موسوی، انفاسِ مسیحی کا بیش بہا سرمایہ بتدریج اسی لئے فراہم کیا تھا کہ آخری قصرِ نبوت زینتِ تکمیل کے فروغ سے جگمگا اٹھے۔

آج کی صبح پر تنویر وہ سعادت آفریں صبح ہے جس کی رات نے رفعتِ کسروی، سطوتِ کیانی، صولتِ رومی، اغلالئے چینی کو خاک میں ملا دیا۔ آتش کدۂ ضلالت، آذرکدۂ جہالت، سفرِ شر، تجسیم ضرر سب ٹھنڈے ہو گئے۔ بت خانے سمار ہو کر گردِ دامنِ روزگار بنے۔ ہمکدے ویرانی سے آباد ہوئے، مجوسیت کا درفش کاویانی سرنگوں ہوا، نصرانیت کے ابعاد ثلاثہ تعرّفِ تخلیق نے اپنے آغوش میں چھپا لئے۔

چمنِ روزگار میں بُعثِ وسعادت کی روح پرور بہار آئی، زمزمۂ توحید سے دشت و در لبریز ہوئے۔ عالمِ امکاں آفتابِ ہدایت کی تجلی ریزیوں سے لبقدرِ نور رہا، نہاں خانۂ ضمیرِ اسرارِ قدس کا جلوہ خانہ بن گیا، اخلاقِ انسانی کا خس پوش چشمہ سحابِ سعادت کے فیضان سے بحرِ مواج بن کر بہہ نکلا یعنی جناب عبداللہ کا دریتیم، حضرت آمنہ کا نورِ نظر، پارہ جگر، خدیو حرم، شہریارِ عجم، خانوادۂ ہدایت کا چشم و چراغ، تنزیہ و تقدیس باری کا مہکتا ہوا باغ، دین و دنیا کا تاجدار، لنگرِ زورق روزگار، خسرو عرش نشیں، رحمۃ للعالمیں عزت افزائے خطۂ ارض ہوا۔

پہلے پہل حضرت آمنہ کے معجز نما وجود کی دھاریں پیکر رسالت کے کام و دہن کا تغذیہ نہیں، پھر ہالہ (جناب آمنہ کی بنت عم اور حضرت حمزہ کی والدۂ گرامی) ثویبہ (کنیز ابولہب) اُمِّ ایمن (کنیز جناب عبداللہ) پھر بی بی حلیمہ کی گود (ابن اسحاق کی تحقیق کے موافق) پورے چھ برس تک رسول ابطحی کا گہوارہ بنی رہی۔

خصوصیاتِ عرب اور فصاحتِ زبان کے جوہر کی حفاظت کے لئے معززینِ عرب کے شیر خواروں کا خانہ بدوش بدوؤں میں نشو و نما پانا

اس وقت کے تمدن کا ایک خاص دستور تھا۔ حلیمہ خاتون کے آغوش میں ختم المرسلین کے زمانۂ رضاعت وغیرہ بسر ہونے کی قوی وجہ یہی ہے۔

چھ برس کے سن میں والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اٹھا۔ آٹھ سال کی عمر میں جدِ محترم سے مفارقت ہوئی۔ شعور کی آنکھ کھلی تو اپنی ذات کو اپنے عم مکرم کی کنف حمایت میں پایا۔ جناب ابوطالب نے جس محبت و شفقت رافت و الفت کے ساتھ فرض پرورش ادا کیا۔ اپنے پیارے بھتیجے کو جس طرح اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا، ہر آفت میں جس طرح سینہ سپر رہے، سرد و گرم زمین کی الفت میں جو جو تکلیفیں برداشت کیں، سختیاں سہیں، مصیبتیں جھیلیں یہاں تک کہ تمام عرب کو اپنا دشمن جان بنا لیا۔ یہ ایک مستقل طولانی داستان ہے۔ مثال کے طور پر صرف شعب ابوطالب (یہاڑ کا یہ وہ درہ تھا جس پر آل ہاشم کا موروثی قبضہ چلا آتا تھا) میں بنو ہاشم کی طولانی نظربندی کا واقعہ جسے طبری اور ابن سعد نے تفصیل لکھا ہے) اجمالاً بیان کر دینا کفایت کرتا ہے۔

کفار قریش نے اسلام کے مٹانے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ہزاروں جتن کئے۔ ہر قسم کی روک ٹوک کی۔ ہر طرح کا بندوبست کیا مگر اس پر بھی جب اسلام کی ترقی روز افزوں نظر آئی تو ان کے غم و غصہ کی پھر کوئی انتہا نہ رہی۔

اسلام سے کفار کو اپنے خود ساختہ خداؤں کی تحقیر و تذلیل کے علاوہ اپنا دنیوی اقتدار بھی خاک میں ملتا دکھائی دیتا تھا۔ اس لئے ایک لمحے کے واسطے بھی وہ وجود اسلام کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ مار سیاہ کی طرح پیچ و تاب کھا کھا کر آپس میں کہتے تھے۔ ہمیشہ سے ہمارا خاندان آل ہاشم کا حلیف اور مقابل رہا ہے۔ آج تک ہم کسی بات میں بھی اس سے دب کر نہیں رہے۔ بڑی بڑی گھمسان کی لڑائیاں اگر اس نے جیتیں تو ہم نے بھی اس طرح کے بہت سے معرکے سر کئے۔ اس نے جہاں فوازیاں کیں تو ہم نے بھی اس سے بڑھ کر کیں۔ اس نے خوں بہا دئے تو ہم نے بھی دئے جس طرح اس کے ہاتوں سے سخاوت کا مینہ برسا اس سے زیادہ بارش فیض ہمارے ہاتوں سے ہوئی۔ ہر ایک بات میں اشہد اسے ہم اس کے دوش بدوش رہے اور کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ اب بنو ہاشم پیغمبری کا دعوےٰ کر کے ہمیں دبانا چاہتے ہیں تو یہ بات کبھی کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اسی جوش غضب سے بے خود ہو کر اسلام کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے سوچنے کے لئے تمام قبائل کے سرگروہ ایک جگہ جمع ہوئے۔ اس باب میں بہت سی تدبیریں سوچیں، مختلف مشورے ہوئے دیر تک رد و قدح کے بعد آخر یہ طے ہوا کہ خاندان بنو ہاشم سے فوراً بائیکاٹ کر دیا جائے اس گھرانے میں نہ اب کسی قرابت کی سلسلہ جنبانی کی جائے اور نہ کسی قسم کے لین دین کا معاملہ۔ روزمرہ کے استعمال کی چیزیں یہاں تک کہ کھانے پینے کا سامان بھی اس خاندان تک نہ پہنچنے پائے۔ اس کی گمراہشت نہایت سختی سے اس وقت تک باقی رہے جب تک بنو ہاشم اپنے نئے نبی کو ہمارے حوالے نہ کر دیں۔ جب ان باتوں پر اتفاق ہو چکا تو یہی باتیں عہدنامے کی صورت میں آگئیں۔ یہ عہدنامہ منصورین مکرمہ نے لکھا اور درکعبہ پر لٹکا دیا۔ اب گویا رجسٹری ہو گئی اور کفار قریش میں سے ہر ایک پر اس عہدنامہ کی پابندی لازمی قرار پائی۔

ہوا کا یہ بدلا ہوا رُخ جناب ابوطالب نے دیکھا اور نہایت خاموشی سے اپنے تمام کنبہ کو ساتھ لے کر شعب ابوطالب میں جا کر پناہ لی۔ یہاں گزر بسر کی یہ حالت تھی کہ اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

اس خاندان کا کوئی فرد معاہدہ مذکور کے لحاظ سے علی الاعلان کوئی چیز نہیں خرید سکتا تھا۔ اگر کبھی اتفاق سے چھپ چھپا کر کہیں سے کچھ جنس وغیرہ آ گئی تو گویا عید ہو گئی۔ نہیں تو یوں ہی فاقوں پر فاقے ہوتے تھے یا بھوک کی انتہائی تکلیف میں درختوں کے پتے آگ پر بھنے ہوئے سوکھے چمڑے کے ٹکڑے، پانی میں بھگو بھگو کر حلق سے اتار لئے جاتے۔ بھوک سے چھوٹے چھوٹے بچوں کے بلکنے کی پُر درد آوازوں سے تمام درہ گونج اٹھتا درے سے باہر سنگدل اور بے درد ان دردناک صداؤں کو سن سن کر خوش ہوتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ پھر یہ شدائد ایک دن دو دن نہیں پورے تین سال تک برابر برداشت کرنا پڑے۔ لیکن جناب ابوطالب نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے پیارے بھتیجے کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا اور زندگی بھر شمع رسالت کا پروانہ بنے رہے۔

آل ہاشم کے ان مصائب پر ان سنگ دلوں ہی میں سے بعض کے دل پسیجے۔ اگرچہ ابوجہل اس معاہدے کی خلاف ورزی کا سخت مخالف تھا اور آخر تک برابر ہاں ہاں کرتا رہا۔ لیکن جو لوگ اس وقت تک کے برتاؤ کو نارواظلم سمجھ چکے تھے انہوں نے پھر اس کی ایک نہ سنی اور متفق ہو کر اسی کے سامنے وہ عہدنامہ درکعبہ سے جھپٹ کر گھسیٹا اور پرزے پرزے کر کے وہیں زمین پر پھینک دیا۔ اس کے بعد ہی لوگ خاندان بنو ہاشم کو

اس درے سے اپنے ساتھ باہر نکالی کر لائے۔

بہر طور گھر کا پیشہ تجارت تھا۔ معاش کے سلسلے میں آپ نے بھی یہی اختیار کیا۔ اسی سلسلے میں مختلف مقامات کے سفر کرنا پڑے۔ تجارت میں معاملہ ایسا کھرا اور صاف و پاک رکھا کہ قوم "امین" کے لقب سے پکارنے لگی۔

تجارت کے کاروبار میں تاجر کی بہترین اخلاقی خوبی یہی قرار دی جا سکتی ہے کہ وہ پابند عہد اور صادق الوعد ہو۔ اگر حد اس وقت تک متقن اعظم کی پیش گاہ سے اوفوا بالعھود کا قانون محکم نافذ نہیں ہوا تھا لیکن مکہ کا تاجر نفاذ قانون سے پہلے ہی محاسن اخلاق میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں عبداللہ بن ابی الحمساء ایک صحابی کے واقعے کی یہ تصریح موجود ہے کہ نبوت سے پہلے رسالت مآب صلعم سے تجارت کے سلسلے میں ان کا لین دین کا کچھ معاملہ ہوا۔ ابھی بات طے نہ ہونے پائی تھی کہ کسی فوری ضرورت سے تصفیہ تک یہ وہاں نہ ٹھہر سکے اور تکمیل معاملہ کے لئے جلد آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ یہاں سے جانے کے بعد یہ اپنا وعدہ ایسا بھولے کہ تیسرے دن ادھر سے گزرتے وقت مکہ کے تاجر امین کو وعدہ گاہ پر موجود پا کر اپنے وعدے کا خیال آیا۔ تین دن تک زحمت انتظار برداشت کرنے پر بھی چہرۂ اقدس پر غیظ و غضب کا کوئی اثر نہ تھا۔ صرف یہ فرما کر اس واقعہ کو ختم کر دیا کہ تین دن سے میں یہیں ہوں۔ تمہارے وعدے نے اذیت دی۔

آپ کے حسن معاملہ، صدق و راست بازی کی بڑھتی ہوئی شہرت سے متاثر ہو کر مکہ معظمہ کی معزز و متمول خاتون جناب خدیجہ نے اپنے یہاں کا کاروبار تجارت بھی آپ کے سپرد کر دیا۔ کچھ دنوں بعد جناب خدیجہ کی خواہش پر سرور کائنات نے پچیس سال کی عمر میں پہلے پہل حضرت خدیجہ کو اپنا شریک زندگی بنا کر ام المومنین کا شرف مرحمت فرمایا۔

دنیاوی تعلقات، تجارت کی دیکھ بھال اسی سلسلے میں سفر وغیرہ کی مصروفیت، اولاد کی غور و پرداخت اگرچہ یہ باتیں سرشار دو عالم کو اپنا کر کے رکھنا چاہتی تھیں لیکن اس رنگ میں بھی محبوب حقیقی کی تلاش برابر جاری رہی۔ آخر یہ نوبت پہنچی کہ غار حرا (جو مکہ سے تین میل کی مسافت پر تھا) کا خلوت کدہ مطلوب حقیقی کی جستجو کا میدان بن گیا۔ یہاں تک کہ وہ بیاض نبوت کی ابتدا ہوئی اور رویائے صادقہ میں حقیقتیں بے پردہ نظر آنے لگیں۔ آگے بڑھ کر خواب کی باتیں واقعہ بنیں اور واقعہ بن کر سامنے آ گئیں۔ اس کے بعد وہ وقت آیا کہ بتدریج اپنے حبیب سے ناموس اعظم کا تخاطب شروع ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے یہ صورت اختیار کی کہ پھر تو ناز و نیاز کا تانتا بندھ گیا۔

سرا پردۂ قدس سے محض وقت کہہ کے ایک ایسے امی کو امانت اسرار سپرد کی جا رہی تھی جس کا دست معلومات اور رسمی علوم کے اوراق سے بالکل خالی تھا جس کی نگاہیں حروف ھاھا فا کی دنیا سے یکسر ناآشنا تھیں جس کے زانوئے ادب نے کسی نوع کے کسی ادب آموز کے سامنے تہ نہ ہونے تھے جس کے گرد و پیش کھڑی ہیبت ناریکیاں تھیں اور ناقوسوں کی بھیانک آوازیں جس نے الہیات، اخلاقیات، آئین معاشرت، اصول قانون کا نام تک کسی سے نہ سنا تھا وہ یک بیک بھری دنیا کو نور گیا، اخلاق، طہارت باطن، تصفیۂ روح، درس الہیات، نوعیت معاد، فلسفۂ معاشرت، اصول تمدن کے ایسے اسرار و دقائق رموز اور باریکیاں باتوں ہی باتوں میں سمجھا دے کہ حکما کا گروہ، فلاسفہ کا مجمع، متقنین کا جتھا تو ایک طرف رہا خود پیغمبران اولوالعزم کی بزم اس طرح کی حقیقت آفرینی کے کمال تذکرے سے برابر خالی رہی۔

غار حرا کا سکوت نیاز نطق ناز میں تبدیل ہوتے وقت تمام دنیا پر اوہام پرستی کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہند اور مصر والوں کے اوہامات عقاید بے شمار خداؤں یا اوتاروں کی فرضی معجزنمائیوں سے معمور تھے۔ نصرانی، باپ بیٹا۔ روح القدس کو اپنے اعتقادات کی دنیا کے موالید ثلاثہ مان کر احترام و عقیدت کے سہرے تثلیث پر چڑھا رہے تھے۔ صابئین جگمگاتے تاروں کی پوجا میں مصروف تھے۔ مجوسی یزداں اور اہرمن نیکی اور بدی کے دو خدا فرار دے کر نور و ظلمت کی پرستش کر رہے تھے۔ عالم بھر میں یہودی توحید کے مدعی ضرور تھے لیکن اس کی حد بھی زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہ تھی اس لئے کہ وہ جس خدا کے سامنے سر نیاز جھکانا پسند کرتے تھے اس کی نوعیت انسان ہی کے مماثل یا مشابہ یہ کچھ اس سے زیادہ ہو۔ رہا عرب تو وہ بادۂ کہنہ الحاد سے ایسا چھکا ہوا تھا کہ اسے اپنے تن بدن کا ہوش تک نہ تھا۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جس طرح کے ماحول میں انسان بسر کرتا ہے اس کے اردگرد جس قسم کے خیالات و روایات کے انبار لگے ہوتے ہیں انہیں میں سے گھٹا بڑھا کر اس کے دماغ کا سانچہ خیالات کی صورتیں ڈھالنے کا خوگر ہے۔ اس معیار پر رسول اعظمی کا خدا زیادہ نہیں کچھ نہ کچھ تو

اُس دور کے رجحانات و میلانات ذہنی کے حامل ہونا چاہئے تھا۔

فلسفۂ انتساب یعنی نسبت کا فلسفہ مثلاً ہم ایسے اگر یہ نہیں ہمارے آباؤ اجداد ایسے گھر بار ایسا۔ خاندان، کنبہ، قبیلہ ایسا۔ یا ہمارا مذہب ایسا ہم مذہب ایسے۔ یہاں تک کہ ہمارا شہر ایسا۔ ہمارا ملک ایسا۔ کسی نہ کسی طرح قریب یا بعید بلکہ بعید تر دور از قیاس نسبت سے بھی اپنی ذات کو فایدہ پہنچانے میں ادنیٰ کمی نہ کرنا اس کا ماحصل ہے۔

اکثر مسیح پرستوں نے اسی فلسفہ کے تحت ملت بیضا کو طرح طرح سے نصرانیت کا منت پذیر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ بعض پیرہ ذہن افراد نے تو کھلم کھلا اسلام کو نصرانیت کی ایک مسخ شدہ ہیئت کہہ ہی دیا بعض عیسائی مصنفین نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس سعی لاحاصل کا ساز چھیڑا ہے کہ ذات رسالت مآبی نہ تھی بلکہ یہی علوم سے خاصی واقفیت رکھتی تھی۔ جرجیس نامی عیسائی سے تورات و انجیل کا سبق لے چکی تھی۔ یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے جس کے ثبوت میں مدعی کے پاس ایک دلیل بھی نہیں لیکن تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ یہ جو کچھ خیال آرائی کی گئی وہ سب صحیح ہے تو اُس زمانے کی تورات و انجیل اور جرجیس عیسائی کی تعلیم سے آنحضرتؐ کے دل میں اسی قسم کے خدا کا خیال پیدا ہونا لازمی تھا جس کی تعلیم پائی تھی اور جسے خود جرجیس سا معلم مانتا تھا۔ ایسی صورت میں تو اور بھی خالص وحدتِ مطلقہ کا خیال پیدا ہونا غیر ممکن ہی نہیں بلکہ سراسر محال تھا۔

سر ولیم مور نے نسطوری فرقہ (عیسائیوں کا ایک مذہبی گروہ) کے بحیرا نامی ایک راہب سے شہنشاہ کونین کی ملاقات کو اس اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کے دیکھنے کے بعد حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ زیادہ تر اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ طبیعتیں جو ایک طرف دقت نظر و موشگافی کی گہرائیوں سے سطح پر آنا پسند ہی نہیں کرتیں دوسری طرف وہی سطحی (رسمی) دور از کار باتوں کی پل بندیوں میں مصروف و منہمک نظر آتی ہیں۔

بحیرا راہب والی روایت ہمارے یہاں کوئی مستند اور موثق روایت نہیں اس لئے کہ اسے اصول فن کے لحاظ سے مرسل مانا گیا ہے یعنی پہلے راوی کا واقعے کے وقت نہ موجود ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ اس شخص کے نام کا پتا چلتا ہے جو خود اس واقعے میں شریک تھا۔ اس کے علاوہ اگر اس روایت کو صحیح مانتے پر اصرار ہے تو اسی طرح کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا جس طرح یہ روایت بیان کی گئی ہے۔ وہ اس سے زائد نہیں کہ بسلسلۂ تجارت جناب ابوطالب کے شام روانہ ہوتے وقت سرورِ کائنات نے بھی اپنے عم مکرم کی معیت اختیار کی اس وقت آپ کی عمر گرامی بارہ برس سے نہ تھی اور شہر بصریٰ (جو دمشق کے جنوب میں ملک شام کی سرحد پر آباد تھا) کی ایک نسطوری خانقاہ میں اقامت گزیں ہوئے۔ یہیں بحیرا راہب سے ملاقات ہوئی جس نے سردار دو عالم کو دیکھتے ہی کہا کہ سید المرسلین یہی ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا۔ اس نے جواب دیا کہ جب یہ پہاڑ سے اتر رہے تھے تو شجر و حجر سب ان کی تعظیم کے لئے جھک گئے۔

روایت صرف اتنی ہی ہے جس میں بحیرا کی تعلیم و تلقین کے نام سے ایک حرف تک نہیں لیکن چونکہ ملتِ مصطفوی کے فخر ترین لزلِ قصر فلک بوس کا سنگِ بنیاد دوستِ مسیحیت سے رکھوانے کا فخر حاصل کرنا ہے۔ اس جوشِ تمنا نے روایت مذکور کو اس طرح گھڑنے پر مجبور کر دیا کہ شہر بصریٰ کی نسطوری خانقاہ میں پیغمبر اسلام کو بحیرا راہب نے مذہبی تعلیم دی اور آپ کے پرقوت دماغ نے اپنے ہم نشیں کے مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کا ایسا زبردست اثر لیا کہ اُس کا نتیجہ اسلام کی صورت میں دنیا نے دیکھا۔

یہاں پر ضرورت ہے کہ خود بحیرا کے خیالات وغیرہ کا جائزہ لیا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ کتنے پانی میں تھا اور اس کی پرواز خیال کہاں تک تھی۔ یہ نسطوری عقاید کا متبع حضرت مریمؑ کو اُمّ خدا ماننے سے احتراز کرتا تھا۔ نسطوری فرقے کا بانی نسطور نامی ایک شخص قسطنطنیہ کا بطریق اعظم جس نے فلسفہ ارسطو کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اس کی یہی کوشش تھی کہ خالص عقاید مسیحی اسی کسوٹی پر کسے جائیں۔ چنانچہ اہل مصر نے جب حضرت مریم کی پرستش کو عقاید میں داخل کرنا چاہا تو اس باب میں اسی نسطور نے پُرزور مخالفت کی۔ یہ حضرت مریم کے احترام کا مادرِ خدا ہونے کی حیثیت سے قائل نہ تھا۔ اس کے حریف چونکہ دربار قیصر میں پیش پیش تھے اس لئے نسطور کی کچھ پیش نہ گئی اور یہ خود اُلٹا اپنے اس خیال کی پاداش میں خارج البلد ہی نہیں بلکہ مرتے دم تک ایک ریگ زار میں نظر بند رہا اس کے خیالات کو جن لوگوں نے رضا و رغبت کے کانوں سے سُنا اور عقیدت کی آنکھوں سے دیکھا وہ نسطوری کہلائے۔ یہ نسطوری گروہ دور دور تک پھیلا۔ بحیرا راہب جس کی ملاقات افضل البشر سے بیان کی جاتی ہے۔ اسی نسطوری فرقے کا ایک فرد تھا۔ باپ، بیٹا، روح القدس کی پرستش کرنے

والوں کے عقاید پر اگر فقد و تبصرہ کیا جائے تو ملتِ مسیحی کے عام پیروؤں میں خاص کر یہی نسطوری فرقہ نصرانیت کے محدود دائرے ہی میں روشن خیال کہا جاسکتا ہے اس سے زاید بحیرا کے حالات بالکل تاریکی میں ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اپنے محدود فرقے میں بھی کسی غیر معمولی دل و دماغ کا مالک نہ تھا۔

بھلا یہ زرا سی ملغن کس قسم کے دماغ تسلیم کریں گے کہ بحیرا کے چند گھنٹوں یا چند دنوں کی تعلیم و تلقین ایک بارہ برس کے بچے میں تو وہ زبردست طاقت پیدا کر دے کہ وہ آگے بڑھ کر ایک عالم کو زیر و زبر کر کے رکھ دے اور خود بحیرا دم واپسیں تک اسی تثلیث کی دلدل میں پھنسا ہوا ہاتھ پاؤں مارتا رہے۔ بانی اسلام کا نتیجۂ تبلیغ اگر مسیحی اساتذہ کے فیضِ تعلیم کا منت پذیر ہوتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ توحید خالص میں کچھ نہ کچھ تثلیث کی جھلک باقی نہ رہتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب باری عز اسمہٗ کی نسبت عقائد کی نیویارکی میں علیم النظیر کی وحدنی ذاکٹر نے جس تنزیہ و تقدیس کا مکمل معجزنما پھونکا ہے بحیرا تو بحیرا چشم روزگار نے بھی کبھی اس کا خواب تک نہ دیکھا تھا۔

دنیا کو حیرت ہے کہ وہ قوم عرب جس کا دامنِ حیات ایک زمانے سے فسق و فجور کی نجاست سے داغ دار چلا آتا تھا، سوق عکاظ کے مناظر قبیحہ جس کی کتاب تہذیب و شائستگی کے اہم اجزا سمجھے جاتے تھے۔ اس وقت کی متمدن اور مہذب قومیں جس ذلت بھری نظروں سے عرب کو دیکھتی تھیں اس کا ثبت اس واقعے سے ملے گا کہ پہلے پہل دعوت اسلام پہنچنے پر سرخ کلاہ ایران نے نہایت نفرت خیز اور حقارت انگیز لہجے میں یہ الفاظ کہے تھے:۔

اونٹنیوں کا دودھ اور گوہ کا گوشت کھانے کھانے لو۔ اب عربوں کو بھی یہ دن لگے کہ وہ کیانی سلطنت کی آرزو کرنے لگے ہے گردش چرخ کچھ پہ تف ہے۔

دفعتہً اس خانہ بدوش قوم کی حالت بدلی اور اسی سرزمین سے ایک پیکر قدسیتی کی ایک الوہی جنبش لب صدہا اوامر سلطانی سے بڑھ کر تھی۔ امانت تو حیا لئے ہوئے فقیروں کے بھیس میں منظرِ عام پر آیا اور تمام عالم سے اس معجزنما لہجے میں مخاطب شروع کیا کہ چاروں طرف سے لبیک کی صدائیں آنے لگیں۔ اگر چہ ابتدا میں اس کی دعوت حدیبیہ سے مقامی افق پر انکار اور عدم تسلیم کی گھنگھور گھٹائیں چھائی تھیں۔ لیکن اس کے استقلال عزم اور قوت تحمل کے سامنے مخالفت و انکار کے دل بادل دیر پا نہ رہ سکے اور رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ آفتاب ہدایت کی ضوپاشیوں سے عالم تمام مطلع انوار ہوگیا۔ آج بنی نوع انسان کے ایک تہائی حصے کے معتقدات اسی مبلغ اعظم کے فیضان تعلیم کے سامنے سر بسجود ہیں۔

سرورِ کونین نے عالم کو جس نہج اور جس طرز پر تعلیم توحید سے بہرہ ور کیا وہ تعلیم نکتہ شناس اور دقیقہ رس طبیعتوں کے لئے حیرت آفریں اور تسخیر خیز ہے جو مقام بے شمار خداؤں کی ذہنی قدرت نمائیوں سے گھرا ہوا ہو وہاں مبلغ اسلام کی تعلیم کہ سرچشمۂ ہستی، علۃ العلل، احد و صمد، ناموس اعظم، خالق لوح و قلم، معبود برحق، قادر مطلق، یگانہ و یکتا، عظمت و جبروت میں بے ہمتا وہی ایک ذات ہے جس کا وجود کسی علت کا متماج نہیں۔ اس کی ذات بے مثال ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ وہ وہ وحدہٗ لاشریک نشیب و فراز، پست و بلند، یمین و یسار، زمان و مکان میں سے کہیں بھی نہیں اور پھر ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ وہ ایسا دیکھنے والا ہے کہ گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں بھی چیونٹی کے پاؤں کے نشان اس سے چھپ نہیں سکتے۔ وہ ایسا جاننے والا ہے کہ دل کے چھپے ہوئے بھید کسی طرح بھی اس سے مخفی نہیں رہ سکتے۔ وہ ایسا حاسب ہے کہ پوری کائنات کے منتشر و پراگندہ ذرّوں کی تعداد اس سے پوشیدہ نہیں۔ انسان کی سریع الزوال بیرونی اور اندرونی تمام قوتیں ایسی ناکارہ اور اپاہج ہیں کہ اس کی حقیقت و کنہ کا ہار سر بستہ نہیں دریافت کر سکتیں۔ بشری حواس و احساسات جو تحت و فوق، جہت و اشارہ کے سہارے چلنے کے خوگر ہیں اس کے سرادیۂ اقتدار تک کسی طرح نہیں پہنچ سکتے۔ وہ ازل و ابد کا شیرازہ بند اپنے غیر فانی اور لازوال اقتدار تمام کے ساتھ جیسے پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے اور یوں ہی سریر قدس پر ہمیشہ جلوہ گر رہے گا۔

اس حیرت آفریں سلسلے سے گھبرا کر گبن کہتا ہے کہ زمان و مکان، تحت و فوق، جہت و اشارہ ان تمام خصوصیتوں کو علیحدہ کرنے کے بعد خیال بشر کے لئے کوئی چیز ہی نہیں بچتی۔ دست انسانی سے حواس اور احساسات کا پورا سرمایہ ہی جب چھین لیا جائے تو پھر اس کے پاس باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔ مگر خیال کی یہ لطافت، یہ پاکیزگی، یہ بلندی، جو بانی اسلام نے اپنے خدا کی نسبت صرف کی کسی طرح بھی کبھی نہیں معلوم ہوتی۔

سر ولیم جونس کہتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنے گرد و پیش اور ماحول کے بالکل خلاف وحدت باری اور صفات ایزدی کے متعلق وہ وہ دقیق اور نازک حکیمانہ خیالات بے جھجک اس طرح ظاہر کئے کہ جن کے

تصور سے قلب انسانی ہیبت کدہ بن کر رہ جاتا ہے۔

کانٹ ہنری فرانسیسی ہتھ کہتا ہے کہ بانی اسلام کی توحید خالص کی تعلیم وقت نظر سے دیکھنے کے بعد پھر ایک لمحے کے لئے بھی یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح کی تعلیم تورات و انجیل کے مطالعہ کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ مبلغ اسلام جس طرح کی فطرت سلیم، دماغ نازک، احساس لطیف، مذاق صحیح لے کر آیا تھا اس کے لحاظ سے اگر یہ کتابیں اسے پڑھنے کو دی جاتیں تو وہ انہیں اٹھا کر دور پھینک دیتا اور ان پر اک سرسری نظر ڈالنا بھی کبھی گوارا نہ کرتا۔

جان ولیم ڈریپر کو اسلام کی خالص تعلیم توحید اور اس کی ترویج پر الیسا رشک ہے کہ بے اختیا رحسرت آگیں طرفقہ پر ایک جگہ یہ لکھنا ہے کہ:۔

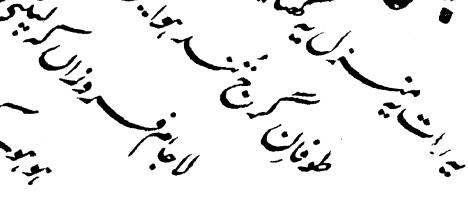
تبلیغ مسیحیت کو کبھی بھی یہ دن نصیب نہیں ہوا کہ وہ بت پرستی کا استیصال کر سکتی۔ اس کی قوت وسطوت جتنی بڑھتی گئی یہ دیا بھی اس کے ساتھ ساتھ رہی۔ مسیحیت کا فروغ دعوت جتنا آگے بڑھا اسی حد پر اس نے بھی پاؤں پھیلائے۔ یہ خلاف اسلام کے کہ پہلے ہی دن اس نے علی الاعلان کھلم کھلا جس تنزیہ و تقدیس کا پرزور دعوے کیا تھا۔ وہ محض زبانی جمع خرچ نہ تھا بلکہ اُسے عملی طریقے سے ثابت کر کے دنیا کو دکھا دیا۔ مختلف قبائل عرب کے دیومیکل خداؤں کے مجسموں کو نفرت و حقارت کی منجنیقوں سے ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر کے ایسا سرمہ سا بنا دیا کہ ان کا غبار گرد روزگار میں مل کر اعتقادات کی نگاہوں سے بالکل غائب ہو گیا اور عرب کی جبود پسند قوم شارع اسلام کی اچھوتی تعلیم توحید کی بدولت دیکھتے ہی دیکھتے ہر قسم کی نظر فروز تر قیوں کا ایک ایسا مرکز بن گئی کہ جس کی طرف عالم بھر کی نگاہیں بندھ گئی تھی۔

جناب نبی مرتبت کے فیضان تعلیم سے بہرہ ور ہو کر اس خانہ بدوش قوم نے دنیا پر اپنی وہ دھاک بٹھا رکھی تھی کہ اک عالم نے اس کی عظمت و جبروت کا لوہا مانا۔ شام، دمشق، ایران، مصر، بیت المقدس، اسکندریہ عربوں کے ایوان فتح و ظفر کے جب صحن بن چکے تو تقریباً بیس سال تک اسلامی نبرد آزماؤں کی پیش قدمی آب بستہ کی طرح رُکی رہی جس کی تلافی اس جوش کشور ستانی سے ہوئی جو عقبہ وادی نیل سے کوہ و دشت و صحرا کی ناہموار اور دشوار گزار راہوں اور اس سلسلے کے درمیانی شہروں اور ملکوں کو فتح و نصرت کے قدموں سے روندتا ہوا بحر اوقیانوس کے لب ساحل دم لینے کے لئے ٹھہر گیا۔

گبن کہتا ہے کہ جبل الطارق سے دریائے لائر کے ساحل تک طولاً ہزار میل کی مسافت پر اسلامی فتح و ظفر کی قدم قدم پر ڈاک بیٹھی ہوئی تھی اسلامی کشور ستاں قدم اگر اتنی ہی مسافت اور طے کر لیتے تو ایک طرف پولینڈ کے حدود اور دوسری جانب اسکاٹ لینڈ کی سرفلک چوٹیوں پر اسلام کا پرچم اقبال لہراتا ہوتا۔ اسلامی سورماؤں نے اپنے دست و بازو سے جیسی وسیع اور عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی جغرافیہ کے لحاظ سے سکندر اعظم اور رومۃ الکبریٰ کی سلطنتیں بھی اس کے پاسنگ نہ تھیں۔

سید ابوالقاسم
دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

رباعی



سعید احمد اعجاز

گوالے

سامنے مسکرا رہی ہے سحر
اوس کی آفتاب پر ہے نظر

دھوپ کی چھوٹ ہے پڑاوے پر
گا رہے ہیں کہار آوے پر

سوئے مغرب جو چنگی خانہ ہے
واں سحر درد کا فسانہ ہے

ایک جھگھٹ سا ہے گوالوں کا
گائے، بکری کے دودھ والوں کا

رُخ پہ اک انہماک کی اُلجھن
سر پہ بے عیب دودھ کے برتن

تیز سانسوں سے بوئے مجبوری
گرم ماتھوں پہ گردِ مزدوری

خاک سے ہیں اٹے ہوئے کپڑے
ڈاڑھیوں میں لگے ہوئے تنکے

خوابِ قارونیت کی تعبیریں
سر بسر مفلسی کی تصویریں

ان میں کچھ عورتیں بھی ہیں جن کے
بھوک سے ہیں سُلگتے ہوئے چہرے

رُخ پہ بیماریٔ شباب کا رنگ
دینِ پاک میں حجاب کا رنگ

باغ ویران شادمانی کے
پھول توڑے ہوئے جوانی کے

شوخیاں دم بخود ادا خاموش
نازِ مجروح بانکپن بے ہوش

باری باری سے کر رہے ہیں ادا
ہے جو محصول زندہ رہنے کا

جب محرر کے پاس آتے ہیں
خوف کھاتے ہیں تھرتھراتے ہیں

نطق گر اس جگہ ہو گرمِ سخن
چھوٹ جائے بیان کا دامن

کاش اس پائمال طبقے کو
خستہ و پُر ملال طبقے کو

رہنما کوئی ایسا مل جائے
جو انہیں راہِ راست پر لائے

ان کے سینوں میں روشنی کر دے
جلد از جلد آدمی کر دے

ان کے افلاس کا علاج کرے
علم سے صیقلِ مزاج کرے

احسانِ دانش

سبز دلبراں

اتوار کا دن تھا اور حفیظ، یعقوب اور ناصر حسب معمول سرفراز کے مکان پر جمع تھے۔ شروع سے یہی قاعدہ چلا آرہا تھا کہ چھٹی کے روز دوستوں کی مجلس سرفراز کے مکان پر جمتی۔ یہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا کر آئے تھے اور اب سہ پہر کی چائے کا تقاضا کر رہے تھے۔ پہلے تو سرفراز بھی ٹال مٹول کرتا رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ فرار کی تمام راہیں بند ہیں تو مجبوراً ملازم کو مٹھائی لانے کے لئے بازار روانہ کیا اور اندر گھر میں چائے کے لئے کہلا بھیجا۔ تاش کی پے بہ پے کئی بازیاں ختم کرنے کے بعد اب یہ چاروں دوست چھوٹی میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ فقرے چست ہو رہے تھے اور پھبتیاں کسی جارہی تھیں۔ بندلہ سنگھ اور حاضر جوابی میں یعقوب ان سب میں بڑھا ہوا تھا۔ اس نے بی اے کے بعد جیسے کا کام شروع کر دیا تھا جہاں اُس کی ذہانت و قابلیت نے اس کی آیندہ ترقی کے بہت سے دروازے کھول دیئے تھے۔ حفیظ کا اصلی وطن کرنال تھا لیکن اُس کے والد کی ملازمت کا سارا زمانہ لاہور میں بسر ہوا تھا۔ یہیں انہوں نے مکان بنا لیا تھا اور پنشن لینے کے بعد بود و باش بھی اس جگہ اختیار کر لی تھی۔ حفیظ کو تعلیم ختم کرنے پر پلاٹ صاحب کے دفتر میں ایک معقول اسامی مل گئی تھی اور اب وہ اپنے کنبے کے دیگر افراد کے ہمراہ لاہور میں رہتا تھا۔ ناصر سیالکوٹ کا رہنے والا تھا لیکن گزشتہ آٹھ سال سے لاہور ہی میں مقیم تھا۔ اس نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی تھی اور اب یونیورسٹی میں "ریسرچ سکالر" کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جس کا اُسے اچھا خاصا.... مشاہرہ مل جاتا تھا۔ اُسے امید تھی کہ اگر وہ اپنے موجودہ فرائض محنت و سرگرمی سے ادا کرتا رہا تو مستقبل قریب میں اُسے محکمہ تعلیم میں ضرور کوئی قابل عزت جگہ مل جائے گی۔ ان احباب میں صرف سرفراز لاہور کا اصل باشندہ تھا۔ سرفراز کے والد لکڑی کی تجارت کرتے تھے اور لاہور کے صاحب ثروت لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ پہلے وہ وسطی دروازے کے اندر اپنے جدی مکان میں رہتے تھے لیکن کچھ عرصے سے انہوں نے شہر سے باہر ایک وسیع خوبصورت باغ تعمیر کرالیا تھا جہاں اب وہ اہل و عیال سمیت منتقل ہو آئے تھے۔ سرفراز نے بی اے کے بعد باپ کے کاروبار میں شریک ہونے کی بجائے قانون کی تعلیم حاصل کرنا پسند کیا اور اب اُسے پریکٹس جاری کئے ہوئے دو سال کے قریب گذر چکے تھے۔ ایک تو وکالت کا پیشہ یوں بھی کچھ ایسا نفع بخش نہیں رہا اور پھر لاہور ایسے شہر میں جہاں ہر قسم کے چھوٹے بڑے وکلا کی کثرت نے کام کو اور زیادہ محدود کر دیا ہے ایک بندی کے لئے روزگار مہیا کر لینا بے حد مشکل ہو گیا ہے۔ کاروبار کی اس واماندگی سے سرفراز چنداں مایوس نہیں ہوا تھا۔ اُسے کھانے پینے اور رہنے سہنے کی تمام ضروریات میسر تھیں اس لئے اطمینان سے اپنے کام میں محنت کئے جانے سے اُسے گریز نہ تھا۔ اُس نے کوٹھی کے دو بڑے کمرے اپنے لئے الاٹ کر لئے تھے۔ ایک میں اس کا دفتر تھا اور دوسرا نشستگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دوست احباب آتے اور یہیں فرصت اور تفریح کا وقت گزرتا تھا۔

اتنے میں چائے آگئی اور سب دوستوں نے بڑھ بڑھ کر مٹھائی پر ہاتھ مارنا شروع کئے۔ باتیں بھی جاری رہیں۔ حفیظ کہنے لگا "لاہور میں اچھی مٹھائی دلی والے حلوائی بناتے ہیں"۔

یعقوب بولا "تم مٹھائی کا ذکر کرتے ہو میں کہتا ہوں لاہور کی ہر اچھی چیز پر لاہوریوں کی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے!"

حفیظ اور ناصر نے مسکرا کر سرفراز کی طرف دیکھا۔ وہ جانتے تھے کہ یعقوب لاہور کے باشندوں کی مذمت میں ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے۔ اور سرفراز کے ساتھ اُس کی اکثر پر لطف نوک جھونک ہوتی رہتی ہے۔

یعقوب بالعموم یہ کہنے کا عادی تھا کہ "اگر باہر کے لوگ لاہور میں آکر آباد نہ ہوتے تو یہ شہر علم و ادب کا سر کر دینے کی بجائے جہالت نگر ہوتا"

سرفراز نے گرم گرم چائے کی پیالی ہاتھ میں اٹھائی اور یعقوب کے سر پر لا کر کہا "اگر تم نے اپنی زبان بند نہ کی تو یاد رکھو یہ آگ تمہارے اوپر گرا دوں گا"۔ ناصر کہنے لگا "سرفراز بھائی اس طرح کام نہیں چلے گا۔ دلیل سے بات ہونی چاہیئے۔ یعقوب جو کچھ کہہ رہا ہے مجھے اس سے

پورا اتفاق ہے۔ لاہور کو لاہور [illegible] لوگوں نے بنایا ہے۔ لاہور سے مراد وہ لاہور نہیں جو آج سرکلر روڈ کے اندر آباد ہے بلکہ وہ شہر جو میونسپل کمیٹی کے باغات سے باہر کھڑا ہے لاہور ہے اور اس لاہور کو بنانے، سجانے اور سنوارنے والے ہم ہیں۔ یہاں کی علمی و ادبی مجالس نہیں دیکھ کر دلی دلکھنؤ کی قدیم صحبتوں کی یاد تازہ ہوتی ہے ہمارے دماغ کی کاوشوں کی شرمندہ ہیں۔ یہاں کی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی درس گاہیں جن کے عقیل لاہور خطۂ یونان بن رہا ہے ہمارے خون سے سینچی گئی ہیں۔ یہاں کی ہنگامہ خیز صحافت جس کی دھاک ہندوستان کے طول و عرض میں بیٹھ چکی ہے۔ ہمارے قلم کی مرہونِ منت ہے۔ یہاں کی صنعت و حرفت اور یہاں کے سیاسی و معاشرتی اداروں کی رونق ہمارے دم قدم سے زندہ ہے۔ اگر ان تمام عناصر کو جنہوں نے لاہور کے تن مردہ میں خونِ زندگی کی حرارت پیدا کر رکھی ہے خارج کر دیا جائے تو بتاؤ لاہور ایک لنگڑے، لنجے، اندھے اپاہج سے زیادہ کیا رہ جاتا ہے؟

یعقوب چلّا اٹھا "ناصر زندہ باد۔ اور اب میرے بھائی ذرا اس لاہور کا بھی ذکر کر دو جس پر ہمارے دوست سرفراز کو ناز ہے۔ بات یہ ہے کہ لاہور اور لاہوریت دو مختلف المعانی الفاظ ہیں۔ لاہوریت ایک استعارہ ہے جس سے مراد ایک خاص قسم کی معاشرت خاص قسم کی زبان، خاص قسم کے رسم و رواج اور خاص قسم کا ماحول ہے جسے اس لاہور سے کوئی تعلق نہیں جس کے ہم باشندے ہیں۔ دلی دروازے کے اندر داخل ہو کر کسی سے دروازے تک چلے جاؤ۔ تمہیں جگہ جگہ لاہوریت کے لاجواب نمونے نظر آئیں گے۔ چڑیا کوچی، سرفراز کو سرفراز اور سڑک کو سڑکا کہنا یہاں کے فصحاء کی زبان ہے اور اس میں جاہل اور تعلیم یافتہ، مہذب اور غیر مہذب کی کوئی تمیز نہیں۔ بات بات پر ہنسی ہنسی میں دو دو سن کی گالی استعمال کرنا یا گفتگو کے دوران میں زیبِ داستان کے طور پر متفنی و صحیح مغلظات کی بارش کر دینا یہاں کی معاشرت کا ایک عام محبوب و مرغوب پہلو ہے۔ بلدیہ کے باغات میں صبح سے شام تک لڈو گھما گھما کر ہاؤ ہو پار کرنا یا کباب فروش اور فالودہ بیچنے والے کی دکان پر دبلی سے بیٹھ کر نہایت کرخت آواز میں نانک کے گیت الاپتے رہنا یہاں کے دلچسپ مشاغلِ حیات ہیں۔ اگر لاہوریت کا حقیقی رنگ و روغن دیکھنا ہو تو اس کی دو جھلکیں ہیں۔ پہلوانوں کا دنگل یا حمام۔ سردیوں کے موسم میں صبح کے وقت کسی حمام میں جا نکلو تو لاہور اپنے اصلی خدوخال میں نظر آ جائے گا۔ میں تفصیل اس لئے بیان نہیں کرتا کہ مبادا ہمارے دوست حضرتِ سرفراز کی طبعِ نازک پر گراں گزرے۔ یہی حال بلغمی کا ہے جہاں ہر شخص اپنے لباس، اپنے اندازِ نشست و برخاست اور اپنی چال ڈھال سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ تہذیب و متانت کے مروّجہ و مسلمہ اصولوں کی پابندی کو اپنی شانِ قیادت کے منافی سمجھتا ہے۔ یہاں ہر شخص جو لباس میں زیادہ آشفتہ حال و پریشاں، زبان میں زیادہ بے احتیاط و گریزاں اور کردار میں زیادہ فحش و عریاں ہو خلیفہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس محفل میں ہر شخص بے تاب نظر آتا ہے کہ اپنا ڈیل ڈول دکھلانے کے لئے دوسرے کی پگڑی اچھالے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے بات بات پر آستینیں چڑھائی جاتی ہیں اور سب و شتم کی روانی میں زبان قینچی کی طرح استعمال کی جاتی ہے جو شخص ثقاہت و متانت کا جامہ زیادہ تندی سے تار تار کرتا ہے وہی محفل کی سرداری کا زیادہ اہل تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں پندرہ سال سے اوپر عمر کا ہر لڑکا اپنے اچھے بھلے صاف کو کانوں پر گرا کر اور تہمد کے پلّو کو دائیں ہاتھ سے اٹھا کر اپنی چال ڈھال اور وضع قطع میں عمداً ایسا رنگ پیدا کرتا ہے جو اُسے معقول اور سنجیدہ انسانوں کی صف سے خارج کر دے کیونکہ جب تک لباس کی تراش خراش اور رفتار و گفتار کے انداز میں سنجیدگی و معقولیت کا ذرا شائبہ بھی ہے اُسے خلفاء کے حلقے میں شریک ہونے کی توقع نہیں ہو سکتی اور آپ جانتے ہیں کہ لاہور میں ہر نوخیز و نوعمر نوجوان کا منتہائے نظر یہ ہے کہ وہ جلد از جلد خلیفہ بن جائے باقی رہا وہ لاہور جس میں یونیورسٹی ہے، کالج ہیں، اخبارات و رسائل ہیں تمدنی و سیاسی ادارے ہیں، علم و ادب کے چرچے ہیں، صنعت و حرفت کے ہنگامے اور شستگی و شگفتگی کے نمونے ہیں سو اس کا تعلق ہم ناچیز انسانوں کے ساتھ ہے جنہوں نے اپنا وطن چھوڑ کر یہاں اقامت اختیار کر لی تاکہ لاہور کی مٹی کو سونا بنایا جائے۔"

حفیظ کہنے لگا "بعض لوگ لاہور کو بڑا مردم خیز خطہ سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ پنجاب اور ہندوستان کے اکابر کی فہرست سامنے رکھ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ لاہور کی مردم خیزی محض ایک بے حقیقت افسانہ ہے۔ میں نے لاہور کا جو کچھ دیکھا ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں عشق و محبت کا سوز بھی موجود نہیں البتہ رندی و ہوسناکی کے مناظر عام ہیں۔"

سرفراز خاموش بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا اور کبھی کبھی مسکرا دیتا تھا۔ جب حفیظ نے بات ختم کی تو اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ کہنے لگا

بھائیو! جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ غلط ہے یا صحیح اس پر پھر کبھی بحث کریں گے۔ لیکن سر دست میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حفیظ کے اس فقرے نے کہ لاہور میں عشق و محبت کا سوز موجود نہیں البتہ رندی و ہوسناکی کے مناظر عام ہیں، مجھے ایک ایسا واقعہ یاد دلا دیا ہے جو عشق کے سوز اور محبت کی بے کسی کی ایک المناک مثال ہے۔ یہ ایک دردناک داستان ہے جس میں محبت کے مجسمہ درماندگی کے علاوہ عشق کی بے پناہ ہلاکت آفرینی کی ایک دنیا آباد ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ واقعہ گوش گزار کروں۔"

یکایک سب دوستوں کے ہنستے ہوئے چہروں کا رنگ اڑ گیا اور انہوں نے یک زبان ہو کر کہا "ضرور"

سر اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور پندرہ بیس منٹ کے بعد وہاں سے برآمد ہوا تو اُس نے ہاتھ میں ایک لفافہ پکڑا ہوا تھا اور چہرے پر حزن و ملال کے آثار ہویدا تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر اُس نے کہنا شروع کیا "میں کوئی بیس آنے سے پہلے ہم دہلی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ میں کالج میں پڑھتا تھا اور فرصت کا وقت عموماً گھر پر ہی گزرتا تھا۔ میرا کمرہ مکان کے نیچے کی منزل میں تھا جہاں دوست احباب بے تکلفی سے آنے اور اٹھنے بیٹھنے کے عادی تھے۔ میرا ایک دوست فیاض جو دسویں جماعت تک میرا ہم کتب و ہم سبق رہ چکا تھا ہمارے پڑوس میں رہتا تھا۔ دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد فیاض چھ مہینے کے قریب بے کار رہا اور پھر اُسے ریل کے دفتر میں چالیس روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی تھی۔ یہ ایک خوش باش بے فکر کھلنڈرا لڑکا تھا۔ چار بجے دفتر سے آکر سیدھا منٹو پارک چلا جاتا تھا جہاں کھیل کود میں سرگرمی سے حصہ لینا اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ ہفتے میں دو تین بار شام کو میرے پاس آکر عموماً رہ جاتا تھا اور محلے میں کسی شادی غمی کی تقریب پر ریل کے دفتر کے کسی واقعہ یا اسکول کے زمانے کی کسی بات پر ہمارے درمیان آدھ پون گھنٹہ گفتگو ہو جاتی تھی۔ فیاض کے والد چمڑے کی دکان کرتے تھے اور اچھے مرنجاں مرنج خوش حال بزرگ تھے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے فیاض نہایت دلکش انسان تھا لیکن اُسے عام نوجوانوں کی طرح بن ٹھن کر رہنے کا قطعاً شوق نہ تھا۔ میں کبھی کبھی مذاق کے طور پر اُس سے کہتا تھا کہ دنیا میں اچھی شکل لے کر پیدا ہونا ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ اکثر لوگ ہیں کہ اگر ان کی دنیاوی ترقی کے وسائل پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اُن کی کامیابی کا راز ان کی خوش [illegible] میں مضمر ہے۔ تم یقیناً خوش قسمت ہو کہ قدرت نے تمہیں اس نعمت سے فوازنے میں بخل نہیں کیا اور تم چاہو تو اس خصوصیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے ہم عصروں میں سربلندی و امتیاز حاصل کر سکتے ہو اور اگر تمہیں اسی حالت میں رہنا پسند ہے کہ گریبان چاک ہو، بال پریشان ہوں اور چہرے کو دو روز سے پانی کا چھینٹا نصیب نہ ہوا ہو تو بہتر ہے کہ اپنی شکل کسی اور کو دے دو۔"

وہ ہنس کر جواب دیتا "میں نواب تک یہی سنتا آرہا ہوں کہ جو انسان زیادہ جفاکش، زیادہ محنتی اور زیادہ مستعد ہے وہی اس کارگاہِ عمل میں زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ تم پہلے شخص ہو جس نے یہ نکتہ بتایا ہے کہ دنیا میں عروج حاصل کرنے کے لئے خوب روئی و خوش جمالی کی ضرورت ہے میں تو جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا۔ یہ ہر وقت بن سنور کر رہنا اور صبح و شام نازنخرے کی فکر میں لگے رہنا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

عادات و اطوار کے لحاظ سے فیاض بالکل سیدھی سادی طبیعت کا لڑکا تھا۔ اُس کے مزاج کی سادگی اور بے پروائی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ ہر مہینے تنخواہ لا کر اپنی والدہ کے حوالے کر دیتا اور کہتا کہ "مجھے تو صرف کھانے کے لئے دو وقت کی روٹی اور پہننے کے لئے کپڑا درکار ہے اور یہ چیزیں مجھے ابا جیسا کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ روپے میرے کسی کام نہیں۔"

ایک مرتبہ اُس کی والدہ نے اس کی شادی کا ارادہ کیا تو اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا "گھر کے کام دھندوں اور بیوی بچوں کی الجھنوں میں بسر کرنے کے لئے ابھی عمر پڑی ہے۔ یہ دو چار سال تو مجھے اور آزادی کی ہوا کھا لینے دیجئے۔"

سیاست یا ادب سے فیاض کو چنداں دلچسپی نہ تھی۔ میرے پاس آکر بیٹھتا تو اخبار رسالے پڑھ لیا کرتا تھا یا پھر میں خود ہی کبھی کبھی اُسے کوئی دلچسپ مضمون یا اچھی سی نظم سنا دیا کرتا تھا۔

دفعتہً فیاض کی طبیعت میں انقلاب آگیا۔ وہ چپ چاپ اور اُداس اُداس رہنے لگا۔ شام کا کھیل تقریباً ترک ہو گیا۔ چار بجے دفتر سے آکر وہ اب بھی گھر میں زیادہ نہ ٹھہرتا تھا۔ لیکن آتا اُس کے دوستوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ حسب معمول منٹو پارک نہیں جاتا۔ غروبِ آفتاب کے بعد اب وہ باقاعدگی سے ہر روز میرے ہاں آنے لگا تھا لیکن میرے مطالعہ میں حارج ہونے کی اس نے کبھی کوشش نہ کی تھی۔ اُس کی

عادت تھی کہ خاموشی سے آکر، مزاج پرسی کے چند کلمات کہہ کر، میز کے قریب آرام کرسی پر دراز ہو جاتا۔ بلکہ رحمٰن کی خیالستان یا حسرت موہانی کا دیوان اس کی محبوب کتابیں بن گئی تھیں۔ گھنٹہ یون گھنٹہ کرسی پر لیٹے لیٹے انہی کتابوں کے ورق الٹتا رہتا اور پھر چپ چاپ اٹھ کر چلا جاتا تھا۔ میں نے دو، ایک مرتبہ اُس سے اس تکدر و اضمحلال کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاں نہ میں ٹال دیا۔ اُس کے والد خود متفکر تھے کہ فیاض کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک روز وہ میرے پاس بیٹھا خالی نظروں سے ہر طرف دیکھ رہا تھا تو میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور کہا "تمہیں آج صاف صاف بتانا ہوگا کہ تمہاری حالت روز بروز کیوں خراب ہو رہی ہے یہ ہر وقت تم کس فکر میں غرق رہتے ہو۔ وہ تمہارا ہنستا کھیلتا اور خوش رہنا کیا ہوا؟ تمہاری اس کیفیت سے تمہارے گھر کے لوگ اور تمہارے دوست سخت پریشان ہیں"۔

فیاض نے سر اٹھا کر نہایت عاجزی کے ساتھ میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں حیران ہو گیا میں نے بہت نرمی کے ساتھ اس سے کہا "گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ دوست ہوں۔ مجھ سے بلا تامل اپنی تکلیف بیان کرو اور میں بہ دل و جان تمہاری مدد کروں گا"۔

فیاض نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا "میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ پر ترس نہیں آئے گا بلکہ الٹا تم میری حماقت پر ہنسو گے لیکن یہ خدا جانتا ہے کہ میں آج کل کس جان لیوا اذیت میں مبتلا ہوں"۔

میں نے اُسے پھر تسلی دیتے ہوئے کہا "مجھ پر کامل اعتماد کرو۔ تمہاری بہتری کے لئے جو کچھ بن پڑے گا میں دریغ نہیں کروں گا لیکن مجھ سے اپنا راز مت چھپاؤ"۔

فیاض نے کہا "میں خود نہیں جانتا مجھے کیا ہو گیا ہے میری زندگی کا یہ انوکھا واقعہ ہے اور میں اس قدر گھبرا گیا ہوں کہ مجھے راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر میں تم سے سچ سچ کہہ دوں تو کیا تم مجھ سے نفرت تو نہ کرنے لگو گے؟"

میں نے جواب دیا "تم بھی کیا بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو میرے بھائی، اگر تم دنیا کا سب سے بڑا گناہ کر کے آؤ تو بھی میں تمہاری امداد سے گریز نہ کروں گا"۔

فیاض کہنے لگا "میرے ایک بہت دور کے قرابت دار ہیں جن کا نام میں اس وقت بتانا نہیں چاہتا۔ دو سال ہوئے ان کی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنی بیوی کو ہمراہ لے کر کہیں باہر چلے گئے تھے۔ اب تین مہینے ہوئے وہ واپس لاہور آئے ہیں۔ میں ان سے ملنے گیا تھا۔ ان کی بیوی کو میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ اس قدر حسین اور نازک اندام لڑکی ہے کہ اس کی مثال آج تک نظر سے نہ گزری تھی۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ گلاب اور موتیا کے پھولوں کی پتیوں سے بنی ہوئی ایک آسمانی حور ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی شگفتگی کا یہ عالم ہے کہ اُسے ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ فضا میں نور و سرور کی بارش شروع ہو گئی ہے۔ وہ چلتی ہے تو خدا کی قسم کہ مستان کی پری معلوم ہوتی ہے جو ہوا میں اٹکھیلیاں کرتی جا رہی ہو اور وہ ہر وقت اس قدر شاداں و فرحاں رہتی ہے کہ اس کے سامنے رنج و غم کا ذکر کرنا قدرت کی نعمتوں کی توہین کرنا ہے۔ میں نے جب سے اُسے دیکھا ہے میرا دل میرے اختیار میں نہیں رہا۔ ایک ناقابلِ بیان خلش ہر وقت دل و دماغ کو بے قرار رکھتی ہے۔ رات کو آرام اور دن کو کام کے اوقات کا کوئی لمحہ اس کے تصور سے خالی نہیں رہتا۔ میں نے اُسے بھول جانے کی بے حد کوشش کی ہے لیکن جادو کی طرح جو انسانی تصرف و اختیار سے باہر ہو اس کا خیال میری روح پر حاوی ہو چکا ہے۔ میں نے اُس کے ہاں جانا ترک کر دیا ہے لیکن جوں جوں اُس سے غافل رہنے کی کوشش کرتا ہوں وہ ناقابلِ فہم طریق سے میری زندگی پر چھائی چلی جاتی ہے"۔

میں نے پوچھا "کیا اُسے تمہاری اس کیفیت کا علم ہے؟"

"بالکل نہیں۔ یہ ہو کیونکر سکتا ہے۔ میں اگر اشارۃً و کنایۃً بھی اس کا اظہار کر دوں تو تم جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ خاندان تباہ ہو جائیں گے۔ وہ ایک محبت کرنے والے شفیق و مہربان خاوند کی بیوی ہے اُس کے فرائض نہایت اہم اور اس کی ذمہ داریاں بے حد نازک ہیں اور وہ خود اپنے گھر میں اس قدر خوش و خرم اور مسرور و مطمئن ہے کہ میں اس مہلک راز کے اظہار کی کبھی جرأت نہ کروں گا۔ ایسا کرنا قتلِ عمد سے زیادہ خوفناک جرم ہے۔ میں اُس کے ہاں اکثر جاتا تھا لیکن اب کئی ہفتے ہوئے میں وہاں نہیں گیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو گئی جس سے ذرا سا شک و شبہ بھی پیدا ہوا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے"۔

میں نے کہا اس کو بھول جانے کی کوشش کرو۔ ایسے واقعات گاہے گاہے انسان کی زندگی میں رونما ہوا کرتے ہیں لیکن ان سے اس طرح متاثر ہونا ٹھیک نہیں۔ دفتر کا کام زیادہ محنت سے کرو اور سیر کو منٹو پارک کے کھیل میں بلاناغہ شریک ہوا کرو۔ فرصت کا وقت میرے پاس گزارنے میں اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو بلا تکلف یہاں آجایا کرو۔ مجھے مذہب سے زیادہ شغف نہیں لیکن ایسے مصائب میں دعا سے استمداد کرنا مضمحل انسان کی روحانی تشفی کا باعث ہوتا ہے۔ اس نئے ابتلا سے نجات پانے کے لئے مذہب سے مدد طلب کرو"

فیاض کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو جاری ہو گئے اور اس نے بمشکل آنکھوں کو رومال سے خشک کرتے ہوئے کہا "میں سب کچھ کر چکا ہوں۔ نہیں کیا معلوم کہ میں نے کس طرح راتیں جاگ جاگ کر آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ میں نے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگی ہیں کہ خدایا مجھے اس آزمائش سے بچالے۔ میں نے محض اسے بھول جانے کے لئے روزانہ بارہ بارہ گھنٹے دفتر کا کام کیا ہے لیکن اس کا خیال بدستور دماغ کے گوشے گوشے میں موجود ہے۔ کام سے ذرا سر اٹھاتا ہوں تو اس کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ بتاؤ ایسی حالت میں میں کیا کروں۔ میں کام اور آرام دونوں سے محروم ہوں۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ دن بھر کرب و اضطراب میں بسر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر میں اس راز کو کھول دوں، اگر اس کے سامنے جا کر اپنا سینہ چاک کر دوں۔ اگر اس سے کہہ دوں کہ خدارا محبت کی ایک نگاہ مجھ ناچیز پر ڈال دے تو کیا ہو۔ اس خیال کی دہشت سے میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اس کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے آجاتا ہے اور میں اس بات کے تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہوں کہ میرے اس فعل سے اس کی زندگی بھر کی مسرت و راحت تباہ ہو جائے گی"

فیاض نے میز پر سر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں سے پھر آنسو ٹپکنے شروع ہو گئے۔

میں نے پوچھا "اس کا نام کیا ہے؟"

"کس کا نام؟"

"تمہاری محبوبہ کا"

"میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ میں نے آج تک اس واقعے کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ اگر یہ بات کھل گئی تو وہ مفت میں بدنام ہو جائے گی۔ لیکن تم سے چونکہ پردہ نہیں اس لئے میں صرف اتنا بتانے کو تیار ہوں کہ اس کا نام ز سے شروع ہوتا ہے"

اس گفتگو کے ایک مہینہ بعد فیاض نے خودکشی کر لی۔ اپنے مکان کے ایک کمرے کو اندر سے مقفل کر کے اس نے اپنے بائیں بازو کی شریان چاقو سے کاٹ ڈالی اور اس کے جسم کا سارا خون بہہ گیا۔ میں نے جا کر اس کی لاش دیکھی تو ایک عجیب چیز نظر آئی۔ فرش پر جگہ جگہ خون سے لکھا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خون بہ رہا تھا اور وہ انگلی کو خون میں ڈبو کر فرش پر ز۔ ز لکھ رہا تھا"

سرفراز نے یہ قصہ ختم کیا تو سننے والوں کی آنکھیں پرنم ہو گئیں ناصر نے پوچھا "آخر زکا راز بھی معلوم ہوا یا نہیں؟"

سرفراز نے جواب دیا "کچھ پتہ نہیں چلا۔ میرا خیال ہے کہ زسے مراد غالباً زبیدہ ہے۔ لیکن وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس راز کو محفوظ رکھنے کی خاطر تو فیاض نے اپنی جان دے دی تھی"

سرفراز نے لفافے سے ایک تصویر نکالی اور کہا "یہ فیاض کا فوٹو ہے" مسکراتا ہوا خوبصورت سا گول چہرہ۔ پیشانی پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے بال۔ لمبی لمبی آنکھیں جنہیں گھنی پلکوں کے سائے نے زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔

حفیظ نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا "اللہ اللہ، ایسے ایسے انسان بھی دنیا میں موجود ہیں"

عاشق حسین بٹالوی

تجلیات

گر نورِ محبت سے ہے روشن ترا سینہ
اے مردِ جواں بخت! ہے جینا ترا جینا

جس عرش پہ ہیں جلوۂ یزداں کی بہاریں
اخلاص و محبت ہے اسی عرش کا زینا

جو شام و سحر تیری ضیا سے رہے روشن
یارب مری قسمت میں ہو وہ دیدۂ بینا!

اک مستیٔ جاوید ہے جامِ مئے حق میں
گو تلخ تریں ہے مگر اے دل! یہی پینا!!

تسنیم سے بھی پاک ہے سورج سے بھی روشن
وہ رند کہ سرمست ہے بے ساغر و مینا

طوفاں میں بھی جو کھیلتا پھرتا ہو خوشی سے
ساحل پہ پہنچ کر ہی رہے گا وہ سفینہ

میں محفلِ ہستی میں ہوں اک شمعِ دل افروز
میں خاتمِ ہستی کا ہوں انمول نگینہ

جچتے نہیں یاقوت و گہر میری نظر میں
پنہاں ہے مرے دل میں محبت کا خزینہ

نزہت میں ہے فردوس کے پھولوں سے بھی بڑھ کر
وہ دل کہ اثرؔ جس میں عداوت ہے نہ کینہ

اثرؔ صہبائی

حضرت زکی بلگرامی بحیثیت مرثیہ گو

دنیائے شاعری کا یہ آفتاب جس کا نام محمد زکی اور تخلص زکی تھا ۱۳۰۸ھ میں اپنے پاک بلگرام پر طلوع ہوا۔ پانچ برس کی عمر تھی کہ رسم بسم اللہ ہوئی اور اردو فارسی کی تعلیم شروع ہوئے لگی۔ پندرہ برس کی عمر تھی کہ یہ ہونہار ہستی دریسیات سے فارغ ہو کر علم ادب کے بحر ناپیدا کنار کی شناوری کرنے لگی۔ خوش قسمتی سے تعلیم کی ابتدائی منزل میں ایسے استاد کی رہبری حاصل ہوئی جو ہمہ داں اور ہمہ گیر تھا جس کے یہاں دن رات شعر و شاعری کے چرچے رہا کرتے تھے یعنی مولوی کرم حسین بلگرامی جن کا تبحر علمی اہل خبر سے پوشیدہ نہیں۔ مرحوم بہت ہی قابل بزرگ تھے عربی، فارسی اور اردو علم ادب پر انہیں حیرت ناک عبور حاصل تھا۔ اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے مگر علم العروض کے بہت بڑے ماہر تھے اُن کی قابلیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر ایسا جما ہوا تھا کہ جب کوئی نازک مسئلہ درپیش ہوتا اور آپس کے بحث و مباحثے سے طے نہ ہو سکتا تو ان کی طرف رجوع کیا جاتا اور ان کا فیصلہ ناطق سمجھا جاتا۔ اسی وجہ سے دن رات ان کے یہاں شعرا اور ادبا کا مجمع رہتا تھا۔ معمول یہ تھا کہ سب لوگ جمع ہو جاتے طرح دی جاتی اور ہر شخص طبع آزمائی کرتا۔ مصرعوں پر مصرعے لگائے جاتے اور مولوی کرم حسین ان میں ترمیم و تنسیخ کرتے جاتے۔ اس طرح پر قریب قریب روزانہ ایک اچھا خاصہ مشاعرہ ہو جاتا تھا۔ یہ ادبی نیرنگیاں زکی مرحوم کی فطرت میں جذب ہونے لگیں۔ مشاعروں کی کثرت اور شعر و شاعری کے شیدائیوں کی صحبت نے ان کے دل میں بھی لیلائے سخن کی محبت کی تخم ریزی کی۔

ابتدائے شاعری دس گیارہ سال کی عمر ہی کیا ہے مگر اس کمسنی کے عالم میں بھی یہ شمع ادب چار طرف چھوٹ ڈالنے لگی۔ سلام کہنا۔ غزلیات کے مصرعوں پر رچستہ مصرعے لگانا ان کا معمولی کام تھا۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا ہے کہ سب سے پہلے آپ نے یہ شعر کہا تھا ؎

ہمیشہ باتوں ہی باتوں میں آکر چھیر جاتے ہو
بڑے بے درد ہو کھتے ہوئے دل کو کھاتے ہو

اسی زمانے کا ایک یہ بھی شعر ہے ؎

زکی میں جان دینے کے لئے اور کون آیا
کسی بے رحم کا جذب محبت کھینچ لایا ہے

زکی بلگرامی کا لکھنؤ میں ورود پندرہ سولہ برس کی عمر میں لکھنؤ میں گزر ہوا۔ اس وقت یہاں کے چمنستان شاعری پر بہار کا عالم تھا۔ عندلیبان خوش نوا انیس و دبیر کی زمزمہ سرائیوں سے یہاں کی زمین کا ذرہ ذرہ مست ہو رہا تھا۔ ارباب بہار ادب تو کچھ اس درجہ مست ہو گئے تھے کہ ان کے کان سوائے ان نغموں کے کسی نالہ خوش نوا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے لیکن گلستان بلگرام کے اس طوطی شیوا بیان (زکی) نے کچھ اس انداز سے اپنا نغمہ چھیڑا کہ فضائے ادب گونج اٹھی اور سیہ مستان ادب جھوم جھوم کر اس نغمۂ جانفزا کی طرف خود بخود کھنچنے لگے۔ بعض قواس درجہ سرشار ہوئے کہ انہیں اپنے جذبات پر قابو نہ رہا اور ان کے وہ خیالات جو دماغوں میں چکر لگا رہے تھے۔ زبان قلم سے نکل کر دامن کاغذ پر اس طرح گہر ریز ہوئے۔

زکی بلگرامی کے متعلق تذکرہ نویسوں کی رائے

(۱) "میر محمد زکی . . . سراپا ذہن و ذکا تھے، اسم با مسمّٰی تھے . . . بڑے مشاق، سلام اور مرثیہ کہنے میں طاق . . . قصیدہ۔ غزل اور اقسام کے شعر کم کہتے تھے مگر جب کہتے تھے تو ہم سخنوں سے کم نہ رہتے تھے۔

(انتخاب یادگار صفحہ ۱۱ مرتبہ امیر مینائی)

(۲) "ان حضرت نے مرثیہ گوئی میں بڑی مشق بہم پہنچائی تھی . . . . ہر چند کہ غزل، قصیدہ۔ رباعی سب قسم کی شاعری کرتے تھے لیکن اپنے ہم عصروں سے اس فن خاص میں سبقت لے گئے۔" (تذکرہ یادگار رعنیم ص ۲۹)

(۳) "سید محمد زکی . . . بڑے طباع اور قابل بزرگ تھے . . . مرثیہ اور قصیدہ کہنے میں اچھی مشق تھی۔" (خمخانۂ جاوید حصہ ۲ ص ۲۶۶ مولفہ لالہ سری رام)

مندرجۂ بالا اقوال پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ زکی مرحوم نے صنفِ مرثیہ میں بہ نسبت دیگر اصناف کے اپنی طبع رسا کی جولانیاں زیادہ دکھلائی ہیں مگر تعجب ہوتا ہے کہ جس صنف میں ان کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ اس میں بہت ہی تفحص کے بعد ہمیں صرف ۲۴ مرثیوں کا پتہ چل سکا

زکی مرحوم کا کلام انیس و دبیر سے کیوں کم ہے؟

اسا، میر صاحب اور مرزا صاحب کی طبع رسا کی جولانیاں صرف مرثیہ، سلام اور رباعی پر ختم ہو گئی تھیں۔ برخلاف اس کے زکی کل اصنافِ سخن پر برابر طبع آزمائی کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صنف (مرثیہ گوئی) میں ان کا کلام حضرات انیس و دبیر سے تعداد میں کم ہو گیا۔

(۲) چونکہ خلاقِ عالم نے ان کی طبیعت میں لاپروائی کا مادہ ودیعت فرمایا تھا اس لئے انہوں نے اپنا کلام جمع کرنے کی کوشش نہیں کی میری رائے کی تصدیق منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے اس قول سے ہوتی ہے۔ "ان کا کلام آزاد طبعی کی وجہ سے جمع نہ ہو سکا" اس آزاد طبعی کے باوجود بھی کچھ کلام جمع ہو گیا تھا مگر ان کے انتقال پر ان کے بڑے صاحبزادے محمد حسن صاحب نے وہ سب کلام نواب رام پور مرحوم و مغفور کے اتفاق و مصلحت کر ڈالا۔ نہیں معلوم اس بستے میں کتنے مرثیے تھے۔ برخلاف اس کے حضرات انیس و دبیر کا کلام اُن کے اعزا و احباب کی کوششوں سے جمع ہو نثار ہوا اور پھر مطبع نول کشور کی بدولت وہ سب طبع ہو کر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا

(۳) چونکہ زکی مرحوم صاحبِ تصنیف و تالیف تھے اس لئے ان کے وقت کا زیادہ حصہ تصنیف و تالیف کی نذر ہو جاتا تھا۔ برخلاف اس کے حضرات انیس و دبیر کو نشتر نگاری سے کوئی علاقہ نہ تھا اس لئے ان کی عمر کا تمام حصہ مرثیہ گوئی ہی میں صرف ہوا۔

تصنیفات زکی

(۱) کلبلد و دمنہ (نثر اردو) (۲) نل و دمن (نثر اردو) بطرز و جواب فسانۂ عجائب (جب علی بیگ سرور (۳) گل بکاؤلی (نثر اردو) (۴) داستان امیر حمزہ (نثر اردو) (۵) جلد (۶) تاریخ بلگرام (نثر اردو) (۶) تذکرۃ الشعرا (نثر اردو) (۷) تحقیقات زکی (لغت اردو) (۸) علم العروض والقوافی (۹) رسالہ تذکیر و تانیث (۱۰) علم اللسان (۱۱) مراثی زکی بلگرامی (۱۲)

دیوان زکی بلگرامی (غزلیات۔ قصائد۔ مثنویات۔ قطعات۔ تواریخ۔ سہرے۔ واسوخت وغیرہ وغیرہ) (۱۳) مثنوی بطرز و جواب گلزار نسیم۔

زکی مرحوم کی مرثیہ گوئی

لغت میں مرثیہ کے معنے ہیں "کسی کی مصیبت پر رحم کرنا" مگر شعرا کی اصطلاح میں مرثیہ اُس صنفِ نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کے حالات۔ اوصاف سخاوت شجاعت وغیرہ وغیرہ بیان کئے جائیں لیکن اردو شعرا نے اس صنف کو علی العموم شہدائے کربلا اور دیگر ائمہ معصومین کی شہادت کے بیان کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔

مرثیہ کی ابتدا

کہا جاتا ہے کہ اس کا وجود خلقتِ انسانی کے ساتھ ساتھ وجود میں آیا۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد دہلوی تحریر فرماتے ہیں۔ "روئے زمین پر پہلا غم ہابیل کا تھا کہ قابیل کے سبب سے حضرت آدم کے دل پر طاری ہوا اسے فیضِ جوشِ غم کا کہنا چاہئے کہ باوجودیکہ اس وقت شعر و شاعری کا نام نہ تھا مگر جوشِ طبیعت سے جو کچھ کلام اس وقت ان کی زبان سے نکلا موزوں تھا۔ چنانچہ وہ سریانی میں اب تک موجود ہے"۔ امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

ماہم در اصل شاعر زادہ ایم — دل با ہیں محنت نہ از خود دادہ ایم

مرزا صائب کہتے ہیں ؎

آنکہ اول شرگفت آدم صفی اللہ بود — طبع موزوں حجتِ فرزندیِ آدم بود

اردو مرثیہ گوئی کی ابتدا

اردو شاعری کا سرچشمہ دکن ہے اور یہ اسی کی فیاضیوں کا نتیجہ ہے کہ اردو شاعری آج بامِ ترقی پر جلوہ افروز ہے۔ شاہانِ گولکنڈہ اور بیجاپور خود بھی شاعر تھے اور شعرا کے قدر داں بھی تھے اور چونکہ یہ مذہب امامیہ رکھتے تھے لہذا تحصیلِ ثواب کی غرض سے خود بھی مرثیہ کہتے تھے اور لوگوں کو مرثیہ کہنے کی ہدایت کرتے تھے۔ مگر اس زمانے کے مرثیے بالکل ابتدائی حالت میں تھے اس وقت اس کا یہ انداز تھا کہ غزل کی طرح متفرق اشعار میں درد انگیز داستان دہرائی جاتی تھی۔ دو چار مثالیں ملاحظہ ہوں

سلطان قلی قطب شاہ التخلص بہ معانی ؎

اک پوت کو دے زہر دوسرے پہ پھینچے خنجر — کافر کنے کیسے تہر بزور ظلم کاری ہے

ہاشم علی التخلص بہ ہاشم

زہر دے مارے حسن کوں کہ یسیں — سنبرق و چہرۂ گل فام کا

نوٹ اگرچہ ابتدا میں کچھ غزلیں میر صاحب نے بھی کہی تھیں مگر وہ قدما میں اس قدر کم کہ نہ ہونے کے برابر ہیں سلسلۂ انتخاب یادگار ص۱۱ میں دیکھو نظم آزاد و مصحفی آزاد دہلوی نظم اور کلام ہونے کے باعث ہیں۔

خیالات" تقریر جلسہ سفقہ ۱۵ اگست ۱۹۳۶ء مرتبہ۔

کربلا میں تھا حسین ابن علی آج ہیں نیزے کے اک جام کا
ماتم آل نبی ہاشم علی آج لگ جیتا انہیں ایام کا

کا قطعہ ؎

اے نابکارانِ دین کا پتھر گرانا کہاں روا
سرورِ نبی کی آل کا دکھ میں لیانا کہاں روا

مرزا گل احسین گدا ؎

جب آکر بلا میں وہ گردش کی ماری ؛ ہوا فاطمہ کی علی کی پیاری
گئوا بادشاہی لٹا شہریاری ؛ چلی شام میں قید ہونے سواری

اس کے بعد شعرا دہلی کی تنزلی کا دور شروع ہوا ان لوگوں نے مرثیہ میں بہت دلچسپی لی چنانچہ میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں اور میر حسن دہلوی نے تذکرۃ الشعرا میں بہت سے مرثیہ گو شعرا کا ذکر کیا ہے جن میں میر آقائی۔ میر عاقل علی۔ میر آل علی۔ درخشاں۔ سکندر۔ قادر۔ کمان۔ ندیم وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مرثیہ گو تھے جن کے کلام کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

عالم شاہ محزوں دہلوی۔ لکھنؤ میں رہتے تھے ؎

باز اکبر کو کہیں اے جانِ افسوس ؛ تیری صورت کو کہوں یا کہ جوانی افسوس
ہائے گیا خاک میں تو حیف جوانی افسوس ؛ ہائے اعدا نے تری قدر نہ جانی افسوس

جعفر علی۔ آپ کا کوئی تخلص نہ تھا بلکہ پورا نام لکھتے تھے ؎

جب سر کو پٹک روتی تھی یہ زار سکینہ ؛ ہاں رو رو کے کہتی تھی میں قربان سکینہ
بابا ترا آتا ہے مری جان سکینہ ؛ کیوں رو رو کے تو ہوتی ہے نڈھال سکینہ

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ مطلع میں چار مصرعے ایک قافیہ میں اس کے بعد نیچ کا ایک شعر اور پھر تین مصرعے ایک نئے قافیے میں اور پوتھے مصرعے میں مطلع کا قافیہ ہوتا اور پھر نیچ کا ایک شعر ہوتا تھا ؎

جب وداع ہونے لگی وہ بیسویں رات ؛ شہ نے بعد از نوافل و رکعات
تسبیح اور پھیرا جلدی سات ؛ کہا کہ اے دست و دل کر اہتمام

ہر ہم از عمری رود نغمے چوں نگہ می کنم نماند بے
جاگتے جاگتے وہ ساری رین ؛ کی پرستش خدا کی بار سرو میں
کہا آنکھوں نے تک تو کے حسین ؛ کہا کیا سروں اب گزرتی رات

خواب نوشین بادہ و نیسل باز وارد پیادہ راز سبیل

اس طرز کو سید انشا کے زمانے تک لوگ نظم و سخدان سے دیکھا کئے مگر رزا علی ندیم نے اس طرز کو اور ساتھ ہی ساتھ دیگر خامیوں کو مرثیے سے الگ کر دیا۔ آخر کار موجودہ مرثیہ گوئی کا انداز قایم ہوا اور مرثیے مسدس کہے جانے لگے۔

سب سے پہلے جس نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر مرزا دبیر کے اُستاد ہیں۔ میر ضمیر کے مرثیے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں میر ضمیر اور میر خلیق کے بعد ہی انیس و دبیر کا مبارک زمانہ آگیا اس زمانہ میں مرثیہ کے پیکر بیجان میں روح حیات پھونک دی گئی سان بزرگوں سے بیشتر ہی مرثیہ مسدس کی شکل میں منتقل ہو چکا تھا لہٰذا اس کی شکل میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہاں البتہ ان دونوں نے جو کچھ خلیق و ضمیر سے پایا تھا اُسے معراج کمال پر پہنچا دیا۔

زکی بلگرامی کا عہدِ شاعری

زکی مرحوم کی مرثیہ گوئی کی ابتدا کا زمانہ لکھنؤ کا وہ مبارک عہد تھا جس وقت وہاں کی شاعری کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ انیس سا بلبل ہزار داستان چہک رہا تھا اور دبیر سا طوطی خوش بیان زمزمہ پرداز تھا انہیں آفتاب و ماہتاب کی بدولت مرثیہ معراج کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ لکھنؤ والوں کے کانوں میں یہی دو فتے گونج رہے تھے لہٰذا یہ بات مشکل تھی کہ غیر کی وہاں تک رسائی ہو سکے اور پھر وہ ان دیوؤں کے مقابلے میں غلیلیں پڑھے اور برابر داد سخن لے کر منبر سے اترے۔ لیکن زکی ہی کی ایک ایسی ذات تھی جس نے برق سخن کی ضیا پاشیوں سے ان ہر دو ماہ رانیس و دبیر کی آنکھوں کو جھپکا دیا۔ چونکہ انیس و دبیر کی طرز شاعری کی علمداری تمام لکھنؤ پر قایم ہو گئی تھی لہٰذا اس زمانے کے مرثیہ گو شعرا کو سوائے ان حضرات کی سکھائی ہوئی چالیں چلنے کے اور کچھ نہ آتا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت زکی مرحوم کا ضمیر بزرگوار کے آب و گل سے بنا تھا اور ان کے دل میں اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح خود داری کا جذبہ جوش زن تھا اس لئے وہ حضرات انیس و دبیر کے نقش قدم پر سجدے کرنے کو اپنا ننگ سمجھتے تھے۔ وہ میر صاحب اور مرزا صاحب سے برابری کا دعوے رکھتے تھے ان کے مقابلے میں مرثیے کہتے اور مغارت کے پہلو نظر انداز نہ کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو ؎

ہیں نظم ہو چکے یہ مضامین پیش ازیں	ممکن نہیں نظیر یہ کہتے ہیں ہمنشیں
بجھیں بحیثم و فرحسن فہم و ہمت ہیں	یہ صورت دوم ہے وہ تھا نظم اطلس

پیدا ہوا آئینہ میں جو شکل آفتاب کی۔
تصویر بول اُٹھے ابھی حاضر جواب کی

شاعرانہ تعلی اور مصرعوں پر چشمک زنی

اعجاز سے کلام فصاحت نشاں مرا — کلکِ پر صریر سخنورِ شیریں زباں مرا
کیا منہ کہ عندلیب کرے امتحاں مرا — دم بند ہو گئے جو یہ رنگیں بیاں مرا

ہوا اور ہی بہار جو ظاہر یہ عید ہو
یوں رنگ لائے کہ رنگ محرم کا سفید ہو

چشمک

نگہانگ ہے جہاں میں ہر کلک کی صریر — تحریر میں یہ طرز نہ پیدا ہے بے نظیر
ماتا نہیں انیس نہ موجود ہیں دبیر — یہ قدرت خدا کی ہے نہ کریں شک ہم صغیر

باتیں وہی ہیں اور وہی اردو زبان ہے
لیکن یہ رنگ اس کی کریمی کی شان ہے

مداح امام ابن امام آیا ہے — شیدائے شہ عرش مقام آیا ہے
آنکھیں مہ و مہر کی جھپکتی ہیں کہ کیا — کیا ذرۂ خاک بلگرام آیا ہے

ظاہر ہے کہ اس وقت حضرت انیس و دبیر لکھنؤ کیا ہندوستان کے سپہر شاعری کے آفتاب و ماہتاب تھے اور لوگ انہیں آفتاب و مہتاب کے روشن نام سے موسوم بھی کرتے تھے۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مہ و مہر سے مراد انیس و دبیر ہیں اور اس طرح زکی مرحوم نے ان پر چشمک کی ہے

کلام زکی

اب میں حضرت زکی مرحوم کے مرثیوں کا انتخاب مولوی شبلی مرحوم کی قائم کردہ سرخیوں کی تحت میں درج کرتا ہوں تاکہ ناظرین کرام اندازہ کر سکیں کہ زکی مرحوم کی یہ شاعرانہ تعلیاں اور چشمکیں کہاں تک راستی پر مبنی ہیں۔

فصاحت

علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ (۱) لفظ میں جو حروف آئیں اُن میں تنافر نہ ہو۔ الفاظ نامانوس نہ ہوں قواعد صرفی کے خلاف نہ ہوں (۲) الفاظ سادگی، آسانی، کثرتِ استعمال کے ساتھ ہی مبتذل اور معمولی بھی نہ ہوں۔ جب ایسے الفاظ جامیں جو سادہ، آسان، کثرتِ استعمال اور غیر مبتذل ہوں تو یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئیں اُن کی مناسبت، ہیئت نشست، نرمی اور گرانی کے ساتھ اُن میں خاص تناسب و توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی جب کسی مصرعے یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب و توازن تو افق پایا جاتا ہے، اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہا جاتا ہے اور یہی چیز ہے جس کو بندش کی صفائی، نشست کی خوبی، ترکیب کی دلآویزی، برجستگی، اسلاست، اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں"

مندرجہ بالا کلیہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت زکی مرحوم کے مندرجہ ذیل چند بند ملاحظہ ہوں۔

ہیبت

بپھرے یہ صدا آتی ہے ہلتے ہیں جو کہسار — ہے وقت اذا زلزلت الارض خبردار
شدت پہ ہے تہر و غضب ایزدِ قہار — موت آئی اس پہ کہ جو ہیں گے کہ جو ہیں گے کفار

لشکر شکن و صفدر و بیجا یہ ولی ہے
ہاں آمدِ غرام نیستان علی ہے

ہچل سے ہوئی فوج مخالف تہ و بالا — صف پر جو گری صف تو رسالہ پہ رسالہ
ہستی کا کیا موت نے قسمت نے حوالا — تقدیر کی گردش نے غضب پیچ میں ڈالا

آئے جو نظر یک بیک آثار غضب کے
دم بند ہوئے خوف سے ہوش اڑ گئے سب کے

سراپا جناب قاسم

صل علیٰ وہ طلعتِ زیبا وہ شانِ حسن — صدقے ہوئے نثار ہوئے قدر دانِ حسن
قامت کے راستے نے دکھائے نشانِ حسن — پرتو سے سطح خاک بنا آسمانِ حسن

ذروں میں جان پڑ گئی چہرے کے نور سے
حوریں بلائیں لینے لگیں رخ کی دور سے

چمکا رخ صبیح کا آئینہ جمال — نکھی قلم نے زلف کی تقسیم خط و خال
آنکھوں کے سامنے نظر ہو گئے غزال — پلکیں زبان بن گئیں ہنگام قیل و قال

رتبہ گھٹا جبیں سے مہ با کمال کا
خجلی بھوؤں نے رنگ مٹایا ہلال کا

بینی سے وجہ آئینہ بینی ہوئی عیاں — سبزے سے خط کے زرد ہوا سبزۂ بناں
قائل ہوئے دہن کے سخن فہم و نکتہ داں — گھبرا کے کہیں لب نہ لگیں نے شیخاں

دانتوں نے تارے ہو کے خجل ڈوبنے لگے
چاہِ ذقن کی چاہ میں دل ڈوبنے لگے

مناجات امام

دستِ دعا بلند کئے سوئے آسماں — کی عرض رو کے درگہِ حق میں بصد فغاں

ملہ تو ازندہ انیس و دبیر" مولفہ مولوی شبلی نعمانی۔

کس منہ سے ہو سکے ترے الطاف کا بیان بندوں پہ ہیں سوا ترے بندہ نوازیاں
حقا دلیل رابطہ جسم و جاں ہے تو
مخلوق سب ہیں خالق کون و مکاں ہے تو

تو رہنمائے خضر ہے ظلمت کی راہ میں یعقوب کا نبی ہے فریاد و آہ میں
رکھا ترے پناہ نے سر دھنپاہ میں یونس کو بطن حوت میں یوسف کو چاہ میں
آدم کو در دہجر سے درمان جاں ملی
عیسیٰ کو دار پر رہ دارالاماں ملی

ہے گو کہ دل پہ چار طرف ہجوم غم بھرتا ہوں دم مگر تری الفت کا دم بہ دم
بیٹے کا رنج ہے نہ برادر کا ہے الم لشکر کا شوق نے ہوس رأت و علم
اندیشہ قضا ہے نہ مطلب حیات سے
بندے کو مدعا ہے فقط تیری ذات سے

وقت سفر قریب ہے زاد سفر نہیں آساں گذر رہا جس سے یہ رہ گذر نہیں
ہمدم نہیں رفیق نہیں راہبر نہیں کیا راہ میں گزرتی ہے اس کا خبر نہیں
درپیش تن سے روح کو راہ شباب ہے
نے قدرت قیام نہ رحلت کی تاب ہے

گو عجلوا کا غل ہے شعور الرحیل ساماں کثیر چاہئے فرصت بہت قلیل
خاطر ہو مطمئن نہیں ایسی کوئی سبیل اے کردگار بندۂ عاجز کا ہو کفیل
ہاتف سنا رہا ہے پیام انتقال کا
ہو خاتمہ بخیر محمد کی آل کا

جی چاہتا ہے وعدۂ طفلی وفا کروں قربان تجھ پہ جان کروں سرفدا کروں
اظہار بندگی تہ تیغ جفا کروں وقت قضا بھی شکر کا سجدہ ادا کروں
بچپن سے دل کو فکر ہے امت کے دین کی
اللہ تیرے ہاتھ ہے عزت حسین کی

پھولوں سے نخل شاہد گل پیرہن بنے کانٹے زبان بن گئے غنچے دہن بنے

تھرائے آفتاب قیامت جلال وہ یوسف نے خواب میں بھی نہ دیکھا جمال وہ

طلعت میں حرف حرف سر باکمال ہے دیکھو یہ وصف قاسم وسیم جمال ہے

ملقبہ مونس و دبیر مولفہ سید علی بلگرامی نجفی۔

صندل کے بدلے خاک کا چھپا قبول ہے یا چھلسد عارو ہم کو رتا یا قبول ہے

دیتے ہیں اہلبیت دعائی رسول کی میدان میں لٹ رہی ہے کمائی تبول کی

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا

"ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اصلی اجزاء کی جو اصلی ترتیب ہے وہ قایم رہے مثلاً فاعل، مفعول، مبتدا، خبر، متعلقات فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں، یہی ترتیب شعر میں بھی قایم رہے . . . نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے"۔ بطور نمونہ حضرت زکی کے کلام سے ایک بند ملاحظہ ہو۔

جاتے تو ہو مگر مجھے بیوہ بناتے جاؤ کیا گزرے گی نباہ کی صورت کوئی بتاؤ
صاحب تم اپنے ہاتھ سے تھپ چوڑیاں بڑھاؤ کہہ دو پھپھی سے یہ اسے رنڈسالا نہ بنائیں

جن سے سہاگ تھا وہ چلے منہ کو موڑ کے
گہنا اتاریں پھینک دیں پہرے کو توڑ کے

روزمرہ اور محاورہ

بہتیرا کہہ دو آئیں جو ہے نیگ کی طلب کھلا رہا ہے دھوپ کے مارے یہ غنچہ لب
رخصت کریں عروس کو حضرت نہیں سبب چڑھتی ہے دھوپ دیر نا مناسب ہیں اب
رسموں کا دھیان ہے نہ دھن کا خیال ہے
گرمی ستم کی ہے مرا بچہ نڈھال ہے

فرقت کا غم ہے سرور عالم پناہ کو سدھ تے گئی سلام کرو اٹھ کے شاہ کو

فریاد اجاگر کری تقدیر سو گئی بیٹا میں پال پوس کے بے آب کر گئی

میں جانتی تھی چین طلال ٹھہر گئے لو اب کھلا کہ جان سے دونوں گزر گئے

مناسبت الفاظ

یعنی مضامین کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال کرنا۔

رزمیہ بند میں فخر کے پہلو اس طرح دکھائے جاتے ہیں ؎

کانپے فلک دکھاؤں اگر قوت شباب الٹوں جما ستیں تو ہو دنیا کا انقلاب

اس ضرب شرکن کی نہیں کانوں کو تاب — سن تھا ہی چڑھے تھے جو خیبر پہ بوتراب
دادا کا نام نام خدائے قدیر ہے
ان انگلیوں میں زور رشتہ قلعہ گیر ہے

اگر کسی جری بہادر کا سراپا کھینچنا منظور ہے تو اس کا یہ انداز ہے ؎

الحق کہ خداداد ہے یہ دبدبہ وجاہ — یہ لفظ نہ وسطوت وصولت ہے من اللہ
دیکھے جو یہ تیور تو بنے شیر بھی روباہ — نزدیک ہے یہ کوہ اڑیں شل پر کاہ
اقبال سلیماں ہے بہادر کے جلو میں
ہے باد صبا لشکر سبا کے تگ و دو میں

دیگر رزمیہ اشعار کی شان و شوکت ملاحظہ ہو ؎

تھا شور ہل رہے ہیں طبق رزم گاہ کے — بپھرے ہوئے ہیں شیر حسینی سپاہ کے

منہ شیر خشمناک کا ہے سوئے رزمگاہ — ابرو پہ بل، جبیں شکن قہر کی نگاہ

دیکھو جس طرح ایک بہادر اور پُر ہیبت شخص بحالت غیظ و غضب کسی شخص کو مرعوب بنا دیتا ہے اسی طرح ان پُر زور الفاظ کے صورت و لہجہ سے شوکت و جلال کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے"۔

بلاغت "بلاغت کلام یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق اور استعارات باترائن کنایات بلیغ تشبیہات نادرہ غیر مبتذلہ سے آراستہ ہو۔ بشروط فصاحت کیونکہ فصاحت بلاغت کا ایک جزو ہے۔ پس فصاحت کا تعلق الفاظ باعتبار سے ہے اور اس میں الفاظ اور بندش الفاظ کے حسن و قبح سے بحث ہوتی ہے"۔ اور بلاغت کا اصلی تعلق معانی الفاظ سے ہے یعنی اس میں خوبی و فصاحت کی نوعیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے"۔

"بلاغت کا کمال یہ ہے کہ واقعات کربلا کو جو مرثیہ گویوں کا موضوع شاعری ہے اس طرح بیان کیا جائے کہ بالکل مقتضائے حال کے موافق ہو اور واقعہ کی صورت آنکھوں میں پھر جائے (۲) حریفوں کی لڑائی میں یہ واقعات بیان کئے جائیں۔ دونوں کے سراپا۔ ڈیل ڈول۔ اسلحۂ جنگ کے سچے کا نقشہ دونوں نے فن جنگ میں کیا کیا ہنر دکھائے وغیرہ وغیرہ (۳) واقعات کے بیان میں جس رتبہ اور درجہ، اور جس سن و سال کے لوگوں کا ذکر آئے اسی

قسم کے طرز خیال اور طریق ادا کو نگاہ رکھا جائے۔ بوڑھے۔ بچے۔ جوان۔ مرد عورت۔ کنیز۔ بیوہ ماتا۔ غلام۔ نوکر چاکر۔ غرض جس کی زبان سے جو خیال ظاہر کیا جائے اس کی زبان اور طرز خیال کی تمام خصوصیتوں کو قایم رکھا جائے"۔

سراپا حضرت قاسم ابن امام حسن علیہ السلام کا سراپا ؎

سیادت کا سر ہے یہ زلف مسلسل — صحیفہ ہے رخ کتابی یہ جدول
یہ دیوان قدرت کی ہے نظم اول — کھلی اس سے شان کتاب سنزل
بڑھا حسن رخسار حسن قسم سے
کھچا ہے یہ نقشہ اسی موقلم سے

کدھر ہیں سرو خوریہ رخسار دیکھیں — فرشتے یہ روئے ضیا بار دیکھیں
کلیم خدا کشف اسرار دیکھیں — نہوں غش بخلی انوار دیکھیں
انھا پردہ راز دینہ دار آئیں
زیارت کو مشتاق دیدار آئیں

رگیں ہیں جو نازک گلے کی ہویدا — ہیں آثار صبح شہادت کے پیدا
کریں شور مستانہ پھیلا سپیدا — صبا ہی کے طالب صباحت کے شیدا
ہوا خوش ہے کشت تمنا ہری ہے
مے خلد سے یہ صراحی بھری ہے

اب فوج کفار کے پہلوانوں کا سراپا ملاحظہ ہو۔ یہ حضرت عون و محمد علیہم السلام کے مقابلے کے لئے چار کافر نکلتے ہیں۔

رخ کفر تھے رہبانی کے شایاں — وہ پیشانیاں تنگ تھیں جن پہ زناں
ان آنکھوں سے تھے چار چشمے نمایاں — وہ شیطاں تھے ہم چشم غول بیاباں
بھویں نون ناقص تھیں لکھیں الف تھیں
نگاہیں خود اس رمز کی معترف تھیں

نہایت تھی مکروہ بینی بریدہ — کہ تھی خط بینی نشان ندیدہ
فلاکت زدہ تھے وہ آفت رسیدہ — دریدہ دہن بدنہاں لب گزیدہ
غم خلعتی دفتہ مشکل تھی ان کو
ذقن کی گھڑی چاہ بابل تھی ان کو

گلوں کی گریباں کہ زنار گردن — بتوں کے تھے بندے وہ خود پرفن
دلوں میں جو تھی آگ پیتے تھے گانھن — کہ کافر یہ ایما عدم ہیں یہ دشمن

۱؎ الیزان مولانا سید نظیر حسن صاحب فوق ص۱۰۵ ۲؎ دیکھو "الیزان" مولفہ مولوی نظیر حسن صاحب فوق ص۱۰۵ ۳؎ دیکھو "موازنہ انیس و دبیر" مولفہ مولوی مسلم الغنی۔

زمانے کی گردش سے محرم تھے
نہ تھے حلقۂ ناف گرداب غم تھے

حضرت قاسم علیہ السلام اپنی ایک رات کی بیاہی دلہن سے رخصت لے کر میدان میں جانا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں روکنا چاہتی ہیں مگر خوبسبب حجاب کے کچھ کہہ نہیں سکتیں اپنی کم سن بہن حضرت سکینہ علیہ السلام سے کہتی ہیں کہ تم انہیں روکو۔ دشمن کا پانی بہن کو سمجھانا پھر حضرت سکینہ کا اقرار کرنا کہ میں انہیں نہ جانے دوں گی اس کے بعد اُن کا حضرت قاسم علیہ السلام کو روکنا۔

مجھ بدنصیب کو تو ہے بی بی ابھی حجاب — یہ منتظر جواب کے ہیں کون دے جواب
در پردہ رو رہے ہیں لہو دیدۂ پُرآب — ہے ہے کسے دکھاؤں محمدؐ پہ اضطراب
سب گھر کو روتا بھائی تمہارے رلائیں گے
گر ضد کرو گی تم تو یہ مرنے نہ جائیں گے

بولی سکینہ خوب بھلا جائیں تو سہی — میں خاک پر چل کے قیامت دل ابھی
روئے ہیں آپ ہی آپ کسی کا تو کچھ نہیں — لے لو یہ جا رہے پریشاں ہیں سب جبھی
جاتے تو ہیں حضور سے رخصت بھی پائی ہو
اچھا میں پوچھتی ہوں یہ کیا دل میں آئی ہے

آئی قریب قاسم نوشاہ وہ خرد سال — گویا ہوئی یہ مقام کے دامن بصد ملال
کھلتا نہیں کچھ آپ کی آزردگی کا حال — میں بھی سنوں دھن سے ہے کس بات کا ملال
ناحق نہ بات بات پہ تکرار کیجئے
منظور کیا ہے آنکھ ذرا چار کیجئے

بھیا مری بہن کو رلاتے ہو واہ وا — بھیا نہ دل دکھاؤ کرو رحم کی نگاہ
بھیا غضب کی جا ہے بھرا گھر ہوا تباہ — بھیا کہیں گے سب کہ مبارک ہوا نہ بیاہ
آیا یہ کیا خیال کہ کس کر کمر چلے
جنگل میں ہم کو چھوڑ کے بھیا کدھر چلے

میدان کربلا میں امام حسینؑ کے خیمے دریا کے کنارے برپا ہو رہے تھے کہ فوج شام آکر نامزد ہوئی اس پر نامور امام علیہ السلام کو جلال آیا اور حضرت عباس نے تھوڑا علم کی۔ اس شور و غل کی آواز سن کر عورتیں پریشان ہوگئیں۔ حضرت زینب کی زبان سے اضطراب کی حالت میں جو الفاظ نکلے وہ اس طرح حوالۂ قلم کئے ہیں ؎

گھر کے اٹھ کھڑے ہوئے سلطانِ خوش خصال — بیتاب محملوں میں ہوئی فاطمہ کی آل
چلائی رو کے زینب ناشاد خستہ حال — کیسا یہ غل ہے خیر تو ہے اے علی کے لال
سنتی ہوں میں فساد پہ دشمن تلے ہوئے
تیغیں کھنچی ہوئی ہیں علم میں کھلے ہوئے

فریاد ہمارے بگڑے ہیں اہل کیں — عباس سے ہوئی ہے یہ بیحد شے اے معین
لٹتے ہیں مجھ کو ہول سدھارو نہ تم کہیں — بھیا بلا لو ابن ید اللہ کو یہیں
ہے فوج شام درپے آزار کس لئے
جمعت یہ کس لئے ہے یہ لشکر کس لئے

ہے ہے کہاں ہیں عون و محمد وہ جلد جائیں — عباس نوجوان کو مرے پاس جلد لائیں
غصہ کی یہ جگہ نہیں ہرگز نہ طیش کھائیں — تکرار کیا ضرور ترائی سے ہاتھ اٹھائیں
اب تیغ تیز نہر کی ایک ایک لہر ہے
بن جائے جس سے جان یہ پانی وہ نہر ہے

تشبیہ حضرت شہر بانو کے دل میں جلوہ ایمان کا پرتو جھلکنے لگا ہے مگر ابھی وہ گھر ستان ایمان میں ہیں۔

نفی اس صنم کدہ میں وہ حق فہم و حق نگر — یاد یہیں مرقع مریم تھا جلوہ گر
گویا حجاب شب میں نہاں تھا ضیائے سحر — خورشید تھا غبار میں اور ابر میں قمر
خلعت تھی آب شور میں دُرِ خوش آب کی
ماہین خار زار کلی تھی گلاب کی

یوں ہے قدم رکاب ظفر انتساب میں — جیسے شعاعِ مہر ہیں آفتاب میں

دیکھی نہیں یہ شوکتِ کنعاں نے خواب میں — ملے ہیں چاند ہے کہ قدم ہر رکاب میں

صنائع و بدائع زکی مرحوم کی ابتدائے شاعری کے وقت لکھنؤ کے شعراء حایات لفظی اور صنائع و بدائع کے بہت دلدادہ تھے۔ شعر کو حقیقت سے کام نہ تھا معنویت سے تعلق نہ تھا۔ جذباتِ باطنی مفقود و واردات قلبی ناپید ہو چکے تھے۔

اسی لئے ان کے کلام میں بھی یہ رنگ نظر آتا ہے مگر انہوں نے رعایت لفظی کے چکر میں پڑ کے شعر کی لطافت کو دھبا نہ لگنے دیا۔ ان کے یہاں جو صنائع و بدائع نظر آتے ہیں وہ مثل الطعام کا مزہ دیتے ہیں۔

صنعت ایہام یعنی ایک لفظ کے دو معنی ہوں ایک معنی مراد ہوں اور دوسرے معنی اگرچہ مراد نہ ہوں لیکن مقدم و موخر الفاظ سے ان کو مناسبت ہو

طالب تھا آبرو کا جو اُس بادشاہ سے — دریا بھی اس ہوا میں بڑھا لاکھ چاہ سے
دل ہو گئے دو نیم جگر چاک ہو گئے — سایہ بھی اس کا حق پہ پڑا خاک ہو گئے

مبالغہ | جناب امام حسین کربلا میں اترتے ہیں اور سیر کرتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچے ؎

الیاس حضرتے بہ کہا بڑھ کے ناگہاں — ہشیار اے فرات کہ آئے شہ زماں
یہ سنتے ہی حباب ہوئے سر کے بل رواں — ساحل ہوا کے لگ گئیں موجوں کی پشتیاں

طالب تھا آبرو کا جو اس بادشاہ سے
دریا بھی اس ہوا میں بڑھا لاکھ چاہ سے

شاعر کے نزدیک یہ باتیں خلافِ عقل نہیں ہیں کیونکہ وہ امام حسین کو اپنے رسول کا جانشین اور صاحبِ اعجاز مانتا ہے۔ ان کے معجزات کو دیکھتے ہوئے ان باتوں کا وقوع پذیر ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

حسنِ تعلیل | اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے واسطے کسی شے کو علت فرض کریں جو درحقیقت میں اُس کی علت نہ ہو۔

جناب عباس نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈالا۔ گھوڑے کے سموں کے وزن سے دریا کے پانی کو جنبش ہوئی۔ موجیں اٹھیں اور حباب اُبھرنے کے لگے۔ گر شاعر کے نزدیک اُن کی علت یہ ہے کہ جناب عباس کے حُسن کے پرتو کے پانی پر پڑنے کی وجہ سے اس میں تلاطم برپا ہوا اور یہ موجیں گھوڑوں کے سموں کے وزن سے نہیں اُٹھ رہی ہیں بلکہ پانی شوقِ لقائے جناب عباس میں بے تاب ہو رہا ہے اور حباب اُن کی زیارت کے لئے اُبھر رہے ہیں ؎

دیکھا جو حُسنِ طلعتِ دلبند نورِ آب — سیماب کی طرح متلاطم ہوا وہ آب
گویا دلیلِ شوق تھا موجوں کا اضطراب — پیہم اُبھر اُبھر کے لگے دیکھنے حباب

چاہا کہ دستِ بیعِ ہو خالق کے نور سے
پھیلائے ہاتھ پنجۂ مرجاں نے دور سے

صنعتِ طباق | یعنی دو متضاد یا متقابل چیزوں کا جمع کرنا ؎

ع - آنکھیں ہوئیں جو بند تو راز نہاں کھلا
ع کھولی جو چشمِ شوق بندھا آنسوؤں کا تار
ع اب شربتِ حیات مرے حق میں زہر ہے
ع یکساں ہیں ہم صبح وطن اور سفر کی شام
ع - بازارِ گرمِ موت کا دل زندگی سے سرد

مراعات النظیر | یعنی الفاظ کی رعایت۔ اس صنعت میں کئی چیزیں تناسب غیر متضاد ایک کلام میں مذکور ہوتی ہیں مثلاً ذوق۔

خط بڑھا عذر لیں بڑھیں کاکل — بنے گیسو بڑھے
حُسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

خط۔ زلف۔ کاکل۔ گیسو باہم متناسب ہیں لیکن اگر کسی سادہ طریقے پر اس صنعت کو برتا جائے تو کچھ قابلِ تعریف بات نہیں، البتہ شاعر کی جولانی فکر کا نمونہ اور قابلِ تعریف و پر لطف اس کی وہ قسم ہے جس کو ایہام التناسب کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مثلاً دو معنی جمع کریں جن کو آپس میں کچھ مناسبت نہ ہو مگر ان معنوں کو جن دو لفظوں سے تعبیر کریں اُن میں ایک لفظ کے دو معنی ہوں اور معنی دوم جو غیر مقصود ہوں ان کو پہلے لفظ سے مناسبت ہو ؎

سیادت کا سہرا ہے یہ زلفِ مسلسل — صحیفہ ہے روئے کتابی یہ جدول
یہ دیوانِ قدرت کی ہے نظمِ اول — کھلی اس سے شانِ کتابِ منزل

بڑھا حُسنِ رخسار حُسنِ رقم سے
کھنچا ہے یہ نقشہ اسی قلم سے

یہ نورِ نظر ہیں جو مردم کو پیارے — بٹھایا ہے آنکھوں پہ الفت کے مارے

ع وہ ذرہ چمک کے مہر ہو وہ آفتاب دے
ع آندھی کی خاک قدر ہے باندھا کے ہوا

صنعتِ معاد | یہ صنعت رد العجز علی الصدر کے قبیل سے ہے، اس میں وہ الفاظ جو مصرعِ اول کے آخر میں ہوتے ہیں اُن کو مصرعِ دوم کے اول میں لاتے ہیں اور جو مصرعِ دوم کے آخر میں ہوتے ہیں ان کو مصرعِ سوم کے اول میں لاتے ہیں وعلیٰ ہذا القیاس۔

عدد نار سا تھے یہ بجلی رسا تھی — رسا تھی کہ فصلِ خزاں کی ہوا تھی
ہوا تھی کہ جانوں کی خاطر بلا تھی — بلا تھی کہ یہ ناگہانی قضا تھی

قضا تھی ٹھہرنے کی جس کو قسم تھی
قسم تھی اسی وجہ سے تیز دم تھی

سلسلۂ البیان: مولانا سید علی نقی صاحب نقی دام ظلہ
سلسلۂ البیان: نصیر الحسن نوری

صنعت تنسیق الصفات ایک موصوف کے لئے متواتر کئی اوصاف کا ذکر کرنا۔

حضرت زینب علیہ السلام کے صاحبزادوں کی مدح سے

ذی تمکنت، متین، ہنرمند، ارجمند — حق فہم، حق نیوش، حق اندیش، حق پسند
مانند جد شجاع، و سرفراز، سربلند — نانا کی طرح قاتل عزت وہ دیوبند

انسانی جذبات یا احساسات چونکہ شعر کا کمال وصف جذبات انسانی کو برانگیختہ کرنا ہے یعنی اس کو سن کر دل میں رنج، یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے اس لئے اصلی شاعری، دلی جذبات اور خیالات کے ہو بہو اور صحیح صحیح نقشہ اتارنے کو کہتے ہیں۔ "یہ نقشہ جس قدر اصل کے مطابق ہوگا اسی قدر موثر و دلنشین ہوگا" ایسے مضامین کے ادا کرنے میں حضرت زکی مرحوم نے جو کمالات دکھائے ہیں وہ مندرجہ ذیل انتخاب سے نظروں کے سامنے آجائیں گے۔

جناب عباس میدان جنگ میں پہنچ گئے ہیں اُن کے غم میں امام حسین کی بے تابی سے

بیٹھے ہیں خاک پر شہ بیکس بھائے سر — تھامے ہیں ایک ہاتھ سے دل ایک سے جگر
چہرہ ہے زرد، دیدۂ پُرخوں سے تر بتر — رہ رہ کے دیکھتے ہیں بحسرت اِدھر اُدھر
ٹکڑے جگر ہے چاک دل ناصبور ہے
اُس گل کو ڈھونڈھتے ہیں جو آنکھوں سے دور ہے

شکل نبی کو دیکھ کے کرتے ہیں یہ بیاں — آتے ہیں عرش پر کو سنبھالو پدر کی جاں
جھکتا تو موجہتی ہے زمیں سے نہ آسماں — دیکھو تو کس طرف ہے مرا شیر نوجواں
بیٹا کہاں شفیق امام غریب ہے
دریا کے پاس ہے کہ معنوں کے قریب ہے

جناب عباس علمبردار کی لاش پر امام حسین تشریف لاتے ہیں سے

ٹھنڈا جو ہوا رحمان میں علم فوج خدا کا — اور قصد بہشتی نے کیا ملک بقا کا
تڑپا دل بے تاب شہنشاہ ھدیٰ کا — مقتل میں گئے سُن کے یہ پیغام قضا کا
دیکھا کہ لہو خاک پہ تھے کا بہا ہے
اک شیر ترائی میں پڑا لوٹ رہا ہے

شانوں کا لہو منہ پہ ملا رو یہ کہے — بھائی کہہ جیتے ہو کہ دنیا سے سدھارے
منہ موڑ چلے اے مرے جینے کے سہارے — بھیا تجھے اس غم نے کیا گور کنارے
تھمتے نہیں دم بھر جو عدم کے مفری ہیں — اے ماہ ہیں ہم بھی چراغ سحری ہیں

حضرت قاسم کی لاش پر ماں بہن اور دلہن کے بین

ماں کے بین:-

منہ دیکھ کے منہ پہ بیٹے کے بولی کمال زار — اے لال تیرے جانے سے کھنچ گئے کلیجے تار
خاموش کس لئے ہو مرا دل ہے بے قرار — دیکھو تو آنکھ کھول کے اماں کر رہی ہے پیار
عزت مری زیادہ ہوئی آبرو ہوئی
دو بے جو تم لہو میں تو ماں سرخرو ہوئی

بہنوں سے گر وہ آئیں جو بے تابی کے سبب — کھلا رہا ہے دھوپ کے مارے یہ منہ کو اب
رخصت کریں عروس کو حضرت کہیں سبب — چڑھتی ہے دھوپ دیر کرو ہیں نہیں اب
رسموں کا دھیان ہو نہ دھن کا خیال ہے
گرمی تم کی ہے مرا بچہ نڈھال ہے

شانہ ملا کے پھیر یہ صدمے کی چشم تر — مجھ غمزدی کے حال پہ واری کر و نظر
طرفے کا ہے بچا نہ بچا کی کی ہے خبر — جاگو کہ بے حواس ہے بیٹا تمام گھر
وقت کا غم ہے سرور عالم پناہ کو
صدقے گئی سلام کرو اٹھ کے شاہ کو

ہے ہے نہ راس آیا تجھے تیرا ماں یہ سال — ہے ہے دھرے رہ گئے ہوا اور دھرے رہ گئے ہوا
ہے ہے ہوا یہ بیاہ کا جوڑا لہو سے لال — ہے ہے مرے شہید کیا ہاتھ کو پامال
صرف خزاں تمام مرادوں کے باغ ہیں
روشن رہیں گے دل میں صدا جو یہ داغ ہیں

بہن کے بین:-

رو رو کر بلائیں لیتی تھی اور پیٹتی تھی سر — کہتی تھی ہائے ہائے رے اس بانکے پر
ہے ہے کلیجہ پھٹتا ہے صورت دیکھ دیکھ کر — یہ لاش ہے کہ چاند پڑا ہے لہو میں تر
عزت میں دم یہ آن گئی قسمت جاگ گئی
ہے ہے حسن حسین کی کھیتی اجڑ گئی

بھیا سعادت میں قضا ظلم کر گئی — بھائی ہوا شہید بہن کیوں نہ مر گئی
یکسر طرح کا قہر ہوا کیسا گذر گئی — بھیا تو کل کے گھر سے سواری کدھر گئی
منزل کی ہے خبر نہ پتہ ہے مقام کا
بھیا کہاں ہے آج ارادہ قیام کا

رخصت کر و برات کو کیا شہ نے کہہ دیا — مشرف براتیوں نے پیا یا نہیں پیا
بھیا کہاں کا قصد ہے اس خوب میں کیا — بھیا ابھی تو نیگ بھی میں نے نہیں لیا

لہ شعر العجم جلد ۳ صفحہ ۱۳۱ مولانا شبلی نعمانی۔
لہ دستہ الیزان مولانا نذیر احمد خورجوی۔

ماں جائے کو حرم میں لگائے گلے چلوں
بھیّا چلو میں ساتھ میں آنچل کے لے چلوں

. . . . . .

نئی دلہن کے بین:-

گھونگٹ الٹ کے اشک چھڑکتی کی نظر — اور منہ پہ خاک مل کے یہ بولی بچشم تر
صاحب لٹوں گی یوں مجھے اس کی نہ تھی خبر — اک رات کی دلہن کہ چلے کس پہ چھوڑ کر
کیا سور ہے ہو داد دو مجھ دادخواہ کی
صاحب بتاؤ اب کوئی صورت نباہ کی

ماتم کروں کہ لاش پہ آہ و بکا کروں — تازی دلہن ہوں سوگ کی کیونکر بنا کروں
دل ہیں تو ہے تڑپ کے قیامت بپا کروں — پر شرم سے زبان پہ ہے مُہر کیا کروں
دریا رواں ہے اشک کا چشم پر آب سے
صاحب میں بین کر نہیں سکتی حجاب سے

منظر یعنی سین

کسی خاص واقعے یا کسی حالت کی تصویر کھینچنا جس کو انگریزی میں سین کہتے ہیں، واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے عام واقعہ نگاری اور سین میں فرق ہے کہ واقعہ نگاری میں ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے بخلاف اس کے سین اُس کیفیت کا نام ہے جو متعدد واقعات یا واقعہ کی متعدد جزئیات کے مجموعے سے پیدا ہوتی ہے۔"

نزع کی حالت - حضرت عباس کی نزع کی حالت

یہ کہہ کے سوئے خیمہ شکستہ بگاہی — آنسو بہائے آنکھ سے اور دل سے آہ کی
دم اُکھڑا کرب نزع نے حالت تباہ کی — آواز آئی اشہد ان لا الٰہ کی
جھرّیاں قضا کی دل پہ کلیجے پہ چل گئیں
رنگت سفید ہو گئی آنکھیں بدل گئیں

تمام رفقا کی شہادت کے بعد حضرت امام حسین کی بیکسی

جب کربلا میں گلشن زہرا خزاں ہوا — ماتم کدہ مرتع باغ جہاں ہوا
جنت کو قافلہ شہدا کا رواں ہوا — یوسف نبی کی آل کا بے کارواں ہوا
بچھڑے رفیق مونس و غمخوار چھٹ گئے
حضرت پہنچ کے منزل آخر پہ لٹ گئے

تنہا رہا بتول کی آغوش کا پلا — مولائے کائنات ہوا مورد بلا
غربت میں پیش آیا جو آفت کا مرحلہ — مشتاق آب تیغ ہوا پھول سا گلا
سینے میں داغ آنکھوں میں آنسو بھرے گئے
خونناب دل سے زخم جگر سب ہرے ہوئے

حضرت امام حسین کا میدان کربلا میں داخلہ۔ رفقا کی شان و شوکت اور گفتگو

مقتل میں سید الشہدا کا ورود ہے — شام سواد منزل آخر نمود ہے
ہر جا ظہور قدرت رب ودود ہے — حمد و ثنا کی دھوم سے شور درود ہے
ہیں گلعذار فاطمہ مہمان کربلا
پھولوں سے ہے بھرا ہوا دامان کربلا

نوبت کی وہ صدا وہ نشانوں کا اوج و خم — وہ جرّہ و مدھا سے پھریروں کا مثل موج
پیدل وہ فرغرہ وہ اسوار زرق برق — قربان بادشاہ و نثار شکوہ فوج
اک شور و دھاش کا زد و یک دو دور ہے
کیا شوکت ورود امام غیور ہے

وہ شہر میں کہ چشم نظارے سے ہو نہ سیر — کانٹے جہاں تھے جمع وہاں ہیں گلوں کے ڈھیر
خوش خوش چل رہا ہے لب نہر کوئی پیر — کہتا ہے مست خاک اٹھائے کوئی دلیر
کھینچا ہے کربلا نے ہمیں کس تپاک سے
اُنس دلی ہے روح کو اس خاک پاک سے

کہتا ہے یوں کسی سے کوئی ہو کے شاد کام — سنتا ہوں ہے ولادت عیسیٰ کا یہ مقام
جاں بخش اس جگہ کی ہے آب ہوا تمام — مولود یاں کے مردے جلاتے ہیں لکھ مقام
بندے کو خاص رب جہاں آفریں کیا
اس خاک نے مسیح کو گردوں نشیں کیا

کہتا ہے نونہال حسن کیا بہار ہے — کس لطف کی زمیں ہے عجب سبزہ زار ہے
سامان عیش چار طرف آشکار ہے — ہر شے وہ خوشنما ہے کہ جس جی نثار ہے
نوشاہ حسن پھول سہرا ہے اس چمن کا
غنچہ کا ہے حجاب کہ گھونگھٹ دولہن کا ہے

سنہ ۱۹۳۷ء آئیں دبیر مصطفیٰ تاخانی

بولے زہیر قین کہ تفریح ہے عجیب ہاں بڑھ چلو جہاں سے ہے جنت بہت قریب
اک مشت خاک اٹھا کے یہ گویا ہوئے حبیب اے ابن بوتراب کے فدیو خوشا نصیب
یہ خاک ہے کہ آب رُخِ حورِ خُلد ہے
سونگھو تو اس میں نکہتِ کافورِ خُلد ہے

تھے جستجوئے آب میں عباس ذی وقار خوش خوش پھرا دھر سے وہ چند گاہ و گاہ
کی عرض ہاتھ باندھ کے یا شاہ نامدار نہرِ فرات ہے یہیں دیکھ آیا جاں نثار
کیسا دلپسند آب و ہوائے لطیف ہے
قابل ملاحظہ کے وہ جائے لطیف ہے

فرمایا شاہ نے کہ مجھے اس کی ہو خبر بھائی مری نگاہ میں ہے مثلِ خشک و تر
یہ کہہ کے سوئے نہر چلے شاہِ بحر و بر ہمراہ سب ہوئے رفقا بھی اِدھر اُدھر
عاشق وہ سب تھے سبطِ رسالت مآب کے
تارے بھی ساتھ ساتھ چلے ماہتاب کے

پہنچے کنارِ نہر امامِ فلک جناب آئینہ بن گیا پہ دیدارِ سطحِ آب
پرنور فرق ہوا رُخِ دل سند بوتراب پایا زمیں پہ چشمۂ خورشید کا جواب
ابرِ کرم کے فیض کی اک دھوم پڑ گئی
موتی کی بھی صدف کی طرح آنکھ لڑ گئی

واقعہ نگاری "واقعہ نگاری اور سین میں یہ فرق ہے کہ واقعہ نگاری میں ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے بخلاف اس کے سین اُس کیفیت کا نام ہے جو متعدد واقعات یا واقعہ کی متعدد جزئیات کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہے۔"

امام حسین زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتے ہیں اور حضرت زینب خیمہ سے نکل آتی ہیں اس وقت کا دردناک سین ملاحظہ ہو:-

زہرا کی طرح رو رو کے کرتی ہوئی بیاں پہنچی قریب سبطِ پیمبر بصد فغاں
دیکھا گلے پہ نیزہ ستم اور لبوں پہ جاں ہے عین عیش میں رخِ شہ عیاں سکے نشاں
اک رُخ لبوں پہ لال ہے اور اک زمیں پہ ہے
رکتا ہے دم اجل کا پسینہ جبیں پہ ہے

منکا رُھلا ہے کان کی لو سے پھری گئی زخموں میں ریگِ بیاباں بھری گئی
تن سرد، جی نڈھال، طبیعت گری گئی ہے ایک جان لاکھ بلا میں گھری گئی
جلاد پہلوؤں میں ہیں بالیں پہ موت ہے
سب صورتوں میں زیست کا مضمون فوت ہے

زینب کو جب یہ قہر کا سامان پڑا نظر پھیلا کے ہاتھ بھائی سے لپٹی بچشمِ تر
چہرے سے گرد و خاک کی زانو پہ رکھ کے سر کھینچا گلے سے تیر کلیجہ سنبھال کر
سچ ہے یہ حال دیکھ کے کس طرح کل پڑے
نکلا نہ تیر آنکھوں سے آنسو نکل پڑے

چلائی آبِ اشک چھڑک کر وہ دل فگار بے ہوش کیا ہوش میں آؤ مرے نثار
ہمشیر کی صدا نے کیا دل کو بے قرار آنکھوں کو غش سے کھول یہ شعلہ نے کیا شرار
رو دا دل پر بہن کے برادر نے رو دیا
بھائی کے منہ کو دیکھ کے خواہر نے رو دیا

لزمیہ اردو شاعری میں اس کا فقدان تھا۔ میر ضمیر نے اس کی بنیاد ڈالی "وہ بالکل نقشِ اولیں تھا۔ مگر میر انیس اور مرزا دبیر نے اس کو اس قدر ترقی دی کہ اردو شاعری دنیا کی بہترین زبانوں کے پہلو بہ پہلو چلنے کے قابل ہو گئی۔ اگر یہ دو ہستیاں اس میدان میں قدم نہ رکھتیں تو یہ اس قابل بھی نہ ہوتی کہ دیگر زبانوں کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا۔"

زکی مرحوم نے بھی اس صنفِ نظم پر خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اور ایسے ایسے اباب مضامین نکالے کہ بے ساختہ منہ سے وہ نکل جاتی ہے۔

بہادروں کی آمادگی جنگ:-

نیزہ بلا لا کے پکارا کوئی دلیر ہاں صفدرانِ لشکرِ اسلام کیا ہے دیر
بولا یہ کھینچ کر دمِ شمشیر کوئی شیر اے تو بھی تول کے ہوں پتے سر کے ڈھیر
چلایا کھینچ کر کوئی چلہ کمان کا
یہ تیر توڑتا ہے قوا آسمان کا

آمد:-

آمد ہے اُس جری کی جو ہے صفدروں میں فرد ضرغام رزم فارسِ جولانگہِ نبرد
چرگر دو پر غبار ہے میدانِ لاجورد ہے نیم رنگ وجہِ کارزگِ آسمانگرد
مہتاب چھٹ رہا ہے رخِ آفتاب پر
گویا پڑی ہے اوس ستاروں کی آب پر

ریگِ رواں ہے نہر تو آبِ رواں سراب جاں باختہ بھنور سپہ غرقہ حباب
حیرت سے دیکھ کر یہ تلاطم یہ اضطراب زہرے جھکے ہیں مردمِ آبی کے آب آب
ہیں مائل فرار محافظ فرات کے
دریا بھی چاہتا ہے بنے راہ گھاٹ کے

جھک جھک کے سلحِ خاک میں چھپتا ہوا سماں — ہل ہل کے کوہسار بھی کہتے ہیں الاماں
ڈر ڈر کے جی چھپاتے ہیں جنگل کے آہوؤں — مڑ مڑ کے تیر ڈھونڈتے ہیں گوشۂ کماں
بڑھ بڑھ کے سدِّ راہ ہوں وہ شاہراہ ہیں
ہم تم کہ چل رہی ہے ہوا میں بھی ہم ہیں

حملہ کا زور شور اور فوجوں کی ہلچل:۔

الٹا جوشہ نے بہر وغا آستین کو — دیکھا اجل نے ڈر کے یسار و یمن کو
حاصل ہوا فراق مکاں سے مکین کو — کانپے یہ کوہسار کہ چھوڑا زمین کو
بحرِ محیط قعرِ خدا موج زن ہوا
زندوں کے تن پہ جامۂ ہستی کفن ہوا

جنبش ہوئی زمین کو تھرائے آسماں — سینوں میں قلب گور میں مردے ہلے تپاں
اعضا سے زد میں سو جانیں ہیں رواں — گہ الحذر کا غل ہوا گہ شورِ الاماں
دم میں ہوائے کبر سروں سے نکل گئی
خورشید کو زوال ہوا دھوپ ڈھل گئی

دہشت سے وحشِ مثلِ زمیں کانپنے لگا — ذروں کی طرح مہر مبیں کانپنے لگا
سنگیں دلِ سپاہ یہیں کانپنے لگا — ایسا نہ تھا کوئی کہ نہیں کانپنے لگا
سو بھی نہ جائے امن کہیں اضطراب میں
دریا سمٹ کے آگیا جامِ حباب میں

گھوڑا اور تلوار:۔

گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں میر انیس اور مرزا دبیر نے خوب خوب زورِ قلم دکھایا ہے جس کے بعد ان موضوعات پر قلم اٹھانا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں رہی لیکن زکی مرحوم نے گھوڑے اور تلوار کی تعریفوں میں جس دلکش انداز سے خامہ فرسائی کی ہے وہ بے نیاز تعریف ہے۔ مرحوم نے ان کی تعریفوں میں خاص زورِ طبیعت دکھایا ہے۔ نئے اور پیارے انداز سے جولانی طبع دکھائی ہے۔ اسلوب بیان کے ساتھ بہ لطافتِ کلام زورِ جدتِ تخیل کے ساتھ کلام کی بلاغت، دقیقہ رسی کے ساتھ بھر فصاحت کی موج زنی، یہ وہ سحر کاریاں ہیں جنہوں نے ان کے کلام کو سراسر اعجاز بنا دیا۔

تلوار بجلیوں پہ بپھرتی ہوئی نکلی — اک شاخِ برق تھی کہ لچکتی ہوئی نکلی
تن تن کے نظرِ فوجوں پہ کرتی ہوئی نکلی — دم مرکبِ مضاجات کا بھرتی ہوئی نکلی

منظور لگاوٹ ہوئی لیلیٰ عرب کو
پیغام صفائی کا دیا کھنچتے ہی سب کو

مل پڑ گیا جانوں کی خریدار وہ نکلی — نا طورِ خوشرو طرحدار وہ نکلی
گردن کش و لشکر کش و خونخوار وہ نکلی — آتش زن ہنگامہ پیکار وہ نکلی
ہوتے ہیں شرارے تنِ گرد سے پیدا
لو آگ ہوئی عرصۂ نادرد سے پیدا

تھا شور تب و تاب میں ہر جنبشِ ملک سے — یہ ہر قیامت ہے کہ جلوہ فلک ہے
سینوں میں تو یہ سوز ہے غنچوں میں مگر ہے — گرمی ہے یہی گرمی تو سانچہ سمک ہے
بجلی پہ ہے بالا یہ عجب برقِ جہاں ہے
گردوں پہ بھی اسی آتشِ سوزاں کا دھواں ہے

. . . . . .

سینے میں جو دبی دلِ بیتاب میں پہنچی — تالاب سے مچھلی چہ سیماب میں پہنچی
زد ہو کے ہر اک دیدۂ پُر آب میں پہنچی — موجوں سے گزرتی ہوئی گرداب میں پہنچی
گھبرائی نہ ظلمات میں ذوالحوت کی صورت
رگ رگ میں غوص دوڑ گئی حوت کی صورت

گھوڑا:۔

وہ سازدہ یراقِ سمندِ صبا شتاب — ناوک کنوتیاں تھیں فلاخن ہاک کا رکاب
ہیکل وہ چار آئنہ کی جس میں آب و تاب — پاکھر زدہ تھی، زین جبلہ کا تھا جواب
رہوار تھا کہ نہر کا دریا تھا جوش پر
تھی بال یا کمند تھی رستم کی دوش پر

گلگوں پر رنگِ نکہت گلشن رواں ہوا — بادِ سحر چلی کہ وہ توسن رواں ہوا
ہُد ہُد اٹھا کے ناز سے گردن رواں ہوا — گویا پرانِ عرش نشیں رواں ہوا
دامانِ زیں سے تیز پری کے اثر کھلے
ایسی ہوا بندھی کہ نہ پریوں کے پر کھلے

کس قہر کی آمد ہے غضب جلوہ گری ہے — رہوار نہیں شیر کے پنجے میں پری ہے

سید شاہد حسین رضوی

غزل

لائے گی رنگ آپ کی یہ دل لگی کچھ اور
بڑھ کر رہے گی اب مری آشفتگی کچھ اور

مجھ پر کھلیں گے اور ابھی رازہائے عشق
دل کو ملے گی لذتِ بے چارگی کچھ اور

میری حیاتِ عشق ہے تمہید انبساط
جلوے دکھائے گی مجھے خود رفتگی کچھ اور

ان کی طرف ہے چشمِ سخن گو دمِ خیال
اس کے سوا نہیں اثرِ زندگی کچھ اور

ہاں اے خیالِ دوست دکھا دوست کو دکھا
باقی کچھ اور ہے ہوس بندگی کچھ اور

رہتا نہ اتنا دور میں اس جلوہ گاہ سے
اے کاش ابھارتا غمِ افتادگی کچھ اور

وعدے یوں ہی جو کرتے رہیں گے وہ نو بہ نو
حاصل کروں گا میں طربِ زندگی کچھ اور

منظور اک نگاہِ طرب سوز کے سوا
دیکھا نہ ہم نے حاصلِ شرمندگی کچھ اور

علی منظور حیدرآبادی

سوز ناتمام

خزاں کی ایک بے کیف رات میں پہاڑ دشتوں کی بے برگ اور خشک شاخوں سے بین کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میں خلاف معمول رات کے دو بجے بھی جاگ رہا تھا۔ دراصل تمام دن میں نے بے چینی میں گزارا تھا اور اب تخیلات کے سمندر میں ڈوبا ہوا کہیں کا کہیں بہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کبھی مجھے والد سے آخری گفتگو کا خیال آتا تھا اور کبھی اپنے مستقبل پر نگاہ چلی جاتی تھی۔ میں ایک مصنف کی حیثیت سے دنیا میں روشناس ہو چکا تھا لیکن مجھے وہ کامیابی نصیب نہ ہوئی تھی جس کی آرزو ہر مصنف کے دل میں قدرتاً موجود ہوتی ہے۔ کیا ظاہر کا خیال واقعی درست تھا "تم نفسیات سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے جب تک تمہیں کسی . . . کا مطالعہ کرنے کا موقعہ نہ ملے"۔ . . . کسی عورت . . . کے مطالعہ کرنے کا موقعہ . . . آخر میں انہیں خیالات میں کھویا ہوا نیند سے ہم آغوش ہو گیا۔

دن ایسے ہی گزرتے چلے گئے۔ مطالعہ مجھے ہر وقت مصروف رکھتا تھا۔ میری دنیا میرے گھر میں کتابوں سے لدی ہوئی الماریوں میں موجود تھی۔ بڈھا کلن گرمجھے وقت پر کھانا تیار کر دیتا تھا، لیکن کمبخت سارا دن ایسا غائب ہوتا تھا کہ مجھے کئی دفعہ اس پر مرجانے کا شبہ ہوتا۔ البتہ رات میرے لئے آفت تھی۔ پریشان خیالات کا ہجوم میرے گرد پیش منڈلانے لگتا تھا میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ آخر میری بے چینی کی وجہ کیا ہے۔ مجھے کلن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کی غیر حاضری سے ضرور دلچسپی ہو گئی۔ ایک شب کو بارہ بجے ہوں گے مجھے یوں ہی خیال آیا کہ آج اس سے اس کے مشاغل کی بابت پوچھنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اُسے فوراً آزادی . . . لیکن صدائے برنخواست۔ ایک۔ دو۔ تین، آخر میں ضبط نہ کر سکا جی میں آیا کہ اس کو سپٹ ہی تو دوں گا۔ اٹھ کر اس کے کمرے میں گیا دیکھا تو حضرت غائب۔ طبیعت پہلے ہی منغض تھی، اور بھی زیادہ پریشان ہو گئی آخر وہ کہاں گیا تھا اور تمام دن کہاں رہتا ہے۔ جس جگہ میں نے مکان لے رکھا تھا وہ شہر کے شمال کی جانب عیدگاہ کے قریب پہاڑ کے دامن میں تھی اور شہر سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر۔ مجھے قدرتی طور سے اس کا سراغ لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن وہ حضرت ایسے نہیں تھے کہ بغیر رسید کے واپس آجائیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کب سویا لیکن اتنا ضرور ہے کہ گھڑی نے دو میرے سامنے بجائے تھے۔ میں سحر خیز نہیں ہوں اور صبح آٹھ بجے سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔ فرائض کی ادائیگی میں کلن نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ چنانچہ دوسرے دن بھی جب گھڑی نے ٹک سے آٹھ بجائے اس نے اپنی تھرتھنی دروازے سے نکال کر کہا "سرکار چائے حاضر ہے"۔ مجھے یکایک رات کا معاملہ یاد آگیا اور میں نے گرج کر کہا "رات کہاں تھا سرکار"۔ سرکار کا زوال گیا تھا۔ دردانہ . . . "کیا بکتا ہے بولتا کیوں نہیں (حالانکہ ابھی اُس نے اپنا فقرہ بھی ختم نہیں کیا تھا) میری درشتی پر وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ میں بھی خاموش ہو رہا۔ مجھے اس کے افعال سے کیا واسطہ تھا۔ کھانے کے وقت مجھے پھر کچھ پوچھنے کی ترغیب ہوئی لیکن خلاف مصلحت سمجھ کر چپ ہو رہا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ رات کے وقت تمام ناچار پھر میری آنکھوں میں پھر گیا۔ میں نے اپنے آپ کو کسی اور خیال میں گم کرنا چاہا۔ انسان ابتدائی منازل سے کس طرح گزرا؟ پیغمبر کیوں نہیں آتے؟ انسان اتنا کامل ہو چکا ہے کہ اب اُسے اس کی ضرورت نہیں پیغمبر کیسا مضحکہ خیز خیال ہے۔ جنگ! مجھے تو اس کے نام سے خوف آتا ہے۔ یہ لوگ کیوں لڑتے ہیں۔ جوع الارض۔ کلن!!! میں نے بے ساختہ آواز دی "سرکار حاضر ہوا"۔

جس وقت وہ نگاہیں نیچی کئے سر جھکائے ہاتھ باندھے میرے سامنے کھڑا تھا مجھے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دل میں کس قدر ہیجان ہے۔ میں نے نہایت ملاطفت سے پوچھا "کلن تم کہاں غائب رہتے ہو۔ اگرچہ مجھے اس بات کا کافی حق نہیں کہ تمہاری سرگرمیوں میں دخل دوں لیکن پھر بھی تمہارے آقا کی حیثیت سے پوچھنا میں اپنا فرض

خیال کرتا ہوں کہ تمہاری عمر کا انسان اگر کوئی غلطی کرے تو قابلِ معافی نہیں"۔

کلن نے مجھ سے صرف اس قدر کہا "سرکار! معلوم ہوتا تھا کہ آگے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے اور نہیں کہہ سکتا۔ میں نے اسے بیٹھ جانے کا حکم دیا اور یقین دلایا کہ سچ سچ کہہ دینے پر میں اسے سب کچھ معاف کر دوں گا اس نے بیان کرنا شروع کیا "سرکار آپ جانتے ہیں میں مجرد ہوں۔ تمام عمر کبھی عورتوں کے دام میں نہیں پھنسا۔

لیکن جب سے یہاں آیا ہوں۔ کارنیوال میں جاتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میں تباہ ہو رہا ہوں۔ لیکن پھر بھی چلا جاتا ہوں صرف دردانہ کو دیکھنے کے لئے"۔

آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے اس بوڑھے لنگور کی حالت پر رحم آیا اور میں نے کہا "وہ دردانہ کون ہے"۔ کہنے لگا "سرکار مجھے معلوم نہیں لیکن میں اپنے دل میں ایک زبردست خواہش محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کی بھی خدمت کروں جس طرح سرکار آپ کی خدمت کر رہا ہوں۔ اگر آپ اسے اپنے گھر میں لے آئیں تو . . . "!

اس کی اس بات پر میں جل ہی تو گیا اور جل کر کہا۔ "دور ہو کمبخت" اس کے چلے جانے کے بعد میں ایک عجیب عالم میں تھا۔ ظاہر ہے وقوف ہے جو کہتا ہے کہ نہیں عورت کے مطالعے کی ضرورت ہے۔ شیکسپیئر نے تو اُسے اس قدر وضاحت اور اختصار سے بیان کر دیا ہے کہ اور کسی بات کی ضرورت ہی نہیں۔ ہاں "گزوری تیرا نام ہی تو عورت ہے"۔ اذیت دہ خیالات میں گم ہو کر میں سو رہا۔ سارا دن نہایت اطمینان سے میں نے کام کرنے میں گزارا۔ ڈوز کی کتاب ختم کرنے کے بعد میں بھی اپنی نئی تصنیف میں مشغول ہو جاؤں گا۔ "عجز و عبودیت کوئی اچھا نام نہیں"! "اعترافِ شکست" اس میں کونسی رعنائی ہے"۔ دردانہ! اف میرے خدا"۔ رات ابھی آئی ہی نہیں اور بستر کے کانٹے جسم و روح کو جھلسنے لگے دیتے ہیں۔ آج میں خیالات کو شکست دوں گا"۔ مجھے کلن کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اسے آواز دی اور اس نے دیسی آم کی چوسی ہوئی گٹھلی کی طرح شکل دکھائی۔ سرکار"۔

"تم گئی سرکار! چلو کارنیوال چلیں" "مگر سرکار"۔ جلد تیار ہو جاؤ میں بھی کپڑے پہنتا ہوں اور برق جیسی سرعت کے ساتھ میں بستر سے اچھلا اس نے مجھے کپڑے پہنائے اور میری فلٹ اور چھڑی میرے ہاتھ میں دے دی۔ کارنیوال چھاؤنی کی جانب تھا اس لئے تھوڑی دور پیدل چل کر ہمیں گاڑی لینی پڑی۔ کلن تمام راستہ ساکت و صامت صنم بنا بیٹھا رہا اور جس وقت کارنیوال کی روشنی ہمیں دور سے دکھائی دی میں نے محسوس کیا کہ اس کے یخ بستہ جسم میں ارتعاش پیدا ہو گیا ہے۔ کارنیوال میں بے حد رونق تھی۔ کلن مجھے گھسیٹ کر لئے جا رہا تھا۔ نسبتاً ایک کم رونق جگہ پر لے جا کر مجھے اشارہ کیا کہ سرکار اس کمرے میں تشریف لے چلئے۔ اندر جا کر مجھے معلوم ہوا کہ دراصل یہی جگہ کارنیوال کا دل ہے۔ داؤ لگ رہا تھا اور ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ کر حاضرین کی دلچسپی کا جائزہ لے رہے تھے۔ کلن نے گھنٹی بجائی اور چھوکرے کے آنے پر چائے کی فرمائش کر دی۔ اگرچہ ہم تماشائی کی حیثیت میں تھے۔ لیکن میرے دل کا اضطرار ہر لحہ زیادہ ہو رہا تھا۔

چائے لانے والی چھوکرے کے بجائے ایک لڑکی تھی اور غالباً یہی دردانہ تھی۔ اس نے آتے ہی کلن کی طرف دیکھا اور پھر جھک کر مجھے سلام کیا اس کی صورت حد درجہ متوحش نظر آتی تھی اور اس کا رنگ گلاب کی کھلائی ہوئی بتی کی طرح بے رونق تھا۔ برف کی سی سفیدی اس کے نیم برہنہ بازوؤں اور مرمریں گردن سے نمایاں تھی۔ دینس کا مجسمہ اس قدر متناسب الاعضا نہیں ہوگا۔ بتا نہیں غمزدہ لڑکی کا جسم تھا۔ میری نگاہیں اس پر جم کے رہ گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے چائے کا سامان میز پر رکھ دیا اور خاموش واپس چلی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ہرن نیند ہی نیند میں چل رہا ہو۔

کلن یہ لڑکی کون ہے۔ اس قدر غمگین کیوں ہے" میں نے نوکر سے پوچھا "سرکار خاموش رہئے۔ یہی دردانہ ہے اور صرف اس کی دید کی خاطر اتنے لوگ اپنی جیبیں خالی کر رہے ہیں۔ مجھے اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ کون ہے" ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد دردانہ اس کمرے میں بہکے ہوئے غزال کی طرح آتی تھی اور طول و ثروہ واپس چلی جاتی تھی۔ غالباً یہی اس کے مالک کا حکم تھا کہ خاطر بستگی کبھی زائل نہ ہو۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ اسے اپنی طرف متوجہ کر دوں۔ لیکن بلور کی آنکھوں کی طرح شاید ان میں دید کی طاقت ہی نہ تھی۔ وہ کسی کی طرف بھی متوجہ نہ ہوتی تھی۔ اس رات کے بعد میرا معمول ہو گیا کہ ہر شب وہاں چلا جاتا لیکن سوائے حسرت و یاس کے اس کے قلب مخزوں میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کی تہ تک پہنچ جاؤں۔ لیکن

میری زبان کو تالو گویائی نہ تھی۔ اب اسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ مستقل گاہک ہے۔ ایک دن اس نے پوچھا "آج آپ دیر سے تشریف لائے ہیں۔ مجھے اس روز دیر ہو گئی تھی" "تو تم میری منتظر تھیں" "نہیں آقا ہم لوگ اپنے سرپرستوں کا ضرور خیال رکھتے ہیں" "میں تو صرف تمہارے لئے آجاتا ہوں۔ آخر تم ہو کون اور اس قدر المناک کیوں ہو؟" جیسے کسی نے سویا ہوا فتنہ بیدار کر دیا ہو۔ اس کے برفانی چہرے پر ایک چمک نمودار ہوئی اور شرار کی طرح چشم زدن میں ماند پڑ گئی۔ "آقا آپ کی ہمدردی کا شکریہ! قدرت نے عورت کو محتاج ہی پیدا کیا اور اسے ہمیشہ کسی نہ کسی کی محتاج ہی رکھتی ہے" اس کی آواز بھرا سی گئی جلد ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہنے لگی "آقا قیدِ انسان بری بلا ہے"۔ وہ تو چلی گئی اور مجھے فکرات کے بحرِ بے پایاں میں غوطہ دے گئی "قیدِ انسان! قید ہونا اور قید کرنا دونوں اذیت دہ ہیں۔ محبت میں یا دشمنی میں . . . قید کتنی تکلیف کا باعث ہے۔ غلامی ابدی غلامی۔ غلام بنانے والا ہمیشہ ہی خوش اور غلام ہمیشہ ناخوش۔ جب تک کوئی روئے نہیں دوسرا ہنس نہیں سکتا۔ ایک کی تکلیف سے ہی دوسرے کو راحت مل سکتی ہے"۔ انہیں خیالات میں میں نے تمام شب گزار دی۔

دوسری شب میں نے اس سے کہا "در دانہ میں کل نہیں آؤں گا۔ اگر تم اپنی کیفیت بتا دو تیں تو شاید تمہارے لئے میں کچھ کر سکتا۔ اگر تمہیں مجھ سے کسی امداد کی ضرورت ہو تو کہہ سکتی ہو" اس کے جواب میں اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے اور اس نے خدا معلوم دل کی کن گہرائیوں سے کہا "یہ سہارا بھی ٹوٹ گیا" اور چلی گئی۔ اس کے الفاظ نے میرے دل پر سخت چوٹ لگائی جیسے مجھے کسی نے خواب سے چونکا دیا ہو۔ اب میں اس کے لئے رحم ہی نہیں محبت بھی محسوس کرتا تھا۔ اس کے دوبارہ آنے پر میں نے اسے تشفی دی اور کہا "صبح چار بجے گلن اس کمرے کی پشت پر آجائے گا۔ اگر تم میرے پاس آجاؤ تو اس اندوہ سے نجات مل سکتی ہے" اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ میں جلد ہی گھر چلا آیا اور سو چنے لگا کہ اسے یہ کیا دعوت دے آیا ہوں۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ طوعاً و کرہاً میں نے گلن کو اس بات سے آگاہ کیا۔ میرے حکم پر وہ کانپ ہی تو گیا لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ خوش بھی ہے۔ پانچ بجے صبح در دانہ میرے کمرے میں تھی لیکن اس حالت میں کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ "ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گا تو وہ کیا کریں گے" ہمیں یہ خیال پریشان کئے دیتا تھا۔ اس کے حالات معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ ابھی وہ بچہ ہی تھی کہ ان ظالموں کے پالے پڑ گئی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں کیسے لائی گئی ہے خواب کی طرح اسے یاد تھا کہ اس کے والدین نہایت دولتمند تھے اور غالباً وہ کسی نہایت اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور یہاں غالباً اغوا کر کے لائی گئی تھی۔ اس سے زیادہ وہ مجھے کچھ نہ بتا سکی۔ شام کو حسبِ معمول میں کارنیوال پہنچا۔ چائے طلب کی۔ خدمتگار سے پوچھا وہ چھوکری کہاں ہے۔ کہنے لگا حضور وہ بیمار ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے پولیس میں خبر نہیں دی۔ کیونکہ الٹا انہیں خود پھنسنے کا اندیشہ تھا۔ ایک ہفتہ تک متواتر میں وہاں جاتا رہا تاکہ حالات سے باخبر رہوں۔ وہاں کی بساط الٹ چکی تھی۔ رونق کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔

جیسے کسی نرم و نازک پھول کے پودے کو تمتماتی دھوپ سے اٹھا کر سائے میں رکھ دیا جائے۔ بعینہٖ یہی حالت در دانہ کی ہوئی۔ اگرچہ وہ مجھے آقا کہتی تھی اور میری ہر آسائش کا خیال رکھتی تھی لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا تامل نہیں کہ اسے مجھ سے انس بھی تھا۔ مجھے کتابوں سے عشق ہے اور بس لیکن جنسِ نگاہ سے کون نفرت کر سکتا ہے۔ وہ میرے کتب خانے میں کھڑکی کے سامنے جس میں پھولدان رکھے تھے کرسی بچھا کر بیٹھ جاتی تھی اور پڑھنے لکھنے میں مشغول بہم پہنچاتی تھی۔ بارہا ہماری نگاہیں کتابوں سے اٹھ کر دوچار ہو گئیں اور اس کے لب لعلیں سے تبسم کی جھلک نمودار ہو کر اندر ہی اندر جذب ہو گئی۔ غالباً وہ مجھے آقا کی حیثیت سے دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ اپنے جذبات کے اظہار میں جس قدر احتراز سے کام لے سکے لے۔ میں کوئی اندھا تو ہوں نہیں۔ طاہر کی نصیحت کے مطابق اب میں انسانی مطالعے میں مشغول تھا۔ لیکن اس میں اس قدر کھو گیا کہ سب کچھ بھول گیا۔ محبت بیکاری کا بہترین مشغلہ ہے لیکن وہ لوگ جنہیں دنیا میں کوئی کام کرنا ہے اس سے دور ہی رہیں تو اچھا ہے اور میں بھی تو ایک بہترین مفکر اور مصنف کی حیثیت سے جلوہ گر ہونے والا تھا اس لئے اس کھیل سے مجھے بھی پرہیز ہی لازم تھا۔ لیکن ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

کیونکہ پنیر چلاتا ہے اور ٹسکا کو اسی وقت پتا چلتا ہے جب صیاد اسے

فتر ک سے کس کر بانہ رہ لیتا ہے۔ خلوت کی آب و ہوا محبت کی آبیاری کے لئے بہت راس ہے اور یہی وجہ تھی کہ شمل الفت بے روک ٹوک بڑھتا اور پھلتا پھولتا گیا۔ اب ہم دونوں کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر کتاب قدرت کا مطالعہ کیا کرتے۔ شام کے وقت بہار کی پرسوز رح کے غروب ہونے کا نظارہ عجیب دلکشا ہوتا۔ جاڑی اور سونے کے محلات تعمیر ہو ہو کر رات کی تاریکیوں میں غائب ہو جاتے۔ صبح صبح نسیم شمال کہ کر ہمیں بیدار کرتی۔ کائنات پر شباب جلوہ پاشی کر رہا تھا۔ قدرت کی ہر شے جوان تھی۔ غم والم کا سایہ چھٹ چکا تھا۔ وہی نگاہ جو کبھی ٹنڈ منڈ درختوں پر جا کر ناکام واپس آجاتی اب ان کی سرسبزیوں میں جا کر اٹک جاتی تھی۔ پرندے گیت گا کر فضا بدروح کو پیغام تقدیر تے تھے میں کتاب لکھنے میں مصروف تھا اور اسرار کائنات عریاں ہو کر میرے سامنے مصروف رقص تھے۔

دن گزر جاتے ہیں لیکن اپنے نہ مٹنے والے اثرات چھوڑ جاتے ہیں میری بیکلی اور بے چینی خوشگوار اور امید افزا تخیلات میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن ایک قوت نامعلوم البیان قوت مجھے اپنی طرف کشاں کشاں لئے جاتی تھی۔ اف کس قدر زبردست تھی وہ کشش جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میں اپنی روح کی والہانہ سرگشتگیوں میں محو تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس یکسر جاذبیت میں کس قدر ہیجان زلزلہ بر پا تھا۔ میرے لئے شاید میرے ہی دل کی کایا پلٹ چکی تھی لیکن دراصل دردانہ کے دردمند دل میں بھی ایک رنگیں امنگ ایک حسین آرزو جادہ گر تھی جس کا احساس مجھے اس طرح ہوا۔

ایک شام جبکہ میں تخیلات کی بلندیوں پر محو خرام تھا۔ دردانہ میرے پہلو میں آرام کرسی پر دراز تھی۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے میں اس کی طرف دیکھ لیتا۔ کسی وقت اس کا چہرہ شفق بہار کی طرح تمتما اٹھتا اور کبھی رنگ زرد خزاں سے تاراج شدہ آخری برگ گل کی طرح زرد معلوم ہوتا اس کے دل میں امید و بیم کا پرجوش تلازم موجزن تھا جو نہ معلوم اسے کنار عافیت پر پہنچا دیتا یا عین لب لعل تشنۂ حیات رکھتا۔ قدرت کا دل رباو حسین نظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ سامنے بہار کی چوٹیوں پر زمردیں قصر تعمیر ہو رہے تھے اور شفق کے گوناگوں رنگ ان پر سنہری اور روپہلی گلکاریاں کر رہے تھے کبھی پارہ ہائے ابر پیل دماں کی صورت دکھائی دیتے اور کبھی افق آتشیں پردہ نگاہ پر چھا جاتی۔ اس حیرت انگیز و دلنشین لمحہ میں مجھے دردانہ کی موسیقیوں میں غرق آواز سنائی دی۔ "آقا میں آپ سے شرف ہمکلامی حاصل کر سکتی ہوں؟" چنگ و رباب کے نغموں سے لبریز تار کو چھیڑنے سے جو چوٹ دل پر لگتی ہے۔ وہی میرے دل پر لگی۔ میں نے کہا "کہو دردانہ کیا بات ہے" آقا میں آپ کی کنیز بن کر تا عمر آپ کی خدمت گزاری کا شرف حاصل نہیں کر سکتی؟" میرے دل و دماغ پر بجلی سی کوند گئی۔ مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ متاہل زندگی کی تاریکیوں میں کود جاؤں یا آزاد و دلفریب ہواؤں سے لطف اندوز ہوں میری آئندہ توقعات کامیابی نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا کہ میں گرہست کے بندھنوں میں جکڑا جانے کی بجائے ہمیشہ شباب بہار زندگی سے ہمکنار رہوں۔ لیکن فیصلہ یہ کرنا تھا کہ آیا مجھے دردانہ سے محبت نہیں تھی؟ تھی اور والہانہ لیکن میرے دل و دماغ کو محبت نے مختل نہیں کر دیا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ میں ابھی بقید ہوش و حواس تھا۔ میں نے جواب دیا "دردانہ بچوں کی سی باتیں نہیں کیا کرتے" اس کے بعد موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ میری نگاہیں سامنے درختوں پہ جمی رہیں اور کچھ دیر کے بعد دردانہ اٹھ کر چلی گئی۔

رات کا کھانا بھی خاموشی میں ہی تمام ہوا۔ بے وقوف کلن راز خوشی معلوم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ ضرور معاملہ کچھ بے طور ہے۔ رات میری بے چینی حد سے گزر گئی۔ لیکن میں نے جو کچھ کیا تھا اپنی بہتری کے لئے کیا تھا۔ مجھے اس پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ عقل و شعور مجھے تسلیاں دے دے کر اور تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کسی کروٹ چین نہ پڑتا تھا۔ معلوم نہیں میں کس وقت سویا۔ صبح کلن کی زبانی معلوم ہوا کہ دردانہ جا چکی ہے۔ میرے دل میں غصے اور محبت کی آگ بھڑک اٹھی۔ لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ عقل بگڑنے کا رنے کہا تھے اس ناپسند کھیل سے کیا غرض تھی جو تیرے مستقبل کے لئے مضرت رساں تھا۔ کلن نے کہا "حضور وہ وہیں چلی گئی ہو گی۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ خاموش نامعقول" اس کے بعد میرے شب و روز الم واندوہ میں گزرنے لگے۔ میرے مشاغل بے کیف رہ گئے۔ میں کام کرتا تھا لیکن بغیر شوق و تجسس کے ایسے معلوم ہوتا تھا کہ میں بغیر روح کے کام کر رہا ہوں۔ جس طرح پھولوں کی خوشبو ضائع ہو جانے سے وہ پھیکے پھیکے معلوم ہوتے ہیں

بعینہٖ یہی میرے پژمردہ دل کی حالت تھی۔ سکون و سرور ناپید ہو چکے تھے۔ لیکن اس پر بھی دن گزر جاتے ہیں۔ میرے بھی دن گزرتے جاتے تھے۔ اب میں نے سیر و تفریح بالکل چھوڑ دی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کتابوں میں ہی پڑا رہوں۔ اگرچہ یہ میری رفیق زندگی تھیں لیکن استعدادِ بیگانگت و انبساط سے بے بہرہ تھیں۔ انسان۔ انسان ہی ہے۔ خواہ کتنا ہی معروف ہو لیکھے اکتا ہی جاتا ہے۔ مجھے اگرچہ اپنی طبیعت پر مکمل اختیار حاصل تھا لیکن وہ آوارہ اور آزاد ہونے کے لئے بے قرار تھی۔

بے سکون راتوں کے گزرنے پر بھی میں عنانِ عقل و شعور سنبھالے ہوئے تھا۔ لیکن دردانہ کے چلے جانے کے پورے ایک ماہ بعد مجھے دیوانگی کا پہلا دورہ ہوا۔ رات گیارہ بجے کے قریب میری طبیعت حد درجہ افسردہ اور نڈھال تھی۔ گریبان چاک کرنے اور دیوانہ وار جنگل میں چلے جانے کو جی چاہتا تھا۔

عقل و ہوش نہ معلوم کہاں ہجرت کر گئے تھے۔ میں چپ چاپ اٹھا کوٹ پہن کر چھڑی ہاتھ میں لی اور کان کو بتائے بغیر نکل کھڑا ہوا۔ مجھے میرے پاؤں مقناطیسی قوت کے ساتھ آفندی کے ہوٹل کی طرف کھینچ رہے تھے۔ اس کشش کے مقابل جو مجھے ادھر لئے جا رہی تھی میں بالکل بے بس تھا۔ خیالات خواب پریشان کی طرح ناپید تھے اور میں مشین کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ میں ہوٹل میں داخل ہو گیا اور اپنی پرانی نشست کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک نوعمر خوش پوش چھوکرا جاگزین تھا ناچار مجھے ایک اور خالی نشست پر بیٹھنا پڑا۔ میں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ہر چیز کی طرف تکتا تھا لیکن دیکھتا کچھ بھی نہیں تھا۔ چھوکرے نے آکر پوچھا "حضور چائے چاہئے؟" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا وہ چپ چاپ چلا گیا اور چائے کا سٹ میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔ میں نے پیالی تیار کی۔ بھاپ کے بادل پیالی میں سے اٹھ رہے تھے اور میری نگاہیں انہیں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں میں کتنی دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ جس وقت میں اپنے خواب سے بیدار ہوا دردانہ اسی نوخیز لڑکے کے پاس کھڑی تھی۔ وہ اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ امید و بیم اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے نمایاں تھے۔ میں نے محسوس کیا اس کی نگاہیں بہت تیز ہیں۔

دردانہ بے پروایانہ انداز سے کھڑی تھی۔ اسے اس کی کچھ پروا نہیں تھی کہ کون اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ بہار کی اولیں صبح کی اولیں کلی کی طرح مسکرائی۔ نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا۔ مجھے نہ معلوم کیا ہوا۔ کیک کاٹنے کی چھری یکایک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں غصے، جوش اور دیوانگی کے عالم میں دردانہ کی طرف لپکا کہ وہ خنجر اس کے سینے میں گھونپ دوں جس وقت اس نے مجھے اپنے مقابل پایا نہایت سکون سے اپنا گلا رہنہ کر کے میرے سامنے پیش کر دیا۔ اس کی نگاہوں میں التجا و تشکر کی شراب کا خمار جھلکیاں لے رہا تھا۔ پیار و محبت کی کرنیں چھن چھن کر میرے ظالم و مکروہ چہرے پر پڑ رہی تھیں میرا ہاتھ رک گیا میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ مڑا اور نوجوان کے پہلو میں جو ابھی نشۂ محبت کی پینک سے اچھی طرح بیدار بھی نہیں ہوا تھا۔ وہی پارۂ آہن پیوست کر دیا۔ اس کے منہ سے ایک کرب واندوہ سے معمور چیخ نکلی جس نے میری بے خودی کا تمام طلسم توڑ دیا۔ مجھے ایک لمحے میں اپنے خطرناک فعل کا احساس ہو گیا۔ اب بھاگ کر جانا ناممکن تھا۔ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بھرپور آوازوں کے درمیان میں تھانے پہنچا دیا گیا۔ رات میں نے حوالات میں کاٹی۔ صبح معلوم ہوا کہ وہ نوجوان خفیف سی ضرب کا شکار ہوا ہے اور خطرے سے بالکل باہر ہے۔ عدالت نے مجھے دس ہزار کی ضمانت پر رہا کر دیا اور میرے وکیل نے اپنی عقلمندی سے فریق مخالف کو پانچ ہزار روپیہ دے کر صلح نامہ داخل کرا دیا۔ میں اب آزاد تھا۔ لیکن شکستہ دل۔ پڑھنے پڑھانے سے قطعاً بیزار۔ میں نے اپنی لائبریری چھوڑ کر روپوش ہونے کا ارادہ کر لیا۔

کلن کو اپنے مکان کا محافظ ٹھہرا کر میں اسی دن ایک نامعلوم سمت کو روانہ ہو گیا۔

کئی سال میں اسی گردش کا شکار رہا۔ انسان کبھی ایک حالت پر قانع نہیں۔ اس غیر منتہی سفر سے میرا دل بھی اکتا گیا۔ اب مجھے سکون کی ضرورت تھی۔ میرے والد بقیدِ حیات تھے اور ان سے جدا ہوئے مجھے پانچ سال ہو چکے تھے۔ میری والدہ میری عمر کے سولھویں برس میں ہی انتقال کر گئی تھیں اور اگرچہ میرے دو چھوٹے بھائی اور دو کمسن بہنیں اور تھیں لیکن اس چار سال کے عرصے میں جب تک میں والد کے پاس رہا انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔

ایک نامعلوم شے کی تلاش میں میں ادھر سے ادھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یہ خواہش بھی گدگداتی تھی کہ وطن جا کر اپنے

والد اور بہن بھائیوں کی صورت دیکھوں۔ لیکن ہمیشہ ہی میں اس خواہش کو رد کر دیا کرتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں کسی کا بھی نہیں۔ میں نے دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا تھا لیکن آہ وہ سرزمین جہاں مجھے چین ملے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ زندگی کس قدر رو دکھا آزار ہے۔ کیا مشاہیر عالم خوشی اور مسرت کی بلندیوں کو طے کر چکے ہیں۔ میرے لئے یہ راز ابھی سربستہ تھا۔ آہ جب دنیا میں کسی کا کوئی نہ ہو تو یہ خواہش کس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی ہوا اور جب کوئی ہو تو یہ آرزو کہ

ہمنشیں کوئی نہ ہو اور ہمنوا کوئی نہ ہو

میرے دل میں والد اور عزیزوں سے ملنے کا شوق فزوں سے فزوں تر ہوتا گیا اور آخر ایک دن کریں وطن سے ایک روز کی مسافت پر تھا میں نے والد کے نام تار بھیج دیا کہ فلاں گاڑی سے آ رہا ہوں۔ یہ خیال میرے لئے قدرے سکون بخش تھا کہ کل صبح سویرے اپنے عزیز و اقارب میں مل کر بیٹھوں گا۔

گاڑی اپنے مقررہ وقت پر سٹیشن آ کر رکی۔ میرے والد یہیں کے جاگیردار تھے جس وقت میں نے ٹیکٹ فارم پر قدم رکھا چار جنجس نگاہیں مجھے ڈھونڈھ رہی تھیں اور ایک لمحہ بعد میں اپنے والد سے بغلگیر تھا۔ چھوٹا بھائی مجھ سے مل کر حد درجہ محظوظ تھا اور سٹیشن پر ہی کہنے لگا کہ ہم نئی امی لے آئے ہیں۔ وہ بہت اچھی ہیں اور اس قدر تعریفوں کے پل باندھنے لگا کہ میرے دل میں اسے دیکھنے کی زبردست خواہش محسوس ہونے لگی۔ جب میں گھر گیا تو عزیز کشاں کشاں مجھے زنان خانے کی طرف لے چلا۔ میں نے صحن میں اپنا قدم رکھا ہی تھا کہ حیرت سے میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا "در دانہ" ہمی آشنا ہیں عزیز اس کی ٹانگوں کے ساتھ اتی اتی جان کہ کر چمٹ گیا۔ ہماری نگاہیں ایک لمحے کے لئے دو چار ہوئیں اور میں دیوانخانے میں لوٹ آیا۔ اس وقت میرے دل کی جو حالت تھی نہ میں بیان کر سکتا ہوں اور نہ کسی سے بیان ہو سکتی ہے

ہنیں اور بھائی میرے ساتھ چمٹ چمٹ کر خوش ہو رہے تھے اور ان کا یہ عالم میرے خیالات کو مجتمع ہونے سے ہر چند روک رہا تھا لیکن حقیقت میں میں کسی اور ہی دنیا میں آباد تھا۔

چند لمحوں کے بعد چائے تیار تھی اور سامنے میز پر والد بیٹھے تھے وہ مجھ سے کہنے لگے۔ "غیروزہ کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟" میں چونک پڑا۔ آپ کا مطلب"؟ مسکرا کر کہنے لگے۔ "ہاں ہاں تمہاری وا . . . . "

میں جھینپ سا گیا۔ "بہت اچھی ہیں ابا جان"

"نہیں پتا ہے یہ کیسے ہاتھ لگیں"؟ ڈھائی تین سال ہوئے میں نے بچوں کی غور و پرداخت کرنے کے لئے کسی آنریبل خاتون کی ضرورت کے سخت اخبارات میں اشتہار دیا تھا۔ اس کے چند روز بعد ہی خاتون حصول ملازمت کے مقصد سے مجھ سے ملنے آئیں اور اپنی خدمات پیش کیں۔ میں نے ان سے ان کا گزشتہ حال دریافت کیا کہنے لگیں میں اس کے متعلق آپ سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی خواہ آپ مجھے ملازم رکھیں یا نہ رکھیں اور یہ شرط بھی پیش کی آئندہ کبھی یہ سوال نہیں کیا جائے گا۔ مجھے ان کی پیشانی سے نجابت کے آثار دکھائی دئے۔ اگرچہ یہ اس وقت نہایت شکستہ حالت میں تھیں۔ میں نے ان کی شرط منظور کر لی اور گھر کا انتظام ان کے سپرد کر دیا تین سال کے عرصے میں ان کی دیانت۔ شرافت اور نیکی نے میرے دل پر نہایت گہرا اثر کیا۔ آج تک ان کی نگاہیں کبھی مجھ سے دو چار نہیں ہوئیں۔ اور نہ کبھی ضرورت کے علاوہ اس نے کوئی بات کی ہے۔ یہ بات البتہ قابل ذکر ہے کہ یہ ہمیشہ سیاہ لباس پہنتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے غم میں سوگوار ہے۔ لیکن اب اس کی زندگی بہت بہتر ہو جائیگی۔

ایک مہینہ ہوا میں نے اسے شادی کرنے کے لئے کہا۔ اگرچہ تمہاری والدہ کی وفات کے بعد میرا شادی کرنے کا ارادہ تھا اور نہ اس پچاس سال کی عمر میں مجھے اس کی ضرورت تھی۔ اس نے مجھ سے ایک مہینہ کا عرصہ سوچنے کے لئے مانگا۔ کل جس وقت ہمارا نکاح ہوا سب سے پہلی خوشی کا پیغام جو آیا وہ تمہارے آنے کا تار تھا میں اسے نہایت مبارک فال خیال کرتا ہوں"۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر یہ تمام کہانی سنتا رہا کہ وہ کہنے لگے۔ "ہاں تو تم نے کچھ نہیں کہا نسیم" میں نے چونک کر جواب دیا۔ "ہاں ابا جان نہایت نیک فال ہے۔ لیکن میں تو یہاں صرف آپ کی قدم بوسی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا تھا اور میں آج ہی رات چلا جاؤں گا"

"نہیں بیٹا۔ مجھے چھوڑ کر تم کیوں چلے جاؤ گے! اس بات کا جواب میں کیا دے سکتا تھا میں نے وہ تمام دن دیوانخانے میں ہی

گزارا۔ میرے سر پر وحشت سوار تھی۔ رات میں نے ہمیشہ کے لئے اپنے وطن کو خیرباد کہا۔

میرے دل میں اپنی لائبریری اور کلن کو دیکھنے کی خواہش محسوس ہوئی اور میں نے اسی طرف کا رخ کر دیا۔ تین روز کے بعد شام کے دھندلکے میں میں اپنے مکان کے دروازے پر تھا۔ کلن نے دروازہ بند کر رکھا تھا۔ میری آواز پر اس نے بے پروائی سے کہا۔ "کون ہے! ابھی آتا ہوں"۔ شاید اس نے پہچانا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر "سرکار آپ آ گئے" کہہ کر مجھ سے لپٹ ہی تو گیا۔

میں ایک پتھر کی مورت کی طرح بالکل بے حس تھا۔ اس نے جلدی سے میری ضرورت کے مطابق چائے اور کھانے کا انتظام کیا میں اپنے مطالعہ کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ تمام کمرہ بہترین صفائی اور نفاست کا مرقع تھا۔ غالباً کلن اپنے دن کا بیشتر حصہ اس کی صفائی میں صرف کر دیتا تھا۔ میں خالی اور تھکی ہوئی نگاہوں سے کھلی ہوئی کھڑکی میں سے بے کیف فضائے آسمانی کی طرف تک رہا تھا کہ وہ کرسی کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "سرکار اگر حکم دیں تو ایک بات کہوں"۔ میں نے متوحشانہ جواب دیا "ہاں کہو"۔ اس نے کہا۔ "سرکار جس روز آپ کا فیصلہ ہوا تھا اور آپ چلے گئے تھے اسی شام وہ یہاں آئی اور مجھ سے آپ کی بابت پوچھا۔ میں نے کہا وہ تو چلے گئے خدا معلوم کہاں۔ پھر وہ اسی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر سر جھکائے بہت دیر تک روتی رہی۔ پھر بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھی اور کہنے لگی میں جاتی ہوں ان کو تلاش کرنے اور دیوانہ وار یہاں سے نکل گئی۔ جاتی دفعہ اس نے یہ الفاظ کہے۔ اگر وہ کہیں آجائیں تو ان سے یہ بات میری زبانی کہنا۔

میری زندگی ان کی یاد سے وابستہ تھی میری زندگی کا سہارا ان کی یاد ہوگی۔ کاش وہ اپنی کنیز کو اپنے پاس رکھتے"۔

میں نرع کی سی حالت میں یہ افسانہ جانگداز سنتا رہا۔ اختتام پر میں نے کلن سے کہا۔ جاؤ کلن اب تم آرام کرو۔ میں یہ سوچتا ہوں۔

"مسرت میرے قریب آ آ کر بھی مجھ سے دور کیوں رہتی ہے"؟

"میری بے کیف زندگی کا مقصد کیا ہے"؟

"محبت یا سوز ناتمام"؟

نذیر احمد خاں مرغوب ایم اے

غزل

سوز نہاں ہے اس قدر ہجر رخ نگار میں
آگ سی ہے لگی ہوئی رشتۂ جان زار میں

گردش چرخ سے نہ ڈر شوق سے کوہ غم اٹھا
وزن نہ ہو سبک مگر دیدۂ اعتبار میں

گلشن دہر کی ہوا دشمن انبساط ہے
کھلتے ہیں کب گل مراد گلشن روزگار میں

سینے سے تیرے متصل، شاید اسے قرار ہو
گوندھ لے میرے دل کو بھی اپنے گلے کے ہار میں

بندہ نوازیاں ہیں یہ آپ کے لطف عام کی
بات تو ورنہ کچھ نہ تھی جوہر خاکسار میں

کنول نین جوہر
پی سی۔ ایس لائل پور

غزل

سر مستیوں میں روحِ جوانی مچل گئی! یعنی بہارِ سوزِ بہاریں سے جل گئی

کیا یاد کر کے عشرتِ رفتہ کو روئیے اک لہر تھی جو ناچتی گاتی نکل گئی

وہ ایک لمحہ جس میں ہوئی تھی نظر دوچار اُس ایک لمحے میں مری دنیا بدل گئی

تھی سسکیوں میں لپٹی ہوئی ایک یاد آہ موجِ نسیم آج کلیجہ مسل گئی

چھیڑا جو تو نے ساز کے پردوں کو مطربہ! محسوس یہ ہوا کہ مری جاں نکل گئی

یادش بخیر، عہدِ محبت کی شاعری ایک آہ تھی جو گیت کے سانچے میں ڈھل گئی

اخترؔ گھٹائیں جھوم کے برسیں کچھ اس طرح
ارمان جاگ اٹھے، تمنّا مچل گئی

اخترؔ انصاری

عورت

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

افراد:۔

ڈاکٹر رضا ۔۔۔۔۔ شعیب کا دیرینہ دوست عمر ۴۰ سے اوپر
شعیب ۔۔۔۔۔ سہیل کا باپ عمر ۴۲ کے لگ بھگ
سہیل ۔۔۔۔۔ شعیب کا بیٹا عمر ۴ سال
میری ۔۔۔۔۔ نرس

(ایک کمرہ جس میں ایک چارپائی پر سہیل لیٹا ہوا ہے اس کے سرہانے ذرا دور میز پر بجلی لیمپ جل رہا ہے جس کی مدھم روشنی اس کے نحیف اور بیمار چہرہ پر پڑ رہی ہے۔ باقی بدن لحاف سے ڈھکا ہوا ہے۔ پاس ہی چارپائی پر دواؤں کی ہندوتیں پڑی ہیں۔ بائیں طرف دیوار پر کلاک ٹک رہا ہے اس کے نیچے ایک بڑا میز رکھا ہے تین آرام کرسیاں ہیں ایک پر شعیب سر جھکائے بیٹھا ہے۔ چہرہ پر غم کے آثار ہویدا ہیں۔ دوسری پر ڈاکٹر لیٹا ہوا ہے اور آنکھیں اوپر چھت پر جمی ہوئی ہیں۔ تیسری خالی ہے سامنے دیوار میں ایک کھڑکی ہے جو باہر کھلتی ہے اس وقت بند ہے ۔۔۔۔۔ بارش اور ہوا کی ملی جلی آواز آ رہی ہے۔ کبھی کبھی بادل بھی گرجتا ہے۔ کلاک ٹن ٹن دو بجاتا ہے۔ ڈاکٹر کلاک کی طرف دیکھتا ہے۔ شعیب چونک کر اٹھتا ہے)

شعیب۔ دو بج گئے۔ دوا دینی چاہئے؟

ڈاکٹر۔ ہاں (اٹھتا ہے مریض کے قریب آکر اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا ہے۔ وہ بے ہوش پڑا ہے) میرے خیال میں بھاپ بھی دے دینی چاہئے۔

شعیب۔ اچھا (گھنٹی بجاتا ہے۔ ایک نرس چہرے پر نقاب ڈالے داخل ہوتی ہے) میری! کھولتا ہوا پانی لاؤ۔ مریض کو بھاپ دی جائے گی۔

میری۔ بہت اچھا (چلی جاتی ہے)

شعیب۔ (ڈاکٹر کے پاس کھڑا ہو کر افسردگی سے مریض کو تکتا ہے اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتا ہے) اوہ۔ بدن تو ویسے ہی پھنک رہا ہے (گھٹنوں پر جھک کر بھرائی ہوئی آواز میں) بیٹا ہوش کرو۔

ڈاکٹر۔ (اوں ہوں۔ اسے بلاؤ نہیں (چارپائی میں دو انجکشن دیتا ہے مریض کو مطلق ہوش نہیں ڈاکٹر اور شعیب دانتوں کو چیر کر دو احمق ہیں اٹھتے ہیں)

شعیب۔ (سہیل قطعاً بے ہوش ہے۔ آہ ڈاکٹر میرے دماغ میں برے برے خیال آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر۔ (ظاہری صورت سے) گھبراؤ نہیں خیریت ہے ۔۔۔۔

شعیب۔ آہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ خدارا مجھ سے کچھ چھپاؤ نہیں ہر بری خبر سننے کے لئے تیار ہوں۔ رضا مجھے فریب میں نہ رکھو! بولو۔ بولو۔

ڈاکٹر۔ (اس کی تیز اور متجسس نگاہوں کی تاب نہ لا کر شکستہ الفاظ میں) کیسے کہوں شعیب۔ اگر تین گھنٹے تک بخار نہ اترا تو سہیل کی جان خطرے میں ہے۔

شعیب۔ (روتے ہوئے ہاتھ مار کر) آہ۔ سہیل کی جان خطرے میں۔ میرا لختِ جگر معصوم سہیل۔ آہ سہیل بچ جائے۔ میں مر جاؤں (مریض کی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ حالت غشیان میں کرب و بے چینی سے ہاتھ پیر مارتا ہے) میرے معصوم بچے۔ مجھ بدنصیب کو تنہا نہ چھوڑ جانا تیرے بغیر میری زندگی موت سے بدتر ہے۔ میں نے آج تک

تیری ہر معمولی سے معمولی خواہش کو پورا کرنا اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا۔ بیٹا سہیل مجھ سے نہ روٹھ جانا۔ تیرے بھولے بھالے چہرے کو دیکھ کر میں اپنے دردناک ماضی کو بھول جانا سیکھ گیا تھا۔ ان پیاری آنکھوں کو کھولو سہیل۔ خدارا کھولو ان آنکھوں کو جن سے نکلی ہوئی ایک ایک نگاہ نے مجھے صبر و ضبط کا ایسا سبق دیا جو بڑے سے بڑا فلسفی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ آہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی خوشی نہیں دیکھی۔ قدرت نے جب مجھے بڑا کیا تو میں سمجھا کہ میرے مقدر کا ستارہ اب اپنے عروج سے نکل چکا ہے میں نے مجھے پالینے کے بعد اپنی داستانِ غم کو رفتہ رفتہ بھلا دینا چاہا۔ آہ سہیل۔ تیرے معصوم چہرے کے سامنے اور تیری ماں جگمگاتی ہوئی مقدس آنکھوں کے روبرو میرے لئے کائنات بھر کے تمام بیش بہا خزانے اور جہان بھر کی تمام لطیف ترین نعمتیں ایک حذف سے بڑھ کر وقعت نہ رکھتی تھیں۔ آہ اب قدرت مجھ کو مجھ سے چھین لینے پر مصر ہے رماتھے پر ہاتھ مارتا ہے) آہ سہیل قدرت نے مجھے مجھ کو دیا ہی کیوں تھا۔

ڈاکٹر۔ حوصلہ کرو شعیب۔ اٹھ (اس کو اٹھاتا ہے) سہیل کو بھاپ دے دیں۔ دیکھو ابھی آرام ہو جائے گا۔ تم تو بہت صابر تھے (گھنٹی کا بٹن دباتا ہے۔۔۔) میری نہیں آئی۔ باہر کہیں ہے شاید۔ دیکھو تو رشعیب باہر جاتا ہے۔ ڈاکٹر کمرے میں ٹہلتا ٹہلتا کھڑکی کو کھولتا ہے باہر گھپ اندھیرا ہے۔ بادل گرجتا ہے۔ مریض کرب و بے چینی میں ہاتھ پیر مارتا ہے اور حالت ہذیان میں کہتا ہے۔ "ماں ماں۔ ماں۔ آں۔" ڈاکٹر کھڑکی بند کر کے مریض کی نبض دیکھتا ہے اُس کو لحاف سے ڈھانکتا ہے اور پھر ٹہلنے لگتا ہے اور آپ ہی آپ کہتا ہے) خدا کرے یہ بچ بچ جائے شعیب تو مر جائے گا۔ خدا تو بڑا رحیم ہے۔ ایک تنہا باپ کی زندگی جس نے اس بچے کو چودہ سال پالا پوسا اتنے سے اتنا کیا اب اُس کے سامنے زندگی کی آخری گھڑیاں گزارے توبہ خدایا ـــــ یہی ننھی سی جان اس کی تمام عمر کی کمائی ہے تیرے خزانۂ غیب میں رحمت کی کمی نہیں اگر تو اب بھی سہیل کو شفا دے دے تو تیری قدرت بے مثال سے کچھ بعید نہیں۔ (قدموں کی آہٹ سن کر خاموش ہو جاتا ہے۔

شعیب اور میری داخل ہوتے ہیں) یہاں رکھ دو دیگچی۔

میری۔ (دیگچی رکھ کر) کیا حال ہے اب ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر۔ ویسا ہی ہے۔ دعا کرو۔

میری۔ دعا! ایک بے معنی لفظ ہے۔ کیا خدا خود ہماری مصیبتیں نہیں دیکھتا کیا وہ انتظار کرتا رہتا ہے کہ ہم دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں تو وہ رحم کرے۔ آپ کا خدا کتنا تنگ دل خدا ہے

ڈاکٹر۔ چپ میری۔

مریض (بے ہوشی میں ہاتھ پیر مارتا ہے) ماں ـــ اوہ۔ ماں۔

شعیب۔ ہائے بیٹا تیری ماں کو کہاں سے لاؤں۔ وہ یہاں کہاں بیٹا۔ بے ہوشی میں بھی مجھے وہی ملعونہ یاد آ رہی ہے (چارپائی پر جھک جاتا ہے) مجھے بتا سہیل پیارے۔ تیرا باپ حاضر ہے۔

ڈاکٹر۔ (رکھ سفوف باہم ملا رہا ہے) میری دیگچی کو بستر کے قریب کر دو۔

شعیب!!! (شعیب کچھ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ میری دیگچی کو بستر کے قریب رکھتی ہے) سہیل کو اب اس طرف کروٹ دلاتا ہے۔ نرس اور شعیب مریض کو کروٹ دلاتے ہیں۔ نرس سہیل کے سر کو ذرا آگے کو تھامے رکھتی ہے۔ ڈاکٹر ڈھکنا اٹھا کر دیگچی میں دوا الٹ دیتا ہے اس میں سے سفید سی بھاپ اٹھنے لگتی ہے ـــــ مریض کھانستا ہے) بس نرس اب سیدھا لٹا دو۔

شعیب۔ یا خدا رحم!!!

ڈاکٹر۔ (دیگچی پر ڈھکنا دیتے ہوئے) لے جاؤ اسے میری۔ (میری لے جاتی ہے)

شعیب۔ اب آفاقہ ہو جائے گا؟؟؟

ڈاکٹر۔ امید تو ہے۔

شعیب۔ اچھا ـــــ!!! دوسری خوراک کس وقت دینی ہے؟

ڈاکٹر۔ اب دو گھنٹہ تک کوئی دوا نہیں دی جائے گی۔ پانچ منٹ کے بعد ٹمپریچر لینا ہے اگر کم ہو گیا تو خطرہ سے بچ نکلنے کا امکان ہے

شعیب۔ (خوشی سے) اچھا۔

ڈاکٹر۔ بیٹھ جاؤ۔ تم فکر نہ کرو دیکھو خدا کو کیا منظور ہے (دونوں بیٹھ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر جیب سے سگرٹ نکال کر سلگاتا ہے ایک شعیب کو دیتا ہے)

شعیب۔ نہیں جی نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر۔ بہت سردی ہے شعیب۔ صرف ایک پی لو ـــــ (شعیب سگرٹ سلگا لیتا ہے دونوں خاموش بیٹھے کش لیتے رہتے ہیں

شعیب کلاک کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

(۳ منٹ خاموشی)

شعیب۔ رضا اتنی غمزدگی کیوں ہو رہی ہے۔؟

رضا۔ چونکہ اخراجات دماغ کی طرف صعود کر رہے ہیں اس لئے ہذیان کی نوبت آ گئی ہے۔ (کلاک کی طرف دیکھ کر) دو منٹ اور باقی ہیں۔

شعیب (کلاک کو دیکھ کر) یا خدا رحم کر ——— یہ بھاپ تپ کو کم کرتی ہے!

ڈاکٹر۔ ہاں ——— دیکھو۔ ابھی اپنا اثر دکھائے گی۔

(خاموشی)

(ڈاکٹر جیب سے تھرمامیٹر نکال کر جھٹکتا ہے اور کلاک کی طرف دیکھتا ہے۔ دونوں اٹھتے ہیں۔ مریض کی چارپائی کے قریب ٹھہرتے ہیں۔ ڈاکٹر پھر کلاک کی طرف دیکھتا ہے۔ تھوڑی انتظار کے بعد تھرمامیٹر لگاتا ہے ——— شعیب اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپائے سر کو دائیں بائیں منہ میں کچھ گنگنا رہا ہے۔ جیسے دعا میں محو ہے ——— ڈاکٹر تھرمامیٹر نکالتا ہے۔ دیکھ کر خوشی سے کہتا ہے) ٹمپریچر کم ہو گیا (تھرمامیٹر شعیب کو دیتا ہے)

شعیب۔ (تھرمامیٹر دیکھ کر) خدایا شکر ہے تیرا۔ میرے بچے پر رحم کر (دونوں کرسیوں کی طرف جاتے ہیں۔ شعیب بیٹھنے سے پہلے واپس مڑ کر مریض کی پیشانی پر بوسہ دیتا ہے پھر کرسی پر بیٹھتا ہے) کیا بعید ہے ڈاکٹر سہیل کو خدا آرام دے دے۔

ڈاکٹر۔ خدا کی رحمتوں سے کوئی بعید نہیں۔ خدا پر بھروسہ کرو شعیب۔

سہیل۔ ہائے ——— ماں ——— آں۔

شعیب۔ (رنجش پر نظریں گاڑ کر) آہ بے ہوشی میں بھی کہتا ہے "ماں" (شکستہ الفاظ میں) اف ماں بھی کیا چیز ہے!؟؟

ڈاکٹر۔ جب باہر تھے تم اُس وقت بھی کہتا ہے۔

شعیب۔ کب؟

ڈاکٹر۔ جب تم میری کو بلانے گئے تھے ——— میری کیا خود پانی گرم کر رہی تھی تم نے بہت دیر کر دی تھی وہاں؟

شعیب۔ مجھ کو کم بخت سو گیا تھا۔ بے چاری خود کو لئے سلگا رہی تھی۔

ڈاکٹر۔ میری بڑی اچھی نرس ہے۔

شعیب۔ بیشک رضا اُس نے تو میری تکلیف آدھی کر دی ہے۔ خدا اُس کو اجر دے۔ میرا خیال تھا نرسیں بہت ہمدرد نہیں ہوا کرتیں۔ اُس نے تو خدا کی قسم کئی کئی راتیں سہیل کے سرہانے آنکھوں میں کاٹ دی ہیں۔ اُس کے اخلاق کی میں تعریف نہیں کر سکتا۔ ابھی جب میں نے پوچھا کہ وہ خود کو لئے کیوں سلگا رہی تھی تو کہنے لگی۔ ملازم کل رات بھی نہیں سو سکا ابھی ابھی اُس کی آنکھ لگ گئی تھی میں نے اُسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے کہا وہ بھی تو تمہاری طرح ہی ہے۔ تم کیوں جاگ رہی ہو؟ کہنے لگی اپنے اپنے فرض کا احساس ہوتا ہے اگر اُسے اب جگاتا بھی تو کام تو کر دے گا مگر بددلی سے جس کام کو خوشی خوشی نہ کیا جائے۔ اُس میں خدا کی برکت نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر۔ کبھی کبھی تو بہت معقول بات کرتی ہے۔ مگر یہ نقاب کیوں پہنتی ہے؟

شعیب۔ پتہ نہیں۔ میں نے اس کے متعلق اُس سے جب وہ میرے پاس ملازمت کے لئے آئی تھی سوال کیا تھا جس کا جواب اس نے نہایت غمگین آواز سے ان الفاظ میں دیا کہ میں ایک غمزدہ عورت ہوں۔ عیسائی ہونے سے پہلے ایک راسخ الاعتقاد جینی عورت تھی اور اب بھی جب کہ مجھے عیسائی ہوئے کئی برس گزر چکے ہیں۔ میرے گزشتہ مذہب کے کئی اعتقادات میرے ساتھ ساتھ ہیں مثلاً اب بھی میرا ضمیر مجھے قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ میرا سانس ہوا میں سمائی ہوئی ننھی ننھی جانوں کے لئے موجب ہلاکت ہو۔ میں کیوں عیسائی ہوئی یہ ایک طویل داستانِ غم ہے جو میں کسی کو بھی ہرگز سنانے کے لئے تیار نہیں ——— جناب آپ میرا کام دیکھیں میری ذات کے متعلق سوال کرنا قطعی لاحاصل ہے۔ بعد ازاں مجھے اُس سے سوال کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوئی اور نتیجہ تو یہ ہے کہ اُس نے مجھے اتنا آرام پہنچایا ہے کہ میں نے عمداً اس سے کبھی کچھ دریافت ہی نہیں کیا ———

ڈاکٹر۔ اس سے پہلے بھی تم نے کوئی نرس رکھی تھی؟

شعیب۔ نہیں ڈاکٹر ایسی نرس مجھے بھلا کہاں مل سکتی تھی۔ خدا سازی بات ہے کہیں ابھی اپنے کمرے میں نرس کی ضرورت کا اشتہار لکھ رہا تھا کہ ملازم نے اطلاع دی کہ ایک نرس ملاقات کے لئے آئی ہے۔ میں نے کہا اُسے اندر بھیج دو۔ تب یہ اندر آئی

اور اس سے معاملے ہو گیا۔ میں نے اُسے جب یہ کہا کہ تیری یا مریض کی ماں مر چکی ہے اس لئے تیمارداری کے تمام انتظامات کی تنہا ذمہ دار تم ہی ہو اس لئے تم کو بہت دلجمعی سے مریض کی خدمت کرنی ہوگی۔ اُس کا جواب پتہ ہے کیا تھا؟ میں سہیل کو اپنا بیٹا یا بھائی سمجھ کر خدمت کروں گی اگر ایک بار بھی شکایت کا موقع دوں تو آپ مجھے ایک پیسہ دئے بغیر نکال سکتے ہیں۔ اُس کے اس ہمدردانہ جواب نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ واقعی ڈاکٹر اُس نے جس تندہی سے سہیل کی خدمت کی ہے۔ میرا دعوے ہے مائیں بھی نہیں کر سکتیں ——

ڈاکٹر۔ خیر یہ تو تمہارا مبالغہ ہے۔ ماں اور پھر اپنی اولاد کی بیمار اولاد کی خدمت نہ کرے یہ ناممکن ہے۔

شعیب۔ (لمبی سانس لے کر) آہ! دنیا میں ایک جیسی مائیں نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر۔ لیکن اولاد کے معاملہ میں سب ایک جیسی ہیں۔

شعیب۔ نہیں ڈاکٹر تم بھی پر جوش میری بات کو رد مت کرو۔ میرے الفاظ میری زندگی کا نچوڑ ہیں (جوش میں) کون ہے دنیا میں جو میرے الفاظ کو جھٹلا سکے۔ میں نے ان کو قیمتاً —— قیمتاً خریدا ہے۔ سہیل کی جلا ماں کو دیکھو ڈاکٹر! نے ——

ڈاکٹر۔ شعیب کیوں مردے اکھیڑتے ہو۔ وہ جلا دتھی؟؟؟

شعیب۔ مُردے؟؟ ہنسہ جلا دتھی جلاد۔ ظالم جلاد۔ اس وقت وہ مجھے اڑا رہی ہے رضا خدا کی قسم مجھے اڑا رہی ہے۔ مری کب تھی وہ نابکار۔ مجھے مار گئی تھی تمہیں علم نہیں کیا؟ میں نے سب داستان تمہیں لکھ دی تھی۔

ڈاکٹر۔ داستان!!! کیسی داستان؟؟؟

شعیب۔ کیسی داستان؟ اُس کے بھاگ جانے کی ——

ڈاکٹر۔ کیا تم دیوانے ہو گئے ہو شعیب! آج سے چودہ پندرہ برس پہلے اُس کی موت کے متعلق تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا خط مجھے دراس میں ملا تھا۔

شعیب سچ کہتے ہو رضا! —— اور تو اور آمنہ سے بھی میں نے یہ راز پوشیدہ رکھا۔ وہ معلوم نہ مری نہیں تھی۔ بھاگ گئی تھی ——

ڈاکٹر۔ (کرسی کو اُس کے قریب کھینچ کر) ہیں بھاگ گئی تھی؟! آج تک میں تاریکی میں رہا۔

شعیب۔ میں نے اپنے حلقۂ اعزہ و احباب میں ہر ایک کو اس کی موت کی خبر دی تھی اور آج تک یہ سمجھتا رہا کہ صرف تمہیں میں نے ساری کی ساری داستان لکھ دی ہے۔ رضا میں اس سانحہ کے بعد کئی برس تک جنونی سا رہا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا ہو گیا ہے۔ میں پاگل تھا تم صحیح کہتے ہو میں نے تمہیں بھی اس کے مرنے کی ہی خبر دی ہوگی درانحالیکہ سمجھتا یہ رہا کہ اصل واقعہ کے متعلق تمہیں اطلاع دے چکا ہوں۔

ڈاکٹر۔ واقعہ کیا تھا وہ؟

شعیب۔ آہ وہ حسن و پیار رضا تم کو شاید علم نہیں کہ حسنہ بچپن سے اپنے چچیرے بھائی سے منسوب تھی اور آغاز شباب میں ایک آدھ سال تک ان کے درمیان عشق و محبت سے لبریز نامہ و پیام کا تبادلہ بھی ہوتا رہا تھا۔ ایاس کی طبیعت میں فطرتاً لاابالیاپن اور آوارگی تھی۔ ایسے آدمی ہر قسم کی ذمہ داری سے جو اُن کی آزاد منش طبیعت پر ایک قید کی طرح گراں گزرے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ وہ شادی سے ایک برس پہلے گھر سے بھاگ کر انڈیا چلا گیا۔ اُس خوب صورت جادو گر کی جدائی میں حسنہ کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ تھی مگر آہ اس وقت قضا و قدر کے خرمنتے اسی فن میں میری دائمی بربادی اور تباہی کا فیصلہ کر رہے تھے۔ دو برس بعد میرا مقدر مجھے اُس کے آستانے پر لے گیا اور میں چپکے چپکے اُسے چاہتا رہا۔ حتیٰ کہ ایک برس کے صبر و شکیب کے بعد مجھے یارائے ضبط نہ رہا میں نے اظہار محبت کے لئے زبان کھول ہی دی اُس کی نگاہیں جھک گئیں۔ مجھے اب تک یاد ہے —— جب میں نے اُس کے بے جان ہاتھ پر اولیں بوسہ دے کر اپنی چاہت کا نتیجہ اُس کے حسین چہرے سے اخذ کرنا چاہا تو اُس کی آنکھوں سے ایک مُرصّع آنسو نکل کر اُس کے خستہ پر تھرتھرایا اور نیچے گر پڑا۔ عورت شاید جام محبت سے ایک گھونٹ پی کر اس کے کیف آگیں نشے سے سرشار ہو کر پیالہ ہاتھ سے دینا نہیں چاہتی۔ وہ بھی محبت کی پیاسی تھی۔ لوگوں نے ہر چند رکاوٹیں پیدا کرنا چاہیں مگر ہم نے ایک دوسرے سے ایسا رشتہ استوار کر لیا کہ کبھی ٹوٹنے کا شائبہ تک نہ رہا۔ شادی کے وقت اُسکی عمر بیس اور میری تیس برس کی تھی۔ ہماری شادی کے دو

برس بعد الیاس افریقہ سے واپس آگیا اور اس کی آمد کی خوشی میں اس کے باپ نے ایک بہت بڑی شاندار دعوت دی ہم بھی مدعو تھے۔ مجھے اُن دنوں کام کاج سے ایک منٹ کی فرصت بھی نہ تھی اور وہاں سے شرکت کے لئے خط پر خط آرہا تھا۔ آخر میں نے اپنے لئے معذرت پیش کرتے ہوئے حسنہ کو بھیج دیا۔ وہ اُن دنوں حامد علی کو کئی ایک مہینہ وہاں رہی ہوگی۔ واپسی پر جب الیاس کے متعلق باتیں چھیڑیں تو مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ افریقہ سے بہت دولت کما کر لایا ہے ——— حسنہ گو پہلے کی طرح بدستور اب بھی میرے آرام و آسائش کا خیال رکھتی رہی مگر میں نے ایک تبدیلی اس میں یہ پائی طور پر دیکھی۔ میرے روبرو ہر چند وہ ویسے ہی مسرور قہقہے لگاتی رہتی مگر میں الگر جب وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوتی اُس کو اداس اداس کسی غمناک سی سوچ میں پڑے ہوئے دیکھا کرتا اور آہ میری نادانی میں یہ سمجھتا رہا کہ اس کو چونکہ تکلیف ہے اس لئے بیزار سی رہتی ہے مگر یہ نام و ہم میرے سامنے حقیقتیں بن کر روشن ہوئے۔ جب وہ چھ مہینے کے معصوم سہیل کے ننھے کے نیچے ایک مختصر مہمل سی تحریر چھوڑ کر بھاگ گئی ——— مجھے یقین ہے کہ وہ الیاس ہی کے ساتھ ہندوستان سے کہیں باہر چلی گئی تھی کیونکہ اس واقعے کے ایک ہفتہ بعد جس طرح الیاس پہلے گھر سے بھاگ گیا تھا اُسی طرح اب پھر اچانک غائب ہوگیا۔ وہ یقیناً اُسی کے ساتھ گئی تھی مجھے یقین ہے ——— یقین ہے (اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر) آہ رضا عورت کو سمجھ لینا آسان کام نہیں۔ اس کی فطرت کبھی ظاہر نہیں ہوسکتی۔ مجھے اب تک یاد ہے آج سے سالہا سال قبل اُس کی آنکھوں سے نکلا ہوا وہ ننھا سا آنسو مجھے اب تک یاد ہے۔ آہ اُس کو میں نے اپنی محبت کے جوش میں محبت کا اشارہ سمجھا تھا۔ اُف ہماری کرخت فطرت بھی عورت کے صرف ایک آنسو کے سامنے اپنے تمام ہتھیار ڈال دیتی ہے وہ معمولہ مجھے زندہ میں لاکر الیاس کا انتقام مجھ سے کرہ گناہ سے لینا چاہتی تھی (ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں ڈال کر زور سے دباتا ہے) ڈاکٹر! اُس نے آغاز شباب میں الیاس کو اک شدید ترین جذبۂ محبت سے چاہا تھا۔ یہ مت سمجھ کہ چنگاری جب راکھ میں دب جائے تو اُس کا وجود عدم کے برابر ہو جاتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ ایک شعلۂ جوالہ بننے کے لئے بے قرار رہتی ہے اور ہر ذرا سی ہوا سے لپٹنے سے وہ ایک بھڑکتا ہوا شعلہ بن جاتی ہے۔

رضا! اُس کے بھاگ جانے کے بعد میری زندگی نے ایک سخت پلٹا کھایا ——— ابتدا میں تو اکثر پرانی باتیں یاد آآ کر مجھے تڑپایا کرتی تھیں مگر پھر میں نے سوچا کہ کیوں جان کو ہلاک کرنا بے سود ہے جس عورت نے میری محبت کی اور اپنے جگر کے ٹکڑے کی بھی پروا نہ کی اور راتی سخت دل ہو کر اس کو ہمیشہ کے لئے اپنے سے علیحدہ کر کے ایک آوارہ منش شخص سے بھاگ جانا گوارا کر لیا، اُس کا خیال کرنا دنیا میں سب سے بڑی حماقت ہے (آنکھیں نکال کر) جس طرح اس نے کئی برس متواتر مجھے کانٹوں پر لٹایا ہے۔ اُسی طرح راتیں بھی اسی طرح پریشان ہو کر رہیں گی۔ وہ کبھی چین نہ پاسکے گی میری بددعائیں کبھی خالی نہیں جاسکتیں ——— آہ کبھی کبھی حسنہ سے انتقام لینے کا خیال مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری کر دیتا اور میں بارہا سہیل کو اور اپنے آپ کو گولی سے ہلاک کر دینے کے درپے ہو جاتا مگر کسی غیبی طاقت کے ماتحت ہمیشہ رک جاتا۔ عورت اور وفا۔۔۔ پانی اور آگ!!! (انگلیوں کی طرح ہنستے ہوئے) دنیا کس سب سے ناقابل اعتبار چیز ہے ——— رضا تم حیران کیوں ہو رہے ہو۔ انسانی زندگی کیسر سوز و گداز ہے۔

ڈاکٹر۔ (جو اُس کی داستان غم سنتے سنتے کھو سا گیا تھا اپنے آپ کو سنبھال کر) ایک لمبی سانس لے کر) واقعی شعیب فطرت تمہارے معاملے میں بہت بے انصاف واقع ہوئی ہے۔

شعیب۔ بے انصاف؟ اُس نے برسوں سے مجھ سے طمانیت قلب چھین لی ہے سالہا سال سے میرے لبوں سے مسکراہٹ فوج لی ہے اب اس خزینہ داستان کا اعادہ کرتے وقت میرا دل اور دماغ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پھٹ جائیں گے مگر آہ ان آنکھوں میں ایک آنسو نہیں آتا۔ یہ سچ ہیں میں نے ان کے راستے اتنا پانی بہا دیا ہے کہ عورتوں کی وفاداری پر ناز کرنے والے گویوں نے اتنا پیا بھی نہیں ہوگا۔ (دنیا جانتا ہوں کہ رونا نہیں آتا ———

ڈاکٹر۔ (حیران ہو کر) شعیب! اس اندوہناک واقعے کے متعلق کس کس کو علم ہے؟

شعیب۔ کس کس کو علم ہے، میری بہن اور حسنہ کا باپ آج تک یہی سمجھتے

ہیں کہ میری بیوی مر چکی ہے۔ میں نے اُن کو بھی یہی اطلاع دی تھی میری خود داری یہی چاہتی تھی رضاء آمشروع شروع میں میرا سینہ اس ہولناک راز کو اگل دینا چاہتا تھا مگر ہزار دقتوں اور لاکھ کوششوں کے بعد میں نے اپنی طبیعت پر جبر کر لیا اور آج تک جبکہ سہیل کی عمر کا چودھواں سال گزر رہا ہے یہ راز میرے سینے میں دفن رہا ——— آج۔ اتنی طویل تر میں مدت کے بعد جب قدرت نے دو بچھڑے ہوئے دوستوں کو یہاں مسوری میں لا ملایا ہے شاید اس کو یہی منظور تھا کہ میرے لبوں کی سنگین خاموشی تمہارے روبرو پاش پاش ہو جائے۔ رباط ول زور سے گرتا ہے سہیل چیخ مارتا ہے)

شیعب۔ او وہ بیٹا! (دونوں لپک کر چارپائی پر جھک جاتے ہیں اور ایک آدھ لمحہ گھبرائے ہوئے کھڑے رہتے ہیں)

ڈاکٹر۔ (سہیل کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر) ڈر گیا ہے! (پھر کچھ پیچھے ہٹ کر مریض کو غور سے دیکھتا ہے)

شیعب۔ خیر تو ہے؟؟ (ماتھے پر ہاتھ رکھ کر) اوہ حرارت تو بڑھ گئی ہے (ڈاکٹر اور شیعب کی مایوس نظریں چار ہوتی ہیں)

ڈاکٹر۔ (پیچھے ہٹ کر گھنٹی کا بٹن دباتا ہے۔ پھر دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دیتا ہے) میری ——— میری!

شیعب۔ (چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر سہیل کی پیشانی کو چومتا ہے) آہ میرا بیٹا!!!!!

میری۔ (گھبرائی ہوئی آتی ہے) جناب؟

ڈاکٹر۔ چولہا اور پتیلی ٹیکے کی سرنج!

میری۔ (بہت اچھا (چلی جاتی ہے)

شیعب۔ کیا ٹیکہ کرو گے؟

ڈاکٹر۔ (جیب میں ہاتھ ڈال کر) ہاں ——— (جیب سے تھرمامیٹر نکال کر مریض کو لگاتا ہے۔ شیعب ہاتھوں سے اپنے سر کو دبائے کھڑا ہے۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا رہی ہے ——— کہیں دور گھڑیال کے چار بجانے کی آواز آتی ہے۔ ڈاکٹر کلاک کی طرف دیکھتا ہے اور دیکھتا رہتا ہے ——— مریض کے منہ سے تھرمامیٹر نکالتا ہے شیعب اس کے کندھوں پر سے درجہ حرارت دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈاکٹر دیکھ کر مایوس سی صورت بناتا ہے شیعب اُس کے ہاتھ سے تھرمامیٹر چھین کر خود دیکھتا ہے۔

شیعب (دھکا کرسی کے ہاتھ سے تھرمامیٹر لے کر جیب میں رکھ لیتا ہے شیعب چارپائی کی پٹی پر خاموش بیٹھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر کمرے میں ٹہلتا ہے اور ٹہلتا ٹہلتا کھڑکی کھول کر باہر دیکھتا ہے۔ بارش رک چکی ہے آسمان سے بادل اڑ گئے ہیں اور نصف چاند ایک رقیق سی بدلی کے ٹکڑے سے باہر نکلا ہوا ہلکی سی روشنی دے رہا ہے۔ دھکا کرسی کھلی رہنے دیتا ہے ——— میری ایک ہاتھ میں اسٹوو اور ایک میں بیگ پکڑے داخل ہوتی ہے اور اس وقت ناک خاموشی سے گھبرا سی جاتی ہے۔ کلاک ٹن ٹن چار بجاتا ہے۔ میری بیگ سے دیگچی نکال کر اسٹوو پر رکھ کر اس میں سرنج رکھتی ہے دیگچی میں پانی گراتی ہے اور دروازے کی طرف جاتی ہے)

ڈاکٹر۔ کہاں جاتی ہو؟

میری۔ (بیچ بوکس!!!

ڈاکٹر۔ یہ لو (جیب سے نکال کر اُسے دیتا ہے اور خود کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر باہر آسمان کی طرف نظر کر کے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے)

میری۔ (اسٹوو کو جلاتی ہے پھر مریض کے پاس جا کر اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتی ہے) (ٹمپریچر دیکھا ہے؟

شیعب۔ ایک سو آٹھ!

میری۔ ایک سو آٹھ!!! (مریض کے سرھانے بیٹھ کر سوچ میں پڑ جاتی ہے)

شیعب۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) میرا بیٹا سہیل! اے اگر تو مر گیا تو میں کہاں جاؤں گا۔ میرے اجڑے ہوئے گھر کی رونق تیرے دم سے ہے۔

ڈاکٹر۔ (ٹھٹک کر شیعب کی طرف دیکھتا ہے) حوصلہ کرو شیعب۔ دوا کیوں نہیں کرتے؟

شیعب۔ دعا کس سے کروں؟ خدا (ہاتھوں کو اوپر اٹھاتا ہے) خدایا بدنصیب پر رحم کر تیری بے حساب رحمت کہاں گئی میری زندگی کا دل بہلاوا میرے زخمی دل کا کھلونا کیوں توڑا جا رہا ہے کیا تو رحیم نہیں (مٹھیاں بند کر کے) اگر میری خاطر نہ سہی صورت ہی کی انتہا سہیل کی جان لے رہی کرنی تھی تو اسے مجھے دیا ہی کیوں تھا۔ اب

اُسے مجھ سے چھین رہے ہو۔ تیری بے نیاز ذات سے یہ توقع تو نہ تھی (ڈاکٹر تھوڑی پرا نہ رکھے کھڑکی کے پاس کھڑا شعیب کو تک رہا ہے) آہ بدنصیب پر رحم کھا۔ اس تاریک رات میں امید کی شعاع کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ خدایا کیا میری دعا کے لئے تیرے کان بند ہو گئے ہیں۔ اگر سہیل کو کچھ ہو گیا تو میں تیرے سر ٹکرا کر مر جاؤں گا میں اپنی جان سے بیزار ہوں۔ سہیل کے بعد میرا جینا بیکار ہے (سہیل کو پیار کرتا ہے) تو نے اپنے رحمت کے خزانہ سے مجھے تو ایک پل کی خوشی بھی نہیں دی۔ ہاں ہاں نانا سہیل میرے لئے بہت بڑی خوشی تھا مگر اب تو اُسے بھی مجھ سے چھین رہا ہے۔ کتنا ظالم ہے تو جس طرح کسی اڑتے ہوئے پرندے کو اچانک گولی آ لگے اور وہ بے جان ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اسی طرح شعیب بے جان سا ہو کر سہیل پر گر پڑتا ہے۔ اُسے چومتا ہے)

میری۔ (رجو بھی تک اپنے سر کو ہاتھوں سے دبائے مریض کے سرہانے بیٹھی تھی۔ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھتی ہے اور اسٹول کے قریب آتی ہے سرنج کو ویکچی میں سے نکالتی ہے اور آہستہ آہستہ ٹوٹی ہوئی آواز میں کہتی ہے) آہ۔ انسان کی زندگی۔ خدا ہم سے کیا چاہتا ہے۔ بے چارہ شعیب۔ پیارا سہیل۔ میں بدنصیب مر جاؤں ——— (ڈاکٹر اس کے قریب جاتا ہے اور بیگ سے دوائی کی چھوٹی سی بوتل نکال کر سرنج کو بھرتا ہے۔ میری ایک پھریری کو پچھر آئیوڈین سے تر کر کے مریض کے سرہانے ساکت (سکتہ) کھڑی رہتی ہے۔ شعیب اوندھے منہ سہیل سے لپٹا ہوا ہے ڈاکٹر آگے بڑھتا ہے)

ڈاکٹر۔ شعیب۔ شعیب (شعیب اٹھتا ہے) خدا ہر شے پر قادر ہے کوئی بعید نہیں کہ اُس کو اس معصوم پر رحم آ جائے۔ ہٹو ہمیں ٹیکہ کرنے دو (شعیب ایک طرف ہٹ جاتا ہے اور عاجز مظلوموں کی طرح کھڑا ہو کر انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہے۔ میری پھر بڑی ڈاکٹر کو پکڑ اکر مریض کا بازو کحاف سے باہر نکالتی ہے۔ آستین چڑھاتی ہے اور برہنہ بازو کو بے اختیارانہ چومتی ہے۔ پھر ڈاکٹر سے پھریری لے کر مریض کے بازو پر پچھر آئیوڈین کا نشان لگاتی ہے۔ ڈاکٹر ٹیکہ لگا کر مریض کو سیدھا لٹا دیتا ہے

مریض کی کرب دے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہے)

شعیب (حسرت اور رقت آمیز آواز میں) ڈا ——— کٹر ——!؟؟؟؟

(ڈاکٹر اور نرس کی نظریں مریض کے زرد چہرے پر ہیں)

مریض۔ (ہاتھ پیر مارتا ہے۔ الفاظ اُس کے منہ سے کاٹے ہوئے نکلتے ہیں)

ہا ہا نانے ——— م۔ م آں ——— م آں ———

شعیب۔ (مریض پر جھک کر اُسے چومتا ہے) میری۔ جا ۔ ن ۔ دغ بھی کر۔ ماں کو ——— بھولے سہیل، بدکار ماؤں کو بھی۔ بیٹے یاد کیا کرتے ہیں۔ تیرا باپ ——— مر گیا ہے!

(میری کے منہ سے بے اختیارانہ ایک دردناک چیخ نکلتی ہے شعیب اور ڈاکٹر گھبرا کر اُس کی طرف دیکھتے ہیں)

میری۔ (نقاب کو پھاڑ کر) بھولے سہیل۔ تیری بدکار ماں۔ مظالم سے کچلی ہوئی زمانے کی روندی ——— آہ تیری ماں (زور سے چیخ کر سہیل پر گر پڑتی ہے) ہائے میرا بیٹا (وہ اپنا منہ سہیل کی گالوں پر رکھ کر دیوانوں کی طرح بوسوں کا تار باندھ دیتی ہے)

شعیب۔ (حیرت سے) حسنہ !!!!!! ——— او وہ حسنہ !؟؟؟

(دانتوں کو پیس کر آگے بڑھتا ہے) نابکار، لعین ——— بے حیا حسنہ۔ میرا گھر ناپاک ہو گیا (اُس کو کھینچتا ہے) ٹھکرائے ہوئے سہیل سے لپٹتی ہے۔ آہ۔ معصوم کو آلودہ کر رہی ہے (کھینچ کر دھکا دیتا ہے۔ وہ گر پڑتی ہے اور محبت بھری آنکھوں سے پہلے سہیل کو دیکھتی ہے پھر شعیب کو)

حسنہ۔ (آنکھوں سے زار زار آنسو گرتے ہیں آواز بھرائی ہوئی) معاف کر دو مجھے۔ پیارے سہیل کے باپ ———

شعیب۔ نکل جا یہاں سے ذلیل بدکار عورت۔ کتیا دھتکاری ہوئی (اُس کو گھسیٹتا ہے وہ بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ یوں جیسے حسرت و ارمان کی تصویر جا رہی ہو۔ شعیب خونخوار بھیڑیئے کی طرح دانت پیس پیس کر اس کو حقارت و نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ رضا حیران، مشت شدر، مبہوت ہوا کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہے)

سہیل۔ (پھر ہاتھ پیر مارتا ہے) او وہ! او وہ! (ہری ہوئی آواز میں)

ماں ——— آں ——— آں۔

شعیب۔ (زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتا ہے اور مریض پر جھک جاتا ہے)

آہ سہیل۔ پیارے سہیل مجھے ماں کی مزدرت ہے۔ ہوش کرو خدا کے لئے ہوش کرو۔ آہ ــــ آ ــــ ہ ــــ سہیل۔ ہا ــ ہا ــــ

(ڈاکٹر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر باہر دیکھتا ہے۔ اچانک گھبرا جاتا ہے اور غور سے کچھ دیکھتا رہتا ہے)

شعیب۔ رضا ــــ!!! (مڑ کر رضا کو دیکھتا ہے) رضا (جیسے سنا ہی نہیں کھڑا رہتا ہے شعیب پاس آ کر کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے ــــ گھبرا جاتا ہے) حسنہ؟؟ (زور سے آواز دیتا ہے) حسنہ ــــ حسنہ۔ ٹھہرو۔ رک جاؤ۔ ٹھہرو۔ (آگے چٹان ہے خطرناک نشیب ہے) حسنہ، حسنہ۔ وہ گری (دونوں اپنی اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے چھپا کر پیچھے ہٹتے ہیں شعیب فوراً کمرے سے بھاگ جاتا ہے۔ ڈاکٹر بے جان سا ہو کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

(چند منٹ بعد)

سہیل۔ آہ ــــ آ آہ ــــ اہ۔ اہ ــــ (اُس کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر اس کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے۔ پھر اوپر چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہے)

ڈاکٹر۔ اے خدا۔ رحم، رحم کر ــــ (اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر سر باہر نکال کر زور سے آواز دیتا ہے) شعیب ــــ شعیب جلدی آؤ۔ (پھر مریض کی نبض ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بدستور ہچکیاں لے رہا ہے) اے خدا سہیل اس دنیا سے معصوم جا رہا ہے۔ یہ کلی ہے جو ابھی شگفتہ بھی نہیں ہوئی۔ اس پر رحم کر خدا رحم کر (وہ ایک آخری لمبی سی ہچکی لے کر جسم و روح کے تعلق سے آزاد ہو جاتا ہے۔ رضا اسی وقت اُس کی پیشانی پر ایک بوسہ دیتا ہے) لے لو یہ بدنصیب شعیب کی طرف سے آہ خدایا شعیب تو مر جائے گا پاگل ہو جائے گا (کھڑا ہو کر اُس کے چہرے کو لحاف سے ڈھانپ دیتا ہے۔ اتنے میں شعیب حسنہ کو ہاتھوں پر اٹھائے اپنے پیروں کو گھسیٹ گھسیٹ کر کمرے میں داخل ہوتا ہے)

شعیب۔ لے آیا ہوں تیری ماں کو سہیل۔ (حسنہ کے بال سفید اور کالے سلے جلد نیچے لٹک رہے ہیں۔ کپڑے کیچڑ سے لت پت ہیں۔ زرد گردن کے پاس خون کا بڑا سا دھبہ ہے۔ شعیب کی آنکھیں بے نور ہو رہی ہیں اور ان کے گرد نیلے نیلے حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ رنگت میں موت کی سی زردی ہے۔ حسنہ کو فرش پر لٹا کر اس کے دل پر ہاتھ رکھتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اس کا بازو اوپر اٹھا کر) دیکھو رضا۔

رضا۔ (نبض کو ہاتھ میں لے کر۔ سر کو دائیں بائیں ہلاتا ہے)

شعیب۔ ختم؟؟؟ ــــ (اچانک چارپائی پر نظر پڑتی ہے۔ ٹھٹک کر) سہیل؟؟ (لپک کر چہرے سے لحاف اٹھاتا ہے۔ چہرہ فوراً سخت ہو جاتا ہے۔ آنکھوں میں ایک آنسو نہیں زبان پر ایک لفظ نہیں۔ بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے ــــ ڈاکٹر رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتا ہے اور آگے بڑھ کر شعیب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے اُسے دباتا ہے۔ شعیب ہاتھ چھڑا کر پاگلوں کی طرح رضا کا گریبان سے پکڑ لیتا ہے اور کھینچ کر ہنستا ہے) آ ہا ہا ہا۔ آ ہا ہا ہا۔

رضا۔ (گھبرا کر) شعیب ــــ شعیب

(پردہ گرتا ہے)

(پردہ گرنے کے بعد بھی آواز آتی ہے)

شعیب!!!

بابر بٹالوی بی اے (آنرز)

اشعار

ملتا نہیں بلبل کو تڑپنے کا صلہ کیوں
کیا دامنِ گلچیں میں کوئی خار نہیں ہے
سینہ میں تلاطم ہے تو آنکھوں میں ہیں آنسو
درگاہِ اجابت میں مگر بار نہیں ہے

رضا

غزل

نہیں دیکھے گئے وہ بھی نگاہِ برق مضطر سے
جو تنکے بچ رہے تھے آشیاں میں بادِ صرصر سے

ارے صیاد مجبوری اسی کا نام ہے شاید
نشیمن جل رہا ہے دیکھتے ہیں ہم ترے گھر سے

بہارِ صحنِ گلشن ہے اگر اپنے مقدر میں
قفس کی تیلیاں سرسبز ہوں گی دیدۂ تر سے

ہمارے دل کے زخموں کی یہ دھندلی سی تصویریں
حروفِ نامہ جتنے مٹ گئے ہیں دیدۂ تر سے

قفس میں دل کی ہر جنبش پہ اتنا ہوش آتا ہے
کہ انجامِ خزاں کا ذکر تھا نکلے تھے جب گھر سے

خدایاد آیا جب پامالِ حسرت دل ہوا اپنا
نکل آئی رہِ عمرِ ابد اُجڑے ہوئے گھر سے

دعا کے ساتھ وہ آمین کہتے ہیں مگر جوہر
اثر بیگانہ سا رہتا ہے کچھ تیرے مقدر سے

لکشمی نرائن جوہر بدایونی

حورِ صحرا کے نام

میں سوچتا ہوں کہ یہ دن رات کی محنت، یہ صبح و شام کی شقت آخر کس لئے؟ یہ آہیں جاگ جاگ کر آنکھوں میں کاٹنا، یہ دن بھر سر گردان و پریشان ہو ہو کر پھر ناآخر کس واسطے؟ میری شام و سحر کی محنت میری شب و روز کی کاوش کا انجام کیا ہے؟ راتوں کی دیدہ ریزی اور دنوں کی جاں فشانی سے کیا مقصود ہے؟

شہرت کی خواہش؟ دولت کی ہوس؟ نام و نمود کی چاہت؟

میں نے اگر سیم و زر کے انبار جمع کر بھی لئے، میرا نام اگر بحر و بر کی دور دراز پہنائیوں تک پہنچ بھی گیا اور میرے قلم کی سحر طرازیوں نے اگر دنیا کو محوِ حیرت بنا بھی دیا تو کس کام؟ میں جب تک اس کی نگہِ التفات سے محروم ہوں زر و جواہر کے خزانے ہیچ ہیں۔ ہفت افلاک کی شہرت بے معنی ہے اور شعر و ادب کی ہنگامہ آرائی بے سود

اور پھر سوچتا ہوں کہ یہ شعر و ادب ہے کیا! بس اُس کی ایک جھلک کے بجھ کر رہ گئے ہوئے شعلوں کی تپش، اُس کی ایک نظر کے برپا کئے ہوئے طوفانوں کی لہر اور اُس کی ایک آواز کے متحرک کئے ہوئے نغموں کا ترنم۔ شعلوں کی اس تپش، طوفانوں کی اس لہر اور نغموں کے اس ترنم نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ لیکن میرے دل و دماغ کی دنیا اسی تپش، اسی لہر اور اسی ترنم سے آباد ہے۔ یہ چیزیں مجھ سے چھین لو اور میں اس بے آب و رنگ دنیا میں زندہ رہنے کی خواہش سے دست بردار ہو جاؤں گا۔

یہ شعر کون سا نغمہ خوانی ہے۔ یہ افسانہ نجی صرف اس امید پر حاصل کی تھی کہ اپنے دل کے داغ، اپنی روح کے گداز اور اپنی جان کے روگ سے اُسے آگاہ کر سکوں گا۔ یہ ادب و انشا کی زندگی محض اس خیال سے اختیار کی تھی کہ الفاظ کے پردے میں اپنے زخموں کی خلش، اپنی آہوں کی جلن اور اپنی آنکھوں کی سوزش اُسے دکھا سکوں گا، لیکن میری تیرہ بختی کہ جگر خون ہو ہو کر آنکھوں سے بہتا رہا، شرر بار آہوں سے جسم و جان جل جل کر راکھ ہو گئے، زخموں نے رس رس کر ناسور کی صورت اختیار کر لی اور وہ میرے حالِ تباہ سے بے خبر، میرے رنج و الم سے غافل، میرے درد و کرب سے بے نیاز اطمینان سے دنیا کا تماشا کرتی رہی۔ ہائے

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال لے نوازی

لوگ کہتے ہیں کہ میرے الفاظ میں مقناطیس کی قوت، بجلی کی تڑپ اور شعلوں کی حدت پنہاں ہے۔ میرے حریفِ حیران ہیں کہ میرے کلام میں سوز، میرے بیان میں سحر اور میری انشا میں نگینی کہاں سے آئی۔ وہ شاید سمجھتے ہیں کہ لغت کے قواعد اور محاورے کی پابندیاں زبان کو معجز بیانی اور قلم کو جادو نگاری کی طاقت بخش دیتی ہیں۔ لیکن آہ یہ راز دوست دشمن کبھی سے پوشیدہ رہا کہ میری بے کیف زندگی جب تک اس کے جلووں سے منور نہ ہوئی تھی، میرے لیل و نہار کا بے روح بے ذوق تسلسل جب تک اُس کی نگاہوں کے سحر سے پاش پاش نہ ہوا تھا اور وہ جب تک اپنے حسن و جمال کی تابانیوں کے ساتھ میرے افقِ حیات پر چودھویں کا چاند بن کر نمودار نہ ہوئی تھی، میرے الفاظ میں نہ مقناطیس کی کشش تھی اور نہ بجلی کی چمک۔ میری زبان میں تاثیر تھی اور نہ میرے قلم میں روانی۔ اُس نے مجھ سے ایک نظر مجھ خانماں خراب پر ڈال دی اور یہ سوئے ہوئے فتنے یک بارگی جاگ اُٹھے، الجھی ہوئی چنگاریاں انگاروں کی طرح دہکنے لگ گئیں اور سازِ زندگی کے ٹوٹے ہوئے تاروں سے نشاط و کامرانی کے نئے نئے پھوٹ پھوٹ کر بہ نکلے۔ عشق فصاحت و بلاغت کا سب سے بڑا معلم ہے۔ جب دل اس کی شعاعوں سے جگمگانے لگتے ہیں، جب روحیں اس کے فتنوں سے وجد میں آتی ہیں اور جب حواس پر وہ ایک خمار بن کر چھا جاتا ہے تو زبان حقائق و معارف کی ترجمان بن جاتی ہے

اور قسمِ ازل و ابد کے اسرار کے پردے چاک کر دیتا ہے۔

میرے دل و دماغ پر حکومت کرنے والی ساحرہ! تیری ایک نگاہ نے میری دنیا بدل ڈالی۔ میری زندگی کی شاہراہ کس قدر تاریک تھی، تو نے ایک لمحہ کی مسکراہٹ سے اُسے دور دور تک روشن کر دیا۔ یہ صبح و شام کی فرسودگی، یہ لیل و نہار کی گردش دلآویزیوں سے محروم ہو چکی تھی۔ تو نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور جس طرح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کائنات کے مردہ جسم میں حیاتِ تازہ کی لہر دوڑ جاتی ہے میری مضمحل و افسردہ زندگی تیرے جمالِ جاں فروز کے پرتو سے چمک اٹھی۔ آہ

ایک ہی بار ہوئیں وہ چار نگاہیں دل کی
اتفاقات اُن کی نگاہوں نے دوبارہ کیا

یہ کاہشِ فراق، یہ تجھ سے دور رہنے کی اذیت، یہ تجھ تک نہ پہنچ سکنے کی بے کسی مجھے ہلاک کئے دیتی ہے۔ پھر یہ سب کچھ ایک روز کا دکھ ہو تو صبر بھی ہو سکتا ہے۔ مگر جب حالت یہ ہے کہ دن رات میں کوئی لمحہ تیری یاد سے غافل اور شام و سحر کا کوئی دقیقہ تیرے تصور کے بغیر نہیں گزرتا تو بتا میں دلِ ناداں کو کہاں تک تسلیاں دے دے کر بہلاتا رہوں۔ جانتا ہوں کہ تیری عیش و آرام میں ڈوبی ہوئی زندگی میرے رنج و اضطراب سے متاثر نہیں ہو سکتی لیکن اس پر بھی اپنے دلِ غم نصیب کے اُن خونچکاں گوشوں کو بے نقاب کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جن کی ایک جھلک شاید دنیا سے مسرت و نشاط کا وجود فنا کر دے

میری جان، میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ تجھے صحرا کی زندگی کیوں پسند آ گئی ہے؟ تنہا، یہ حسین جسم جو ہتاب کی کرنوں سے بڑھ کر حسین و جمیل اور موسمِ بہار میں کھلنے والے پھولوں سے زیادہ معطر و شاداب ہے بدخشاں کی گرم ہواؤں کی کیوں کر تاب لا رہا ہے؟ کیا اس لئے کہ لیلےٰ کو نجد اور عذرا کو یمن عزیز تھا اور تو نے بھی دل نوازی و دل بری کی فہی روایات کو زندہ رکھنے کی خاطر بیابانِ ریگ زار منتخب کر لیا ہے جہاں حُسن ہمیشہ ناوک فگنی اور عشق ہمیشہ جاں کنی میں مصروف رہتا ہے؟

اگر یہ چند سطریں تیری نظر سے گزریں ـــــ آہ مجھے اپنے بختِ نارسا سے اس کی توقع نہیں ـــــ تو سمجھ لینا کہ قدرت نے تجھے لیلےٰ روشنی سکھا کر مجھ مجنوں صحرا نصیب کو تیس کی سوختہ سامانی عطا کرنے میں بخل نہیں کیا۔

"ع"

"سانیٹ"

غرقِ تزئم آج بھی بادِ بہار ہے
اب بھی ہے اودی اودی گھٹا زُہد آزما
طوفانِ رنگ و بو ہے فسوں کار و سحر زا
اب بھی ہزار کیف کی پروردگار ہے

غارت گرِ قرار ہے اب بھی شفق کا رنگ
اب بھی ابھارتی ہے دلوں کو گناہ پر
اب بھی نظر نواز ہے رنگینیٔ سحر
بیدار دل میں کرتی ہے اب بھی وہی اُمنگ

اب بھی ہے اُن کی زلفِ پریشاں جنوں طراز
محشر بدوش اب بھی ہیں اٹھتی جوانیاں
اب بھی نگاہِ حسن میں رقصاں ہیں بجلیاں
عہدِ شباب اب بھی ہے پر میرے چارہ ساز!

اس روز و شب کی اشک فشاں کو کیا کروں!
دل ہی جواں نہ ہو تو جوانی کو کیا کروں!

سکندر

ایک راہبہ کے محبّت نامے!

تیسرا خط!!!

میری ظلمتیں ان کی اس سے زیادہ حسرت ناک انتہا اور کیا ہوگی اور تم مجھ سے اپنی محبت کا اس سے زیادہ صلہ اور کیا چاہتے ہو؟ میرے ذہن کی تمام تر طاقتیں سلب ہو چکی ہیں۔ میری مایوسیوں نے مجھے کچھ سوچنے سے بھی مجبور دلاچار کر دیا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اب کیا کروں۔؟

میں اسی امید میں جی رہی تھی کہ تم جہاں بھی جاؤ گے، جس شہر سے بھی گزرو گے، مجھے ضرور کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجو گے، خطوں میں مجھے اپنے ملنے کی امید دلا کر میری شکستہ دلی کو دور کرو گے اور اس طرح سے اپنی وفاداری کا ثبوت بہم پہنچاؤ گے۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا میں یقیناً اطمینان کا سانس لیتی اور سمجھتی کہ تمہیں بھی میرے غم کا پاس ہے، میرے دل کی آہ و زاری کا تمہیں بھی خیال ہے۔ تمہارے اس طرح یاد کرنے سے میری تمام مصیبتوں کی تلافی ہو جاتی اور میرا غم بھی یقیناً ہلکا ہو جاتا!!

آہ، تم کیا جانو کہ میرے دل کے ساتھ کیا گزر رہی ہے اور تمہاری ظالم جدائی مجھ پر کیا کیا ستم ڈھا رہی ہے۔ میری صحت برباد ہو چکی ہے۔ میرے دل کے مقدس جذبات منتشر اور شکستہ پڑے ہیں۔ میری پرشوق آرزوئیں غارت ہو چکی ہیں اور میری مایوس نگاہیں تمہاری دید سے محروم ہو کر تڑپ رہی ہیں۔!!

کیا جدا ہوتے وقت تم نے جو پیمانِ الفت باندھے تھے وہ سب جھوٹی فریب کاریاں تھیں تمہاری خصلت کی ——— جنہیں میں نے اپنے بھولے پن سے اپنی آنے والی قسمت کا معاون و مددگار سمجھا تھا!!!

آہ، کیا یہ محبت کے غم کا بار مجھے اکیلے ہی اٹھانا پڑے گا، کاش میں اپنی اس بے چارگی اور ناتوانی کو اس وقت محسوس کرتی۔ جب تمہیں میں نے اپنی محبت کے لئے انتخاب کیا تھا!!! افسوس میری ظلمت

اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ میں تمہیں اپنے رنج و غم کا شریک بھی نہیں بنا سکتی اور تنہا خود ہی مجھے اپنی بدقسمتی کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے!!!

یہ ظالم خیال مجھے مارے ڈالتا ہے اور اس ڈر کی دہشت مجھے چین نہیں لینے دیتی کہ شاید تم نے واقعی کبھی محبت کی اصل خوشی چاہی ہی نہ تھی!! ہاں! اب مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری وہ سب سرگرمیاں اور تمہارے وہ سب شوق محض جھوٹے تھے اور بے ثبات! تمہارا یہ کہنا کہ تم میرے بغیر اکیلا رہنا گوارا نہیں کر سکتے تھے دھوکا تھا سراپا دھوکا!!

تمہاری روح کی وحدانیت، تمہارے دل کی بے قراریاں، یہ سب کچھ میرا دل رکھنے کے لئے تھا، تمہیں تو صرف میرے دل کا سکون برباد کرنا تھا سو کیا۔ یہ حقیقت کہ تم میری محبت سے کبھی بھی متاثر نہیں ہوئے۔ مجھ پر اب کھلی۔ میں نے یہ راز اب جانا۔ ذرا سوچو تو! تم نے میرے اس قدر ایثار، میری اس درجہ عاجزی اور انکساری سے کیا فایدہ حاصل کیا! یقیناً کچھ بھی نہیں!! آہ، کتنے بدنصیب ہو تم! اور یہاں میرا یہ حال کہ تمہاری اس قدر پرستش کر چکنے کے بعد بھی میں تمہیں اپنا نہ بنا سکی!!

مجھے سخت افسوس ہے اپنے دل کے تمام تر خلوص و صدق کے ساتھ محبت کی ان بے انتہا مسرتوں کا جنہیں تم ضائع کر چکے ہو، کیا تم نے ان مسرتوں کو حاصل کرنے کی کبھی آرزو بھی کی تھی!!!؟

اگر تم محبت اور محبت کی اصلیت سے آگاہ ہو جاتے تو بجائے اس کے کہ مجھے فریبوں میں مبتلا کرتے۔ میری عبادت کرتے، اور اس راز کو سمجھ سکتے کہ محبت کئے جانے کی نسبت دیوانہ وار محبت کرنے میں ایک مسرت روحی ایک وجدانِ حقیقی ہوتا ہے!!!

میری جانب دیکھو۔ میں نے اپنے آپ کو محبت میں غرق کر ڈالا ہے یہاں تک کہ اپنی ہستی کو بھی بھولی ہوئی ہوں۔ اتنا بھی نہیں جانتی کہ مجھے کرنا

کیا ہے اور وہ کون ہے جس کی آرزوئیں کھو ئی جا رہی ہوں !!! ؟

سینکڑوں تفہرانی اور بے بس کرنے والے افکار اور پریشانیوں نے مجھے بے حس و مردہ بنا رکھا ہے۔ آہ، میری عاجزی کتنی حسرت خیز ہے کہ میں نے تمہاری محبت میں اپنا سب کچھ کھو کر بھی تم سے یہ درخواست نہ کی، کہ تم بھی میری طرح محبت کی تجلیوں سے بے خود و بے قرار ہو۔ میں خودکشی کروں گی! اگر ایسا نہ کر سکی تو غموں میں گھل گھل کر اپنی جان پر کھیل جاؤں گی! آہ، اگر مجھے اتنا صرف اسی قدر معلوم ہو جائے کہ تمہیں بھی میرے غم میں سکون نصیب نہیں۔ تمہاری زندگی بھی میری طرح درد و الم سے ہم کنار ہے۔ تمہاری راتیں بھی میرے غم میں پریشان رہتی ہیں، تم بھی میری یاد میں روتے رہتے ہو اور سب سے آخر میں یہ کہ دنیا میں میرے بغیر تمہیں بھی کوئی شے بھلی نہیں لگتی !!!

مجھے محبت نے اس درجہ ناتواں اور نحیف بنا دیا ہے کہ مجھ میں اب اپنے غموں کا مقابلہ کرنے کی بھی سکت نہیں رہی۔ اُف! اگر کہیں ایسا ہوتا کہ تم بھی میری طرح افسردہ و غمگین ہوتے (اگر تمہیں کوئی غم ہو تا تب!) تو، نا ممکن تھا کہ میں تمہارے ان شدید اور سرگرم غموں کو برداشت کر سکتی !!

یقین جانو کہ مجھے ہر اُس شے سے خطرناک طور پر حسد ہے جو (آتش میں تمہارے دل و دماغ کے لئے دلچسپی اور دلکشی کا باعث بنی ہوئی ہے!

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں خط کیوں لکھتی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ تم یہی کرو گے کہ مجھ سے اظہار ہمدردی کرنے لگو۔ لیکن میں اب ہر چیز سے بے نیاز ہو چکی ہوں۔ مجھے اب تمہاری ہمدردی کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے اس وقت خود سے نفرت ہونے لگتی ہے جب میں یہ سوچتی ہوں کہ میں نے تمہارے لئے کیا کچھ کیا۔ میں تمہاری خاطر اپنی عزت، اپنا وقار سب کچھ کھو بیٹھی۔ میں نے صرف ایک تمہارے لئے اپنے تمام عزیزوں کو ناراض کر لیا۔ میں نے صرف تمہاری خوشی کے لئے مکین قوانین کی بھی پروا نہ کی جو حکومت نے ہمارے طبقہ کی عورتوں کے لئے نافذ کر رکھے ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر تمہاری بے وفائی ——— تمہاری سرد مہری کا نشانہ بنی جس سے زیادہ ہلاک میرے لئے دنیا میں اور کوئی مصیبت نہیں ——— کوئی بلا نہیں !! اگر آہ یہ سب کچھ کر کے بھی میری محبت ابھی تشنہ ہے۔ میری پیشانی ابھی تک ناکمل ہے میں ابھی اور ان سے زیادہ خطرناک مصائب تمہارے لئے نہایت خوشی اور آسانی سے قبول سکتی ہوں۔ آہ میں اب بھی تیار ہوں۔

میں اب بھی راضی ہوں۔ اپنی زندگی کی تمام تر لطافتیں، اپنی معصوم جوانی کی ساری رنگینیاں اپنے ناموس کی تمام شہرتیں اور سرفرازیاں تمہارے لئے آہ صرف تمہارے لئے قربان کر دینے کو !!!

اب بھی میرے لئے جو کچھ عزیز ہے، اب بھی دنیا میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے وہ فقط تمہارے لئے تنگ ہے، میں اُسے بلا روک ٹوک، کسی قسم کا تامل کئے بغیر تمہارے قدموں پر لٹانے کے لئے، تم پر نثار کرنے کو ہر وقت ہر لمحہ تیار ہوں !!

مجھے اس کا احساس ہے کہ مجھے ابھی تک میری محبت کے غم نے اچھی طرح سے مطمئن نہیں کیا۔ میری محبت کی تکمیل ابھی تک نہیں ہوئی۔ میری روح کو اس وقت تک چین نصیب نہ ہوگا۔ جب تک کہ میں تمہارے دل کی تسلی کو حاصل نہ کر سکوں! میری اس تمام تر ریاضت اور عبادت کا کیا فایدہ اگر میں تمہیں خوش نہ کر سکی ؟

میں زندہ ہوں مگر اپنی وفاؤں کے صلے کے بغیر آہ اپنی آرزوؤں کی کامیابی کے بغیر مجھے اپنی زندگی کے بقا پر رکھے میں تنا سف حاصل نہ ہوگا جتنا کہ اس بات کے کہ تم خوش ہو گی!!

کاش میں اپنی اس شکستہ پندار کی حالت میں ہی مر جاتی۔ پھر میری محبت کی خونچکاں داستان صرف خطوں میں ہی پوشیدہ رہتی !!

اگر میں اپنی روح کی تمام تر گہرائی اور شدت کے ساتھ جس کا اظہار میں پہلے بھی کئی بار کر چکی ہوں، تم سے محبت کرتی تو کیا میں اب تک مر نہ جاتی؟ میں نے ایسا نہ کر کے یقیناً تمہیں فریب دیا ہے۔ تمہیں دھوکے میں رکھا ہے۔ تم اس بات کا مجھ سے شکوہ کر سکتے ہو تم میری اس غفلت طرازی کا مجھے مجرم ٹھیرا سکتے ہو! تم مجھے اس کی سزا دے سکتے ہو!!! آہ تم مجھے سزا دینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ !!!! تم مجھ سے جدا ہو گئے ہو اور اب میں کسی حال میں کسی طرح بھی یہ امید نہیں کر سکتی کہ تم مجھے کبھی ملو گے۔ آہ، یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں پھر بھی زندہ ہوں۔

میں نے تم سے دغا کی ہے۔ میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ مگر آہ، تم مجھے معاف نہ کرو۔ تم مجھ سے بے رحمانہ برتاؤ کرو۔ مجھے اس بات کا طعنہ دو کہ میرے احساسات غیر مستقل اور ناتواں ہیں۔ تم میری خوشیوں کے لئے مشکل بن جاؤ اور مجھے حکم دو کہ میں تمہاری محبت میں مر جاؤں !!! میں تم سے منت کرتی ہوں ——— التجا کرتی ہوں کہ اس معاملے میں خدارا تم میرا ساتھ دو تاکہ میں اپنی انسانی کمزوری

کو اچھی طرح محسوس کر لوں اور ایک ابدی موت سے اپنی اس محبت کی خام کاری کا خاتمہ کر ڈالوں! اور پھر شاید تم میرے اس دردناک انجام سے کچھ نہ کچھ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکو اور پھر شاید مجھے کبھی کبھی یاد بھی کر لیا کرو!!

میری موجودہ حالت (جس کا تمام تر گناہ تمہاری گردن پر ہے) شاید وہ حالت کچھ بہتر ہو!!

الوداع، اے میری زندگی کے چھیننے والے، الوداع!!

آہ! میں کتنی خوش نصیب ہوتی۔ اگر تمہاری محبت کی اولین نگاہ کو ٹھکرا دیتی!! میری محبت کے اس قوی الاثر جذبے نے مجھے بعد میں کتنا تباہ کیا۔ اب جبکہ میں اپنے دل کی واردات لکھ رہی ہوں۔ مجھ پر یہ راز عیاں ہو رہا ہے کہ جتنا میں پہلی بار تمہیں دیکھ کر پریشان ہوئی۔ اتنا میں تمہیں چاہنے میں مایوس نہیں ہوئی!!

بغیر کسی شکوہ و شکایت کے میں اپنی نابکار قسمت کی ہار مان لیتی ہوں! جب مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم نے اسے خوش رکھنے میں ذرا سی بھی کوشش سے کام نہیں لیا! تم جو میری محبت کو مظلوم بنانے والے معصوم قاتل ہو! مجھ سے عہد کرو کہ تم میری مایوس موت پر اپنے دل کے رقیق اور نرم جذبات سے آنسو بہاؤ گے، اور میرے دیوانے جذبات محبت کی اس معصوم قربانی سے متاثر ہو کر دنیا کی کسی اور دلچسپی میں حصہ نہ لو گے۔ اتنی آہ، صرف اسی قدر تسلی میرے دل کے لئے کافی ہوگی! اگر میں تم سے اپنی محبت کو واپس چھین لوں گی تو میں تمہیں کسی دوسری محبوبہ کی آغوش محبت میں دیکھنا بھی پسند نہ کروں گی۔ اس سے زیادہ تمہاری بے رحمی کی حد اور کیا ہوگی کہ تم میری محبت کو ٹھکرا کے اپنے آپ پر نازاں ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ تم نے کائنات میں ایک معصوم روح کو مجروح اور پامال کر کے دنیائے محبت پر ایک بہت جلیل القدر احسان کیا ہے!!!!؟

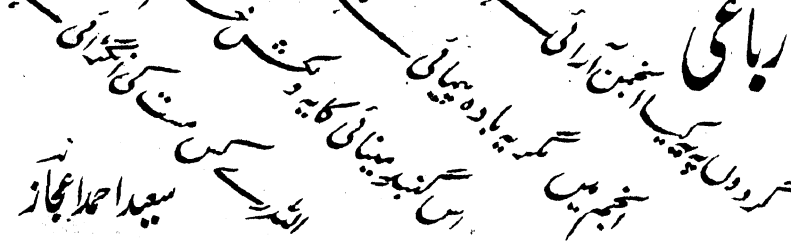
میں تمہیں دوسری بار الوداع کہتی ہوں۔ میری جانب سے تمہیں بہت طویل خطوط لکھے جاتے ہیں۔ میں تمہارے قیمتی وقت کا بھی تو خیال نہیں کرتی جس کی میں تم سے معافی مانگتی ہوں اور یہ امید رکھنے کی جسارت کرتی ہوں کہ تم ضرور اپنے قیمتی وقت کی تھوڑی سی مصروفیت ایک دیوانی لڑکی کی داستان الم کے سننے کے لئے بھی نکال لو گے۔ آہ، وہ دیوانی لڑکی جو تمہیں محبت کرنے سے پہلے یقیناً فرزانہ تھی۔

مجھے اس کا علم ہے کہ میں تم سے اپنی پریشانیوں کا بہت تذکرہ کرتی ہوں تاہم میں تمہارا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کیونکہ میری یہ سب پریشانیاں تمہاری ہی بے اعتنائی کی مرہون منت ہیں!!!

مجھے اپنی زندگی کے اُس سکون سے بھی نفرت رہی ہے جو مجھے تمہاری محبت سے پہلے حاصل تھا!!

اس وقت کہ میں تمہیں آخری بار الوداع کہنا چاہتی ہوں تسلیمات سے گرا جا رہا ہے! دل ہے کہ بے تاب ہو رہا ہے ـــــ اور روح ہے کہ گھبلی جا رہی ہے ـــــ آہ مجھے ابھی تم سے کیا کیا کچھ اور کہنا تھا!!!!

عظیم قریشی



پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری ایم اے۔ الہ آباد سے تحریر فرماتے ہیں:۔

میرے غمزدہ بھائی پیغام لکھتے ہوئے کلیجہ دکھتا ہے۔ آہ منصور احمد کی موت نے ہم سے اور آپ سے ہمایک زندگی کے اور شاغل تو بطرف تمام ادبی کاموں سے جی اُچٹ گیا۔ اُدبی دنیا میں مرحوم کی تصویر دیکھ کر ایسی محبت اُمڈی اور جی اتنا دکھا کہ میں روک نہ سکا میں آپ کی تشفی کیا کروں گا۔ آپ پاس نہ تھے تو آپ سے تشفی کی امید کرتا۔ ہاں مرحوم کے والد سے لپٹ کر رونے کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن کے قدموں میں ممکن اور مناسب ہو تو میرے یہ الفاظ پہنچا دیجئے گا۔ یہ سب لکھ رہا ہوں پھر بھی اپنے غم اور ان الفاظ میں کوئی نسبت نہیں پاتا۔ منصور احمد کی موت میرے بھائی اور دو ایک سال چھوٹے بھائی کی موت کے برابر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مرحوم کے والد صاحب سے کہوں کہ منصور احمد آنجہانی کی جگہ ہم سب کو سمجھیں۔ اس غم اور مایوسی میں جگر مرادآبادی کے اس شعر سے مجھے آپ کو اور مرحوم کے متعلقین کو سہارا لینا چاہیے:۔

تو فنا آمادہ ہے مجھ کو نظر آتی ہے موت
زندگی تابندگی پائندگی پاتا ہوں میں

اُدبی دنیا کا اور اپنا مجھے برابر خادم اور مخلص سمجھئے۔

شہید ابن علی صاحب بیرہ ضلع مظفر گڈھ سے لکھتے ہیں۔

مرحوم کی جواں موت کے صدمے کا اندازہ تو اس کے دل سے ہو سکتا ہے جس کا وہ تختِ جگر تھا یا جس کا دستِ راست۔ مگر مجھے بھی ایک سخت صدمہ نصیب ہوا ہے کیونکہ اس دنیا میں ادبی مقالات کے متعلق سوائے ان کے میرا اور کوئی دستگیر نہ تھا اور مجھے ان سے ایک عقیدت تھی۔ مخلصانہ۔ نیازمندانہ عقیدت ـــــ بے پناہ اور نامحدود عقیدت۔

برا ہو موت کا کہ اُس نے ایک ایسے ادیب شہیر کے جسدِ خاکی کو دنیا سے مٹا دیا۔ مگر اس کا نام مٹانے کی طاقت موت کو نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

محمد یعقوب صاحب بی اے۔ اسلامیہ کالج پشاور سے رقمطراز ہیں۔

افسوس۔ مرحوم کے خویش و اقارب ایک نیک سیرت عزیز اور اُس کے دوست ایک مخلص رفیق کی پیاری شخصیت سے محروم ہو گئے کون آدمی ہے جس نے منصور احمد کے ساتھ ایک دفعہ بات کی ہو اور پھر اُس کی صفاتِ حمیدہ کا گرویدہ نہ ہوا ہو۔

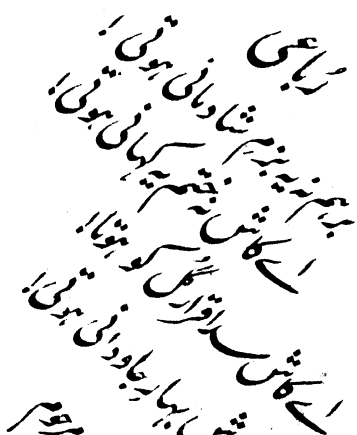
اردو ادب اور زبان کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ ایک ہونہار ادیب کی بیش بہا خدمات سے اُسے فایدہ اٹھانے کا موقعہ نہیں ملا۔

مجھے اس ناگہانی موت سے بہت صدمہ ہوا ہے۔ اگر سچ پوچھیں تو میں محبۂ تنفیطیت بن گیا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک تاریک غار میں دھکیل دیا گیا ہوں۔ جہاں مجھے چاروں طرف موت ہی موت نظر آتی ہے۔ ہم سب اس کے بغیر اور کیا کر سکتے ہیں کہ چپ چاپ خدا کی مرضی کے سامنے سرِ نیاز خم کریں۔

جناب تمکین کاظمی صاحب حیدرآباد دکن سے رقمطراز ہیں۔

"منصور احمد صاحب کی موت بڑی نادقت موت ہے اور اس کا ریخ رسمی نہیں بلکہ قلبی ہے۔ درحقیقت یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ خداوند مرحوم کو مدارج اعلیٰ عطا کرے۔"

ادارہ



نقد و نظر

شاعر (آگرہ) کا سالنامہ

ہمعصر شاعر نے اس مشت گراں پیا عظیم الشان سالنامہ شائع کرکے ثابت کر دیا ہے کہ شاعر جب چاہے تخیل کے سحابی ایوانوں سے نکل کر میدان عمل میں بھی سرگرم کار ہو سکتا ہے۔ سو اپا نسو صفحات کی یہ تالیف لطیف ایک بہت وقیع ادبی گلدستہ ہے جس کا بیشتر حصہ "آگرہ سکول" کے نقر یباً پونے تین سو شعرا کے کلام اور حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ کئی شعرا کی تصاویر بھی زینت دہ اوراق ہیں اور ایک حدیث جو ہمیں پڑھ کر معلوم ہوئی ہے کہ آگرہ سکول کے سرکار داں یعنی حضرت سیماب اکبرآبادی اپنے تلامذہ کی نظموں اور غزلوں کی جس طرح اصلاح کرتے ہیں اُس کے بہت سے نمونے درج کئے گئے ہیں۔ آگرہ سکول کیا ہے۔ اس کا مختصر جواب پروفیسر حامد حسن صاحب قادری نے یوں دیا ہے:۔

"تعمیر، ینہ اور ترقی آب طلبہ میں دہلی و لکھنؤ کے تصنع و تکلف کی زیادہ قدر نہ رہی۔ کچھ افراد ملک میں ایسے پیدا ہو گئے جو ان دونوں اسکولوں سے الگ ایک جدید رنگ کے طلبگار ہوئے۔ یہ وہ رنگ تھا جو مرزا داغ اور مرزا غالب کے رنگِ تغزل کے امتزاج سے بقدر معتدل پیدا ہوا تھا۔ آگرہ اسکول بھی آج اسی رنگ کا نتیجہ و یدہ ہے۔"

اور مفصل جواب چاہیں تو سالنامہ شاعر ملاحظہ فرمائیں جسے بقول ایڈیٹر صاحب شاعر آگرہ سکول کی توضیح کا مکمل نمونہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

گھصلی پیلائی ہوئی کاغذ عمدہ، سمرتی خوبصورت قیمت صرف ایک روپیہ بارہ آنے (پتہ) منیجر شاعر آگرہ۔

میکدہ

شاید بہت کم اصحاب کو معلوم ہوگا کہ حکیم سید علی احمد صاحب تیرؔ وسطی جن کا مسکن شمار سرزمین پنجاب میں ہزاروں بندگانِ خدا کو پنجۂ اجل سے چھڑانے میں کامیاب ہو چکا ہے ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ آپ کی غزلوں اور قومی و ادبی نظموں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ "میکدہ" کے نام سے شائع ہو کر تشنگانِ زلالِ ادب کو سیراب کر رہا ہے۔ ہم نے جستہ جستہ مقامات سے میکدہ کا مطالعہ کیا ہے۔ تیرؔ صاحب کے کلام میں جو چیز

